الفرقان لکھنؤ

مُدیر

محمد منظور نعمانی

سالانہ چندہ ۱۲/-
[پاکست]ان سے ۲۵/-
[بن]گلہ دیش سے ۱۵/-
ضخامت ۴۸ صفحات
قیمت
[فی] کاپی ۱/۲۰

جلد ۴۳	بابت ماہ جنوری ۱۹۷۵ء مطابق ذی الحجہ ۱۳۹۴ھ	شمارہ (۱)

اگر اس دائرہ میں ◯ سُرخ نشان ہو، تو

[اس] کا مطلب ہو کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہو، براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، [چ]ندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۰ فروری تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے جو پتہ کی چٹ پر لکھا رہتا ہے۔

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کردیا جاتا ہو اگر ۱۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو [د]وبارہ مطلع کریں اسکی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانی چاہیئے اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

الفرقان کا دُوسرا

انتخاب نمبر

اب سے دو سال پہلے جب الفرقان کی عمر کے ۴۰ سال پورے ہوئے تھے تو یہ طے کیا گیا تھا کہ اس کے پرانے فائلوں میں جو ایسے بہت سے مضامین دبے پڑے ہیں جن کی آج بھی ویسی ہی ضرورت و اہمیت اور اُن میں وہی افادیت ہے جو ان کی اشاعت کے وقت تھی، اور ہمارے اس دور کے زیادہ تر ناظرین کو ان کی خبر بھی نہیں ہے، اُن کو پرانے فائلوں سے نکال کر چند خاص نمبروں میں مرتب کر کے دوبارہ شائع کر دیا جائے۔

اس تجویز کے مطابق الفرقان کا "پہلا انتخاب نمبر" اس سال کے شروع میں شائع ہو چکا ہے جس میں الفرقان کے بریلی کے ۱۰ سالہ ابتدائی دَور کے منتخب مضامین ہمارے ناظرین ملاحظہ فرما چکے ہیں ـــــ اُن کے خطوط سے یہ معلوم کر کے بڑی خوشی اور بڑا اطمینان ہوا کہ انھوں نے اس کو بہت مفید سمجھا۔ فللہ الحمد۔

اب انشاء اللہ آئندہ مہینے فروری کے شمارہ کے بعد اسی طرح کا دوسرا انتخاب نمبر شائع ہوگا، اندازہ ہے کہ اس میں لکھنوی دور کے ابتدائی دس بارہ سال کے منتخب مضامین ناظرین کی خدمت میں پیش کیے جا سکیں گے۔

خدا نے چاہا تو آئندہ شمارہ میں اس انتخاب نمبر سے متعلق کچھ مزید تفصیلات عرض کی جا سکیں گی۔

ناچیز

ناظم دفتر الفرقان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

محمد منظور نعمانی

کچھ عرصہ ہوا ضلع ناسک (مہاراشٹر) سے ایک صاحب کا خط آیا تھا، انھوں نے لکھا تھا کہ میں کالج کا ایک طالب علم ہوں ـــــ خط کا مدعا یہ تھا کہ جو شخص توحید کا قائل ہو، اگرچہ قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا بلکہ سرے سے نبوت و رسالت ہی کا منکر ہو اُس کو "مسلم" اور نجات و جنت کا مستحق ماننا چاہیے ـــــ

پھر لکھا تھا کہ بہت سے ہندو توحید کو مانتے ہیں اُن کے بارے میں ہم کو ماننا چاہیے کہ وہ بھی مسلمان ہیں اور نجات و جنت کے مستحق ہیں ـــــ اس سلسلے میں ہندوؤں میں سے بعض بڑی اور معروف شخصیتوں کے نام بھی لکھے تھے۔

مکتوب نگار نے اپنے اس خیال یا دعوے کی تائید میں یہ چند چیزیں پیش کی تھیں۔

(۱) یہ مُسلَّم ہے کہ توحید ہی اسلام کی بنیاد ہے پس یہ بنیاد جس کو حاصل ہو وہ مُسلِم ہے چاہے یہاں اُس کا شمار غیر مسلموں میں ہوتا ہو۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں توحید کے ماننے والوں کو بخشش کا مستحق قرار دیا ہے، فرمایا گیا ہے کہ شرک کے سوا خدا جس گناہ کو چاہے معاف فرمادے مگر شرک کو معاف نہ فرمائے گا۔

(۳) حدیث شریف میں ہے "من قال لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ" (یعنی جس نے کہا لا الٰہ الا اللہ وہ جنت میں جائے گا)

خط لکھنے والے صاحب نے اپنے یہ دلائل لکھنے کے بعد لکھا ہے ـــــ کہ

"سوال یہ ہے کہ ہمارے علماء نے جو رسالت اور قرآن کے منکر کو اسلام سے خارج

قرار دیا ہے، مذکورہ دلائل کی روسے اس کا کیا جواب ہے؟"

آگے اس سلسلے میں یہ بھی لکھا ہے

"اور متقدمین میں اکثر علماء نے صرف توحید کے ماننے والے کو مسلم لکھا ہے۔"

یہ خط لکھنے والے صاحب یا صاحبزادے جیسا کہ انھوں نے خود لکھا ہے کسی کالج کے طالبعلم ہیں۔ ظاہر ہے کہ انھوں نے علم دین حاصل کرنے اور قرآن و حدیث کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے عمر کا کوئی حصہ صرف نہیں کیا ہے، اُن کے خط کے مضمون سے بھی یہ بات ظاہر ہے، لیکن وہ اپنے کو اس کا حقدار سمجھتے ہیں کہ اسلام اور کفر کے بنیادی مسئلے میں اُن تمام علماء اور ماہرین کتاب و سنت کے نقطۂ نظر سے اختلاف کریں اور ان کی تحقیق اور رائے کو غلط قرار دیں جن کی عمریں علم دین کی تحصیل و خدمت اور قرآن و حدیث کے سمجھنے سمجھانے ہی میں صرف ہوئی ہیں۔

یہ خط لکھنے والے عزیز تو ایک نوعمر طالب علم ہیں لیکن واقعہ اور خود اپنا تجربہ یہ ہے کہ ہمارے جدید تعلیم یافتہ طبقے کے بہت سے عمر رسیدہ حضرات بھی اس مرض میں مبتلا ہیں، اور کبھی نہیں سوچتے کہ ان کا یہ طرزِ عمل منطق و معقولیت سے کتنا دور ہے۔ ان کے سامنے اگر کوئی شخص جس نے طب اور ڈاکٹری کی تعلیم بالکل حاصل نہیں کی طبیبوں اور ڈاکٹروں کے کسی مسلّمہ مسئلہ اور نظریہ پر مخالفانہ بحث کرنے لگے تو یہ اُس کو اس کا حقدار نہ سمجھیں گے۔ اور اس کی بات کو بکواس قرار دے کر اس کی طرف توجہ بھی نہیں کریں گے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص جس نے قانون کی تعلیم حاصل نہیں کی عدالت میں کسی وکیل اور بیرسٹر کے مقابلہ میں قانونی بحث کرنے پر اصرار کرے تو یہ اس کو جیل خانہ یا پاگل خانہ بھیجے جانے کا مستحق قرار دیں گے، لیکن دین کے اہم سے اہم اصولی اور بنیادی مسئلوں میں بھی علماءِ دین و شریعت اور ماہرین کتاب و سنت کی اجماعی تحقیق و رائے سے اختلاف کرنے اور اس کو غلط قرار دینے کے لیے یہ حضرات دینیات اور قرآن و حدیث کے علم کو بالکل ضروری نہیں سمجھتے۔

— پچھلے دنوں قادیانیوں سے متعلق پاکستان کی قومی اسمبلی نے علماء کے متفقہ فتوے اور اسکے مطابق عوام کے مطالبہ پر جو قانونی اور دستوری فیصلہ کیا، اُس کے خلاف ہندوستان کے متعدد ہندو اخبار نویسوں نے جو لکھا اور مسلمانوں میں سے میر قاسم وزیر اعلیٰ کشمیر اور انصار ہروانی جیسے

لوگوں نے جو بیانات شائع کیے وہ اسی قبیل سے اور اسی کی مثالیں ہیں۔ کاش ان کو توفیق ہو کہ وہ اپنے اس طرزِ عمل کی غیر معقولیت کو محسوس کریں۔

اس کے بعد ناظرین مولہ بالا خط کے مندرجات کے بارے میں ملاحظہ فرمائیں۔

مکتوب نگار نے اپنے اس دعوے کے ثبوت میں کہ جو کوئی توحید کا قائل ہو (اگرچہ قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا منکر ہو) وہ "مسلم" اور نجات اور جنت کا مستحق ہے — پہلی دلیل یہ دی ہے کہ — توحید ہی اسلام کی بنیاد ہے پس جس کو یہ بنیاد حاصل ہو وہ "مسلم" ہے۔

اس کا جواب جو مکتوب نگار جیسے لوگوں کے لیے سمجھنا آسان ہوگا یہ ہے کہ کسی چیز کی بنیاد وہ پوری چیز نہیں ہو جاتی، بلکہ وہ صرف بنیاد ہی ہوتی ہے۔ مثلاً مکان کی صرف بنیاد کو مکان نہیں کہا جا سکتا بلکہ وہ مکان کی صرف بنیاد ہے جب اس پر دیواریں کھڑی ہو جائیں گی اور چھت پڑ جائے گی تو اس کو مکان کہا جائے گا۔ اسی طرح سمجھنا چاہیئے کہ عقیدۂ توحید اگرچہ اسلام کی ایک اہم بنیاد ہے لیکن وہ پورا اسلام نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو احکام لے کر آئے اُن سب کے ماننے کا نام اسلام ہے، ہاں عقیدۂ توحید اور عقیدۂ رسالت اور عقیدۂ آخرت کو اس میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

اپنے دعوے کی تائید میں مکتوب نگار نے دوسری بات یہ لکھی ہے کہ قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے کہ "شرک کے سوا خدا جس گناہ کو چاہے معاف فرما دے گا" ظاہر ہے کہ اس سے ان کا اشارہ قرآن مجید کی اس آیت کی طرف ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاءُ۔ اس سے انھوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جو آدمی مشرک نہیں ہے وہ مسلم اور نجات کا مستحق ہے (اگرچہ وہ قرآن اور رسالت کا بھی منکر ہو)۔

مکتوب نگار کو اور جن دوسرے لوگوں کو بھی اس طرح کی غلط فہمی ہو اُن کو سوچنا چاہیے کہ اگر آیت کا یہی مطلب اور نتیجہ ہو کہ شرک کے سوا ہر گمراہی اور ہر قسم کا کفر بھی قابلِ معافی ہے تو لازم آئے گا کہ جو بدبخت خدا کا سرے سے منکر ہو وہ بھی نجات کا مستحق ہو کیونکہ وہ "مشرک" تو نہیں ہے۔ وہ تو شرک سے اتنا دور ہے کہ ایک خدا کا بھی قائل نہیں —

دراصل اس آیت میں "وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذَالِکَ لِمَنْ یَّشَاءُ" کا تعلق شرک سے نیچے کے درجہ کے اُن گناہوں سے ہے جن کو ہم کبیرہ اور صغیرہ کہتے ہیں۔ اللہ کا انکار، یا اُس کے رسولوں یا اُسکی کتابوں کا انکار یا قیامت و آخرت یا دوسرے ایمانیات کا انکار، کفر کی یہ ساری شکلیں اس فہرست میں داخل ہی نہیں ہیں۔ اور قرآن مجید میں پچاسوں جگہ ایسے منکروں کو انتہائی درجہ کا گمراہ اور کافر قرار دیا گیا ہے اور ان کو جہنم کے عذابِ ابدی کی وعید سنائی گئی ہے —— وہی سورۂ نساء جس میں یہ آیت "اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ الخ" واقع ہوئی ہے، اسی کی، اس آیت کے قریب ہی کی یہ دو آیتیں پڑھ لیجئے۔

"ومن یکفر باللہ وملٰئکتہ وکتبہ ورسلہ والیوم الاٰخر فقد ضلّ ضلالاً بعیداًo
(النساء آیت ۱۳۶)

اور جو منکر ہوا اللہ کا اور اُس کے فرشتوں کا اور اس کی کتابوں کا اور اس کے رسولوں کا اور یوم آخرت کا تو وہ بہت دور کی گمراہی میں جا پڑا۔

واضح رہے کہ اس سے چند ہی آیتیں پہلے مشرکین کے بارے میں بھی یہی فرمایا گیا ہے کہ جس نے شرک کیا وہ بہت دور کی گمراہی میں جا پڑا (ومن یشرک باللہ فقد ضلّ ضلالاً بعیداًo) ——
آگے دوسری آیت پڑھیئے!

اِنَّ الَّذِیْنَ یکفرون باللہ ورسلہ ویریدون ان یفرّقوا بین اللہ ورسلہ ویقولون نومن ببعض ونکفر ببعض ویریدون ان یتخذوا بین ذالک سبیلاًo اولئٰک ھم الکٰفرون حقّاً واعتدنا للکٰفرین عذاباً مھیناًo
(النساء آیت ۱۵۰ و ۱۵۱)

جو لوگ کفر کرتے ہیں اللہ کے ساتھ اور اسکے رسولوں کے ساتھ اور فرق کرتے ہیں اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان، اور یوں کہتے ہیں کہ ہم بعض کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے، اور (اپنے اس طرزِ عمل سے) چاہتے ہیں کہ ایک بیچ کا راستہ اپنے لیے نکال لیں، یہ سب لوگ قطعاً و یقیناً کافر ہیں اور ایسے کافروں کے لیے ہم نے سخت اہانت آمیز عذاب تیار کر رکھا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوا وَظَلَمُوا لَمْ یَکُنِ اللّٰہُ لِیَغْفِرَ لَھُمْ وَلَا لِیَھْدِیَھُمْ طَرِیْقًا ۝ اِلَّا طَرِیْقَ جَھَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا اَبَدًا	جن لوگوں نے کفر و انکار اور ظلم و عدوان کا رویہ اختیار کیا اللہ ہرگز اُن کو نہیں بخشے گا اور جہنم ہی کے راستہ کی طرف ان کو لے جائے گا جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ مبتلائے عذاب رہیں گے۔
(النساء آیت ۱۶۸ و ۱۶۹)	

یہ آیتیں اسی سورۂ نساء کی ہیں جس میں فرمایا گیا ہے "اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَاءُ" بلکہ اس آیت کے قریب ہی کی ہیں اور پورے قرآنِ مجید میں ایسی آیتیں یقیناً سیکڑوں کی تعداد میں ہیں جن میں اللہ کے رسولوں، اللہ کی کتابوں، اور یومِ آخرت وغیرہ ایمانیات کے منکروں کو کافر قرار دے کر دوزخ کے عذابِ ابدی کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔

مکتوب نگار نے اپنے خیال کی تائید کے لیے جس حدیث کا حوالہ دیا ہے (من قال لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ) اس کا لفظی ترجمہ بیشک یہ ہے کہ جس نے کہا لا الٰہ الا اللہ وہ جنت میں جائے گا۔ لیکن مکتوب نگار کو غور کرنا چاہیئے کہ اس لفظی ترجمہ کی بنیاد پر مسئلہ کا فیصلہ کیا جائے تو لازم ہوگا کہ جو مسخرہ دل سے خدا کو بالکل نہ مانے یا ایک خدا کے ساتھ بیسیوں خداؤں کا قائل ہو وہ اگر تمسخر کے طور پر بھی صرف زبان سے ایک دفعہ کہہ دے لا الٰہ الا اللہ تو وہ بھی مسلم اور جنتی ہو۔ کیونکہ حدیث میں قَالَ کا لفظ ہے اور اس کے لفظی معنی صرف کہنے اور زبان سے بول دینے کے ہیں۔ حالانکہ مکتوب نگار خود بھی ایسے آدمی کو مسلم اور جنتی قرار نہیں دے سکیں گے۔

اصل بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں لا الٰہ الا اللہ کہنے کا مطلب ہوتا تھا اسلام کو قبول کرکے اپنا دین بنالینا، جس طرح آج بھی اردو محاورہ میں "کلمہ پڑھنے" کا یہی مطلب سمجھا جاتا ہے۔ تو حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو مشرک یا کافر یہ کلمہ پڑھ کر اسلام کو قبول کرلے اور اپنا دین بنالے وہ جنت کا مستحق ہے۔

اس حدیث کی تشریح زیادہ تفصیل کے ساتھ "معارف الحدیث" جلد اول میں کی گئی ہے، اگر ذہن میں کوئی خلش باقی ہو تو اس کا بھی مطالعہ کرلیا جائے۔

یہاں ایک بات یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ توحید کے مختلف درجے ہیں، دُنیا کے اکثر مشرکین کسی حد تک، اور کسی درجے میں، توحید کے قائل ہوئے ہیں، مشرکین عرب بھی جو قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ توحید کے اول مخاطب تھے وہ بھی ایک حد تک توحید کے قائل اور دعویدار تھے۔ قرآن پاک میں ہے کہ وہ مانتے تھے کہ زمین و آسمان اور ساری کائنات کا خالق اور پروردگار بس ایک اللہ ہے اس میں کوئی اس کا شریک نہیں، اسی طرح چاند سورج اور ساری کائنات کو ایک خاص نظام کے ساتھ چلانے والا اکیلا اللہ ہی ہے۔ اس میں بھی اس کا کوئی شریک نہیں، جب کبھی دریائی سفر میں خطرہ کی شکل پیدا ہوتی تو وہ اپنے سب دیوتاؤں کو چھوڑ کر اور بھول کے مدد کے لیے صرف اللہ کو پکارتے تھے اور مانتے تھے کہ ایسے خطروں سے نجات دینا اور بچا لینا بس اللہ ہی کی قدرت میں ہے اس میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے — قرآن مجید میں ان کا یہ حال جابجا بیان کیا گیا ہے — لیکن اسی کے ساتھ چونکہ اُن میں کچھ شرک بھی تھا اس لیے ان کو مشرک قرار دیا گیا ہے — اسی طرح عیسائی تثلیث کا عقیدہ رکھنے کے باوجود توحید کے مدعی ہیں۔ "ایک تین" اور "تین ایک" اُن کا مشہور نظریہ ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کی توحید شرک آمیز توحید ہے۔ خالص اور کامل توحید وہ ہے جس کی تعلیم و ہدایت قرآن مجید دیتا ہے اور جس کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعوت دیتے تھے، جن غیر مسلموں کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ وہ موحد تھے، یا ہیں، اگر تحقیق کی جائے تو معلوم ہوگا کہ اُن کی توحید کم و بیش اسی طرح کی ہے جس طرح کی مشرکین عرب کی تھی یا جس طرح کی توحید کے نصاریٰ بھی دعویدار ہیں۔ وما یومن اکثرھم باللہ الا وھم مشرکون ہ۔

قرآن مجید کس توحید کی دعوت دیتا ہے اور اللہ کے ہاں کس توحید کا اعتبار ہے اس کی تفصیل راقم سطور کی کتاب "دین و شریعت" میں، اور "قرآن آپ سے کیا کہتا ہے" میں دیکھی جا سکتی ہے۔

مکتوب نگار نے یہ جو لکھا ہے کہ "متقدمین میں اکثر علماء نے صرف توحید کے ماننے والے کو مسلم لکھا ہے" — اس کے سوا کیا کہا جائے کہ جہالت کے ساتھ غلط ادعا کی جسارت کی یہ حیرت انگیز مثال ہے، سلف و خلف، متقدمین اور متاخرین میں ایک عالمِ دین کا نام بھی نہیں بتایا جا سکتا جس نے لکھا ہو کہ جو شخص صرف توحید کو مانے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور قرآن اور قیامت و آخرت اور دیگر ایمانیات کا منکر ہو وہ مسلم ہے۔

شاہ معین الدین احمد مرحوم :-

ہمارے اکثر ناظرین کو اخبارات یا دوسرے ذرائع سے ماہنامہ "معارف اعظم گڈھ" کے مدیر مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کے سانحۂ ارتحال کی اطلاع مل چکی ہوگی ـ واقعہ یہ ہے کہ مجھے تو تفصیل معلوم کر کے ان کے سفر آخرت پر رشک آیا۔

کسی بندہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ کیا ہو اور آخرت میں کیا ہونے والا ہو' اسکے بارے میں کوئی بھی یقینی اور قطعی طریقہ سے کچھ نہیں کہہ سکتا، لیکن اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمت و رأفت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ظاہری آثار و علامات دیکھ کر قیاس اور گمان کیا جا سکتا ہے

شاہ صاحب مرحوم حضرت مولانا سید سلیمان ندوی علیہ الرحمہ کے ساختہ پرداختہ اور اُن کے جانشین تھے۔ حضرت سید صاحبؒ پر اللہ تعالیٰ کا ایک خاص الخاص انعام آخر میں یہ بھی ہوا تھا کہ علم و تحقیق کی وہ ساری منزلیں طے کرنے کے بعد جو کسی کے لیے سرمایۂ امتیاز و افتخار ہو سکتی ہیں انھوں نے طریق و سلوک کے سلسلے میں حکیم الامّت حضرت تھانویؒ سے وابستہ ہو کر تعلق باللہ کی اس میراث سے بھی پورا حصہ پایا جو حضرت حکیم الامتؒ کو اُن کے مرشد حاجی امداد اللہ قدس سرہ کے واسطہ سے حاصل ہوئی تھی ـــــ شاہ معین الدین احمدؒ کے ساتھ بھی اللہ تعالیٰ کا معاملہ اسی طرح کا ہوا، علم و ادب میں وہ کمال حاصل ہو جانے کے بعد جو اُن کا حصہ تھا طریق و سلوک میں وہ شیخ وقت مخدومنا حضرت مولانا زکریا (شیخ الحدیث) مدظلہ سے بیعت ہوئے، اسکے بعد سے اُن کو حضرت شیخ کے ساتھ ویسا ہی تعلق ہو گیا جیسا کہ ہونا چاہیے اور حضرت شیخ کی بھی خاص نظر و عنایت ان کو حاصل ہو گئی۔ پچھلے ہی سال شاہ صاحب کو اللہ تعالیٰ نے دوسری بار حج و زیارت کی سعادت نصیب فرمائی، راقم سطور اور رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بھی اس حج میں شریک تھے۔ حج سے فراغت کے بعد ہم سب مدینۂ طیبہ حاضر ہوئے۔ حضرت شیخ الحدیث مدظلہٗ مدینۂ طیبہ ہی میں مقیم تھے۔ وہاں کے زمانۂ قیام میں حضرت کا مستقل معمول یہ رہتا ہو کہ روزہ نہ ہونے کی صورت میں بھی دن کو کھانا بالکل نہیں کھاتے۔ صرف رات کے کھانے میں شرکت فرماتے ہیں اسکی وجہ سے خاص مہمانوں کو بھی رات ہی کے کھانے پر مدعو فرماتے ہیں، حضرت نے شاہ معین الدین صاحب سے بھی فرمادیا کہ جبتک آپ کا قیام مدینۂ طیبہ میں ہے رات کا کھانا آپ میرے ہی ساتھ کھائیں۔ چنانچہ یہی معمول رہا ـــــ

ــــ شاہ صاحب پان کے بھی بہت عادی اور بڑے شوقین تھے اور معلوم ہو کہ حجاز مقدس میں پان ملنا آسان نہیں لیکن حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا جو خاص معاملہ ہے اسکی بنا پر اُن کے یہاں مکہ اور مدینہ میں بھی پان اسی طرح افراط سے رہتا ہے جیسے ہندوستان میں، چنانچہ کھانے کے بعد شاہ صاحب کو سہارنپور ہی کی طرح حضرت شیخ کے یہاں پان بھی ملتا اور حضرت فرمادیتے تھے کہ شاہ صاحب کل اس وقت تک کے لیے اپنی ڈبیہ بھی بھر لو۔ چنانچہ جتنے پان ڈبیہ میں آسکتے شاہ صاحب روزانہ بھر لیتے۔

اس عاجز کے نزدیک عمر کے بالکل آخری سال میں حج وزیارت کی یہ توفیق شاہ صاحب پر اللہ تعالیٰ کا خاص انعام واحسان تھا۔

حُسنِ اخلاق کی دولت اللہ تعالیٰ نے شاہ صاحب کو خاص طور سے عطا فرمائی تھی اُن سے تعلق رکھنے والوں کا یہ گویا متفقہ احساس ہے کہ ان کی زبان یا ان کے ہاتھ سے غالباً کسی کو کبھی کوئی ایذا نہ پہونچی ہوگی ــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے "المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده" یعنی حقیقی مسلم بندہ وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے اہلِ ایمان کو اذیت نہ پہونچے۔

پھر خاتمہ کیا قابلِ رشک ہوا، جمعہ کا مبارک دن تھا، بظاہر بالکل اچھے بھلے تھے، جمعہ کی نماز ادا کی عصر سے پہلے اپنے رفقاء کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ عصر کا وقت آجانے پر نماز کی تیاری کے لیے اٹھے ملازم سے وضو کے لیے پانی لانے کو کہا، وہ پانی لینے کے لیے گیا، شاہ صاحب انتظار میں کرسی پر بیٹھ گئے، ملازم پانی لے کر آیا تو دیکھا کہ شاہ صاحب نیچے زمین پر گر گئے ہیں، اُس نے دوسرے لوگوں کو بتایا لوگ دوڑے ہوئے آئے۔ زمین سے اُٹھایا، لیکن شاہ صاحب اپنے رفقاء کار کو اور اس پوری دُنیا کو الوداع کہہ کر ملاءِ اعلیٰ اور عالمِ آخرت کی طرف سفر کر چکے تھے۔ رہے نام اللہ کا! ــــ غالباً قلب پر دورہ پڑا اور فوراً ہی جاں بحق ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ــــ کیسا مبارک اور کس قدر قابلِ رشک ہے یہ سفرِ آخرت! ــ

شاہ صاحب کا اصل وطن ضلع بارہ بنکی کا مشہور قصبہ ردولی تھا، سلسلہ صابریہ چشتیہ کے مشہور جلیل القدر شیخ حضرت شاہ احمد عبد الحق ردولوی رحمۃ اللہ علیہ کے خانوادہ سے تھے۔ انتقال دار المصنفین اعظم گڈھ میں ہوا اور اگلے دن تدفین اپنے وطن ردولی میں ہوئی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ الابرار الصالحین ــ

درسِ قرآن — مولانا محمد منظور نعمانی

مرکز والی مسجد — ۱۵ دسمبر ۷۴-۱۹ء (یکشنبہ)

حساب کا وقت قریب آگیا ہے اور یہ لوگ غفلت میں مدہوش ہیں

رسول اللہ صلعم کے بارہ میں منکرینِ مکہ کی خرافات اور ان کا جواب

انبیاء علیہم السلام اور ان کے مخالفین کے بارہ میں سنۃ اللہ

حمد و صلوٰۃ، اعوذ اور بسم اللہ کے بعد

اقترب للناس حسابهم وهم في غفلة معرضون ○ ما يأتيهم من ذكر من ربهم محدث إلا استمعوه وهم يلعبون ○ لاهية قلوبهم وأسروا النجوى الذين ظلموا هل هذا إلا بشر مثلكم أفتأتون السحر وأنتم تبصرون ○ قل ربي يعلم القول في السماء والأرض وهو السميع العليم ○ بل قالوا أضغاث أحلام بل افتراه بل هو شاعر فليأتنا بآية كما أرسل الأولون ○ ما آمنت قبلهم من قرية أهلكناها أفهم يؤمنون ○ وما أرسلنا قبلك إلا رجالا نوحي إليهم فسألوا أهل الذكر إن كنتم لا تعلمون ○ وما جعلناهم جسدا

لَا يَأْكُلُونَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوا خَالِدِينَ ۝ ثُمَّ صَدَقْنَاهُمُ الْوَعْدَ فَأَنجَيْنَاهُمْ وَمَن نَّشَاءُ وَأَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِينَ ۝ لَقَدْ أَنزَلْنَا إِلَيْكُمْ كِتَابًا فِيهِ ذِكْرُكُمْ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝

سورۃ الانبیاء آیۃ ۱ تا ۱۰

لوگوں کے بالکل قریب آگیا ہے اُن کے حساب کا وقت اور وہ غفلت میں سرشار منہ موڑے ہوئے ہیں۔ اُن کے رب کی طرف سے جو تازہ نصیحت اُن کے پاس آتی ہے (بجائے اس کے کہ وہ اُس کو توجہ اور سنجیدگی سے سنیں) اس کو وہ کھیل تماشے ہی کے طور پر سنتے ہیں، اور اس وقت اُن کے دل بالکل ہی غافل ہوتے ہیں ـــــ اور اُن لوگوں نے جو ظالم اور مجرم ہیں چپکے چپکے سرگوشیاں کیں کہ یہ شخص (یعنی محمد صلے اللہ علیہ وسلم) اس کے سوا کیا ہے کہ تمھاری ہی طرح بس ایک آدمی ہے، پھر تم کیوں اس کی جادو والی بات سننے آتے ہو، جبکہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو ـــــ

پیغمبر نے فرمایا کہ میرا پروردگار جانتا ہے ہر بات (خواہ) آسمان میں ہو اور (خواہ) زمین میں، اور وہ خوب سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے، بلکہ ان ظالموں نے (یہ بھی) کہا کہ (یہ قرآن) اضغاث احلام (خواب و خیال کی باتیں) ہیں، نہیں بلکہ انھوں نے (یعنی پیغمبر نے) اس کو تراش لیا اور گڑھ لیا ہے، نہیں بلکہ وہ ایک شاعر آدمی ہیں (اور قرآن ان کا شاعرانہ کلام ہے) اگر یہ خدا کے رسول ہیں، تو انھیں چاہیے کہ ہمارے سامنے کوئی ایسی کھلی نشانی لائیں جیسی کھلی نشانیاں لے کر اگلے پیغمبر بھیجے گئے تھے۔ اُن سے پہلے ہم نے جن بستیوں کو ہلاک کیا اُن میں سے کوئی بھی (نشانیاں دیکھ کے) ایمان نہیں لایا تو کیا یہ لوگ ایمان لے آئیں گے۔

اور اے پیغمبر ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھیجے وہ سب آدمی ہی تھے جن پر ہماری وحی اتری تھی، تو (اے منکرو) اگر تم کو اس کا علم نہیں ہے تو اہلِ کتاب سے دریافت کر لو ـــــ اور ہم نے ان پیغمبروں کو ایسا جسم نہیں بنایا تھا کہ کھانا نہ کھاتے ہوں (کھانے پینے سے بے نیاز ہوں) اور وہ ہمیشہ زندہ رہنے والے (غیر فانی) نہیں تھے، ـــــ پھر ہم نے ان سے کیا ہوا وعدہ سچ کر دکھایا، اور (اس کا ظہور اس طرح ہوا کہ) ہم نے ان پیغمبروں کو اور (اُن کے ساتھ) جن کو ہم نے چاہا نجات دے دی، اور حد سے گزرنے والوں کو ہلاک کر ڈالا ـــــ ہم نے تمھاری طرف ایک کتاب نازل کر دی ہے

اس میں تمہارے لئے ذکر نصیحت اور موعظمت ہے، تو کیا تم نہیں سمجھتے (اور مانتے) نہیں۔

(سورۂ انبیار آیت ۱ سے ۱۰ تک)

(تفسیر و تشریح) یہ سورۂ انبیار شروع ہوئی، یہ بھی مکی سورتوں میں سے ہے، میں نے پہلے بھی بار بار کہا ہے کہ قرآن کریم کو صحیح طور سے سمجھنے میں بڑی مدد اس سے ملتی ہے کہ حالات کا وہ نقشہ اور وہ فضا سامنے ہو جس میں قرآن پاک نازل ہو رہا تھا ــــ میرا خیال ہے کہ صحابۂ کرام نے قرآن مجید کو جو سب سے بہتر سمجھا اور سب سے زیادہ اثر لیا تو اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ جس ماحول اور جس فضا میں وہ نازل ہو رہا تھا وہ انکی نگاہوں کے سامنے تھا ــــ اب سورۂ انبیار کی یہی ابتدائی آیتیں جن کی میں نے اس وقت تلاوت کی ہے اُن کا ترجمہ اور نفس مطلب تو کسی درجہ میں ہر عربی داں سمجھ لے گا۔ لیکن ان کا وزن اور ان کی تاثیر کو جبھی محسوس کیا جا سکے گا جب اس فضا اور اس ماحول کو جس میں یہ آیتیں نازل ہوئی تھیں سامنے رکھ لیا جائے ــــ ذرا اس صورت حال کا تصور کیجئے کہ مکہ کی عام آبادی خدا کو بالکل بھلائے ہوئے ہے خدا کے بجائے کچھ فرضی معبودوں سے اس نے رشتہ جوڑ لیا ہے وہ اس سے بھی بالکل بے فکر ہے کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا اور کیا پیش آئے گا، بلکہ اس کے سامنے مرنے کے بعد کا سوال ہی نہیں ہے۔ پھر اس شرک اور خدا فراموشی اور آخرت کی طرف سے بے فکری کی وجہ سے اس کی زندگی بڑی گمراہانہ اور غلیظ اور گندی ہے ــــ ایسی فضا میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوتے ہیں۔ آپؐ اُن کو خدا کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، شرک چھوڑ کر صرف ایک خدا کی عبادت کی دعوت دیتے ہیں، آخرت میں خدا کے سامنے پیشی اور اعمال کے محاسبہ کی، پھر جنت اور دوزخ کے عذاب و ثواب کی بات ان کو بتلاتے ہیں۔ اور انتہائی دردمندی اور دلسوزی سے خدا کا فرمان اُن کو سناتے ہیں لیکن وہ ان باتوں کو توجہ سے سنتے بھی نہیں۔ بس تفریح اور لہو و لعب میں مست ہیں اور کھل کر آپ کی دعوت کی مخالفت کرتے ہیں اور جو نیک دل انسان اُس سے متاثر ہوتے ہیں اُن کو بہکانے کی اور ستانے کی بھی طرح طرح سے کوششیں کرتے ہیں حضور کے بارے میں بالکل بے بنیاد خرافاتی باتیں مشہور کرتے ہیں اور پروپیگنڈے کی پوری طاقت سے ان کو پھیلاتے ہیں ــــ اس فضا میں اور حالات کے اس نقشہ میں یہ آیات نازل ہوتی ہیں ــــ ارشاد ہے

"اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ .... لَاهِيَةً قُلُوبُهُمْ" ــــ یعنی اُن لوگوں کے حساب کتاب کا وقت قریب آگیا ہے اور یہ غفلت کے نشہ میں مدہوش ہیں اور بجائے فکر اور توجہ

کرنے کے بالکل رُخ پھیرے ہوئے اور منھ موڑے ہوئے ہیں۔ اُن کے خدا کی طرف سے جو تازہ بتازہ نصیحت پیغمبر کے ذریعہ اُن کے پاس آتی ہے جو اُن کے لئے پیغام حیات ہے یہ اُس کو توجہ سے سُننے کے قابل نہیں سمجھتے بلکہ اس طرح اور اس حال میں سنتے ہیں کہ لہو و لعب میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں "إِلَّا اسْتَمَعُوهُ وَهُمْ يَلْعَبُونَ" ــــ آگے فرمایا "لَاهِيَةً قُلُوبُهُمْ" یعنی ان کے دل اور ان کی روحیں بالکل غافل ہوتی ہیں ــــ یہاں حساب سے مُراد بظاہر آخرت ہی کا حساب کتاب ہے جس کو قریب ہونا فرمایا گیا کہ جو واقعہ یقیناً ہونے والا اور پیش آنے والا ہے اُس کو قریب ہی سمجھنا چاہئے۔ اور جو گزر گیا اگرچہ کل ہی گزرا ہو وہ بہت دور ہو گیا کیونکہ اب وہ آنے والا اور ملنے والا نہیں ہے۔ ــــ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں کا مرنے کا اور اس دنیا سے آخرت کی طرف سفر کرنے کا وقت قریب ہی ہے اور مرکر آخرت کی پہلی منزل میں پہنچ جاتا ہے اور جو کچھ آخرت میں پیش آنے والا ہے اُس کا سلسلہ تبھی سے شروع ہو جاتا ہے۔ تو "اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ" کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ان منکروں کی موت کا وقت قریب ہی آگیا ہے، اور یہ اُس کی طرف سے بالکل غافل اور بدمست ہیں ــــ ایک مشہور حدیث ہے حضورؐ نے ارشاد فرمایا۔ ــــ "مَنْ مَاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهُ" یعنی جو شخص مرا اور اس دُنیا سے جس نے سفر کیا تو ایک طرح سے اس کے لئے قیامت آگئی۔ بہرحال حساب کے قریب ہونے سے موت کا قریب ہونا بھی مُراد ہو سکتا ہے۔

آگے فرمایا ہے: "وَأَسَرُّوا النَّجْوَى الَّذِينَ ظَلَمُوا .... وَأَنْتُمْ تُبْصِرُونَ" یعنی ان ظالم اور مجرم منکروں نے آپس میں چپکے چپکے سرگوشی کے طور پر کہا کہ یہ محمد (صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) جو خدا کے رسول اور پیغمبر ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور خدا کا فرمان بتا کر ایک کلام سُناتے ہیں، یہ تم جیسے ایک آدمی کے سوا کیا ہیں۔ [illegible] ہاں شاید ان کے پاس اور ان کے کلام میں جادو ہے جس کی وجہ سے لوگ پھنستے ہیں۔ تو کیا تم لوگ جان بوجھ کر اور دیکھتے بھالتے ان کے پاس جاؤ گے اور ان کے [illegible] میں پھنسو گے۔ (أَفَتَأْتُونَ السِّحْرَ وَأَنْتُمْ تُبْصِرُونَ ٥)

آگے ارشاد فرمایا "قَالَ رَبِّي يَعْلَمُ الْقَوْلَ فِي السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ" یعنی [illegible] پیغمبر نے کہا کہ آسمان میں یا زمین میں جو بات بھی کوئی کرے میرا پروردگار اس کو جانتا ہے۔

وہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم لوگ میرے بارے میں اور خدا کے کلام کے بارے میں جو کچھ کہتے ہو وہ سب خدا کے علم میں ہے جو سمیع وعلیم ہے اور مجرموں کو پکڑنے والا اور سزا دینے والا ہے تمہیں اس کی پکڑ سے ڈرنا چاہئے اور میں اس کو سمیع وعلیم جانتے ہوئے اور اس کی قدرت اور اس کے قہر وجلال پر یقین رکھتے ہوئے پیغمبری کا جھوٹا دعویٰ کیسے کر سکتا ہوں، ایسی مجرمانہ جسارت وہی کر سکتا ہے جو خدا کو جانتا نہ ہو۔ اور اس کی صفات پر ایمان نہ رکھتا ہو۔

آگے ارشاد ہے۔ بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ ..... كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ ۔

مطلب یہ ہے کہ مکہ کے منکروں اور مشرکوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اور آپ کے لائے ہوئے کلام الٰہی کے بارے میں ایک خیال تو یہ ظاہر کیا کہ یہ جادو کا دھندا ہے۔ لیکن پھر خود ہی انھیں خیال آیا کہ یہ بات چلنے والی نہیں ہے کیونکہ جو شخص بھی حضورؐ کو کچھ جانتا ہے وہ اس کے ماننے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا تو انھوں نے بات بدل کر کہا کہ جو کلام یہ سناتے ہیں وہ خدا کی وحی نہیں بلکہ "اضغاث احلام" یعنی خواب وخیال کی باتیں ہیں (جیسے مراقی لوگ آسمان زمین کی باتیں کیا کرتے ہیں) پھر کہا نہیں بلکہ انھوں نے یہ کلام خود بنایا اور گڑھا ہے، پھر کہا کہ نہیں بلکہ اصل بات یہ ہے کہ یہ شاعر ہیں اور جو کلام یہ سناتے ہیں دراصل وہ ان کے شاعرانہ تخیل کی بلند پروازی ہے۔

اس آیت سے ان منکروں کی ذہنیت کا حال معلوم ہو جاتا ہے اور یہ بات بھی کھل جاتی ہے کہ وہ جو کچھ بھی حضورؐ کے خلاف کہتے تھے وہ خود اس کو صحیح اور واقعہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ قوم کے سیدھے سادے عوام کو فریب دینے کے لئے مختلف طرح کی باتیں بناتے تھے۔ کبھی کہتے تھے کہ جادوگر ہے۔ کبھی کہتے تھے کہ جو باتیں یہ کرتے ہیں وہ "اضغاث احلام" ہیں یعنی پراگندہ خواب پریشاں۔ کبھی کہتے تھے کہ یہ جھوٹے ہیں دانستہ خدا پر افترا کرتے ہیں اور یہ کلام جس کو یہ کلام اللہ کہتے ہیں خود ان کا طبعزاد اور گڑھا ہوا ہے کبھی کہتے تھے کہ یہ شاعر ہیں —— بعض مفسرین نے یہ مطلب لیا ہے کہ یہ مختلف خیالات ظاہر کرنے والے مختلف لوگ تھے۔

قرآن پاک میں مکہ کے منکروں کی ان سب باتوں کو جا بجا نقل کیا گیا ہے اور رد فرمایا گیا ہے یہاں نہ صرف نقل کر دیا گیا ہے۔ لیکن اس طرح نقل کیا گیا ہے، جس سے یہ بات خود ہی ظاہر ہو جاتی ہے کہ جو لوگ یہ باتیں کرتے تھے وہ خود بھی ان کو صحیح نہیں سمجھتے تھے، ایک بات کہتے تھے اور پھر بدل کر

دوسری بات کہہ دیتے تھے۔

آگے اُنہیں کی یہ بات نقل کی گئی ہے: فَلْيَأْتِنَا بِآيَةٍ كَمَا أُرْسِلَ الْأَوَّلُونَ ٥ یعنی مکہ کے منکروں نے حضورؐ کے متعلق مختلف قسم کی اور بھانت بھانت کی یہ باتیں کیں اور اُس کے بعد یہ بھی کہا کہ اگر یہ خدا کے رسول ہیں تو ایسی نشانیاں اور ایسے کھُلے معجزے ہمیں دکھائیں جیسے معجزے اگلے پیغمبر لائے تھے۔ غالباً ان سے ان کی مراد حضرت موسیٰؑ و حضرت عیسیٰؑ وغیرہ اگلے نبیوں کے مشہور معجزے ہوں گے جیسا کہ حضرت موسیٰؑ کے عصا کا سانپ بن جانا اور حضرت عیسیٰؑ کے ہاتھ سے مٹی سے بنائے ہوئے پرندے کا زندہ پرندے کی طرح اُڑ جانا اور کوڑھیوں اور مادرزاد اندھوں کا اچھا ہو جانا وغیرہ وغیرہ ۔۔۔۔۔ ان مکہ والوں کو اگلے انبیاء علیہم السّلام کے ان معجزوں کا علم غالباً اُن روایات سے ہوا ہوگا جو عام طور سے ان لوگوں کی طرح مشہور تھیں اور خود قرآن مجید میں بھی جا بجا ان کا بیان کیا گیا ہے۔ تو یہ بھی ممکن ہے کہ مکہ کے ان کافروں نے قرآن ہی کے بیان کی بنیاد پر یہ بات کہی ہو کہ اگر تم سچے پیغمبر ہو تو ایسے ہی کھلے معجزے تم بھی دکھاؤ جیسے معجزے اگلے پیغمبروں کے تم خود پڑھ پڑھ کر سناتے ہو ۔۔۔۔۔

یہ مضمون بھی قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر بیان کیا گیا ہے کہ مکہ کے کفار و مشرکین آپؐ سے ایسی نشانیاں اور ایسے معجزے دکھانے کا مطالبہ کرتے تھے، اور اس کے جواب میں فرمایا گیا ہے کہ معجزے اور نشانیاں ظاہر کرنا پیغمبر کے اختیار میں نہیں ہوتا بلکہ اللہ کے اختیار میں ہے ۔۔۔ (اِنَّمَا الْآيَاتُ عِنْدَ اللّٰهِ) وہ جب کسی پیغمبر کے ہاتھ پر کسی معجزے کا ظہور مناسب سمجھتا ہے تو اس کے ہاتھ پر ظاہر کر دیتا ہے۔ اس لئے پیغمبر سے معجزہ کا مطالبہ کرنا جہالت کی بات ہے۔ اور اسی کے ساتھ قرآن میں بار بار یہ فرمایا گیا ہے کہ پہلے جن لوگوں کے مطالبہ پر معجزے دکھائے گئے تھے، وہ ان کو دیکھنے کے بعد بھی ایمان نہیں لائے اور پھر وہ ہلاک کر دیئے گئے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ جب کسی پیغمبر کے ہاتھ پر ایسے کھلے معجزے ظاہر کر دیئے جائیں جن کا مطالبہ خود قوم نے کیا ہو اور اس طرح اللہ کی حجت تمام ہو جائے اور پھر بھی وہ ایمان نہ لائیں تو وہ قوم ہلاک کر دی جاتی ہے۔ چنانچہ کفارِ مکہ کے اس مطالبے کے جواب میں کہ یہ پیغمبر (محمد صلّے اللہ علیہ وسلّم) ایسے معجزے دکھائیں جیسے اگلے پیغمبروں نے دکھائے تھے (فَلْيَأْتِنَا كَمَا أُرْسِلَ الْأَوَّلُونَ ٥)

یہاں فرمایا گیا ہے "مَا آمَنَتْ مِنْ قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا أَفَهُمْ يُؤْمِنُونَ" مطلب یہ ہے کہ پہلے زمانوں میں جن لوگوں نے پیغمبروں سے ایسے معجزے طلب کئے تھے وہ ان معجزوں کے ظہور کے بعد بھی ایمان نہیں لائے پھر وہ خداوندی قانون کے مطابق آسمانی عذاب سے ہلاک کردیئے گئے۔ اسی طرح یہ مکہ کے منکرین بھی ایمان نہیں لائیں گے۔ پھر یہ بھی ہلاکت اور عذاب کے مستحق ہوجائینگے۔

واقعہ یہی ہے کہ حضورؐ کے زمانے کے یہ کفار و مشرکین جو خاص خاص معجزوں کا مطالبہ کرتے تھے ان کی نیت یہ ہرگز نہیں ہوتی تھی کہ اگر یہ معجزات ظاہر ہوجائیں تو ہم ایمان لے آئیں گے وہ بدبخت تو صرف شرارت سے یہ باتیں کرتے تھے، اگر وہ معجزے اُن کو دکھا دیئے جاتے تو وہ یہی کہتے کہ ہم تو پہلے ہی کہتے تھے کہ تم جادوگر ہو۔ یہ معجزے تم نے جادو کے زور سے دکھائے ہیں۔ اسی لئے ارشاد فرمایا گیا " أَفَهُمْ يُؤْمِنُونَ " یعنی کیا یہ بدبخت اور شریر النفس معجزے دیکھ کر ایمان لے آئیں گے، ہرگز نہیں، یہ تو نہ ماننے کا فیصلہ کئے ہوئے ہیں۔

• اوپر کی آیتوں میں ان منکرین کی ایک بات یہ بھی نقل کی گئی تھی کہ اُنھوں نے حضورؐ کے بارے میں کہا کہ یہ کیسے رسول ہوسکتے ہیں یہ تو ہماری ہی طرح کے ایک بشر ہیں (هَلْ هَٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ) ان کی یہ بات قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر نقل کی گئی ہے اور اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ انسانوں کی ہدایت اور اصلاح کے لئے انسان ہی کو پیغمبر بناکر بھیجا جائے۔ انسان ہی انسان کی بیماریوں کو اس کے مزاج اور جذبات اور رُجحانات کو سمجھ سکتا ہے۔ اسی واسطے انسانوں کی اس دُنیا میں ہمیشہ انسان ہی پیغمبر بناکر بھیجے گئے۔ حضرت نوحؑ، حضرت ہودؑ، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ و عیسیٰؑ یہ سب پیغمبر انسان تھے۔ اسی سلسلے میں ایک جگہ یہ بھی فرمایا گیا ہے:—

"لَوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلَائِكَةٌ يَمْشُونَ مُطْمَئِنِّينَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِم مِّنَ السَّمَاءِ مَلَكًا رَّسُولًا" یعنی اگر اس دُنیا میں انسانوں کے بجائے فرشتے آباد ہوتے اور اُن میں کوئی رسول بھیجا جاتا تو فرشتہ ہی کو رسول بناکر بھیجا جاتا ——— ان لوگوں کی بنیادی غلطی یہ تھی کہ وہ انسان کو گھٹیا درجہ کی مخلوق سمجھتے تھے۔ حالانکہ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ مخلوقات میں صرف وہی اللہ تعالیٰ کی صفات کا ایک درجہ میں کامل نمونہ ہے۔ جیسا کہ میں پہلے بھی ذکر کرچکا ہوں، آدم علیہ السّلام کی تخلیق کے وقت فرشتوں کے لئے سجدے کا جو حکم ہوا تھا وہ دراصل اسی حقیقت کا اظہار تھا۔ بہرحال

انسان اگر انسان ہی ہو اور نفس کی شرارت سے شیطان یا حیوان نہ بن جائے تو وہی اللہ تعالیٰ کی سب سے افضل و اشرف مخلوق ہے لیکن جاہلوں نے اس حقیقت کو کبھی نہیں سمجھا۔

یہ مکہ والے اسی سلسلے میں ایک بات یہ بھی کہتے تھے "مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ"۔ یعنی یہ کیسے رسول ہیں جو ہماری طرح کھاتے پیتے ہیں اور اپنی ضروریات کے لئے اور خرید و فروخت کے لئے بازار بھی جاتے ہیں۔ ان جاہلوں کا خیال تھا کہ پیغمبر ایسی مخلوق ہونا چاہیے جسے کھانے پینے کی اور اپنی ضروریات کے لئے بازار اور کسی دوکان پر جانے کی ضرورت نہ ہو۔ یہاں سورہ انبیاء میں اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا "وَمَا اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ"۔ یعنی اے ہمارے پیغمبر ہم نے تم سے پہلے جو رسول اور نبی قوموں کی ہدایت کے لئے بھیجے وہ سب آدمی ہی تھے، اُن کو ہم وحی کے ذریعہ ہدایت سے متعلق امور بتاتے تھے ــــ آگے فرمایا اے مکہ والو! اگر تم اس حقیقت سے واقف نہیں ہو تو "اھل الذکر" یعنی اہلِ کتاب سے معلوم کر لو وہ تم کو بتا دیں گے کہ پہلے آنے والے اللہ کے سارے پیغمبر آدمی ہی تھے ــــ آگے فرمایا "وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ"۔ یعنی پہلے بھیجے جانے والے پیغمبر کوئی ایسی مخلوق نہیں تھے جو کھاتے پیتے نہ ہوں اور ایسے بھی نہ تھے جن کو کبھی موت نہ آئے اور وہ ہمیشہ دنیا میں زندہ رہیں۔

آگے ارشاد فرمایا: "ثُمَّ صَدَقْنٰهُمُ الْوَعْدَ فَاَنْجَيْنٰهُمْ وَمَنْ نَّشَآءُ وَاَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِيْنَ"۔ یعنی اگلے پیغمبروں کے ساتھ ہمارا معاملہ یہ رہا ہے کہ اُن کی نصرت اور ان کے مخالفین کی ہلاکت یا مغلوبیت کا جو وعدہ ان سے کیا تھا وہ ہم نے پورا کر دکھایا اور ان کے منکرین جو شرارت اور گستاخی میں حد سے بڑھے ہوئے تھے اُن کو ہم نے ہلاک کر ڈالا اور ان پیغمبروں کو اور اُن پر ایمان لانے والوں کو ہم نے نجات دی۔

یہ مکے کے منکروں کو بہت کھلی وارننگ اور آگاہی دی گئی کہ اگر تم اپنی مجرمانہ حرکتوں اور شرارتوں سے باز نہ آئے تو پھر یہی ہوگا کہ ہم اپنے پیغمبر اور اُن کے ساتھیوں کی اپنے غیبی لشکروں سے مدد فرمائیں گے اور تم اگلے مجرمین کی طرح ہلاک و برباد کر دیئے جاؤ گے ــــ اور یہی ہوا کہ ان میں سے جو لوگ کفر اور شرارت سے باز نہ آئے وہ ختم کر دیئے گئے جیسے ابوجہل اور ابولہب وغیرہ اور جو بچے وہ سب

اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ یہاں تک کہ ابوسفیانؓ اور عکرمہؓ ابن ابی جہل بھی ایمان لے آئے اور پھر دین کے مخلص خادموں میں ہو گئے۔

اس سب کے بعد آخر میں مکہ کے انھیں منکروں کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا گیا ہے "لَقَدْ اَنْزَلْنَا اِلَیْکُمْ کِتَابًا فِیْهِ ذِکْرُکُمْ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝" یعنی ہم نے تمھارے لئے ایک کتاب نازل کر دی ہے جس میں تمھارے لئے پوری نصیحت اور ہدایت کا پورا سامان ہے، تو کیا تم سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے اور ہماری دی ہوئی عقل و فہم سے کام نہیں لیتے، (اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ) ظاہر ہے کہ یہ استفہام اور استفسار نہیں ہے بلکہ استفہام کی شکل میں تنبیہ ہے جس طرح ہم کسی ایسے آدمی سے جو توجہ سے بات نہیں سنتا اور نصیحت پر عمل نہیں کرتا کبھی کہتے ہیں کہ "کیا تم سنتے نہیں، کیا تم سمجھتے نہیں"۔

—— بعض مفسرین نے فیہ ذکرکم کا یہ مطلب بھی لیا ہے کہ ہم نے تمھاری طرف اور تمھارے لئے کتاب نازل کی ہے یعنی قرآن مجید نازل کیا ہے جس میں تمھارا ذکر ہے اور اس کے ذریعہ تمھاری قوم کی یاد زندہ رہے گی —— تمھیں اس نعمت کی قدر کرنی چاہیئے۔ اور سمجھنا چاہیئے کہ تمھاری قوم پر یہ اللہ تعالیٰ کا کتنا بڑا انعام ہے —— واقعہ یہ ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث نہ ہوتے اور قرآن مجید عربوں میں نازل نہ ہوتا تو ہرگز دنیا میں اور تاریخ میں عربوں کو وہ مقام نہ ملتا جو حضورؐ کے اور قرآن کے طفیل میں اُن کو ملا۔

بقیہ صفحہ ۲۹

شغل آپ کے واسطے بجز تلاوت قرآن شریف واذکار ماثورہ ونوافل کوئی ضرورت نہیں۔ یہی موجب ترقی اور باعث ازدیاد یقین ہو دیں گے —— تعلیم فرزندان کو تو ال و محمد یسین خاں جو مشورہ ہے تو بندہ کے نزدیک جب تم نے یہ کام اختیار کر رکھا ہے وہ بھی آجا دیں کیا حرج ہے۔ اس باب میں کیا ضرورت مشورہ ہے۔

.... آپکے ضبط اوقات بھی عمدہ طرح پر ہیں۔ وہ خراب تین تونٹیوں کے جاری ہونیکا، وہ آپکے فیضان ہیں کہ جاری ہوویں گے۔ دوام آگاہی کہ جس میں غفلت نہ ہو، نسبت قلبی سے تعلق رکھتا ہے۔ دوام آگاہی مبارک ہو۔ آپکے سب خطوط بطور حرز جان اپنے پاس رکھتا ہوں ؎

در گور برم از سر گیسوئے تو تارے   تا سایہ کند بر سر من روز قیامت[1]

زیارت فخر عالم علیہ السلام اختیاری بات نہیں۔ درود شریف کی کثرت و محبت موجب اس کا ہے —— فی انوار قدسیہ زبان دور از مقصد ہیں .... (مورخہ ۱۴ر جمادی الثانیہ ۱۳۰۱ھ روز جمعہ)

[1] میں تیرے گیسو سے ایک تار قبر میں اپنے ساتھ لیجاؤں گا تاکہ بروز قیامت وہ میرے سر پر سایہ فگن ہو۔

جواہر پارے

(اقتباسات "مکاتیبِ رشیدیہ")

——— تلخیص از مولانا نسیم احمد فریدی امروہوی

قطب الوقت حضرت مولانا رشید احمد محدث گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ علوم ظاہری و باطنی کے امام اور رموزِ شریعت و طریقت کے ماہر و راز داں تھے۔ ایک طرف درسِ حدیث کی مسند پر فائز رہ کر ہزارہا تشنگانِ علوم دینیہ کو مستفیض فرمایا، دوسری طرف تزکیۂ قلب اور تہذیب باطن کا سلسلہ قائم فرمایا جس سے کثیر التعداد اشخاص نے استفادہ کیا۔ تفسیر و حدیث، علم و حکمت، فقہ و کلام اور احسان و تصوف میں آپ کا جو مقامِ عالی تھا اس کو کما حقہٗ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کی تصانیف، فتاویٰ اور مکاتیب طالبانِ علوم دینیہ کیلئے مشعلِ راہ ہیں۔ آپ کے بعد آپ کے خلفاء اور تلامذہ نے کتاب و سنت کی روشنی میں حکمتِ ولی اللّٰہی اور فقرِ امداد اللّٰہی کو دنیا کے گوشے گوشے تک پہونچایا۔ سچ یہ ہے کہ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے فیوض و برکات اس کثرت سے ہیں کہ رہتی دنیا تک طالبینِ حق ان کا اقرار و اعتراف کریں گے۔

"مکاتیبِ رشیدیہ" حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات کا ایک مختصر مجموعہ ہے جو مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی مرحوم نے شائع کیا ہے۔ کوشش کی جائے تو ابھی حضرت والا کے اتنے اور مکاتیب ہندوستان میں دستیاب ہو سکتے ہیں جن سے ایک مجموعہ اور تیار ہو سکے ——
اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے مولانا میرٹھی مرحوم کو کہ انھوں نے مکتوباتِ رشیدیہ کا ایک مجموعہ تلاش و جستجو سے مرتب کر کے شائع کیا۔ میں نے مناسب سمجھا کہ اس مجموعہ میں احسان و تصوف

اخلاق و معاملات، ذکر و فکر اور پند و نصائح سے متعلق جو مفید مضامین موجود ہیں ان کو بطور تلخیص و اقتباس کے شائع کرا دیا جائے تاکہ اس مجموعہ کے ضروری اقتباسات ہی سے ان حضرات کو آگاہی ہو جائے جو پورے مجموعہ کو نہیں پڑھ سکے۔ یہ کام چند اقساط میں ختم ہوگا۔ سب سے آخر میں حضرت مولانا حافظ عبدالرحمٰن صاحب نامی صدیقی امروہوی کے نام آئے ہوئے مکتوبات کا بھی اقتباس پیش کیا جائے گا۔ وہ خطوط مطبوعہ نسخے میں نہیں ہیں۔ اگر ضرورت سمجھی تو فٹ نوٹ میں بعض شخصیتوں کا تعارف بھی کرایا جائے گا۔

آخر میں یہ لکھنا ضروری ہے کہ مکاتیب رشیدیہ میں اکثر و بیشتر خطوط وہ ہیں جن میں سنہ و تاریخ نہیں۔ جن جن خطوط میں سنہ و تاریخ پڑی ہوئی ہے ان کے اقتباس کے ساتھ ساتھ سنہ و تاریخ بھی لکھ دیا جائے گا ـــــ مکتوبات کے اقتباس میں کہیں کہیں جزوی ترمیم مطلب کو واضح کرنے کے لئے اس طرح کی گئی ہے کہ مفہوم میں کوئی فرق نہ آئے۔ بعض جگہ کاتب کی غلطی کا شبہ تھا، وہاں بھی کچھ ترمیم کی گئی ہے۔ کہیں کہیں بین القوسین مشکل الفاظ کی وضاحت کر دی گئی ہے ـــــ اللہ تعالیٰ ناظرین کو اس سے نفع پہونچائے اور قبول فرمائے۔

نسیم احمد فریدی امروہی

مولوی صدیق احمد صاحب[1]۔ السلام علیکم۔ آپ کا خط آیا حال معلوم ہو کر بہت بہت فرحت ہوئی حق تعالیٰ ترقی فرما دے .... اب ذکر زبانی میں بھی احاطۂ ذاتی کا لحاظ کرو اور پاس انفاس میں بھی خروج و دخولِ نفَس ذکری میں احاطۂ ذاتی کا تصوّر کرو۔ غرض کام سے ہے جہاں ہو سکے بفراغت کرنا چاہئے، خواہ مخواہ گنگوہ آنے کی ضرورت نہیں۔ یہاں وہاں سب یکساں ہے، خود جیسا مناسب جانو ویسا کرنا۔ یہاں پھر وطن کے قریب میں شاید تشادیش پیش آجاویں۔ اور ذکر میں کچھ خصوصیت

---

[1] مولانا صدیق احمد انبیٹھوی ـ آپ حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری کے چچا زاد بھائی اور ہم وطن تھے حفظ قرآن اور ابتدائی دینی تعلیم حضرت مولانا خلیل احمد کے ساتھ حاصل کی۔ اور بیعت و تحصیلِ سلوک میں بھی حضرت مولانا موصوف کے ساتھ رہے۔ آپ صاحبِ احوالِ بلند تھے۔ قطبِ ربانی حضرت محدث گنگوہی کے خلفاء میں انوار و تجلیات اور واردات قلبیہ کے ظہور و ورود میں ایک امتیازی شان رکھتے تھے۔ حضرت گنگوہی نے جب آپ کو مجاز کیا تو

(باقی اگلے صفحہ پر)

رات ہی کی نہیں دن کو بھی کرو۔ باقی یہ جو اوّل کیفیت تھی پھر وہ نہ ہوئی تو اس کی یہ وجہ ہے کہ اوّلاً جو حال وارد ہوتا ہے تو وہ بہت زور سے آتا ہے۔ قلب نا آشنا ہوتا ہے، کیفیت زیادہ ہوتی ہے۔ پھر اس حال سے ایک گونہ مناسبت ہو جاتی ہے تو وہ زور شور نہیں معلوم ہوتا کہ اوّل کورے ظروفِ گلی (یعنی مٹی کے پیالوں) میں پانی ڈالیں تو کیسا شور ہوتا ہے۔ دوبارہ میں حالاں کہ پانی کا اثر زیادہ ہوتا ہے مگر وہ جوش نہیں ہوتا۔ ایسا ہی حال قلب و جسدِ انسان کا ہے ——
اور غرض کیفیت سے نہیں، مقصد سکون و ربطِ قلب باللہ ہے۔ حالات جو اولیاء پر ہوئے وجد و حال کے اُس کا بیسواں حصہ بھی صحابہؓ سے منقول نہیں۔ غرض نسبت و سکون و طمانیت باللہ تعالیٰ اصل ہے۔ اور کیفیت لازم و دائمی نہیں۔ یہ حال ہے مقام نہیں۔ سو اس کا افسوس مت کرو۔۔۔۔
ذکر میں رعایت دماغ و قوت کی ضرور رکھنا۔ لذت میں گر استقامت کرنا کہ اصل کام ہے، رہ جاؤ۔ تھوڑا تھوڑا بڑھتا ہے، جلدی کا کام نہیں۔ ایک دو روز کی بات نہیں ساری عمر کا کام ہے۔ "ساعۃ فساعۃ" قولِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ رات دن یکساں حال نہیں ہوتا۔ اس امر کو بہت یاد رکھنا
—— دوسرا خواب بھی صالح اور مبارک ہے۔۔۔۔۔۔۔

(۱۴ صفر سنہ ۱۳۰۱ھ)

۔۔۔۔۔۔ بارش اور پانی کا دیکھنا عمدہ بات ہے اور آثار بھی عمدہ ہیں۔ حق تعالیٰ باوجود

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) [illegible] حضرت حاجی صاحب قدس سرہ نے آپ کو عطا فرمائی تھی اور جس کو بحفاظت رکھا تھا، مولانا صدیق احمد صاحب [illegible] یہ [illegible] آپ کی سب سے بڑی خصوصیت تھی۔

آپ کے بیش بہا مکاتیب [illegible] اور [illegible] کے انبار میں حضرتؒ کے پاس آتے تھے ان کو حضرتؒ جمع فرماتے جاتے تھے [illegible] نہیں، حضرتؒ نے ظاہری بینائی جانے پر وہ مجموعہ آپ کے پاس روانہ کر دیا۔ [illegible] حضرت امام ربانی کے مکاتیب رشیدیہ [illegible] ہو گئے ہیں۔ [illegible] مولانا کے پاس موجود تھا۔ ایک [illegible] میں مولانا مدین احمد صاحب مدرسہ فتح پوری دہلی کے [illegible] آپ [illegible] وفات معلوم نہ ہو سکا۔

(ماخوذ از تذکرۃ الرشید جلد دوم صفحہ ۱۵۶)

ورارالورا کے قریب عبد کے ہے۔ "وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ"۔

...... برادرا! صاحبِ حال کو وحدت خوش آتی ہے۔ کثرت و تعلق سے گھبراتا ہے۔ اور جو مخل اس کے مقصد کا ہے وہ قید سے زیادہ بلا ہے۔ حق تعالیٰ آپ کو سب بلا سے محفوظ رکھے اور اپنے ذکر میں مشغول رکھے۔ باقی جو کچھ حالات لکھے ہیں وہ سب قابلِ شکر ہیں ـــــ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ ـــــ .... اپنے آپ کو ذات سے وابستہ رکھو۔ پہلے بھی لکھ چکا ہوں۔ یہ سب عنایات حق تعالیٰ کی ہیں۔ آپ کی دعا سے اگر مجھ کو بھی حاصل ہو جائیں تو کیا عجب ہے۔ فقط

(۸ر صفر ۱۳۰۱ھ)

مولوی صدیق احمد صاحب۔ السلام علیکم۔ آج سہ شنبہ کو خط آیا اور ایک خط کل دوشنبہ کو آیا تھا جواب کی دونوں میں حاجت نہیں۔ یہ تمہارے حالات صادق ہیں۔ حق تعالیٰ اصل مقصد نصیب فرمائے۔ آمین۔ اور یہ حسنِ ظن تمہارا ہے کہ مجھ کو بھی ذرہ اپنے غیب کا عطا فرماوے۔ ذکرِ جہر کی اب کچھ حاجت نہیں، ذکر اصل میں تذکرِ قلب ہے، سو جب ذکرِ قلبی حاصل ہوا، اب زبان کی کچھ ضرورت نہیں۔ خصوصاً جب ذکرِ جہر سے دل گھبراوے اس وقت ذکرِ زبانی کا ترک کرنا ضروری ہے۔ جس ذکر میں دل کو سرور ہو اس کو کرنا چاہیئے۔ مثلاً تسبیح تہلیل تحمید میں یا تفکر میں یا شکر میں یا جس پیرایہ میں حضور حاصل ہو اس پر ہی قناعت کرو۔ اصل سب کا حضور ہے اور بس۔ اور یہ نعمت دفعتاً حاصل ہو جانا محض احسان حق تعالیٰ کا ہے۔ اس ناکارہ کو ساری عمر گذری کچھ بھی نصیب نہ ہوا۔ چاہ (کنوئیں) سے پانی چلتا ہے اور بذریعہ نالی (نل) کے زراعت میں جاتا ہے۔ نل نالی کو کچھ حظ (حصہ) نہیں، محض واسطہ ہے۔ علیٰ ہذا یہ ناکس واسطہ واقع ہوا، گو خود خشک لب و محروم ہے۔ اب آپ سے التجا دعا کرتا ہوں کہ ہمت و دعا سے مجھ کو بھی یاد رکھیں۔

شیخ عبد القدوس قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ "اصل یہ ہے کہ شیخ مرید کو لے جاتا ہے اور فضل یہ ہے کہ مرید شیخ کو لے جاوے"۔ پدرِ مفلس کو اگرچہ زکوٰۃ (دینا) درست نہیں مگر صدقہ نافلہ جائز ہے۔ علیٰ ہذا اہل ایمان دانش تو مرید سے شیخ کو ملنا محال ہے مگر ترقی حالات ملنا عجب نہیں، سو اس ناکس

کو اس عمر میں سوائے اصل نسبتِ سلسلہ کے کچھ نہیں ملا۔ انوار وتجلیات سے کچھ نہیں پایا، کیا تعجب ہے کہ آپ کی دعا کی برکت سے کچھ مل جاوے ــــــــ الحاصل تم اپنے کام میں مصروف رہو اور امورِ جدیدہ سے اطلاع کرتے رہو۔ اس وقت تک کوئی امر مندشہ کا پیش نہیں آیا، آئندہ کو بھی فضلِ حق تعالیٰ درکار ہے۔ جس کی نسبت میں ــ انوار کا مشاہدہ ہوتا ہے تو وہاں لاریب (بلاشک) اندیشۂ دخلِ ابلیس بہت ہوتا ہے۔ لہٰذا ہر حال ہر امر میں اتباعِ شریعت کا خیال رکھنا! کوئی حال خلافِ شرع کے معتبر نہیں ہوتا۔ یہ سب تمہارے واقعات عمدہ ہیں۔ الحمد للہ علیٰ ذالک ــــــ آخر میں بعض ایسے وقائع پیش آتے ہیں کہ سالک حیران ہوتا ہے۔ البتہ ایسے وقت واقف رہبر کی ضرورت پڑتی ہے۔ سو اگرچہ قطعِ طریق نصیب اس مُدبر (بدبخت) کے (کو) نہیں ہوا مگر ہاں صحبتِ مشائخ سے حصہ لیا ہے۔ طبیبِ نادان اگرچہ خود بیمار ہو مگر دوسرے کو نسخہ کچھ نہ کچھ بتلا دیتا ہے۔ فقط والسلام

(۱۰ ر صفر ۱۳۰۱ھ)

مکرمی عزیزی مولوی صدیق احمد صاحب دفیوضہم السلام علیکم۔ آپ کے خطوط متواتر پہونچے۔ حالاتِ حائیہ دیکھے۔ تعمیل تبیعت کردی گئی اور جو جو معاملات میری فہم نارسا کے ہیں ان کی تصدیق بھی کرتا ہوں۔ اور جو امر اپنی رسائی سے خارج ہیں ان میں معذور رہوں۔ سالک کو بجز لحاظ ذات بحت کے اور افراد اپنے کے بجز ذات میں اور تجرید ذات عن جمیع الشیونات کے (اور زائد باتوں سے) اجتناب لازم ہے۔ اور شغل فرائض و سُنن رواتب کے بعد اذکار مسنونہ کرتا رہے۔ باقی تحریر مذکورہ بالا میں رہے۔ ذاتِ پاک حق تعالیٰ کی احاطۂ ادراک سے خارج ہے۔ بجز ہستی محض و وجودِ مطلق کے جو کچھ مُدرَک ہے وہ سب خیال سالک ہے نہ ذاتِ حق تعالیٰ ہے

دوربینانِ بارگاہِ الست ــ غیر ازیں پے نہ بُردہ اند کہ ہست[1]

بس سوائے اس قدر کہ ھُوَ مَوْجُوْدٌ مَوْصُوْفٌ بِالصِّفَاتِ المعہودہ، سب مُدرکات کی نفی کرنا چاہیے لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ الآیۃ ــــــ بس یہ امر کلی ملحوظ رہے۔ بعد اس کے

---

[1] (ترجمہ) بارگاہِ خداوندی کو دور سے دیکھنے والے بس اس سے زیادہ سراغ نہیں لگا سکے ہیں کہ وہ ہستی مطلق موجود ہے۔

سننا چاہیے کہ حق تعالیٰ محیط بکل شیئ ہے و "معکم" ہے۔ "اَللّٰہُ نُورُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" اُس کی شان ہے ــــــ

...... سالک عبد ہے، عدم اصلی ہے، محض بیکار ہے ــــ فقط بے اختیار لا یعلم ہے۔ عکس کی ہوا پر مغرور و مسرور ہے۔ "کُلُّ شَیْئٍ ھَالِکٌ اِلَّا وَجْھَہٗ" ــــ پس جو کچھ واردات ہیں سب اسی احاطہ کا اثر ہے۔ ورنہ اصل الامر یہ ہے کہ ھُوَ ھُوَ لَا ھُوَ اِلَّا ھُوَ لَا وُجُوْدَ لِتَرْشِیْدٍ وَلَا لِصِدِّیْقٍ ــــ ؎ آخرِ ما جیبِ تمنا تہی است۔

اب حق الامر ظاہر کرتا ہوں۔ من آنم کہ من دانم، شیخ امداد اللہ نے بامداد اللہ تعالیٰ اس ذرۂ خوار ذلیل ناہموار، سرشار بد اخلاقی و ظلمات کو اجازت (عطا) فرمائی۔ خود خراب در خراب تمام عمر کو خوار کیا۔ گاہ (کبھی) بھی نور کا ظہور نہ ہوا۔ واللہ باللہ ثم باللہ کہ ایسے واردات کا خواب تک بھی نہیں دیکھا۔ جانتا تھا کہ ایک روز رُسوا ہونا ہوگا۔ لہٰذا ہر روز سب کے رُوبرو اپنے حرمان کو ظاہر کرتا رہا۔ اب فضل الٰہی دامن گیر ہوا کہ تم کو مجھ سے نامزد کرکے اس قدر نوازشِ بے کراں سے شاد فرمایا۔ تمہاری اصلاح کے کیا شایان ہوں۔ بہر حال بجز تصدیق اور کیا کر سکتا ہوں اور سوائے ایک فقرے کے کیا بتلا سکتا ہوں کہ (جو) سابق (میں) لکھا کہ ذات بحت مجرد و ہستی محض کے حضور کے سوا سب واقعات پر لا رفعی کشیدہ کرو۔ اور اپنے آپ کو ذلیلِ محض و منفی خالص تصور کرکے فنا کرو۔ یہ شغل رہے جس کا مظہر کلمۂ توحید لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ہے ــــ اور قرآن شریف، درود، حزب اعظم اور وظائفِ حدیث کو سادہ معانی کے ساتھ جو لغوی ترجمہ ہے ورد رکھو۔ اور دقائق (پر) التفات مت کرو۔ اور شغل علم دین رکھو ــــ

اتباعِ شریعت کو (جیساکہ) سابق (پہلے) بھی لکھا ہے، فرضِ عین جانو ــــ بعد اس سب کے اب اس رُوسیاہ شرمندہ کے واسطے بھی کوشش و سعی کرکے دست گیری کرنا لازم ہے۔ جب اس خوار کا مرشد ہونا آپ پر روشن ہوا تو ھَلْ جَزَاءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ــــ ؎

چو با حبیب نشینی و بادہ پیمائی
بیاد آر محبان بادہ پیما را[1]

---

[1] (ترجمہ) اے مخاطب جب تو حبیب کے ساتھ بیٹھے اور فیض اُٹھائے تو دوسرے بادہ پیما محبوں اور دوستوں کو بھی یاد رکھنا

اگر کوئی شاہ زادہ گرسنہ (بھوکے شہزادے) کا لقمہ دیوے اور ارشادِ راہ کردیوے (راستہ بتادے) تو شاہزادہ بعد اپنی جانشینی کے وزارتِ عظمیٰ اس گدائے لقمہ دہندہ کو دیتا ہے۔ گو اس نے بڑا احسان نہیں کیا مگر یہ جزاءِ اعظم دیتا ہے۔ تو اس پر قیاس کرکے عمل کرنا مناسب ہے۔ اور ہرگاہ (چونکہ) کہ حق تعالیٰ نے تم کو واصل کیا اور شرطِ اجازت متحقق ہوگئی تو اجازت میں کیا عذر ہے۔ خرقہ واجازت دونوں حاصل ہوویں گے۔ مطمئن رہیں۔ اس خط کو بہت غور سے مطالعہ کرنا اور دیکھنا کہ اس میں بہت کچھ لکھا ہے گو الفاظ قلیل ہیں۔

مولوی صدیق احمد صاحب السلام علیکم۔ آپ کے خطوط سے حالات معلوم ہوئے۔ جو کچھ عنایات حق تعالیٰ کی بندۂ احقر پر مبذول ہیں اس کا شکر یہ محال ہے ـــــ اصل مقصود تو احسان ہے سو وہ بفضلہٖ تعالیٰ آپ کو عطا ہوا۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے قرن میں یہ احسان ہی تھا، اور معارف جو خلف کو جدید حاصل ہوئے وہ بھی ثمرۂ عنایات ہیں، مگر انوار کا جو طریق وسلوک ہے وہ خطرناک ہے۔ فقط احسان میں کوئی دخل شیطان کا نہیں ہوسکتا، مگر انوار کے نزول میں بہت خدشہ ہے اور اس حالت میں اتباع سنت نہایت درکار ہے۔ اور رعایت مشرع کی پُر فرض ہے۔ علم و تفقہ بہت بہت واجب ہے۔ ....

ہستیِ مطلق کو ہر دم خیال میں پرورش کرنا اور بلاکیف حاضر وموجود جان کر حیاء وشرم کے ساتھ بندۂ مطیع رہنا مقصد اصلی ہے اور یہی احسان ہے۔ باقی زوائد ـــــ

لہٰذا مشائخ فرماتے ہیں کہ جس کے سلوک میں انوار پیش نہ آویں اس کا سلوک اکمل ہے۔

.... سنو کہ سلوکِ صحابہؓ وتابعینؒ وتبع تابعینؒ میں تحصیلِ احسان اور اپنا بندۂ ناچیز بے اختیار ہونا اور من کل الوجوہ محتاج ذاتِ غنی کا اور حضور اس کردگارِ بے نیاز محسنِ عباد کا ہونا (تھا)۔ بندگی در بندگی، عجز در عجز، توکل در توکل، ہمت، اطاعت وجان ومال بازی فی رضاء المولیٰ اس کا ثمرہ تھا۔ نہ استغراق تھا، نہ فنا تھی۔ متاخرین نے دوسرا راستہ نکالا کہ جس سے ربط حادث بالخالق کی کیفیت معلوم ہوجاوے۔ سو بعد مجاہدات معلوم ہوا کہ سب مخلوقات اعلیٰ سے اخس تک اپنے خالق سے مربوط اور اس کے وجود سے موجود ہیں۔ بوحدتِ وجود یا بوحدتِ شہود

علیٰ خلافِ بینہم. پس اس ربط کے شہود کا نام جذب رکھا گیا، اور انتہاءِ راہِ جذب اس نسبت کے انکشاف پر ہے. پس جذب کے معنیٰ رجوع السالک الیٰ حقیقۃ الحقائق واصل الاشیاء اور اس میں افنا اپنا اور اپنے علمِ انانیت کا کر دینا مقرر ہوئے ــــــ

اس راہِ جذب کو جو کچھ حضراتِ مشائخ نے طے کیا اس کے بیان سے زبان عاجز ہے. گویا وہ کمالات اب کالعنقا ہو گئے ہیں. جس قدر سالک مجاہدہ کر کے کوئی مقام طے کرے ہنوز اس کے آثار کے سوائے اُن کمال (کمالات) سے کوئی مناسبت نہیں ہوتی. اُن کا حوصلہ و ملکہ ملاءِ اعلیٰ سے ناشی تھا، اب ملاءِ سافل سے بھی پوری مناسبت نہیں. معہٰذا راہِ جذب ہے نہ در گاہ ــــــ

بعد طے راہِ جذب کے پھر وہی طریقۂ صحابہؓ کہ عبدیت کا مقام ہے اختیار کرنا وا(اور) عبادت و عاجزی کا معاملہ کرنا واجب ہوتا ہے. پس یہ بات کہ کسی مقام اور کسی حال میں مناسبت و مساواتِ قدماء یا متاخرین کی توقع ہو تو یہ محض خیالِ خام ہے. مگر ہاں بطفیل اُن اکابر کے وہی راہ ہے اور اُسی قسم کے حالات ہیں .... جو کچھ حظ (حصّہ) بندہ کا ہو جائے، عین عنایت ہے کہ اگر اس کے شکریہ میں کروڑوں سال ہمہ تن زبان ہو کر شکر کرے تو کوئی ادنیٰ درجہ شکر کا بھی ادا نہیں ہو سکتا.

نفس کو رویتِ انوار سے لذت ہوتی ہے اور تماشائے مخلوقاتِ غیبیہ میں مشغوف (یعنی اس کا شغف) ہے، اس واسطے ان انوار کا مشتاق تھا ورنہ اصلِ کارِ سالک فناءِ ہستیِ خود ہے، انوار سے کیا مقصود ہے. ؟ سو الحمد للہ اس نکتہ کو تم سمجھ گئے ہو اور اب مرتبہ یادداشت کا قائم ہو گیا. اب تم کو مشغولیِ درس و تدریس مضر نہیں، چونکہ اکثر کتبِ طب پڑھ لی ہیں، اس قدر قلیل باقی (کتب) کو بھی تمام کر لو اور دو گھنٹے یہ بھی فی رضاء اللہ تعالیٰ جان کر خرچ کرو کہ کسی بندۂ حق تعالیٰ کا کام (علاج معالجہ) کر دیا، اور اس کی ارضا سے اپنے مولیٰ تعالیٰ شانہٗ کی ارضا کو مطلوب رکھنا کیا مضائقہ ہے. باقی یادِ قرآن سودہ تمہارے شوق سے شروع ہوا ہے. انشاء اللہ تعالیٰ تمام ہو جائے گا. ورنہ جس قدر ہو جاوے مفت ہے ــــــ

..... سب اذکار و مراقبات تحصیلِ نسبت کے واسطے ہوتے ہیں. جب نسبتِ یادداشت حاصل ہو چکی، اب مراقبات کی درخواست عجب بات ہے. اب تمہارا سب ذکر لسانی، قرآن، صلوٰۃ

اور ذکر مسنون مراقبہ ہے (ان) سب میں یادداشت ہے کہ ثمرۂ مراقبات یہی ہے۔ اب کسی مراقبے کی حاجت نہیں۔ اذکار مسنونہ حدیث پڑھو، قرآن و نوافل صلوٰۃ مسنونہ ادا کرو اور بس ــــ ضیافت کے باب میں یہ ہے کہ ضیافت میں جانا مسنون ہے ــــ نہ کہ کھانا ــــ ان کی خوشی کے واسطے پانچ چار لقمہ کھالیے، ان کے اصرار پر نظر نہ کی، اور جو اس میں بھی نقصان ہو تو ترک کردو کوئی تردد کی بات نہیں۔

(۹ ربیع الاول ۱۳۱۰ھ)

مولوی صدیق احمد صاحب و فیو فکم السلام علیکم و رحمۃ اللہ تعالیٰ و برکاتہٗ۔ آپ کا پہلا خط آیا، جواب کی نوبت نہ آئی کہ دیوبند چلا گیا۔ وہاں رہ کر فرصت جواب نہ ملی، واپس وطن آیا۔ مولوی صدیقؒ[1] نے دوسرا خط دیا۔ بیمار ہوگیا اب صحت ہوئی۔ اس عرصہ میں دو خط اور آپ کے پہونچے۔ چار خط جمع ہو گئے۔ اب جواب لکھتا ہوں کہ جو جو احوال تم نے لکھے وہ خود ترقی کی خبر دیتے ہیں۔ حاجت جواب نہیں۔ خواب میں رویت حضرت سلمہٗ (حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ) کی اور چرس میں پانی بھرنا اور چاہ (کنویں) میں جانا، نکلنا یہ سب تمہارے فیضان کی علامات ہیں کہ تم سے کسی کو فائدہ ہووے گا۔ حضرات چشت و قادریہ کے نسبات بھی اعلیٰ درجہ کو پہونچے ہیں۔ ایسا خیال ہرگز مت کرنا کہ وہ (حضرات) تشبیہ میں ہی رہے۔ قبض و بسط ہر دو حالت رفیع ہیں۔ فیصلہ، نسبات اولیاء میں میرا تمہارا کام نہیں۔ ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است۔ سب اکابر اعلیٰ درجہ تنزیہ کو پہونچے ہیں۔ ایک سے ایک اعلیٰ ہے۔ چند اشخاص کو جو آپ نے مستعد بیعت کیا ہے، آپ ہی ان سے بیعت لیویں، آپ کو اجازت اخذ بیعت دیتا ہوں۔ اور تلقین مناسب فرمادیں۔ بفضلہٖ لائق اس منصب کے ہو۔ اور (اُن کو) یہاں آنا کچھ ضروری نہیں۔ بندہ کو زاویہ خمول (گمنامی) میں ہی راحت ہے۔ غرباء کو وظیفہ حدیث بتادینا سہل ہے اور بس ــــ آپ بوجہ حسن ظن کیا کچھ میرے ساتھ اعتقاد جمائے بیٹھے ہیں، الحق مجھ کو نہایت شرم ہے ــــ میرا حال قابل اس کے نہیں کہ کوئی مجھ سے اعتقاد کرے۔ مگر تمہارا حسن ظن

---

[1] حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے متوسلین میں صدیق نام کے بہت سے حضرات ہیں۔ معلوم نہیں کہ یہاں کون مراد ہے۔

اپنا وسیلۂ آخرت جانتا ہوں۔ اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ[1] موجب طمانیت ہو رہی ہے۔ پس میرا پردہ فاش کر کے مجھ کو ضائع مت کرو۔ جو طالبِ حق ہے اُس کو تم ہی حسبِ حوصلہ کچھ بتلادو ——— کریم بخش کو جس کے لطائف بند ہو گئے اسے ازسرِ نو تلقین لطائف کرو اور گاہ گاہ اپنے سامنے بٹھلایا کرو۔ لطائف اس کے جاری ہو جائیں گے۔ علیٰ ہذا عبد الجلیل خاں کو کچھ بتلا دینا۔ (ان کا) یہاں آنا کچھ ضروری نہیں۔ بفضلہٖ تعالیٰ مجھ سے بہتر تم ہو۔ یہاں تو فقط درس و تدریس کا شغل ہے اور بس ——— باقی جو جو کچھ درباب راہ نبوت و تنزیہ لکھا ہے سب کی تصدیق کرتا ہوں۔ دوسرے خط میں جو افضلیت مقاماتِ انبیاء و صحابہ ہے وہ سب درست ہے۔ مشتاقانِ مالیر کوٹلہ کو آپ پر (کے) حوالہ کر چکا ہوں۔ جہاں تم ہو میری کوئی حاجت و شمار نہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو میرا وسیلۂ نجات کرے اور جب کوئی کمال قلب پر متمکن ہو جاتا ہے اس قدر عظمت اسکی نہیں رہتی جو ابتدا میں ہوتی ہے۔ تیسرے خط میں اجرائے تنخواہ و رفع وساوس بشریہ و ترقی دریافت ہو کر زیادہ سرور ہوا۔ خواب میں کشمش کا کھانا بھی اچھا ہے اور درختِ سبز و میوہ وغیرہ یہ سب عمدہ بات ہے۔ سالک کو جب عبورِ عنصر مار پر ہوتا ہے تو یہ اس کے آثار ہیں۔ راحتِ جسمی بھی ضرور ہے۔ چھوٹی شب میں تھوڑا شغل کیا۔ غرض حصولِ نسبت سے ہے۔ عبادت قدرِ طاقت کرنا چاہئے۔ خَیْرُ الْعَمَلِ مَا دِیْمَ عَلَیْہِ[2] قیامِ حالِ نسبت اصل مقصود ہے ——— نقشہ دو شغل وغیرہ کا مظاہر الحق ترجمۂ مشکوٰۃ میں منقول ہے۔ وہ عمدہ نقشہ ہے اس کو ملاحظہ فرمادیں۔ چوتھے خط میں ازدیادِ یقین و وضوحِ احسان لکھا ہے۔ اور خفائے توحید انفعالی، سو یہ امر موجب ترقی ہے۔ خلوت جلوت یکساں ہو جانا آثار اس کے ہیں۔ الحمد للہ علیٰ ذالک ——— اِتی اقتصاد (اعتدال) جملہ امور میں وہ بھی بتدریج حاصل ہو جاوے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ کثرتِ کلام میں اگر رضاءِ قلبِ مومن ہو تو وہ بھی عبادت ہے، حُسنِ اخلاق میں داخل ہے۔ کوئی امر خواہشِ نفس سے نہ ہو بلکہ بامر مالک و قاعدۂ شرع ہو۔ وہ عادت بھی عبادت ہو جاتی ہے۔ فی الواقع شریعت فرض اور مقصد اصلی ہے طریقت بھی شریعت باطنی ہے۔ اور حقیقت و معرفت متمم شریعت ہیں۔ اتباعِ شریعت بکمال بدونِ معرفت نہیں ہو سکتا۔ اور شغل تدریس بنظر رفاہِ مسلمین اعلیٰ عبادت شانِ انبیاء علیہم السلام ہے۔ اور

(باقی صفحہ ۱۹ پر)

---

[1] یہ حدیث قدسی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "میں اپنے بندے کے گمان کے قریب ہوتا ہوں"۔ [2] بہترین عمل وہ ہے جس پر مداومت ہو۔ (حدیث نبوی)

معرفتِ نفس و معرفتِ رب

قرآن مجید کا بیان

(از افاداتِ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ قدس سرہٗ)

ایک سلسلۂ کلام میں ارشاد فرمایا:۔

سنیے ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ کے متعلق پہلے کچھ تحقیق کی ہے علماء کا کلام دکھلایا ہے کہ علماء نے کیسی کیسی تفسیر بیان فرمائی ہے لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ آپ دور کیوں جاتے ہیں قرآن شریف کی جانب کیوں نہیں آتے۔ دیکھیے اللہ تعالیٰ کیا فرماتے ہیں فرماتے ہیں فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۝ انسان کو دیکھنا چاہیے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے۔ خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ۝ يَّخْرُجُ مِنْۢ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ ۝ وہ ایک اچھلتے پانی سے پیدا کیا گیا ہے جو پشت اور سینہ کے درمیان سے نکلتا ہے۔ اِنَّهٗ عَلٰى رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ ۝ وہ اس کے دوبارہ پیدا کرنے پر ضرور قادر ہے۔ اسی طرح ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖٓ ۝ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ۝ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ۝ انسان کو چاہیے کہ اپنے کھانے کی طرف نظر کرے کہ ہم نے عجیب طور پر پانی برسایا، پھر عجیب طور پر زمین کو پھاڑا۔ فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ۝ وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا ۝ وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا ۝ وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا ۝ وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا ۝ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ۝ پھر ہم نے اس میں اُگائے غلّہ اور انگور اور ترکاری اور زیتون اور کھجور اور گنجان باغ اور میوے اور چارہ پیدا کیا۔ تمہارے اور تمہارے مویشی کے فائدہ کے لیے۔

اللہ تعالیٰ نے پہلی آیت میں انسان کے مبدا کا ذکر فرمایا ہے کہ انسان کو چاہیے کہ اپنی ابتدا اور تخلیق کو دیکھے اسی سے اس کو میری بھی معرفت ہو جائے گی چنانچہ ایک اور مقام پر نہایت ہی شوکت اور غضب کے لہجہ میں فرماتے ہیں۔

وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِیَ خَلْقَہٗ ۵ اس نے ہمارے لیے (یعنی ہماری شان میں) ایک عجیب مضمون بیان کیا اور اپنی اصل کو بھول گیا۔ اور وہ عجیب مضمون یہی کہ بوسیدہ ہڈیوں کو دوبارہ زندہ کیے جانے کا انکار کیا کہتا ہے کہ مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَهِیَ رَمِیْمٌ ۵ ہڈیوں کو جبکہ وہ بوسیدہ ہو گئی ہوں کون زندہ کرے گا۔ قُلْ یُحْیِیْهَا الَّذِیْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۵ آپ جواب میں فرما دیجئے کہ ان کو وہی زندہ کرے گا جس نے اوّل بار میں ان کو پیدا کیا وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِیْمٌ ۵ اور وہ سب طرح کا پیدا کرنا جانتا ہے الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ ۵ وہ ایسا ہے کہ ہرے درخت سے تمہارے لیے آگ پیدا کر دیتا ہے پھر تم اس سے اور آگ سلگا لیتے ہو۔ اَوَلَیْسَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓی اَنْ یَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ؕ بَلٰی وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِیْمُ ۵ جس نے آسمان اور زمین پیدا کیے ہیں کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ ان جیسے آدمیوں کو پیدا کر دے۔ ضرور قادر ہے اور وہ بڑا پیدا کرنے والا ہے اور خوب جاننے والا ہے اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَیْـًٔا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ۵ فَسُبْحٰنَ الَّذِیْ بِیَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَیْءٍ وَّاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ۵ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو بس اس کا معمول تو یہ ہے کہ اس چیز کو کہہ دیتا ہے کہ ہو جا پس وہ ہو جاتی ہے تو اس کی پاک ذات ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا پورا اختیار ہے اور تم سب کو اسی کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔

دیکھیے اس آیت میں نسیان پر نکیر ہے فرماتے ہیں کہ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِیَ خَلْقَہٗ یعنی ہمارے لیے مثل اور نظیر بنائی مخلوقات سے اور ہماری قدرت کو بھی ان کی قدرت پر قیاس کیا اور اپنی پیدائش کو بھول گیا۔ پس جب نسیان پر نکیر ہوئی تو اس کی ضد واجب ہوئی اور اس کی ضد ہے اپنی تخلیق کو پہچاننا۔ مطلب یہ ہوا کہ حق تعالیٰ کی جو کہ رب ہے معرفت حاصل کرنے کے لیے اور ان کی قدرت پر یقین کرنے کے لیے اپنی تخلیق کا تذکرہ ضروری ہے یہی معنی ہیں مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ کے یہ نظر واجب ہے کیونکہ قرآن شریف میں اس کا امر ہے فرماتے ہیں فَلْیَنْظُرِ الْاِنْسَانُ

مِمَّ خُلِقَ اور فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖ الخ اب جب انسان اپنی خلقت میں دیکھے گا تو بھلا اسے اپنی معرفت اور حقارت اور پھر اس کے واسطے سے حق تعالیٰ کی عظمت اور ان کی معرفت نہ حاصل ہوگی؟ اسی کے متعلق فرماتے ہیں اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ کیا آدمی کو معلوم نہیں کہ ہم نے اس کو نطفہ سے پیدا کیا جس کا مقتضا تو یہ تھا کہ اپنی اس ابتدائی حالت کو یاد کرکے اولاً تو جو اپنی حقارت اور خالق کی عظمت کے جرأت انکار اور گستاخی اعتراض سے طبعاً شرماتا ثانیاً خود اس حالت سے صحت بعث پر عقلاً استدلال کرتا سو اس نے ایسا نہ کیا بلکہ برخلاف اقتضائے مذکور وہ علانیہ اعتراض کرنے لگا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ مضمون نفس کی معرفت کرانے کے لیے کچھ کم ہے؟ اس کو فرمایا کہ حق تعالیٰ نے انسان کو سرنگوں کردیا اور بالکل منکسر الراس کردیا تکبر کے ازالہ کے لیے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا کیا بیان کیا ہے لوگ اسے پڑھتے بھی ہیں اور کہتے ہیں کہ تکبر نہیں جاتا۔ میں کہتا ہوں کہ تکبر کا علاج اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا جو قرآن شریف میں بیان فرمایا ہے وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ۔ اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ - ایک جگہ فرمایا خَلَقْنٰهُ مِنْ مَّاءٍ مَّهِيْنٍ - آگے فرماتے ہیں فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ ای مبالغ فی الخصومة والجدال الباطل ہم نے اس کو نطفہ سے پیدا کیا اور اب وہ ہمیں سے جھگڑتا ہے جس کی بلی اسی سے میاؤں مبین یعنی کھلا ہوا جھگڑالو ہم نے اس کو اخس الاشیاء اور امہن الاشیاء سے تو پیدا کیا بس اچانک وہ ہمیں سے ایسے امر میں جھگڑا کرنے لگا جس کے صحت کی کھلی ہوئی شہادت خود اس کی مبدأ فطرت دے رہی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اب ان سب آیات کے پڑھنے کے بعد بھی کیا آدمی میں تکبر رہ سکتا ہے۔ ارے کیا کر رہے ہو؟ اور کہاں جا رہے ہو قرآن شریف کو سمجھو اس کو بہت کم لوگوں نے سمجھ کر پڑھا ہے حالانکہ اسمیں سب کچھ ہے ؎

جمیع العلم فی القرآن لکن
تقاصر عنہ افہام الرجال

تمام علوم قرآن شریف میں موجود ہیں لیکن لوگوں کی فہم ان کے سمجھنے سے قاصر ہے۔ جب قرآن شریف کو اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے تو اس کے معنی یہی یہ ہوئے کہ آپ کو اپنے تک پہونچانے کا سامان کردیا ہے اور گویا ذمہ داری لی ہے کہ یہ تم کو خدا تعالیٰ تک پہونچا دے گا اس کے بعد بھی نہ سمجھو اور یہ سمجھو کہ دوسری چیزوں سے خدا تعالیٰ تک پہونچو گے تو تم پر تف ہے اس

آیت سے پہلے فرماتے ہیں کہ اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَھُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَیْدِیْنَآ اَنْعَامًا فَھُمْ لَھَا مٰلِکُوْنَ وَ ذَلَّلْنٰھَا لَھُمْ فَمِنْھَا رَکُوْبُھُمْ وَمِنْھَا یَاْکُلُوْنَ وَلَھُمْ فِیْھَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ اَفَلَا یَشْکُرُوْنَ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اٰلِھَۃً لَّعَلَّھُمْ یُنْصَرُوْنَ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ نَصْرَھُمْ وَھُمْ لَھُمْ جُنْدٌ مُّحْضَرُوْنَ ۝ فَلَا یَحْزُنْکَ قَوْلُھُمْ اِنَّا نَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ وَمَا یُعْلِنُوْنَ ۝

کیا ان لوگوں نے اس پر نظر نہیں کی کہ ہم نے ان کے لیے اپنے ہاتھ کی ساختہ چیزوں میں سے مواشی پیدا کیے پھر یہ لوگ ان کے مالک بن رہے ہیں مِمَّا عَمِلَتْ اَیْدِیْنَا یعنی جس کے احداث کے ہم خود بالذات متولی ہوئے بلا شرکت غیرے نہ خلقاً اور نہ کسباً اور ہم نے ان مواشی کو ان کا تابع بنا دیا سو ان میں بعضے تو ان کی سواریاں ہیں اور بعض کو وہ کھاتے ہیں اور ان میں ان لوگوں کے اور بھی نفع ہیں اور پینے کی چیزیں بھی ہیں سو کیا یہ لوگ شکر نہیں کرتے؟

دیکھئے کیسا شاہانہ کلام ہے کتنا شیریں ہے اور کس طرح انسان سے رذائل کو ختم کرنیوالا ہے یہ سب میں نے اس لیے سنایا کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے جو کچھ تکبر کے علاج کے متعلق لکھا ہے وہ ہے ہی میں یہ کہتا ہوں کہ اس کے ازالہ کے لیے انسان بس اپنی خلقت پر نظر کرے۔ اسی سے سب ختم ہو جائے گا ازالہ کبر کا یہ قرآنی علاج ہے چنانچہ ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں اَیَطْمَعُ کُلُّ امْرِئٍ مِّنْھُمْ اَنْ یُّدْخَلَ جَنَّۃَ نَعِیْمٍ کَلَّا اِنَّا خَلَقْنٰھُمْ مِّمَّا یَعْلَمُوْنَ کیا ان میں ہر شخص اس کی ہوس رکھتا ہے کہ آسائش کی جنت میں داخل کر لیا جائے گا یہ ہرگز نہ ہوگا ہم نے ان کو ایسی چیز سے پیدا کیا ہے جس کی ان کو بھی خبر ہے یعنی کیا وہ جنت میں بلا ایمان ہی کے داخل ہو جائیں گے۔ یہ ان کی محض خام خیالی ہے مِمَّا یَعْلَمُوْنَ کی ایک تفسیر نطفۂ قذرۃ (پلید ۱۲) سے کی گئی ہے اس کے متعلق روح المعانی میں ہے کہ وفی التعبیر عن مادۃ خلقھم بما یعلمون ما یکسر سورۃ المتکبرین ما لا یخفی (روح ج ۲۹)

یعنی اُن کے مادہ تخلیق یعنی نطفۂ قذرۃ کو مِمَّا یَعْلَمُوْنَ سے تعبیر کرنے میں متکبرین کے تکبر کی تیزی پر جیسی کچھ ضرب کاری ہے اہلِ بصیرت پر مخفی نہیں اس سے معلوم ہوا کہ تکبر میں ایک تیزی ہوتی ہے جس کا توڑنا مطلوب ہے اور وہ ٹوٹتی اسی سے ہے کہ آدمی اس پر غور کرے کہ اس کی اصل اور اس کا مادہ تخلیق کیا ہے جب یہ دیکھے گا کہ اس کی اصل ایک ایسی اخس اور ارذل شئی ہے تو اس کی وجہ سے اس کے نفس میں انکسار اور اپنی حقارت پیدا ہوگی۔ تکبر پاش پاش ہو جائے گا۔ اب سنئے اعتراض نہ کیجئے کہ

امام غزالی تو اس کا علاج ایسا فرماتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ جہاں سے وہ کہتے ہیں میں بھی کہتا ہوں آپ خود سمجھئے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنا کلام اتارا ہمیں انسان کے نفس کے امراض بتائے اور اس کا معالجہ بیان فرمایا تو پھر رہ کیا گیا ہم کو دور جانے کی کیا ضرورت ہے جانتے ہو کہ مشائخ کا معمول جو فجر کے بعد سورہ یٰسین پڑھنے کا ہے وہ اسی غرض کے مراقبہ کے لیے ہے کہ انسان اپنی حقیقت کو اور حقارت کو برابر پیش نظر رکھے تاکہ وہ موڈی ہو حق تعالیٰ کی عظمت اور معرفت کی طرف چنانچہ فجر کے بعد ہی بزرگوں کا معمول مراقبہ کا ہوا کرتا ہے تو سب سے پہلا مراقبہ وہ اسی کا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انفسی چیزوں پر بھی کلام فرمایا ہے وَفِیْ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ۔ اس کو صوفیا سیر انفسی کہتے ہیں نیز سیر آفاقی پر بھی کلام فرمایا ہے وَفِیْهَا اٰیَاتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ ۔ ایک جگہ فرمایا کہ یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ یہ سیر آفاقی ہے دنیا میں بیوی بچے مال یہی چیزیں بالعموم فتنہ بنتی ہیں ان سے تحذیر فرمادی اب قرآن شریف کو چھوڑ کر اور کون سی کتاب تلاش کرتے ہو۔ فَبِاَیِّ حَدِیْثٍۭ بَعْدَهٗ یُؤْمِنُوْنَ ٥

دیکھئے اس آیت کو کہ اللہ تعالیٰ نے دو ہی باتوں میں معرفت سکھلادی ایک میں فرمایا فَلْیَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰی طَعَامِهٖ الخ یہ تو معرفت آفاقی ہے اور دوسری آیت میں فرمایا اَوَلَمْ یَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنَاهُ مِنْ نُّطْفَةٍ۔ یہ سیر انفسی ہے مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ۔ سے مراد یہی سیر انفسی ہے۔ یہ سیر قریب کی ہے اور انسان کے اندر کی چیزوں کی ہوتی ہے اور سیر آفاقی خارجی اور باہر کی چیزوں کی ہوا کرتی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کی معرفت قریب کی چیزوں سے کیوں نہیں حاصل کرتے۔ (بشکریہ "معرفت حق الہ آباد")

جرح و تعدیل

(۱۲)

مولانا مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی

(استاذ شعبہ دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)

ابو شکور سالمی کی "تمہید" میں ہے "پھر مرجئہ کی دو قسمیں ہیں:۔

(۱) مرجئہ مرحومہ:۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ہیں (اور اُن کے طریقہ کی پیروی کرنے والے)

(۲) مرجئہ ملعونہ:۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ گناہ بالکل مضر نہیں ہے اور گناہ گار کو کوئی عذاب نہیں ہوگا۔ عثمان بن[1] ابی لیلیٰ کے بارے میں مروی ہے کہ انھوں نے ابو حنیفہ کو تحریر کیا تھا کہ "آپ لوگ مرجئہ ہیں" انھوں نے جواب دیا کہ مرجئہ کی دو قسمیں ہیں (۱) مرجئہ ملعونہ، میں ایسے مرجئہ سے بری اور بیزار ہوں۔ (۲) مرجئہ مرحومہ: ایسا مرجئی میں بیشک ہوں۔ اسی جواب میں انھوں نے

---

(۱) یہ لغزش قلم ہے۔ اصل نام عثمان البتی ہے۔ عثمان البتی البصری (وفات ۱۴۳ھ) نے ارجاء کے بارے میں ابو حنیفہ کو خط لکھا تھا۔ ان ہی دونوں کے درمیان مراسلت ہوئی ہے، ابو حنیفہ نے عثمان البتی کے لیے ایک رسالہ تحریر کیا تھا جس میں وضاحت سے بیان کیا تھا کہ عمل کو رائیگاں کرنے والا ایمان کا رائیگاں کرنے والا نہیں کہلائے گا۔ اپنے اس نقطۂ نظر کی تائید میں انھوں نے دلائل پیش کیے۔ اس کے آگے لکھا کہ "کیا تم خود "مومن ظالم" "مومن مذنب" "مومن مخطی" "مومن عاصی" اور "مومن جائر ...." کے الفاظ استعمال نہیں کرتے ہو؟ اس کے آگے ابو حنیفہ نے لکھا ہے "سنو! میں یہ کہتا ہوں کہ

(باقی اگلے صفحہ پر)

یہ بھی تحریر کیا تھا کہ "تمام انبیاء بھی اسی خیال کے تھے، دیکھو حضرت عیسیٰ فرماتے ہیں" اِن تُعذّبهم فانهم عبادك وان تغفر لهم فانك انت العزيز الحكيم ٥ (اے اللہ تو انھیں عذاب دے تو وہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو ان سے درگزر فرمائے تو تو عزت والا اور حکمت والا ہے)"

ابن حجر مکی (احمد بن محمد بن علی بن حجر الہیتمی المصری المکی) "شرح المنہاج" "الزواجر عن اقتراف الکبائر" اور "الصواعق المحرقہ" وغیرہ کے مصنف متوفی ۹۷۵ھ نے "الخیرات الحسان فی مناقب النعمان" کی ۲۷ویں فصل میں لکھا ہے "ایک گروہ نے ابو حنیفہ کو مرجئہ میں شمار کیا ہے، یہ بات حقیقت پر مبنی نہیں ہے اولاً اس وجہ سے کہ المواقف کے شارح کا کہنا ہے کہ غسان مرجئی ابو حنیفہ سے ارجاء کا عقیدہ نقل کرتا تھا اور یہ اس کا افترا اور بہتان تھا اس سے اس کا مقصد یہ تھا کہ اتنے بڑے امام کی طرف اپنے مسلک کو منسوب کر کے اپنے مذہب کی ترویج و اشاعت کرے ثانیاً اس وجہ سے کہ آمدی کا کہنا ہے کہ ابتدائی زمانے میں معتزلہ ان لوگوں کو جو قضاء و قدر کے بارے میں ان کی رائے سے اختلاف کرتے تھے، مرجئہ کے لقب سے ملقب کیا کرتے تھے، ثالثاً یہ بات ہو کہ چونکہ امام ابو حنیفہ کا کہنا ہے کہ ایمان میں کمی بیشی نہیں ہوتی اس لیے ان کے بارے میں ارجاء کا گمان کیا گیا اس لیے کہ وہ ایمان سے عمل کو مؤخر کرتے ہیں۔"

حاصل کلام اس سلسلے میں یہ ہے کہ ارجاء کا اطلاق کبھی تو اہل سنت و جماعت پر ان کے مخالفین معتزلہ کی طرف سے جو مرتکب گناہ کبیرہ کے ہمیشہ جہنم میں رہنے کے قائل ہیں، کیا جاتا ہے اور کبھی ان ائمہ پر جو قائل ہیں کہ "اعمال" ایمان میں داخل نہیں ہیں اور نفس ایمان میں کمی بیشی نہیں ہوتی ہے —— اور یہ مذہب امام ابو حنیفہ اور ان کے متبعین کا ہے —— ارجاء کا اطلاق محدثین کی طرف سے کیا جاتا ہے یہ محدثین قائل ہیں کہ ایمان میں کمی بیشی ہوتی ہے اور اعمال ایمان میں داخل ہیں، یہ اختلاف محض لفظی ہے جیسا کہ متقدمین و متاخرین نے تحقیقی طور پر بیان کر دیا ہے پھر بھی ہوا یہ کہ متقدمین اور متاخرین

[illegible] عمل جزو ایمان ہیں، فرائض میں سے کچھ کو رائیگاں کر دینے سے نہیں ان کو دائرہ ایمان سے خارج [illegible] ہوتا، جو شخص ایمان کے ساتھ تمام فرائض جس حکم خداوندی بجا لاتا ہے وہ ہمارے نزدیک جنتی ہے، جو ایمان اور عمل دونوں [illegible] جو شخص ایمان رہا اور فرائض میں بعض کو رائیگاں کرنے والا ہو وہ مومن مذنب ہے [illegible] میں اللہ کی مشیت ہوگی تو اسے عذاب دے گا [illegible] مشیت ہوگی تو درگزر فرمائے گا، عذاب دے گا تو گناہ پر، درگزر فرمائے گا تو گناہ کو۔" ۱۲ عبد الفتاح۔

کے کلام کی جب طول طویل تشریحیں ہوئیں تو بات یہاں تک پہونچ گئی کہ محدثین کیخلاف رائے رکھنے والوں پر ارجاء کا اطلاق کیا گیا اور اس ارجاء کے نام پر ان کی مذمت کی گئی، حقیقت یہ ہے کہ یہ ارجاء کوئی مذموم امر نہیں ہے جیساکہ ماہرین شریعت سے مخفی نہیں ہے۔

اب جب یہ تفصیل ذہن نشین ہوگئی تو سمجھ لینا چاہیے کہ جرح و تعدیل کے ائمہ میں سے کسی کا، خواہ وہ جلیل القدر محدثین میں ہی کیوں نہ ہو، کسی راوی کے بارے میں مطلقاً یہ کہنا کہ وہ مرجئین میں سے اس راوی کو گمراہ فرقہ میں شامل کرنے میں جلدبازی سے کام لینے کے لیے کافی وجہ جواز نہیں ہے بلکہ اس موقع پر چھان پھٹک ضروری ہے، پھر جو صورت مرجح معلوم ہو اس کے مطابق حکم لگانا چاہیے، البتہ اگر کوئی صریحی یا حالی قرینہ اس پر دلالت کررہا ہو کہ ارجاء کے الزام سے یہاں وہی ارجاء مراد ہے جو گمراہی ہے تو ایسے راوی کے بارے میں گمراہ ہونے کا حکم دینا غلط نہ ہوگا، یوں تو یہ احتمال باقی رہتا ہے کہ کسی معتزلی نے اس راوی پر ارجاء کا اطلاق کیا ہو وہیں سے جرح کرنے والے نے یہ الزام اس راوی کے اوپر لگا دیا ہو محض اس بناء پر کہ معتزلی کا یہ الزام شہرت پاگیا اور جرح کرنے والے نے یہ تحقیق نہیں کی کہ الزام لگانے والا دراصل معتزلی تھا! یہ بھی احتمال باقی رہتا ہے کہ جس راوی کو مرجئہ میں داخل کردیا گیا ہے وہ ان لوگوں میں ہو جو ایمان میں کمی بیشی کو اور ایمان میں عمل کو داخل نہیں مانتے ہیں تو اس پر کسی محدث جارح نے محدثین کے طریقے کی پیروی میں ارجاء کا لفظ بول دیا ہو۔

اس کی مثال ابن حجر عسقلانی کی کتاب 'لسان المیزان' میں امام ابوحنیفہ کے شاگرد محمد بن الحسن (امام محمد) کے تذکرے میں موجود ہے۔ ابن حجر لکھتے ہیں "ابن عدی نے اسحاق بن راہویہ سے روایت کی ہے کہ انھوں نے یحییٰ بن آدم کو یہ کہتے سنا کہ شریک، مرجئہ کی گواہی قبول نہیں کرتے تھے، ایک دفعہ محمد بن الحسن (امام محمد) نے ان کے سامنے گواہی دی تو انھوں نے قبول نہیں کی، جب ان سے اس بارے میں کہا گیا تو انھوں نے کہا۔ "میں ایسے کی گواہی قبول نہیں کرتا جو کہتا ہو کہ نماز ایمان میں داخل نہیں ہے۔"

یہ صریحی ثبوت ہے کہ امام محمد پر ارجاء کا اطلاق محض اس لیے کیا گیا کہ وہ نماز کو اصل ایمان کا جزء نہیں مانتے تھے، ظاہر ہے کہ یہ ارجاء گمراہی نہیں ہے۔

اسی طرح ذہبی نے میزان الاعتدال میں مسعر بن کدام کے احوال میں ان کی ثقاہت کے

ذکر کے بعد لکھا ہے: "سلیمانی کے اس کہنے کا کوئی اعتبار نہیں ہے کہ مسعر ابن کدام، حماد بن ابی سلیمان، نعمان، عمرو بن مرّہ، عبدالعزیز بن ابی روّاد، ابو معاویہ اور عمر بن ذر وغیرہ مرجئہ تھے۔ میں (ذہبی) کہتا ہوں کہ ارجاء متعدد جلیل القدر علماء کا مسلک ہے۔ ارجاء کے قائل کی مذمت مناسب بات نہیں ہے۔"

اسی طرح 'الملل والنحل' میں شہرستانی کا مرجئہ کی بحث کے آخر میں کہنا ہے: "مرجئہ کے ممتاز لوگوں میں جیسا کہ روایت کیا جاتا ہے، الحسن بن محمد بن علی بن ابی طالب، سعید بن جُبیر، طلق بن حبیب، عمرو بن مرّہ، محارب بن دثار، مقاتل بن سلیمان، ذر، عمرو بن ذر، حماد بن ابی سلیمان، ابو حنیفہ، ابو یوسف، محمد بن الحسن اور قدید بن جعفر ہیں اور یہ سب ائمہ حدیث ہیں، گناہ کبیرہ کے مرتکب کی تکفیر نہیں کرتے اور اس کے ہمیشہ جہنم میں رہنے کا حکم نہیں دیتے برخلاف خوارج اور قدریہ کے۔"

بعض شیعہ مصنفین نے — جیسے الاستقصاء کا مصنف — سلیمانی کے اس قول کو جو اوپر مذکور ہوا کہ ابو حنیفہ مرجئین میں تھے "حجت" لکھا ہے، ان کو یہ بھی علم نہیں کہ یہ قول رد کیا ہوا ہے یا نقاد اہل سنت کے نزدیک مرذول ہے ——— سلیمانی نے ایک دوسری جگہ ابو حنیفہ کو شیعہ قرار دیا ہے، اس رد کردہ بات کو اس شیعہ مصنف نے کیوں نہ سند سمجھا؟ اس طرح ابو حنیفہ ان کے ٹھکرائے ہوئے مذہب میں داخل ہو جاتے!

ذہبی نے 'میزان الاعتدال' میں عبدالرحمٰن بن ابی حاتم کے ذکر میں لکھا ہے: "میں ان کا (عبدالرحمٰن کا) ذکر نہ کرتا اگر ابوالفضل سلیمانی نے ان کا ذکر نہ کیا ہوتا۔ اس نے یہ بُری حرکت کی ہے۔ اس نے لکھا ہے" ان شیعہ محدثین کے اسماء جو حضرت علی کو حضرت عثمان پر فضیلت دیتے تھے یہ ہیں: اعمش، نعمان بن ثابت (امام ابو حنیفہ)، شعبہ بن الحجاج، عبدالرحمٰن ابن ابی حاتم۔"

مختصر یہ کہ سلیمانی کا یہ قول کہ "ابو حنیفہ شیعہ تھے جس طرح مسترد کر دیا گیا ہے اس لیے کہ دونوں فریق اس پر اتفاق رکھتے ہیں کہ ابو حنیفہ شیعہ نہیں تھے۔ اسی طرح اس کا مذکورہ قول کہ (امام ابو حنیفہ مرجئی تھے) دونوں فریقوں کے ممتاز علماء کے نزدیک غیر مقبول ہے۔"

تھوڑی دیر اہلِ حق کے ساتھ

مولانا محمد یونس نگرامی ایم، اے
(ریسرچ فیلو شعبۂ عربی لکھنؤ یونیورسٹی)

(۱)

ہندوستان کے مسلم فرماں رواؤں کی تصویر کچھ اس انداز سے پیش کی جاتی ہے کہ اصل صورت و حقیقت نظروں سے اوجھل ہوجاتی ہے، حالانکہ اگر کچھ تلاش و تفحص سے کام لیا جائے تو ان کی زندگیوں میں بعض بڑے ہی روشن اور جان دار پہلو ملتے ہیں۔ چنانچہ ناصر الدین محمود کی شخصیت غلام خاندان کے حکمرانوں میں بڑی ہی صاف ستھری اور پاکیزہ نظر آتی ہے۔

طبقات ناصری کے مؤلف کا بیان ہے:

"کہ اس میں انبیاء کے اخلاق اور اولیاء کے اوصاف تھے وہ متقی، زاہد، سخی، عدل پرور بھی تھا۔"

ابن بطوطہ کا بیان ہے:

"یہ بادشاہ نیک چلن تھا، قرآن شریف کی کتابت کر کے اس کی قیمت سے گزارہ کرتا۔ میں نے اس کا لکھا ہوا قرآن مجید دیکھا ہے، خط اچھا ہے اور کتابت منشیانہ ہے۔"

ظاہر ہے کہ اس قلیل آمدنی میں گزر بسر بڑی مشکل سے ہوتا ہوگا۔ چنانچہ محل میں خادمہ نہ تھی۔ ایک روز اس کی بیوی نے شکایت کرتے ہوئے کہا کہ روٹی پکاتے ہوئے میرے ہاتھ جل جاتے ہیں، ایک

خادمہ کا بندوبست کر دیجئے۔ راوی کا بیان ہے کہ یہ سُنتے ہی ناصر الدین محمود رونے لگا۔ اور اس نے کہا کہ یہ دُنیا گذر جانے والی ہے، یہاں اس تکلیف کو برداشت کرو اس کا اجر تم کو قیامت میں ملیگا۔ بیت المال سے میں تمہارے لئے کسی بھی خادمہ کا بندوبست نہیں کر سکتا۔ چنانچہ نیک صفت بیوی نے بھی اس خیال سے اتفاق کر لیا۔

اس تقویٰ و کسرِ نفسی کے ساتھ ساتھ وہ عشق نبوی کا بھی متوالا تھا، آپؐ کا نام نامی اور اسم گرامی لینے میں بھی بڑا اہتمام کرتا تھا۔ اس کے ایک خادم کا نام محمد تھا، وہ ہمیشہ اس کو محمد ہی کے نام سے پکارا کرتا تھا۔ ایک روز اس نے اپنے خادم کو تاج الدین کے نام سے پکارا وہ آیا اور حکم کی تعمیل کر کے چلا گیا۔ اور دو تین دن تک واپس نہ آیا۔ سُلطان نے اس کو گھر سے بُلا بھیجا اور محل نہ آنے کی وجہ دریافت کی تو اس نے جواب دیا کہ آپ مجھ کو ہمیشہ محمد کے نام سے پکارتے تھے۔ اس دن آپ نے تاج الدین کے نام سے یاد فرمایا تو میں نے سمجھا کہ شاید آپ کو مجھ سے کوئی بدگمانی پیدا ہوگئی ہے، اس لئے میں نے اپنی صورت نہیں دکھلائی۔ اس پر ناصر الدین محمود نے جو جواب دیا وہ یقیناً تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا اُس نے کہا:-

"محمدؐ! میں تم سے ناراض نہ تھا، لیکن جب میں نے تم کو تاج الدین کے نام سے پکارا تھا اس وقت میں وضو سے نہ تھا۔ اور مجھ کو شرم آئی کہ میں محمدؐ کا نام لوں اور بے وضو"

ملا عبدالقادر بدایونی کا خیال ہے کہ اس کے حالات خلفائے راشدین سے ملتے جلتے ہیں۔ اس نے بائیس برس حکومت کی لیکن درویشانہ شان ہمیشہ قائم رکھی۔ اس کو بادشاہت کی کوئی ہوس نہ تھی اور آگے چل کر تو اس نے سلطنت کی باگ ڈور غیاث الدین بلبن کے سپرد کر دی تھی جو کہ اس کا وزیر اور خسر بھی تھا۔ حکومت دیتے وقت اس نے بلبن سے کہا تھا:-

"اپنے تمام اختیارات تم کو دے رہا ہوں لیکن کوئی کام ایسا نہ کرنا کہ کل خدا کے حضور میں جواب نہ بن پڑے اور ساتھ ہی مجھ کو بھی شرمندہ ہونا پڑے"۔

(۲)

زمانہ مشہور فرماں روا سُلطان شمس الدین التمش کا ہے، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اجمیر سے دلی

تشریف لائے ہیں۔ ساری دلی ہے کہ اُمڈی پڑ رہی ہے۔ لیکن بار شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ ملنے نہیں آئے بلکہ حضرت خواجہ خود ہی اُن سے ملنے ان کے مکان پر تشریف لے جاتے ہیں، پھر بھی نجم الدین کچھ زیادہ گرم جوشی کا اظہار نہیں کر رہے ہیں۔ حضرت خواجہ یہ سرد مہری محسوس فرما کر وجہ دریافت فرماتے ہیں۔
اس پر نجم الدین فرماتے ہیں کہ جب سے آپ کے حکم سے خواجہ بختیار کاکی دلی میں مقیم ہیں میری عزت دفعتہً مٹی ہو گئی ہے۔ اُن کے بار خاطر کو دور کرنے کے لئے حضرت خواجہ نے حکم دے دیا ہے کہ بختیار کاکی ان کے ساتھ اجمیر واپس جائیں گے۔ اس اعلان کے سُنتے ہی ساری دلی غم و افسوس کے سمندر میں ڈوب گئی ہے۔ خود سلطان شمس الدین التمش حیران ہے اور حضرت خواجہ کی خوشامد کر رہا ہے کہ وہ اس فرمان کو واپس لے لیں لیکن ادھر سے جواب میں بیار انکار ہے۔
خواجہ معین الدین چشتی اور اُنکے ساتھ بختیار کاکی بھی دلی سے اجمیر کے لئے روانہ ہو رہے ہیں دلی میں کہرام مچا ہے کہ آج وہ درد و محبت معرفت سے محروم ہوئی جا رہی ہے۔
.. ساری دلی انھیں دونوں بزرگوں کے پیچھے پیچھے چل رہی ہے۔ التمش بھی حیرانی و پریشانی کے عالم میں ساتھ ہے۔ جس جس جگہ ان دونوں بزرگوں کے قدم پڑ رہے ہیں لوگ اس جگہ کی خاک کو بطور تبرک اٹھا لیتے ہیں۔ حضرت خواجہؒ نے جب یہ منظر دیکھا تو ارشاد فرمایا۔
"بختیار تم یہیں رہو تمھارے جانے سے یہاں کے لوگوں کے دل کی دُنیا اُجڑ جائے گی۔ جو مجھ کو پسند نہیں ہے"۔
یہ خبر عام ہوتے ہی لوگوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی ہے۔ سُلطان التمش بھی یہ خبر سُنتے ہی خوشی سے دیوانہ ہو اُٹھا ہے اور جوش کے عالم میں حضرت خواجہؒ کے پیروں کو بار بار چوم رہا ہے اور بعد میں خواجہ بختیار کاکی کے ساتھ خوشی خوشی دلی واپس آ رہا ہے۔

محمد منظور نعمانی

تحدیثِ نعمت

(۱۱)

حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں (۲)

(گذشتہ سے پیوستہ)

اس سلسلہ کی غالباً پچھلی قسط میں ایک بڑی جماعت کے ساتھ حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے لکھنؤ اور رائے بریلی کے سفر کا ذکر کیا گیا تھا — جس میں اس عاجز کو بھی رفاقت نصیب ہوئی تھی۔ — وہ جب ۱۳۶۲ھ کے اواخر میں ہوا تھا، اُس سے واپسی کے چند ہی مہینوں کے بعد حضرت مولاناؒ کے اُس آخری مرض کا سلسلہ شروع ہو گیا جس کا اختتام ۲۱ رجب ۱۳۶۳ھ کو وصال پر ہی ہوا — حضرت کے وصال سے قریباً ۳ مہینے پہلے (ربیع الاول یا ربیع الثانی ۱۳۶۳ھ میں) مراد آباد کے ایک سفر میں جو تبلیغی کام ہی کے سلسلے میں کیا گیا تھا، بعض ایسے حضرات سے ملاقات ہوئی جو دہلی سے آئے ہوئے تھے اور حضرت مولاناؒ سے عقیدت و محبت اور ان کے تبلیغی کام سے بھی تعلق رکھتے تھے — انہی سے حضرت کی بیماری کی تشویشناک نوعیت کا اس عاجز کو علم ہوا تو زیارت و عیادت کی نیت سے میں وہیں سے دہلی روانہ ہو گیا — حُسنِ اتفاق جس دن میں نظام الدین پہنچا اس سے کئی دن پہلے سے قدوتنا حضرت مولانا شاہ عبد القادر رائے پوری (قدس سرہ) اور شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مدظلہ بھی مولانا کی زیارت و عیادت ہی کے لئے وہاں تشریف لائے ہوئے تھے، اور اسی دن ان حضرات کی واپسی کا پروگرام تھا — حضرت رائے پوری قدس سرہ نے روانہ ہوتے وقت مجھے الگ مسجد

کے ایک کونے میں بٹھلایا اور ارشاد فرمایا کہ

"مولوی صاحب! اور کام تو عمر بھر کروگے اس وقت جتنا بھی ہو سکے یہاں پڑے رہو آج کل یہ بڑھیاں ہزاروں میل روز کی رفتار سے جارہے ہیں"۔

سچی بات یہ ہے کہ میں حضرت کے اس ارشاد کا مطلب تو پوری طرح سمجھ نہیں سکا کیونکہ اُس رُوحانی پرواز سے خود واقف نہ تھا جس کی طرف حضرت نے اشارہ فرمایا تھا تاہم میں نے یہ طے کرلیا تھا کہ جب تک حضرت مولانا کی بیماری کا سلسلہ ہے میں انشاء اللہ یہیں رہوں گا۔ اور دو تین ہفتہ کے بعد رسالہ الفرقان[1] اور اُس کی دفتری ضروریات کی دیکھ بھال کے لئے دو چار دن کے واسطے بریلی چلا جایا کروں گا۔ پھر یہی معمول رہا۔

جب میں نظام الدین حاضر ہوا ہوں تو حضرت کا ضعف اس درجہ کو پہونچ چکا تھا کہ خود کھڑے بھی نہیں ہو سکتے تھے، دوسرے ہی لوگ جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے اس بندے کی خدمت کی سعادت بخشی تھی اُٹھا کر کھڑا کرتے، اور نماز کے وقت وہی خدام امام کی جگہ مصلے پر لاکر کھڑا کر دیتے، لیکن نہیں معلوم کہ مصلے پر کھڑے ہونے اور تکبیر تحریمہ کہہ کے نماز شروع کرنے کے بعد کہاں سے قوت آجاتی کہ پوری نماز اچھے خاصے تندرستوں کی طرح کھڑے ہوکر اور ہمیشہ کی عادت کی طرح رکوع و سجود کے ساتھ پڑھاتے کسی سہارے کی بالکل ضرورت نہ ہوتی ــــ لیکن سلام پھیرنے کے بعد فوراً ہی حالت میں ایسا فرق پڑجاتا کہ سیدھے بیٹھ بھی نہ سکتے اور وہی خدام دیوار سے کمر لگا کر بٹھا دیتے ـــــ پھر اسی حالت میں فجر کی نماز کے بعد روزانہ تقریر بھی فرماتے، اور اس تقریر کے دوران پھر قوت کی آجاتی ـــــ یہ واقعہ ہے کہ اگر حضرت کا یہ حال بچشم خود نہ دیکھا ہوتا تو کسی کے بتلانے سے صحیح طور پر سمجھ نہ سکتا اور سمجھ لیتا تو یقین نہ آتا، کہ ایسا کمزور اور بے جان آدمی اس طرح نماز پڑھ سکتا اور پڑھا سکتا ہے اور اس طرح دل کے پورے جذبے کے ساتھ تقریر کر سکتا ہے۔

کچھ دنوں کے بعد جب ضعف اور زیادہ بڑھ گیا تو خود امامت نہ فرماتے لیکن جب جماعت کھڑی ہوتی اور اقامت کہی جاتی تو خدام آپ کو صفِ اوّل میں کھڑا کر دیتا اور آپ امام کی اقتدا میں پوری

---

[1] الفرقان اس زمانہ میں بریلی سے نکلتا تھا اور اس کی وجہ سے میرا مستقر اُس وقت بریلی ہی تھا۔

نماز کھڑے ہو کر ہی ادا کرتے ــــــــ پھر جب کچھ دنوں کے بعد ــ ضعف اور زیادہ ہو گیا تو آپ کو صفِ اوّل میں بٹھا دیا جاتا اور آپ بیٹھ کر نماز ادا کرتے۔

آخری دنوں میں جب بیٹھنے کے قابل بھی نہ رہے تو آپ کے پلنگ کو پہلی صف کے ساتھ لگا دیا جاتا اور آپ لیٹے لیٹے جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتے، آخری دن تک یہی معمول رہا۔

اس آخری حالت میں بھی دین کی فکر اور مسلمانوں کی دین سے دُوری کے درد کا غلبہ اتنا زیادہ تھا کہ جس نے نہیں دیکھا وہ سُن کر یا تحریر میں پڑھ کر کچھ نہیں سمجھ سکتا ــــ حالت یہ ہو گئی تھی کہ کمزوری کی وجہ سے اتنی آواز بھی نہیں نکل سکتی تھی کہ قریب کا آدمی سُن سکے تو بعض خاص خادموں کو اشارہ فرماتے کہ اپنا کان میرے لبوں سے لگا دو، جب وہ کان لگا دیتے تو آپ ان سے فرماتے کہ میری طرف سے یہ بات حاضرین سے کہہ دو! وہ منھ پر کان رکھ کے بھی بمشکل ہی آپ کی بات سمجھ سکتے اور پھر لوگوں کو آپ کا پیام پہونچاتے۔

آپ کے وطن کاندھلہ سے آپ کے بعض اعزہ عیادت اور مزاج پرسی کے لئے آئے، ان سے آپ نے دریافت کیا کہ آپ لوگ کیوں آئے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ آپ کی خیریت اور خبر لینے آئے ہیں ــــ آپ نے فرمایا کہ جو مرنے اور مٹنے ہی کے لئے ہے اس کی خبر اور خیریت لینے کے لئے اتنی دُور سے آئے ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین عزیز مِٹ رہا ہے اور اس کی خبر لینے کی کوئی فکر نہیں۔

کسی حکیم یا ڈاکٹر کو علاج کے لئے بُلانے کی اجازت تب ہی دیتے جبکہ یہ اطمینان ہوتا کہ ان سے دین کی بات کہی جا سکے گی اور ان کو دعوت دی جا سکے گی۔

بیماری کے آخری مرحلہ میں (جہاں تک یاد ہے وصال سے قریباً دو ہفتے پہلے) حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ ڈاکٹر شوکت اللہ صاحب انصاری کو لے کر آئے (جو اُس وقت دلّی کے ممتاز ڈاکٹروں میں تھے) ان کے ساتھ ایسے ہی ایک دوسرے بڑے ڈاکٹر اور بھی تھے۔ ــــ حضرت کو اطلاع دی گئی، فرمایا کہ جب وہ مجھے دیکھنے کے لئے میرے پاس آئیں تو اُنکے بیٹھنے کا انتظام ایسا کرو کہ وہ آکر فوراً ہی مجھے دیکھنے نہ لگیں، میں پہلے اُن سے اپنی بات کہونگا، اس کے بعد وہ مجھے دیکھیں ــ چنانچہ ایسا ہی انتظام کیا گیا ــــ حضرت مفتی صاحب اور دونوں ڈاکٹر صاحبان، اندر حجرہ میں جہاں حضرت کا پلنگ تھا، تشریف لائے اور پلنگ سے ذرا

فاصلہ پر ان حضرات کے لئے جو قالین بچھوایا گیا تھا، اُس پر بیٹھ گئے۔

—— حضرت نے انتہائی کمزور آواز میں ڈاکٹر صاحبان کو مخاطب کر کے فرمایا:۔

" ڈاکٹر صاحب آپ کے پاس ایک فن ہے جس سے مخلوق استفادہ کرتی ہے اور میں نے اس فن میں آپ کی تعریف سُنی ہے۔ لیکن یہ وہ فن ہے جس کو ماند کرنے کے لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو چند ظاہری معجزے (مادرزاد اندھوں اور کوڑھیوں کو اچھا کر دینا اور مُردوں کو زندہ کر دینا) دیکر بھیجا گیا تھا، اور یہ تو آپ جان سکتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جو رُوحانی علوم دیئے گئے تھے وہ اِن ظاہری معجزوں سے بدرجہا اعلیٰ اور افضل تھے —— تو مجھے آپ سے یہ کہنا ہے کہ ہمارے حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ جو رُوحانی علوم اور دینی احکام بھیجے گئے ہیں وہ وہ ہیں جنھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رُوحانی علوم اور ان کی لائی ہوئی شریعت کو غیر چلن دار کر دیا، تو ذرا سوچیئے کہ حضورؐ کی لائی ہوئی اِن رُوحانی چیزوں کی طرف توجہ نہ کرنا کتنی بڑی چیز کی ناقدری ہے —— لوگوں سے ہم بس یہی کہتے ہیں کہ وہ اس نعمت سے فائدہ اٹھائیں ورنہ بڑے گھاٹے میں رہیں گے "۔——

حضرت نے جب اپنی یہ بات پوری فرمائی تو ڈاکٹر صاحبان کو طبی معائنہ کا موقع دیا۔ اُن حضرات نے اپنے طریقے پر خوب اچھی طرح دیکھا بھالا —— حجرہ سے باہر آکر اِن دونوں حضرات نے آپس میں انگریزی زبان میں کچھ گفتگو کی۔ اس کے بعد ڈاکٹر شوکت اللہ انصاری صاحب نے حضرت مفتی صاحب سے کہا کہ ہم دونوں اس پر گفتگو کر رہے تھے کہ ہمارے فنی اور طبی حساب سے تو اس شخص میں کچھ بھی نہیں رہا ہے پھر یہ شخص بولتا کہاں سے ہے۔ ہم اس کے سوا کچھ نہیں سمجھ سکے کہ یہ بات ہمارے فن سے بالاتر ہے، کوئی رُوحانی طاقت ہے جس سے یہ شخص زندہ ہے اور بول رہا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی اس آخری بیماری میں حضرت کی خدمت میں قیام کی جو توفیق ملی یہ اس گنہگار بندہ پر اُس کے رب کریم کی خاص الخاص نعمت تھی۔ دین کی بہت سی حقیقتیں جو کتابوں کی عبارتوں سے پوری طرح سمجھ میں نہیں آسکتی تھیں حضرت کا حال دیکھ کے الحمد للہ کچھ سمجھ میں آگئیں۔ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور خواص امت کے احوال کا سمجھنا

کچھ آسان ہوگیا۔

میرے ایک دوست اور دورۂ حدیث کے ہم سبق عالم دین، جو کتب تصوف کے مطالعہ کا بھی ذوق رکھتے تھے، انھوں نے سنایا کہ ایک دفعہ میں نے تصوف کی ایک کتاب کا نام لے کر حکیم الامت حضرت تھانوی رح کی خدمت میں عرض کیا کہ حضرت نے وہ کتاب تو ملاحظہ فرمائی ہوگی؟

حضرت نے ارشاد فرمایا:——

"مولانا! میں نے کتب زیادہ نہیں دیکھیں، ہاں ایک قطب دیکھا ہے"

اس سے حضرت کا اشارہ اپنے مرشد حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہٗ کی طرف تھا۔ سبحان اللہ! کس قدر بلیغ اور کیسا حقیقت افروز ارشاد ہے۔

جناب ڈاکٹر سمیع الحق صاحب
صدر شعبۂ اردو، رانچی یونی ورسٹی

جمعہ

(سورۂ جمعہ کا آزاد منظوم اردو ترجمہ)

(۱)

سب اہلِ زمیں اہلِ سموات ہیں پڑھتے — اللہ کی تسبیح جو مالک ہے جہاں کا
قدوس، عزیز اور حکیم اپنے تئیں ہے — وہ جسکی ثنا شیوہ ہو سب اہلِ فغاں کا
ان لوگوں میں مبعوث کیا اُس نے پیمبرؐ — پہچانتے تھے لفظ نہ جو علم و بیاں کا
آیاتِ الٰہی وہ سناتے ہیں سبھی کو — اور تزکیہ کرتے ہیں ہر اک پیر و جواں کا
سکھلاتے ہیں قرآن سے حکمت کی وہ باتیں — چاہے کہ رہا ہو کوئی بدکار جہاں کا
وہ دوسرے جو شاملِ اصحابؓ نہیں ہیں — دیں گے وہ پیام انکو بھی تزکیۂ جاں کا

یہ فضلِ الٰہی ہے جسے چاہے وہ بخشے
اللہ کا ہے فضل بڑے فضل رساں کا

(۲)

وہ جن کو بنایا گیا توراۃ کا حامل — پر اُس کے ہی احکام سے سر پھیر چکے ہیں
ہے اُن کے سرِ پشت کتابوں کا گراں بار — گویا کہ وہ گدھے ہیں جو بوجھوں سے لدے ہیں
کتنا ہی بُرا حال ہے اربابِ جفا کا — اللہ کی باتوں کو جو جھٹلاتے رہے ہیں
اللہ نہیں دیتا انھیں ذوقِ ہدایت — جو ظلم سے قانون کی حد توڑ چکے ہیں
پوچھ اُن سے جو کہلاتے ہیں دُنیا میں یہودی — کیا رشتۂ یاری ہیں خدا ان سے جُڑے ہیں

یہ زعم ہے باطل کہ جہاں بھر سے الگ وہ
گر ایسا ہے تو موت کی کرلیں وہ تمنا
ہرگز نہ کبھی موت کی خواہش وہ کریں گے

اللہ کی الفت کے سزاوار ہوئے ہیں
دیکھنا دعوے میں نہ سچے وہ رہے ہیں
[illegible] سے لگے ہیں

اللہ پہ ظاہر ہے جفاکاروں کی نیت
کہہ ان سے کہ تم موت سے کیا بھاگ رہے ہو
پھر تم کو وہ پلٹائے گی اللہ کی جانب

وہ ذرے کی طرح ان کو سمجھ بوجھ رہے ہیں
لینے کو تمہیں موت کے آغوش کھلے ہیں
جو غائب و موجود کے دانندہ بڑے ہیں

دکھلائیں گے وہ تم کو تمہارے سبھی کرتوت
اس وقت جانوگے کہ کیا کرتے رہتے ہیں

(۴)

جب جمعہ کو مسجد سے ندا آئے اذاں کی
بازار جہاں چھوڑ کے مسجد میں پہنچ
جب ذکر خدا سے ہو تو فارغ تو بکھر جا
ہر حال میں غافل نہ ہو تو یاد خدا سے

بڑھ یاد خدا کے لیے اے مومن دیندار
اور جان لے اس میں ہیں چھپے خیر کے آثار
جا دھرتی پہ ہو فضل الٰہی کا طلبگار
بہبودی ہے مطلوب تو رکھ کثرت اذکار

جب دیکھتے ہیں کوئی تجارت یا تماشا
رہتے ہیں کھڑے آپ وہاں منتظر ان کے
بیوپار یا تفریح سے بڑھ کر

اس سمت لپک جاتے ہیں روزی کے طلبگار
اس طرح کا مومن کا کہیں ہوتا ہے کردار
کس چیز سے راضی ہو خداوند جہاندار

ہیں رزق رساں جتنے ذرائع بھی جہاں میں
ہے سب سے بڑا رازق کا اللہ نگہدار

بریلوی فتنہ کا نیا روپ
ارشد القادری صاحب کی کتاب "زلزلہ" کا
تنقیدی جائزہ اور تحقیقی جواب
از مولانا محمد عارف سنبھلی استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ
اس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ
ارشد القادری صاحب نے "زلزلہ" میں علماء دیوبند پر جو الزامات لگائے ہیں وہ خود دھوکہ اور فریب ہیں۔ ان میں ذرہ برابر بھی سچائی نہیں ہے
توحید اور شرک کی حقیقت پر ایسی روشنی ڈالی گئی ہے اور علم غیب اور تصرف ان دونوں مسئلوں کی ایسی تنقیح و تحقیق کی گئی ہے جس کے بعد کسی غلط فہمی کی گنجائش نہیں رہتی
آخر میں
بریلی کے تکفیری فتنہ کی تاریخ اور تعارف پر ایک مستقل بصیرت افروز اور زلزلہ افگن مضمون ہے
شروع میں مولانا محمد منظور نعمانی کا ایک مفصل مکتوب ہے
وہ گویا اس کتاب کا پیش لفظ ہے:
قیمت: پانچ روپے

Regd. No. LW/NP-62

Monthly 'ALFURQAN' Kutchery Road, Lucknow U. P.

VOL. 43 NO. 1 JANUARY, 1975 Phone : 25547

Cover Printed at—Shining Press, Naya Ganj, Lucknow-1

الفرقان لکھنؤ

مدیر

محمد منظور نعمانی

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
ایک پونڈ
(یا ہندوستانی بیس روپے)
ہوائی ڈاک کے لیے مزید
محصول ڈاک کا اضافہ ہوگا

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۱۲/
پاکستان سے ۲۴/
ضخامت ۸۴ صفحات
قیمت فی کاپی ۱/۴۰
اس مشترکہ شمارہ کی قیمت ۲/-

جلد ۴۳ | بابت ماہ فروری و مارچ ۱۹۷۵ء مطابق محرم و صفر ۱۳۹۵ھ | شمارہ ۲ و ۳

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں۔ یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۵ مارچ تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی۔ پی ارسال ہوگا۔
نمبر خریداری :۔ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجئے جو پتہ کی چٹ پر لکھا رہتا ہے۔
تاریخ اشاعت :۔ الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے، اگر ۲۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں۔ اس کی اطلاع ۲۸ تاریخ تک آجانی چاہیے اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

"دوسرا انتخاب نمبر"

یہ فروری اور مارچ کا مشترک شمارہ ہے۔ اس کے بعد انشاء اللہ

الفرقان کا "دوسرا انتخاب نمبر" ہی شائع ہوگا

"الفرقان" اب سے ٹھیک ۴۲ سال پہلے ۱۳۵۳ھ کے آغاز میں بریلی سے جاری ہوا تھا۔ ساڑھے تیرہ سال اس کا دفتر بریلی رہا۔ پھر ۱۳۶۶ھ کے وسط (۱۹۴۷ء کے شروع) میں لکھنؤ منتقل ہو گیا۔۔۔ یہ شمارہ جو آپ کے ہاتھ میں ہو سنہ ہجری کے حساب سے تینتالیسویں سال کا پہلا شمارہ ہے۔

"پہلا انتخاب نمبر" جس میں بریلی کے تیرہ سالہ دور کے منتخب مضامین شائع کیے گئے تھے۔ گزشتہ سال شائع ہوا تھا۔ خوشی ہے اور اللہ تعالیٰ کا بیحد شکر کہ عام طور سے اس کو بہت مفید سمجھا گیا اور مختلف موضوعات و مسائل سے متعلق وہ مضامین جو ۳۰۔۴۰ سال پہلے بڑی محنت سے لکھے گئے تھے اور جن کی آج بھی وہی اہمیت و افادیت ہے جو اس وقت تھی اور وہ الفرقان کے پرانے فائلوں میں دفن تھے، الحمدللہ اس نمبر کے ذریعہ دوبارہ زندہ ہو کر پھر منظر عام پر آ گئے اور محفوظ ہو گئے۔

اب "دوسرا انتخاب نمبر" جس کی تیاری شروع ہو چکی ہے، انشاء اللہ مئی کے وسط یا اواخر میں ناظرین تک پہونچ جائے گا۔۔۔ لکھنوی دور کے ابتدائی ۸۔۱۰ سالوں میں جو ایسے مضامین شائع ہوئے جن کی آج بھی وہی افادیت اور اہمیت ہے جو اب سے ۲۰۔۲۵ سال پہلے اسوقت تھی جب وہ لکھے گئے تھے وہ سب انشاء اللہ اس دوسرے انتخاب نمبر کی شکل میں ناظرین کو مل جائیں گے۔۔۔ ان میں زیادہ تر مضامین وہ ہیں جن کا تعلق اُن حالات اور مسائل سے ہے جو ملک کی آزادی کے بعد مسلمانان ہند کے لیے پیدا ہوئے۔۔۔ امید ہے کہ انشاء اللہ اس دوسرے انتخاب نمبر کو پہلے نمبر سے بھی زیادہ مفید سمجھا جائے گا۔

ایک ضروری بات:۔ اگرچہ الفرقان کے بدل اشتراک (سالانہ چندہ اور قیمت) میں اتنا اضافہ کر دینا پڑا ہے جس سے خود اپنے دل پر بوجھ ہے، لیکن صورت حال یہ ہے کہ اب بھی "الفرقان" کے آمد و صرف کا توازن صحیح نہیں ہے۔ اس کے مصارف آمدنی سے زیادہ ہیں۔ اور اس کی کچھ تلافی صرف اشتہارات ہی سے ہو سکتی ہے۔۔۔ لہٰذا جو مخلص احباب ایک اشتہار کی فراہمی کے لیے بھی سعی فرما سکیں وہ دریغ نہ فرمائیں "دوسرا انتخاب نمبر" جو تیار ہو رہا ہے اس کے لیے اشتہارات تو زیادہ سے زیادہ آخر اپریل تک آ جانے چاہئیں۔۔۔ اور مستقل اشتہارات کے لیے جب آپ کی کوشش کامیاب ہو سکے۔

اشتہار کا نرخ نامہ

دفتر سے طلب فرمایا جا سکتا ہے

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نگاہِ اوّلیں

محمد منظور نعمانی

دسمبر کے شمارہ میں "قادیانیوں اور قادیانیت سے متعلق ایک مضمون پر گفتگو کی گئی تھی جو پہلے دہلی کے ماہنامہ "شبستان" میں مولانا محمد عثمان فارقلیط کے نام سے شائع ہوا تھا اور پھر اس کے حوالہ سے نقل ہو کر قادیانیوں کے متعدد اخبارات و جرائد میں شائع ہوا ـــــ راقم سطور نے اس کو سری نگر کشمیر سے شائع ہونے والے قادیانیوں کی لاہوری شاخ کے ہفتہ وار "روشنی" ہی میں پڑھا تھا ـــــ الفرقان کے ناظرین کو جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے، فارقلیط صاحب نے اس مضمون کی تمہید میں یہ ظاہر کر دیا تھا کہ ـــ جو کچھ اس مضمون میں لکھا گیا ہے وہ میرے اپنے خیالات نہیں بلکہ، کچھ دانشوروں کے خیالات ہیں جن کو اس لئے شائع کیا جا رہا ہے کہ علمار محققین ان کا تشفی بخش جواب دیں (اور اسی لئے الفرقان کے جوابی مضمون میں روئے سخن ان "دانشوروں" ہی کی طرف رکھا گیا تھا)ـــ

ـــــ لیکن یہ واقعہ ہے کہ مضمون کی تمہید میں فارقلیط صاحب کی اس وضاحت اور صراحت کے باوجود عام طور سے اُس کو خود فارقلیط صاحب ہی کا مضمون اور ان کے خیالات کا ترجمان سمجھا گیا اور چونکہ اُن کی شخصیت ایک معروف شخصیت ہے، اس لئے علم و استدلال کے لحاظ سے مضمون کے بالکل ہی بے جان اور سراسر مہمل ہونے کے باوجود بیچارے بہت سے وہ لوگ جو اُس کی غلطیوں اور مغالطوں کو خود نہیں سمجھ سکتے تھے اس سے متاثر ہوئے اور جو متاثر نہیں ہوئے اُن کو فارقلیط صاحب کی نسبت اور تعلق سے سخت پریشانی ہوئی ـــــ اسی لئے راقم سطور نے بھی اس پر لکھنا ضروری سمجھا ـــ اور الحمد للہ کہ عام طور سے اس کو "تشفی بخش" سمجھا گیا اور ملک کے متعدد وسیع جرائد میں اس کو نقل بھی کیا گیا۔

اس سلسلہ میں انتہائی خوشی کی بات یہ ہے کہ خود فارقلیط صاحب نے بھی الفرقان کے جوابی

مضمون سے اتفاق کیا اور اس کو درست قرار دیا، اپنے بعض خطوط میں بھی جو راقم سطور کے خطوط کے جواب میں انھوں نے لکھے اور اپنے ایک اخباری بیان میں بھی جو ۲۵ جنوری کے روزنامہ "دعوت" دہلی میں شائع ہوا ہے، اس بیان میں موصوف نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ "شبستان" میں جو مضمون اُن کے نام سے شائع ہوا وہ دراصل ان کا لکھا ہوا نہیں تھا، غلطی سے اُن کے نام سے شائع ہو گیا۔ اس سلسلہ میں بیان کا اصل متن یہ ہے:۔

"چند علم یافتہ حضرات ایک طویل تحریر لیکر راقم کے پاس آئے اور اس کی اشاعت پر زور دیا۔ راقم نے اصل مضمون سے بہت کچھ حذف و ترمیم کے بعد مضمون واپس کر دیا جو ماہنامہ شبستان میں شائع کر دیا گیا۔ مضمون کے آغاز میں راقم نے لکھ دیا تھا کہ دانش وروں کے یہ خیالات اس لئے پیش کئے جا رہے ہیں کہ علماء کرام ان کا تسلی بخش جواب دیں۔ یہ بھی لکھ دیا تھا کہ راقم کے اپنے خیالات محفوظ ہیں۔ راقم نے مضمون کا عنوان دانشوروں کے لئے چھوڑ دیا تھا، مگر وہ اس پر کوئی عنوان نہ لگا سکے اور ایڈیٹر نے غلطی سے اس پر میرا نام دیدیا، اور لوگ غلطی میں پڑ گئے کہ اصل مضمون میری طرف سے شائع ہوا ہے۔

مضمون کے جواب میں دو اسلامی ماہناموں نے بہت کچھ لکھا، ماہنامہ تجلی دیوبند اور الفرقان لکھنؤ کے جوابات درست پائے گئے۔"

(روزنامہ دعوت دہلی ۔ ۲۵ جنوری ۱۹۷۵ء)

اُمید ہے کہ جو لوگ فاروقلیط صاحب کی نسبت اور نام ہی کی وجہ سے "شبستان" کے اس مضمون سے متاثر ہو کر غلط فہمی میں یا خود فاروقلیط صاحب کے متعلق بدگمانی میں مبتلا ہو گئے تھے، اس بیان کے بعد اُن کا ذہن صاف ہو جائے گا اور غلط فہمی دور ہو جائے گی۔

"شبستان" والے اُس مضمون میں، جیسا کہ ہمارے ناظرین کو معلوم ہے اُن "دانشور" حضرات نے "مسئلہ نزول مسیح" پر بھی گفتگو کی تھی، اس موضوع سے متعلق انکی جن باتوں کے بارہ میں ہمارا یہ اندازہ تھا کہ بیچارے عام ناظرین انکی غلطی کو خود نہ سمجھ سکیں گے اور شک و شبہ میں پڑ جائیں گے، ان پر بقدر کافی دسمبر کے مضمون میں لکھ دیا گیا تھا اور اس مسئلہ پر آئندہ لکھنے کا وعدہ بھی کیا گیا تھا ۔۔۔ وہ وعدہ اسی شمارہ میں پورا کیا جا رہا ہے۔ ناظرین کرام ان سطور کے بعد اسی کو پڑھیں گے۔ امید ہے کہ جو کچھ لکھا گیا ہے انشاء اللہ ان لوگوں کے لئے جو فہم سلیم سے محروم نہیں ہیں اس مسئلہ میں اطمینان اور بصیرت کا موجب ہو گا۔ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ

مسئلۂ نزولِ مسیح

محمد منظور نعمانی

مسلمانوں کے عقیدہ نزولِ مسیح اور حیاتِ مسیح کی بنیاد دو چیزوں پر ہے۔ ایک قرآن مجید کی بعض آیات — اور دوسرے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وہ کثیر التعداد احادیث جو مجموعی اور معنوی حیثیت سے یقیناً حدِ تواتر کو پہونچی ہوئی ہیں۔

اس تواتر کا مطلب یہ ہے کہ حدیث کی پچاسوں کتابوں میں مختلف سندوں اور مختلف عنوانات سے اتنے صحابہ کرام سے نزولِ مسیح کی یہ حدیثیں روایت کی گئی ہیں جن کے متعلق (ان کی صحابیت سے قطع نظر کرکے بھی) ازروئے عقل و عادت یہ شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے باہم کوئی سازش کرکے حضورؐ پر یہ بہتان باندھا ہو یا حضورؐ کی بات سمجھنے میں اُن سب سے غلطی ہوئی ہوگی — پھر اسی طرح ان صحابۂ کرام سے روایت کرنے والوں اور پھر اُن سے روایت کرنے والوں کی تعداد ہر طبقہ اور ہر دور میں اتنی بڑھتی چلی گئی کہ خالص عقلی اور عادی طور پر اُن کے متعلق بھی اس قسم کا کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

یہ بات کہ اس قسم کے تواتر سے کسی چیز کا یقینی اور قطعی علم حاصل ہو جاتا ہے اور اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی، آپ اس مثال سے اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ آپ نے مثلاً لندن شہر نہیں دیکھا پیرس نہیں دیکھا، نیویارک اور ماسکو نہیں دیکھا، بغداد اور قاہرہ بھی نہیں دیکھا، لیکن آپ کو اس میں قطعاً کوئی شبہ نہیں کہ یہ سب شہر دنیا میں موجود ہیں — آپ غور کریں اور سوچیں کہ یہ یقین آپ کو کس وجہ سے اور کس دلیل سے حاصل ہوا؟ — صرف اس وجہ سے کہ آپ نے ان شہروں کا مختلف لوگوں سے اتنا تذکرہ سنا ہے اور کتابوں اور اخباروں میں ان کا ذکر اس قدر پڑھا ہے کہ جس کے بعد آپ کے لیے

کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہی ـــــ بس اسی کا نام تواتر ہے اور خاص علمی اصطلاح میں اس قسم کے تواتر کو "تواترِ قدرِ مشترک" کہتے ہیں۔

بہرحال نزولِ مسیح کا مسئلہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے اسی طرح کے تواتر سے ثابت ہے۔ حدیث کی قریباً سب ہی کتابوں میں اس مسئلہ سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو حدیثیں روایت کی گئی ہیں اُن کو سامنے رکھنے کے بعد ہر سلیم العقل کو بالکل قطعی اور یقینی علم اس بات کا حاصل ہوجاتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دوبارہ اس دنیا میں آنے کی اطلاع اپنی اُمّت کو ضرور دی تھی ـــــ حضرت استاذ مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہٗ نے اب سے قریباً پچاس سال پہلے اس مسئلہ سے متعلق احادیث و روایات کو حدیث کی متفرق کتابوں سے چھانٹ کر اپنے ایک رسالہ "التصریح بما تواتر فی نزول المسیح" میں جمع کردیا تھا، اس میں سترؔ سے اوپر مرفوع حدیثیں ہیں جن میں سے قریباً ۳۰ وہ ہیں جو سند کے لحاظ سے محدثین کے نزدیک صحیح یا حسن درجہ کی ہیں ـــــ حالانکہ تواتر اور حصولِ یقین کے لئے اس سے بہت کم تعداد کافی ہوتی ہے۔

بہرحال اس مسئلہ سے متعلق حدیثیں بلاشبہ حدِ تواتر کو پہونچی ہوئی ہیں اور ماہرین حدیث و روایت نے اس تواتر کی تصریح بھی کی ہے۔ صحیح بخاری کے شارح اور مشہور مفسر قرآن حافظ ابن کثیر اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:۔

وقد تواترت الاحادیث عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہ اخبر بنزول عیسیٰ علیہ السلام قبل یوم القیامۃ

(تفسیر ابن کثیر ص ۱۳۲ ج ۴)

احادیث متواترہ سے یہ بات معلوم ہوچکی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے قیامت سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نازل ہونے کی خبر اُمّت کو دی تھی۔

مرزا غلام احمد قادیانی کا اقرار و اعتراف

یہاں ناظرین کو یہ بتادینا بھی مناسب اور مفید ہوگا کہ خود مرزا غلام احمد قادیانی نے بھی اس کا اقرار و اعتراف کیا ہے کہ نزولِ مسیح سے متعلق حدیثیں متواتر ہیں اور ان کا تواتر اوّل درجہ کا ہے ـــ

— "ازالۃ الاوہام" میں لکھتے ہیں :۔

"مسیح بن مریم کے آنے کی پیشین گوئی ایک اوّل درجہ کی پیشین گوئی ہے جس کو سب نے بالاتفاق قبول کر لیا ہے۔ اور جس قدر صحاح میں پیشین گوئیاں لکھی گئی ہیں کوئی پیشین گوئی اس کے ہم پلّہ اور ہم وزن ثابت نہیں ہوئی، تواتر کا اوّل درجہ اس کو حاصل ہے"۔

——— (ازالہ ص ۲۳۱)

یہاں اس حقیقت کا علم بھی ناظرین کے لئے موجب بصیرت ہوگا کہ مرزا صاحب مسیحیت کے دعوے کے بعد بھی طویل مدّت تک (دس بارہ سال تک) سب مسلمانوں کی طرح یہی یقین رکھتے تھے کہ حضرت مسیح علیہ السّلام آسمان پر زندہ ہیں اور جیسا کہ حدیثوں میں بتلایا گیا ہے وہ آخر زمانہ میں نازل ہوں گے، اور کہتے تھے کہ الہامات میں مجھے جو "مسیح" کہا گیا ہے اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ میں "مثیل مسیح" ہوں۔

— "براہین احمدیہ" جو اُن کی ابتدائی دور کی تصنیفوں میں سے ہے، اس کے ایک حاشیہ میں انھوں نے لکھا تھا:۔

"اور جب حضرت مسیح علیہ السلام دوبارہ دنیا میں تشریف لائیں گے تو ان کے ہاتھ سے دین اسلام جمیع آفاق واقطار میں پھیل جائے گا"۔

——— (براہین احمدیہ ص ۴۹۸-۴۹۹ حاشیہ در حاشیہ)

اور مرزا صاحب کے فرزند اور خلیفہ مرزا محمود نے "حقیقۃ النبوۃ" میں لکھا ہے کہ :—

"حضرت مسیح موعود باوجود مسیح کا خطاب پانے کے دس سال تک یہی خیال کرتے رہے کہ مسیح آسمان پر زندہ ہے حالانکہ آپ کو اللہ تعالیٰ مسیح بنا چکا تھا جیسا کہ براہین کے الہامات سے ثابت ہے"۔

——— حقیقۃ النبوۃ ص ۱۴۲

مرزا صاحب اور مرزا محمود کی ان عبارتوں سے دو باتیں صاف طور پر معلوم ہو گئیں۔ ایک یہ کہ نزول مسیح سے متعلق احادیث حد تواتر کو پہونچی ہوئی ہیں اور ان کا تواتر اوّل درجہ کا ہے — اور دوسرے یہ کہ مرزا صاحب نے بھی ان حدیثوں سے یہی سمجھا تھا کہ حضرت مسیح بن مریم (جو اسرائیلی سلسلہ کے آخری پیغمبر تھے جن کا ذکر قرآن مجید میں بار بار کیا گیا ہے وہی) آخر زمانہ میں آسمان سے نازل ہوں گے • اور انہی حدیثوں کی بنا پر ان کو اس عقیدہ پر ایسا یقین اور اطمینان تھا کہ (بقول اُنکے)

تعجب اُن کے خدا نے الہام میں اُن کو "مسیح" قرار دیا تو انھوں نے اس کا مطلب صرف یہ سمجھا کہ میں مثیلِ مسیح ہوں اور اس کے بعد بھی دس سال تک یہی سمجھتے رہے اور اسی عقیدے پر قائم رہے جو انھوں نے حدیثوں سے سمجھا تھا اور جو پوری امت نے سمجھا اور جو سب مسلمانوں کا عقیدہ تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آخر زمانہ میں آسمان سے نازل ہوں گے۔

پھر مدت کے بعد (سنہ ۱۸۹۱ء میں) مرزا صاحب نے دعویٰ کیا کہ میں ہی وہ "مسیح بن مریم" اور "عیسیٰ بن مریم" ہوں جن کے نازل ہونے کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی کثیر التعداد حدیثوں میں اُمت کو خبر دی تھی۔

جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے عقل و فہم سے بالکل محروم نہیں کیا ہے وہ سوچیں کہ مرزا صاحب کا یہ دعویٰ کتنا مہمل اور معقولیت سے کس قدر دور ہے ــــ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات میں جہاں جہاں مثلاً حضرت ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ، موسیٰؑ، ہارونؑ اور ان کے علاوہ جن پیغمبروں کا نام کے ساتھ ذکر کیا وہاں تو وہی پیغمبر مراد ہوں ــ جن کا اِن ناموں سے قرآن پاک میں ذکر کیا گیا ہے اور جو ان ناموں سے معروف ہیں لیکن نزولِ مسیح سے متعلق پچاسوں حدیثوں میں جہاں جہاں آپؐ نے "مسیح بن مریم" اور "عیسیٰ بن مریم" کا ذکر کیا ہے اور آخر زمانہ میں ان کے نزول کی خبر دی ہے اس سے آپؐ کی مراد وہ مسیح اور عیسیٰ نہ ہوں جن کا اس نام سے قرآن پاک میں ذکر کیا گیا ہے اور جو اس نام سے معروف ہیں بلکہ ان سب حدیثوں میں مسیح بن مریم اور عیسیٰ بن مریم سے مراد مرزا غلام احمد قادیانی جیسا اُن کا کوئی مثیل ہو ــــ لاحول ولا قوۃ الا باللہ ــــ کیا اس سے زیادہ مہمل اور خلافِ عقل کوئی بات کبھی یا سوچی جا سکتی ہے؟ لیکن حیرت ہے کہ قادیانیوں میں مولوی محمد علی لاہوری اور خواجہ کمال الدین جیسے "دانشوروں" اور تعلیم یافتوں نے بھی اس کو قبول کر لیا اور نہ صرف قبول کر لیا بلکہ زور شور سے اس کی وکالت شروع کر دی ــــ بلاشبہ حق فرمایا اللہ تعالیٰ نے "وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ" ــ اور "وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ"۔

ہم نے عرض کیا تھا کہ عقیدۂ حیاتِ مسیح و نزولِ مسیح کی بنیاد بعض آیات پر ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان کثیر التعداد احادیث پر جو حدِ تواتر کو پہونچی ہوئی ہیں اور جن کو مجموعی طور پر سامنے

رکھنے کے بعد اس بات کا قطعی اور یقینی علم حاصل ہو جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر زمانہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کی خبر دی تھی۔ — احادیث کے بارہ میں جو کچھ ہم نے یہاں عرض کیا امید ہے کہ انشاء اللہ وہ ناظرین کے لئے کافی ہو گا۔

قرآن مجید کے بارہ میں بھی ہم پہلے اسی طرح کی ایک اصولی بات عرض کرتے ہیں۔ — ہر پڑھا لکھا آدمی اس بات سے واقف ہو گا کہ نزول قرآن کے وقت بھی عام عیسائیوں کا عقیدہ تھا اور اب بھی یہی عقیدہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر اٹھا لئے گئے اور وہ زندہ ہیں اور آخر زمانہ میں اس دنیا میں پھر نازل ہوں گے، اور مروجہ انجیلوں میں یہی لکھا ہے۔[۱]

پس اگر یہ عقیدہ ایسا ہی گمراہانہ اور مشرکانہ ہوتا جیسا کہ مرزا صاحب اور اُن کے امتی کہتے ہیں[۲] تو لازم تھا کہ قرآن مجید میں (جس کا خاص موضوع ہر قسم کے شرک کو ڈھانا ہے) اس عقیدہ کی بھی ایسی ہی صراحت اور وضاحت کے ساتھ تردید اور نفی کی جاتی جس طرح عیسائیوں کے دوسرے گمراہانہ اور مشرکانہ عقائد (مثلاً حضرت مسیح کی الوہیت، اور ابنیت و ولدیت اور عقیدہ تثلیث وغیرہ) کی کی گئی ہے تاکہ قرآن پر ایمان لانے والی امت اس عقیدہ سے بھی اسی طرح محفوظ ہو جاتی جس طرح حضرت مسیح کی الوہیت اور ابنیت و ولدیت کے مشرکانہ عقائد سے محفوظ ہو گئی۔ — لیکن ظاہر ہے کہ قرآن مجید میں کہیں بھی اس عقیدہ کی ایسی تردید اور نفی نہیں فرمائی گئی۔ — جس کی سب سے بڑی اور بالکل عام فہم دلیل یہ ہے کہ نزول قرآن کے زمانہ سے لے کر اس وقت تک جمہور اُمت کا یہی عقیدہ رہا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر اٹھا لئے گئے ہیں اور آخر زمانہ میں وہ پھر نازل ہوں گے۔ — ہر دور کے مصنفین، مفسرین اور محدثین، متکلمین اپنی کتابوں میں سب یہی عقیدہ لکھتے رہے۔ — حتیٰ کہ ہر صدی کے مجددین بھی (جن کا خاص کام ہی یہ ہوتا ہے کہ امت کے اعمال اور عقائد میں داخل ہو جانے والی غلطیوں اور گمراہیوں کی اصلاح کریں اور حق و باطل کے درمیان لکیر کھینچیں) وہ سب بھی اپنے اپنے دور میں اسی عقیدہ کا اظہار کرتے

---

[۱] دیکھی جائے انجیل لوقا باب ۲۴ آیت ۵۱ ۔ مرقس باب ۱۶ آیت ۱۹ ۔ اعمال باب اوّل آیت ۹، ۱۰، ۱۱۔

[۲] مرزا صاحب نے الاستفتا ضمیمہ حقیقۃ الوحی میں حیات مسیح کے عقیدہ کو "شرک عظیم" کہا ہے صفحہ ۳۹ اور ان کے فرزند و خلیفہ مرزا محمود نے حقیقۃ النبوۃ میں اس کو "سخت شرک" بتلایا ہے صفحہ ۵۲۔

رہے اور انتہا یہ ہے کہ خود مرزا غلام احمد، الہام اور مجددیت کا دعویٰ کرنے کے بعد بھی اور اپنے "خدا" کی طرف سے مسیحیت کے منصب پر فائز ہونے کے دس بارہ برس بعد تک بھی اسی عقیدہ پر قائم رہے اور اسی کو اسلامی اور قرآنی عقیدہ سمجھتے رہے — کیا ہوش و حواس رکھتے ہوئے کوئی بھی آدمی یہ کہہ سکتا ہے یا اس کو باور کر سکتا ہے کہ قرآن مجید میں تو اس عقیدہ کی تردید اور نفی صاف صاف کی گئی تھی لیکن اُمت کے ان سارے طبقوں میں سے کسی نے اس کو سمجھا ہی نہیں اور خود مرزا غلام احمد بھی پچاس برس کی عمر تک (۱۸۹۱ء تک[1]) اس کو نہیں سمجھ سکے، بلکہ قرآنی آیتوں اور حدیثوں سے اس کے بالکل برعکس یہی سمجھتے رہے کہ حضرت مسیح آسمان پر اُٹھا لئے گئے اور وہ زندہ ہیں اور حدیثوں کی پیشین گوئی کے مطابق وہی پھر آخر زمانہ میں نازل ہوں گے۔

یہ مسلّم تاریخی حقائق اس بات کی آفتاب سے زیادہ روشن دلیل ہیں کہ قرآن مجید کے تیس پاروں میں کہیں ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے جس سے حیات مسیح اور نزول مسیح کے عقیدہ کی تردید اور نفی ہوتی ہو، اگر ایک لفظ بھی ایسا ہوتا تو ہرگز اُمت اس عقیدہ کو اس طرح نہ اپناتی۔ یہ ایسی موٹی اور عام فہم بات ہے جس کو بڑے سے بڑے عالم دین کی طرح ایک تعلیم یافتہ آدمی بھی آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ قادیانی مصنفین و متکلمین جن آیتوں کے متعلق یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان سے عقیدہ حیات مسیح و نزول مسیح کی تردید و نفی ہوتی ہے وہ ان کی صرف کج بحثی اور زبان درازی ہے۔ قرآن پاک کتاب ہدایت ہے اس کا دعویٰ ہے کہ اس کی زبان اور اس کا بیان بالکل واضح ہے (بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ) وہ ہرگز ایسی چیستاں نہیں ہے کہ اس کا مقصد و مطلب اس پر ایمان لانے والے اس کے سمجھنے سمجھانے پر عمریں صرف کر دینے والے لاکھوں علماء اور مفسرین تیرہ سو برس تک نہیں سمجھ سکے اور خود مرزا غلام احمد بھی اپنی مجددیت و مسیحیت کے باوجود پچاس سال کی عمر تک نہیں سمجھ سکے۔

حیرت ہے کہ ان قادیانی مصنفین و متکلمین کو (جن میں مولوی محمد علی لاہوری جیسے مدعیان علم و دانش بھی ہیں) اتنی بے تکی اور معقولیت سے اتنی دور بات کہنے کی جرأت کیسے ہوتی ہے جس کو کوئی عقل والا

---

[1] جہاں تک ہمیں معلوم ہے مرزا صاحب نے حیات مسیح اور نزول مسیح کا انکار کر کے مثیل مسیح موعود ہونے کا دعویٰ "ازالۂ اوہام" میں ہی کیا ہے جو ۱۸۹۱ء کی تصنیف ہے۔

اس وقت تک قبول نہیں کر سکتا جب تک کہ اپنے کو عقل و فہم سے خالی نہ کر لے۔

واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید پر اس سے بڑی کوئی تہمت نہیں لگائی جا سکتی ہے کہ وہ ایسی زبان میں ہے کہ خود اس کے ماننے والے عربی زبان کے وہ لاکھوں ماہرین بھی جنھوں نے اپنی عمریں اس کے مطالعہ اور خدمت میں صرف کر دیں تیرہ سو برس تک اس کا مطلب نہیں سمجھ سکے اور اس کی وجہ سے کسی معمولی غلطی میں نہیں بلکہ "شرک عظیم" میں مبتلا رہے ہے ـــــ کیا اسلام اور قرآن مجید کی یہی وہ خدمت ہے جس کا دعویٰ مرزا غلام احمد اور ان کی امت کے مصنفین اور متکلمین کرتے ہیں:-؟

اس کے بعد میں عرض کرتا ہوں کہ اگر بالفرض قرآن مجید میں کوئی آیت بھی ایسی نہ ہو جس سے عقیدۂ حیات مسیح اور نزول مسیح کی تائید ہوتی ہو تو صرف یہ بات کہ قرآن مجید نے عیسائیوں کے دوسرے گمراہانہ اور مشرکانہ عقیدوں (حضرت مسیح کی الوہیت اور ابنیت وغیرہ) کی طرح اس کی تردید اور نفی نہیں کی (حالانکہ یہ بھی ان عیسائیوں کا خاص عقیدہ تھا) اس بات کی روشن دلیل ہے کہ عیسائیوں کا یہ عقیدہ اللہ کے نزدیک غلط اور گمراہانہ نہیں تھا بلکہ ان کے بعض دوسرے عقیدوں کی طرح صحیح عقیدہ تھا ـــــ کیونکہ ایسے موقعہ پر تردید اور نفی نہ کرنا ایک طرح کی تصدیق اور توثیق ہوتی ہے۔ عقل و منطق اور قانون کا بھی یہ مسلم مسئلہ ہے کہ "السکوت فی معرض البیان بیان" ـــــ لیکن بات صرف اتنی ہی نہیں ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید نے ان کے عقیدے کے اس جز کی اسی طرح تصدیق و توثیق کی ہے جس طرح ان کے اس عقیدہ کی کہ حضرت مسیحؑ بن باپ کے کنواری مریم کے بطن سے پیدا ہوئے۔ اور انھوں نے احیاء موتیٰ وغیرہ کے معجزے دکھلائے ـــــ ہاں حضرت مسیح کے آسمان پر اٹھائے جانے ہی کے سلسلے میں عیسائیوں کے اس عقیدے کی قرآن پاک نے صراحت سے اور پورے زور سے تردید کی ہے کہ وہ صلیب پر چڑھائے گئے اور اس طرح اللہ تعالیٰ اور قرآن مجید نے اُن کی عظیم ترین گمراہی "کفارہ" کے اس عقیدے کو جڑ سے اکھاڑ دیا جس پر عیسائیوں کی ساری بداعمالیوں کی بنیاد ہے ـــــ اب ناظرین اس کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔

ہم نے ابھی عرض کیا تھا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے بارہ میں عیسائیوں اور یہودیوں میں شدید اعتقادی اختلافات تھے، دونوں سخت افراط و تفریط میں مبتلا تھے جس کی کچھ تفصیل یہ ہے:-

یہود کہتے تھے کہ (معاذ اللہ) وہ مریم کی ناجائز اولاد تھے (اور وہ بدبخت حضرت مریم صدیقہ پر زنا کی تہمت لگاتے تھے) نیز کہتے تھے کہ وہ (یعنی مسیح ابن مریم) نبوت و رسالت کے جھوٹے مدعی اور کذاب و مفتری تھے، اور عوام کو پھانسنے کے لئے معجزوں کے نام سے جو "تماشے اور کرتب" انھوں نے دکھائے وہ ان کی جادوگری اور شعبدہ بازی کے کرشمے تھے اور ایسے آدمی کے لئے تورات اور اسرائیلی شریعت کا حکم یہ ہے کہ اس کو سولی پر لٹکا کے ختم کر دیا جائے اور اس کی یہ موت لعنتی موت ہوگی۔ تو ہم نے تورات کے حکم کے مطابق ان کو سولی پر چڑھا کے ختم کرا دیا اور وہ (معاذ اللہ) لعنتی موت مر گئے۔

اس کے بالمقابل عیسائی ان کو مقدس ترین ہستی اور "ابن اللہ" اور "ثالث ثلاثہ" (یعنی خدا کا بیٹا اور خدائی کے تین شریکوں میں سے ایک) اور خود خدا کا روپ تک کہتے تھے، وہ ان کے ان معجزات پر بھی عقیدہ رکھتے تھے جن کا ذکر انجیلوں میں اور ان کی روایات میں تھا۔ ان کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ حضرت مسیح سولی کے واقعہ کے بعد آسمان پر اٹھا لئے گئے ــــ یعنی عیسائی یہ بات تسلیم کرتے اور مانتے تھے کہ یہودیوں نے حضرت مسیح کو سولی دلا کر قتل کرا دیا یعنی مروا ڈالا[1] (اور اسی پر ان کے نہایت گمراہانہ عقیدہ کفارہ کی بنیاد ہے) لیکن اس کے ساتھ وہ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ بعد میں اللہ تعالیٰ نے مسیح کو زندہ کر کے آسمان پر اٹھا لیا اور وہ آئندہ زمانہ میں پھر اس دنیا میں آئیں گے ــــ (یہاں یہ بات خاص طور سے قابل لحاظ ہے کہ کوئی فریق اور کوئی طبقہ اس کا قائل اور مدعی نہیں تھا کہ عیسیٰ کا طبعی موت سے انتقال ہوا)۔

---

[1] شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے "الجواب الصحیح" میں ذکر کیا ہے کہ عیسائیوں میں بعض ایسے لوگ بھی تھے جو مسیح علیہ السلام کے مصلوب و مقتول ہونے سے منکر تھے وہ کہتے تھے کہ ان کے دھوکے میں ایک اور شخص (یہودا) مصلوب ہوا جس نے جاسوسی کی تھی اللہ نے اس کی صورت بالکل مسیح کی سی بنا دی اور عیسیٰ کو صحیح سلامت آسمان پر اٹھا لیا۔ برناباس کی انجیل میں بھی یہی لکھا ہے یہ مسلمانوں کے عقیدہ اور قرآن کے بیان کے بالکل مطابق ہے۔ لیکن دنیا کے عام عیسائی [illegible] کے قائل ہیں اور [illegible] بھی ہے اور اسی پر ان کے گمراہانہ عقیدہ "کفارہ" کی بنیاد ہے۔ ۲

عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں یہودیوں اور عیسائیوں دونوں فریقوں کا مذکورہ بالا عقیدہ اور موقف اُن کی تاریخ اور موجودہ انجیلوں میں مذکور ہے اور اس کے زیادہ تر اجزا قرآن مجید میں بھی بیان فرمائے گئے ہیں۔ پس اس حالت میں کہ اگلے اہل کتاب کے ان دونوں گروہوں یہودیوں اور عیسائیوں میں حضرت مسیح کے بارے میں اتنے شدید اعتقادی اختلافات تھے اور وہ دونوں افراط و تفریط کی گمراہیوں میں مبتلا تھے، ضروری تھا کہ "قرآن مجید" جو اللہ تعالیٰ کی آخری "کتاب ہدایت" ہے، ان اختلافات کے بارہ میں واضح فیصلہ دے، دونوں فریقوں کی گمراہیوں کو رد کر کے اصل حقیقت بتائے اور حق کو حق اور باطل کو باطل قرار دے ـــــ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی تنزیل کا مقصد بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:-

وَمَا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ إِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوا فِيهِ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ○	اور اے پیغمبر ہم نے تم پر یہ کتاب (قرآن) خاص اس واسطے نازل کی ہے کہ جن باتوں میں ان لوگوں کے درمیان اختلاف ہے، تم اس کو صاف صاف بیان کر دو اور ماننے والوں کے لئے ہدایت اور رحمت ہو۔
سُورہ نحل آیت ۶۴	

چنانچہ قرآنِ مجید نے حضرت مسیحؑ سے متعلق یہودیوں اور عیسائیوں کے ان اختلافات کے بارہ میں واضح فیصلہ دیا اور ہر فریق کی گمراہیوں کو رد کر کے جو حق تھا اس کا اعلان فرما دیا۔

عیسائیوں کے عقیدہ الوہیت مسیح، اسی طرح ابنیت و ولدیت مسیح اور تثلیث کے نظریہ کی قرآنِ پاک نے شدّت کے ساتھ تردید کی اور اس کو خالص کفر قرار دیا۔ (مائدہ آیت ۷۲، و ۷۳)

اور سورۂ "مریم" کے آخر میں فرمایا کہ "کسی کو خدا کا بیٹا اور اسکی اولاد قرار دینے کی بات اتنی خبیث و شدید ہے کہ اس کی وجہ سے آسمان پھٹ پڑیں اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ لرز کر زمین بوس ہو جائیں"۔ (آیت ۸۸-۸۹-۹۰)

اور سورۂ "زخرف" میں فرمایا کہ "مسیح کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ ہمارے ایک بندے ہیں جن کو ہم نے خاص انعامات سے نوازا"۔ (آیت ۵۹)

الغرض قرآن مجید نے بیسیوں مقامات پر یہ اعلان فرمایا کہ عیسائیوں کا مسیحؑ کی الوہیت اور

ابنیت وولدیت اور تثلیث کا عقیدہ سخت گمراہی اور ربّ ذوالجلال کی شان پاک میں شدید گستاخی اور صریح کفر ہے۔ مسیح بس اللہ کے بندے اور رسول ہیں اور عیسائیوں کا یہ کہنا کہ خود مسیح نے ہم کو یہ تعلیم دی تھی اس پاک اور معصوم پیغمبر پر افترا ہے، اور وہ قیامت میں خدا کو گواہ بنا کر اس سے اپنی برأت ظاہر کردیں گے۔ (آخر سورۂ مائدہ)

اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق یہودیوں کی گمراہیوں کو بھی قرآن پاک نے رد فرمایا — صراحت کے ساتھ اعلان فرمایا کہ عیسیٰ بن مریم اللہ کے سچے اور برگزیدہ رسول اور مقرب بندے ہیں، وہ کلمۃ اللہ ہیں، یعنی اللہ نے ان کو اپنی خاص قدرت اور حکم سے معجزانہ طور پر کنواری مریم کے بطن سے پیدا کیا، بغیر اس کے کہ کسی مرد نے ان کو چھوا ہو — اور مریم اللہ کی برگزیدہ بندی اور صدیقہ تھیں — یہودی ان کے بارہ میں جو کہتے ہیں وہ اس پاک بندی پر ان کا "بہتان عظیم" ہے اور اس کی وجہ سے وہ خدا کی لعنت اور عذاب کے مستحق ہیں — (سورۂ آل عمران، سورۂ نساء، سورۂ مائدہ اور سورۂ مریم میں یہ سب مضامین بیان کئے گئے ہیں)۔

حضرت مسیح علیہ السلام سے متعلق یہودیوں کی گمراہیوں کے رد ہی کے سلسلے میں قرآن مجید نے ایک بات یہ بھی فرمائی کہ یہودیوں کا یہ عقیدہ اور دعویٰ بھی غلط اور موجب لعنت و عذاب ہے کہ ہم نے مسیح کو سولی دلا کر مار ڈالا (وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ) — آگے فرمایا، اصل واقعہ یہ ہے کہ

"وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ" (یعنی مسیح کو نہ انھوں نے قتل کیا نہ سولی پر چڑھایا بلکہ قدرت کی طرف سے ان کے لئے شبہ کی ایک صورت پیدا کردی گئی، جس کی وجہ سے وہ ایسا خیال کرنے لگے[۱]) — پھر فرمایا:-

إِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ لَفِي شَكٍّ مِنْهُ مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ
إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا بَلْ رَفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ وَكَانَ اللَّهُ

---

[۱] واقعہ کیا ہوا، اور کس طرح لوگوں کو ایسا خیال ہوگیا؟ اس کی تفصیل عام تفسیروں میں مذکور ہے، اور برنا باس کی انجیل کا بیان بھی بالکل اس کے مطابق ہے۔ ۱۲

عَزِیْزًا حَکِیْمًا ۝ (النساء آیت ۱۵۷ و ۱۵۸)

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ (یہودی اور عیسائی) مسیح کے بارے میں اختلاف کرتے ہیں (کہ وہ مصلوب مقتول ہو کر ختم ہو گئے یا پھر زندہ کر کے آسمان پر اٹھا لئے گئے) اُن کے پاس اس واقعہ کے بارے میں صحیح علم ہے ہی نہیں، صرف بے اصل اٹکلیں اور بے بنیاد قیاس آرائیاں ہیں جن پر وہ چلتے ہیں، صحیح اور یقینی بات یہ ہے کہ انھوں نے اُن کو قتل کیا ہی نہیں۔ بلکہ اللہ نے ان کو اپنی طرف اٹھا لیا، اور اللہ پوری طاقت اور حکمت والا ہے (جس نے اپنی کامل قدرت اور حکمت سے یہ سب کچھ کیا)۔

بالکل واضح اور کھلی ہوئی بات ہے کہ ان آیتوں میں قرآن مجید نے حضرت مسیح کے مقتول و مصلوب ہونے کی (یعنی صلیب پر چڑھائے جانے اور مار ڈالے جانے کی) تو پوری صراحت سے نفی کر دی، (بلکہ ایک دوسری آیت "وَاِذْ کَفَفْتُ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ عَنْکَ" (مائدہ آیت ۱۱۰) میں یہ بھی بتلا دیا کہ اللہ نے اُن کو ایسا بچایا کہ اُن کے یہودی دشمن اُن کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکے)۔ تو اِن آیتوں نے یہودیوں کے اس "لعنتی" دعوے اور عقیدے کی واضح تردید کر دی کہ ہم نے مسیح کو صلیب پر چڑھا کے ختم کر دیا اور مار ڈالا، اور اس کے ساتھ عیسائیوں کے نہایت خطرناک اور دین کو برباد کر دینے والے عقیدہ کفارہ کو بھی جڑ بنیاد سے اکھاڑ دیا کیونکہ اس کی بنیاد اسی عقیدہ پر ہے کہ حضرت مسیح صلیب پر چڑھائے گئے) اور "قتل" و "صلب" کی اس نفی کے ساتھ قرآن مجید نے عیسیٰ علیہ السلام کے لئے رفع (اٹھائے جانے) کا اثبات کیا اور "بل" کا کلمہ درمیان میں لاکر فرمایا "بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ" یعنی ان پر "قتل" کا فعل قطعاً واقع نہیں ہوا بلکہ اللہ نے ان کو اپنی طرف اُٹھا لیا۔ آیت کے اس آخری لفظ سے صاف معلوم ہوا کہ عیسائیوں کے عقیدہ کا یہ جز صحیح ہے کہ مسیحؑ اُوپر اٹھا لئے گئے۔

قادیانیوں کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ اس آیت میں "رَفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے حضرت عیسیٰؑ کے درجے بلند کر دیئے، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس سے "روحانی رفع" مراد ہے لیکن جس شخص کو ذرا بھی عربیت سے واقفیت ہو وہ سمجھ سکتا ہے کہ اس آیت میں رفع کے معنی ایسے ہونے چاہئیں جو قتل کی ضد ہوں یعنی مقتول ہونے کے ساتھ جمع نہ ہو سکیں۔ اور ظاہر ہے کہ کسی نبی کے رفع روحانی و رفع درجات میں اور دشمنوں کے ہاتھ سے اُن کے مقتول ہونے میں قطعاً کوئی منافات اور تضاد نہیں ہے۔ بلکہ راہ خدا میں مظلومانہ قتل ... درجے اور زیادہ

بلند ہو جائے۔ بہر حال اسی لئے کہنے والے نے کہا ہے:

یہ رُتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مُدّعی کے واسطے دار و رسن کہاں

قرآن مجید میں متعدد جگہ انبیاء علیہم السلام کے ناحق مقتول ہونے کا ذکر ہے۔ ("وَقَتْلِهِمُ الْأَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ" ـــ "يَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ الْحَقِّ" وغیرہ وغیرہ) ـــ ظاہر ہے کہ اللہ کے یہ سب پیغمبر جو ظالموں کے ہاتھ سے شہید ہوئے اس شہادت کی وجہ سے اُن کے درجے بلند تر ہوئے ـــ الغرض "رفع روحانی" اور "رفع درجات" ہرگز مقتول ہونے کے منافی نہیں ہے ـــ البتہ جسم کے ساتھ صحیح و سالم اٹھایا جانا بیشک مقتول ہونے کے منافی ہے اس لئے "بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ إِلَيْهِ" کا مطلب یہی ہوگا کہ یہ کوئی ان کے دشمن قتل نہیں کر سکے۔ بلکہ اللہ نے صحیح و سلامت ان کو اپنی طرف اٹھا لیا۔ اور اپنی طرف اٹھانے کا مطلب یہی ہوگا کہ آسمان پر اٹھا لیا۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اگرچہ جہت اور کسی مکان کا مکین نہیں ہے لیکن قرآن مجید کے بیان کے مطابق آسمان کو اس سے ایک خاص مکانی نسبت ضرور ہے ـــ

"ءَأَمِنتُم مَّن فِي السَّمَاءِ أَن يَخْسِفَ بِكُمُ الْأَرْضَ فَإِذَا هِيَ تَمُورُ"

ـــ "أَمْ أَمِنتُم مَّن فِي السَّمَاءِ أَن يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا" ـ

اور کئی جگہ فرمایا گیا ہے "ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ"۔

یہ آیتیں اس کی صریح دلیل ہیں کہ آسمان کو اللہ تعالیٰ کی ذات پاک سے ایک خاص مکانی نسبت ہے ـــ اور ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت کو "مومنہ" فرمایا جس سے پوچھا گیا تھا "اللہ کہاں ہے؟" تو اس نے جواب دیا تھا "فِي السَّمَاءِ" یعنی وہ آسمان میں ہے ـــ (صحیح مسلم [illegible])

اس مسئلہ میں ایک دوسری قطعی فیصلہ کن بات یہ ہے کہ جیسا کہ اوپر تفصیل سے بتلایا گیا عیسائی عام طور سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اٹھا لئے جانے کا عقیدہ رکھتے تھے اور آج بھی انجیلوں میں صراحۃً یہ عقیدہ موجود ہے بلکہ بعض مقامات پر آسمان پر اٹھائے جانے کے الفاظ ہیں اور بعض جگہ صرف اوپر اٹھا لئے جانے کا ذکر ہے ـــ اور انجیل کے عربی ترجموں میں ان مواقع پر "رفع" ہی کا لفظ

ہے، اب اگر یہ مانا جائے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے مصلوب ہونے کے عقیدہ کی طرح اُن کے اٹھائے جانے کا عقیدہ بھی غلط اور مشرکانہ تھا تو قرآن مجید پر سخت الزام آئے گا کہ اس نے اس موقع پر اس عقیدہ کی نہ صرف یہ کہ تردید نہیں کی بلکہ یہ غضب کیا کہ "بَل رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ" اور دوسری جگہ "رَافِعُكَ اِلَيَّ" فرما کر عیسائیوں کے اس عقیدہ پر گویا مہرِ تصدیق ثبت کر دی اور انتہا یہ کہ اس نے لفظ بھی وہی رفع کا بولا جو خود عیسائی اپنے اس عقیدہ کے اظہار کے لئے بولتے تھے اور جو انجیلوں میں اب تک بھی موجود ہے اور اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ آج تک جمہور امت نے بھی قرآن پاک کے ان الفاظ سے یہی سمجھا کہ حضرت عیسیٰ اوپر اٹھا لئے گئے ۔۔۔ پھر تو (معاذ اللہ) قرآن مجید نے خود ہی لوگوں کو گمراہ کیا اور ساری اُمت کو ایک "شرکِ عظیم" میں جھونک دیا ۔۔۔

الغرض ہر معمولی سی سمجھ رکھنے والا بھی اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک عیسیٰ علیہ السلام کے قتل و صلب کے عقیدہ کی طرح ان کے اٹھا لئے جانے کا عقیدہ بھی غلط اور گمراہانہ ہوتا تو پھر جس طرح "مَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ" فرما کر اور پھر "وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا" کو مکرر لا کر عقیدہ قتل و صلب کی پوری شدت اور صراحت سے تردید کی گئی ہے، اسی طرح "عقیدہ رفع" کی بھی واضح تردید اس موقع پر کی جاتی، لیکن ہوا یہ کہ بجائے نفی اور تردید کے صاف صاف "بَل رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ" اور دوسری جگہ "وَرَافِعُكَ اِلَيَّ" فرما کر قرآن مجید نے عیسیٰ علیہ السلام کا "رفع" (یعنی اٹھایا جانا) بیان کیا ۔۔۔ الغرض عیسائی عقیدے اور انجیلوں کی تصریحات کو سامنے رکھنے کے بعد اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ قرآن مجید نے ان کے عقیدہ کے اس جز کی (یعنی مسیح علیہ السلام کے اٹھا لئے جانے کی) تردید نہیں کی بلکہ اس کی واضح تصدیق کی ہے جس طرح عیسائیوں کے اس عقیدہ کی تصدیق کی ہے کہ حضرت مسیحؑ بن باپ کے کنواری مریم کے بطن سے اللہ کے حکم سے پیدا ہوئے اور وہ "کلمۃ اللہ" ہیں۔ اور جس طرح قرآن مجید نے حضرت مسیح کے احیاءِ موتیٰ وغیرہ ان معجزات کی تصدیق کی ہے جو انجیل میں بیان کئے گئے ہیں اور عیسائی جن کا دعویٰ کرتے اور عقیدہ رکھتے تھے۔

اگر کسی کے دل میں بیماری اور کجی نہ ہو اور قرآن مجید پر ایمان ہو تو ہماری اس گفتگو کے بعد اس کو اس میں شک و شبہ نہیں رہے گا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح کو اپنی خاص قدرت

سے معجزانہ طور پر بن باپ کے پیدا کیا تھا، اسی طرح اُن کے دشمن یہودیوں کی گرفت سے اور قتل و صلب سے بالکل محفوظ رکھ کر معجزانہ طور پر اُن کو صحیح سلامت زندہ آسمان پر اُٹھالیا ——

پھر اس کے بعد والی آیت میں ایک خاص انداز میں اُن کی حیات اور آخر زمانہ میں اُن کے نزول کی اطلاع دی گئی ہے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے۔

وَإِن مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهِ قَبْلَ مَوْتِهِ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكُونُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا ٥

اور سب ہی اہلِ کتاب عیسیٰ علیہ السلام کی موت سے پہلے اُن پر ضرور بالضرور ایمان لے آئیں گے اور قیامت کے دن وہ ان کے بارہ میں شہادت دیں گے۔

اس آیت کا مطلب جو صحابہ کرام حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے صحیح اور قابلِ اعتماد سندوں سے حدیث اور تفسیر کی کتابوں میں مروی ہے اور آیت کے الفاظ کی ترتیب اور سیاق و سباق سے متعین ہوتا ہے اور اسی وجہ سے اس کو اکثر ائمہ تفسیر نے اختیار کیا ہے وہ یہی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام (جن کا آسمان پر اُٹھالیا جانا اوپر کی آیت میں مذکور ہوا) ان کی موت سے پہلے ایک وقت ضرور ایسا آئے گا کہ سب اہلِ کتاب (یعنی اُس وقت کے سب اہلِ کتاب) اُن پر ایمان لے آئیں گے، اور اُس واقعی حقیقت کو تسلیم اور قبول کرلیں گے (جو اُن سے متعلق اوپر کی آیتوں میں بیان کی گئی ہے) —— اور یہ اُس وقت ہوگا جب اللہ کے حکم سے وہ دوبارہ اس دُنیا میں آئیں گے۔ جس کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پچاسوں ارشادات میں اُمت کو دی ہے —— دیکھی جائے "فتح الباری" ص ۲۸۱ تفسیر ابن جریر ج ۶ ص ۱۴ - ابن کثیر ج ۱ ص ۵۷۸ - درمنثور ج ۲ ص ۲۴۲ وغیرہ

الفرقان کے اس شمارہ میں جو صفحات اس مضمون (نزولِ مسیح) کے لئے محفوظ کیے گئے تھے، اُن کی گنجائش ختم ہوگئی —— اس لئے مضمون کے آخری حصّہ کو روک لینا پڑا۔ تاہم جو حصّہ شائع ہورہا ہے وہ بھی بجائے خود کافی ہے۔

جواہر پارے

اقتباسات "مکاتیب رشیدیہ"

(تلخیص — از مولانا نسیم احمد فریدی امروہی)

—(دوسری قسط)—

مولوی صدیق احمد صاحب مدفیوضہم السّلام علیکم۔ بخیریت ہوں۔ جواب آپ کے چار خط کا سابق روانہ کر چکا ہوں۔ اب اور خط آیا جس میں پیر جیو فخر الحسن[ع۵] صاحب کا خط ہے۔

ع۵ الشیخ العالم الصالح فخر الحسن بن عبد الرحمٰن الحنفی الگنگوہیؒ — آپ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے خاص شاگرد اور سفر و حضر میں ساتھ رہنے والے خدام میں سے تھے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد فنِ طب حکیم محمود خاں دہلوی مرحوم سے حاصل کیا۔ آخر عمر میں بسلسلۂ طبابت کانپور میں قیام کیا۔

آپ نے حضرت مولانا محدّث گنگوہیؒ سے بھی حدیث پڑھی تھی — آپ صاحب حسن و وجاہت اور خوش طبع شخص تھے۔ گفتگو اور تقریر شیریں اور دلکش تھی۔ غرضکہ تمام اوصاف حمیدہ کے حامل تھے۔ آپ اپنے اوقات کو مذاہب باطلہ سے مناظروں میں بھی صرف کرتے تھے۔ آپ کی تعلیقات یہ ہیں:- (۱) حاشیہ سُنن ابو داؤد جس کا نام تعلیق المحمود ہے۔ (۲) حاشیہ مختصرہ علی سُنن ابن ماجہ۔ (۳) حاشیہ تلخیص المفتاح۔

آپ نے سنہ ۱۳۱۵ھ میں کانپور میں وفات پائی۔ (نزہۃ الخواطر جلد ۸)

اس کا جواب تو وہی جواب ہے جو پہلے لکھ چکا ہوں۔ اور اگر خواہ مخواہ وہ مجھ سے تعلق بلا واسطہ چاہتے ہیں تو آپ کی ملاقات تک ملتوی رکھیں۔ اور چند بار استخارہ کر لیویں۔ بعد استخارہ و قرارِ رائے بروقت دیکھا جائے گا۔ کچھ جلدی کی بات نہیں ــــ ندامت اعمال کے باب میں جو لکھا ہے تو (آپ پر) کچھ حال اہلِ وجد چشتیہ کا منکشف ہونا ممکن ہے۔ جب نسبت وجدیہ غلبہ کرتی ہے اپنے آپ کو بدتر از کفار سالک تصور کرتا ہے۔ بخاری کے کتاب الایمان میں ملاحظہ کریں کہ اکثر اصحاب اپنے نفاق پر اندیشہ رکھتے تھے۔ اور کوئی مطمئن اپنی نجات و ایمان پر نہ تھا ؎

سودہ شد از سجدۂ پیش بتاں پیشانیم چند بر خود تہمتِ دینِ مسلمانی نہم[۵]

یہ شعر شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ اپنے مکتوبات میں اکثر لکھتے ہیں اور غلبۂ وجد میں سب اشیاء کو اپنے آپ سے بہتر جانتے ہیں۔ پس آپ پر اب بعد رفع سکر یہ نسبت اثر کرتی ہے۔ اپنے اعمال و افعال پر ندامت اس کا اثر ہے ــــ مبارکباد!

ــــ پیرجیو فخرالحسن اگر آپ سے بیعت کر لیویں تو بہتر ہے ورنہ جواب اول لکھ چکا ہوں، اُس پر عمل کریں۔ پیرجیو صاحب کو بعد سلام مسنون مضمون واحد ہے۔ مستقلین خط کی حاجت نہیں۔ بندہ ہوں بندگی سے کیا چارہ، جز عرض کام نہیں اور کچھ اختیار نہیں۔ والسلام

(۱۴ر رجب ۱۳۰۱ھ)

مولوی صدیق احمد صاحب مدفیوضہم۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ ــــ دو خط آپ کے پہونچے حال معلوم ہوا۔ جملہ حالات آپ کے عمدہ ہیں خواہ حیرت ہو خواہ عبودیت موجب شکر ہیں۔ اور خواب جو دیکھے اور نقل کیے وہ بھی رؤیاء صالحہ ہیں۔ محتاج تعبیر نہیں۔ ہاں البتہ اس کے بیان کی ضرورت ہے کہ آپ اس عاجز پابرہنہ کے پیچھے جو اپنے آپ کو دیکھتے ہو تو اس کی دو وجہ ہیں۔ ایک تو آپ کے عقیدے میں یہ امر قرار پایا کہ یہ گمنام کچھ ہے۔ دوسرے فی الواقع اس ناکام کو

---

[۵] (از بس کہ، بتوں کو سجدہ کرتے کرتے میری پیشانی گھس گئی۔ اس حالت میں کب تک اپنے پر دینِ مسلمانی کی تہمت دھرتا رہوں (یعنی کب تک اپنے آپ کو مسلمان کہلواتا رہوں)

آپ کا وسیلہ ظاہر بنایا ہے سو اگرچہ چاہ (کنوئیں) سے پانی نکلتے وقت رہٹ کے ظروف میں اول پانی آتا ہے مگر کھیت میں جا کر جمع ہوتا ہے۔ سو اولاً تو ظروف جز (بجز) طریق زراعت اور کچھ نہیں اور جو کچھ پانی ان میں رہتا ہے یا آتا ہے وہ بہت قلیل نسبت بہ زراعت ہے۔ اگرچہ ظروف مقدم زراعت پر ہیں مگر نفس تقدم کو کیا شرف ہے۔ لہذا تقدم موجب فخر نہیں۔ ہاں آپ کے اتباع سے فخر ہے کہ "باشد کہ پیر را بذریعہ مرید نوازند"۔۔۔ اب یہ لکھتا ہوں کہ مولوی خلیل احمد کی نسبت بسیط ہے کہ حضور میں اعلیٰ درجہ کو پہونچے اور انوار و وقائع و انکشافات جو آپ کو ہوتے ہیں وہ اُن کو بھی نہیں تھے۔ اور آپ اس نسبت مفصلہ کے حامل ہیں۔ اس امر میں بمراتب ان سے سابق و اعلیٰ ہو اور حضور و یادداشت میں قریب ان کے ہو۔ اپنا یہ فہم ہے۔ والغیب عند اللہ تعالیٰ۔ (کہ) ان کی نسبت خواجہ محمد باقی باللہ علیہ الرحمۃ کے طرز پر مناسب ہے اور آپ کی حضرت مجدد علیہ الرحمۃ کی وضع پر چیاں ہے۔ کہ اگرچہ نسبت وہ ہی نسبت ہے مگر بسط و بساطت کا فرق ہے اور بظاہر اب اثر نسبت تمام لطائف و عناصر پر واقع ہو گیا۔ قالب اُس وقت عبادت میں مصروف ہوتا ہے اور اُس میں اثر ذکر آ جاتا ہے والحمد للہ علیٰ ذالک۔۔۔

مولوی فخر الحسن کے واسطے جیسا آپ نے مناسب جانا بہتر ہے۔ اب سر دست ان کو ذکر جہر بارہ تسبیح معمولی چشتیہ تلقین فرما دیویں۔ وہ کرتے رہیں۔ پھر وقت ملاقات دیکھا جاوے گا۔۔۔ بندہ جو کچھ حال خود لکھتا ہے بحد اللہ مقصود اس تحریر سے انکسار و تواضع نہیں بلکہ یہ خیال آتا ہے کہ دُنیا میں تو سب احوال و مراتب بندگان مخفی ہیں۔ نہیں معلوم کہ کون ادنیٰ ہے اور کون اعلیٰ (ہے)۔ مگر الضاف سے مرتبہ بذریعہ احوال عادات و اخلاق معلوم ہو جاتا ہے۔ سو اپنے حالات معلوم ہیں۔ اگر اب بھی وہ دم پیری آپ کے رُوبرو مارے جاؤں تو روز قیامت وقت ظہور سرائر عبث ایک خفت دُبکی حاصل کرنا اور کشف عجب در یا د ہو کر ندامت حاصل ہووے گی۔ لہٰذا بہتر ہے کہ دُنیا میں اظہار حقیقت کر کے سبکدوش ہوں اور الزام معتقدین سے اُس روز نجات پاؤں اور باقی خیر، کس کو اپنی بڑائی بُری معلوم ہوتی ہے۔

(مورخہ ۱۱ شعبان ۱۳۰۱ھ)

برادرم مولوی صدیق احمد صاحب مدفیوضہم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

دو خط آپ کے پہونچے۔ آپ کے خیالات کی تصدیق کرتا ہوں۔ اور خواب جو آپ نے لکھے سو سب رویا رصالحہ ہیں۔ تعبیر کی حاجت نہیں۔........ جیسا آدمی کے اندر کوئی امر پختہ ہو جاتا ہے وہ سب کو ویسا ہی خیال کرتا ہے بلکہ مشاہدہ کرتا ہے۔ لہذا جو حال سالک پر وارد ہووے گا، سب میں وہ ہی معائنہ کرے گا۔ یہ تو کلیہ ہے .... غرض یہ سب اُمور درست ہیں۔ ہاں اس بسط کے ساتھ اور تفصیل کے (ساتھ) اپنے کسی دوست کو یہ واردات نہیں ہوئے۔ یہاں (مجھ کو) ہر روز اجمالی یادداشت کی تحصیل رہی اور درمیان کے وقائع محذوف —— یہ فضیلت آپ کو نصیب ہوئی اور یہ تفصیل آپ کو میسر ہوئی۔ حق تعالیٰ برکت و ترقی فرماوے۔ آپ کے سب خطوط بندہ نے جمع کر لیے ہیں۔ شاید کسی کے کام آجاویں۔ (۱۳۰۱ھ)

مولوی صدیق احمد صاحب، مدفیوضہم، السلام علیکم۔

بندہ ایک ہفتہ سے دیوبند ہے۔ آپ کا خط گنگوہ سے دیوبند آکر مجھ کو ملا۔ حال معلوم ہوا۔ عزیزا! وہ کون ہے کہ حدیث النفس سے محفوظ ہے .... مگر خیر اس کا خیر ہے اور شر اس کا شر —— تدبیر خلق اور اصلاحِ امور معاش و معاد کی حدیث النفس، صالحات میں ہے اور خلاف اس کے ضد اس کی ہے —— الحاصل حدیث النفس و خواطر لازم بشر ہیں۔ ہاں اگر غلبہ ہو کر ذکر سے تسارع؟ وساوس (روکنے والے) ہوجاویں تو بُرا ہے۔ تفرقہ زبون امر ہے، ورنہ کیا اندیشہ ہے۔ ابو الحال کو کوئی خطرہ مضر نہیں۔ ہاں ابن الحال کو ضرور ہے۔ سو آپ بفضلہ تعالیٰ اس سے مامون ہیں۔ معہذا چونکہ سعی آپ کی ازالۂ احادیث نفس میں ہے تو تدبیر اس کی یہ ہے کہ صمدیت حق تعالےٰ کی مدنظر رہے۔ اپنا عاجز محتاج ہونا اور حق تعالیٰ کا غنی عاجز نواز ہونا ہر حال (میں)، اپنی ضرورت و حاجت اور اُس کی توجہ و اعانت کا (تصور)، اس مراقبہ سے رفع احادیث (النفس) ہوجاوے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ زیادہ کچھ ضرورت نہ ہوئے گی........

مولوی رفیع الدین[1] صاحب کو ربع کا (چوتھے دن کے بخار کا) دورہ آتا ہے۔ بہت ضعیف

---

[1] حضرت شاہ رفیع الدین عثمانی دیوبندیؒ ابن مولانا فرید الدین عثمانی دیوبندیؒ۔ آپ دارالعلوم (باقی اگلے صفحہ پر)

ہیں۔ دو روز تک بیہوش رہتے ہیں۔ چلنے پھرنے کی طاقت نہیں ہے۔ حاجی محمد عابد صاحب بھی ایسے ہی ہو گئے تھے مگر تین دورے ٹل گئے ہیں۔ افاقہ ہے۔ سب کو سلام پہونچے۔

سنہ ۱۳۰۲ھ

برادرم مولوی صدیق احمد صاحب مد فیوضہم السلام علیکم ورحمۃ اللہ تعالیٰ وبرکاتہ۔

آپ کا خط آیا۔ صحتِ مزاج آپ کی اور حافظ محمود[۵] سے طمانیت ہوئی۔ آپ کی ہمت سے توقع ہے کہ عزیز ممدوح کو علم نصیب ہو جائے۔ اور خود تو دعا کرتا ہی ہوں کہ اہلِ غرض ہوں۔ آپ کی صفائی یادداشت موجب نعمت ہے اور شکر کا مقام ہے۔ ع

تا یار کرا خواہد و میلش بکدام است

کسی کے اختیار میں نہیں۔ سب واہب العطیات کی طرف سے ہے۔ مراقبۂ صمدیت، دفعِ خطور خطرات کے بہت مناسب ہے .... ضرورت تعین شغل کی مبتدی ہی کے واسطے پڑتی ہے۔ منتہی اپنے اختیار میں ہوتا ہے۔ جس امر سے مطلب برآمد ہو وہ ہی کرے۔ نہ اس کو قید ذکرِ زبانی کی ہے۔

(حاشیہ گزشتہ سے پیوستہ) دیوبند کے دوسرے مہتمم ہیں۔ حضرت شاہ عبد الغنی مجددی مہاجر مدنی سے بیعت تھے اور ان ہی سے اجازت و خلافت حاصل تھی۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے بھی اکتسابِ فیض کیا تھا۔ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب دیوبندی آپ ہی کے بلند پایہ خلیفۂ مجاز تھے۔ سنہ ۱۳۰۲ھ میں بمقام مدینہ منورہ وصال فرمایا اور جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔ (تذکرۂ مشائخ دیوبند) [۵] حاجی حافظ سید محمد عابد صاحب دیوبندی عرف حاجی عابد حسین۔ آپ کا نسبی تعلق ساداتِ رضویہ سے ہے۔ آپ حضرت میاں جی کریم بخش صابری ساکن رامپور منہیاراں کے خلیفۂ مجاز تھے۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے بھی آپ کو خلافت حاصل تھی۔ آپ مجددین دار العلوم میں سے ہیں۔ تین مرتبہ اس تعلیمی ادارے کے مہتمم مقرر ہوئے تھے۔ آخر مرتبہ شاہ رفیع الدین عثمانی کے سفرِ ہجرت کے بعد سنہ ۱۳۰۶ھ میں مہتمم ہوئے اور سنہ ۱۳۱۰ھ تک مسندِ اہتمام پر فائز رہے۔ ۲۷ ذی الحجہ سنہ ۱۳۳۱ھ کو وصال فرمایا اور ۲۸ ذی الحجہ سنہ ۱۳۳۱ھ بروز جمعہ دیوبند میں مدفون ہوئے۔ (ماخوذ از تذکرۃ العابدین و تذکرۂ مشائخ دیوبند)

[۵] حضرت محدث گنگوہی کے بڑے صاحبزادے جو عالمِ شباب میں رحلت فرما گئے۔

کوئی ذکر ہو، نہ کسی تصور و خیال کی۔ غرض کام سے۔ ہے اور بس۔ مجھ کو بھی دُعا میں یاد کر لیا کرو۔ آپ کا حُسنِ ظن (میں نے) اپنا رفیق بنا رکھا ہے۔ فقط والسلام

(سنہ ۱۳۰۲ھ)

مولوی صدیق احمد صاحب مد فیوضہم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

آپ کا خط آیا۔ باعث موجب فرحت و سرور ہوا۔ الحمد للہ علیٰ احسانہٖ کہ آپ کو اُس ذاتِ پاک نے اپنا بنایا اور اپنی نسبت عطا فرمائی ۔۔۔ ظاہر با خلق، باطن با حق کیا۔ ع

کجا خود شکر ایں نعمت گذارم

یہ سب عنایت پاک پروردگار تعالیٰ شانہٗ کی ہے ۔۔ آپ کا حال حضرت سلمہٗ (حضرت حاجی صاحب) کی خدمت میں عرض کیا تھا۔ وہاں سے حکم آیا کہ (آپ کو) اجازتِ اخذ بیعت و تلقین دینا چاہیے۔ (اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کے) حُسنِ ظن سے اس ناکام کو بھی باکام فرما دیوے۔ آمین۔

محمود کے حال سے بھی طمانیت ہوئی۔ آپ کی توجہ سے اس کا بھی کام ہو جاوے۔ حق تعالےٰ آپ کو ہر طرح ترقی فرماوے۔ یہاں سب طرح عافیت ہے۔ مولوی فخر الحسن جاتے تھے، ان کو خط نہ دے سکا۔ طبع نے تحریر سے کاہلی کی۔ آج جمعہ کو لکھتا ہوں۔

(سنہ ۱۳۰۲ھ)

مولوی صدیق احمد صاحب مد فیضہم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

آپ کا نامہ دیوبند میں ملا۔ استقامتِ باطنی جو عطیہ واہب العطایا ہے، آپ کو ملی ہے۔ مستوجب شکر بے نہایت کا ہے۔ بس زیادہ کیا لکھوں۔ رزق و نفقہ انسان کا دنیا میں رفع حوائج بشریہ کے واسطے ہے، ورنہ انسان کو جالبِ اموال (مال لادنے والا) و مخزنِ مزبلہ (نجاست کا ڈھیر) نہیں بنایا۔ پس صاحبِ حال و مقام کو یہ ہی بس ہے کہ قدر کفاف ملے۔ زائد تو بس زائد ہی ہے۔ اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ رِزْقَ آلِ مُحَمَّدٍ کَفَافًا[۱] خود دُعا فخرِ عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی

[۱] اے اللہ خاندان محمدؐ کو بس اتنی روزی عطا فرما جو روزمرہ کے خرچ کو کافی ہو۔

ہے۔ پھر یہ وظیفہ (تنخواہ) جو ہے ہنوز اس میں کوئی تغیر و تنکر پیدا نہیں ہوا جو یہاں سے قطع کر کے دوسری جا (جگہ) مشقت کو گوارا کیا جائے ___ بعد ازاں اگر حسب مقدر تغیر ہوا تو اس وقت دوسرا در رزق کھلا ہوا ہے کوئی معین جگہ نہیں کہ اس پر حصر ہو۔ جہاں حکم و مقدر ہو دیگا وہاں ہو جاوے گا۔ بندہ بدست مولیٰ تعالیٰ شانہٗ مثل مردہ بدست غسال ہے۔ افوض امری الی اللہ[1] ___ پس ہم کو کیا فکر اس شے کا جس کا ضمان (جس کی ذمہ داری) خود مولی العالمین فرماتا ہے ___ وَمَا مِنْ دَابَّۃٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُہَا[2] ___ پس میرے عزیز ملک مسلمانان (ریاست اسلامیہ)[a] میں ___ کہ تم سے وہاں کے لوگ مربوط ہیں، مطمئن رہو جب تک حکم ہے۔ جس وقت دل تنگی ہو اس وقت جیسا حکم وقت ہو دیگا اور جہاں کا اشارہ اِسْتَفْتِ قَلْبَکَ[3] (کی رو سے) ہو دیگا۔ (تو تم) جانا یا رہنا ___ بس اس پر ہی مستقیم رہو

محمود کی حالت سے مسرور ہوتا ہوں، اور تمہارے فیض باطن کا ثمرہ جانتا ہوں اس کو بہت بہت دعا سلام فرما دیویں اور حافظ ابراہیم کو بھی ___ مولوی محمد صدیق صاحب، مولوی فخر الحسن صاحب اور فتح خاں اور جو صاحب عنایت فرما ہیں ان کو میرا سلام مسنون فرما دیویں۔ جو اشخاص کہ آپ کی تلقین سے بہرہ ور ہوئے ان کو مشرف بیعت سے فرمائیے۔ بندہ کی اس میں سربلندی و فرحت کا موجب ہے: جمعہ تک قیام دیوبند کا ہے۔ شنبہ کو سہارنپور کا قصد ہے۔ وہاں چند روز قیام ہو کر براہ رامپور (منیہاران) گنگوہ جاؤں گا اگر مقدر ہے۔

(سنہ ۱۳۰۲ھ)

از بندہ رشید احمد عفی عنہ بعد سلام مسنون مطالعہ فرمایند۔ آپ کا خط آیا۔ مدرسہ کی شہرت سے مسرور ہوا۔ مولوی محمد صدیق کا وہاں جانا مناسب ہے، مگر مدرسہ انبیٹھ کی خرابی کا خیال

---

[1] (ترجمہ) میں اپنے کام کو اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔ [2] زمین پر تمام چلنے والوں (اور اس پر رہنے بسنے والوں) کا رزق اللہ ہی کے ذمہ ہے [3] اپنے قلب سے فتویٰ لے۔ [a] مولانا صدیق احمد صاحب انبیٹھوی ریاست مالیر کوٹلہ میں بعہدۂ مفتی مقیم تھے۔ ۲۰ صفر ۱۳۲۴ھ کو مالیر کوٹلہ ہی میں انتقال فرمایا اور وہیں دفن ہوئے۔

ہے۔ اگر یہاں دوسرا تجویز ہو جاوے تو پھر کوئی اندیشہ نہیں۔ اس وقت تک مجھ سے کچھ ذکر نہیں آیا۔ مگر مشورہ ہوا تو یہی جواب دیا جاوے گا ــــــ

سلطان الاذکار حقیقی کے بعد خطرات سوء کی گنجائش نہیں رہتی ع

بہ جائے کہ سلطان خیمہ زد غوغا نماند عام را[1]

مگر ہاں (وہ) خیالی سلطان الاذکار ہوگا۔ اب اس کی تدبیر کثرت ذکر ہے کہ بسبب کثرت ذکر کے بیخ ذکر قائم ہو کر بیخ خطرات کو قطع کر دیوے۔ خواہ بجہر خواہ بخفی ــــ .... جواب امر ثالث یہ ہے کہ مستی تام نہیں ہوئی۔ اگر فناء تام ہو جاوے تو اگلی راہ مفتوح ہو ــــ رات کو ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔

سنہ ۱۳۰۳ھ

مولوی صدیق احمد صاحب مد فیوضہم، السلام علیکم۔ خط آیا۔ آپ کے حالات رفیعہ رجوع الی البدایۃ موجب مزید سرور ہوئے۔ رجوع کے معنی صحیح لکھے ہیں۔ اور یہی حالات تجلی ذاتی کے ہیں۔ مگر ہنوز کمال اس کا نہیں ہوا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ عنقریب (عنقریب) یہ (کیفیت) کامل ہو جاوے گی ــــ اور خوابیں جو ہیں وہ نشان آپ کے صراط مستقیم پر ہونے کے ہیں۔ حق تعالیٰ ہر روز استقامت عطا فرماوے۔ اور اس احقر کو اور سب دوستوں کو بلکہ سب مسلمانوں کو نصیب فرماوے۔ آمین۔ زیادہ والسلام۔ دعا کا امیدوار اپنے سب دوستوں سے ہوں اور خود دعا سب کے لیے کرتا ہوں۔

رقیمہ بندہ رشید احمد عفی عنہ، از گنگوہ رمضان المبارک سنہ ۱۳۰۳ھ

مولوی صدیق احمد صاحب مد فیضکم۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ،

آپ کا خط موجب فرحت ہوا۔ جو خطرہ کہ انتشار نہ دیوے وہ خطرہ ہی نہیں۔ خطرہ سے کون خالی ہوتا ہے۔ اگر خطرہ نہ ہو تو تمام کاروبار بند ہو جاویں۔ بہر حال شکر کی جگہ ہے کہ

---

[1] ترجمہ۔ جہاں بادشاہ خیمہ زن ہوگا وہاں ہیبت کی وجہ سے عوام کا شور و غل نہیں ہوگا۔

پروردگار عالم اپنے کسی بندہ کو اپنے ذکر سے منور فرمائے اور مقبول بنالیوے۔ عزائم اب بھی بلند ہیں مگر معتاد ہونے کی وجہ سے اور ملکہ پختہ ہونے کے سبب سے کمی معلوم ہوتی ہے۔ ورنہ فی الواقع کیفیات عزائم، قوۃ اور نسبت میں زیادہ ہیں۔۔۔۔ مزار حضرت مجددؒ پر حاضر ہو تو کچھ اس ناکارہ کے واسطے بھی خیال رکھنا، اور زبانی مزار مبارک پر بہ فلاں نام سلام عرض کر دینا۔ زیادہ کیا لکھوں۔ منشی فتح محمد کو بعد سلام یا حفیظ کا التزام گیارہ سو بار بعد عشاء فرماویں مولوی ابو السعد کو بھی سلام مسنون فرمادیں۔ حافظ خیر الدین صاحب اگر ہوں سلام پہونچے۔ اور مولوی پیر جی فخر الحسن کو بھی

(۱۳۰۳ھ)

مولوی صدیق احمد زید فیوضہم۔ السلام علیکم

بندہ بخیریت ہے، مطمئن رہیں۔ آپ کا خط آیا۔ صحت بعد مرض سے فرحت دو چند ہوا۔ حق تعالیٰ تندرست اور اپنی رضا میں رکھے (ریاست کے) اجنٹ کے انتقال کی خبر پہلے سنی تھی۔ حق تعالیٰ کسی مسلمان کو وہاں مقرر فرمادے۔ انگریز کا آنا بظاہر اچھا نہیں ـــــ ام الصبیان کے واسطے یہ عمل کرو کہ ایک دھاگا خواہ کسی رنگ کا ہو، سفید ہو یا سیاہ اور کوئی مقدار تاروں کی بھی نہیں، مگر سات یا نو یا گیارہ ہوں تو بہتر ہے۔ اس پر اکتالیس بار سورۂ فاتحہ مع تسمیہ پڑھ کر ہر فاتحہ پر ایک گرہ لگاؤ۔ جب ۴۱ فاتحہ اور ۴۱ گرہ ہو جاویں، پسر کے گلے میں ڈالدو۔ حق تعالیٰ فضل فرمائے گا ـــ زکوٰۃ کے روپیہ سے کچھ خرید کر دینا درست معلوم ہوتا ہے۔ حنفیہ کے نزدیک قیمت زکوٰۃ دینے سے بھی زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے۔ پس زکوٰۃ کے روپے سے اگر پارچہ، جوتہ، طعام خرید کر دیا جاوے گا۔ بہ نیت زکوٰۃ تو زکوٰۃ ادا ہو جاوے گی اور شوافع کے نزدیک عین شئے دینا لازم ہے۔ لہٰذا خود روپیہ ہی دینا احوط والبعد عن الخلاف ہے۔۔۔۔۔۔ جس قدر صورتیں آپ نے لکھی ہیں ان سب صورتوں میں طلباء فقیر ہیں۔ ان کو زکوٰۃ دینا درست ہے۔ حاجت شرح کی نہیں۔ جو مالک قدر نصاب کا ہے مگر قادر نہیں وہ فقیر ہے۔

جو کچھ بزرگان نے لکھا ہے اپنے اپنے تحقیق و مشاہدہ کر لکھا ہے اور ذات بحت منزہ

تو اب اپنے امور وجدانیہ کو کیا لکھوں، وجدان اگرچہ صحیح ہو کشف کو جو مشابہ ظنیہ ہے اور علم بدیہی قطعی (ہے) کس طرح مقابل ہو کر رد کر سکتا ہے۔ لہٰذا آپ کے سب مشاہدات کا جواب بندہ کے نزدیک اجمالی طور سے یہ ہے کہ حالات رفیعہ ہیں۔ حق تعالیٰ برکت فرمادے اور ترقی عطا کرے۔ اور آپ کے فیض سے عالم کو منور فرمادے اور اس عاجز کو بھی آپ کے ذیل میں درج فرمادے۔ آمین ـــــ

سید فتح محمد کو ذکر اسم ذات بجہر مناسب ہے۔ جو نہ ہو سکے تو وہ بھی حبس کافی ہے۔ مگر تھوڑا کریں اور توجہ (کے لیے) فقط آپ کے پاس بیٹھنا کافی ہے۔ اگرچہ بطور معمولی لطائف کو بیدار کر کے لطائف طالب پر توجہ (بھی) نہ ہو ـــــ برکت صحبت اصل توجہ ہے ـــ علاوہ ہمت شیخ امر دیگر ہے۔ پس اگر موقع ہو تو فقط پاس بٹھا کر ان کا خیال کر لیا کرو ورنہ کچھ ضرورت نہیں.... اور معیت و قرب و احاطہ بھی کیفاً خارج از فہم بشر ہے۔ حق ہے اور ایمان اس پر فرض ـــــ مگر کیف اس کا مجہول ہے اور جو کچھ متخیل و معلوم بشر ہے وہ سب تحت لا الٰہ داخل ہے ـــ اس باب میں نسبت یادداشت نقشبندیہ اقرب الی التحقیق ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم ـــــ

یا اللہ جل جلالک! اگر اس تحریر میں خطا ہوئی، معاف فرمانا۔ بندہ معذور ہے اور یہ جانتا ہے کہ ایمان باللہ اگرچہ بمشاہدہ حق ہو، ایمان بالغیب ہی ہے اور بس ــ اور وجہ یہ کہ انبیاء نے (جس کی) دعوت دی ہے، وہ بالغیب ہی ہے۔ اور نہایت عین ہدایت ہے۔ اندراج النہایہ فی البدایہ کے یہی معنی ہیں ــــ .... نسبت کے حصول کے معنی یہ ہیں کہ جو نسبت بندہ کو حاصل واقعی ہے اس سے تنبہ اور عارف ہو گیا۔ نہ یہ کہ کوئی نسبت پیدا ہو گئی۔ حضور علم حضور کا نام ہے۔ نہ ابتداع (پیدا کرنا) حضور کا۔ کما لا یخفی ــ بندہ کے واسطے دعا فرمادیں۔ حق تعالیٰ آپ کو بمدارج کمال پہونچائے ــــ فقط والسلام

(۱ رجب ۱۳۰۸ھ)

گرامی قدر مولوی عبد الحق احمد صاحب مد فیوضہم۔ بعد سلام مسنون مطالعہ فرمایند ـــــ

پہلے دو خط کا جواب روانہ کر دیا تھا۔ ایک (مالیر) کوٹلہ، دوسرا میرٹھ۔ اب تیسرا خط بدست مولوی خدا بخش پہونچا۔ آپ کے رفعت حال سے مسرور ہوتا ہے کہ شاید اس محروم کو بھی وسیلہ بخشش دیویں۔ اور پھر آپ کا حسن ظن جو ہے اس سے بھی توقع خیر ہوتی ہے کہ مقبولوں کا ظن خالی

نہیں جاتا۔ اس عاجز کو صاحب استقامت جاننا اور اس کے قدم بقدم چلنا محض آپ کا حسن ظن ہے ـــــ تعبیر خواب جو آپ نے سمجھے درست ہے۔ آپ کو غنا عن الدنیا و مافیہا ہوگا ـــــ فالحمد للہ علی ذالک ـــ

ـــ ...... مولوی محمود حسن صاحب[1] سے کہا گیا تھا، فرماتے ہیں کہ مسودہ کو درست [illegible] روانہ کریں گے۔ اشغال کی بابت آپ نے لکھا ہے سو آپ کو جملہ طرق کے اشغال کی اجازت ہے۔ جس کو جس طرح چاہو تلقین کرو، چاہے کوئی شغل اپنی طرح وضع کر کے (بطور خود) بتاؤ ـــ کسی شیخ متبع سنت سے اجازت لینا مضائقہ نہیں عمدہ ہے ـــ مگر جس سے کوئی شخص اجازت لیتا ہے اس کے ساتھ ایک اتحاد پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر کسی مبتدع (اہل بدعت) سے اجازت حاصل کی تو اندیشہ ضرر ہے۔ لہذا اس کا خیال رہے اور چند مشائخ سے ایک شغل کی اجازت حاصل کی تو برکت زیادہ ہوگی۔ بندہ کے خاص اشغال کوئی نہیں، پہلے مشائخ کے سب ہیں۔ لہذا ان کو بیان کرنا ضرور نہیں، ضیاء القلوب[5] وغیرہ میں سب درج ہیں۔ بس آپ جس طرح شغل کو چاہیں طالب کو تلقین کر دیا کریں۔ مولوی خدا بخش کو شغل جہر نفی اثبات کا بتا دیا ہے۔ ان کی طبع اور خواہش سے یہ ذکر زیادہ مناسب جانتا ہوں۔ چنانچہ ایک ہی روز کے کرنے میں اثر بتاتے ہیں۔ مولوی خلیل احمد[2] صاحب اور مولوی محمود حسن اور حافظ مسعود[3] و حافظ محمود کا سلام مسنون پہنچے۔

---

[1] شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن محدث دیوبندیؒ (م ۱۳۳۹ھ) [2] حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوریؒ [5] ضیاء القلوب مؤلفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ [3] مولانا حافظ حکیم مسعود احمد صاحبزادہ حضرت گنگوہیؒ۔

اولاد کی تعلیم و تربیت قرآن و حدیث کی روشنی میں

از مولانا جلال الدین عمری، علی گڑھ

اسلام کے نزدیک اس کے ماننے والوں کی یہ ایک اہم ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے بیوی بچوں کو علم سکھائیں، صحیح تربیت دیں اور ان کے دین و اخلاق کی نگرانی کرتے رہیں۔ قرآن مجید اور احادیث میں اس ذمہ داری کو بہت شدت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور اس پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ اسلام نے بیوی اور بچوں کی معاشی کفالت کے ساتھ ان کی دینی اور اخلاقی اصلاح کو بھی فرض قرار دیا ہے اس لئے کہ انسان صرف غذا، لباس، مکان اور دوا دارو ہی کا محتاج نہیں ہے بلکہ اس کو صحیح فکر، اعلیٰ اخلاق، نیکی اور تقویٰ اور تہذیب و شائستگی کی بھی ضرورت ہے۔ یہ اس کے ساتھ بہت بڑی زیادتی ہوگی کہ اس کی مادی ضرورتیں تو پوری کر دی جائیں اور اس کو صحیح تعلیم و تربیت سے محروم رکھا جائے۔ قرآن کا صریح حکم ہے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِیْكُمْ نَارًا۔ (سورۃ التحریم)

اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے بال بچوں کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔

جہنم سے بچنا اور جنت میں پہنچنا کھیل نہیں ہے اس کے لئے بہت ہی طویل راستہ طے کرنا پڑتا ہے۔ یہ ایسا سفر ہے جس کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب کہ انسان شعور کی منزل میں قدم رکھتا ہے اور اس وقت تک یہ سفر جاری رہتا ہے جب تک کہ لمحاتِ حیات ختم نہیں ہو جاتے۔ اس میں اس کو زندگی بھر ایک متعین راستہ پر چلنا پڑتا ہے کچھ اصول و آداب کی پابندی کرنی ہوتی ہے، کچھ چیزوں کو چھوڑنا اور کچھ چیزوں کو اختیار کرنا پڑتا ہے۔ یہ دراصل جیسے انسان جہنم

سے بچنے کے لئے ضروری تصور کرتا ہے۔ قرآن مجید کی ہدایت ہے کہ اپنے بیوی بچوں کے سلسلہ میں وہ بھی اسے ناگزیر سمجھے اور اس کا ان کو پابند بنائے۔ چنانچہ تفسیروں میں آتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت فرمایا کہ ہم اپنے اہل و عیال کو جہنم سے کیسے بچائیں۔ آپ نے فرمایا کہ — جن باتوں سے اللہ نے تم کو منع کیا ہے ان سے تم ان کو منع کرو اور جن باتوں کا اس نے تمہیں حکم دیا ہے ان کا تم ان کو حکم دو۔ یہ چیز ان کے جہنم سے بچنے کا ذریعہ بن جائے گی۔"

(آلوسی۔ روح المعانی ۱۵۶/۲۷)

قرآن مجید اور احادیث میں بیوی اور بچوں کی اصلاح و تربیت پر ایک ساتھ بھی زور دیا گیا ہے اور الگ الگ بھی۔ اس مضمون میں ان بیانات کی گنجائش نہیں ہے کہ ان دونوں طرح کی تعلیمات کو پیش کیا جائے۔ یہاں قرآن و حدیث کی صرف ان ہدایات اور ان کے دبے ہوئے اشارات کو پیش کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے جن کا تعلق خاص طور پر اولاد کی تعلیم و تربیت سے ہے۔

عام طور پر اولاد کو بڑھاپے کا سہارا سمجھا جاتا ہے۔ دولت و ثروت، عیش و راحت اور فخر و مباہات کا ذریعہ تصور کیا جاتا ہے اسی لئے اولاد کی خواہش بھی کی جاتی ہے۔ جب ان مقاصد کو پورا کرنے والی اولاد مل جاتی ہے تو آدمی دنیا والوں کے درمیان اتراتا پھرتا ہے، اپنی قوت و طاقت اور برادری کا مظاہرہ کرتا ہے اور اپنے حریفوں کو زک دینے کی کوشش کرتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سب بہت چھوٹے اور گھٹیا مقاصد ہیں۔ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے پیغمبروں میں بھی اولاد کی طلب پائی جاتی تھی اور وہ اس کے لئے دعائیں بھی کرتے تھے، لیکن ان کی طلب اور تمنا ان حقیر اور ادنیٰ مقاصد کے لئے نہیں ہوتی تھی جن مقاصد کے لئے دنیا والے آرزو کرتے ہیں وہ ایک اعلیٰ اور ارفع مقصد کے طالب ہوتے تھے اور یہی ایک مقصد ان کے سامنے ہوتا ہے۔ اولاد کی طلب بھی ان کے اندر اسی مقصد کے لئے پائی جاتی ہے۔

حضرت زکریا علیہ السلام کو اولاد کے نہ ہونے کا غم ہے۔ لیکن بڑھاپا طاری ہے۔ عمر کے اس مرحلہ میں داخل ہو چکے ہیں کہ اولاد کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ بیوی بھی سن یاس کو پہونچ چکی ہے۔ پھر بھی خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتے۔ چپکے چپکے اور آہ و زاری کے ساتھ دعا فرماتے ہیں:

فَهَبْ لِي مِن لَّدُنكَ وَلِيًّا — تو مجھے اپنے پاس سے ایک جانشین عطا

يَرِثُنِي وَيَرِثُ مِنْ آلِ يَعْقُوبَ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا
(مریم - ۵، ۶)

"جو میرا بھی وارث ہو اور آل یعقوبؑ کا بھی۔ اور اس کو اے میرے رب! پسندیدہ انسان بنا۔"

حضرت زکریا علیہ السلام کے دل میں اولاد کی تمنا اور آرزو موجزن ہے لیکن اس لئے نہیں ہے کہ وہ ان کے مال و دولت اور جائداد کی وارث بنے اور ان کے کاروبار اور تجارت یا کارخانہ کو چلائے یا وہ کہ وہ اس کے ذریعہ اپنی شان و شوکت کا مظاہرہ کریں، اور اپنے تفوق اور برتری کا لوہا دوسروں سے منوائیں بلکہ اس لئے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت یعقوبؑ سے دین کی جو دولت ان کو ملی ہے، جس پیغام کے وہ امین ہیں اور دعوت و تبلیغ کا جو فرض وہ انجام دے رہے ہیں اس کو ان کے بعد اٹھائے اور اسی دھن اور جذبہ کے ساتھ وہ کام کرے جو کام وہ خود کر رہے ہیں اور جس کے لئے خدا نے ان کو نبوت سے سرفراز کیا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس کام کے لئے سب سے بڑی شرط یہ ہے کہ آدمی میں تقویٰ اور خدا ترسی پائی جائے وہ نیک اور صالح اور پسندیدہ اطوار اور خوش خلق ہو۔ اس لئے کہ بدکار اور بداخلاق انسان چاہے اس میں دنیوی لحاظ سے کتنی ہی دوسری خوبیاں اور کمالات کیوں نہ ہوں اس کام کا اہل نہیں ہو سکتا۔ اسی وجہ سے حضرت زکریا کی دعا یہ ہے کہ

رَبِّ هَبْ لِي مِن لَّدُنكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً إِنَّكَ سَمِيعُ الدُّعَاءِ
(آل عمران - ۳۸)

اے میرے رب! مجھے اپنے پاس سے پاکیزہ اولاد عطا فرما بے شک تو دعا کا سننے والا ہے۔

جس اولاد کی تمنا ہے اس کے لئے دولت و ثروت، شان و شوکت، دنیوی عزت و جاہ کسی چیز کی درخواست اور التجا نہیں ہے۔ بلکہ دعا یہ ہے کہ جو اولاد مجھے ملے وہ فکر و عمل اور سیرت و کردار کی نجاستوں سے پاک ہو، وہ شستہ اخلاق اور شائستہ کردار ہو اور اس کی خصلتیں پاکیزہ ہوں۔ حضرت زکریا کی یہ دعا قبول ہوئی اور ان کو حضرت یحییٰ عطا کئے گئے۔ قرآن مجید نے ان کی خوبیوں کا ذکر ایک جگہ ان الفاظ میں کیا ہے

يَا يَحْيَىٰ خُذِ الْكِتَابَ بِقُوَّةٍ وَ

(ہم نے حکم دیا) اے یحییٰ اللہ کی کتاب کو مضبوط پکڑ لو

آتَيْنَاهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا وَحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكَاةً وَكَانَ تَقِيًّا وَبَرًّا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا۔ (سورہ مریم)

ہے پکڑو، ہم نے اسے بچپن ہی میں سوجھ بوجھ اور قوت فیصلہ سے نوازا تھا۔ اور اپنے پاس سے نرم دلی اور پاکیزگی عطا کی تھی۔ اور وہ پرہیزگار اور اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنے والا تھا اور سرکش اور نافرمان نہ تھا۔

یہ اس نیک اولاد (حضرت یحییٰ) کی صفات ہیں جو حضرت زکریا علیہ السلام کو عطا کی گئی تھی اور ان کی کچھ مزید صفات ایک اور جگہ اس طرح بیان ہوئی ہیں:۔

مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللهِ وَسَيِّدًا وَحَصُورًا وَنَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ (آل عمران: ۳۹)

وہ اللہ کے ایک کلمہ کی تصدیق کریں گے (حضرت عیسیٰ کے بے باپ پیدا ہونے کی تصدیق) وہ سردار ہوں گے، پاکباز ہوں گے، نبی ہوں گے اور صالحین میں ان کا شمار ہوگا۔

ایک جگہ ان دونوں باپ بیٹے (حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ) کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

إِنَّهُمْ كَانُوا يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَيَدْعُونَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا وَكَانُوا لَنَا خَاشِعِينَ۔ (الانبیاء: ۹۰)

وہ نیکی کے کاموں میں سبقت کرتے تھے۔ اور ہمیں رغبت اور شوق اور خوف (کے ملے جلے جذبات) کے ساتھ پکارتے تھے اور ہمارے آگے سر جھکائے ہوئے تھے۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام خدا کے پیغمبر بنائے گئے، ان کو معاملات کی بصیرت اور فیصلہ کی قوت عطا کی گئی محبت اور دل سوزی، تقویٰ اور طہارت، والدین کے ساتھ حسنِ سلوک، پاکبازی اور دینی و اخلاقی سیادت اور سرفرازی سے نوازا گیا۔ حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ دونوں خدا کے پیغمبر تھے۔ اب پیغمبری کا سلسلہ بند ہو چکا ہے لہٰذا کوئی شخص پیغمبر نہیں ہو سکتا۔ اس ایک پہلو سے قطع نظر اوپر کے بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک صالح باپ کے اندر کس قسم کی اولاد کی تمنا اُبھرتی ہے اور وہ کس مقصد کے لیے اولاد کا طلبگار ہوتا ہے۔ پھر یہ کہ اللہ تعالیٰ انسان کی اولاد کو کن اعلیٰ صفات سے متصف دیکھنا چاہتا ہے۔

حضرت ابراہیم بھی بڑھاپے میں اولاد کی تمنا اور دعا کرتے ہیں لیکن مطلق اولاد کی نہیں بلکہ

صالح اولاد کی۔

رَبِّ هَبْ لِي مِنَ الصَّالِحِينَ — اے میرے رب مجھے صالح اولاد عطا فرما۔

اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔

فبشرناہ بغلام حلیم — ہم نے اس کو خوش خبری دی ایک بردبار لڑکے کی۔

(صافات : ۱۰۱)

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے :۔

وبشرناہ بغلام علیم۔ — ہم نے اس کو خوش خبری دی ایک علم والے لڑکے کی۔

(ذاریات)

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جس اولاد کی خوش خبری دی تھی وہ حضرت اسماعیلؑ تھے۔ حضرت اسماعیل کی دو نمایاں خصوصیات یہاں بیان کی گئی ہیں، ایک یہ کہ وہ حلیم تھے دوسرے یہ کہ وہ علم والے تھے۔ حلم ضبط نفس اور بردباری کا دوسرا نام ہے اور علم اس روشنی اور بصیرت کو کہا گیا ہے جو پوری زندگی میں خدا کی طرف سے ملتی ہے۔ اس دنیا میں صحیح زندگی گزارنے کے لئے علم کی ضرورت ہے اور کامیاب زندگی کے لئے حلم کی۔ علم سے انسانی فکر کی اصلاح ہوتی ہے اور حلم سے دشمن بھی دوست بن جاتے ہیں اور بہترین تعلقات وجود میں آتے ہیں۔

حضرت ابراہیم نے صالح اولاد کی دعا کی اور جب یہ دعا مقبول ہوئی تو حضرت اسماعیل پیدا ہوئے جن کی شخصیت صحیح فکر اور اعلیٰ اخلاق دونوں کا مجموعہ تھی، اسی کو یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ صالح اولاد وہ ہوتی ہے جس میں یہ دونوں خوبیاں موجود ہوں۔

اولاد اگر صالح اور خدا ترس نہ ہو تو چاہے وہ پیغمبر ہی کی اولاد کیوں نہ ہو اسلام اس کو کوئی اہمیت نہیں دیتا اور اس بات کو پیغمبر کی شان کے منافی سمجھتا ہے کہ اسے اپنی طرف منسوب کرلے۔ حضرت نوحؑ کا بیٹا جب اپنی نافرمانی کے نتیجہ میں خدا کے عذاب کی زد میں آنے لگا تو حضرت نوحؑ نے دعا فرمائی۔ خدایا! تو نے وعدہ فرمایا ہے کہ مجھے اور میرے خاندان کو اپنے عذاب سے محفوظ رکھے گا، لہٰذا میرے بچہ کو اس عذاب سے بچالے۔ اس دعا کے جواب میں اللہ نے فرمایا :

يَا نُوحُ إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ — اے نوحؑ! وہ تیرے گھر والوں میں نہیں ہے

لئے اس دین کو پسند کیا ہے لہٰذا مرتے دم تک
اسی کے مطیع فرمان رہو۔

یہی آخری نصیحت حضرت یعقوبؑ کی اپنی اولاد کو تھی ــــــــ

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰـهَكَ وَاِلٰـهَ اٰبَآئِكَ اِبْرَاهِيْمَ وَاِسْمَاعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰـهًا وَّاحِدًا وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (البقرہ۔ ۱۳۳)	کیا تم اس وقت موجود تھے جب کہ یعقوب کی موت کا وقت آیا، اس نے اپنے بیٹوں سے پوچھا کہ میرے بعد تم کس کی عبادت کروگے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہم اسی ایک خدا کی عبادت کریں گے جو آپ کا بھی معبود ہے اور آپ کے باپ دادا ابراہیم، اسمٰعیل اور اسحٰق کا بھی معبود وہ ہے اور ہم سب اسی کے اطاعت گزار ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اولاد کو تمام بات کی وصیت اور تاکید کی جاتی رہنی چاہئے وہ یہ ہے کہ وہ خدائے واحد کو مانے، اس کی مطیع و فرمانبردار بن جائے۔ زندگی کی آخری سانس تک اس کی اطاعت و غلامی پر ثابت قدم رہے اور پیغمبروں اور صالحین کے نقش قدم پر چلے۔

اس سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ خدا کے پیغمبر اولاد کس لئے چاہتے تھے، ان کو کس قسم کی تعلیم و تربیت دیتے تھے، کن باتوں کی تاکید اور نصیحت فرماتے رہتے تھے اور کس مقصد کے لئے ان کو تیار کرتے تھے۔؟

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں بھی اولاد کی تعلیم و تربیت پر بے حد زور دیا گیا ہے مشہور حدیث کا فقرہ ہے۔

الرجل راع علی اهل بیته و هو مسئول عن رعیته و امرأة راعية علی بيت زوجها و ولده وهی مسئولة عنهم[۱]	آدمی اپنے گھر والوں کا نگراں ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں (خدا کے ہاں) پوچھا جائے گا۔ عورت اپنے شوہر کے گھر اور اس کے بچوں کی نگراں ہے اس سے

[۱] متفق علیہ، مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الامارۃ والقضاء

إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ فَلَا تَسْأَلْنِ
مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنِّي أَعِظُكَ
أَنْ تَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ
(ہود: ۴۶)

وہ تو ایک 'غیر صالح عمل' ہے اس لئے تم مجھ
سے ایسی بات کا سوال نہ کرو جس کا تمھیں
علم نہیں ہے. میں تم کو نصیحت کرتا ہوں کہ
تم جاہل نہ بنو.

اللہ کی تعلیم و تربیت جس نہج پر ہونی چاہئے اسے قرآن مجید نے اس نصیحت کے ذریعہ واضح کیا ہے جو حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو کی تھی اس نصیحت میں سب سے پہلے شرک سے اجتناب اور خدائے واحد کی بندگی کی تعلیم ہے اسی ضمن میں ماں باپ کے حقوق اور ان کی اطاعت کے حدود واضح کئے گئے ہیں پھر حضرت لقمان نے آخرت کا تصور بھی پیش کیا ہے. خدا کو حاضر و ناظر جان کر زندگی گزارنے کی تلقین کی ہے، نماز کی تاکید فرمائی ہے جو خدا سے تعلق کا بہترین ذریعہ ہے. دعوت و تبلیغ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا حکم دیا ہے اور اس میں ثابت قدمی کی ہدایت کی ہے. آخر میں اخلاق، تہذیب اور شرافت کی بڑے موثر انداز میں تعلیم دی ہے. (لقمان، رکوع ۲)

اسی طرح حضرت ابراہیم کی اس نصیحت میں بھی اس کے خطوط ملتے ہیں جو انھوں نے اپنی اولاد کو کی تھی کہ اللہ کے دین پر قائم رہنے اور عمل کرنے کی قرآن مجید نے تاکید کی ہے.

وَمَنْ يَرْغَبُ عَنْ مِلَّةِ إِبْرَاهِيمَ
إِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهُ وَلَقَدِ
اصْطَفَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا وَإِنَّهُ فِي
الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ. إِذْ قَالَ
لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ قَالَ أَسْلَمْتُ
لِرَبِّ الْعَالَمِينَ. وَوَصَّى بِهَا
إِبْرَاهِيمُ بَنِيهِ وَيَعْقُوبُ
يَا بَنِيَّ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَى لَكُمُ
الدِّينَ فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ
مُسْلِمُونَ. (البقرہ ۱۳۰-۱۳۲)

اور کون ہے جو ابراہیم کے دین سے
نفرت کرے سوائے اس کے جو حماقت میں
مبتلا ہو. ہم نے اس کو دنیا میں منتخب کیا تھا
اور آخرت میں اس کا شمار صالحین میں ہوگا.
اس وقت کا تصور کرو جب اس کے رب نے
اس سے کہا تھا کہ سر جھکا دو تو اس نے کہا
میں نے رب العالمین کے سامنے سر جھکا
دیا. ابراہیم نے اسی کی وصیت اپنے بیٹوں
کو کی تھی اور یعقوب کی بھی یہی نصیحت اپنی
اولاد کو تھی کہ اے میرے بیٹو اللہ نے تمھارے

ان کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

یہ بہت جامع الفاظ ہیں ان کے مفہوم میں بچوں کی مادی ضرورتوں کو پورا کرنا اور ان کے دین و اخلاق کو سنوارنا دونوں ہی باتیں داخل ہیں۔ شریعت کی رو سے والدین اولاد کے سرپرست اور نگراں ہیں ان کو خدا کے ہاں اولاد کے بارے میں جواب دینا ہوگا۔ ان کی ذمہ داری صرف یہی نہیں ہے کہ بھوک، پیاس برہنگی اور مرض سے اپنی اولاد کی حفاظت کریں، بلکہ یہ بھی ان کی ذمہ داری ہے اور بہت بڑی ذمہ داری ہے کہ اس کو بے دینی اور جہالت سے بچائیں، تہذیب و شائستگی سے آراستہ کریں اور ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام کریں۔ والدین اگر اولاد کو صحیح راہ پر لے چلیں گے تو خدا کے ہاں اجر و ثواب کے مستحق ہوں گے۔ اور اگر انھوں نے اس میں کوتاہی کی اور ان کو سیدھی راہ سے بھٹکا دیا یا ان کو بھٹکتے چھوڑ دیا تو ان سے اس کے متعلق سخت باز پرس ہوگی۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اپنے بچے کو ادب سکھاؤ، کیونکہ تم سے اس کے بارے میں قیامت کے دن پوچھا جائے گا کہ تم نے اس کو کیا ادب سکھایا اور کیا تعلیم دی، جس طرح اس سے یہ سوال ہوگا کہ اس نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا اور تمہاری کتنی اطاعت کی۔[1]

اس دنیا میں ہر شخص اپنی اولاد کو خوش حال دیکھنا چاہتا ہے، اس کے لئے وہ کوشش بھی کرتا ہے اور جہاں تک ہو سکے ان کی آسائش و راحت کے لئے مال و دولت اور مادی اسباب و وسائل فراہم کرتا ہے۔ یہ جائز حدود میں غلط نہیں ہے۔ لیکن اس سے زیادہ قیمتی چیز یہ ہے کہ اولاد کے دین و اخلاق کو سنوارا جائے، ان کو صحیح تعلیم و تربیت دی جائے اور ان کو اس قابل بنایا جائے کہ ہوش سنبھالنے کے بعد وہ اسلام کے مطابق اپنی زندگی بسر کر سکیں۔ یہی بات ایک حدیث میں ان الفاظ میں کہی گئی ہے:۔

مانحل والد ولدا من نحل افضل من ادب حسن[2]	کسی باپ نے اپنے بچے کو اچھے ادب سے بہتر کوئی عطیہ نہیں دیا۔

---

[1] ابن قیم الجوزیۃ: تحفۃ المودود باحکام المولود ص ۱۳۴۔ [2] مسند احمد ۴۱۲/۳۔ ترمذی، ابواب البر والصلۃ باب ادب الولد۔ قال الترمذی ہذا عندی حدیث مرسل۔

ایک دوسری روایت ہے :۔

لان یودب الرجل ولدہ خیرلہ من ان یتصدق بصاع۔[1]

آدمی اپنے بچے کو (ایک) ادب سکھائے یہ صاع اس سے بہتر ہے کہ ایک صاع صدقہ کرے۔

اولاد کی تربیت کے سلسلے میں یہ بہت ضروری ہے کہ ان کے ساتھ بہترین اخلاقی رویہ اختیار کیا جائے۔ اس لئے کہ اخلاق اور تہذیب و شرافت سے انسان میں اعلیٰ اخلاقی قدریں اُبھرتی ہیں، اور اس کی انسانیت کی نشو و نما ہوتی ہے۔ بچے کی غلطیوں اور خامیوں کو دیکھ کر بعض اوقات سخت گیر اور بدمزاج والدین ان کے خلاف شدید نفرت اور حقارت کا مظاہرہ کرنے لگتے ہیں اور اس طرح سلوک کرنے لگتے ہیں کہ جیسے وہ بالکل ناقابل اصلاح ہیں۔ اصلاح اور تربیت کے نقطہ نظر سے یہ بہت ہی غلط رویہ ہے اس سے بچے کی عزت نفس مجروح ہوتی ہے اور وہ یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ اس کو ذلیل و رسوا کیا جا رہا ہے۔ بچے کا یہ احساس اس کی سیرت کو تباہ کر کے رکھ دیتا ہے، اس کی فطری خوبیاں اور اعلیٰ حوصلے دب جاتے ہیں اور وہ احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے احادیث میں والدین کو اولاد کے ساتھ شریفانہ رویہ اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے تاکہ وہ یہ سمجھے کہ اس کے بہی خواہ اور سرپرست اس کو باعزت مقام دے رہے ہیں اور وہ اس قابل ہے کہ معاشرہ میں بہترین کردار انجام دے سکے۔ یہ چیز معمولی نہیں ہے بلکہ اس سے بچے کے اندر اوپر اُٹھنے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے اور اس کی فطری خوبیاں اور کمالات اُبھرنے لگتے ہیں۔ یہ رویہ انتہائی مفید ہونے کے ساتھ ایسا ہے کہ اس میں ذرا سی بے احتیاطی بچے کو غلط راہ پر بھی ڈال سکتی ہے وہ نافرمان، بے ادب اور متکبر ہو سکتا ہے، اس میں بڑوں کی نصیحت کو قبول نہ کرنے کا جذبہ بھی ابھر سکتا ہے۔ اس لئے بچے کو ایک طرف تو عزت و احترام کی نظر سے بھی دیکھا جائے اور دوسری طرف اس کی اصلاح و تربیت سے غفلت بھی نہ برتی جائے اس کے اندر اچھے اخلاق و عادات پیدا کرنے کی کوشش کی جائے اور برائیوں اور غلط کاموں سے بچانے کی فکر کی جائے۔ یہی بات ایک حدیث میں اس طرح کہی گئی ہے :۔

---

[1] ترمذی، ابواب البر والصلۃ۔ باب ادب الولد۔ مسند احمد ۵/ ۹۶، ۱۰۲۔ مسند احمد میں۔ صاع کی بجائے۔ نصف صاع۔ کا لفظ آیا ہے، اس لفظی اختلاف سے قطع نظر حدیث سنداً کمزور ہے۔

اکرموا اولادکم واحسنوا ادبہم[1]
اپنی اولاد کی عزت کرو اور ان کو اچھا ادب سکھاؤ۔

اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ انسانوں کی اصلاح، تذکیر و تفہیم اور نصیحت و تبلیغ سے کی جائے اور سختی کا ذریعہ اس وقت اختیار کیا جائے جب کہ نصیحت و تبلیغ سے اصلاح کا امکان نہ ہو اور فساد و بگاڑ کا اندیشہ پیدا ہو جائے۔ اس اصول کے تحت بچہ کی تعلیم و تربیت بھی نرمی اور لطف و محبت ہی کے ذریعہ ہونی چاہئے، اور غیر ضرورت سے زیادہ سختی اور تشدد سے پوری طرح اجتناب کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ سختی سے انسان کو کچھ باتوں کا عارضی طور پر تو پابند بنایا جا سکتا ہے لیکن اس کے ذہن و فکر کو بدلا نہیں جا سکتا، بے جا سختی اور تشدد سے انسان کی نفسیات اور مزاج پر بڑے خراب اثرات پڑتے ہیں اور اس کے اندر شدید ردعمل ابھرنے لگتا ہے اس سے اصلاح کے بجائے فساد کا خطرہ رہتا ہے۔

علامہ ابن خلدون نے اس موضوع پر بڑی اچھی بحث کی ہے کہ سختی سے بچے کے اندر کس قسم کا ردعمل ابھرتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بچے کے اندر نشاط اور تازگی اسی وقت تک باقی رہتی ہے، جب تک کہ اس کے ساتھ محبت اور نرمی کا سلوک کیا جائے، سختی سے اس کے اندر انقباض کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ سست اور کاہل بن جاتا ہے۔ مار کے ڈر سے بچہ جھوٹ بولنے لگتا ہے پھر رفتہ رفتہ اس کی عادت بن جاتی ہے، اس کے علاوہ دوسری اخلاقی خرابیاں بھی اس کے اندر پیدا ہونے لگتی ہیں اور اعلیٰ اخلاق اور بہترین اوصاف و کمالات کا حصول اس کے لئے دشوار ہو جاتا ہے۔ لہٰذا استاد کو طالب علم کی تربیت کے سلسلہ میں اور باپ کو بچہ کی تربیت کے سلسلہ میں سخت گیری نہیں کرنی چاہئے۔

ابو محمد بن زید کہتے ہیں کہ بچہ کی تادیب کے لئے اس کو جسمانی سزا دینا ضروری ہو تب بھی تین بار سے زیادہ نہیں مارا جا سکتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جس شخص کو شریعت ادب نہ سکھائے اللہ تعالیٰ اسے با ادب نہ بنائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شریعت نے تادیب و تربیت کے جو حدود مقرر کر دیئے ہیں وہ انسانوں کی اصلاح کے لئے کافی ہیں، اس لئے کہ انسانی فطرت اور اس کے مصالح پر بہت گہری نگاہ ہے

---

[1] ابن ماجہ ابواب الادب، باب بر الوالد والاحسان الی البنات۔ قال المناوی فیہ نکارۃ وضعف .... : التیسیر بشرح الجامع الصغیر ۱/۲۰۲

اس سے آگے بڑھ کر کسی کے ساتھ سختی کا رویہ اختیار کرنا اس کی حمیت کو ختم کرنا اور اسے ذلیل و رسوا کرنا ہے۔"[1]

اسی وجہ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بچوں کی تربیت ہمیشہ نصیحت اور فہمائش کے ذریعہ کی اگر ان سے کبھی غلطی کا صدور ہوا تو پیار اور محبت سے بتایا کہ وہ غلطی کر رہے ہیں اور انہیں اس سے اجتناب کرنا چاہیئے، تاکہ ان کے اندر خود سے اپنی غلطی کا احساس ابھرے اور وہ اس کو ایک غلط کام سمجھ کر چھوڑ دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص حضرت انس رضی اللہ عنہ آٹھ دس سال کی عمر سے لیکر بیس سال کی عمر تک آپ کی خدمت میں رہے۔ بچپن سے لے کر جوانی تک کے اس پورے دور کے بارے میں وہ فرماتے ہیں کہ:۔

"میں نے دس برس آپؐ کی خدمت کی لیکن آپؐ نے کبھی ڈانٹ ڈپٹ نہیں کی اور نہ کبھی آپؐ نے مجھ سے یہ فرمایا کہ تم نے فلاں کام کیوں کیا اور فلاں کام کیوں نہیں کیا۔"[2]

وہ اپنے بچپن کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ آپؐ نے مجھے ایک ضرورت سے بھیجا۔ میرا ارادہ گو کہ وہاں جانے کا تھا لیکن میں نے کہہ دیا کہ قسم خدا کی میں نہیں جاؤں گا۔ پھر وہاں سے نکل کر میں چند لڑکوں کے پاس پہونچ گیا جو راستہ میں کھیل رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیچھے سے پہونچے اور دست مبارک سے میری گردن کو پکڑ لیا۔ پلٹ کے دیکھا تو آپؐ مسکرا رہے تھے۔ فرمایا بیٹے انس! جس کام کے لئے میں نے تمہیں بھیجا تھا تم وہاں گئے یا نہیں؟ میں نے عرض کیا حضور! ابھی جا رہا ہوں۔[3]

روایات میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے صدقہ کی کھجوروں میں سے ایک کھجور منہ میں ڈال لی تو آپ نے فرمایا چھی چھی! اسے تھوک دو۔ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ ہم صدقہ والی چیز نہیں کھاتے۔[4]

---

[1] مقدمہ ابن خلدون فصل فی ان الشدۃ علی المتعلمین مضرۃ بہم ص ۴۹ ۔ [2] مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الفتن۔ باب فی اخلاق و شمائل صلی اللہ علیہ وسلم بحوالہ بخاری و مسلم ۔ [3] حوالہ سابق بحوالہ مسلم ۔ [4] مشکوٰۃ کتاب الزکوٰۃ۔ باب من لا تحل لہ الصدقۃ ۔

حضرت عمر بن ابو سلمہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پروردہ تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ آپ کی گود میں میری پرورش ہوئی۔ ایک مرتبہ میں آپ کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا (تو جیسے عام طور پر بچوں کی عادت ہوتی ہے) میں برتن کے چاروں طرف سے کھانے لگا۔ آپ نے فرمایا کہ بیٹے! اللہ کا نام لے کر کھاؤ، دائیں ہاتھ سے کھاؤ اور اپنے سامنے سے کھاؤ۔ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میرے کھانے کا طریقہ یہی رہا۔[1]

بہت سے لوگ بچوں کو ان کی خامیوں پر ٹوکتے نہیں بلکہ ان کی بڑی سے بڑی غلطی کو بھی کم سنی اور نادانی کا نتیجہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا کرتے ہیں۔ یہ طریقہ صحیح نہیں ہے اس سے بچہ کے اندر بُری عادتیں جڑ پکڑ جاتی ہیں جن کا چھڑانا بعد میں مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے ان حدیثوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بچوں میں جب بھی کوئی غلطی دیکھی تو پیار اور محبت سے اس پر انھیں ٹوکا اور بچپن ہی سے انھیں اسلامی آداب کا پابند بنایا۔

اسی طرح بچوں کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں بعض لوگ سختی کو بالکل پسند نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک تربیت کے لئے بچے کو جسمانی سزا دینا معاشرہ کے نچلے اور متوسط طبقوں کا طریقہ ہے۔ اونچے طبقے میں بچے سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو اس کو جسمانی سزا نہیں دی جاتی بلکہ افہام و تفہیم سے کام لیا جاتا ہے۔ اگر اس سے وہ اصلاح قبول نہ کرے تو ڈانٹ ڈپٹ اور سرزنش کی جاتی ہے۔ مار پیٹ کسی حال میں نہیں کی جاتی۔

اسلام جسمانی سزا کو ہر حال میں غلط نہیں سمجھتا اور نہ یہ اس کے نزدیک کسی فرد یا معاشرہ کے مہذب ہونے کی نشانی ہے کہ وہ بچوں کو غلطی سے روکنے یا ان کی تربیت کے لئے سختی سے کام نہ لے۔ اس کی تعلیم یہ ہے کہ بچہ کی اصلاح و تربیت لطف و محبت اور ہمدردی ہی سے ہونی چاہئے لیکن اگر اس سے اس کی اصلاح نہ ہو سکے تو والدین کو اس کے ساتھ سختی بھی کرنی چاہئے۔ ع

درشتی و نرمی بہم در بہ است

ہاں سختی نہ تو بے ضرورت ہونی چاہئے اور نہ حد سے زیادہ۔

تربیت ہی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ بیوی بچوں کے ساتھ ایسا رویہ نہ اختیار کیا جائے کہ وہ

[1] بخاری، کتاب الاطعمۃ باب التسمیۃ علی الطعام والاکل بالیمین۔

نڈر اور بے خوف ہوجائیں اور ان کو غلط روی سے روکنا مشکل ہوجائے۔ احادیث میں آتا ہے کہ آدمی کو ایک طرف تو اپنے متعلقین کی مادی ضروریات کے پورا کرنے میں فراخ دل ہونا چاہئے۔ دوسری طرف سختی سے ان کی اخلاقی نگرانی بھی اسے کرتے رہنا چاہئے۔ چنانچہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

وانفق علیٰ عیالک من طولک ولا ترفع عنہم عصاک ادباً واخفہم فی اللہ[1]	اپنے بال بچوں پر اپنی دولت میں سے خرچ کرو اور ان کے ادب کی خاطر اپنی چھڑی ان پر سے نہ ہٹاؤ اور اللہ کے بارے میں ان کو ڈراؤ۔

یہی بات ان الفاظ میں بھی کہی گئی ہے:——

علقوا السوط حیث یراہ اھل البیت فانہ ادب لہم[2]	اپنا کوڑا ایسی جگہ لٹکاؤ کہ گھر والے اس کو دیکھ سکیں اس لئے کہ یہ ان کو ادب دینے کا ذریعہ ہے

والدین کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اولاد کو بچپن ہی سے نماز کا عادی بنائیں اور اس سلسلے میں اُن سے کوتاہی ہو تو سختی کریں۔

مروا اولادکم بالصلاۃ وھم ابناء سبع سنین واضربوھم علیھا وھم ابناء عشر[3]	بچے سات سال کے ہوجائیں تو ان کو نماز کا حکم دو اور جب وہ دس سال کی عمر کو پہنچ جائیں اور نماز نہ پڑھیں تو ان کی پٹائی کرو۔

احکام دین میں چونکہ نماز کی اہمیت سب سے زیادہ ہے اس لئے خصوصیت سے یہاں اس کا ذکر کیا گیا ہے ورنہ جیسا کہ فقہاء نے لکھا ہے روزہ کا بھی یہی حکم ہے[4]۔ مطلب یہ کہ ماں باپ کو صرف ایک نماز ہی کی نہیں

---

[1] مسند احمد ۵/۲۳۸۔ [2] قال الہیثمی رواہ الطبرانی فی الکبیر والاوسط...... واسناد الطبرانی فیھما حسن (مجمع الزوائد ومنبع الفوائد ۸/۱۰۶) [3] مسند احمد ۲/۱۸۰، ۱۸۷۔ ابوداؤد، کتاب الصلاۃ باب متی یومر الغلام بالصلاۃ۔ اس حدیث میں کسی قدر ضعف ہے لیکن اسی مضمون کی اور روایتیں ابوداؤد اور ترمذی میں موجود ہیں۔ [4] ابن عابدین رد المحتار علی الدر المختار ۲/۴۱

روزے کی بھی بچہ کو تلقین اور نصیحت کرنی چاہیے اور بچہ غفلت اور تساہلی کا مظاہرہ کرے تو اس کے ساتھ سختی کی جانی چاہیے۔ یہی حال دوسرے احکام دین کا بھی ہے۔ شریعت نے ان میں سے جس حکم کو جتنی اہمیت دی ہے اتنی اہمیت بچہ کے سامنے آتی رہنی چاہیے اور اس کا اُسے پابند بنانے کی کوشش کبھی نرمی اور سختی دونوں طریقوں سے کی جانی چاہیے تاکہ دین اور اس کی تعلیمات اس کے لیے نامانوس نہ ہوں اور جوان ہونے کے بعد اچانک ان پر عمل کرنا اس پر شاق نہ گزرے۔ اس بارے میں فقہاء کے خیالات کی ترجمانی ابن کثیر نے ان الفاظ میں کی ہے کہ "نماز کے بارے میں بچوں کے ساتھ جو رویہ اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہی رویہ روزہ کے سلسلے میں بھی اختیار کیا جانا چاہیے تاکہ خدا کی عبادت اور اطاعت کرتے ہوئے بچہ جوانی کے مرحلے میں قدم رکھے اور معاصی سے اجتناب اور منکرات سے پرہیز کا وہ عادی ہو چکا ہو"۔[۵۱]

والدین پر اولاد کی تعلیم و تربیت فرض ہے۔ اس لیے شریعت نے ان کو تذکیر و نصیحت کے ساتھ اس بات کا بھی حق دیا ہے کہ وہ وقت ضرورت تنبیہ و تادیب بھی کریں۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ آدمی بچہ کو ادب سکھائے اور تربیت دینے میں جو سختی کرے اس کا اس پر کوئی گناہ نہ ہوگا۔[۵۲]

اسی وجہ سے فقہاء نے لکھا ہے کہ باپ بچہ کو قرآن مجید کے پڑھنے، علم دین حاصل کرنے اور اسلامی آداب و اطوار کے سیکھنے پر مجبور کر سکتا ہے اس کا اسے حق حاصل ہے۔[۵۳] حضرت سفیان ثوری رحمہ کہتے ہیں کہ آدمی کو چاہیے کہ اولاد کو علم حدیث حاصل کرنے پر مجبور کرے اس لیے کہ اس سے قیامت کے دن اولاد کے بارے میں پوچھا جائے گا کہ (اس نے ان کو تعلیم دی تھی یا نہیں)۔[۵۴]

اسی طرح اسلام پورے معاشرے کے اندر ایک خاص طرح کی تہذیب و معاشرت کو پروان چڑھاتا ہے۔ جس میں شرم و حیا اور عفت و عصمت کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ بچہ کو شروع ہی سے ان اخلاقی قدروں کی تربیت دی جائے اور اس کے ذہن و مزاج میں ان کو پیوست کر دیا جائے چنانچہ ایک جگہ آداب معاشرت کی تعلیم دیتے ہوئے قرآن مجید نے ہدایت کی کہ نماز فجر سے پہلے، دوپہر کے وقت جب کہ آدمی تھوڑا سا آرام کرتا ہے اور عشاء کے بعد نابالغ بچوں کو بھی گھر (یا کمرے) میں اجازت

۵۱ ابن کثیر، تفسیر ۱/۲۴۱۔ ۵۲ مختصر کنز العمال علی ہامش المسند ۶/۴۳۶۔ ۵۳ ابن عابدین، رد المحتار علی الدر المختار ۲/۶۷۱۔ ۵۴ ابن قیم، تحفۃ المودود باحکام المولود ص ۱۳۶۔

لے کر داخل ہونا چاہیئے ——— (النور۔ ۵۸) اس لئے کہ یہ اوقات خلوت کے ہیں اور ان میں ستر کی پوری احتیاط نہیں ہوتی، اس لئے اس بات کا اندیشہ ہے کہ بچے بے ستری کی حالت میں آدمی کو دیکھ لے۔ پھر یہی اوقات بالعموم جنسی تعلقات کے بھی ہوتے ہیں۔ ان تعلقات کو پوشیدہ رہنا چاہیئے کسی نابالغ بچہ پر بھی ان کا ظاہر ہونا پسندیدہ نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بچوں کو اس طرح کی تربیت دی جائے اور ان کو اس کا عادی بنایا جائے کہ وہ خلوت کے اوقات میں آدمی کے کمرے میں بے تحاشہ نہ گھس پڑیں، بلکہ اجازت لے کر اندر آئیں۔

احادیث میں آتا ہے کہ بچہ جب دس سال کا ہو جائے تو اسے اپنے ساتھ نہ سلایا جائے اور اس کا بستر الگ کر دیا جائے[1] اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ عمر جنسی بیداری کی ہوتی ہے اس میں بچہ کا ماں باپ کے ساتھ سونا مناسب نہیں ہے۔

اسلام میں تعلیم و تربیت کا کوئی محدود تصور نہیں ہے۔ اس میں کتاب و سنت کی تعلیم اور اس کے مطابق ذہن و فکر کی تعمیر کے ساتھ اُن علوم و فنون کی تعلیم بھی شامل ہے جن کی کسی بھی زمانے میں ایک مرد مومن کو ضرورت پڑ سکتی ہے۔ حدیثوں میں ہدایت کی گئی ہے کہ اولاد کو تیراکی اور تیر اندازی کی تعلیم دی جائے[2] حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو عبیدہ کو لکھا کہ تم لوگ اپنے بچوں کو تیراکی اور گھوڑ سواری سکھاؤ اور ضرب الامثال اور اچھے شعر یاد کراؤ[3]

تیراکی صحت اور تندرستی ہی کے لئے مفید نہیں ہے بلکہ اس سے آدمی میں خطرات کے مقابلہ کی عادت بھی پیدا ہوتی ہے۔ گھوڑ سواری اور شمشیر زنی اور تیر اندازی کو دورِ اول کے وسائل جنگ میں بنیادی اہمیت حاصل تھی۔ اس لئے ان کی تعلیم پر خصوصیت سے زور دیا گیا ہے۔ ضرب الامثال اور اچھے اشعار کی قدر و قیمت زبان و بیان اور ادب ہی کے نقطۂ نظر سے نہیں ہے بلکہ ذہن و مزاج کی تعمیر اور سیرت و کردار کی اصلاح میں بھی ان کا بڑا دخل ہے لہٰذا ان کو بھی بچوں کی تعلیم کا جزو بنانے کی ہدایت کی گئی ہے۔

---

[1] ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ باب متی یؤمر الغلام بالصلوٰۃ۔ [2] اس مضمون کی کئی روایتیں آئی ہیں ملاحظہ ہو منتخب کنز العمال ۶/ ۳۹۴۔ [3] حوالہ سابق ص ۳۹۴

آج کے تمدنی، معاشرتی اور سیاسی حالات دورِ اوّل کے حالات سے مختلف ہیں اس لئے ان میدانوں میں وہ قدیم علوم و فنون کارآمد نہیں ہوسکتے جو دورِ اوّل میں کارآمد تھے۔ اب ان جدید علوم و فنون کی تعلیم دینی ہوگی جن کے ذریعہ بچہ کی صحیح نشوونما بھی ہوسکے، اس کے اندر اعلیٰ اخلاقی اوصاف بھی پیدا ہوں اور وہ اس قابل بھی ہوسکے کہ اسلام کی حریف طاقتوں کا آسانی سے مقابلہ کرسکے اور اسلام کی فوقیت اور برتری کو دنیا سے منوا سکے۔

ایک مردِ مومن کی وفات — صفحہ ۸ کا بقیہ

بالکل راضی ہوں اور مجھے اُمید ہے کہ میرا اللہ بھی مجھ سے راضی ہوگا۔ خود بھی مغفرت کی دُعا بہت زیادہ کرتے اور دوسروں سے بھی کہتے۔ اسی حال میں وہ اس دُنیا سے رخصت ہوگئے ——— اللہ تعالیٰ مغفرت و رحمت کا خاص معاملہ فرمائے اور اپنے خاص کرم سے درجے بلند فرمائے ——— پسماندگان کو اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق اور صبر و اجر عطا فرمائے اور ہم لوگوں کو ان کی زندگی سے سبق حاصل کرنے کی توفیق دے۔

جرح و تعدیل
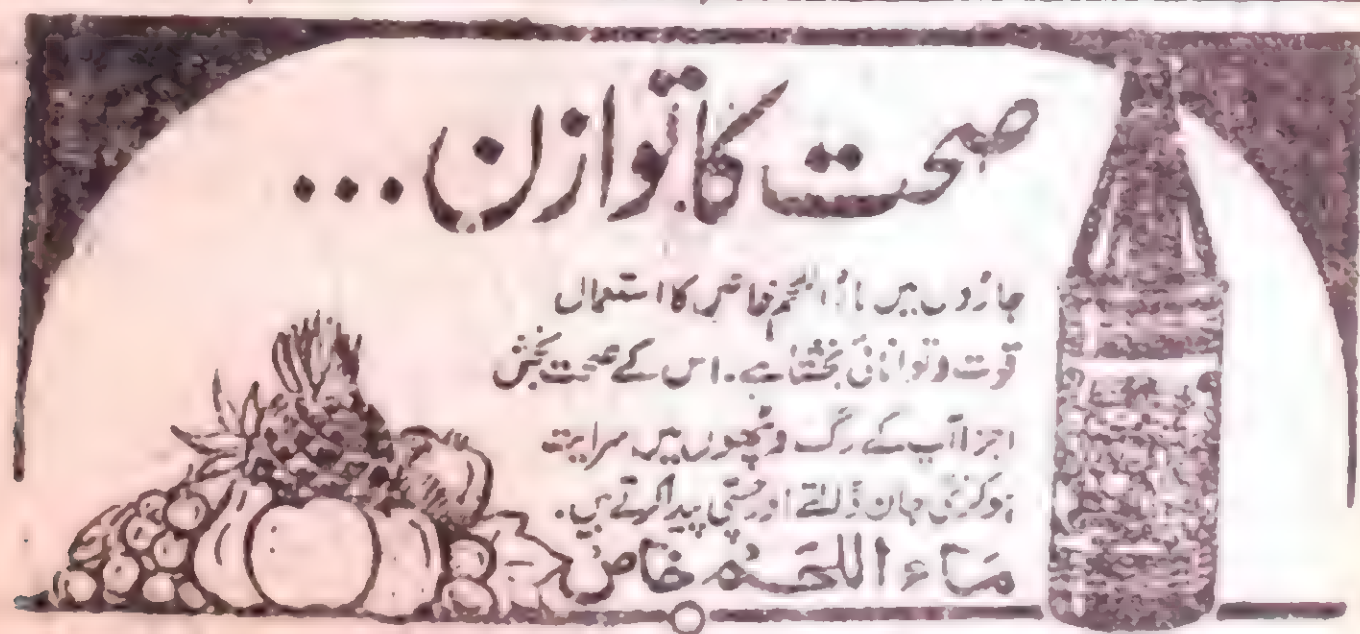
("الرفع والتکمیل" مصنفہ حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلی" کا ترجمہ)

(از مولانا مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی)

(قسط ۱۳)

"غنیۃ الطالبین" ایک مفید بحث

قطب الاقطاب، غوث الانجاب، رئیس الصوفیہ الصافیہ، راس السلسلۃ القادریہ مولانا سید محی الدین عبدالقادر جیلانی نے (ان کے سلسلے میں داخل ہونے والا ہمیشہ فضل رحمانی سے شادکام رہے) اپنی تصنیف "غنیۃ الطالبین کی ایک فصل میں مسلمانوں کے فرقوں کے ذکر کے موقعہ پر لکھا ہے "مسلمانوں کے ۷۳ فرقوں کی اصل دس فرقے ہیں۔ اہل سنت و جماعت، خوارج، شیعہ، معتزلہ، مرجئہ، مشبہہ، جہمیہ، ضراریہ نجاریہ اور کلابیہ......" اس کے بعد ہر فرقے کی اور اس کی شاخوں کی اور ان کے خیالات کی تفصیل بیان کی ہے، اس سلسلہ میں مرجئہ کے بیان میں انھوں نے لکھا ہے۔ "مرجئہ کے ۱۲ گروہ ہیں، جہمیہ، صالحیہ، شمریہ، یونسیہ، یونانیہ، نجاریہ، غیلانیہ، شبیبیہ، حنفیہ، معاذیہ، مریسیہ اور کرامیہ"

پھر ان ۱۲ فرقوں میں سے ہر ایک کا حال اور جس شخص کی طرف وہ منسوب ہے اس کا کچھ حال لکھا ہے، اس سلسلے میں انھوں نے تحریر فرمایا ہے کہ "حنفیہ، ابو حنیفہ نعمان بن ثابت کے ماننے والے، جن کا خیال ہے کہ ایمان نام ہے معرفت اور اللہ، اس کے رسول اور جو کچھ رسول پر نازل ہوا ہے اس سب کے مجموعی اقرار کا، جیسا کہ برہوتی[1] نے کتاب الشجرہ میں لکھا ہے۔"

---

(۱) برہوتی برہوت سے منسوب ہے، حضرموت میں ایک کنواں ہے، یا یمن میں کسی گاؤں یا شہر کا نام ہے۔ میں نے معجم البلدان، قاموس

(باقی اگلے صفحہ پر)

اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ حنفیہ جو طبقۂ حنفیہ کے پیرو ہیں، مرجئہ ضالہ مبتدعہ میں ہیں، اس عبارت سے شیعوں کے متعدد علماء نے سند پکڑی اور ابو حنیفہ کے متبعین پر اعتراض کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ابو حنیفہ مرجئہ ضالہ میں ہیں۔ اور افسوس ہے کہ اہلسنت میں سے بھی بہت سے ان لوگوں نے جن میں حد درجہ سے زیادہ تعصب ہے اور جو ابو حنیفہ اور اُن کے متبعین سے کدر رکھتے ہیں، اس معاملہ میں شیعوں کی پیروی کی ہے۔ وہ امام ابو حنیفہ کے معائب و مثالب بیان کرتے ہوئے اس عبارت کو بھی نقل کر دیتے ہیں تاکہ حنفیوں کو ایذا پہونچے، تعجب شیعوں پر نہیں کہ وہ تو اہلسنت کے دشمنوں میں ہیں، اُن کا حال تو یہ ہے کہ وہ بڑے بڑے صحابہ کو بھی گالیاں دیتے ہیں اور اہل ہدایت سلف صالحین کو لعن طعن کرتے ہیں، امام ابو حنیفہ اور اُن کا پسندیدہ مسلک کس شمار و قطار میں ہے؟ تعجب اور حیرت اُن لوگوں پر ہے جو اہلسنت میں ہیں اور کتاب و سنت کی پیروی کے دعویدار ہیں، باوجود اس کے وہ اس اُمت کے اولین امام پر بغیر سمجھے بوجھے طعنہ زنی کرتے ہیں!۔

حضرت شیخ جیلانیؒ کے ایسے جلیل القدر بزرگ اور صوفی صافی کی تصنیف "غنیۃ الطالبین" میں حنفیہ کے بارے میں ایسی عبارت کا پایا جانا، مذاہب اربعہ کے علماء کے درمیان ہمیشہ موضوع بحث رہا ہے اور سب ہی نے اس عبارت کے غنیۃ الطالبین میں پائے جانے پر سخت اشکال محسوس کیا ہے۔ دو وجہوں سے:۔

اول یہ کہ امام ابو حنیفہ کی تصانیف، جیسے "الفقہ الاکبر" اور "کتاب الوصیۃ" پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ ایمان[۱] اور اس کے فروع کے بارے میں اُن کا وہ مسلک نہیں ہے جو گمراہ فرقۂ مرجئہ کا ہے۔ اسی طرح حنفیوں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اور اس کی شرح میں یہ تفصیل ڈھونڈ نکالی ہے، لیکن کتاب الشجرہ اور اس کے مؤلف ابو بکر کے بارے میں باوجود مسلسل تحقیق و جستجو کے اب تک مجھے کچھ پتہ نہیں چل پایا ہے۔ بہرحال ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے۔

بعد میں مصنف نے مؤرخ کبیر علامہ شیخ محمود حسن ٹونکی مرحوم کی کتاب "معجم المصنفین" میں دیکھا وہ "غنیۃ الطالبین" کی اس عبارت پر طعنہ زنی کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "یہ ابو بکر اور اس کی کتاب الشجرہ پر بھروسہ نہ کرنا چاہیے، کیونکہ اس کا مصنف ذاتی و صفاتی ہر لحاظ سے بالکل غیر معلوم ہے۔ اسی طرح شیخ (حضرت شیخ جیلانیؒ) نے کتاب الشجرہ سے جو نقل کیا ہے اس پر بھی بھروسہ نہ کرنا چاہیے اس لیے کہ شیخ کی غرض اس نقل سے صرف اتنی ہے کہ وہ بھی موضوع کے سلسلہ میں مل جائے۔" ہمارا کردہ

عبد الفتاح ابو غدہ

کی کتابیں مرجئہ کے مذہب کے باطل ہونے کی گواہ ہیں، نیز اس پر گواہ ہیں کہ حنفیہ اور ان کے امام مرجئہ نہیں ہیں تو ان کی طرف مرجئہ ہونے کی نسبت بلاشک وشبہ کذب ہے، اور ایسی بات کا شیخ جیلانیؒ کے ایسے گروہ صوفیہ کے سرتاج سے صدور بڑا مشکل اور سخت پریشان کن مسئلہ ہے۔

دوم یہ کہ خود غوث الثقلین نے "غنیۃ الطالبین" میں ابو حنیفہ کا ذکر "امام" کے لفظ کے ساتھ کیا ہے اور بڑے بڑے ائمہ کے اختلاف کے بیان میں امام ابو حنیفہ کا قول بھی (اُمّت کے ایک مُسلّم امام کی حیثیت سے) نقل کیا ہے۔ مثلاً نماز فجر کے وقت کے بیان میں اپنے امام احمد بن حنبل کا یہ مسلک بیان کرتے ہوئے کہ اندھیرے منہ (اول وقت) نماز فجر پڑھنا افضل ہے، تحریر کیا ہے کہ "امام ابو حنیفہ کا کہنا ہے کہ اِسفار (اُجالا پھیل جانے کے وقت فجر کی نماز پڑھنا) افضل ہے۔

اسی طرح نماز کی فضیلت کے بیان میں تارک نماز کا حکم بیان کرتے ہوئے شیخ جیلانیؒ نے لکھا ہے کہ "امام ابو حنیفہ کا مسلک ہے کہ تارک الصلوٰۃ قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ اُس وقت تک قید رکھا جائے گا جب تک نماز نہ پڑھنے لگے اور توبہ نہ کرلے ... یا قید خانہ ہی میں مر نہ جائے، اور امام شافعی کا مسلک ہے کہ بطور حد شرعی تارک صلوٰۃ کو تلوار سے قتل کیا جائے گا مگر اس کو کافر نہیں قرار دیا جائے گا"۔

تو اگر شیخ جیلانیؒ کے نزدیک ابو حنیفہ گمراہ مرجئہ فرقے سے ہوتے تو امور شرعیہ میں ان کا قول دوسرے ائمہ کے ساتھ آپ اس طرح کبھی نقل نہ کرتے۔

اس مشکل سوال کے حل کرنے کی کئی کوششیں کی گئی ہیں جن میں سے اکثر وہ ہیں جو صحیح مسلک کے طلب گار کو پسند نہیں آئیں مثلاً:۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ "ہم شیخ جیلانیؒ کے کلام کی حقیقت سمجھنے سے قاصر ہیں مگر یہ یقین رکھتے ہیں کہ آپ کا کلام حق ہے، اسی طرح یہ بھی یقین رکھتے ہیں کہ حنفیہ اہل حق اور نجات یافتہ گروہ ہے۔

یہ بات کسی سمجھدار سے مخفی نہیں کہ یہ جواب نہ تشفی بخش ہے اور نہ اس سے اشکال حل ہوتا ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ جب غوث الثقلین نے حنفیہ کو فرقۂ غیر ناجیہ میں داخل قرار دیا ہے تو ہر اُس شخص پر جو سلسلۂ قادریہ میں داخل ہے اور حضرت شیخ سے ارادت رکھتا ہے، لازم ہے کہ وہ اپنی گردن سے حنفی ہونے کا جوا اتار دے۔

آپ جانتے ہیں کہ یہ جواب کتنا فتنہ انگیز ہے، کوئی انتہائی حبّی یا کوئی کینہ پرور ہی ایسی بات کہہ

سکتا ہے ــــ محض اس وجہ سے کہ سلسلہ قادریہ کے سربراہ نے حنفیہ کو مرجئہ کہہ دیا ہے ــ حالانکہ حنفیہ کے امام کی کتابیں اور حنفیوں کی تصانیف اس کے خلاف شاہد ہیں ــــ یہ جواز نہیں پیدا ہوتا کہ قادری سلسلے کے لوگ حنفیت سے توبہ کر لیں. جیسا کہ اس غلط جواب دینے والے کا خیال ہے ــــ یہ جواز کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟ شخص واحد کی کسی بات سے اختلاف خواہ وہ مشہور ترین لوگوں میں کیوں نہ ہو. جمہور اہل حق کی بات سے اختلاف کرنے کے مقابلے میں اہون اور زیادہ آسان ہے، کیا مضائقہ ہے اگر اس معاملہ میں غوث الثقلین کے اس قول کا لحاظ نہ کیا جائے. کیونکہ یہ قول تمام اصحاب دانش کے قول کے خلاف ہے. خاصکر اس صورت میں کہ خود غوث الثقلین کی اسی تصنیف میں ایسی باتیں بھی پائی جاتی ہیں جو اس قول کے خلاف اور معارض ہیں! (یہ مسلمہ ہے کہ) سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر ایک کے اقوال میں اخذ و ترک کا عمل جاری ہوتا ہے. ہر ستن آدمی کا ہر قول مسلّم نہیں ہوا کرتا اس لیے کہ بھول چوک سے مطلقاً معصوم ہونا انبیاء کے خواص میں سے ہے. صحابہ بھی معصوم نہیں ہیں چہ جائیکہ اولیاء اللہ.

اس کی مثال شیخ محی الدین بن العربی کا فصوص الحکم میں ملعون فرعون کے ایمان کا دعویٰ ہے' چونکہ ایمان فرعون کا دعویٰ قرآن وسنت اور تصریحات ائمہ کے نیز خود شیخ ابن العربی کی "فتوحات مکیہ" میں درج تصریح کے خلاف ہے اس لیے علمائے دین کے بڑے طبقہ نے اس قول کو مسترد کر دیا ہے. جیسا کہ ملا علی القاری مکی نے اپنے رسالہ "فر العون من مدعی ایمان فرعون" میں اور ابن حجر مکی نے اپنے رسالہ "الزواجر من اقتراف الکبائر" میں نیز دوسروں نے اپنی تصانیف میں شرح وبسط سے اس موضوع پر بحث کی ہے.

بعض حضرات کا کہنا یہ ہے کہ شیخ جیلانی نے حنفیہ کے بارے میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہا ہے بلکہ دوسرے کا قول نقل کر دیا ہے اور ناقل پر صرف صحیح نقل کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے قول کی صحت کی ذمہ داری اُس پر ہے جس سے یہ قول نقل ہوا ہے.

اس جواب میں جو نقص اور کمزوری ہے وہ اہل علم سے پوشیدہ نہیں، ایک متبحر عالم اور ایک روشن ضمیر صوفی کو ایسی غلط بات کے نقل کرنے میں معذور نہیں قرار دیا جا سکتا. حق یہ ہے کہ ایسی باطل بات کا نقل کرنا ہی جائز نہیں سوائے اس صورت کے کہ اس کی پوری طرح تردید اور ابطال مقصود ہو. کسی کا قول نقل کرنے سے متعلق یہ بحث اگر تفصیل سے دیکھنا چاہو تو میرے رسالہ "تذکرۃ الراشد برد تبصرۃ الناقد" کو پڑھو.

بعض حضرات لکھتے ہیں کہ "غنیۃ الطالبین" شیخ محی الدین عبد القادر الجیلانی کی تصنیف ہی نہیں ہے۔ وہ اس کے ثبوت میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا یہ قول پیش کرتے ہیں جو انھوں نے غنیۃ الطالبین کے فارسی ترجمہ کے شروع میں لکھا ہے کہ

"قطعی ثابت نہیں ہے کہ یہ کتاب (غنیۃ الطالبین) حضرت غوث الثقلین کی تصنیف ہے اگرچہ آنجناب کی طرف اس کا انتساب عام طور سے مشہور ہے (اس کے باوجود) اس خیال سے کہ شاید اس میں ایک آدھ حرف حضرت (غوث پاک) کا ہو میں نے اس کا ترجمہ (فارسی میں) کیا ہے جیسا کہ علامہ میر حسین میبذی نے اس دیوان کے دیباچہ میں جو عوام میں حضرت امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے اسی انداز سے عذر پیش کیا ہے۔

اس جواب کا حاصل یہ ہوا کہ غنیۃ الطالبین کا حضرت شیخ جیلانی رح کی تصنیف ہونا اگرچہ مشہور ہو گیا ہے لیکن یہ بات ثابت نہیں ہے۔

• اس جواب میں جو نقص ہے وہ کسی بھی صاف ذہن آدمی سے پوشیدہ نہیں، ایک تو اس وجہ سے کہ "غنیۃ الطالبین" کا شیخ جیلانی کی تصنیف ہونا ابن حجر وغیرہ جیسے اکابر کی کتابوں میں مذکور ہے۔ لہٰذا کسی کا اس سے انکار کرنا بعد والوں کے نزدیک قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ دوسرے اس وجہ سے کہ جو شخص بھی غنیۃ الطالبین کو شروع سے آخر تک حرف بہ حرف پڑھے گا وہ جان لے گا کہ یہ شیخ جیلانی ہی کی تصنیف ہے اس میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

تیسرے یہ کہ یہ فرض کر لینے کے بعد کہ یہ تصنیف شیخ جیلانی کی نہیں کسی دوسرے کی ہے، جو بھی اس کا مطالعہ کرے گا اس کو اس میں ذرا بھی شک نہ رہے گا کہ اس کا مصنف کوئی فاضل ربانی اور کامل عرفانی ہے اگرچہ وہ شیخ جیلانی نہ ہوں، پس کسی بھی ایسے فاضل کامل کا جو راسخ العلم گروہ سے تعلق رکھتے ہوں صراحت کے ساتھ حنفیہ کو مرجئہ کہنا ایک اشکال کی شکل میں بحالہ برقرار رہتا ہے اگرچہ قطب زماں شیخ جیلانی سے یہ الزام ہٹ جائے کہ انھوں نے حنفیہ کو مرجئہ لکھا ہے۔

۴

بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ عبارت جس میں حنفیہ کو مرجئہ کہا گیا ہے، شیخ عبد القادر جیلانی کی نہیں ہے، یہ کسی ایسے شخص نے بڑھا دی جس کو (حنفیہ اور امام ابو حنیفہ سے) کھلا تعصب اور کھلا بغض ہے

اسی جواب کو عبد الغنی النابلسی نے اپنی تصنیف "الرد المتین علی منتقص العارف محی الدین" میں اختیار کیا ہے، نابلسی (مؤلف الحدیقۃ الندیہ شرح الطریقۃ المحمدیہ متوفی ۱۱۴۳ھ) لکھتے ہیں: بہتر یہ ہے کہ جواب میں یہ کہا جائے کہ یہ عبارت شیخ جیلانی کے نام سے جھوٹ گڑھ کر کتاب میں شامل کردی گئی ہے اور اس بنیادی جواب کو ہر اُس تحریر کے سلسلے میں یاد رکھنا چاہیے جو علماء صالحین میں سے کسی کی کتاب میں پائی جاتی ہو جس کا مطلب غلط اور جس کی مراد قبیح ہے جیسا کہ قاضی ابوبکر الباقلانی نے اپنی کتاب "الانتصار" میں لکھا ہے، مفہوم اس کا یہ ہے کہ: کسی ایک کتاب یا ایک ہزار کتابوں میں کسی امام کی طرف منسوب کسی مسئلہ کا پایا جانا اس بات کی قطعی دلیل نہیں ہے کہ یہ بات اُس امام کی واقعی کہی ہوئی ہے ہاں اگر تواتر کے ساتھ، ایسے تواتر کے ساتھ جس کے اول آخر اور درمیانی راوی سب برابر ہوں، کوئی مسئلہ کسی امام سے منسوب ہو تو اُسے مان لیا جائے گا مگر ایسا تواتر نادر الوجود ہے۔"

اسی طرح علامہ سیالکوٹی[1] نے "غنیۃ الطالبین" کے ذکر میں لکھا ہے "حنفیہ کا مرجئہ فرقہ میں شمار کرنا اور یہ کہنا کہ حنفیہ کے نزدیک ایمان بس معرفت اور اقرار کا نام ہے، حنفیہ کے مذہب کے خلاف ہے، ان کا مسلک کتابوں میں وضاحت سے موجود ہے، شاید کچھ مبتدعین نے حنفیہ کے بارے میں مذکورہ عبارت، شیخ جیلانی کے کلام میں بڑھا دی ہے۔"

بعض لوگوں نے اس نقطۂ نظر کی تائید میں لکھا ہے کہ ایک جملہ یا عبارت کا علماء کے کلام میں جاہلوں کی طرف سے اضافہ اہلِ علم کے نزدیک کوئی بعید از قیاس بات نہیں ہے بلکہ بہت سے متقدمین اور متاخرین کے ساتھ یہ صورت پیش بھی آچکی ہے علامہ شعرانی[2] نے اپنی کتاب "الیواقیت والجواہر فی بیان عقائد الاکابر" میں لکھا ہے: زندیقوں نے احمد بن حنبل کے تکیہ کے نیچے گمراہ کن عقائد کسی ترکیب سے رکھوا دیے، اگر ان کے پیرو امام احمد کے عقائد کا صحیح صحیح علم نہ رکھتے ہوتے تو ان کے تکیہ کے نیچے سے نکلنے والے عقائد اُن کے لیے سخت فتنہ کا باعث بن جاتے

---

(۱) سیالکوٹی: عبد الحکیم بن شمس الدین، علامۂ ہند، حاشیۂ مطول" حواشی شرح المواقف، حواشی تفسیر بیضاوی، حاشیہ مقدمہ توضیح، وغیرہ کے مصنف۔ وفات ۱۰۶۷ھ مزید تفصیل ان کے احوال کی میری کتاب "انباء الخلان بانباء علماء ہندستان" میں دیکھی جا سکتی ہے۔ (۲) شعرانی: عبد الوہاب بن احمد الشعرانی وفات ۹۷۳ھ مصنف

اسی طرح قاموس کے مصنف شیخ الاسلام مجد الدین فیروز آبادی کے نام سے ایک کتاب گڑھ دی جو امام ابو حنیفہ کی تردید اور تکفیر میں تھی اور اس کتاب کو ابن الخیاط یمنی کے حوالے کر دیا، کتاب پڑھکر ابن الخیاط نے شیخ مجد الدین کو شکوہ کا خط لکھا۔ شیخ نے جواب دیا اگر آپ کے ہاتھ میں ایسی کتاب موجود ہو تو اُسے جلا دیجئے، یہ دشمنوں کا جھوٹ اور افتراء ہے، میں تو امام ابو حنیفہ کے زبردست معتقدین میں ہوں ان کے مناقب میں میں نے ایک کتاب تصنیف کی ہے!

اسی طرح امام غزالی کے سر بعض مسائل "احیاء العلوم" کے اندر جڑ دیے۔ ان گڑھے ہوئے مسائل پر مشتمل احیاء العلوم کا ایک نسخہ قاضی عیاض کے ہاتھ لگا تو انھوں نے اُسے نذر آتش کر دینے کا حکم دیا۔

شیخ محی الدین (ابن العربی) کے سر اسی طرح کئی مسئلے "فتوحات مکیہ" میں ابن زندیقوں نے جڑ دیے۔ میں نے انھیں پڑھا اور تامل میں پڑ گیا اس کا ذکر میں نے شیخ ابو الطاہر مغربی سے کیا جو مکہ معظمہ میں مقیم ہو گئے تھے، انھوں نے مجھے فتوحات مکیہ کا ایک نسخہ دیا جس کو انھوں نے شیخ ابن العربی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے اور قونیہ میں موجود "فتوحات مکیہ" کے نسخے سے پوری طرح ملایا تھا، اس نسخہ میں میں نے وہ مسائل نہیں پائے جن کے بارے میں مجھے تردد پیدا ہو گیا تھا جب میں نے فتوحات مکیہ کا خلاصہ تیار کیا تو ان گڑھے ہوئے مسائل کو اس سے حذف کر دیا۔

خود میری کتاب "البحر المورود" میں کئی گمراہ کن عقیدے زندیقوں نے گڑھ کے شامل کر دیے، مصر اور مکہ معظمہ میں تین سال تک ان کو خوب پھیلایا، میں ان عقائد سے بری الذمہ ہوں۔"

اس جواب میں جو سخافت (گھٹیا پن) ہے وہ سمجھداروں سے مخفی نہیں ہے! کوئی شخص یہ احتمال کہ یہ عبارت شیخ جیلانی کے کلام میں جوڑ دی گئی ہے، کھٹک کو دور نہیں کرتا، ہاں اگر اس احتمال کی تائید غنیۃ الطالبین کے صحیح نسخوں سے جن میں مصیبت میں پھنسانے والی یہ عبارت نہ ہو، ہو جائے، تو اور بات ہے ورنہ یہ جواب کچھ بھی نہیں۔

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ "ابو حنیفہ" ہمارے امام ابو حنیفہ کے علاوہ ایک دوسرے آدمی کی بھی کنیت ہے، تو شیخ جیلانی کی مراد یہ دوسرے ابو حنیفہ ہیں جن کے ماننے والے مرجیہ ہیں،

اس جواب میں کئی کھلی کمزوریاں ہیں:۔

(۱) یہ محض احتمال ہے اس لیے نامسموع ہے۔

(۲) غنیہ میں ابوحنیفہ کے بعد نعمان بن ثابت بھی لکھا ہے یہ اس کی واضح دلیل ہے کہ ابوحنیفہ سے مراد وہی ہیں جو ائمہ اربعہ میں سے ایک ہیں۔

(۳) ہمارے امام کے علاوہ جن صاحب کی کنیت ابوحنیفہ ہے ان کا مسلک نہ مشہور ہوا نہ پھیلا۔ اور نہ ان کے ماننے والوں کو "حنفیہ" کہا گیا ہے۔ اس طرح شیخ جیلانی کی عبارت میں 'حنفیہ' کا لفظ اس احتمالی قضیہ کو تسلیم کرنے سے انکار کر رہا ہے۔

بعض حضرات نے لکھا ہے کہ ارجاء کی دو قسمیں ہیں (۱) ارجاء بدعی (۲) ارجاء سنی۔ یہ تفصیل اوپر گزر چکی ہے اور یہ بھی مذکور ہو چکا ہے کہ اہل سنت کے بیشتر مخالفین ان کو مرجئہ سے موسوم کرتے ہیں تو شیخ جیلانی کی عبارت میں ارجاء سنی پر محمول ہوگی نہ کہ ارجاء بدعی پر۔ یہ وہ پہلو ہے جسے ملا علی قاری نے اختیار کیا ہے۔

اس پہلو میں بھی کھٹک ہے پوری طرح واضح ہے اس لیے کہ شیخ جیلانی گمراہ فرقوں کا ذکر کر رہے ہیں، ان میں مرجئہ کا ذکر کرتے ہیں اور مرجئہ میں حنفیہ کو داخل کرتے ہیں تو اس احتمال کی یہاں کوئی گنجائش نہیں رہتی اگرچہ دوسرے اہل علم و کمال کی عبارتوں میں یہ احتمال ٹھیک بیٹھتا ہے جیسا کہ مذکور ہو چکا۔

بعض حضرات لکھتے ہیں کہ شیخ جیلانی کی مراد 'حنفیہ' سے حنفیوں کا ایک گروہ ہے جو مرجئہ ہے۔

مطلب یہ ہے کہ حنفیہ اس گروہ کا نام ہے جو مسائل فرعیہ میں امام ابوحنیفہ کا مقلد ہے اور اعمال شرعیہ میں ان کے مسلک پر چلتا ہے۔ عام اس سے کہ عقائد میں وہ امام ابوحنیفہ سے متفق ہے یا مخالف، اگر متفق ہے تو اس کو "حنفیہ کاملہ" کہیں گے اور اصول عقائد میں اتفاق نہ رکھتا ہوگا تو اسے ایسی قید کے ساتھ "حنفیہ" کہا جائے گا جس سے عقائد کلامیہ میں اس کا مسلک واضح ہو جائے، بہت سے حنفی ہیں جو مسائل فرعیہ میں حنفی ہیں اور عقیدتاً معتزلی ہیں، جیسے تفسیر کشاف وغیرہ کے مؤلف جاراللہ زمخشری اور جیسے قنیہ حاوی اور مجتبیٰ شرح مختصر القدوری کے مؤلف نجم الدین زاہدی، ان دونوں کے حالات ہم نے "الفوائد البہیہ فی تراجم الحنفیہ" میں تفصیل سے لکھے ہیں، اور جیسے عبد الجبار، ابوہاشم اور جبائی وغیرہ، اس طرح بہت سے حنفی ہیں جو فروع میں حنفی ہیں اور اصلاً مرجئی ہیں یا زیدی ہیں

ماحصل یہ ہے کہ اختلافِ عقیدہ کے اعتبار سے حنفیہ کی کئی شاخیں ہیں، ان میں شیعہ بھی ہیں، معتزلہ بھی ہیں اور مرجئہ بھی، تو شیخ جیلانی کی عبارت میں حنفیہ سے مراد وہ حنفیہ ہیں جو مرجئہ ہیں، فروع میں ابو حنیفہ کے پیرو ہیں اور عقیدے میں ان سے اختلاف اور خالص مرجئہ سے اتفاق رکھتے ہیں، (اس طرح وہ حنفی مرجئی ہیں)

یہ جواب اگرچہ سابقہ جوابوں سے بہتر ہے مگر یہ بھی سخافت سے خالی نہیں ہے، اس لیے کہ "غنیۃ الطالبین" کی عبارت یہ کہہ رہی ہے کہ مرجئہ اصل ہیں اور ان کی ایک شاخ حنفیہ ہے، اور اس جواب کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ حنفیہ اصل ہیں اور مرجئہ ان کی شاخ ہیں!

بعض حضرات یہ جواب دیتے ہیں کہ مرجئہ کی شاخوں کے ذکر میں "حنفیہ" کا لفظ غنیہ کے نقل کرنے والوں کی دانستہ یا نادانستہ غلطی سے "غسانیہ" کے بدلے لکھ گیا ہے اس لیے کہ علم کلام کے مصنفین نے غسانیہ کو مرجئہ کی شاخ کے طور پر ذکر کیا ہے، "حنفیہ" کا کسی نے ذکر نہیں کیا ہے، اور غنیہ کی عبارت "غسانیہ" کے ذکر سے خالی ہے۔

اس جواب کا بودا پن بھی ظاہر ہے اور محض نقل میں غلطی کا احتمال، بغیر کسی ثبوت کے اہل علم کے نزدیک نامسموع ہے۔ علاوہ اس کے غنیہ میں "حنفیہ" کی جو تشریح کی گئی ہے وہ بھی اس احتمال کو قبول کرنے سے انکار کرتی ہے، ہاں اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ یہ تشریح بھی نقل نویسوں کی غلطی سے شامل ہو گئی ہے تو ہو سکتا ہے، مگر یہ احتمال دوسرے احتمال پر مبنی ہے تو ایسی باتیں اہل علم نہیں قبول کر سکتے۔

بعض لوگوں نے جواب یہ دیا ہے کہ یہاں "حنفیہ" سے مراد وہ حنفیہ ہیں جو خالص مرجئہ کے خرافات یعنی ایمان صرف اللہ کی معرفت کا نام ہے وغیرہ وغیرہ کے قائل ہیں۔

رسالہ فخریہ میں درج تفصیلات کے مطابق مذکورہ جواب کی توضیح یہ ہے کہ اہل سنت — خواہ وہ حنفی ہوں یا شافعی یا حنبلی یا مالکی — اور مرجئہ ضالہ کے مابین تباین کلی کی نسبت ہے — اور حنفیہ — امام ابو حنیفہ کے اصلاً اور فرعاً مقلدین — اور اہل سنت کے مابین عموم و خصوص مطلق کی نسبت ہے، یعنی ہر حنفی اہل سنت میں ہے لیکن ہر اہل سنت کا حنفی ہونا ضروری نہیں ہے — حنفیہ جو صرف فروع میں امام ابو حنیفہ کے مقلد ہیں اور اہل سنت کے

ما بین عموم و خصوص من وجہ کی نسبت ہے۔ افتراق کی صورت یہ ہے کہ ایک شخص حنفی ہے مگر اہلِ سنت نہیں ہے جیسے مرجئہ حنفیہ اور معتزلۂ حنفیہ، اور ایک شخص اہلِ سنت ہے مگر حنفی نہیں ہے مثلاً شافعی ہے۔ اجتماع کی صورت یہ ہے کہ ایک شخص فروع اور عقیدے دونوں میں امام ابوحنیفہ کا پیرو ہے وہ اہلِ سنت بھی ہوگا۔

اس تفصیل کے معلوم ہو جانے کے بعد ہم یہ کہتے ہیں کہ غنیۃ الطالبین کی عبارت میں حنفیہ سے مراد، جو مرجئہ کی شاخوں میں کی ایک شاخ ہے، ابوحنیفہ کے وہ پیرو ہیں جو قائل ہیں کہ ایمان نام ہے معرفت اور خدا اور رسول کے اقرار کا، یہ بات صرف غسانیہ پر صادق آتی ہے تو یہی غسانیہ مراد ہیں لفظ "حنفیہ" سے، یہ اوپر گزر چکا ہے کہ غسان کوفی اپنے خبیث مسلک کو ابوحنیفہ کے نام سے بیان کرتا تھا اور [illegible] ابوحنیفہ کو بھی مرجئہ شمار کرتا تھا۔

اور [illegible] "غنیۃ الطالبین" کی عبارت کی سند پیش کر کے حنفیہ یا امام ابوحنیفہ پر طعن [illegible] انتہائی جہالت اور کٹر عصبیت رکھنے والے ہی سے ممکن ہے اور وہ ان لوگوں کی طرح ہیں جن کے لیے [illegible] ہونے کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں کیا ہے: ختم اللہ علیٰ قلوبہم وعلیٰ سمعہم وعلیٰ ابصارہم غشاوۃ۔ (اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر اور کانوں پر مہر کر دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہے) تو ایسوں کے طعن اور [illegible] کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ امام ابوحنیفہ پر ایسا طعن کرنے والا ٹھکرایا ہوا ہے اور ان کے [illegible] "غنیۃ الطالبین" سے متعلق اس مفصل بحث کو ذہن نشین کر لو، یہ اس تصنیف کی اہم بحث ہے۔ اگرچہ گفتگو زیادہ طویل ہو گئی مگر یہ طوالت لاحاصل نہیں ہے۔

الفرقان کی ملکیت اور دیگر تفصیلات کے متعلق

اعلان

۱۔ مقام اشاعت ... ... کچہری روڈ لکھنؤ
۲۔ وقفۂ اشاعت ... ... ماہانہ
۳۔ [illegible] پرنٹر و پبلشر و ایڈیٹر کا نام ... محمد منظور نعمانی
شہریت ... ... ہندوستانی
پتہ ... ... دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ
۶۔ مالکان ... ... محمد منظور نعمانی

میں محمد منظور نعمانی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین میں بالکل صحیح ہیں

دستخط۔ محمد منظور نعمانی۔ یکم مارچ ۱۹۵۵ء

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یوسف بنوری (کراچی)

مدارسِ عربیہ کا نصاب و نظامِ تعلیم

[حضرت مولانا محمد یوسف بنوری ہمارے اس دور کے اکابر علماء و اصحابِ درس میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں، ممدوح کا یہ مقالہ پاکستان کے ماہنامہ "الحق" سے اس لیے نقل کیا جا رہا ہے کہ ہمارے عربی مدارس کے ذمہ دار حضرات اور اساتذہ اس کے مندرجات اور مشوروں پر سنجیدگی سے غور کریں۔ مولانا نے جو کچھ فرمایا ہے اس کی تفصیلات و جزئیات میں تو دو رائیں ہو سکتی ہیں لیکن اُن کا جو اصولی پیغام ہے وہ تو وقت کا بڑا تقاضا ہے جس میں تاخیر کی بھی گنجائش نہیں ہے ——————— ادارہ]

عرصۂ دراز سے دینی حلقوں میں مسئلہ نصابِ تعلیم زیرِ بحث ہے اور شدت سے یہ احساس ہو رہا ہے کہ موجودہ مدارسِ دینیہ عربیہ کا مروجہ نصاب قابلِ ترمیم ہے اور مسائل حاضرہ کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے یہ نصاب کافی نہیں، اُمت کے مصالح اور وقت کے تقاضے اس سے پورے نہیں ہو سکتے، بلکہ بہت سے ابنائے عصر اور جدید تعلیم یافتہ قدیم نصاب کی افادیت ہی سے منکر ہیں۔ یہاں تک کہ بعض غیر سنجیدہ دماغ تو ان علمی درس گاہوں کے وجود کو بھی غیر ضروری سمجھتے ہیں۔

جہاں تک اصل موضوعِ بحث کا تعلق ہے اس میں شک نہیں کہ وقت کی دوسری اہم ضرورتوں کی طرح یہ مسئلہ بھی اہم اور بے حد توجہ کا مستحق ہے۔ زمانہ بدل گیا، خیالات بدل گئے، قوموں کی نفسیات بھی تبدیل ہو گئیں، سائنس کی ترقیات نے معاشیات و اقتصادیات کی نئی راہیں کھول دیں، فقہ اسلامی کے ابواب میں تمدن حاضرہ کے بہت سے جدید ابواب کا اضافہ ہوا، ممالک خارجہ سے تجارت درآمد کے نئے وسائل اور بینکوں کے نظام نے اسلامی نقطۂ نگاہ یا شرعی نظام کے راستے میں بہت سے پیچیدہ مسائل پیدا کر دیے، نئے افکار و خیالات جدید معتقدات اور مختلف علمی و دینی فتنوں نے

جدید علم کلام کی اہمیت اور واضح کردی۔ یہ خیالات سب درست اور بجا ہیں۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ حق تعالیٰ جل ذکرہ نے بھی باوجود اپنی قدرت لامحدود اور علم محیط کے انبیاء کرام علیہم السلام کے معجزات میں وقت کے تقاضوں کی رعایت فرمائی۔ عہدِ ابراہیمی میں صابئین بابل و نینوی کے طبعیین کا عروج تھا، اس لیے ابراہیم علیہ السلام کو معجزہ بھی ایسا عطا ہوا کہ صابئین اور طبعیین کے لیے باعثِ حیرت و اعجاز ہوا۔ موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں سحر و شعبدہ بازی اور اس قسم کے فنون کا عام چرچا تھا، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں یونانی اطبّا اور ان کے حیرت انگیز معالجات کا دور دورہ تھا۔ خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں اگر سرزمین عرب میں فصاحت و بلاغت، قوتِ بیانی اشعر و خطابت کا شہرہ تھا۔ تو ایران میں خسروانہ کر و فر و ایرانی تہذیب کا ہوش رُبا منظر تھا، اور روم الکبریٰ میں بازنطینی نظام و آئین کار فرما تھا، لیکن دنیا نے دیکھا اور بڑی حیرت سے دیکھا کہ ان طاغوتی طاقتوں کو رب العالمین کے بندوں کی معجزانہ کارفرمائیوں نے کیسی فاش شکست دیدی اور رب العالمین نے کیسے فصیح و بلیغ معجزانہ اسلوب و بیان میں کیسا محیر العقول دستور اور مکارم اخلاق کا کیسا جامع ترین نظام نامۂ حیات نازل فرمایا۔

اور پھر اسلام کی علمی تاریخ میں آپ دیکھیں کہ ہمارے سلف صالحین نے ہر دور میں وقت کے تقاضوں اور امت کی مصلحتوں کا کیسے خیال کیا۔ بلاشبہ اب بھی اس کی تقلید کرنے کی ضرورت ہے اور صحیح ضرورت ہے عصری علوم کی ضرورت اور معاشی و اقتصادی و سیاسی مشکلات کی عقدہ کشائی کے سوال کی اہمیت بھی واضح ہے۔ لیکن تعلیم قرآن و درس حدیث اور علوم عربیہ وغیرہ قدیم علوم و معارف کی جتنی اہمیت اب ہونی چاہیے شاید ہی کسی دور میں اہمیت سمجھی گئی ہو کسی مفید اور نافع علاج کی اہمیت اسی وقت زیادہ محسوس ہونی چاہیے جبکہ مرض عام ہو اور ضرورت شدید ہو۔ ہماری ان ہی دینی درسگاہوں سے اسی صدی میں ایسے ایسے اکابر اور امت کے ایسے ایسے رہنما پیدا ہوئے کہ تاریخ بجا طور پر ان پر فخر کریگی اور دنیائے اسلام کی علمی تاریخ میں ان حضرات کے اسماء گرامی بہت جلی حروف میں لکھے جائیں گے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ | قدیم نصاب پر ایک بہت بڑا اعتراض یہ ہے کہ یہ حضرات سالہا سال علوم عربیہ پڑھ لینے کے بعد بھی عربی گفتگو پر قادر نہیں ہوتے۔ کتنے علماء کے اسماء گرامی پیش کیے جا سکتے ہیں جو بلا تکلف فصیح ترین عربی لب و لہجہ میں گفتگو کی مقدرت رکھتے ہیں، دوسرے یہ کہ بولنا خاص

ممارست و تمرین دمشق پر موقوف ہے. ہم نے ممالک اسلامیہ بلکہ خاص قاہرہ و مصر کے بہت سے علماء کو دیکھا کہ وہ فصیح و صحیح عربی پر ارتجالاً پوری قدرت نہیں رکھتے، بلکہ بعض بہترین لکھنے والے ادباء کو دیکھا کہ وہ بلا تکلف فصیح علمی زبان بولنے پر قادر نہیں جیسے وہ لکھتے ہیں بلکہ عام مروجہ عامیانہ زبان استعمال کرتے ہیں۔

تیسری چیز یہ کہ عربی علوم کو لسانیات کے طرز تعلیم پر نہیں پڑھایا جاتا بلکہ کتابیں علوم سکھانے کے لیے پڑھائی جاتی ہیں. اسی لیے ہمارے عربی نصاب کے ابتدائی درجات میں متن و کتابیں صرف و نحو کی فارسی میں پڑھائی جاتی ہیں. الغرض یہ کہ علوم کو درجۂ اول میں رکھا گیا ہے. اور لسانیات کو ثانوی درجہ بلکہ ضمنی درجہ دیا گیا. اس لیے عربی بولنے لکھنے کو مقاصد میں شمار نہیں کیا گیا تھا. بہر حال یہ ایک نقطۂ نگاہ کا فرق تھا. انگریزی تعلیم میں زبان کو پہلے درجہ پر رکھا گیا اور جو اسلوب تعلیم زبان کے لیے مناسب ہو سکتا تھا وہی اختیار کیا گیا اور پھر دنیا میں جو ترغیبی وسائل اس کے لیے تھے وہ اس پر مستزاد بے شک اب وقت کے تقاضوں کے پیش نظر اس اسلوب کو بدلنے اور عربی زبان کی تعلیم مقاصد میں شامل کر کے پہلے درجہ پر رکھنے کی ضرورت ہے۔

قدیم مروجہ نصاب پر ناقدانہ نظر اور اس کی خصوصیات

اس سے پہلے کہ ان وجوہ تنقید کا ذکر کیا جائے جو مروجہ نصاب مدارس عربیہ پر ہو سکتے ہیں. یہ گزارش کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اصل قصور نصاب کا نہیں بلکہ اسلوب تعلیم و منہاج تدریس کا ہے. نصاب کیسا بھی ہو اگر طرز تعلیم و طریقۂ تدریس کی اصلاح کی کوشش ہوتی تو یقیناً عام طور سے جو نقائص محسوس ہوتے ہیں، یہ نہ ہوتے. مروجہ نصاب جس کو درس نظامی کہا جاتا ہے. درحقیقت یہ تو چند صدیوں سے اصلاح و ترمیم کے بعد کی ایک شکل ضرورت ہے. اس ملک کے مختلف ادوار میں کیا کیا نصاب رہا، اس کی تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں اور زیادہ تر مقصد اس نصاب کا یہ تھا کہ اس کے پڑھنے سے سارے علوم نقلیہ و عقلیہ میں بحث و نظر اور تحقیق و تدقیق کے اعتبار سے صحیح رسوخ پیدا ہو جائے اور قوی استعداد و قابلیت میسر آئے۔ یہ کبھی مقصد رہا نہیں رہا کہ یہ درس اور یہ نصاب ان علوم کی آخری معلومات اور تفصیلی ابحاث کے لیے بھی کافی ہے، لیکن اس میں شک نہیں اور بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس قدیم نصاب کا واقعی فاضل اور فارغ التحصیل ہر مشکل سے مشکل نظریہ اور جدید مسائل اور جدید علوم کو سمجھنے کی پوری قابلیت و اہلیت رکھتا ہے۔ لطیفہ

مثال یہ عرض کرنا بے جا نہ ہوگا کہ قدیم بطلیموسی یا فیثاغورسی علم ہیئت سمجھنے والا آج بھی یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ محض مطالعہ سے جدید ہیئت، جدید فلسفہ و سائنس کو سمجھے اور صرف مطالعہ سے ان مشکلات سے عہدہ برآ ہو۔ کیا شرح چغمینی، صدرا، شمس بازغہ اور اور شرح اشارات سمجھنے والا یہ قابلیت نہیں رکھتا کہ جدید طبعیات و ریاضیات کی جو کتابیں تصنیف ہوئی ہیں انھیں سمجھ سکے؟ یقیناً رکھتا ہے. کیا غزالی اور ابن رشد کی تہافۃ الفلاسفہ کو سمجھنے والا ان جدید تالیفات کو نہیں سمجھے گا، یقیناً سمجھے گا. اگر قصور ہے تو مطالعہ کا ہے اور نقص ہے تو توجہ نہ کرنے کا، بلکہ ان جدید کتابوں کا اسلوب اتنا شگفتہ اور بیان اتنا واضح و دلکش ہوتا ہے کہ اس کے سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی، ہم نے دیکھا کہ جب مصر سے الدروس الاولیۃ فی الفلسفۃ الطبیعیۃ ۔ چھپ کر آگئی تو حضرت امام العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیری دیوبندیؒ نے اساتذہ دارالعلوم کو پڑھائی تاکہ جدید طبعیات سے ابتدائی واقفیت ان حضرات کو بھی ہو جائے اور ہم نے دیکھا کہ حضرت شاہ صاحبؒ کو صرف مطالعہ ہی سے ان جدید علوم ریاضیات و طبعیات کی اتنی ہی معلومات تھیں جتنی کسی فن کے ماہر و متخصص ہی کو ہو سکتی ہیں۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ بعض نظریات یا تحقیقات جو اب تک انگریزی یا جرمنی وغیرہ یورپ کی زبانوں سے عربی میں منتقل نہیں ہوئے ان کا علم بغیر ان زبانوں کے حصول کے نہ ہو سکے. لیکن اس میں قصور ذہن یا استعداد کا نہیں بلکہ زبان کا ہو گا.

غرض یہ کہ جہاں تک قابلیت و استعداد کا تعلق ہے. سابقہ نصاب سے زیادہ معیاری نصاب شاید ہی پیش کیا جا سکے. اگر صحیح طریقہ سے سمجھ کر ان علوم کو اور ان سارے فنون کو حاصل کیا جائے تو غبی ذکی فاضل بن سکتا ہے. اور ذکی شخص ایک محقق روزگار بن سکتا ہے، اگر کسی کی تحصیل ہی ناقص رہے، جملہ علوم و فنون حاصل ہی نہ کیے تو نصاب کا کیا قصور!!

سوال تو یہ ہے کہ ان قدیم علوم و فنون کو اور اس نصاب کو کس نے باقاعدہ حاصل کیا اور صحیح معنے میں تکمیل کی تو یقیناً جو جامعیت، دقتِ نظر اور رسوخ فی العلم اسے حاصل ہوگا اس کی نظیر کہیں بمشکل ہی ملے گی. بہر حال جو کچھ عرض کیا گیا اس کے صحیح ہونے کے باوجود عربی مدارس کے نصاب تعلیم کی تجدید و ترمیم و اصلاح کی ضرورت ہے. اس لیے نہیں کہ وہ اپنے زمانے میں کافی نہ تھا یا صحیح استعداد پیدا کرنے سے قاصر تھا بلکہ مزید علوم جدیدہ یا معلومات عامہ حاصل کرنے کی ضرورت ہے،

وقت کے تقاضے بدل گئے، طبیعتوں کے سانچے بدل گئے، اذواق و اذکار میں فرق آگیا، عبارتی دقت اور موشگافی کیلیے مزاجوں میں صلاحیت نہیں رہی، اب بہت اختصار کے ساتھ ان نقطوں کو پیش کرنا چاہتا ہوں جن کی وجہ سے یہ تبدیلی یا ترمیم ضروری ہے۔

مدارس دینیہ عربیہ میں اس وقت جو نصابِ تعلیم رائج ہے حدیث و فقہ کی چند کتابوں کو مستثنیٰ کرنے کے بعد زیادہ تر ساتویں صدی ہجری اور اس کے بعد کے قرون کی یادگار ہے جہاں سے صحیح معنے میں علمی انحطاط کا دور شروع ہو چکا تھا۔ قدماء امت کی وہ تالیفات جن میں علم کی روح موجود تھی، عبارت سلیس و شگفتہ، مسائل و قواعد واضح، جن میں نہ عبارتی تعقیدات تھیں، نہ دور از کار ابحاث جن کے پڑھنے سے صحیح معنے میں دل و دماغ متاثر ہو سکتے تھے، نہ وقت ضائع ہوتا تھا، نہ دماغ پر بوجھ کا خطرہ ہوتا تھا، ان کی جگہ ایسی کتابیں تصنیف ہوئیں جن میں سب سے زیادہ کمال اختصار نویسی کو سمجھا گیا۔ زیادہ زور لفظی بحثوں پر دیا گیا، لفظی موشگافیاں شروع ہوئیں، یوں اگر کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ کاغذ تو کم خرچ کیا گیا، لیکن وقت و دماغ کو اس کے حل پر زیادہ صرف کیا گیا۔ بڑا کمال یہی سمجھا گیا کہ عبارت ایسی دقیق و غامض ہو جس کے لیے شرح و حاشیہ کی ضرورت ہو۔ کئی کئی توجیہات کے بغیر حل نہ ہو، آخر یہ علمی عیاشی نہیں تو اور کیا ہے۔ میرے ناقص خیال میں یہ علم کا سب سے بڑا فتنہ تھا جس سے علوم اور اسلامی معارف کو بڑا نقصان پہونچا۔ بطور مثال اسلامی علوم میں اصولِ فقہ کو لیجیے، جو علوم دین اور علوم اجتہاد میں ایک لطیف ترین اور اہم ترین فن ہے جو قرآن و سنت سے نئے نئے استنباطات کے لیے سب سے اہم راستہ تھا جس کی باقاعدہ تدوین کا فخر دولتِ عباسیہ کے سب سے پہلے قاضی القضاۃ امام ابو یوسفؒ کو حاصل ہے۔ اور امت میں اس کے بعد سب سے پہلی کتاب امام محمد ابن ادریس الشافعی کی کتاب "الرسالہ" ہے جو عرصہ ہوا کہ مصر میں "کتاب الام" کے ساتھ چھپ چکی تھی اور اب کچھ عرصہ ہوا بہت آب و تاب سے دوبارہ قاہرہ سے شائع ہوئی ہے۔ اسی فن میں امام ابوبکر رازی جصاص (متوفی ۳۷۰ھ) نے کتاب "الفصول فی الاصول" لکھی جس کا ایک عمدہ نسخہ دار الکتب المصریہ قاہرہ میں موجود ہے، اور جس کی نقل راقم الحروف کے توسط سے مجلس علمی ڈابھیل حال کراچی کے لیے ہندوستان و پاکستان آئی۔ امام فخر الاسلام بزدوی نے "کتاب الاصول" لکھی جس کی عمدہ ترین شرح عبد العزیز بخاری کی ہے جو ترکی کے سابق دار الخلافہ سے دو دفعہ شائع ہوئی

اور جس کی سحیر العقول عظیم ترین شرح امیر کاتب عمید الدین اتقانی کی "الشامل" دس جلدوں میں دار الکتب المصریہ قاہرہ میں موجود ہے۔ اور اس کا ایک نسخہ استنبول کے کتب خانہ فیض اللہ آفندی میں ہے لیکن افسوس کہ دونوں جگہ ابتدائی دو ڈھائی جز کا نقص ہے۔ اس کی نقل بھی راقم الحروف کے توسط سے مجلس علمی میں آچکی ہے۔ امام شمس الائمہ سرخسی نے "کتاب الاصول" لکھی جس کے نسخے ترکی مصر میں موجود ہیں، یہ اور اس کے علاوہ اس فن میں متقدمین کی عمدہ و نافع کتابیں ہیں۔ اس کے علاوہ اس فن میں امام ابو زید دبوسی کی کتاب "تقویم الادلہ" بے نظیر ہے۔

اب خیال فرمائیے کہ ایسی نادر روزگار کتابوں کی جگہ امام ابن ہمام کی "تحریر الاصول" اور ابن حاجب کی "مختصر الاصول" اور بیضاوی کی "منہاج الاصول" یا ابو البرکات نسفی کی "منار الاصول" یا صدر الشریعہ کی "تنقیح الاصول" نے لی۔ اگر "تحریر الاصول" کی شرح "التحبیر و التقریر" ابن امیر الحاج کی نہ ہو یا "التیسیر" ابن امیر بخاری کی نہ ہو اور قاضی بیضاوی کی "منہاج" کی شرح الاسنوی کی نہ ہو تو یہ چیستانیں امت کے کیا کام آسکتی ہیں؟ یہ مانا کہ ان میں کچھ دقیق و لطیف ان کے مختارات یا خصوصی ابحاث بھی ہیں، لیکن دوسری طرف مہمات جس تعبیر میں ادا ہوتی ہیں، وہ کوئی علمی روح پیدا کرنے کے لیے مفید نہیں ہو سکتیں۔

اسی طرح صرف و نحو، معانی، بیان، منطق، فلسفہ، فقہ و تفسیر، ادب وغیرہ کا اگر جائزہ لیا جائے تو سب کا ماحصل یہی نکلے گا۔ مروجہ درسیات میں ایسی کتابیں داخل ہیں جن میں پوری داد موشگافی دی گئی اور ایجاز و اختصار کا ریکارڈ قائم کیا گیا ہے۔

بیشک ذہن کی جلا و دقتِ نظر اور موشگافی کے کمال کو حاصل کرنے کے لیے یہ موزوں ترین ہوں تو ہوں لیکن عہد حاضر میں ان کے جو نقائص محسوس ہوئے ہیں، ان میں سے بطور مثال چند پیش کیے جاتے ہیں

۱۔ ان کتابوں میں زیادہ تر وقت لفظی مباحث اور عبارتی موشگافیوں پر خرچ ہوتا ہے۔

۲۔ فن کے قواعد اور مسائل کے یاد کرنے کی بجائے مصنف کے مقصد سمجھنے پر وقت ضائع ہوتا ہے۔

۳۔ فن کے قواعد اور مسائل یاد ہو جانے سے جو ایک اعلیٰ سلیقہ اور ملکہ پیدا ہوتا ہے۔ اور جو ایک خاص قسم کی بصیرت حاصل ہونی چاہیے ان مختصرات سے یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔

۴. صرف ان کا پڑھنے اور پڑھانے والا بہت مشکل سے اس فن کا محقق و بالبصیرت عالم بن سکتا ہے۔ درس کا سارا وقت لفظی اور عبارتی تعقیدات کی نذر ہو جاتا ہے اور اسی نکتہ آفرینی کو کمال سمجھنے لگتا ہے۔ اس کو اتنی فرصت ہی نہیں مل سکتی کہ اس فن کی امہات اور اساسی تصنیفات کا مطالعہ کر سکے۔

۵. مشکل پسندی کا ذوق ختم ہو چکا ہے۔ صرف و نحو کے مسائل میں فقہ و اصول کی عبارات میں ہئیت و ریاضی کی مثالوں کے قائم کرنے کا دور گزر چکا ہے۔

۶. بہت سے دیندار حضرات کو ان علوم اسلامیہ کے حاصل کرنے کا شوق دامنگیر ہوتا ہے لیکن جب ان مشکلات کا احساس ہوتا ہے تو گھبرا کر مجبوراً اپنے ارادہ کو شرمندۂ عمل نہیں کر سکتے۔

۷. جو شخص ذکی الطبع اور ذہین نہ ہو یا محنتی نہ ہو وہ ان کتابوں سے مستفید نہیں ہو سکتا۔

۸. متن اور اس پر شرح اور پھر شرح کا حاشیہ یہ اسلوب عصر حاضر کے ذوق کے بالکل خلاف ہو۔

۹. ان کتابوں میں اختصار کی وجہ سے فن کے بہت اہم مسائل اور جزئیات نہیں آ سکے اور جتنے آ سکے اختصار کی وجہ سے اس کے اطراف و جوانب اتنے واضح نہ ہو سکے۔

۱۰. علم کلام جدید، فلسفۂ جدید، علم الاقتصاد، اور بعض جدید علوم سے قدیم نصاب کا دامن خالی ہے۔ اور آج اس کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ جس طرح پہلے جہمیہ، حشویہ، خوارج، معتزلہ و قدریہ صحیح مسلک سے ہٹے ہوئے اور باطل فرقے پیدا ہوئے تھے اور جس طرح ان کے عقائد اور ان کی تردید دین کا اہم جز تھا، اسی طرح آج لادینی نظام حیات، اشتراکیت و قوم پرستی وغیرہ کے مسائل پر قواعد اسلام کے پیش نظر نقد و تبصرہ دین کا اہم جزو ہے۔ آج اگر پہلے اسلاف زندہ ہوتے تو جس طرح انہوں نے اس وقت فرق باطلہ کی تحقیق و تنقیح کے بعد امت کے لیے اسلحہ تیار کر کے دے چکے تھے اسی طرح آج بھی جدید اسلحہ دفاع کے لیے تیار کرتے اور علوم کا بیش بہا اضافہ فرماتے۔

اس ضمن میں سرسری طور پر چند موٹی موٹی باتیں عرض کی گئی ہیں، اگر ہم ان اشارات کو اور اختصار سے پیش کرنا چاہیں تو اس کا خلاصہ دو چیزیں ہیں۔

(الف) قدیم علوم کی کتابوں میں اکثر مروجہ کتابوں کی تبدیلی

(ب) جدید علوم کا اضافہ۔

اگر غور کیا جائے تو ہمارے مدارس میں بیس بائیس علوم کی تقریباً سو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں جن پر کم از کم آٹھ سال کا عرصہ لگتا ہے۔ ان پر جہاں تک راقم الحروف نے غور کیا بمشکل دس کتابیں ایسی ہیں جن کا ہمیں بدل نہیں ملے گا۔ بقیہ سب کا نعم البدل قدماہی کی کتابوں میں مل سکتا ہے۔ ہم ان قدیم علوم کو ہٹانا نہیں چاہتے بلکہ ان علوم میں صحیح مہارت وقابلیت پیدا کرنے کے لیے بہتر کتابوں کو داخل کرنا چاہتے ہیں یعنی ہم اس سلسلہ میں "تجدد" نہیں بلکہ "تقادم" چاہتے ہیں۔ اور یہ ان علوم اسلامیہ کی خیر خواہی کے لیے چاہتے ہیں۔ اور امت حاضرہ کے مفاد کے پیش نظر یہ خواہش رکھتے ہیں۔

اب میں جن نقطوں کے پیش نظر جن خطوط پر جدید نصاب کی بنیاد یا قدیم نصاب کی ترمیم کا خواہش مند ہوں اُن کو پیش کرنا چاہتا ہوں۔

جدید نصاب تعلیم کی ضرورت اور اس کی خصوصیات: جدید نصاب تعلیم میں جو بنیادی خطوط ہیں، میرے ناقص خیال میں اس کے تین نقطے ہیں۔

(الف) تخفیف:۔ یعنی نصاب مختصر ہو جس کی فراغت وحصول میں بہت زیادہ عرصہ کی ضرورت نہ ہو۔

(ب) تیسیر:۔ یعنی نصاب میں مندرجہ کتابیں سہل وسلیس زبان میں ہوں، پیچیدہ و دقیق نہ ہوں۔

(ج) محدود اضافہ یا اصلاح و ترمیم:۔ یعنی بعض غیر اہم فنون کو ساقط کر کے جدید مفید علوم کا اضافہ۔

پہلے نقطہ کی شرح: نصاب جتنا مختصر ہوگا اس کے طالبین وشائقین میں حصول کا جذبہ زیادہ پیدا ہوگا۔ یہ درست ہے کہ مختصر نصاب سے بعض اوقات ہر طبیعت پوری طرح مستفید نہ ہو سکے گی۔ لیکن اس کی تلافی کے لیے ایک مشترکہ عام نصاب کے بعد تخصص وتکمیل (ڈاکٹریٹ) کے درجات مقرر کیے جائیں، جس کو جس فن سے زیادہ مناسبت ہو یا طبعی رجحان ہو اس کو وہ حاصل کر کے فن کا ماہر خصوصی بن سکے گا۔ مصر کے جامع ازہر نے جدید نظام تعلیم میں ان ہی اصولوں کا خیال کیا ہے۔ اور جامع ازہر کے جدید نظام تعلیم میں تین کلیات (کالج) ہیں ..... (۱) کلیۃ اصول الدین (۲) کلیۃ الشریعۃ (۳) کلیۃ الآداب۔ پھر ہر کلیہ میں کچھ درجات تخصص (ڈاکٹریٹ) کے رکھے ہیں۔

میرے خیال میں تخصص وتکمیل کے لیے حسب ذیل درجات ہونے چاہئیں۔

متن نویسی و ایجاز طرازی اختصار کے نئے نئے اسلوب، لفظی موشگافی وغیرہ قرار پایا۔ علمی مسابقت کا میدان بھی بن گیا۔ منظوم قواعد تیار ہونے لگے۔ مبادی و وسائل مقاصد بن گئے۔ علوم عربیت کا مقصد قرآن و حدیث کے لغوی ترکیبی اور اعرابی مشکلات کا حل تھا۔ لیکن آگے چل کر یہ مبادی خود مقاصد بن گئے، قرآن و حدیث کی تراکیب اپنی جگہ رہیں خود ان کتابوں کے مسائل و عبارات مرکز توجہ بن گئے۔ ابن حاجب کے کافیہ کو لیجئے جس کی پچاس سے زیادہ شرحیں لکھی گئیں۔ پھر شرح ملا جامی جو ان شروح میں سے ایک شرح ہے۔ اس کے حواشی اور شروح کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ اس پر اس کی شرح عبدالغفور کو لیجئے، پھر اس کا تکملہ عبدالحکیم سیالکوٹی اور پھر دونوں کی شرح "دافع التوہمات" کو دیکھئے، اسی طرح ابن مالک کی "الفیہ" اس کی شرح اور ان میں سے شرح "اشمونی" اور پھر اس کی شرح "صبان" سات ضخیم مجلدات میں دیکھئے کہ ساری عمر ان ہی کے مطالعہ کی نذر ہو جائے۔ آخر غور کیا جائے کیا یہ مبادی واقعی اتنی توجہ کے مستحق تھے! بہر حال جو کچھ ہوا ایک خاص دور کا تقاضا تھا اور ذوق طالب تھا جو پورا ہو گیا۔ اسی طرح بقیہ علوم و بقیہ کتب کی حالت کو قیاس کر لیجئے۔ اب نہ تو طبائع میں وہ جولانی رہی اور نہ وہ جفاکشی، محنت و عرق ریزی کی صلاحیت دماغوں میں رہی، نہ وہ فرصت و طمانیت رہی اور سب سے بڑی بات یہ کہ نہ اس کی حاجت رہی۔ مشکل پسند مزاج فکر اکتانے لگی جدید کتابیں لکھی گئیں، ادب و انشا کا طرز و اسلوب بدل گیا، قدما کی کتابیں پریس میں آنے لگیں، اہل عصر نے ہمت کر کے ذوق عصری کی تشنگی کے لیے جدید سانچوں میں ضیافت طبع کی خاطر عمدہ تصنیفات پیش کیں۔ اس ماحول میں اگر ہم اب بھی ان غیر اہم مسائل پر چپکے رہیں گے تو علوم اسلامیہ سے توجہات ہٹ جائیں گی۔ اور ہمارا یہ طرز عمل ہمارے اکابر و سلف کی اس "تراث فاخرہ" اور اس علمی ثروت و سرمایہ کو فنا کے گھاٹ اتار دے گا۔ یہ در حقیقت علم کی خیر خواہی نہیں بلکہ نادان دوست کا سا طرز عمل ہوگا۔ کیا فقہ اسلامی میں کنز الدقائق، وقایہ، نقایہ اور شرح وقایہ کے مضامین بڑے اسلاف ہی کی کتابوں میں موجود نہیں) کیا جامع صغیر، جامع کبیر وغیرہ براہ راست مدون فقہ امام محمد بن الحسن الشیبانی کی کتابیں ہر حیثیت سے جامع نہیں ہیں؟ ان میں جو علم اور برکت ہوگی وہ ان متاخرین کی کتابوں میں کہاں سے ملے گی میرے ناقص خیال میں کتب فقہ میں نور الایضاح، قدوری اور ہدایہ کے علاوہ بقیہ سب

قابلِ تبدیلی ہیں۔

دیکھئے، فلسفہ، منطق اور کلام کو لیجئے، امام حجۃ الاسلام غزالیؒ کے چند رسائل محک النظر، معیار العلم مقاصد الفلاسفہ، الاقتصاد فی الاعتقاد، وغیرہ وغیرہ کے پڑھنے سے وہ مہارت پیدا ہو سکتی جو یہ مشکل اور بڑی دقیق و طویل کتابوں سے حاصل ہو گی۔ غزالیؒ کی حسنِ تعبیر، تفہیم اور حلِ مشکلات کی فوق العادۃ قدرت کا کیا دنیا کے مسلمات میں شمار نہیں؟ یہ ہو سکتا ہے کہ بعض مسائلِ فن کے غیر مذکور ہوں اور بعض غیر منقح ہوں، لیکن جتنے مذکور ہیں ان سے جتنی مہارت و مناسبت انشراح صدر و اطمینان قلب حاصل ہو سکتا ہے، متاخرین کی اکثر کتابوں میں وہ روح کبھی نہیں مل سکتی۔ امام رازیؒ جو منطق و فلسفہ کے سب سے بڑے امام ہیں ان کی کتابیں نہایت سلیس شگفتہ عبارت میں امت کی جو رہنمائی و عقدہ کشائی کر سکتی ہیں وہ متاخرین کی کتابیں کبھی نہیں کر سکتیں۔ امام رازیؒ کے لباب الاشارات، المحصل، الاربعین کو دیکھئے، مصنف کو دل سے دعا دیجئے۔ کیا مشکلات کو مشکل تر بنانا یہ کمال ہے یا مشکلات کو آسان بنا کر امت کے سامنے پیش کرنا کمال ہے۔ یہ صرف چند مثالیں ناظرین کی خدمت میں پیش کی گئی ہیں بہر حال تیسیر کو اختیار کرنا نہ صرف وقت کا اہم تقاضا اور امت حاضرہ کی اہم ضرورت ہے بلکہ علوم اسلامیہ کی صحیح خدمت ہے اور علوم سے پہلے دینِ اسلام کی خدمت ہے۔

فرض کیجئے کہ ہم نے کاغذ بچا کر ایک صفحہ میں اتنے اختصار کے ساتھ کسی مضمون کو ادا کیا جس کی تفصیل چند ورق میں ہو سکتی ہے لیکن اس کے پڑھانے کے لیے مدرس کو ایک گھنٹہ کا وقت دینا پڑا اور کافی تمہید و تشریح کے بعد وہ مشکل حل ہوا لیکن جہاں تشریح دماغ سے غائب ہوئی مضمون بدستور چیستاں رہا۔ اگر اس کے بجائے وہ مضمون دو صفحات میں ادا کیا جاتا اور سرسری نظر میں ذہن نشین ہو جاتا تو بتائیے کون سا طریقہ بہتر ہوتا؟ غور فرمائیں بلا شبہ کاغذ روشنائی تو زیادہ خرچ ہوئی لیکن وقت اور دماغ کم خرچ ہوا۔ گویا ہم نے اختصارات و ایجازات سے کاغذ پر تو رحم کیا لیکن دماغ جیسے لطیفہ، جوہر اور وقت جیسے گرانمایہ سرمایہ کو بے رحمی سے خرچ کیا۔ کیا غزالیؒ، رازیؒ، تقی الدین ابن دقیق العید، عز الدین بن عبد السلام، ابن تیمیہ، ابن القیم جیسے افرادِ روزگار محققین ان چیستانوں کی بدولت اذکیاء امت میں شمار ہوئے ہیں؟ کیا ان بزرگوں کی کتابوں میں ان متاخرین یا قرون وسطیٰ کے مشکل پسند طرزِ تعبیر کا کہیں پتہ ملتا ہے؟ یہ داستان طویل اور دردناک ہے، حاصل وہی ہے جو گزشتہ سطور میں پیش کیا گیا۔

خالق کی رضا مخلوق کی رضا سے مقدم ہونی چاہیے۔ مخلوق کی رضا مندی کی کوشش سے اور حق تعالیٰ کی رضا جوئی سے غفلت کے نتائج دینی و دنیوی خسران ہے۔

۲۲۔ مدرسہ کے سالانہ بجٹ میں امتیازی وظائف و انعامی کتب کی مد ضرور رکھی جائے۔

مدارس دینیہ عربیہ کا نظام | دورِ حاضر میں علمی زوال کے لئے جتنے خطرے پیدا ہو گئے تاریخ اسلام کے کسی دور میں اتنے خطرے نہ تھے۔ موجودہ دور میں مدارس کے آپس کے اختلافات اور رقابتوں نے یا غلط مسابقت و بے جا تنافس و تباغض نے ان خطرات میں مزید اضافہ کیا ہے بلکہ ان خارجی فتنوں سے زیادہ خطرناک یہ داخلی فتنے ہیں۔ اگر ان حریفانہ رقابتوں کی اصلاح کی طرف توجہ نہ کی گئی تو ظاہر بظاہر وہ دن قریب ہیں کہ سارے مدارس فنا کے گھاٹ اتر جائیں گے۔ اس وقت اس کی بڑی ضرورت ہے کہ مدارس عربیہ کے درمیان عملی مواسات اور علمی مواخات و علمی روابط ہوں۔ اس مقصد کے پیش نظر موثر ترین تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ دوسروں کے لئے نہیں بلکہ اپنی بقا کے لئے اس کی ضرورت ہے۔ اس وقت اس جانب ذرا بحث سے کہ مرکز کہاں ہو اور کہاں ہو، صرف نظر کر کے چند امور قابل توجہ ہیں۔

۱۔ کراچی سے سرحد تک جتنے دینی مراکز ہیں آپس میں ایک متحدہ محاذ، متحدہ نظام، متحدہ مجلس شوریٰ بنائیں۔ سال میں دو مرتبہ جمع ہو جایا کریں۔ اور اراکین متحدہ اپنے مدارس کے مصارف پر یہ سفر اختیار کیا کریں۔

۲۔ ہر مدرسہ ایک نمائندہ منتخب کیا کرے۔ ان مندوبین کے اجتماعات میں حسب ذیل امور زیر بحث آئیں: (الف) نصاب تعلیم (ب) نظام تعلیم (ج) ممتاز فارغ التحصیل حضرات کی مکمل فہرست۔ (د) ممتاز فارغ التحصیل حضرات [illegible] کا انتظام [illegible] (ہ) ایک مشترکہ فنڈ کا قیام (و) اس فنڈ سے ایک مطبع کا قیام جس میں مدارس کے نصاب تعلیم کی کتابیں طبع ہوا کریں۔ (ز) جو کتاب نادر ہے نہیں ملتی یا طبع نہیں ہوئی اور نصاب تعلیم میں اس کی ضرورت ہے اس کو مشترکہ فنڈ سے طبع کرا کر مدارس متعلقہ میں تقسیم کرایا جائے۔

۳۔ جس [illegible] ممتاز شخصیت ہو [illegible] ان مدارس میں جا کر علمی مشکلات اور علمی نقائص پر تقریر کرنی چاہیے اور ان نقائص و مشکلات کو [illegible] الغرض اس قسم کے اسباب کو اختیار کیا جائے جن کے ذریعہ تنافس کی فضا ختم ہو جائے اور آپس میں اتحاد ہو اور مشترکہ طور پر علمی خدمت اور دینی خدمت میسر ہو۔

تیسرے نقطے کی تشریح تیسرا نقطہ جس کا ذکر کیا گیا وہ "عدم اثبات" یا اصلاح و ترمیم ہے ___ میری مراد اس سے یہ نہیں کہ یہ سارا دفتر پارینہ غرق مئے ناب کر دینے کے لائق ہے ہرگز نہیں۔ بلکہ یہ علوم امت محمدیہ کا سب سے بڑا سرمایۂ حیات ہیں۔ اس کی حفاظت، اس کی تربیت ماہنامہ امت کا سب سے بڑا فرض ہے۔ مسلمانوں کے دین اور ان کے تمدن کی بقا کے لئے ان علوم کا بقاء ایسا ہی ضروری ہے جیسے حیات بدن کے لئے روحِ انسانی کا وجود۔ بلکہ اس دورِ الحاد و دہریت میں ان کا تحفظ، ان کی نشر و اشاعت کی ضرورت سابق سے کہیں زیادہ اہمیت حاصل کر چکی ہے، لیکن اس واقعی حقیقت کو ثابت کرنے کے لئے کہ اس پرفتن و پُرآشوب عہد میں نجات کی راہ، فلاح و ترقی کا صحیح میدان بھی علوم اسلامیہ ہیں یا یہی دین اسلام ہے، اس کے ثبوت کے لئے ہمیں کچھ اصلاح و تبدیلی کی ضرورت پیش آئے گی۔ گزشتہ چند صدیوں سے جو علمی نظام یا علمی نصاب رائج ہو گیا ہے وہ امت کی موجودہ ہیئت کے لئے تریاق نہیں بن سکتا، جو امراض پیدا ہو چکے ہیں، ان کی شفایابی کیلئے یہ کافی نہیں ہے۔

گزشتہ رائج نصاب تعلیم میں قرآن مجید، علوم حدیث، تاریخ اسلامی، سیرت نبویہ، ادب و علوم بلاغت کو وہ اہمیت حاصل نہیں تھی، جو بقیہ علوم و فنون کو حاصل تھی۔ نصاب تعلیم میں اولیت و اہمیت کا درجہ ان علوم کو حاصل ہونا چاہیئے۔ بقیہ علوم کو ثانوی درجہ میں رکھنا چاہیئے۔ عربی ادبی زبان میں گفتگو، خطابت انشاء ان کو کبھی اہمیت نہیں دی گئی، لیکن اب وقت کا اہم تقاضا ہے کہ ان امور کو سب سے پہلا درجہ نصاب میں دینا چاہیئے۔

لسانیات ہی کے طرز تعلیم پر عربی ادب کی تعلیم و تربیت ہونی ضروری ہے۔ جدید ادبی اسلوب جس میں فرانسیسی ادب کے اسلوب سے استفادہ کیا گیا ہے، جس میں غضب کی جاذبیت و عجیب شیرینی ہے اور ادب کا یہ اسلوب قدیم بلکہ قدیم تر اسلوب سے بہت قریب ہے۔ جاحظ، ابن المقفع اور عہد مامون کے ادبی اسلوب کا ذخیرہ امت کے سامنے موجود ہے، بلکہ احادیث نبویہ کا اسلوب بیان اور فصحاء صحابہ کا طرز بیان، خطباء عرب کا قدیمی اسلوب بہت ہی متقارب ہے۔

تیسری چوتھی صدی تک تقریباً یہی اسلوب بیان تھا، بعد میں بدیع الزماں ہمدانی کے مقاماتی انشاء ادب نے پھر حریری کے پُرتکلف سجع بندی نے اس ادب کا خاتمہ کر دیا، لیکن پھر بھی قرون متوسطہ میں

جستہ جستہ ادبیات یا یہی طرز ادا غرض یہ کہ الادب الحدیث یا الادب الجدید قدیم ترین اسلوب سے بہت اقرب الی
ہے اور اسی میں مہارت و قابلیت و امتیاز پیدا کرنے سے قرآن و حدیث کی زبان کی شیرینی محسوس ہو سکتی
ہے۔ اگر ہمارے نصاب تعلیم میں جاحظ اور ابن قتیبہ و ابن المقفع کی کتابیں نہ سہی کم از کم الشریف الرضی کی
نہج البلاغۃ ہوتی جب بھی ادبی ذوق میں اتنا انحطاط نہ ہوتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ قدیم علوم کی بہت سی کتابوں میں تبدیلی کی ضرورت ہے اور بجائے متاخرین کے
متداول کتابوں و مصنفات میں بہترین بدل موجود ہے منطق، قدیم فلسفہ، قدیم کلام اور قدیم ہیئت میں بہت
سرسری معلومات ہی کفایت کر سکیں گی۔ تنقیح کے ساتھ قواعد و مصطلحات کا علم کافی ہوگا۔ اور ان کی جگہ تکمیل
کے لئے جدید علم کلام اور جدید علم ہیئت و ریاضی و اقتصادیات کو دینا چاہئے۔ اس نصف صدی میں ان
علوم کا کافی ذخیرہ عربی میں آ چکا ہے لیکن بہت سے گوشے ابھی تک تشنۂ تکمیل ہیں۔ تاہم جتنا ذخیرہ
عربی میں مدون ہو چکا ہے اس سے مستفید ہونا چاہئے۔ بعض عمدہ کتابیں اردو میں ملیں گی ان کو داخل
نصاب کیا جائے۔ اس وقت اس موضوع کی تفصیل مقصود نہیں صرف اصولی بحث ملحوظ ہے
وقت نصاب کی تعیین کا مسئلہ پیش نظر ہوگا اس وقت مزید تبصرہ کی ضرورت ہوگی، تاکہ نصاب جدید
فیصلہ کن انداز [illegible] ہو سکے [illegible] چند منتشر [illegible] آئندہ [illegible] ناظرین کی خدمت میں "جہد المقل" و
پیش کرنے کا شرف حاصل کرتا ہوں۔

ہم مدرسہ عربیہ اسلامیہ کراچی میں انہی اصول کے پیش نظر انہی خطوط پر نصاب کی بنیاد چاہتے تھے
الحمد للہ کچھ جزئی ترمیم و اصلاح کا قدم بھی اٹھایا جا چکا ہے، جس کی تفصیل کی شاید اس وقت حاجت نہ
اس نصاب تعلیم کے ساتھ ایک جدید نظام تعلیم کی بھی ضرورت ہے۔ قدیم نصاب تعلیم پر اصرار کے
بعض وجوہ و اسباب تھے، اور کچھ موانع و مشکلات بھی ہیں۔ اس وقت اس کو زیر بحث لانا غیر ضروری
سمجھا گیا۔ اب اس کی بہت شدید ضرورت ہے کہ فکر علماء، ملت اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے [illegible]
مرکز [illegible] کیا جائے۔
پاکستان کا علمی نظام [illegible] نصاب تعلیم ایک ہی سلسلے میں منسلک ہو اور اس سلسلہ کے تخریب و تفرقہ
خلاف و اختلافات کو جلد ختم کیا جائے اور دین و علم کی خدمت کے لئے متفقہ آواز اٹھائی جائے
إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ

[نظامِ] تعلیم | مدارسِ عربیہ کا نصاب تعلیم جس طرح محتاجِ اصلاح ہے جس کا اجمالی خاکہ گزشتہ صفحات میں عرض
کیا گیا ہے اس سے کہیں زیادہ نظامِ تعلیم کی اصلاح کی حاجت ہے۔ نظامِ تعلیم سے میری مراد ایک وسیع مفہوم
ہے جس میں طلباء کی تربیت و نگرانی، طلباء کا علمی معیار، طلباء کا اخلاقی معیار، تدریس و مطالعہ کا طریقہ، کن کن مضامین
زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے، طلباء کی ذہنی تربیت کے لئے کیا کیا ذرائع اختیار کئے جائیں۔ طلباء میں علمی
استعداد پیدا کرنے کے لئے ترغیب و ترہیب کے کیا کیا وسائل ہونے چاہئیں۔ غرض صلاح و تقویٰ
ی معیاری قابلیت، اخلاص و عمل کی روح کے پیدا کرنے کے لئے کن کن تدابیر کو کام میں لایا جائے، جب
ب طلباء کے قلوب میں امراض نہیں تھے، دماغوں میں جمود و جہل کا جذبہ نہ تھا، تحقیقی و علمی مسابقت سے
رشار تھیں۔ اساتذہ میں اخلاص و تعلق مع اللہ کی روح جلوہ گر تھی اور تعلیم و تعلّم دونوں کا مقصد خدمتِ علم و
دمت دین تھا یا کم از کم حصولِ علم صحیح، تو ان تدابیر کی حاجت نہیں تھی لیکن نقطۂ خیال بدل گیا۔ تعلیم کا مقصد
صولِ سند ہے یا حصولِ ملازمت۔ اساتذہ میں وہ روح نہ رہی، ان کا مقصد مشاہرہ کا حصول یا مہتمم کو خوش
نا یا پھر طلباء سے خراجِ تحسین کی سند حاصل کرنا۔ جب یہ امراض پیدا ہو گئے تو اب ضرورت ہے کہ انتہائی
سوزی اور جانفشانی کے ساتھ اس کے علاج کی طرف توجہ کرنی چاہئے۔ سابق الذکر امور میں سے ہر
ک کافی تفصیل طلب ہے لیکن یہاں چند اہم ترین امور کی اصلاحی تدابیر کا اجمالی خاکہ پیش کرنا ہے۔

[تدر]یس کا طریقہ | ۱۔ مدرسین حضرات کا طریقۂ تدریس یہ ہونا چاہئے کہ کتاب کے مشکلات کو سادے الفاظ
ں اور اختصار کے ساتھ حل کرنے کی کوشش کریں۔ تعبیر کے لئے عمدہ دل نشین واضح طریقہ اختیار کریں۔
ب کے حل کرنے میں قطعاً تسامح سے کام نہ لیا جائے۔ حل کتاب کے بعد فن کی مہمات پر متنبہ اور تو
جہ کیا جائے۔ جس مشکل کی تحقیق کسی نے عمدہ کی ہے۔ ان کا حوالہ دیا جائے اور طلباء کو ان مآخذ سے
ناس کرایا جائے تاکہ مستعد و ذہین طلباء اپنی معلومات کو آگے بڑھا سکیں۔ فضول و بے کار مباحث
طویل طویل تقریریں کر کے طلباء سے دادِ تحقیق حاصل کرنا یہ تدریس کا سب سے بڑا فتنہ ہے۔ اس کو
ر کسی طریقہ سے ختم کرنا چاہئے۔

[۲۔] کتابوں کا اختتام اور اوّل سے آخر تک تعلیم میں تطابق | جو کتابیں ایسی ہیں جن کا ختم کرنا
ری ہے، پوری توجہ کرنی چاہئے کہ کتاب ختم ہو جائے۔ کوئی بحث نہ رہ جائے۔ جب تک کتاب
نہ ہو اس کا امتحان نہ لیا جائے، تا اختتام امتحان سالانہ مؤخر کیا جائے اور اس مشکل پر قابو پانے کیلئے

۹۔ اساتذہ کو فن کی اعلیٰ کتابوں کی طرف مراجعت کرنی چاہیئے تاکہ عمدہ معلومات طلبار کیلئے فراہم کر سکیں۔ الغرض مطالعہ و جد و جہد ضروری ہے۔ تن آسانی و راحت کوشی سے صرف سابقہ معلومات پہ اکتفا نہ کرنا چاہیئے۔ طلبار کے اندر اعلیٰ علمی معیار پیدا کرنے کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ اساتذہ اس کے معیار کے ہوں۔

۱۰۔ جہاں تک مقدرت ہو طلبار کو راحت و آسائش پہونچائی جائے اور طلبار اتنے رکھے جائیں جن کی عمدہ خدمت ہو سکے۔ لیکن اس کے ساتھ ان کی علمی نگرانی، درس میں حاضری، رات کا مطالعہ، امتحان میں سختی، ان سب باتوں میں کوئی رعایت یا مسامحت نہ اختیار کی جائے۔ باقاعدہ طلبار کے احوال کا تفقد رکھا جائے، اور اس کے لیے انتظام ہو۔ اگر کوئی طالب علم سہ ماہی میں ناکام ہو تو اس کا کھانا بند کر دیا جائے، اور اگر ششماہی میں بھی ناکام ہو تو آخر سال تک مزید موقع دیا جائے۔ اگر سالانہ امتحان میں بھی نیتجہ ساقط رہا تو اس کو علیحدہ کر دیا جائے۔ ان امور میں تسامح و مراعات کرنا علم کو دفن کرنے کے مترادف ہے۔

۱۱۔ ابتدائی درجۂ عربی کے طلباء کا ماہانہ امتحان لازمی قرار دیا جائے۔ مقدار خواندگی متعین کی جائے، کوشش ہو کہ اس حد تک کتاب پہونچ جایا کرے۔

۱۲۔ ہر درجہ کے مناسب مطالعہ کے لئے کوئی نہ کوئی کتاب منتخب کر کے متعلم کو دی جائے۔ اس کتاب کا امتحان سالانہ لازمی قرار دیا جائے۔

۱۳۔ طلبار کی اخلاقی نگرانی، عادات کی اصلاح، دینی وضع کی پابندی بے حد ضروری ہے۔ باجماعت نماز کی پابندی، سیرت و صورت کی تربیت و اصلاح کی طرف پوری توجہ ہونی چاہیئے۔ ان امور میں تسامح سم قاتل ہے۔ غیر ذکی طالب علم اگر محنتی و صالح ہو اس کو برداشت کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ذکی، بد شوق و بد اطوار ہرگز رعایت کے مستحق نہیں۔

۱۴۔ مدرسہ کے ضوابط ایسے ہوں کہ طلبار خود بخود دینی وضع، صالحین کے شعار، لباس، پوشاک، خورد و نوش، معاشرت و عبادت میں پابند ہو جائیں۔

۱۵۔ امتحانات میں مسابقت و تقدم کے لئے ترغیبی وظائف رکھے جائیں۔ سالانہ امتحان میں امتیازی کامیابی پر انعامات مقرر کئے جائیں، انعامات میں بجائے نقد رقوم کے عمدہ عمدہ کتابیں دی جائیں۔ اگر انعامی

کتب میں ان کی علمی استعداد و طبعی خصوصیات کی رعایت رکھی جائے تو اور سونے پر سہاگہ کا کام دے گی۔ مثلاً حدیث میں اعلیٰ کامیابی پر حدیث کی کوئی عمدہ کتاب، تفسیر میں اعلیٰ کامیابی پر تفسیر کی اعلیٰ کتاب دی جائے۔

۱۶۔ ہر سال کے امتحانات میں ایک پرچہ امتحان کا ایسا ہو جس سے عام اہلیت و قابلیت و علمی استعداد کا پتہ چلے۔ کسی خاص کتاب سے تعلق نہ ہو۔ آخری فراغتِ علوم کے امتحان میں یہ تشخیص بہت ضروری سمجھی جائے۔

۱۷۔ عربی ادبی زبان کی قابلیت مقاصدِ تعلیم میں شامل کرنی چاہئے۔ ابتدار سے عربی انشار نویسی کی مشق و تمرین کا سلسلہ جاری رکھنا چاہئے۔ ایک گھنٹہ مخصوص تحریر عربی کا ہو جو ہر درجہ میں لازمی ہو۔ تین سال تعلیم حاصل کرنے کے بعد چوتھی جماعت میں تدریس کی زبان عربی ہو۔ مدرس عربی میں پڑھائے طلبار و اساتذہ کے سوالات و جوابات کا سلسلہ بھی عربی میں ہونا چاہئے۔

۱۸۔ طلبار میں عربی ادبی ذوق پیدا کرنے کے لئے عربی مجلّات و صحف و جرائد کا اجرار لازمی ہے۔ اور ایک دار المطالعہ کا قیام اس مقصد کے لئے ضروری ہے۔

۱۹۔ طلبار میں تقریر و خطابت کی رُوح پیدا کرنے کے لئے ہفتہ وار جمعہ کی رات تقریر کرنے کے لئے مجلسیں قائم کی جائیں۔ ہر درجہ کے طلباء کے لئے علٰحدہ مجلس تربیت ہو اور ہر ایک مجلس کی نگرانی و تربیت ایک اُستاد کے سپرد ہو۔ آخری تقریر اس اُستاد کی ہو۔ ہر جلسہ کے لئے تقریر کا موضوع متعین ہو اور آخری اُستاد کی تقریر میں تقاریر پر تنقید و تبصرہ ہو۔ ہر ہفتہ وار مجلس کا وقت کم از کم تین گھنٹہ ہو۔

۲۰۔ مدرسہ میں طلبار کی تکثیر جماعت و تکثیر افراد کی کوشش نہ کرنی چاہئے۔ کمیت قابلِ التفات نہ ہو بلکہ کیفیت پر توجہ مرکوز رکھی جائے۔ مستعدین کی قلیل جماعت غیر مستعد نااہل کے جم غفیر سے زیادہ قابلِ قدر سمجھی جائے۔ اربابِ مدارس کو تکثیر سواد کے تنافس سے بے حد نقصان پہونچا۔ دس صحیح طالب علموں پر سالانہ بیس ہزار کا خرچ قابلِ برداشت ہونا چاہئے۔ لیکن سو نااہل طلبار پر بیس ہزار کا خرچ بھی قابلِ مواخذہ ہے۔ الغرض یہ خطرناک وبا کی شکل میں مدارس عربیہ دینیہ میں یہ مرض پیدا ہو گیا۔ اس کے علاج و تدارک کی طرف پوری توجہ کی ضرورت ہے۔

نظامِ تعلیم میں عوام کو مدرسہ کی امداد پر مائل کرنے کے بجائے علم و دین کی خیر خواہی مقدم ہونی چاہئے۔

(آگے صفحہ ۸۷، صفحہ ۹۳ سے پہلے دیکھئے)

محمد منظور نعمانی

ایک مردِ مومن کی وفات

حضرت صوفی سید عبد الرب واصل بحق

۲۵ر محرم (۷ر فروری) جمعہ کا دن تھا، صبح ۸ بجے کے بعد ایک صاحب نے آکر اطلاع دی کہ رات ایک بجے کے قریب اُناؤ میں حضرت صوفی عبد الرب صاحب کا انتقال ہوگیا، جنازہ کی نماز اور تدفین جمعہ کی نماز کے بعد ہوگی۔

یہ عاجز اور لکھنؤ کے چند اور احباب جن کو یہ اطلاع مل گئی تھی نمازِ جمعہ سے پہلے اناؤ پہونچ گئے، اور جنازہ کی نماز اور تدفین میں شرکت ہو گئی۔

الفرقان کے ناظرین میں خاصی بڑی تعداد اُن حضرات کی ہوگی، جو صوفی صاحب سے واقف ہونگے۔ صوفی صاحب غالباً ابتدائی عمر ہی میں حکیم الامّت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہو گئے تھے، اور انہی کے حکم سے "اصلاح" کا تعلق اُن کے خلیفہ حضرت مولانا محمد عیسیٰ الہ آبادیؒ سے قائم کرلیا تھا۔ پھر جب سنہ ۱۹۴۳ء (سنہ ۱۳۶۲ھ) میں حضرت حکیم الامّت کا اور اُن کے چند ہی مہینے بعد حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب کا بھی وصال ہوگیا تو صوفی صاحب نے اصلاح کا تعلق حضرت مولانا شاہ وصی اللہؒ سے قائم کرلیا اور اللہ تعالیٰ نے اِن تینوں حضرات کے فیوض سے صوفی صاحب کو بہرہ مند فرمایا۔ جہاں تک اپنا اندازہ ہے —— والعلم عند اللہ —— صوفی عبد الرب صاحب اپنے رب کے بڑے وفادار بندے اور مثالی مردِ مومن تھے۔

بعض تابعین کے بارہ میں کتابوں میں منقول ہے کہ وہ اپنے مخاطبین اور شاگردوں سے ــــ جنھوں نے صحابہ کرام کو نہیں پایا اور دیکھا تھا، فرماتے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کرام کو پھر ہماری اس دُنیا میں واپس بھیجدے تو تم ان کو مجانین (عقل مارے ہوئے دیوانے) سمجھو گے اور وہ تم کو منافق ــــ ہمارے صوفی صاحب کا یہی حال تھا، دین کے بارہ میں ان کی لِلّٰہ فی اللہ شدّت کی وجہ سے بہت کم لوگ اُن سے راضی رہ سکتے اور وہ بھی بہت کم لوگوں کو پسند کرتے ــ اس باب میں وہ حضرت ابوذر غفاری رضؓ کے حال کے وارث وہم مشرب تھے ۔ مولانا محمد علی جوہر مرحوم کا مشہور مصرعہ کہ "یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے" ــــ ان کے بالکل حسبِ حال تھا ــــ کبھی کبھی فرمایا کرتے تھے "مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں کو حکم دے گا کہ میرے اس بندہ عبدالرب کو کان پکڑ کے جنت میں داخل کردو ۔ یہ ہمارے لئے لوگوں سے بہت لڑتا تھا۔

صوفی صاحب نے انگریزی اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم حاصل کی تھی اور پھر گورنمنٹ کے محکمۂ تعلیم ہی سے وابستہ ہو گئے اور ریٹائر ہونے کی عمر تک اسکولوں ہی میں ماسٹری کی، گویا پوری عمر اُن اسکولوں اور کالجوں ہی کے ماحول میں گزری جن کو لوگوں نے "ایمان کی قتل گاہیں" کہا ہے۔ لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا وہ "مثالی مردِ مومن" تھے۔ اپنی ٹھیٹ مُلّایانہ شکل و صُورت اور مولویانہ لباس کے ساتھ اسکول جاتے۔ قرآن شریف اور مناجات مقبول گلے میں حمائل رہتی، جو گھنٹہ خالی ہوتا اس میں تلاوت کرتے یا اپنا رومال کسی کونے میں بچھا کر نوافل پڑھتے رہتے۔ اسکول کا مفوضہ کام محنت اور دیانتداری سے انجام دیتے جیسا کہ پکّی دینداری کا تقاضا ہے، لیکن اپنے اصُولوں میں بے لچک ہونے کی وجہ سے بسا اوقات اختلافات بھی پیدا ہو جاتے اور اس کی وجہ سے جلدی جلدی تبادلے بھی ہوتے رہتے۔

صوفی صاحب پر اللہ تعالیٰ کا ایک خاص انعام یہ تھا کہ ان کو اللہ تعالیٰ پر بڑا اعتماد اور بھروسہ تھا، جو خاص درجہ کے اصحاب یقین کو ہوتا ہے ــــ ایک دفعہ محکمہ کی طرف سے (غالباً سزا کے طور پر) اُن کا تبادلہ بہت بُری جگہ کے لئے کردیا گیا جہاں ایک بھی مسلمان کا گھر نہ تھا اور پینے کا پانی ایک میل سے لانا پڑتا، وہ لکھنؤ تشریف لائے، اس تبادلہ کے معاملہ کا ذکر کرتے ہوئے مجھ سے فرمایا کہ وہ کیا حدیث ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ بعض بندے وہ ہوتے ہیں کہ اگر وہ کسی معاملہ میں اللہ پر قسم کھائیں، تو اللہ تعالیٰ اُن کی قسم پُوری کردیتا ہے؟ ــــ میں نے کہا ہاں حدیث میں آیا ہے "رُبَّ اَشْعَثَ اَغْبَرَ

لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَأَبَرَّهُ ۔ صوفی صاحب نے ایک خاص انداز میں فرمایا۔ "اے اللہ میں تیرے بھروسہ پر قسم کھاتا ہوں کہ اس جگہ کو میرا تبادلہ نہیں ہوگا" ۔۔۔ پھر ایسا ہی ہوا اور ایک دوسری بہتر جگہ کے لئے حکم آگیا۔

ایک زمانہ میں صوفی صاحب فتحپور ہسوہ کے سرکاری اسکول یا کالج سے وابستہ تھے، طلبار میں کچھ ہندو مسلم مناقشہ ہوگیا اور معاملہ خاصا سنگین ہوگیا، اس اسکول یا کالج کے افسر اعلیٰ (ہیڈ ماسٹر یا پرنسپل) نے صوفی صاحب کے پکے مسلمان ہونے کی وجہ سے سارے فساد کا ذمہ دار انہی کو قرار دیا، ۔۔۔ معاملہ چونکہ بہت ہی سنگین نوعیت کا ہوگیا تھا اس لئے صوبہ کا ڈائرکٹر تعلیم جو انگریز تھا، خود تحقیق و تفتیش کے لئے آیا، مختلف لوگوں سے پوچھ گچھ کی اور بیانات لئے، ہیڈ ماسٹر وغیرہ نے صوفی صاحب کی موجودگی میں انہی کو سارے فساد کا ذمہ دار قرار دیا۔ صوفی صاحب اس ساری کارروائی کو خاموشی سے سنتے اور دیکھتے رہے ۔۔۔ آخر میں ڈائرکٹر نے غصہ بھرے انداز میں صوفی صاحب سے مخاطب ہو کر کہا کہ "تم کچھ کہے گا۔؟"

صوفی صاحب نے فرمایا، جی ہاں میں بھی کچھ کہوں گا۔ اِن ہیڈ ماسٹر صاحب کا ایک لڑکا ہے، اسکول ہی میں پڑھتا ہے، پہلے اس کو یہاں بلالیا جائے!۔ ڈائرکٹر نے ۔۔۔ جو غالباً یہ رائے قائم کر چکا تھا کہ صوفی صاحب ہی فساد کے بانی اور ذمہ دار ہیں ۔۔۔ کہا کہ لڑکے کو کیوں بلایا جائے؟۔ صوفی صاحب نے اپنے خاص انداز میں فرمایا کہ وہ اِن کا (ہیڈ ماسٹر کا) اکلوتا لڑکا ہے اور میں جانتا ہوں کہ وہ اِن کو اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے، وہ یہاں آجائے تو میں یہیں دو رکعت نماز پڑھ کے دُعا کروں گا کہ میرے خلاف جو کچھ ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا ہے وہ اگر سچ ہے تو میں ایسا ہی شرارتی اور فسادی ہوں تو زمین شق ہو جائے اور میں ابھی سب کے سامنے اس میں دھنسا دیا جاؤں اور اگر انھوں نے جان بوجھ کر جھوٹ بولا ہے تو اِن کا لڑکا ابھی زمین میں دھنس جائے۔

صوفی صاحب نے یہ بات دل کے ایسے تاثر اور ایسے جلالی انداز میں کہی کہ انگریز ڈائرکٹر دہشت زدہ ہو کر کرسی سے کھڑا ہوگیا اور صوفی صاحب کو پادری صاحب، پادری صاحب کہہ کر مخاطب کرنے لگا اور اس نے تحقیق و تفتیش کا سلسلہ اسی پر ختم کردیا ۔۔۔ آگے سُننے کی خاص بات یہ ہے کہ بعد میں صوفی صاحب کے ایک خاص ہم مشرب دوست نے جو اُن کے پیر بھائی بھی تھے

اُن سے کہا کہ آپ نے اتنی بڑی بات کیسے کہہ دی؟ ــــ صوفی صاحب نے فرمایا کہ اس وقت مجھے پورا یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ ایسا ہی کر دے گا۔

ہمارے اکابر بلکہ سارے ہی محققین کے نزدیک کشف کی کوئی اہمیت نہیں ہے، لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ اگر ایمان اور عمل صالح کے ساتھ کسی بندے کا یہ حال ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کے لئے بعض مخفیات کو منکشف فرما دے تو وہ اللہ تعالیٰ کا خاص انعام اور اس بندہ کی مقبولیت کی علامت اور از قبیلۂ کرامات ہے ــــ صوفی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے یہ نعمت بھی نصیب فرمائی تھی۔ ایک واقعہ جو خود اس عاجز سے متعلق ہے، یہاں ذکر کر دینے کو جی چاہتا ہے۔

شعبان ۱۳۶۶ھ (جون یا جولائی ۱۹۴۷ء) کی کسی تاریخ کو رفیق محترم مولانا علی میاں حج کے لئے روانہ ہو رہے تھے، ان کے اعزہ اور احباب و مخلصین اُن کو رخصت کرنے کے لئے لکھنؤ کے اسٹیشن پر جمع تھے، اُن میں راقم سطور (محمد منظور نعمانی) اور صوفی صاحب بھی تھے، اس کے چوتھے یا پانچویں دن جمعہ آنے والا تھا۔ اس جمعہ کے لئے ایک تبلیغی جماعت کے ساتھ میرے کرسی (ضلع بارہ بنکی) جانے کا پروگرام پہلے بن چکا تھا۔ صوفی صاحب سے بھی اس پروگرام کا ذکر آگیا تھا (صوفی صاحب کا اصل وطن کرسی سے دو تین میل کے فاصلے پر ایک موضع ہے) انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ جمعہ کے دن کس وقت کرسی پہنچنے کا اندازہ ہے؟ میں نے بتلایا کہ ۱۰، ۱۱ بجے تک پہونچ جانے کا ارادہ ہے۔ صوفی صاحب نے فرمایا کہ میرے والد صاحب بیمار ہیں اور یہ ان کا آخری مرض ہے اُن کا انتقال انشاء اللہ جمعہ ہی کے دن ہوگا، آپ کوشش کریں کہ جتنا سویرے کرسی پہونچ سکیں پہونچ جائیں، اور پہلے میرے گاؤں آ کر والد صاحب کی نماز جنازہ پڑھا کر کرسی واپس ہو جائیں۔ ــــ مجھے ان کی اس بات پر کچھ تعجب بھی ہوا، لیکن عقیدت اور محبت تھی ان کے حکم کی تعمیل کا ارادہ کر لیا ــــ مگر اللہ کی مشیت، جس لاری سے ہماری جماعت کرسی کے لئے روانہ ہوئی اس نے کسی وجہ سے کئی گھنٹے کی تاخیر سے پہونچایا، ہم ایسے وقت پہونچے کہ جمعہ کی نماز بالکل تیار تھی۔ ایک صاحب جو صوفی صاحب کا خط لائے تھے میرے منتظر تھے، انھوں نے مجھے خط دیا، اس میں لکھا تھا کہ آج صبح والد صاحب کا انتقال ہو گیا، نماز جنازہ کے لئے آپ کا انتظار کیا جائے گا۔ ــــ صوفی صاحب نے یہ خط لکھ کر آدمی صبح ہی کرسی بھیجا ہوگا، لیکن ہم لوگوں کے بہت تاخیر سے پہنچنے کی وجہ سے یہ خط مجھے نماز جمعہ کے وقت غالباً مسجد ہی میں ملا تھا ــــ میرا خیال تھا کہ زیادہ دیر انتظار

کرنا مناسب نہ سمجھ کر جنازہ کی نماز اور تدفین سے فراغت ہوچکی ہوگی، تاہم میں نے اسی وقت وہاں جانے کا فیصلہ کیا اور نماز جمعہ سے فارغ ہوکر اپنے چند رفقاء کے ساتھ صوفی صاحب کے گاؤں کو روانہ ہوگیا۔ وہاں پہونچا تو دیکھا کہ انتظار کے بعد مایوس ہوکر نماز جنازہ ہوچکی ہے اور اس کے بعد تدفین کے لئے میت کو قبر میں اُتارا بھی جا چکا ہے ـــــ لیکن صوفی صاحب نے فقہ حنفی کا مسئلہ معلوم ہونے کے باوجود اصرار فرمایا کہ آپ لوگ اسی حال میں دوسری نماز جنازہ پڑھیں۔ ان کے اس حکم کی بھی تعمیل کی گئی ـــــ الغرض صوفی صاحب نے ۴۔۵ دن پہلے لکھنؤ کے اسٹیشن پر جمعہ کے دن والد صاحب کے انتقال کے بارہ میں جو کہا تھا اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہی وقوع میں آیا۔ بلاشبہ یہ اُنکا کشفِ صادق تھا۔[1]

اس طرح کے صوفی صاحب کے اور بھی بہت سے واقعات ان کے دوستوں کے علم میں ہیں ـــ لیکن جہاں تک راقم سطور کو معلوم ہے، صوفی صاحب کا یہ رنگ اور حال اب سے قریباً ۲۰ سال پہلے تک رہا اس کے بعد (غالباً جب وہ دوسری دفعہ حج و زیارت سے مشرف ہوئے) عبدیت اور تفویض و تسلیم کا رنگ غالب آگیا۔

صوفی صاحب شاعر بھی تھے اور بہت قادر الکلام شاعر، لیکن ادھر بہت عرصہ سے شعر کہنا بالکل ترک کر دیا تھا، ان کی بہت سی نظمیں الفرقان میں شائع بھی ہوئی ہیں جو اس کے قدیم فائلوں میں محفوظ ہیں۔ اگر ان کا کلام جمع کیا جائے تو اچھا ضخیم دیوان تیار ہو جائے گا۔

صوفی صاحب کی جسمانی صحت بھی خدا کے فضل سے بہت اچھی تھی، عمر کے ساٹھ سال سے متجاوز ہونے کے بعد بھی فرماتے تھے کہ میں اپنے کو بالکل جوان محسوس کرتا ہوں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیت کہ ذیابیطس میں مبتلا ہوگئے۔ اُس نے چند سالوں میں جسم کو بالکل ہی گھلا دیا، آنکھوں کی بینائی بھی ختم ہوگئی، اِدھر کچھ عرصے سے ٹانگوں سے بھی بالکل معذور ہوگئے، لیکن معمولات میں غالباً کوئی فرق نہیں آیا۔ ملاقات اور عیادت کرنے والے دوستوں سے کہتے میں اس حال میں بھی (بفضلہٖ تعالیٰ) بڑے

(باقی صفحہ ۴۶ پر دیکھا جائے)

---

[1] صوفی صاحب کے والد ماجد مرحوم پہلے حضرت مولانا گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے، ان کے وصال کے بعد حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے قیام کانپور کے زمانہ میں بیعت ہوئے تھے ـــ صوفی صاحب بیان فرماتے تھے کہ میرے والد ماجد صاحب سب سے پہلے وہ شخص تھے جن کو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بیعت فرمایا۔

Regd. No. LW/NP-62

Monthly 'ALFURQAN' Kutchery Road, Lucknow U. P.

VOL. 43 NO. 2, 3 FEB., MARCH, 1975 Phone : 25547

Cover Printed at—Shining Press, Naya Gaon, Lucknow-1

الفرقان

لکھنؤ

سلسلہ

محمد منظور نعمانی

دوسرا انتخاب نمبر

سنہ ۱۹۴۷ء سے سنہ ۱۹۵۸ء تک کے فائلوں کے منتخب مضامین

مدیر

محمد منظور نعمانی

یہاں سرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی۔ براہ کرم آئندہ کے لیے سالانہ چندہ (۱۲/-) ارسال کریں، اگر خریداری جاری رکھنے کا ارادہ نہ ہو تو فوراً مطلع فرمائیں ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی۔پی ارسال ہوگا۔

ناظم دفتر الفرقان

فہرستِ مضامین

باب ۵ - حکمت و موعظت

باب ۶ - مردانِ حق

ضروری دفتری اطلاعات

یہ نمبر اپریل، مئی، جون کا مشترک شمارہ ہے۔ اسکے بعد جولائی کا شمارہ انشاءاللہ ار جولائی تک شائع ہوگا۔

یہ **"دُوسرا انتخابِ نمبر"** بھی "پہلے انتخاب نمبر" کی طرح خریداروں کی موجودہ تعداد سے کچھ زیادہ چھپوایا گیا ہے (اس کی قیمت بھی پانچ روپے ہے) جو صاحب صرف یہ نمبر طلب فرمانا چاہیں وہ طلب کر سکتے ہیں۔ جو حضرات اس نمبر سے خریداری قبول فرمائیں گے، ان کو یہ نمبر خریداری کے حساب ہی میں پیش ہوگا۔

دفتر الفرقان اور کتب خانہ الفرقان کے پتہ میں تبدیلی۔ نوٹ کر لیجئے —— اب الفرقان کا دفتر اور کتب خانہ لکھنؤ ہی میں کچہری روڈ سے دوسری جگہ منتقل ہو گیا ہے۔ اب پتہ اس طرح لکھئے:- **۳۱۔ نیا گاؤں مغربی۔ لکھنؤ (یو۔پی)**

پاکستانی خریداروں سے:- الحمدللہ اب ایک عرصہ کے بعد الفرقان پاکستان جانے لگا ہے۔ پاکستانی حضرات اپنا چندہ مبلغ -/۲۰ روپیہ ادارہ اصلاح و تبلیغ، آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو ارسال فرما کر رسید ہمیں ارسال فرماویں۔

ناظم دفتر الفرقان و کتب خانہ الفرقان، ۳۱۔ نیا گاؤں مغربی۔ لکھنؤ (یو۔پی)

سخنہائے گفتنی

بسم اللہ، والحمد للہ، والصلوٰۃ والسلام علیٰ سیدنا محمد رسول اللہ وآلہ وصحبہ ومن والاہ ۝

جیساکہ ناظرین کرام کو معلوم ہے اب سے قریباً ڈھائی سال پہلے جب الفرقان کے اجراء پر چالیس سال پورے ہو رہے تھے تو یہ خیال دل میں پیدا ہوا کہ چالیس سال کی اس طویل مدت میں مختلف موضوعات اور مسائل پر بہت سے ایسے مضامین اور مقالات الفرقان میں شائع ہوتے رہے ہیں جن کی آج بھی ویسی ہی ضرورت اور اُن میں وہی افادیت ہے جو اُس وقت تھی جب وہ لکھے گئے تھے، مگر اب وہ بس الفرقان کے پُرانے فائلوں میں مدفون ہیں، اور اُسکے موجودہ ناظرین میں یقیناً ۸۰-۹۰ فیصد سے زیادہ وہ ہیں جن کی نظر سے وہ مضامین نہیں گزرے اور وہ اُن سے بالکل بے خبر ہیں ____ اُسی وقت یہ تجویز ذہن میں آئی تھی کہ ایسے مضامین کا انتخاب کر کے الفرقان کے ایک "خاص نمبر" کی شکل میں اُن کو پھر شائع کر دیا جائے ____ لیکن جب اس نظر سے اُس کے پُرانے فائلوں کی ورق گردانی کی گئی تو اندازہ ہوا کہ ان سب مضامین کو ایک نمبر میں نہیں سمیٹا جا سکے گا بلکہ متعدد نمبر شائع کرنے ہوں گے اور یہی طے کر لیا گیا ____ اس فیصلہ کے مطابق "پہلا انتخاب نمبر" گزشتہ سال (۱۹۷۴ء) اسی جون کے مہینے میں ڈھائی سو صفحات پر شائع ہوا تھا، اس میں ان ابتدائی تیرہ سال کے منتخب مضامین جمع کر دیے گئے تھے، جب الفرقان بریلی سے شائع ہوتا تھا[1] ____ الحمد للہ اس نمبر کو امید سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی، خاص کر اس کے وہ مضامین بہت مفید سمجھے گئے اور بہت قدر سے پڑھے گئے جو الفرقان کے ابتدائی دور میں مشرکانہ عقائد اور رسوم و بدعات پر لکھے گئے تھے، یا جن میں موجودہ مسلمانوں کے قومی مزاج کے فساد و بگاڑ کی نشان دہی اور اصلاح کی کوشش کی گئی تھی۔

---

[1] اس نمبر کی کچھ کاپیاں اب بھی دفتر الفرقان میں باقی ہیں، شائقین طلب فرما سکتے ہیں. قیمت: پانچ روپے علاوہ محصول ڈاک ۔ ناظم دفتر الفرقان، لکھنؤ

ٹھیک سال بھر بعد اب یہ "دوسرا انتخاب نمبر" ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔ اس میں الفرقان کے لکھنوی دور کے ابتدائی گیارہ بارہ سال (۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۸ء تک) کے منتخب مضامین جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے ـــــ جیسا کہ ناظرین کرام دیکھیں گے، یہ مضامین مختلف النوع ہیں ــ ان سب میں قدر مشترک یہ ہے کہ ان میں کے ہر مضمون میں مسلمانوں کی نظری، فکری یا عملی غلطیوں، یا حالات واطوار کی خرابی کی اصلاح کی کوشش کی گئی ہے اور دین کی محکم تعلیمات اور عقل سلیم کی روشنی میں ان کو اُس زندگی اور فکر وعمل کی اُس صراط مستقیم کی دعوت دی گئی ہے جو اُن کے لئے دنیا وآخرت میں صلاح وفلاح کی واحد راہ ہے۔

پہلے انتخاب نمبر کی طرح اس نمبر کے مضامین ومقالات کو بھی چھ عنوانات یا چھ بابوں میں تقسیم کردیا گیا ہے۔

یہاں اس کا اظہار ضروری ہے کہ ان دس بارہ سال کے فائلوں سے جو مضامین اس "دوسرے انتخاب نمبر" کے لئے منتخب کئے گئے تھے، صفحات میں گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے وہ سب اس میں شامل نہ ہوسکے، اور متعدد اہم مضامین رہ گئے۔ اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا تو آئندہ سال "تیسرے انتخاب نمبر" میں وہ شامل کئے جاسکیں گے، البتہ ایک دو مضمون جن کی کتابت بھی ہوچکی تھی اور گنجائش ختم ہوجانے کی وجہ سے ان کو روک لینا پڑا، انشاء اللہ آئندہ مہینے جولائی کے شمارہ میں وہ شامل کردیئے جائیں گے۔

اس وقت بمشکل اتنا کاغذ دستیاب ہوسکا ہے کہ یہ نمبر تقریباً دو سو صفحات پر شائع کیا جارہا ہے۔ اس کی کتابت اسلئے زیادہ باریک قلم سے کرانی پڑی کہ زیادہ سے زیادہ مضامین لکھے جاسکیں، اگر اسی قلم سے کتابت ہوتی جس سے الفرقان کے عام شمارے لکھے جاتے ہیں تو یہ مضامین ڈھائی سو صفحات سے کم میں نہ سما سکتے۔

نگاہِ اوّلیں

اب سے ٹھیک دو مہینے پہلے ۲۵ مارچ کو شاہ فیصل مرحوم شہید کئے گئے (اللہ تعالیٰ ان کی تربت پر رحمت ورضوان کی بارش کرے) بادشاہوں اور حکومت کے سربراہوں کی موت وحیات بھی عام انسانوں کی موت وحیات کی طرح روزمرہ کے واقعات وحوادث ہیں۔ لیکن شاہ فیصل مرحوم کی شہادت کا حادثہ عالم اسلام کے اُن عظیم اور غیر معمولی حوادث میں سے ہے جو صدیوں میں کبھی واقع ہوتے ہیں ــــ اس حادثہ کے بعد الفرقان کا یہ پہلا شمارہ شائع ہورہا ہے۔ اسمیں "نگاہِ اوّلیں" کے تحت اسی حادثہ پر لکھا گیا ہے۔

جیسا کہ ناظرین کرام کو معلوم ہے مولوی عتیق الرحمٰن کئی سال سے ایسے حال میں ہیں کہ الفرقان کے لئے صفحہ دو صفحے بھی نہیں لکھ پاتے۔ لیکن شاہ فیصل مرحوم کے حادثہ کا اُن پر غیر معمولی اثر ہوا، اور ان کی طبیعت اپنے

احساسات وتاثرات سپرد قلم کرنے کیلئے بیچین ہوئی، انھوں نے اس نقطۂ نظر سے لکھنے کی کوشش کی ہے کہ ... کے کام اور خصوصیات کو صحیح طور پر سمجھا جائے اور اُس سے روشنی حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ ناظرین ... "نگاہِ اولیں" کے ذیل میں اسی کو پڑھیں گے۔

افسوس ہے کہ اپنی خواہش اور کوشش کے باوجود اس نمبر کی کتابت کیلئے بھی اچھے کاتبوں کا وقت نہیں مل سکا۔ جو صاحب الفرقان لکھا کرتے تھے اُن کی صحت طویل مدت سے خراب ہے۔ اسلئے الفرقان کی کتابت کا نظام قریباً ڈیڑھ دو سال سے خراب ہی چل رہا ہے۔ اللہ ہی سے فریاد اور دُعا ہے۔

الفرقان کا حال:-

اللہ تعالیٰ کا یہ بہت ہی عظیم انعام واحسان ہے کہ الفرقان کے ناظرین عموماً وہ ہیں جو اسکے صرف "خریدار" نہیں ہیں بلکہ اُسکو دینی خدمت کا ایک سلسلہ سمجھ کر اس سے لوجہ اللہ محبت و ہمدردی رکھتے ہیں، اُنکا حق ہے کہ الفرقان کا حال اُنکے علم میں رہے ـــــ اسوقت صورت یہ ہے کہ الفرقان کے مستقل صفحات صرف ۴۸ ہیں اور چندہ بارہ (۱۲) روپے ہے (جو خود میرے نزدیک بھی بہت زیادہ ہے) لیکن کاغذ کی قیمت اور دوسرے مصارف میں اسقدر اضافہ ہوا ہے کہ خریداروں سے جو کچھ آتا ہے وہ رسالہ کی تیاری و اشاعت کے اخراجات اور دفتری مصارف کیلئے پورا نہیں ہوتا ـــــ اس کمی کے پورا ہونے کی شکل بظاہر اسباب یہ تھی کہ چند مستقل اشتہارات فراہم ہو جائیں، مگر ایسا نہیں ہوسکا۔ ہاں گزشتہ سال "پہلے انتخاب نمبر" کیلئے بعض مخلصین نے چند اشتہارات فراہم کر کے بھیجے تھے، اس وقت بھی اس "دوسرے انتخاب نمبر" کیلئے انھوں نے یہ زحمت فرمائی (جس سے نمبر کی تیاری میں بڑا سہارا ملا) اللہ تعالیٰ ان کو بہتر سے بہتر جزا اس تعاون علی الخیر کی عطا فرمائے۔

اس سلسلہ میں بعض مخلصین نے یہ مشورہ دیا ہے کہ الفرقان میں اشتہارات زیادہ نہ شائع کئے جائیں، اشتہارات کی فراہمی کی کوشش کے بجائے ایسے حضرات کو "خصوصی معاون" بننے کی ترغیب دی جائے جو صاحبِ استطاعت اور صاحبِ توفیق ہوں اور "معاون خصوصی" کی حیثیت سے سالانہ چندہ سو (۱۰۰) روپے دینا قبول فرمائیں۔

جن مخلص دوست نے یہ مشورہ دیا ہے انھوں نے تین معاونین کا چندہ بھی ساتھ ہی روانہ فرما دیا ... اللہ تعالیٰ اُن کو اپنے خاص فضل وکرم سے نوازے ـــــ اس مشورہ کے مطابق اب یہ طے کر لیا گیا ہے کہ الفرقان کے محبین ومخلصین اشتہارات کی فراہمی کیلئے زحمت نہ فرمائیں۔ ہاں جو صاحبِ استطاعت اور باتوفیق حضرات الفرقان کی مشکلات میں مدد فرمانا چاہیں وہ "معاون خصوصی" بننا قبول فرمالیں ـــــ وَاجرُھُم علی اللہ

محمد منظور نعمانی ـ ۱۳ جمادی الاول ۱۳۹۵ھ ۔ ۲۷ مئی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عتیق الرحمن سنبھلی

نگاہِ اولیں

فیصل شہید - رحمہ اللہ رحمۃ الابرار الصالحین

بڑی مدتوں کے بعد، دعاؤں اور آرزوؤں کے بعد، یاس اور ناامیدیوں کے بڑے ہی گہرے اندھیرے کی تہ سے، ایک آفتاب امیدوں کے چراغ جلاتا ہوا نکلا تھا۔ مگر عین عروج کی حالت میں یہ ایسا یکایک غروب ہو گیا کہ امیدوں اور امنگوں کا یہ زندگی سے سرشار قافلہ، آج دو ماہ گزر جانے کے بعد بھی ایک سکتے کے عالم میں، تصویرِ غم بنا کھڑا ہے!

ڈھلتے ڈھلتے یکسر زرد رو ہو کر ڈوبنے والا آفتاب بھی اپنے پیچھے تھوڑی بہت روشنی چھوڑتا ہے اور دنیا اس کے ڈوبنے کے ساتھ ہی ایکدم اندھیری نہیں ہو جاتی۔ پھر جو آفتاب عین نصف النہار میں غروب ہوا ہو اس کے پیچھے ایکدم اندھیرا چھا جانے اور امیدوں کی دنیا اسی دم تاریک ہو جانے کا کیا سوال؟ روشنی ابھی پوری طرح قائم ہے۔ امیدیں ناامیدی سے بدلنے پر مجبور نہیں ہوئی ہیں۔ مگر ان امیدوں میں وہ زندگی اور شگفتہ روئی جو ایک آفتاب کے وجود ہی پر منحصر ہے۔ اس وقت تک کہاں سے بحال ہو سکتی ہے جب تک کہ کوئی آفتابِ تازہ اس ڈوبنے والے کی جگہ نہ لے لے؟
خدا سے دعا ہے کہ وہ ہماری اس ضرورت اور آرزو کو پورا فرمائے!

امیدوں کا یہ آفتاب سعودی عرب کے فرمانروا شاہ فیصل بن عبدالعزیز کی صورت میں عالمِ اسلام پر طلوع ہوا تھا۔ شاہ فیصل (برّد اللہ مضجعہ) نے ۱۹۶۴ء میں ایسے وقت میں حکومت کی باگ ڈور سنبھالی جبکہ ان کا ملک ہی ایک بحرانی دور سے نہیں گزر رہا تھا بلکہ پوری عرب

دنیا میں بھی ایک ہلچل مچی ہوئی تھی، نزاکتوں سے بھری ہوئی وہ سنگین کیفیت؛ ہاں طاری تھی جو کسی ایسے خطے کی انقلابی روح اور (وہاں) سامراجی مفادات رکھنے والی بڑی بیرونی طاقتوں کے درمیان بھرپور کشمکش سے پیدا ہوتی ہے، جہاں انقلابی شعور عام نہ ہو پایا ہو، جہاں ہر سطح پر کوتاہ بین اور کمزور کیرکٹر کے ایسے حضرات پائے جاتے ہوں جو سامراجی طاقتوں کو مورچے باندھنے کی گنجائش فراہم کرتے ہوں، یا کم از کم اس کا شبہ اُن کے بارے میں کیا جا سکتا ہو۔ عرب دنیا اُس وقت اسی کیفیت سے دوچار تھی۔ باہر کی طاقتوں ہی سے دلیرانہ جاگ پڑنے والی انقلابی روح نہیں ٹکرا رہی تھی بلکہ کہیں بجا اور کہیں بیجا اپنوں سے بھی اسکا ٹکراؤ تھا اور جیسا کہ قدرتی طور پر ہوتا ہے یہ ٹکراؤ روز بروز زیادہ اندھا اور زیادہ بھیانک ہوتا جا رہا تھا، اس کے دائرے کا پھیلاؤ بھی بڑھتا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ پورا عرب خطہ آپس کی لاگ ڈانٹ، باہمی جدال و قتال اور ایک حکومت کی دوسری حکومت کے خلاف سازشوں اور جوابی سازشوں کی نحوست میں اس طرح غرق ہوا کہ ۱۹۶۷ء میں اُس اسرائیل کے ہاتھوں آخری درجہ کی ذلت کا داغ عربوں کے چہرے پر لگا جسے کسی وقت بھی سمندر میں ڈبو دینے کی باتیں وہ کرنے لگے تھے۔

شاہ فیصل اپنی اعتدال پسندی اور مصلحت شناسی کی بنا پر ۶۷ء کے اس اندوہناک لمحے تک خود بھی اس خطے کے تیز گام اور آتش زبان انقلاب پسندوں کی نظر میں ناپسندیدہ بلکہ اُن کے ہدف بنے ہوئے لعن طعن کا نشانہ بنے ہوئے اور اس لیے اُن کے وہ جوہر عام طور سے لوگوں پر نہیں کھل سکے جو انھیں عربوں کی قیادت کے لیے ایک موزوں ترین فرد ٹھہرائے ہوئے تھے۔ گو دیکھ سکنے والوں کے لیے (جوہر) اس لعن طعن کی دھول میں بھی چھپے نہیں رہ پائے تھے ۔۔۔ لیکن ۶۷ء کے حادثے نے انتہا پسند انقلابیت کا نشہ علمبردارانِ انقلاب سے دور کر دیا۔ اندرونی تناؤ اور لاگ ڈانٹ کی فضا ختم ہوئی۔ اور عرب دنیا ناسازگار حالات کی جس دلدل میں پھنس گئی تھی وہاں سے نکل سکنے کے لیے سب عرب طاقتوں کے باہمی تعاون کی ضرورت ایک واجب التسلیم حقیقت بن گئی، اور ہر عرب طاقت کو اس کا کھلا موقع فراہم ہوا کہ حالات کی اس آخری درجہ کی ناسازگاری سے عہدہ برآ ہونے اور ذلت کے داغ کو دھونے کے بدلے لینے کی مہم میں اپنی صلاحیت اور اہلیت کا مظاہرہ کرے، تو مرحوم شاہ کے وہ جوہر جو ابھی تک کام آنے کے لیے بیتاب تھے، ایک ایک کر کے کھلنا شروع ہوئے اور بہت تھوڑے سے عرصہ میں یہ جانا جانے لگا کہ عربوں کے موجودہ حالات میں اُن کی قیادت موجودہ لوگوں میں سے جس کے حصے میں آنا تھی اُس کی طرف کردہ چلنا شروع ہو گئی ہے۔

عربوں کو فوری نوعیت کی سب سے پہلی ضرورت سربراہوں کے دلی اتحاد کی تھی ۔۔۔ اُن

کے دلی اتحاد کی، جن کے دل ایک دوسرے کے ہاتھوں بری طرح زخمی، بری طرح پھٹے ہوئے یا شکایت و بدگمانی کے داغوں سے بھرے ہوئے تھے ـــــ یہ چیز کشادہ دلی چاہتی تھی، حلیمی اور بردباری کی طلبگار تھی، ماضی کو بالکل بھول جانے کا حوصلہ اس کے لیے درکار تھا۔ شاہ فیصل اس کشادہ دلی، حلیمی اور بلند حوصلگی کی عملی مثال بن کر ان سربراہوں کی مجلس میں آئے، وہ ان لوگوں سے عمر میں بھی اور اُن کی دستگیری کے سبب سے زیادہ سنجیدہ اور بے چین داعی بن کر کھڑے ہوئے جنھوں نے بار بار اُن کا ہمدردانہ ہاتھ ہی نہیں جھٹکا تھا بلکہ طرح طرح سے منہ بھی چڑھایا تھا۔ شرافت اور اخلاقی رفعت کے اس ایک چراغ نے سب چراغوں کو روشنی دیدی، اور سب کو حوصلہ مِلا کر ماضی کو یکسر بھول کر مستقبل کے لیے فکر و عمل کا باب شروع کیا جائے۔

اس اتحاد کی برقراری کے لیے ضروری تھا کہ نام پانے اور لیڈری چمکانے کا سودا کسی سر میں پرورش نہ پائے بلکہ ایسی بات کا خواہ مخواہ شبہ پیدا کرنے والی صورتوں سے بھی بچ کے رہا جائے... سیاست و قیادت کی دنیا میں یہ خانقاہی ریاضت کا سبق! اس پہ چلنا تو اب خانقاہوں میں بھی آسان نہیں رہا ہے! لیکن ـــ خدا بے پایاں رحمتیں اس شہید کی قبر پہ نازل کرے ـــ اس نے اس سخت ترین چڑھائی کو سر کرنے کا بھی حوصلہ عملی مثال سے ان ارباب سیاست میں پیدا کیا۔ اُس نے ۶۷ء کی جنگ میں تباہ ہو جانے والے تین ملکوں (مصر، شام اور اردن) کی اقتصادیات کا غیر معمولی بوجھ اپنی مملکت کے ذمے کر کے بھی کسی طرح کا نام یا خصوصی مقام اس کے صلے میں نہیں چاہا اور نہ کبھی اسے جتانے کا کوئی ڈھنگ اپنایا۔ بلکہ آج تک جاری رہنے والا یہ عمل مسلسل اسی طرح کیا جیسے کوئی سراسر فرض ادا کرتا اور اجر کی طمع صرف اس کی توفیق دینے والے سے رکھتا ہے۔

دوسری اہم وقتی ضرورت عرب محاذ کی یہ تھی کہ اُن کی جو تین ریاستیں (یعنی مصر، شام اور اردن) اسرائیل کے سامنے پڑتی ہیں اور کسی بھی عرب اسرائیل جنگ میں عرب دنیا کا دفاع انہی کی سرحدوں پر اُن ہی کے ذریعہ ہوتا ہے، ۶۷ء کی جنگ میں یہ تینوں بیک وقت جس بری طرح تباہی کا شکار ہو گئی ہیں اُس خستہ اور تباہ حالی سے انھیں نکالنے کے لیے غیر معمولی امداد بہم پہونچائی جائے، تو جیسا کہ ابھی ضمناً تذکرہ آیا اس امداد کا سب سے بڑا مالی بوجھ جس عرب ملک نے اُٹھانے کی پیش کش کی وہ شاہ فیصل ہی کا ملک سعودی عرب تھا۔ یہ پیش کش بلا تعیین مدت اُس وقت تک کے لیے کی گئی جب تک کہ یہ شکستہ حال مملکتیں اس کی ضرورتمند رہیں اور اس پہ عملدرآمد بھی بلا تاخیر نہایت کشادہ دلی کے ساتھ شروع کر دیا گیا۔ اور وہ آج بھی اس زعیمانہ کے ساتھ جاری ہے جیسے کہ خود سعودی عرب کی ضرورتوں پہ یہ صرف ہو رہا ہو۔

اس مالی امداد میں دوسری دولتمند عرب ریاستوں نے بھی اپنی استطاعت کے بقدر بے شک پورا حصہ لیا۔ مگر یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ ان میں بھی اتنی بھرپور کشادہ دلی اور پھر ایک غیر متعین مدت تک اس پر برقراری کا جو حوصلہ اور جذبہ پیدا کرنے میں مرحوم شاہ کے جوش اور جذبہ اور عمل کا بڑا دخل تھا۔ ورنہ جس خود غرضی کے زمانے میں ہم رہ رہے ہیں اُس میں برادرانہ خلوص اور جذبہ کی ایسی بلند پایہ مثالیں نصیب عام نہیں ہیں۔

یہ وہ ضروریات تھیں جو عربوں کو ۶۷ء کی ذلت کے گڑھے سے نکلنے کے عزم اور ارادہ کے بعد شرط اول کے طور پر درکار تھیں۔ لیکن ان کی فراہمی بے کار ہی ہوتی ۔ اگر اس عزم و ارادہ کو حرکت و عمل کا وہ راستہ ہاتھ نہ آتا جو کامیابی کی منزل تک پہونچا سکے اور وہ قیادت میسر نہ آتی جو راستہ کو ہموار کرنے کی صلاحیتوں سے آراستہ، اس کے پیچ و خم سے عہدہ برآ ہونے کے فن سے آگاہ، ذوقِ عمل سے سرشار، اُمید و اعتماد سے لبریز اور اس سب کے ساتھ تازہ دم بھی ہو! کہ سفر بہت طویل اور طرح طرح کی پیچیدگیوں سے بھرا ہوا تھا ـــــ کامیابی کے لیے شرط ٹھہرنے والی اس راہ عمل کی یافت اور اس کے لیے موزوں قیادت کی یہ ضرورت بھی عربوں کے لیے جہاں سے پوری ہو سکی وہ شاہ فیصل مرحوم ہی کی ذات تھی!

عربوں کو جس طرز عمل اور راہ عمل نے ۶۷ء کے گڑھے میں ڈالا تھا وہ "عصا بغیر کلیمی" کی راہ تھی۔ جنگ کی واقعی تیاری اور دشمن سے دو بدو ہونے کی ٹھوس اہلیت کچھ نہیں تھی لیکن بگل اتنے زور سے بجایا جا رہا تھا کہ جیسے کسی بات میں کوئی کسر نہیں رہی ہے۔ اسرائیل کو بھی میدان میں آنے کا چیلنج تھا، امریکہ کو بھی للکار تھی، بیچ بچاؤ والوں سے بھی ہٹ جانے کی ضد۔ لیکن سب کچھ ہوا پر، تمام تر نمائشی دم خم اور محض ایکٹنگ۔ سے رعب میں لے لینے کا بزعم خود غلط اعتماد!

اس قسم کی ایکٹنگ اور کھوکھلی رعب آزمائی کا یہ تجربہ اپنی سیاسی فراست و مہارت کے زعم میں اور بین الاقوامی حالات کی ایک خاص سازگاری و نوعیت کے بل پر، اتنے دنوں سے کیا جا رہا تھا۔ اور ان دونوں ہی باتوں (سیاسی فراست و مہارت اور بین الاقوامی حالات کی مساعدت) کے نتیجے میں کامیاب بھی ہوتا رہا تھا۔ کہ اس نے شاید ہمیشہ ہی کامیاب رہنے کے بزعم خود غلط اعتماد میں مبتلا کر دیا۔ حالانکہ یہ طریقے بہت ہی ناگزیر حالات میں وقتی کاروائی کے ہیں، مستقلاً انہی کو شعار بنا کر کوئی بڑے سے بڑا سیاست باز اور وقت شناس بھی اس بدانجامی سے نہیں بچ سکتا جو اس طرز عمل والی عرب قیادت اور اس کے طفیل پوری عرب دنیا کے حصہ میں آئی۔

۶۷ء کے تجربے سے یہ کام تو از خود ہی ہو گیا کہ اس چیختی چنگھاڑتی اور محض ہوائی فنکاری پر چلنے والی سیاست کا نام تک لینے کی اب کوئی ہمت نہ کرے۔ اور یہ حقیقت آخری حد تک روشن ہو گئی کہ عربوں

کو ایک باعزت زندگی کے لیے نہایت سنجیدہ، ٹھوس، حقیقت پسند، کم آواز اور زیادہ طاقت ساز پالیسی کی
ضرورت ہے۔ چنانچہ پچھلی سیاست کے خوگر اور بناکار بھی ہوش و حواس درست کرتے ہی اپنے آپ کو ضرورت
کے اسی نئے سانچے میں ڈھالنے لگے اور جو کچھ تگ و دو کا میدان اُن کے لیے رہ گیا تھا اُس میں اپنی مختصر
ذمہ داری کے تحت اپنے ذہن و فکر کے مطابق اسی نئے طرز پر انھوں نے کام شروع بھی کر دیا — یہ کام اور
اس کا میدان تھا روس کے ذریعہ اپنی جنگی طاقت کی بحالی اور اس میں ضروری اضافہ اور اقوام متحدہ میں
اپنے دوستوں کو امکان بھر اپنی حمایت اور وکالت کے لیے کھڑا کرنا۔

لیکن جو بھاری چٹان اسرائیلی جارحیت سے عربوں کے سینے پر آپڑی تھی اور جسے اپنے شرائط
منوائے بغیر ہٹنے نہ دینے پر نہ صرف اسرائیل اڑا ہوا تھا بلکہ امریکہ کی پوری پشت پناہی بھی اسے حاصل
تھی — اس چٹان کو اتنے کام اور اس کی پیدا کردہ طاقت سے ہٹا ہی نہیں اُٹھایا جا سکتا تھا، اس کے لیے بین الاقوامی
بساط پر ایک نئی حرکت سے ایک نئی طاقت فراہم کرنے کی ضرورت تھی جو بذات خود بھی اس کام میں مؤثر
ہو اور جو دوسرے راست اقدامات اپنے وسائل سے کیے جا سکتے ہوں اُن کے موقع پر یہ طاقت تحفظ کا وسیلہ
بن سکتی ہو۔

اس کام کو انجام دینے کی حیثیت میں، عربوں کے درمیان اگر کوئی شخص تھا تو وہ شاہ فیصل تھے۔
شاید اسی دن کے لیے بشارت الٰہی نے اُن سے تحریک تضامن اسلامی (اتحاد اسلامی) کی داغ بیل
۶۶ء ہی میں ڈلوادی تھی۔ اور وہ بہت ہی لگن کے ساتھ اس کام میں لگے ہوئے تھے، جس کا مقصد یہ تھا
کہ اسلامی ممالک جو مجموعی طور پر اتنے وسائل اور طاقت کے خام ذخائر کے مالک ہیں کہ دنیا کی ایک عظیم طاقت وہ
ان کے صحیح اور معیاری استعمال سے بن سکتے ہیں، اپنے ان وسائل و ذخائر کو ترقی دینے اور کام میں لانے کے لیے باہمی
امداد و تعاون کا ایک مضبوط اور برادرانہ نظام قائم کر کے اپنی اپنی انفرادی بہبود کا بھی سامان فراہم کریں اور
اسلامی دنیا کی مجموعی طاقت و بہبود اور عالمگیر سطح پر اُس کے اُس رول کی تجدید کا بھی ذریعہ بنیں جو اپنے
عقیدے کی رو سے اس کی ذمہ داری ہے۔

شاہ کی نظر میں، اسلامی تعلیمات کے تقاضوں سے مربوط یہ جد و جہد ہی عرب اور غیر عرب ہر
جگہ کے مسلمانوں کے ہر طرح کے مسائل کا حل تھی۔ اسلامی دنیا کے جو سربراہ مذہب کی اطاعت کا ذوق اور
رکھتے تھے وہ اس تحریک کی آواز سنتے ہی مذہبی گرمجوشی کے ساتھ اس کے ہمنوا ہو گئے۔ جن میں یہ ذوق تو
نہیں مگر ملی احساس بہر حال تھا یا کم از کم سیکولرزم کے اس خبط میں مبتلا نہیں تھے کہ مذہب اور مذہبیت
کو کسی بھی دنیوی سرگرمی کی بنیاد نہیں بنانا چاہیے، انھیں بھی یہ دعوت اپنے ملک اور اپنی وسیع تر ملت

عین مفاد میں نظر آئی اور مرحوم شاہ کو اُن کی حمایت و اعانت حاصل کرنے میں بھی کامیابی ہوئی۔ بدقسمتی سے صرف عرب دنیا ہی میں اپنے کو مسلمان کہنے والے ایسے بعض حکمراں رہ گئے تھے جو اسے ایک رجعت پسندانہ حرکت اور اپنی تحریک عرب اتحاد کے خلاف سامراجی اشاروں پر ایک سازش قرار دے رہے تھے۔ ۱۹۶۷ء کے پیدا کردہ حالات نے نہ صرف یہ کہ اپنوں کا یہ واحد مخالف مورچہ بھی توڑ دیا بلکہ انھیں یہ سمجھنے پر بھی آمادہ کر دیا کہ اس تحریک سے انھیں کچھ نہ کچھ سہارا ضرور ملے گا۔ چنانچہ ۱۹۶۹ء میں اُن لوگوں کی بھی شرکت کے ساتھ رباط میں پہلی مکمل اسلامی چوٹی کانفرنس منعقد ہوئی۔ اور اس طرح مرحوم شاہ کے لیے پوری طرح میدان کھلا کہ وہ بین الاقوامی بساط پر جس طاقت کی پوزیشن میں اسلامی دنیا کو کھڑا کرنا چاہتے تھے اُس کے لیے آزادی کے ساتھ سرگرم ہوں۔

اب تک وہ یہ ملی خدمت کے، اور خاص طور پر عربوں کی خدمت کے، سارے کام اپنے ذاتی احساسِ ذمہ داری کے ماتحت کر رہے تھے، مگر ۱۹۷۰ء میں صدر عبدالناصر کے انتقال کر جانے کے بعد اُن کی حیثیت عربوں کے درمیان قوم کے ایسے واحد آدمی کی بن گئی جس پر معاملات کی سربراہ کاری کا مدار تھا۔ کیونکہ اب اُن کے سے بین الاقوامی تجربہ اور قد و قامت کا کوئی دوسرا آدمی وہاں نہیں تھا اور بوجھ اُٹھانے کے اُن کے جذبے اور ہمت کا مشاہدہ سب کر رہے تھے۔ چنانچہ کسی رسمی قرارداد کے بغیر قوم کے عملی رویہ کی زبان نے قوم کی طرف سے بھی اُن پر یہ ذمہ داری عائد کر دی جو کسی کو بڑا اور سر دھرا مان لیے جانے سے عائد ہوتی ہے! ـــ اور رحمت خداوندی انھیں اب تک اپنی بارشوں سے نہال کرے کہ انھوں نے کوئی دقیقہ اپنی اس ذمہ داری کی ادائیگی میں فروگذاشت نہیں کیا۔ بلاشبہ اُن کے بھائی امیر نواف بن عبدالعزیز کے اس بیان میں مبالغہ کا ایک حرف بھی نہیں کہ

"ادھر چند سال سے انھیں دنیا میں کوئی دلچسپی بجز اس کے نہیں رہ گئی تھی کہ زیادہ سے زیادہ کام کریں اور زیادہ سے زیادہ ہی اپنے رب کی یاد و عبادت!"

حکمت و تدبر، توازنِ طبع اور پُر امیدی و استقامت کے اعلیٰ فکری و اخلاقی اوصاف کے ساتھ یہ انتھک محنت اور لگن ہی تھی جس نے گنتی کے چند سال کے اندر اسلامی دنیا ــ "نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر" کی شیرازہ بندی کا کام اس ایک شخص کے ہاتھوں اس منزل تک پہونچا دیا جو فروری ۱۹۷۴ء کی لاہور اسلامی کانفرنس کے آئینہ میں دنیا کے سامنے آئی، غیروں سے اسلامی دنیا کو ایک زندہ حقیقت منوا لینے والی اور اپنوں کو "قم باذن اللہ" کا پیام دے جانے والی چیز تھی! ـــــ وہ چیز جس کی تمنا میں اسلامی دنیا کی کتنی نسلیں اس دنیا سے گزر گئیں اور ملت کی کتنی بلند قامت ہستیاں اس کی خاطر جانفشانی میں ایک ایک رگ نچوڑ کر بھی داغِ حسرت لیے ہوئے چلی گئیں!

اس طرح اس مردِ خدا اور خود آگاہ نے بین الاقوامی بساط پر عربوں کے جادوگرانہ اور طلسم بندانہ وقار و اعتبار کی ہوا، ایک ٹھوس حقیقت سے ٹکرا کر ایک دم اکھڑ جانے اور ایک بھیانک خلا پیدا ہو جانے کے بعد، معجزانہ تیزی کے ساتھ ایک ٹھوس طاقت اسی بساط پر کھڑی کر کے ایک بہترین بدل اس خلا کو دے دیا ــــ اور پھر اپنے خدا کے بھروسے اور اس کی دی ہوئی فراست و بصیرت اور وقت شناسی اور اپنے کی اہلیت پر اعتماد کے بعد ظاہری اسباب میں یہی وہ ٹھوس طاقت تھی جس میں پوشیدہ تحفظ کی طاقت پر تکیہ کر کے، اسرائیل نواز طاقتوں پر عرب پٹرول بند کر دینے کے راست اقدام کا وہ منصوبہ مرحوم شاہ نے بنایا جس کے نفاذ نے اس سرے سے اُس سرے تک بشمول امریکہ اُن تمام ملکوں کو سر کے بل جھکا دیا جو عربوں کے سامنے جھکنے سے زیادہ کمزوری کی بات شاید ہی کسی اور بات کو سمجھتے ہوں! ــــ اسرائیلی جارحیت کی چٹان سے دبے ہوئے عربوں کی بے بسی کا تماشہ دیکھنے والے اور اُن سے ہار منوا لینے کے لیے اسرائیل کو شہ پر شہ دینے والے امریکہ کے وزیر خارجہ کے پاؤں میں "ایک مستقل چکر" اس جھٹکے کے بعد، اس نیک مقصد کے لیے پیدا ہو گیا کہ اسرائیل عربوں کی چھاتی سے ہٹے اور ہار منوا لینے کی بات بھول جائے۔

حالات کا یہ انقلاب اور ایک ٹھوس بنیاد پر اُبھرنے والا یہ دیدنی وقار و اعتبار، عربوں اور پوری ملت اسلامیہ کو شاہ کے قومی و ملی خلوص اور فراوانی آشنایت و تاب کا وہ تحفہ تھا کہ اس جیسے کا ابھی وہ بہت دور تک خواب بھی نہیں دیکھ رہے تھے۔

لیکن ابھی دلوں میں شکر گزاری کا جوش کم نہ ہوا تھا، زبانیں اظہارِ جذبات و احساسات سے سیر نہ تھیں، نظروں میں عقیدت و عظمت کا عالم جوں کا توں بنا ہوا تھا۔ یہ "مردے از غیب بروں آید" کا مصداق حکیمانہ اور مجاہدانہ و مصلحانہ قیادت کے بعد شہادت کا بھی اعزاز لے کر ۱۳ ربیع الاول م ۲۵ مارچ ۷۵ء کو اپنی اصلی دنیا میں لوٹ گیا ــــ اور ابھی جو اور بہت کچھ اُس کے چھیڑے ہوئے کام کی تکمیل کے سلسلے میں اُسی کے ہاتھوں دیکھنے کی اُمید دل و نگاہ کا سرور بنی ہوئی تھی غم کی تصویر بن کے رہ گئی ہے۔

شاہ فیصل مرحوم کا کارنامہ صرف یہی نہیں ہے جس کا تذکرہ اوپر کی سطروں میں ہوا۔ یعنی سیاسی سطح پر مدت سے بکھری ہوئی ملت کی شیرازہ بندی، عمومی طور سے اس کے منہدم وقار کی تعمیر نو اور خصوصی طور پر عربوں کو ایک نئی طاقت و ہمت کی فراہمی! بلکہ اسی کے برابر کا ــــ اور دینی نقطۂ نظر سے اس سے بھی بڑھا ہوا ــــ اُن کا دوسرا کارنامہ یہ بھی ہے کہ سیاست کی مذہب ناآشنائی و بیگانگی کے اس دور میں،

نہ صرف مذہب کی اذان اپنی ... بلکہ اُسے مسلم سیاست کا امام بنا دیا ـــــــ انھوں نے ا
وقت میں جبکہ سیاست کی مذہب ... بلکہ سیاست کی مذہب کُشی کا سب سے زیادہ سرگرم اور
سب سے زیادہ بلند آہنگ مرکز خود خطۂ عرب بنا ہوا تھا، اسلامیت کو پیچھے ڈال کر اکیلی وطن و سلا
میں سمجھ کر عرب قومیت کو عربوں کا کلمہ بنا لیا اور اسے احد ارتقا و محور حیات و ممات بنانے کی وہ مہم
کوشش کی جارہی تھی کہ اس سیاق میں اسلام کا نام لینا کسی صاحب اقتدار کے لیے بھی اپنی عز
وآبرو کو داؤں پر لگانے سے کم نہ تھا، عین اسی دور میں مرحوم نے صاف صاف اسلامی وحدت کی
دعوت انگیز تحریک "تضامن اسلامی" کا آغاز کیا اور طعنہ زنی و تمسخر کی تمام گرد کو مضبوط ارا
اور عزیمت سے سہا ـــــــ پھر وہ وقت آیا کہ عرب قومیت کی اسلام دشمنی کا وبال ۶۷ء کی ہزیمت
شکل میں قصور وار اور بے قصور سب عربوں کے سر پر آیا اور مسلمانوں کا قبلہ اول بیت المقدس
یہودیوں کے قبضے میں چلا گیا ـــــــ اس ہزیمت نے "عرب قومیت" کی علمبردار قیادت کا تمام طلسم
دیا اور عرب قومیت و اشتراکیت جیسے بتوں کی "کارسازی" خود ان پرستوں اور پرستاروں کی نظر میں
بہت کچھ مشکوک ہو گئی تو اسلام اور اس کے نام لیواؤں کو بھی اس بازی کو پلٹنے اور اسرائیل اور
حامیوں سے نپٹنے کی صلاح و مشورت اور تدبیر و عمل میں شریک ہونے کی راہ ملی اور اُن کے
کارزار شاہ فیصل کی اب کچھ قدر و ... اُن لوگوں پر کھلی جو انھیں بے قدر کرتے رہے ہیں پر اب تک تلے رہے

یہ موقع نفسیاتی طور پر بڑا نازک تھا۔ شاہ کو اگر سچے ایمان اور مضبوط عقیدے کی دو
حاصل نہ ہوتی اور کچھ بھی سیاست گری اُن کی تحریک اتحاد اسلامی کے پیچھے ہوتی تو وہ عرب سیا
میں دوسرا سب سے اونچی جگہ آسانی سے پا لینے کی نفسانی ترغیب پر، جس کے واضح امکانات حا
نقشے میں موجود تھے اور جو بالآخر اُن ہی کو ملی بھی، ان "بت پرستوں" کی رعایت سے اپنی اسلا
کچھ دھیما کر دینے اور کچھ کچھ ان کی بھی زبان اختیار کر لینے کی طرف مائل ہو سکتے تھے۔ مگر یقیناً وہ صد
اور صادق الایمان تھے کہ خدا نے اس نازک موقع پر اُن کی حفاظت کی۔ اور "جماعت کی آستینوں
"بت" چھپے ہوئے تھے! وہ بہر حال صاحب ایمان نے

مجھے ہے حکم اذاں لا الٰہ الا اللہ

پر نظر کرتے ہوئے اپنے اسلام کی آواز کو نئی گنجائشوں کے مطابق پہلے سے بھی کچھ بلند و
نے کہا اور بے دریغ فرمایا کہ بیت المقدس کا مسئلہ اصلاً عرب مسئلہ نہیں ہے بلکہ اسلامی مسئلہ
بازیافت ایک مسلمان کی حیثیت سے چاہتے ہیں۔ اسی حیثیت سے اس کے لیے ہم پُر عزم ہیں اور

سے بے چین رہے ہیں گے۔ یہی بات انھوں نے مسلمانوں کے مجموں میں کہی اور یہی غیروں سے گفتگوؤں میں۔ امریکی وزیر خارجہ کسنجر تک سے انھوں نے یہی کہا کہ وہ بیت المقدس کی بازیافت کے سلسلے میں اس لیے زیادہ صبر نہیں کر سکتے کہ اُن کی عمر کا پیمانہ لبریز ہو رہا ہے اور وہ دو سجدے اس آنے والے وقت سے پہلے بیت المقدس کی آزاد سرزمین پر ادا کرنا چاہتے ہیں۔

اور صرف بیت المقدس کے مسئلے ہی تک نہیں بلکہ پورے عرب اسرائیل مسئلے کو انھوں نے معقولیت کی آخری حد تک عرب مسئلے کے ساتھ ساتھ عین اسلامی ذہن و مزاج کے مطابق مسلمانوں کی آفاقی برادری کا بھی مسئلہ بنانے میں کوئی کمزوری اور کوتاہی نہیں دکھائی۔ ۶۹ء کی رباط کانفرنس جو اس زمانہ میں عالمی پیمانہ پر مسلم ممالک کے سربراہوں کا پہلا عالمی اجتماع تھی صاف صاف عرب اسرائیل مسئلہ پر ہی بلائی ہوئی تھی۔ اور یہ اس زمانے کے اسی مجذوب کا کام تھا! ___ اور اتنا مضبوط و مبارک بھی کہ چار سال بعد لاہور کانفرنس کی صورت میں اس کی مضبوطی و بابرکتی کا ظہور کَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ (گویا کہ ایک مبارک درخت ہو جس کی جڑ زمین میں دور تک اور شاخیں آسمان سے مل رہی ہیں۔ قرآن) کا سماں باندھ گیا۔

مسلمانوں کی بین الاقوامی سطح پر اُن کی سیاست کو اس سے زیادہ مذہب آمیزی تک پہونچا دینے کے لیے ظاہر ہے کہ ایک لمبے وقت کی کوششیں درکار تھیں، مدتوں کی مذہب گریزی کی عادت اور بالکل مختلف سانچے میں ڈھل جانے والی طبیعت آزاد ہو جانے پر بھی مدتوں ہی اور بڑی حکیمانہ تدبیروں سے بدل سکتی تھی۔ مرحوم شاہ نے اذان دی، دروازوں پر جا جا کے دستک دی، مسجد میں بلا بلا کے بے نمازیوں کو بلوالیا اور اتنی دیر کے بعد عالمی مسلم سیاست بہرحال اپنے مذہب کی اقتدار میں آ گئی! ___ اسلام کا یہ مرد حکیم و جلیل اگر کچھ اور زندہ رہ جاتا تو اُس کے خلوص و حکمت اور لگن کے چاروں طرف پھیلے ہوئے کرشمے دیکھ کر دل کہتا ہے کہ عرب اسرائیل معرکہ کی طرح اس کام کو بھی وہ بہت امید افزا حد تک آگے بڑھا جاتا مگر اللہ کی مرضی کہ اس مرد با خدمت و سعادت کا وقت اُس نے عطا نہیں کیا۔ یفعل اللہ ما یشاء و یحکم ما یرید۔

عالمی مسلم سیاست کو اسلامیت کی راہ پر لگانے کی ان مومنانہ اور حکیمانہ کوششوں کے ساتھ اپنے حدود اقتدار میں اسلامی ذہن و مزاج کو ترجیح دینے اور منصب حکومت کے اسلامی تقاضوں پر گامزن ہونے کی ذمہ داری کو ادا کرنے میں مرحوم نے جو مثال قائم کی وہ بھی کوئی کم درجہ کی بات نہیں ہے! بلکہ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جیسے جیسے عالمی مسلم سیاست میں مرحوم کی حیثیت پختہ ہوتی گئی اور بڑھی، جیسے اسی کے ساتھ اُنکی بین الاقوامی اہمیت بھی بڑھتی گئی ویسے ویسے وہ اپنے حدود اقتدار سے متعلق اپنی دینی ذمہ داریوں کے احساس میں

ترقی ہی کرتے گئے، تو یہ دیکھ کر دین سے اہل سیاست کی عام بے زاریوں کے اس دور میں اُن کی اور اُن کی اس روش کی قدر و منزلت الفاظ و بیان سے ماورا نظر آنے لگتی ہے۔ اپنے اس آخری دور میں کہ اُن کی سیاسی عظمت و اہمیت نصف النہار کی بلندی تک پہونچ چکی تھی وہ اپنی مملکت کے حدود میں ایک شاہ و فرمانروا سے زیادہ ایک داعی و مصلح کا کردار ادا کرنے لگے تھے۔ باہر تقریریں اور گفتگوئیں کرنے میں وہ بہت سی مصلحتوں کی بنا پر محتاط تھے۔ مگر اپنی مملکت میں اس احتیاط کی ضرورت بھی نہیں تھی، مختلف ذمہ داریاں تقاضہ بھی کرتی تھیں اور مملکت کی قدیم دینی اور جدید سیاسی و اجتماعی مرکزیت کی بنا پر مواقع بھی بہت پیدا ہوتے تھے۔ ایسے تمام ہی مواقع پر اُن کے عمومی خطابات اور گفتگوؤں کا رنگ خالص دینی و ملی وعظ کا نظر آتا تھا جو داعیانہ سادگی اور ایمان و اخلاص سے بھرپور ہوتا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر مبنی بہت سے قوانین اور اُن کے لیے ضروری ادارے جو مملکت میں پہلے سے موجود تھے اپنے زمانہ کے نئے منکرات کے انسداد کے لیے مرحوم نے ان پر ضروری قوانین اور انتظامات کا اضافہ بھی کیا اور مصلحانہ تلقین سے سوسائٹی کا ضمیر بھی ان چیزوں کے خلاف بیدار کرنے کی کوشش کو پیش نظر رکھا۔ — کاش اس کی کچھ مثالیں دینے کی یہاں گنجائش ہوتی۔ انشاء اللہ آئندہ اشاعت میں اس سلسلے کی ایک اہم چیز آئیگی۔

جتنی بھی دعائیں ملت اسلام اپنے اس یکتا و یگانہ فرزند کو دے کم ہیں۔ اس کی صحیح جانشینی موجودہ لوگوں میں سے کسی کے حصے میں آئے گی یا نہیں؟ اور آئے گی تو کب آئے گی؟ اسے خدا ہی جانتا ہے۔ اور کم از کم ہم جیسے لوگوں کے کرنے کا اس سلسلہ میں دعا کے علاوہ کوئی کام بھی نہیں — لیکن اس مثالی شخصیت کی زندگی میں کچھ پہلو ایسے بھی ہیں جن سے سبق لیکر ہم اپنے دائرہ استطاعت میں اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کے کاموں میں ایسی ہی توانائی اور ترقی کا رنگ خدا چاہے تو بھر سکتے ہیں جیسی ترقی و توانائی اور مقبولیت اللہ نے مرحوم کی کوششوں کو عطا کی تھی۔

مرحوم کی جو خصوصیت ہر دائرہ کے کارکنوں اور قائدوں کے لیے سب سے اوّل سبق لینے کی ہے، وہ اُن کے یہ مخلصانہ اطوار ہیں کہ کام سب سے زیادہ کیا جائے، بوجھ سب سے زیادہ اُٹھایا جائے مگر اپنا نام بالکل اوپر اُٹھانے کی کوشش نہ ہو! — اپنی اہمیت اور خصوصی افادیت خواہ دوسروں کی نظر میں بھی ایک مسلّم حقیقت دکھائی دے رہی ہو مگر زبان تو زبان اپنے کسی انداز سے بھی اس کے اظہار کا شائبہ نہ آنے دیا جائے — اور تحسین و اعتراف سے ایسی بے نیازی ہو جیسے کوئی کام ہی نہیں کیا!

غور کیا جائے تو یہ بالکل واقعہ نظر آئے گا کہ اس حسد و منافست اور تنگ دلی اور خوردہ بینی کے دور میں جہاں معمولی درجہ کا کام کرنے والا بھی ... دل بھی شک و شبہ اور منافست کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

(باقی صفحہ ۱۹۷ پر)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اٰمِنُوْا !

اِيمان و اِصلاح کی دعوت

مولانا محمد منظور نعمانی

ہم مسلمانوں کی مثال

فرض کیجئے اگر کوئی شخص سائل بن کر آپکے پاس اس حال میں آئے کہ مسلسل فاقوں سے اس کا پیٹ کمر سے لگ رہا ہو جسم سوکھا جا رہا ہو بھوک اور تشنگی سے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوں اور کپڑے بھی پھٹے پرانے میلے کچیلے ہوں اور پاؤں بھی جوتوں سے ننگے ہوں —— اور آپ کو اس کا علم ہو کہ اس کا باپ فلاں شخص تھا۔ ایک بڑے اچھے نفع بخش کارخانے کا مالک تھا، اس کی آمدنی سے خود بھی عیش و راحت کی اور باعزت زندگی گزارتا تھا اور بہت سے غریبوں محتاجوں کی مدد بھی کیا کرتا تھا۔ اور آپ یہ بھی جانتے ہوں کہ اپنا کارخانہ صحیح سالم چھوڑ کے وہ اس دنیا سے گیا ہے اور اس کا یہ بیٹا ہی اس کا تنہا وارث و مالک ہے —— اور وہ خود بھی آپ سے اس کا اقرار کرے اور بتلائے کہ ہاں میں اسی باپ کا بیٹا ہوں اور بیشک میرے اس باپ کا وہ کارخانہ اب بھی موجود ہے لیکن مجھے اس سے چونکہ دلچسپی نہیں ہے اور اس کے چلانے میں جو محنت اور زحمت اٹھانی پڑتی ہے وہ میرے بس کی نہیں ہے اس لیے والد کے مرنے کے بعد سے وہ بند پڑا ہے اور آمدنی کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے۔ والد صاحب جو کچھ چھوڑ کے گئے تھے کچھ دنوں تک وہ کھایا اس کے بعد گھر کا اثاثہ بیچ بیچ کے کھایا، یہاں تک کہ تن کے کپڑے بھی بیچ ڈالے اب جب بیچنے کے لیے بھی کچھ نہیں رہ گیا ہے تو میں کئی وقت کے فاقوں کے بعد سائل بنکر آپ کے پاس آیا ہوں۔ آپ اللہ کے واسطے میری کچھ مدد کریں! تو ذرا سوچئے کہ اس شخص کی یہ حالت دیکھ کر اور اس کی یہ باتیں سنکر آپ کے دل کا تاثر اور آپ کا جواب کیا ہوگا؟ —— ظاہر ہے کہ اگر وہ دماغ کا بیمار اور پاگل نہیں ہے تو آپ اسے انتہائی درجہ کا غلط کار قرار دیں گے اور اس کی سب سے بڑی خدمت اور مدد یہی سمجھیں گے کہ اگر وہ سمجھ سکے تو کسی طرح سمجھا بجھا کے اس کو اس پر آمادہ کریں کہ وہ اپنے باپ کے اس کارخانہ کو جس کا وہ خود وارث اور مالک ہے چلائے اور اس کے ذریعہ سے اپنے

باپ کی طرح آرام و عزت کی زندگی گزارے۔

بلاشبہ یہ ایک فرضی ——— بالکل فرضی مثال ہے، لیکن غور کیجئے کیا مسلمان کہلانے والی امت یا قوم کا مسئلہ اس وقت ہو بہو بالکل یہی نہیں ہے؟ ——— ہمارے اسلاف اولین نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعوت پر ایمان لاکر ایمانی زندگی کو اپنایا تھا جس کے متعلق دنیا و آخرت وما فیہما کے خالق و مالک کا فیصلہ اور وعدہ تھا کہ جو قوم اس کو اپنائے گی وہ دونوں زندگیوں میں سربلند و سرفراز کی جائے گی، ہم اس کے والی اور حامی ہوں گے وہ ہمیشہ کامیاب اور غالب رہے گی ——— چنانچہ اس خداوندی فیصلہ اور وعدہ کے مطابق ہمارے ان اسلاف کو یہ سب چیزیں حاصل ہوئیں اور اس درجہ میں حاصل ہوئیں کہ صدیوں تک ان کی ناخلف نسلوں اور ان نام لیواؤں نے بھی ان کی بچی کھچی برکات سے فائدہ اٹھایا جنھوں نے ایمان اور ایمانی زندگی کو ان کی طرح نہیں اپنایا تھا ——— لیکن بالآخر ایک وقت آیا کہ اگلے بزرگوں کی وہ کمائی اور ان کا وہ اندوختہ ختم ہوا اور اس کے بعد ان کے نام لیوا جو ان کے طریقہ پر نہ ہونے کے باوجود صرف زبانی جمع خرچ یا نسلی تعلق کی بنا پر اپنے کو ان کا خلف اور وارث سمجھتے ہیں ——— ذلت اور پستی کے اس گڑھے میں جا پہنچے جہاں آج وہ پڑے نظر آرہے ہیں، اب ان کا حال زار یہ ہے کہ اپنی روزی اور معاش اور عزت و آبرو بلکہ اپنی زندگی اور بقا کو بھی اب وہ دوسرے اپنے ہم جنسوں کی نگاہِ کرم سے وابستہ سمجھتے ہیں اور اس لیے اب وہ ان میں سے ہر چیز کے لیے سائلانہ نظروں سے دوسروں ہی کی طرف دیکھتے ہیں ——— آہ "ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ" کا یہ کیسا دردناک منظر ہے۔

حالانکہ کم از کم ماننے اور اقرار کرنے کے درجہ میں آج کے ان خستہ و شکستہ نام کے مسلمانوں کے پاس بھی ایمان اور ایمانی زندگی کا وہ نسخہ بجمیع اجزائہ موجود ہے جس کو صحیح طریقہ پر اور پورے طور سے استعمال کر کے ان کے اسلاف نے اللہ کی خاص مدد اور سرپرستی اور اس کے نتیجہ میں "تسخیر کائنات" کی طاقت حاصل کرلی تھی۔

پس جو لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں اور ایمانی زندگی میں اللہ کی رکھی ہوئی اس تسخیری طاقت پر اب بھی ایمان رکھتے ہیں، ان کی نظروں میں مسلمانوں کی موجودہ ذلت و پستی اوپر کی فرضی مثال والے پریشان حال سائل کی طرح خود ان کی مجرمانہ غلط کاری کا نتیجہ ہے اور اسی طرح ان کی بھی سب سے بڑی خدمت اور مدد یہی ہے کہ کسی طرح انھیں یہ سمجھا دیا جائے اور اس پر آمادہ کر دیا جائے کہ ایمان اور ایمانی زندگی کو پھر سے اپنے اندر پیدا کریں اور اپنے اسلاف کی جس پاک اور بلند زندگی پر وہ فخر کرتے ہیں اس کو

بھرے اپنائیں ــــ یعنی خواہشات کی پیروی کے بجائے اللہ کی عبدیت اور بندگی والی زندگی اختیار کریں، اس فانی دنیا کے بجائے کبھی نہ فنا ہونے والی آخرتی زندگی کی کامیابی کو اصل مقصدِ حیات بنائیں اور ان کے اسلاف نے جس طرح اللہ کے لیے مٹ جانے کو زندگی کی غایت و نہایت سمجھا تھا اسی طرح وہ بھی سمجھیں ــــ مسلمانوں کے لیے بس یہی ہے تسخیرِ کائنات کی کنجی اور اس کا نام ہے ایمانی و اسلامی زندگی، جس کے متعلق اللہ کا فیصلہ اور وعدہ ہے۔

وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ــــ وَكَانَ حَقًّا عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ

یہی ہمارا فلسفہ ہے اور یہی ہماری تاریخ ہے۔ (الفرقان صفر ۱۳۷۲ھ)

مولانا محمد منظور نعمانی

اسلام کے تین بنیادی عقیدے

اور

موجودہ مسلمان قوم

["کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ دین کی امانت کے امین اپنا فرض ادا کریں، کیا ہم عذاب اور غضب الٰہی کی آخری صورتوں کے منتظر ہیں؟"]

اسلام میں تین عقیدوں کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، مطلب یہ ہے کہ ان تین عقیدوں پر ایمان و یقین جتنا گہرا اور حقیقی ہوگا عملی زندگی اتنی ہی اسلامی تعلیمات اور ہدایات کے مطابق ہوگی اور جس قدر یہ یقین کمزور اور ڈھیلا ہوگا زندگی اسلامی معیار سے اسی قدر پست ہوگی ـــــ ان ہی عقیدوں کو امہات العقائد یعنی بنیادی عقیدے کہتے ہیں۔

(۱) ان میں پہلا عقیدہ یہ ہے کہ اس ساری کائنات کا ایک خالق و مالک ہے وہی اس کے پورے نظام کو چلا رہا ہے اور وہی ہمارا پروردگار اور پالنہار ہے یعنی در اصل وہی ہماری زندگی کی ساری ضرورتیں مہیا کرنے والا ہے اور ہر ایک کا بناؤ بگاڑ اور نفع نقصان سب اسی کے ہاتھ میں ہے اور ہم سب اسی کے بندے ہیں اور ہمارا فرض ہے کہ اسی کی عبادت کریں اور پوری زندگی اس کی بندگی اور فرمانبرداری میں گزاریں۔

(۲) اسلام کا دوسرا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ اس زمینی زندگی کے خاتمہ کے بعد ایک اور زندگی آنے والی ہے جس میں ہر ایک کو یہاں کی برائی بھلائی کا بدلہ ملے گا اور وہ زندگی چونکہ دائمی اور ابدی ہوگی جس کا خاتمہ نہ ہوگا اس لیے وہ اس دنیوی زندگی سے زیادہ فکر کے قابل ہے اور وہاں فلاح و نجات صرف وہی لوگ حاصل کر سکیں گے جو اس دنیا میں اپنے

خالق و مالک کی مرضی کے تحت اور اس کے احکام کے مطابق زندگی گزار کے جائیں گے۔

(۳) تیسرا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ اس دنیا کے خالق اور پروردگار کی طرف سے وقتاً فوقتاً اس کی ہدایتیں اور اس کے احکام لے کر پیغمبر آتے رہے ہیں یہ سب اللہ کے مقدس بندے تھے اور ان کی تعلیمات و ہدایات دراصل اللہ کی تعلیمات و ہدایات تھیں اور اس لیے ہر قوم کے واسطے اپنے پیغمبر کی پیروی اور تابعداری ضروری تھی۔ اس سلسلہ کے آخری پیغمبر حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں جو اپنے زمانے کے اور بعد میں پیدا ہونے والے تمام انسانوں کے واسطے خدا کا پیغام اور اس کی ہدایات لائے۔ اب اس دنیا کے خاتمہ تک تمام انسانوں کے لیے ان کی لائی ہوئی خداوندی ہدایات واجب العمل ہیں اور اب کوئی شخص بھی ان کی اطاعت و پیروی کے بغیر اپنے خالق اور پروردگار کی رضامندی حاصل نہیں کر سکتا اور اس کی خاص رحمت و محبت کا مستحق نہیں ہو سکتا ؎

محال است سعدی کہ راہ صفا توان رفت جز در پئے مصطفےٰ

خلاف پیمبر کسے رہ گزید کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید

سب جانتے ہیں کہ یہ تین عقیدے اسلام کے بنیادی عقیدے ہیں بلکہ کسی شخص کے مومن و مسلم ہونے کے لیے تو ان کے علاوہ بھی چند اور حقیقتوں پر ایمان لانا ضروری ہوتا ہے لیکن بہرحال ان کا درجہ ان تین کے بعد ہی ہے اور اساسی و بنیادی حیثیت ان ہی کو حاصل ہے۔

ان تین بنیادی باتوں کو ان لینے اور ان پر ایمان لانے کے بعد چند باتیں آدمی پر آپ سے آپ لازم ہو جاتی ہیں گویا وہ ان کے لازمی اور منطقی نتائج ہیں ـــــ مثلاً یہ کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کی جائے ـــــ کسی منفعت کی امید اور کسی نقصان یا تکلیف کا خوف حقیقی طور پر اس کے سوا کسی سے نہ ہو ـــــ رب حقیقی اور الٰہ برحق ہونے کی حیثیت سے اس کے احکام کی تعمیل کی جائے اس کے حکموں کو ہر چیز سے بالاتر سمجھا جائے اور ہر دوسری چیز سے زیادہ اس کی رضاجوئی کی فکر کی جائے ـــــ اس کے مقابلہ میں کسی کو ترجیح نہ دی جائے۔

پہلے عقیدے (توحید) کے یہ سب لازمی نتائج ہیں۔

اسی طرح دوسرے عقیدے (حیات بعد الممات) کے لازم یہ ہوں گے کہ آخرت کی فکر سب دنیاوی فکروں پر غالب ہو گی ـــــ اپنے ہر عمل اور اقدام میں آدمی یہ خیال رکھے گا کہ اس کا انجام آخرت میں کیا ہو گا۔ عذاب ہو گا یا ثواب ـــــ اگر کوئی منفعت یا عزت اس دنیا میں ایسے

طریقے سے حاصل ہوتی ہوگی جس کا انجام آخرت میں عذاب ہو تو آخرت پر سچا ایمان و یقین رکھنے والا آدمی ہرگز اس کے حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے گا۔ اور ایسی منفعت و عزت سے اپنے کو دور رکھے گا۔

اسی طرح تیسرے عقیدے (رسالت) کے لازمی نتائج یہ ہوں گے کہ اُس پر ایمان رکھنے والا آدمی اللہ کے سارے پیغمبروں کو اس کے برگزیدہ بندے اور انسانیت کے سب سے بڑے محسن سمجھے گا ـــــ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دور کا پیغمبر اور آخری نبی سمجھتے ہوئے اپنی اور اس دور کے سارے انسانوں کی نجات و فلاح آپ پر ایمان لانے اور آپ کی پیروی ہی میں منحصر جانے گا ـــــ آپ کی لائی ہوئی شریعت اور آپ کے بتلائے ہوئے طریقہ زندگی کو اللہ کا الہام کیا ہوا دستور العمل جانتے ہوئے انسانی زندگی کے تمام دوسرے طریقوں اور ضابطوں سے بہتر اور صالح تر یقین کرے گا اور اپنے لیے اور ساری دنیا کے لیے اسی کو پسند کرے گا ــــ آپ کی اتباع اور آپ کی پیروی کو انسانیت کی سعادت اور آپ کی نافرمانی کو شقاوت و بدبختی سمجھے گا۔

اسلام کے ان تینوں بنیادی عقیدوں کے یہ سب ایسے لوازم ہیں جن کی لازمی حیثیت کو ہر سمجھدار آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔

پھر ہر ایک کے لیے یہ اندازہ کرنا بھی آسان ہے کہ ان تینوں عقیدوں پر اگر کسی کو پورا پورا ایمان اور کامل یقین ہو (جیسا کہ ہونا چاہیے) اور ان کے مذکورہ بالا لوازم و نتائج بھی ظاہر ہو جائیں (جن کا ظہور لازمی ہے) تو اس شخص کی سیرت کیسی ہوگی اور اس دنیا میں وہ زندگی کس طرح گزارے گا۔

ظاہر ہے کہ وہ اللہ کا مطیع اور فرمانبردار بندہ ہوگا اس کی عبادت اور بندگی کرے گا اس کے احکام پر چلے گا اسی سے ڈرے گا اور اسی سے امیدیں رکھے گا۔ اس کی مخلوق کا ہمدرد اور خیرخواہ ہوگا اور اس کا ہر کام خود غرضی اور تنگ نظری سے بالاتر ہوگا اور اللہ کی مخلوق کے لیے اس کا وجود سراسر رحمت ہوگا اسی طرح دنیا سے زیادہ وہ آخرت کا فکر کرے گا اور یہاں کی منفعتوں اور لذتوں کے لیے اپنے دوسرے ابنائے جنس سے جھگڑنے کے بجائے آخرت کی فلاح و بہبود اور جنت کی نعمتوں کے حصول کے لیے دوڑ دھوپ کو زندگی کا اصل مقصد سمجھے گا اور ہر کام کے دنیاوی نتیجوں سے زیادہ اس کی نظر اس کے اخروی نتائج یعنی عذاب و ثواب پر ہوگی اس لیے نہ تو وہ زیادہ دولتمند بننے کے لیے ناجائز طریقے اختیار کرے گا نہ کسی کا حق غصب کرے گا نہ ناحق کسی پر ظلم کرے گا۔

علی ہٰذا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونے پر حقیقی طور پر ایمان لانے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ زندگی کے ہر شعبہ میں اور ہر انفرادی و اجتماعی معاملہ میں آپ کی ہدایت و رہنمائی تلاش کرے گا اور اسی کی روشنی میں چلے گا اس کا طریقہ یہ نہ ہوگا کہ جو جی میں آیا یا جس کام میں اپنا یا اپنی پارٹی یا اپنی قوم کا یا اپنے ملک اور اپنی حکومت کا فائدہ نظر آیا وہ کر ڈالا بلکہ اس کا اصول یہ ہوگا کہ اللہ کے رسول نے ایسے موقع کے لیے اللہ کی طرف سے جو ہدایت اور تعلیم دی ہے وہ بس اسی کی پیروی کرے گا الغرض اس کا اصول نفس پرستی کے بجائے خدا پرستی اور احکام خداوندی کی بجا آوری اور نبوی ہدایات و تعلیمات کی پیروی کرنا ہوگا اور ہر معاملہ میں اس کی نظر مصلحتوں اور منفعتوں سے زیادہ اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اسوۂ حسنہ اور آپ کی ہدایتوں پر ہوگی۔

بہرحال مومن اگر سچا ہے اور اسلام کے ان تین بنیادی عقیدوں پر کامل اور حقیقی ایمان اس کو نصیب ہو چکا ہے تو یقیناً اور لازماً اس کی زندگی بالکل یہی ہوگی اور اس میں جتنی کمی اور کوتاہی ہوگی وہ بلاشبہ نتیجہ ہوگا ایمان و یقین ہی کی کمزوری کا۔

صحابہ کرام کی پوری جماعت کا امتیاز یہی ہے کہ دین کی ان تین بنیادی حقیقتوں پر ان کو ایسا ایمان و یقین نصیب ہو گیا تھا کہ زندگی کے تمام شعبے اور اس کی ساری جزئیات ان ہی عقیدوں کے زیر اثر آ گئی تھیں وہ ہر معاملہ کو خدا کی عبدیت، رسول کے اتباع اور اخروی انجام کے ماتحت سوچتے تھے اور ان کا کوئی فیصلہ ان تین عقیدوں سے آزاد یا غافل ہو کر نہیں ہوتا تھا وہ جس طرح نماز روزہ اور نکاح و طلاق جیسے معاملات میں اللہ و رسول کے احکام اور آخرت کے انجام کا فکر رکھتے تھے اسی طرح اپنے عام انفرادی اور اجتماعی معاملوں میں بھی اللہ و رسول کی ہدایت کا اتباع کرتے تھے اور یقین رکھتے تھے کہ اگر ہم نے ان معاملات میں اللہ و رسول کی مقرر کی ہوئی حدوں سے تجاوز کیا تو ہم اللہ کی لعنت و عذاب کے مستحق ہو جائیں گے اور خدانخواستہ جہنم ہمارا ٹھکانا ہوگا۔

پھر بعد کے زمانوں میں دینی لحاظ سے مسلمانوں میں جو انحطاط ہوتا رہا ہے اس کا اصلی سبب یہی ہوا کہ مختلف اسباب سے مسلمانوں کے اکثر طبقوں میں یہ بنیادی عقائد کچھ سست اور کمزور ہوتے گئے اور زندگی پر ان کی گرفت ڈھیلی ہوتی رہی، پھر جس طبقے میں یہ عقیدے جتنے کمزور ہوئے اس کی زندگی اسلامی معیار سے اتنی ہی پست اور خدا و رسول کے احکام سے اتنی ہی بے تعلق اور آخرت کی فکر سے اتنی ہی آزاد ہوتی گئی۔

اس وقت مسلمانوں کی جو یہ حالت ہے کہ ان کی بہت بڑی تعداد (قرآن کے الفاظ میں) "هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ أَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْإِيمَانِ" کی حالت میں ہے (یعنی وہ اپنے طرزِ زندگی کے لحاظ سے بہ نسبت ایمان و اسلام کے کفر سے زیادہ قریب ہیں) اس کا اصلی سبب صرف یہی ہے کہ یہ تین عقیدے (جو آدمی کی زندگی کو ایمانی اور نورانی بناتے ہیں) بے حد کمزور پڑ گئے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ لوگ مسلمان کہلانے کے باوجود اللہ کے ساتھ اپنی عبدیت کے تعلق کو اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے امتی اور پیرو ہونے کی اپنی حیثیت کو گویا بالکل فراموش کر چکے ہیں اور آخرت کے ثواب و عذاب سے یکسر غافل ہیں۔

ان بنیادی عقیدوں کی کمزوری اور زندگی میں ان کی بے اثری کے بارہ میں اس وقت مسلمانوں کی غالب اکثریت کا حال وہی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور قرآن کے نزول کے وقت اہلِ کتاب کا، خاص طور سے یہود کا تھا کہ وہ زبان سے ان عقیدوں کے اقراری تھے اللہ کو اپنا واحد الٰہ و رب مانتے تھے، حضرت موسیٰ کو خدا کا سچا رسول اور اپنے کو ان کا امتی کہتے تھے، تورات کو اللہ کی کتاب یقین کرتے تھے آخرت کی جزا و سزا کے بھی قائل تھے غرض ان میں سے کسی چیز کے بھی منکر نہ تھے مگر بات یہ تھی کہ ان کے یہ عقیدے بے حد کمزور ہو چکے تھے اور زندگی پر ان کا جو اثر ہونا چاہیے تھا وہ نہ تھا، خدا پرستی اور خدا کی بندگی پر عملاً غرض پرستی اور نفس و خواہشات کی بندگی غالب تھی، اپنے رسول کے احکام اور اللہ کی اتاری ہوئی کتاب کی ہدایات کے وہ پابند نہیں رہے تھے الغرض وہ غیر ایمانی زندگی تھی جس سے اللہ تعالیٰ سخت ناراض تھا آج غور کیجئے بالکل یہی حالت مسلمان قوم کی غالب اکثریت کی ہے مسلمانوں میں بہت تھوڑی تعداد ایسے بندگانِ خدا کی باقی ہے جن کو دینِ حق کے ان تین بنیادی عقیدوں پر ایسا ایمان و یقین ہو جو زندگی میں مؤثر ہو رہا ہو اور ان عقیدوں کے لوازم و نتائج ظاہر ہو رہے ہوں۔۔۔ آخری نبی کی آخری امت کی اکثریت کا اس حالت تک گر جانا اتنا بڑا حادثہ ہے اور ہم لوگوں پر اس کی اتنی بڑی ذمہ داری ہے کہ اگر اس کو سوچیں اور سمجھیں تو راتوں کو ہمیں آرام کی نیند نہ آئے اور کھانے پینے میں لذت محسوس نہ ہو، جس امت کو قیامت تک کے لیے نبوت و رسالت کی نیابت و نمائندگی کا منصب سپرد کیا گیا ہو خود اس کی اکثریت کا ایمان و یقین تک کی دولت سے محروم ہو جانا، خدا اور رسول کے احکام سے بے پروا اور آخرت کے انجام سے بے فکر ہو کر زندگی گزارنا اللہ کے غضب کو جتنا بھی بھڑکائے کم ہے کیا ابھی وقت نہیں آیا ہے کہ دین کی امانت کے امین اپنا فرض ادا کریں۔ کیا ہم عذابِ الٰہی اور غضبِ الٰہی کی آخری اور انتہائی صورتوں کے منتظر ہیں۔

(الفرقان بابت ربیع الثانی ۱۳۶۸ھ)
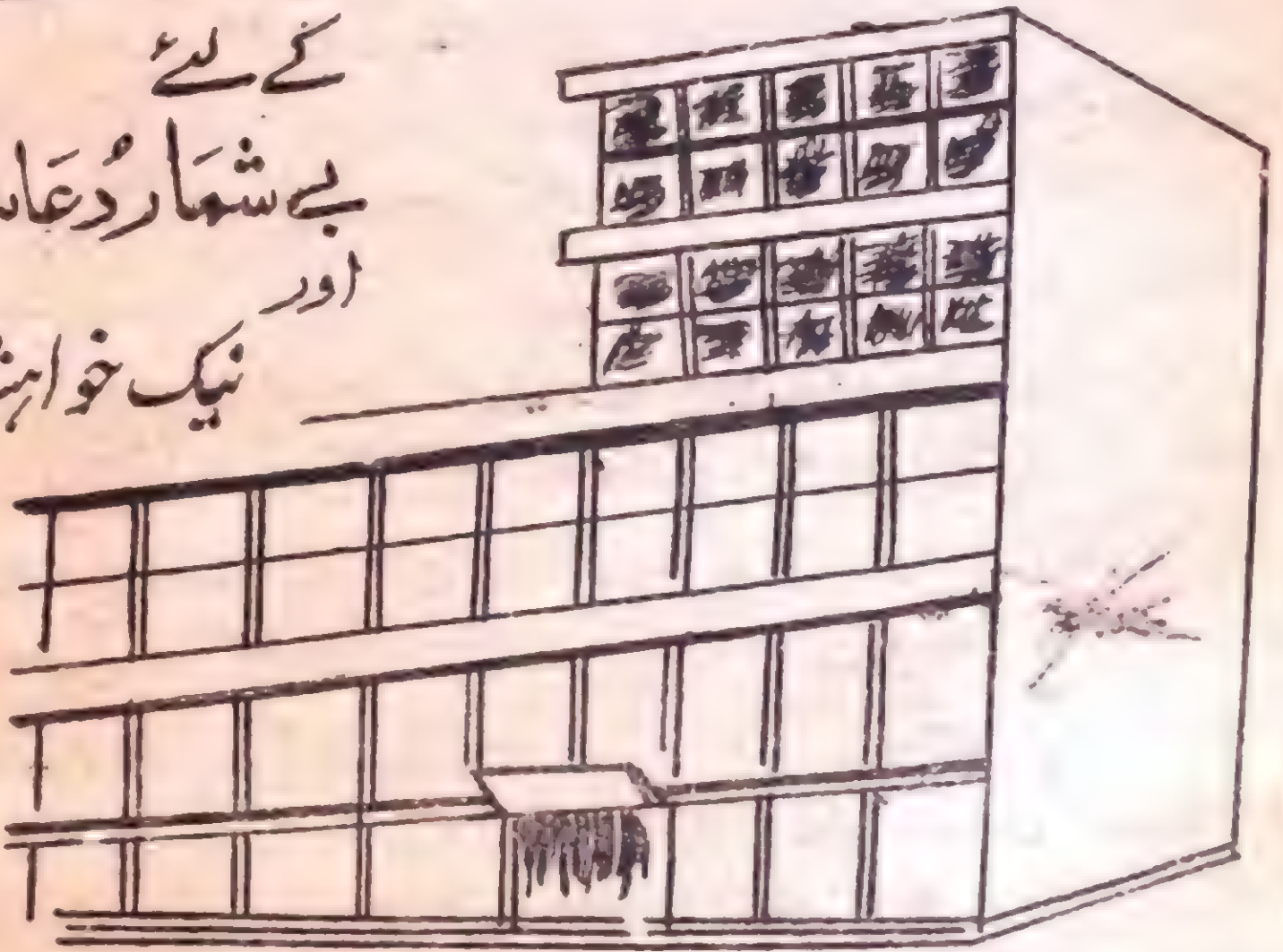
مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

ناموافق حالات میں اہلِ ایمان کا رویہ

اخلاق و سیرت کے اعتبار سے دنیا میں ہمیشہ دو قسم کے لوگ رہے ہیں، ایک وہ جن میں کسی عقیدہ، کسی اصول اور کسی صداقت پر زیادہ دیر تک قائم رہنے اور اس کے لئے کسی مخالفت اور کسی آزمائش کا مقابلہ کرنے کی بالکل طاقت نہیں ہوتی، وہ کسی عقیدہ و اصول پر اس وقت تک قائم رہ سکتے ہیں جب تک سارا ماحول اور ساری فضا اس کے لئے سازگار ہو، اور اس کو سوسائٹی کی تائید اور سرپرستی حاصل ہو، واقعات اس کی تصدیق و توثیق کر رہے ہوں، اس کے ماننے والوں کی مادی کامیابی اس کی صداقت پر مہرِ تصدیق لگا رہی ہوں، کوئی قابلِ التفات آواز اس کے خلاف نہ اٹھ رہی ہو۔ اس وقت اس عقیدہ پر ان کا اطمینانِ قلب بہت بڑھ جاتا ہے اور ان کی ذہانت اپنا پورا کام کرنے لگتی ہے، اور ہر طرف ان کو اس کی تائید ہی تائید نظر آتی ہے۔ لیکن جیسے ہی مطلع غبار آلود ہوتا ہے، زمانہ کے تیور بدلتے نظر آتے ہیں، ان کا سینہ تنگ اور ذہن کند ہونے لگتا ہے، قوتِ ارادی اور قوتِ عمل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جواب دینے لگی ہے، کان میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غیبی آواز آ رہی ہے، کہ ع "زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز" — اور ع . . . "چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی"۔

قرآن مجید میں اس صورتِ حال کی نہایت سچی اور بلیغ تصویر کھینچی گئی ہے —

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ۨ اطْمَاَنَّ بِهٖ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ۨ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ — (بعض آدمی اللہ کی بندگی ایسے طور پر کرتے ہیں جیسے کسی کنارہ پر کھڑے ہوں، اگر ان کو کوئی نفع پہونچتا ہے تو ان کو قرار رہتا ہے اور اگر کوئی آزمائش ہو جاتی ہے تو اپنے منھ کے رخ پر پلٹ جاتے ہیں۔)

دوسری قسم اُن لوگوں کی ہے کہ جب تک اُن کو نرم و ہموار راستہ ملتا رہتا ہے وہ دھیمی چال چلتے رہتے ہیں، انھیں کسی خاص عزم و جوش اور قوتِ ارادی کا احساس نہیں ہوتا، لیکن جیسے ہی ان کے راستہ میں رکاوٹیں آتی ہیں، ٹیلے اور چٹانیں اُن کو اپنے ارادہ سے باز رکھنا چاہتی ہیں، خار زار جھاڑیاں اُن کا دامن پکڑتی ہیں، سنگریزے اور پتھر ان کے پاؤں پڑتے ہیں، راستہ کی دلآویزیاں اُن کو پھسلاتی ہیں، اُن میں منزلِ مقصود کا عشق ترقی کرتا ہے، اپنے سفر کی تکمیل کا ارادہ جنون کو پہونچ جاتا ہے، اُن کی رفتار اور طاقت کہیں سے کہیں پہونچ جاتی ہے۔ ان کو نہ راستہ کی ناہمواری کا احساس رہتا ہے، نہ مسافت کی زیادتی کا، نہ اپنے تکان کا۔ میدانی ندی آہستہ آہستہ اور مزے مزے بہتی رہتی ہے، لیکن پہاڑی دریا کو جب کوئی مغرور چٹان یا ضدی پتھر اپنے ارادہ سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے، اور اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا ہے تو وہ جوش میں آکر آبشار کی صورت اختیار کر لیتا ہے، اپنی آواز سے کوہ و صحرا کو پُرشور بنا دیتا ہے اور اپنے زور میں چھوٹی چھوٹی چٹانوں کو بہا کر اور بڑے بڑے پتھروں کو گرا کر سُرمہ بنا دیتا ہے، اس وقت اُس کے جوش کے سامنے نہ ہاتھیوں کے پاؤں جم سکتے ہیں نہ پہلوانوں کے پنجے۔ یہی حال اہلِ یقین کا ہے کہ جب ان کو ہر طرف مزاحمتیں اور آزمائشیں نظر آتی ہیں تو ان کا اپنے عقیدہ پر ایمان، اپنے اصول کی صداقت کا یقین اور اس پر قائم رہنے کا جذبہ اور جوش بڑھ جاتا ہے۔ ہر رکاوٹ میں ان کو اپنے عقیدہ کی صحت کی دلیل اور ہر آزمائش میں ان کو اپنے مسلک کی صداقت کا تازہ ثبوت نظر آتا ہے کہ روزمرّہ کے واقعات، طبعی عادات اور نفس کی خواہشات سے عقائد و اصول کو جو چیز ممتاز کرتی ہے وہ اُن کے راستے کی مشکلات اور اس راہ کی آزمائشیں ہی ہیں، قیمت کی زیادتی اور سودے کی کمیابی اس کی بیش قیمتی اور مقبولیت کی دلیل ہے۔ أَلَا إِنَّ سِلْعَةَ اللّٰهِ غَالِيَةٌ أَلَا إِنَّ سِلْعَةَ اللّٰهِ الْجَنَّةُ —— (حدیث)
(یاد رکھو اللہ کا سودا بڑا قیمتی ہے، اللہ کا سودا جنت ہے)۔ اس سودے کی خریداری طبعی ناگواریوں کے بغیر ممکن نہیں —— حُفَّتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ وَحُفَّتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ —
(جنت ان تمام چیزوں سے گھری ہوئی ہے جو نفس کو ناگوار ہیں، اور جہنم ان تمام چیزوں سے گھری ہوئی ہے جو نفسانی و طبعی طور پر نہایت خوش گوار ہیں)۔

اسی لئے جب رکاوٹوں، دشمنوں اور وقت کی آزمائشوں میں لوگوں کے لئے تذبذب و تردّد کا سامان ہوتا ہے، اہلِ یقین کے لئے یقین کی ترقی اور اطمینان کی زیادتی کا سامان ہوتا ہے، موجوں کے تھپیڑوں سے وہ سمجھتے ہیں کہ جہاز سمندر میں آچکا ہے اور اپنے سفر پر روانہ ہے۔ گودی میں

لگے ہوئے اور خشکی پر کھڑے ہوئے جہاز کے لئے کیسی موج اور کہاں کا تلاطم؟ مرزا صاحب اس لئے وہ سمجھتے ہیں کہ اب ہماری دعوت اور ہمارے عقیدے نے اپنا طبعی سفر شروع کر دیا ہے اور یہ جو کچھ پیش آ رہا ہے اس کی قدرتی منزلیں ہیں۔ قافلہ اگر صحیح سمت کی طرف روانہ ہوا ہے تو اس کو راستہ کی وہ سب منزلیں اور مقامات ملیں گے جو واقف کار رہنما نے بتلائے تھے اور ان کی پیش گوئی کی تھی، اس لئے ان منزلوں کے پیش آنے سے قافلہ کے ہمراہیوں کو اپنے سفر کی صحت اور اپنے رہنما کی بصیرت پر اعتماد بڑھتا ہے کہ یہ جو کچھ پیش آ رہا ہے بالکل وہی ہے جس کی اس نے خبر دی تھی۔ فَلَمَّا رَأَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ، وَمَا زَادَهُمْ اِلَّاۤ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ـــــ (جب غزوہ خندق کے موقع پر اہلِ ایمان نے مخالفین کی فوجوں کو دیکھا تو انھوں نے کہا کہ یہی ہے جس کا اللہ اور اس کے رسولؐ نے ہم سے وعدہ کیا تھا۔ اور اللہ اور اس کے رسولؐ نے سچ کہا تھا اور اس سے ان کے ایمان و تسلیم میں ترقی ہوئی)۔

• راستہ کی مشکلات اہلِ یقین اور اہلِ عزم کے لئے تازیانۂ شوق کا کام دیتی ہیں، ان سے ان کی صلاحیتیں ابھرتی اور طاقتیں ابلتی ہیں، علم و تمدن کی ترقی میں بھی مشکلات کا بڑا ہاتھ ہے اور اہلِ دین کی روحانی ترقی میں بھی مشکلات کا بڑا دخل ہے اگر مشکلات نہ ہوتیں تو قوتیں ٹھٹھر کر رہ جاتیں، ذہانت کے بہت سے چشمے خشک ہو جاتے، انسانی کوششیں اور انسانی ذہن سیدھی پٹری پر آرام سے چلنے کے عادی ہو جاتے، زندگی کے مسائل و مشکلات میں دماغ اجتہاد سے اور قوائے عمل مقابلہ جہاد سے عاری ہو کر رہ جاتے، زندگی کے دریا کی سطح بالکل ساکن ہو جاتی جس پر کائی جمی ہوتی۔ سچ پوچھئے تو مشکلات سے بہت کچھ زندگی کی ہماہمی اور چہل پہل قائم ہے۔

سہولتوں اور راحتوں کی فراہمی جمود و غفلت کا پیش خیمہ ہے اور جمود و غفلت قوموں کے زوال، سلطنتوں کے سقوط اور عام بربادی کا مقدمہ ہے، دنیا کے مسلمانوں پر بھی اور ہندوستان کے مسلمانوں پر بھی سہولتوں اور راحتوں کا طویل دور گزرا اور اس کے نتیجہ کے طور پر وہ طویل عرصہ تک جمود و غفلت کا شکار رہے، اور اس کا طبعی نتیجہ ظاہر ہوا۔ اب تمام دنیا میں مشکلات کا دور ہے، یہ دور اگر انھوں نے صبر و استقامت سے گزار دیا اور ان کے قوی بیدار ہو گئے تو ان کی تاریخ کے نئے اور بہتر دور کا آغاز ہو گا جس کی پیش گوئی وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِى الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِيْنَ کہہ کر کی گئی اور جس کی طرف سے

(باقی صفحہ ۸۰ پر ملاحظہ ہو)

حضرت جگر مرادآبادی

شائع شدہ الفرقان جمادی الاول ۱۳۶۹ھ
(مارچ ۱۹۵۰ء)

سوزِ جگر

پہلے تو حسنِ عمل، حسنِ یقیں پیدا کر
پھر اسی خاک سے فردوسِ بریں پیدا کر

یہی دنیا جو بُت خانہ بنی جاتی ہے
اسی بُت خانہ سے کعبہ کی زمیں پیدا کر

روحِ آدم، نگراں کب سے ہے تیری جانب
اُٹھ اور اک جنتِ جاوید یہیں پیدا کر

خس و خاشاکِ توہم کو جلا کر رکھ دے
یعنی آتش کدۂ سوزِ یقیں پیدا کر

غم میسر ہے تو اس کو غمِ جاوید بنا
دل حسیں ہے تو محبت بھی حسیں پیدا کر

آسماں مرکزِ تخئیل و تصوّر کب تک
آسماں جس سے خجل ہو وہ زمیں پیدا کر

دلِ ہر قطرہ میں طوفانِ تجلّی بھر دے
بطنِ ہر ذرہ سے اک مہرِ مبیں پیدا کر

بندگی یوں تو ہے انسان کی فطرت لیکن
ناز جس پہ کریں سجدے وہ زمیں پیدا کر

پستیٔ خاک پہ کب تک تری بے بال و پری
پھر اسی خاک سے فردوس بریں پیدا کر

عشق ہی زندہ و پائندہ حقیقت ہے جگر
عشق کو عام بنا ذوقِ یقیں پیدا کر

حضرت مولانا عبدالباری صاحب ندوی
سابق پروفیسر جامعہ عثمانیہ دکن

علم دین اور مسئلہ معاش

عالم ہوکر کھائیں کیا؟ کا قرآنی اور ایمانی جواب

[حضرت مولانا عبدالباری ندوی نے ۱۹۵۸ء میں ایک سلسلۂ مضمون حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی اصلاحات و تجدیدات پر لکھا تھا جو الفرقان میں شائع ہوا تھا، مندرجہ ذیل مضمون اسی کی ایک قسط ہے۔]

ایک مخدوم بزرگ جو خود ماشاء اللہ عالم باعمل ہیں اور ایک معروف بزرگ و شیخ کی قائم کردہ خاص دینی درس گاہ کے ناظم ہیں اور اسی درس گاہ میں خود اپنے ایک بچے کو قرآن حفظ کرا رہے ہیں باوجود اس کے ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ

"یہ تو بتاؤ کہ آخر حافظ، عالم ہوکر کھائیں کیا؟"

اسی طرح ایک اور مخدوم و مخدوم زادہ بزرگ جن کا ہندوستان کے ایک ایسے مشہور و مسلّم خاندان سے قریب ترین تعلق ہے جس کا فخر و امتیاز نسلاً بعد نسل تک علوم دینیہ ہی کی طلب و خدمت رہا، اور جو ابھی ایک ہی پشت پہلے کے ایک ایسے صاحب تقویٰ و توکل، مشہور و مسلّم شیخ وقت کے صاحب سجادہ ہیں جن کے یہاں فاقہ ہو جانا بھی کوئی غیر معمولی بات نہ ہوتی ان مخدوم کے ایک صاحب زادے جب ایم اے ہوکر ملازمت اور اس کے لیے سعی و سفارش میں سرگرداں و پریشان تھے تو ایک موقع پر احقر نے اپنے ان مخدوم کی خدمت میں عرض کیا کہ حضرت نے آخر اپنے خاندان کے دینی علم و توکل کے راستہ سے اولاد کو ہٹا کر اس دنیوی تعلیم و تذلیل کو کیوں پسند فرمایا! جواب دہی کہ دین اور علم دین کا پوچھنے والا

اب کون ہے اور اس کو حاصل کرکے کھاتے کہاں سے؟ احقر نے پوچھا کیا اس میں تو تجارت اور کاروبار کی کوئی راہ اہون واسلم ہوتی، اس کا جواب واقعی بڑا پُر معنی اور پُر لطف عطا فرمایا کہ

"میاں تجارت بڑی محنت ومشقت، ہوشیاری وبیداری کا کام ہے ہم تو بس ملازمت ہی کے کام کے رہ گئے ہیں کہ سوتے جاگتے بری بھلی طرح تیس دن کے بعد کسی پر کچھ واجب ہو جائے،"!

اس میں شک نہیں کہ ملازمت کا یہ بہترین ترجمہ ہے، میمن بوہرے وغیرہ نسلاً بعد نسل کی تجارت پیشہ مسلمان جماعتوں کا ذکر نہیں ورنہ عام مسلمانوں خصوصاً آخون زادوں کو دیکھا کہ نوکری تو وہ بڑی بھلی طرح نباہ کر اور تیس دن کے بعد کسی پر کچھ واجب کرکے وصول کر لیتے ہیں، لیکن تجارت میں اکثروں کا دیوالہ ہی نکلتے دیکھا۔

غرض جب خود ایسے ایسے خاندانی فنائخ اور دیندار علمائے دین تک اپنی اولاد کو تعلیم دین سے ڈر کر دور رکھتے ہیں، کہ علم دین کو حاصل کرکے کھائیں گے کہاں سے، تو پھر بادشاہ یا امراء کا ذکر ہی کیا جو خاندانی دنیادار اور دینی تعلیم ودولیات سے یکسر محروم ہیں!

ایسے دیندار اور دنیادار دونوں قسم کے مسلمانوں کی خدمت میں عرض ہے کہ "کھائیں گے کہاں سے" کا خوف وہی خشیت املاق (خوف افلاس) ہے جس کی بنا پر جاہلیت کے مشرکین اپنی اولاد کو قتل تک کر ڈالتے تھے اتنا فرق تھا ہے کہ وہ اس خوف سے اپنی اولاد کی چند روزہ دنیوی زندگی کا خاتمہ کر دیتے تھے اور ہم ہمیشہ کی اخروی زندگی کو برباد کر دیتے ہیں، آج بھی جاہلیت جدیدہ میں ضبط تولید کی (جو قتل اولاد کی خفی شکل ہے) بڑی دلیل یہی بیان کی جاتی ہے کہ آبادی بڑھتی جاتی ہے، اتنے آدمی آخر کھائیں گے کہاں سے!

اس کا حقیقی جواب نئے اور پرانے سب جاہلوں کو قرآن نے جو دیا ہے، وہ ایسے مسلمانوں کے لیے اور زیادہ حقیقی ہے، جو "خوف افلاس" کی بنا پر اپنی اولاد کو تعلیم دین سے محروم رکھ کر دنیا کی غیر یقینی زندگی کو بنانے سے زیادہ آخرت کی یقینی زندگی بگاڑتے ہیں، جواب یہ ہے کہ تمہاری اولاد کو بھی وہی خدا رزق دے گا جس نے تم کو دے رکھا ہے "نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ" اگر ہم کسی درجہ میں بھی مسلمان ہیں، اور قرآن پر ہمارا کچھ بھی ایمان ہے تو خوب یاد رکھنا چاہیئے، کہ قرآن کے خدا نے انسان کو کھانے کمانے کی فکر میں فنا ہو کر مرنے کے لیے ہرگز نہیں پیدا فرمایا، ہمارا "زیستن برائے خوردن" نہیں، بلکہ "خوردن برائے زیستن" ہے، اور زندگی کا اصل مقصود عبدیت وبندگی کے فرائض کی ادائی ہے، صاف صاف دو ٹوک ارشاد ہے۔

مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝ مَا اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَا اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ ۝ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنِ ۝

میں نے جن و انس کو محض عبدیت و بندگی کے لیے پیدا کیا ہے، رزق کی فکر کے لیے نہیں پیدا کیا، اور نہ اس لیے کہ مجھ کو کھلائیں، رازق تو سب کا صرف اللہ ہی ہے جو رزق رسانی کی پختہ قوت رکھتا ہے۔

باقی اپنی بندگی و عبدیت کو بھلا کر رزاقیت کی تدبیر و قوت کے گھمنڈ میں انسان کی درماندگی کا تماشہ جو مسلسل ۶-۷ سال سے دیکھا دکھلایا جا رہا ہے تاریخ نے تو کب دیکھا ہوگا، لیکن آج ہر آنکھ والے کی آنکھ دیکھ رہی ہے کہ ایک طرف تو "زیستن" کا مطلب تمام تر "خوردن" قرار دے لیا گیا ہے اور حکومت و سیاست سب کا اصل مطلب و مقصود پکار پکار کر فخریہ روٹی کپڑا بتایا جاتا ہے دوسری طرف عالمگیر جنگ کے سلسلہ میں اور خصوصاً اس کے بعد ساری دنیا جس طرح عالمگیر قحط کے چنگل میں پھنسی ہے، اس کے ازالہ کی ہر روز ہر حکومت کی جانب سے طرح طرح کی تدبیروں کا اعلان کیا جاتا ہے، فراہمی غذا کی مستقل وزارتیں اور محکمے قائم ہیں، ہر دن قومی و بین الاقوامی کانفرنسیں منعقد ہوتی رہتی ہیں، ساری حکومتوں نے راشن بندی کر رکھی ہے یعنی ناپ تول کر دو وقت کا برا بھلا غلہ حوالہ کر دیا جاتا ہے جو اکثر صورتوں میں انسان کی معمولی مقدار غذا کا نصف سے زیادہ نہیں ہوتا ہے، اس پر بھی وقتاً فوقتاً تخفیف و تقلیل کی دھمکی اور اطلاع شائع ہوتی رہتی ہے کہ بس ایک مہینہ یا دو مہینہ کا غلہ رہ گیا ہے اور آئندہ فلاں مہینہ بڑا نازک آنے والا ہے۔ امریکہ جو دنیا کا سب سے دولتمند و خوشحال ملک ہے ابھی (۱۴ اکتوبر ۱۹۴۶ء کے) پائنیر میں وہاں کے غذا و زراعت کے ڈائرکٹر جنرل کا بیان چھپا ہے، کہ

"اس موسم سرما میں ایسے شدید قحط سے دوچار ہونا ہے جو دنیا میں کبھی نہ پڑا ہوگا اور جس کا مقابلہ ہر طرح کی معاشی تدابیر اور قومی و بین الاقوامی اجتماعی جد و جہد ہی سے ممکن ہوگا۔"

انسان نے جس طرح اپنے خالق سے منہ موڑا ہے، اس کی سمجھ میں آنا تو اب مشکل ہے لیکن راقم ہذا کو یہ روز افزوں و عالمگیر قحط نہیں، بلکہ عالمگیر قہر ہی نظر آ رہا ہے، اور قرآن مجید میں جابجا جو رزق و رزاقیت کا ذمہ بالکلیہ حق تعالیٰ نے خود لے کر نہ صرف یہ کہ انسان کو عبدیت و بندگی کے لیے فارغ و بے فکر فرمانا چاہا ہے، بلکہ غور کیجیے تو اس دنیا میں اس کی

سب سے جامع الصفات صفت ربوبیت کا سب سے بڑا اور نمایاں مظہر رزاقیت ہی ہے اور انسان انفرادی یا اجتماعی طور پر بالکلیہ اپنے کو اسکا ذمہ دار ٹھہرا کر نہ صرف اللہ تعالیٰ کی اس صفت خاصہ میں اپنے کو شریک و سہیم ٹھہرا رہا ہے بلکہ در اصل خدا کی خدائی چھین کر خود خدا بن بیٹھا ہے، اس کے بعد اگر اسی کا قہر و عذاب اسی قبض رزق کی راہ سے ظاہر ہو تو عین سنۃ اللہ ہے۔

اپنا تجربہ تو اپنے اکثر عزیزوں دوستوں کے انفرادی واقعات تک میں یہی ہے اور جو بھی ذرا غور کرے گا اس کو تجربہ ہو گا کہ معاش و رزق کا معاملہ کچھ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ ہی ظاہر ہوتا ہے اور تدبیر کے تیر بالعموم اپنے نشانہ سے ہٹ کر ہی گرتے ہیں، بارہا دیکھا کہ انگریزی تعلیم میں بھی طالبعلمی میں جن کو بڑا ہونہار خیال کیا جاتا تھا، وہ کچھ نہ ہوئے، اور جن کو ان ہونہاروں نے سمجھا گیا، وہ ان ہونہاروں سے میدان معاش میں کہیں آگے نکل گئے، یہی تجارت وغیرہ ہر چیز میں مشاہدہ ہوتا رہتا ہے کہ بارہا جس شخص اور جس چیز کی تجارت کے چلنے کے ظاہری اسباب زیادہ ہوتے ہیں، وہ رہ جاتی ہے، اور جس کے ظاہری امکانات کم ہوتے ہیں وہ چل جاتی ہے، باقی یوں نکات بعد الوقوع تو ہر واقعہ میں نکال لیے جا سکتے ہیں۔

الغرض کوئی اور سمجھے نہ سمجھے مگر مسلمان کو اس کے سوا سمجھنے کا حق ہی کیا ہے، کہ رزق یا معاش کی تنگی و فراخی، قبض و بسط عطا و منع بالکلیہ مشیت الٰہیہ پر منحصر ہے، اِنَّ رَبَّکَ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَاءُ وَیَقْدِرُ۔ اَوَلَمْ یَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَاءُ وَیَقْدِرُ۔ وغیرہ کثیر آیات نے اس باب میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں چھوڑی ہے کہ رزق کے ظاہری اسباب بس ظاہری سے زیادہ نہیں اس لیے غیروں کی طرح ان میں اتنا غلو کرنا کہ گویا اسباب و تدابیر ہی حقیقی رزاق ہیں، نہ اسلام ہے نہ اسلام کے خدا پر ایمان اور نہ حقیقی اسلام اور نہ حقیقی مسلمان کی تاریخ و زندگی ہی سے اس کی شہادت ملتی ہے، یہ تو در اصل زبان سے خدا کا اقرار اور عمل سے اپنی خدائی کا اعلان ہے۔ اس قسم کے تصورات کو جب تک دماغ بدر نہ کیا جائے اس وقت تک اسلام کی دینی و دنیوی برکات اور انفرادی و اجتماعی ثمرات کی توقع کا حق ہی کیا حاصل ہے۔

یہ تو اس سوال کی کہ "عربی یا دینی تعلیم حاصل کر کے کھائیں گے کیا" بڑی خطرناک ایمانی اور اعتقادی خامی تھی، ایک دوسری بڑی خود فریبی اور مغالطہ یہ ہے کہ کھانے سے مراد ضروریات زندگی سے زیادہ فضولیات زندگی ہوتی ہیں، یعنی ہم نے کھانے پینے رہنے سہنے، شادی بیاہ، مکان سامان زندگی کے تمام جاری و وقتی مصارف کا ایک خود ساختہ معیار مقرر کر رکھا ہے، جب تک وہ پورا

نہ ہو، اس وقت تک ہم سمجھتے اور کہتے ہیں، کہ کھانے ہی کو نہیں مل رہا ہے، حالانکہ اگر ... اگر یہ سوال کیا جائے کہ آخر آپ کو اس کی کیا حاجت ہے، کہ دینی تعلیم سے محروم رکھ کر اولاد کو ججی وکلکٹری کے لیے دنیاوی تعلیم دلاتے ہیں" تو جواب یہی ملتا ہے، کہ اگر ہماری آمدنی زیادہ ہے تو ہماری حیثیت ومصارف بھی تو ویسے ہی ہیں، یعنی اس حیثیت جاہ ومال کو موجودہ آمدنی میں اضافہ اور جاہی مناصب حاصل کیے بغیر کیسے برقرار رکھا جا سکتا ہے یہ ایسی منطق ہے کہ جاہ ومال کے کسی اونچے سے اونچے مقام پر پہنچ کر بھی لاجواب نہیں ہو سکتی!

ورنہ ابھی عالمگیر جنگ اور گرانی اس عالمگیر جنگ سے پہلے اسی ہندوستان میں زندگی کی نفس ضروریات پانچ سات روپیہ ماہوار سے زیادہ نہ تھیں، یعنی چھوٹے بڑے چار پانچ آدمیوں کے گھر کے لیے پچیس تیس ماہوار نفس ضروریات کی حد تک بلا کسی تکلیف وتنگی کے کافی ہوتے تھے اور بہتیرے مولوی بلکہ اچھے اچھے علماء اس سے بھی کم میں گزر فرماتے تھے، خود حضرت علیہ الرحمۃ کی تنخواہ کانپور میں پچیس۲۵ روپیہ ماہوار تھی، جو حضرت کے علم وعمل کے کمالات کے لحاظ سے کیا تھی پھر بھی حضرت نے اس کو بہت بڑی تنخواہ سمجھا تھا اور فرماتے کہ

"میں طالب علمی میں سوچا کرتا تھا، تو زیادہ سے زیادہ دس روپیہ ماہوار کی مدرسی اپنی ضروریاتِ معاشی کے لیے کافی سمجھتا تھا (اس میں بھی) پانچ روپیہ اپنے خرچ کے لیے اور پانچ گھر کے خرچ کے لیے، اس سے زیادہ کی تنخواہ پر کبھی نظر ہی نہ جاتی، نہ اس سے زیادہ کا اپنے کو مستحق سمجھتا"۔

(اشرف السوانح حصہ اول ص ۳۷)

خود راقم ہذا کو اپنے گھر کا تجربہ ہے کہ والد مرحوم دیہاتی وہ بھی نہایت قانع ومتوکل طبیعت کے طبیب تھے، خرچ اوسطاً ۷، ۸ آدمیوں کا، اندر باہر ایک آدھ نوکر چاکر بھی، کھانے پینے رہنے سہنے، شادی بیاہ سب کا معیار اوسط درجہ کے شرفاء اور اہل برادری کا مگر آمدنی کا اوسط شاید ہی کبھی ۳۰۔۴۰ سے بڑھا ہو، نہ آمدنی میں ترقی کی کبھی کوئی فکر فرمائی، البتہ اللہ اور اللہ والوں سے تعلق میں ترقی کی فکر آخر دم تک رہی، حضرت مولانا محمد نعیم صاحب فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت واجازت کے باوجود اُن کی وفات کے بعد حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے آخر تک برابر اصلاح واستفادہ کا تعلق جاری رہا، زیادہ عبرت وسبق کی بات یہ کہ گھر بھر میں چھوٹے بڑے سب کو قلب کی جو راحت وطمانیت یا دل کا جو سکون چین نصیب تھا، وہ اس

نالائق نام ہوا، اور جس کے متعلقین کو سینکڑوں، ہزاروں کی آمدنی اور کوٹھی وموٹر میں بھی میسر نہ ہوا
ہاں گھر بھر میں والد علیہ الرحمۃ کے اس رنگ وبرکت کا وارث والدہ مدظلہا کا دم رہ گیا ہے،
(رب ارحمہما کما ربیانی صغیرا) برکت کی حقیقت بھی ان اللہ والے والدین ہی
کی زندگی وآمدنی کو دیکھ کر سمجھ میں آئی۔

باقی اپنی سینکڑوں، ہزاروں کی آمدنی کوٹھی موٹر نوکر چاکر سب کے چوتھائی صدی کے تجربات
کی میزان اپنے ایک حکیم وحکیم طبع استاد (مولانا شیر علی صاحب مرحوم) کے ایک [illegible]
فقرہ کے سوا کچھ نہ نکلی، مولانا ندوہ میں جب راقم الحروف آخری جماعت میں تھا، صدر مدرس اور
مہتمم تھے، پھر جامعہ عثمانیہ میں شعبۂ دینیات میں علم کلام کے استاد مقرر ہو گئے تھے، مشاہرہ
چھ سو ماہوار تھا، ابھی تک موٹروں کے بجائے گھوڑا گاڑی کا چلن زیادہ تھا، اکثر عہدہ دار اپنی
گھوڑا گاڑی رکھتے تھے، مولانا کے پاس بھی تھی، جس پر یونیورسٹی تشریف لاتے تھے، کچھ دن بعد دیکھا
کہ ایک کرایہ کی گاڑی پر تشریف لانے لگے، عرض کیا کہ حضرت گھر کی گاڑی کیا ہوئی؟ فرمایا نکال دیا
دو گھنٹے میں اس پر سوار ہوتا تھا، چوبیس گھنٹے وہ میرے اوپر سوار رہتی تھی!

اس وقت تو یہ حکیمانہ بات سمجھ میں نہ آئی تھی، اور مولانا کی پیرانہ سالی اور کم ہمتی کا تقاضا
معلوم ہوئی، لیکن اس کے بعد خود گھوڑا گاڑی بھی رکھی، موٹر بھی رکھا، سو ماہوار تک کی کوٹھی بنگلہ
کا بھی مزا چکھا، لکھنؤ میں ایکڑ بھر زمین میں خود اپنی دو منزلہ لمبی چوڑی کوٹھی بنائی لان اور پھلواری
نوکر چاکر، سامان اور فرنیچر سب ہی کا ٹھاٹھ اپنی حیثیت وحوصلہ سے بڑھ کر دیکھا دکھلایا، مگر خدا کو
گواہ کر کے آج بتا دیتا ہوں کہ جیسا جیسا حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی جوتیوں کے تعلق سے کچھ
عقل ٹھکانے لگی، ویسا ہی ویسا اس سارے فخر ونمائش کے ساز وسامان کو راحت وآسائش سے زیادہ
خود اپنے دل ودماغ پر سوار پانے لگا! اور بالآخر کچھ عرصہ بعد حیدرآباد ہی میں جب ایک محب ومحسن
کی ہمت واحسان سے جامعہ کے قریب ایک نوتعمیر مسجد کے احاطہ ہی میں خاص راقم الحروف احقر
کے لیے دو حجرے تیار ہو کر ان میں قیام نصیب ہوا تو [illegible] تھا کہ دل ودماغ پر سے قید کی
کوئی بڑی سزا جھیل کر باہر آ گیا ہے! اور آج بھی لکھنؤ کی ذاتی طویل وعریض کوٹھی میں بیٹھ کر حیدرآباد
کی کوئی چیز یاد آتی ہے، تو شہر وشہریت سے دور مسجد اقصیٰ[1] کے یہی دو حجرے اور اسی زاویہ کے دو چار

---

[1] یہ مسجد شہر کے بالکل کنارے دور (جو لفظ اقصیٰ کے معنی ہیں) واقع ہے جہاں اب جامعہ کی بدولت کچھ آبادی ہو چلی ہے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

انے گئے نہایت فرمایا لکھنؤ کی اپنی کوٹھی کا معاملہ بھی دارم حرام تم کا ہو رہا ہے، ورنہ اب کوٹھی کے بجائے کوٹھری ہی کو دل ڈھونڈتا ہے، یہ تو آپ بیتی تھی، جگ بیتی بھی جو کچھ دھن و دکن ہر جگہ دیکھی اور سنی وہ یہی کہ بڑے بڑے عہدہ دار اور بلند مناصب وزراء و امراء بظاہر جاہ و مال سب کچھ رکھ کر بھی سب کے سینہ کے اندر مزید جاہ اس کے مقابلہ و مسابقت کی بھٹی دہکتی رہتی ہے اور بالعموم اسی کے انگاروں میں لوٹتے لوٹتے دم نکل جاتا ہے۔

یہ اپنی برائی بظاہر طویل داستان اپنے مقصد و مفاد کے اعتبار سے طویل نہیں قصیر ہی ہے اس لیے کہ دنیا کی جس طلب میں دین و آخرت کا ہوش نہ رہے جائز و ناجائز کی تمیز اٹھ جائے، دوزخ و جنت کا خوف و شوق دل سے نکل جائے، خدا کی رضا و ناراضی کا غم نہ ہو" یہ تو (معاذ اللہ) مومن و ایمان کے منافی کافر و کفر کی دنیا کے سوا کیا ہے، اور یہ دنیا کی طلب نہیں، دنیا کا عشق بلکہ جنون ہے۔ بقول حضرت علیہ الرحمۃ کے کسب دنیا کے کمانے کا مضائقہ نہیں، مگر یہ نہ ہو کہ اس میں بالکل کھپ جائے، کہ گویا خدا تعالیٰ سے بالکل واسطہ ہی نہیں" یہ تو کافر ہی کی زندگی کی خاص شان ہے کہ گویا خدا سے کوئی واسطہ نہیں،

• اور مومن کی زندگی کی خاص شان یہ ہے کہ وہ اس دنیا سے بس مسافر اور سرائے کا سا تعلق رکھتا ہے باقی فکر و عمل جد و جہد کا اصل تعلق خدا و آخرت سے ہوتا ہے، اور دنیا میں جو ہم چاہتے ہیں کہ یہ بھی ہو جائے اور وہ بھی ہو جائے، حضرت علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:

> "ایسا ہی ہے جیسے کوئی سرائے میں یہ تمنا کرے کہ یہاں جھاڑ فانوس سب لگا دیے جائیں اور پھر اپنی کمائی سے خرید کر لگا دے، تو ظاہر ہے کہ کتنی بڑی حماقت ہے، خاص کر جب یہ بھی حکم ہو مثلاً اس سرائے میں چار دن سے زیادہ کوئی قیام نہیں کر سکیگا اس وقت تو اپنی کمائی وہاں کی تزئین میں لگانا پورا خلل دماغ ہے اور دنیا ایسی ہی محدود قیام کی سرائے ہے، کہ اس حد کے بعد بلا اختیار یہاں سے نکل جانا پڑے گا، تو اول تو سرائے میں قیام اگر اختیاری بھی ہو تب بھی یہی ہونا چاہیئے کہ اس کے ساتھ گھر کا سا معاملہ نہ کرے اور جب اختیاری بھی نہیں تب تو ہرگز [illegible] میں دل نہ لگانا چاہیئے اور یہی معنی ہیں یہ ہے [illegible] الدنیا

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ ملاحظہ فرمائیے۔)

مولانا گیلانی احقر کے سالہا سال کے رفیق قیام و طعام بھی اسی مسجد کے جوار میں تشریف فرما ہیں اور اس مسجد کا "مسجد قصلی" نام تو ایک اور دوست نے تجویز کیا تھا مگر اس کا تاریخی نام ثابت ہونا مولانا ہی کی یادگار ہے۔

سجن المؤمن ہے، لوگوں نے اس حدیث کے مختلف معنی لیے ہیں، مگر میں کہتا ہوں کہ جیل خانہ تکلیف، وغیرہ کی وجہ سے نہیں فرمایا، بلکہ اس لیے کہ جیل خانہ میں جی کبھی نہیں لگا کرتا، خواہ کیسا ہی ہو، تو مسلمان کی شان ہے کہ دنیا میں اس کا جی نہ لگے گا، اگرچہ بظاہر اس میں کیسا ہی عیش و آرام ہو، کیونکہ جی لگنے کی جگہ گھر ہے اور دنیا گھر نہیں، پھر جب جی نہ لگے گا، تو کیوں ہوسیں ہوں گی، اور کیوں سوچے گا کہ یوں ہو اور یہ ہو اور وہ ہو، بلکہ اب یوں سوچے گا، کہ دنیا تو پردیس ہے، یہاں جس طرح بھی گزر جائے اور دنیا کی بجائے آخرت کی سوچ ہونی چاہیے، اور یہ سوچے گا کہ اگر یہ سامان ہو گیا، تو پھر وہاں یوں بہار ہو گی، یوں عیش ہو گا، ورنہ یوں پریشانی ہو گی، یوں مصیبت ہو گی" (الرفیق صفحہ ۳۷، ۳۸)

لیکن ہماری زندگی اور اسکے برتاؤ اور معاملات سے (الا ماشاء اللہ) بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ:

"جیسے کوئی منکر آخرت ہو، کیونکہ جتنی محبت دنیا کی ہے، آخرت کی نہیں، نہ اس کا اتنا شوق ہے، چنانچہ دلوں کو ٹٹول کر دیکھ لیں کہ دنیا میں قیام کی بابت ہم لوگ کیا کیا خیالات پکاتے ہیں، کہ یوں رہیں گے، یوں کریں گے، جائداد ہو گی، ملازم ہوں گے، ڈپٹی کلکٹر ہوں گے، وغیرہ وغیرہ"۔

"اب انصاف سے دیکھو کہ آخرت کے متعلق بھی کبھی ایسی امنگیں ہوتی ہیں کہ مر جائیں گے تو خدا کے سامنے جائیں گے، یوں جنت ہو گی، اس میں باغات ہوں گے، مکانات ہوں گے، حوریں ہوں گی غالباً کبھی یہ امنگیں نہیں ہوتیں، بلکہ خیال بھی بہت کم آتا ہے۔"

"بعض ایسے ہیں جن کے پاس دنیا کی خوشی کا کوئی سامان نہیں، اور وہ یوں کہیں گے کہ صاحب ہم تو دنیا کی خوشیاں نہیں مناتے بلکہ ہم تو سوچا کرتے ہیں کہ کوئی والی وارث نہیں، زندگی کیسے کٹے گی تو ان سے یہ شکایت ہے کہ جیسے تم نے دنیاوی زندگی کو سوچا کبھی آخرت کو بھی سوچا، اور وہاں کی مصیبت کا بھی خیال کیا کہ وہ زندگی کیسے کٹے گی، دوزخ میں جانا پڑا، تو وہ مصیبت کیسے سہی جائے گی پھر جیسے یہاں تکلیف کو سوچ کر تدبیر سوچتے ہو، کہ شاید فلاں تدبیر سے یہ تکلیف کٹ جائے یا فلاں تدبیر سے مشکل آسان ہو جائے ایسے کبھی آخرت کی مصیبت کے لیے بھی سوچا،

"حالانکہ دنیا کے مصائب بعض ایسے ہیں، جن کی کوئی تدبیر ہی نہیں، اور اس لیے اس کو سوچنا ہی عبث ہے، مگر پھر سوچتے ہو اور آخرت کی کوئی مصیبت بھی ایسی نہیں جو لاعلاج ہو بلکہ ہر مصیبت کی تدبیر موجود ہے لیکن پھر اس کا ذرہ فکر" (الرفیق ص۳۲ ج۲)

خدا و آخرت سے بے تعلقی و بے فکری کا یہ حال صرف عام دنیا داروں ہی کا نہیں جو لوگ اپنے کو دیندار سمجھتے اور سمجھے جاتے ہیں، ان کا حال بھی اس معاملہ میں کچھ بہتر نہیں ارشاد ہے کہ

"دنیا دار تو الگ رہے، دینداروں کو بھی آخرت کے متعلق نہ امنگیں پیدا ہوتی ہیں نہ اندیشے، حالانکہ خدا تعالیٰ صاف صاف فرماتے ہیں یا ایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ ولتنظر نفس ما قدمت لغد

پھر جو لوگ علم بھی دنیا کا نہیں دین ہی کا حاصل کرتے ہیں، ان کو بھی اگر دین و آخرت کی امنگوں اور اندیشوں کے بجائے اس کی فکر دامنگیر رہے کہ کھائیں گے کہاں سے تو یہ کیسے ظلم و حسرت کی بات ہے! ان کی زندگی تو امت کے لیے خیال و اسوہ ہونا چاہیے اور ان کا اسوۂ حسنہ رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہونا چاہیئے، کہ حضور کو اپنے اور اپنے اہل و عیال کے لیے کیسی زندگی پسند و ماثور تھی، اس کا اندازہ اس سے کرو کہ لوگوں کی آسودہ حالی سے متاثر ہوکر ازواج مطہرات کو بھی کچھ طبعاً اس طرف میلان ہوا اور حضور سے کچھ مزید نان و نفقہ اور سامان کی درخواست کی، جو حضور کے قلب مبارک پر اتنی گراں گذری کہ ایک مہینہ گھر میں نہ جانے کی قسم کھالی، بالآخر یہ آیت اتری۔

یا ایھا النبی قل لازواجک ان کنتن تردن الحیوٰۃ الدنیا وزینتھا فتعالین امتعکن واسرحکن سراحا جمیلا وان کنتن تردن اللہ ورسولہ والدار الاٰخرۃ فان اللہ اعد للمحسنات منکن اجراً عظیما۔

خلاصہ یہ کہ حضور کو امر ہوا کہ صاف صاف اپنی بیبیوں سے فرما دیں کہ اگر تم کو دنیا اور اس کا ساز و سامان مطلوب ہے تو میرا تمہارا نباہ نہیں ہو سکتا، اور اگر تم خدا و رسول کی رضا و خوشنودی اور آخرت کے مراتب و انعامات کی طالب ہو تو ایسی نیک بیبیوں کیلئے اللہ تعالیٰ نے آخرت میں عظیم الشان اجر و انعام مہیا فرما رکھا ہے۔

ازواج مطہرات، آخر ازواج مطہرات تھیں، سب کی آنکھیں اتنی تنبیہ ہی سے کھل

گئیں اور پھر مدت العمر حضور کیساتھ خوشی خوشی فقر و فاقہ میں گزار دی، کیونکہ حضور کے ہاں بارہا فاقہ ہوجاتا تھا، قرض لینے کی نوبت آجاتی تھی اور حضور کا یہ فقر و فاقہ اضطراری نہیں بالکل اختیاری تھا، جس کو حضرت مجدد تھانوی علیہ الرحمہ نے فقر صادق سے تعبیر فرمایا ہے۔

"جس کی علامت یہ ہے کہ اس کے ساتھ دلچسپی ہو، اور دلچسپی اس کو کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فقر محبوب تھا، حتیٰ کہ اپنے اولاد کے لیے بھی اس کو قولاً وعملاً اختیار کرکے دکھلایا، تولاً تو یہ کہ خدائے تعالیٰ سے دعا کی۔

اللّٰھُمَّ اجْعَلْ رِزْقَ آلِ محمد قوتا	اے اللہ محمدؐ کی اولاد کو رزق بس بقدر گزر اوقات عطا فرما۔

اور عملاً یہ کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جو سب خاندان سے زیادہ محبوب تھیں، لیکن ایک مرتبہ جب ان کے ہاتھوں میں چکی چلانے سے چھالے پڑ گئے تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فرمانے سے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) سے کسی لونڈی غلام کی درخواست کی تاکہ کچھ مدد ملے، آپ نے فرمایا کہو تو لونڈی غلام دوں، اور کہو تو اس سے بھی اچھی چیز دے دوں، یہ سن کر حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے پھر نہ پوچھا کہ وہ اچھی چیز کیا ہے، بلکہ فوراً عرض کیا کہ اچھی چیز ہی دے دیجئے، آپ نے فرمایا کہ سوتے وقت سبحان اللہ ۳۳ بار، الحمد للہ ۳۳ بار اور اللہ اکبر ۳۴ بار پڑھ لیا کرو، بس یہ لونڈی غلام سے بہتر ہے، اس خدا کی بندی نے خوشی خوشی قبول کرلیا، تو دیکھئے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو فقر محبوب تھا، تو اپنی اولاد کے لیے اس کو تجویز کرکے دکھلایا۔ (الرفیق ص ۳۴)

اور جو اولاد کے لیے محبوب تھا، محبوب اصل میں وہی امت کے لیے بھی تھا، جیسا کہ اس عمومی ارشاد سے ظاہر ہے کہ

من اصبح منکم معافی فی جسمه	یعنی جس کو جسم کی صحت و عافیت، اور دل کا
واٰمنا فی سربه وعنده قوت یومه	امن وچین نصیب ہو اور ایک دن کا کھانا
فکانما حیزت له الدنیا بحذا فیرها۔	پاس ہو تو گویا ساری دنیا جمع ہوگئی۔

البتہ یہ ضعفائے امت کے حال پر ارحم الراحمین و رحمۃ للعالمین کی شان رحمت تھی کہ جائز حد تک دنیا کے کسب و طلب کی اجازت نہ اباحت فرمادی، لیکن دنیا کا ایسا عشق و جنون کہ جیسے کوئی منکر آخرت ہو یا جیسے خدا سے کوئی واسطہ ہی نہیں اس کی اگر اجازت ہو تو پھر دین و دنیا کا فرق و موم

کا جھگڑا ہی کیا رہا۔

(۱) الغرض اسلامی و دینی زندگی کے لیے سب سے مقدم یہ ہے کہ ہر کام میں یوم دین اور مالک یوم الدین سے معاملہ دو واسطہ پیش نظر ہو، اس کے بعد دنیاوی زندگی کے سارے مسائل و مشکلات از خود حل و سہل ہو جاتے ہیں اس لیے کہ ان کی قدر و قیمت وزن و اہمیت ہی مستقل مسائل و مقاصد کی نہیں رہ جاتی، نہ اپنی سعی و عمل کا سارا زور کوئی ہوشمند اس دنیا کے کھانے پینے، عیش و آرام پر اس طرح لگا دینے کو راضی ہو سکتا ہے کہ ساری جد و جہد اسی ادنیٰ یا خسیس و حقیر زندگی میں گم ہو کر رہ جائے، اور پھر حسن فہم یہ کہ ہم بڑا کارنمایاں انجام دے رہے ہیں۔ ضل سعیھم فی الحیوٰۃ الدنیا وھم یحسبون انھم یحسنون صنعا، یہ تو بقول حضرت علیہ الرحمۃ کے ویسا ہی خلل دماغ ہوگا، جیسے کوئی شخص کسی منزل مقصود کو بھلا کر ویٹنگ روم اور ہوٹل یا مسافر خانہ اور سرائے کے چند ساعت یا چند دن کے قیام کے لیے اپنی فکر و عمل کی ساری قوت اس کی زینت و راحت پر خرچ کر ڈالے، سرائے و سفر میں تو آدمی کو اگر ایک وقت کھانا بھی نہ ملے — اور فاقہ ہو جائے تو بھی زیادہ پروا نہیں کرتا چہ جائیکہ کسی ایسی سرائے میں مستقل جی لگا بیٹھے جہاں سے نکالا جانا یقینی ہے۔ یہ رضوا بالحیوٰۃ الدنیا واطمأنوا بھا تو خاص کافر و منکر آخرت ہی کا شیوہ ہے۔ اور ان ہی کو مبارک ہو۔

(۲) دوسری بات جو منکر کے مقابلہ میں مومن بالخصوص اہل علم مومن کے پیش نظر رہنے کی ہے وہ ہمارا یہ ایمان و اعتقاد ہے کہ ہر چھوٹی بڑی چیز کی طرح رزق اور اس کا قبض و بسط یا فراخی و تنگی بھی بالکلیہ حق تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے، اور پہلے ہی سے اس کا سارا پروگرام یا نظام عمل متعین و مقدر ہو چکا ہے اس طرح اصل نظر اسباب کے بجائے مسبب الاسباب اور تدبیر کے بجائے تقدیر پر رہنا عین ایمان ہے جس کے بغیر ایمان ہی صحیح اور پورا نہیں ہوتا۔ "جو کچھ خدا دینا چاہے اس کو کوئی روک نہیں سکتا، اور جو وہی نہ دینا چاہے گا تو کوئی دے نہیں سکتا۔" (لا معطی لما منعت ولا مانع لما اعطیت) حدیث میں تو صاف بیان ہے کہ کوئی بندہ بلا ان چار باتوں پر ایمان لائے مومن نہیں ہو سکتا، ایک توحید (لا الٰہ الا اللہ) دوسرے رسالت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم تیسرے آخرت یا بعث بعد الموت، اور چوتھے تقدیر۔

(۳) تیسرے جو ان دونوں مقدمات کا لازمی نتیجہ ہے کہ اس دنیا کی زندگی میں مومن کسی زیادہ سے زیادہ اپنی سعی و طلب کو ضروریات زندگی تک محدود رکھے اور فضولیات زندگی کی فکر و سعی قطعاً وقت عزیز کو گنوانا ہے اور طفلانہ لہو لعب سے زیادہ نہیں۔ البتہ بلا اضاعت وقت اور بلا ابتلاء لہو و لعب، کچھ راحت کا سامان بھی میسر ہو جائے تو اس کو بھی اللہ تعالیٰ ہی کا اس طرح ایک انعام و احسان جان کر متمتع ہو جس سے خدا و آخرت

(حواشی اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

کا تعلق اور بیدار و پائیدار ہو، البتہ راحت بھی یاد رہے کہ اصل میں قلب کی راحت کا نام ہے۔

الحدیہ بلت کان کھول کر دینداروں ہی کو نہیں دنیاداروں کو بھی سن اور سمجھ لینی چاہیئے، جیسا اوپر اپنے اور پرائے سب کے تجربات سے واضح کیا جا چکا، کہ قلب کی راحت یا دل کے سکھ چین کا راز مادی ساز و سامان یا فضولیات کی بہتات میں نہیں بلکہ ضروریات زندگی پر قناعت ہی میں پوشیدہ ہے، اور ساتھ ہی اگر ایمان و عمل صالح یا دینداری کی زندگی بھی نصیب ہو تو "حیات طیبہ" کی موعودہ زندگی کا تجربہ اسی دنیا میں ہو جاتا ہے جس کا جی چاہے آزما کر دیکھ لے۔

سو آپ نے اچھی طرح دیکھ لیا کہ مومن کامل کے اس سوال کا کہ "کھائیں گے کہاں سے" کیسا کامل و ہمہ حل موجود ہے۔ بلکہ جس کو معاش کی فکر و پریشانی کہا جاتا ہے، ایمانی زندگی سے جسم و جان کو گھلانے والی یہ فکر معاش در اصل سرے سے خارج ہو جاتی ہے اور یہ سوال سرے سے بے معنی ہو جاتا ہے، کہ "دینی یا عربی تعلیم حاصل کر کے کھائیں گے کیا،" خصوصاً علم دین کی تحصیل و تعلیم کی ہمت و سعادت رکھنے والوں کا یہ سوال تو اور بھی بے معنی ہے اس کے معنی تو صرف یہ ہیں کہ ابھی علم دین کی ابجد بھی نہیں سمجھی ــ اور دستار فضیلت باندھ لی تو اس لیے کہ جیسے کہ اوپر تشریح و تاکید کے ساتھ عرض کیا گیا ہے، زندگی میں دین پیدا کرنے کے لیے تعلیم دین کے ساتھ ساتھ تربیت دین لازم بلکہ الزم ہے کیونکہ تربیت بلا تعلیم تو دیندار بنا دیتی ہے لیکن تعلیم بلا تربیت سے شاذ و نادر ہی دین پیدا ہو سکتا ہے۔

(الفرقان شوال ۱۳۶۷ھ)

حاشیہ صفحہ گزشتہ ــ

لہ الفاظ یہ ہیں: "قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یومن عبد حتی یومن باربع یشھد ان لا الہ الا اللہ وانی رسول بعثنی بالحق ویومن بالموت والبعث بعد الموت ویومن بالقدر"

ٹیلی گرام
BATRANS
بمبئی
آندھرا
ٹرانسپورٹ
کمپنی
ٹرانسپورٹ کنٹریکٹرس
ٹیلی فون نمبر
320169
322027
۱۱۳ کھنڈاری اسٹریٹ بمبئی ۳

پیامِ انسانیت

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

نفس پرستی یا خدا پرستی؟

محترم مولانا نے یہ تقریر ۲۰ نومبر ۱۹۵۱ء کو لکھنؤ کے ایک ایسے اجتماع میں فرمائی جس میں ہر مذہب و خیال کے لوگ موجود تھے

خطبۂ مسنونہ کے بعد:-

امیر جمع ہیں احباب درد دل کہہ لے
پھر التفات دل دوستاں رہے نہ رہے

دوستو!

میں آپ سے اس وقت کچھ دل کی باتیں کہنا چاہتا ہوں، اور اس طرح کہنا چاہتا ہوں جیسے میں آپ میں سے ہر ایک کے ساتھ تنہا بیٹھ کر گفتگو کر رہا ہوں۔ لیکن اگر اس کا کوئی امکان ہوتا کہ آپ میں سے ہر دوست سے الگ الگ ملتا اور اپنے دل کی بات کہہ سکتا تو میں ضرور ایسا ہی کرتا تاکہ مجھے اسے تقریر کچھ کرنی نہ پڑتی بلکہ ایک دوست کا درد دل سمجھ کر سنتے۔ مگر کیا کروں ایسا ممکن نہیں ہے۔ اگر یہ چیز ممکن ہوتی تو الکشن میں کھڑے ہونے والے امیدوار ضرور اس پر عمل کرتے، اور وہ اپنی انتخابی مہم کے سلسلے میں جلسے منعقد نہ کرتے، اس لیے کہ انھیں تو ان جلسوں میں وہ باتیں کہنا ہوتی ہیں جو تنہائیوں میں لے جا کر کسی کے کان میں بھی کہنا گراں ہوتی ہیں، یعنی اپنی تعریف، اپنی اہلیت کا اظہار، اور اپنی شان میں جو کچھ آپ ہی قصیدہ خوانی کر سکتے ہیں۔ بس اتنا ہی کر سکتا ہوں کہ آپ سے یہ درخواست کروں کہ براہ کرم میری گزارشات کو اسٹیج کی نہیں، بلکہ دل کی باتیں سمجھ کر سنئے۔

دوستو، بھائیو اور بزرگو!

دنیا میں زندگی کے بہت سے طرز رائج ہیں اور اس کی بہت سی قسمیں کہی جاتی ہیں، مشرقی زندگی، مغربی زندگی، جدید طرز زندگی، قدیم طرز زندگی وغیرہ وغیرہ۔ لیکن حقیقت میں زندگی کی بنیادی قسمیں صرف دو

ہیں۔ ایک نفس پرستانہ زندگی دوسری خدا پرستانہ زندگی۔ باقی جتنی قسمیں جتنے مختلف ناموں سے مشہور ہیں وہ سب ان ہی دو کی شاخیں ہیں۔

پہلی قسم کی زندگی یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو ایک شتر بے مہار سمجھ کر زندگی گزارے اور جو جی میں آئے کر گزرے اس کو من مانی زندگی بھی کہہ سکتے ہیں، دوسری قسم کی زندگی ایک ایسے آدمی کی زندگی ہے جو یقین رکھتا ہے کہ اسے کسی نے پیدا کیا ہے وہ پیدا کرنے والا ہی اس کی زندگی کا مالک اور حاکم ہے، وہ اس کی ضرورتوں اور مصلحتوں کو سب سے زیادہ جانتا ہے، اس کی طرف سے زندگی گزارنے کے کچھ ضابطے اور قاعدے ہیں جن کی پابندی کرنا ضروری ہے۔

ہندوستان میں مہابھارت ایک بہت بڑی تاریخی لڑائی ہوئی ہے، مجھے اس کی تاریخی حیثیت سے انکار نہیں ہے، مگر اس دنیا میں ایک دوسری مہابھارت بھی پائی جاتی ہے، یہ ہندوستان کی مہابھارت سے زیادہ قدیم ہے، یہ وہ لڑائی ہے جو خدا پرستی اور نفس پرستی کے درمیان ہمیشہ سے جاری ہے، یہ لڑائی کسی ایک ملک تک ہی محدود نہیں رہی ہے بلکہ دنیا کے ہر ہر ملک میں پہنچی اور نہ یہ جنگ کے میدانوں ہی تک محدود رہی بلکہ اس کے معرکے گھروں کے اندر بھی ہوئے ہیں، یہ زندگی کے وہ اصول ہیں جو ہمیشہ ایک دوسرے پر غالب آنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ حضرات پیغمبران نے اپنے اپنے وقتوں میں ہر جگہ خدا پرستانہ زندگی کی دعوت دی ہے، اور ان کی کامیابی کے دور میں اسی قسم کی زندگی کا دور دورہ رہا، لیکن نفس پرستی ہمیشہ کے لیے کبھی فنا نہیں ہوئی بلکہ اسے جب بھی موقع ملا وہ زندگی پر قابض ہو گئی۔ بدقسمتی سے ہمارا زمانہ وہ ہے جس میں نفس پرستی زندگی پر پوری طرح مسلط ہے، زندگی کا ہر شعبہ اور ہر میدان اس کی گرفت میں آیا ہوا ہے، گھروں میں نفس پرستی، بازاروں میں نفس پرستی، دفتروں میں نفس پرستی، کارخانوں میں نفس پرستی ـــــ گویا ایک سمندر ہے جو خشکی میں پورے زور شور سے بہہ رہا ہے، اور ہم اس میں گلے گلے اترے ہوئے ہیں ـــ یہ نفس پرستی اب مستقل ایک مذہب بن چکا ہے نہیں، بلکہ ہمیشہ سے اس کی یہ نوعیت رہی ہے اور عموماً اسی مذہب کے ماننے والوں کی تعداد سب سے زیادہ رہتی ہے ہر چند کہ مذاہب کی فہرست میں اس نام کا کوئی مذہب نہیں بتلایا جاتا، اور نہ اس نام سے کسی مذہب کے ماننے والوں کی تعداد کا شمار کیا جاتا ہے، مگر یہ اپنی جگہ بالکل حقیقت ہے کہ یہ دنیا کا سب سے بڑا مذہب ہے، اور اس کے ماننے والے سب سے زیادہ تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ آپ کے سامنے مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے اعداد و شمار آتے ہیں کہ عیسائی مذہب کے پیرو اتنے، اسلام کے پیرو اتنے، اور ہندو دھرم کے ماننے والے اتنے، حالانکہ ان میں سے ہر ایک میں ایک بڑی تعداد ان لوگوں کی ہے جو کہلاتے تو ہیں مذہباً عیسائی، ہندو اور مسلمان لیکن ہیں درحقیقت اسی مذہب نفس پرستی کے پیرو! ...... نفس پرستی کی زندگی کا رواج، اور اس مذہب کی مقبولیت صرف اس

وجہ یہ ہے کہ آدمی کو اس میں مزہ بہت آتا ہے، تاکہ نفس پرستی کی زندگی بڑے مزے کی اور بڑے لطف
ہے۔ اور ہر آدمی کی طبعی خواہش لطف اندوزی ہوتی ہے، لیکن اگر دنیا کے تمام انسانوں کو سامنے رکھ کر
جائے تو پھر اس قسم کی زندگی دنیا کے لیے ایک لعنت ہے، اور اس کی ساری مصیبتیں، اور سارے دکھ
نفس پرستی کا نتیجہ ہیں، اور دنیا کی ساری تباہیوں، تمام قحطوں، اور ناانصافیوں کی ذمہ داری انھیں
پر عائد ہوتی ہے جو اس منحوس مذہب کے پیرو ہیں۔ اس دنیا میں اس مذہب کی گنجائش صرف اس
ہو سکتی ہے کہ پوری دنیا میں صرف ایک انسان کا وجود ہو، اس صورت میں وہ اپنے نفس کی مانگ
من مانے طور پر پورا کرنے کا حقدار ہو سکتا ہے، لیکن واقعہ یوں نہیں ہے، اس دنیا کے پیدا کرنے وا
اس میں کروڑوں اور اربوں انسانوں کو بسایا ہے، اور ان میں سے ہر ایک کے ساتھ نفس، خواہشات
ضروریات نفس لگی ہوئی ہیں، ایسی صورت میں جو شخص بھی من مانی زندگی گزارنے کی کوشش کرتا
گویا اس واقعہ سے آنکھیں بند کرتا ہے کہ اس کے ساتھ اس کے اور بھی ہم جنس رہتے ہیں۔ لیکن واقعہ
بند کرنے سے واقعہ غلط نہیں ہو جاتا وہ اپنی جگہ پر رہتا ہے، اس لیے کچھ لوگوں کی نفس پرستی کا نتیجہ لا
کی مشکلات اور مصائب کی شکل میں نکلے گا۔

نفس پرستی کی زندگی گزارنے والا من کا راجہ ہوتا ہے، من کا راجہ وہ راجہ ہے کہ اگر سار
میں بھی اس کی خواہشات پر سکہ چلے، تو اس کا پیٹ اتنے میں بھی نہیں بھر سکتا، وہ اس سے اور زیاد
مند رہے گا ـــــ غور فرمائیے جب یہ ساری کائنات بھی ایک من کے راجہ کی تسکین کے
ناکافی ہے تو آج جو ایک ایک گھر کی محدود سی دنیا میں کئی کئی من کے راجہ پائے جاتے ہیں تو وہ کیونکر
اور چین پا سکتے ہیں۔ اس نفس پرستی کے مرض نے ایک ایک گھر میں چار چار من کے راجہ پیدا کر دیے
بھی راجہ، ماں بھی رانی، بیٹا بھی راجہ، اور بیٹی بھی اپنے من کی رانی، تو کیونکر گھروں میں چین اور
سکتا ہے؟ یہ نفس پرستی کی زندگی جس کو ہر شخص گزار کر مزہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ایک آگ بنی ہوئی
ایک گھر کے افراد بھی جل رہے ہیں، ایک ملک کی قوم بھی جل رہی ہے اور دنیا کی پوری آبادی جل
رہی ہے۔

دوستو!

دنیا کی مصیبتوں کی جڑ یہی ہے کہ ہر شخص اپنے نفس کی اطاعت کرنا چاہتا ہے! ان مصیب
یہ ہے کہ من کا کہا ماننے کے بجائے خدا کی اطاعت کرو۔ یہ دنیا کروڑوں کی تو کیا، دو آدمیوں کی بھی
کی گنجائش اپنے اندر نہیں رکھتی اس لیے من مانی زندگی گزارنے کے خیال کو چھوڑ دو، اور اس طرح

ہنی کر دجس کا پیغام اللہ کے پیغمبروں نے دیا تھا، یعنی خدا پرستی کی زندگی۔ اس دنیا کے پیدا کرنے والے
زمانہ میں اس زندگی کے پیغامبر پیدا ہوئے، کیونکہ اسی طرز زندگی سے دنیا کا نظام ٹھیک رہ سکتا ہے، جتنا ہو سکتا تھا،
مبروں نے پوری طاقت سے اس طرز زندگی کی دعوت دی، اور نفس پرستی کا زور توڑنے کی پوری طاقت صرف
کی، لیکن جیسا کہ میں شروع میں عرض کر چکا ہوں پیغمبروں کے بعد نفس پرستی کا رواج دنیا سے مٹا نہیں اور جب
پرستی کی دعوت کمزور پڑی، نفس پرستی کا رواج بڑھ گیا اور اسکا سیلاب آتے ہی دنیا کے تمام لوگوں کی [illegible] جب بڑھ گیا، اور
حد بات بڑھ گئیں مثال کے طور پر [illegible] صدی عیسوی کا زمانہ دیکھئے، اس صدی میں نفس پرستی کی زندگی کا رواج انتہا کو پہنچ
گیا تھا، ملک ملک اسی کا دور دورہ تھا، یہ ایک پھیلا ہوا دریا تھا جس کے دھارے پر ہر ہر چھوٹا بڑا
تھا بادشاہ اپنی نفس پرستی میں مبتلا تھے، رعایا ان کی نقل میں نفس پرستی کا شکار تھی۔ مثال کے طور پر ایران
بیان کرتا ہوں:۔۔۔

وہاں قوم کا ہر طبقہ نفس پرستی کا بیمار تھا ۔۔۔ شاہ ایران کی نفس پرستی کا حال یہ تھا کہ اس کی بیبیوں کی
دہ ہزار تھی جب مسلمانوں نے اس ملک کو اس مصیبت سے نجات دلانے کے لیے حملہ کیا، اور ایران کا بادشاہ
چھوڑ کر بھاگا تو ایسے نازک وقت میں بھی حال یہ تھا کہ اس کے ہمراہ ایک ہزار باورچی تھے، ایک ہزار
تھے اور ایک ہزار باز اور شکرے کے محافظ و منتظم تھے، مگر اس پر بھی اس کو افسوس تھا کہ بڑی بے سروسامانی
نا ہوا ہے۔ اس زمانہ کے جنرل اور سپہ سالار ایک ایک لاکھ کی ٹوپی اور ایک لاکھ کا پٹکا لگاتے تھے اونچی
ں میں معمولی کپڑا پہننا گویا جرم تھا لیکن اس طبقہ کی نفس پرستی نے عوام کو کن کن مشکلات میں مبتلا
س کا اندازہ اس سے کیجیے کہ کسانوں کا حال یہ تھا کہ وہ لگان بھی نہیں دے سکتے تھے، اور زمینیں چھوڑ
خانقاہوں، عبادت گاہوں میں جا بیٹھتے تھے۔ متوسط طبقہ کے لوگ امراء کی ریس میں دیوالیہ ہو گئے
تھے چنانچہ معاشی لوٹ کھسوٹ برپا تھی، غرض زندگی کیا تھی، ایک ریس کا میدان تھی ظلم و زیادتی عام
ہر بڑا اپنے چھوٹے کو، اور حاکم اپنے محکوم کو لوٹنے، اور اس کا خون چوسنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا اور پوری
ٹی میں ایک بڑا [illegible] پھیلی ہوئی تھی ۔۔۔ آپ سمجھتے ہیں کہ ایسی سوسائٹی میں عقائد، اخلاق اور کیرکٹر
پ سکتا ہے، اور کس کو آخرت کی فکر اور اخلاقی ذمہ داریوں کا احساس رہ سکتا ہے ان تمام اعلیٰ چیزوں کو نفس
پرستی کا سیلاب بہائے لئے چلا جا رہا تھا، لیکن کوئی نہ تھا جو اس سیلاب پر بند باندھتا اور اس دھارے کو
، ادبا، اور فلاسفہ، سب اسی کے رخ پر تنکوں کی طرح بہہ رہے تھے۔ کسی میں ہمت نہ تھی
ارے کے رخ کے خلاف پیر کر دکھاتا، اور دھارا بھی کون سا؟ پانی کا نہیں عام
کا دھارا؟ اس کی ہمت ایک شیر دل انسان ہی کر سکتا ہے ۔۔۔ اللہ کو منظور

تھا کہ اس دھارے کا رخ موڑا جائے اس کام کے لیے اس نے عرب میں ایک انسان کو پیدا کیا اور اس کو نبوت عطا کی، جس کو ہم محمد رسول اللہ کے نام سے یاد کرتے ہیں (صلی اللہ علیہ وسلم) جنھوں نے دھارے کے خلاف پیر کر ہی نہیں بلکہ اس کا رخ کر دکھایا ——— اس وقت کسی آدمی سے کام نہیں چل سکتا تھا جو دھارے کا رخ تو نہ موڑ سکے، بلکہ اس میں بہنے والی چیزوں کو نکال لائے، اس لیے کہ اس وقت کوئی ایسا محفوظ مقام نہ تھا جہاں اس سیلاب کا دھارا پہنچ رہا ہو عبادت گاہوں اور کلیساؤں تک کو تو اس سیلاب نے اپنی زد میں لے رکھا تھا اس سمندر میں کوئی ٹاپو نہ تھا اور اگر تھا تو وہ بھی اس خطرے کی زد میں تھا۔ ایمان، اخلاق، شرافت، تہذیب اور مختصر الفاظ میں انسانیت کی روح کو اس سیلاب سے بچانے کا کام اگر کوئی شخص کر سکتا تھا تو وہی شخص کر سکتا تھا جس میں دھارے کا رخ موڑ دینے کی ہمت ہو۔ ایسی ہستی اس وقت صرف اللہ کے اسی آخری پیغمبر کی ہستی تھی جس نے رواج عام کے اس دھارے کو جو ایک طوفانی انداز میں نفس پرستی کی سمت میں بہہ رہا تھا چند سال کی کوشش سے خدا پرستی کی طرف پھیر دیا۔ ہمیں چھٹی صدی عیسوی کی دنیا کی تاریخ میں ایک دم سے ایک حیرت انگیز انقلاب نظر آتا ہے جس نے ساری زندگی کو اور بالآخر ساری دنیا کو متاثر کیا اور اب بھی جو کچھ انسانیت، اور خدا پرستی کا بچا کھچا سرمایہ ہے وہ سب انھیں کی محنت کا فیض ہے ؎

بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے ۔۔۔ یہ سب پود انھیں کی لگائی ہوئی ہے

ممکن ہے آپ میں سے کسی کو یہ شبہ گزرے کہ یہ کہنا تو صحیح نہیں ہے کہ اس زمانے میں عام طور پر لوگ صرف نفس پرست تھے کیونکہ وہاں بہت سی دوسری "پرستیاں" بھی موجود تھیں۔ کچھ لوگ سورج پرست تھے، کچھ لوگ آگ کو پوجتے تھے، کچھ صلیب کو پوجتے تھے، کچھ درختوں کو پوجتے تھے اور کچھ پتھروں کی پرستش کرتے تھے، ٹھیک ہے! یہ بات اپنی جگہ پر صحیح ہے، مگر یہ تمام "پرستیاں" ایک پرستی کی تھیں جسکے عام رواج کا میں دعویٰ کر رہا ہوں یہ ساری پرستیاں اس لیے کی جاتی تھیں کہ یہ نفس پرستی کے مخالف نہ تھیں، یہ پرستیاں، من مانی زندگی گزارنے میں رکاوٹ نہیں ڈالتی تھیں۔ آگ، پیڑ، پتھر، سورج وغیرہ ان سے نہ کہتے تھے کہ یہ کام کرو اور یہ مت کرو، اس لیے وہ ان کی پرستش کے پہلو بہ پہلو اپنے نفس کی اطاعت بھی کرتے رہتے تھے۔ اور دونوں میں کوئی تناقض نہیں پاتے تھے ——— بہرحال ہمارے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس سیلاب سے لڑنے اور اس کا رخ موڑ دینے کا بیڑا اٹھایا، اور پوری سوسائٹی سے لڑائی مول لی، حالانکہ آپ اپنی اس سوسائٹی میں بہت مقبول اور ہر دلعزیز تھے، صادق اور امین کے معزز لقب سے یاد کیے جاتے تھے اور اس لیے آپ کو ترقی کے بڑے بڑے مواقع حاصل تھے، آپ کو اپنی قوم کا اتنا اعتماد حاصل تھا کہ ترقی کا کوئی اونچے سے اونچا مقام نہ تھا جو آپ کو مل نہ سکتا مگر یہ سب کچھ تب ممکن تھا جب آپ اُن

کی زندگی کو غلط نہ کہتے، اور اس کو ایک دوسرے رُخ پر موڑ دینے کے عزم و ارادہ کا اظہار نہ فرماتے، مگر آپ کو اللہ نے کھڑا ہی اسلئے کیا تھا کہ بہاؤ کے رُخ پر نہ خود بہیں، اور نہ کسی کو بہنے دیں۔ اسلئے سب سے پہلے تو آپ نے اپنی زندگی کو خدا پرستی کی زندگی کا نمونہ بناکر پیش کیا اور بالفعل، گویا دھارے کے خلاف پیر کر دکھایا۔ پھر پوری سوسائٹی کے رُخ کو نفس پرستی سے ہٹا کر خدا پرستی کی طرف موڑ دینے کی کوشش شروع کی۔ اس کوشش کو کامیاب بنانے کے لیے آپ نے تین بنیادی چیزیں لوگوں کے سامنے پیش کیں ———— ۱ یہ یقین کرو کہ تمہارا اور اس ساری دنیا کا پیدا کرنے والا اور اس پر حکومت کرنے والا، ایک ہے۔ ۲ یہ یقین کرو کہ اس زندگی کے ختم ہونے کے بعد ایک دوسری زندگی ہے جس میں اس زندگی کا حساب و کتاب دینا ہے۔ ۳ یہ یقین کرو کہ میں اللہ کا بھیجا ہوا پیغمبر ہوں، اس نے اس دنیا کے متعلق احکام دیکر مجھے بھیجا ہے۔ جن احکام پر مجھے بھی چلنا ہے اور تمھیں بھی ———— آپ نے جب ان چیزوں کا اعلان فرمایا تو سوسائٹی میں ایک ہلچل مچ گئی، مخالفین اٹھ کھڑے ہوئے! اس لیے کہ یہ نعرہ ان کی زندگی کے آرام میں خلل ڈالنے والا تھا، سارا زمانہ جس رُخ پر بہہ رہا تھا، اس کو چھوڑ کر دوسرا رُخ اختیار کرنا آخر کوئی آسان کام تھا۔ زندگی کی کشتی بہاؤ پر بلا دقت کے چلی جا رہی تھی انھیں کیا پڑی تھی کہ بہاؤ کے خلاف اپنی کشتی چلا کر دقتیں اور خطرات مول لیں، اس لیے انھوں نے چاہا کہ یہ آواز دب جائے، کچھ لوگوں نے آپ کی نیت ہی پر شبہ کیا، ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ دیکھنے میں ایک انھیں جیسا انسان اتنا صاحب عزم بھی ہو سکتا ہے کہ زندگی کے اس طوفانی دھارے کا رُخ موڑنے کی ٹھانے جس میں صرف ہم ہی نہیں دنیا کی ساری قومیں، ان کے علماء اور حکماء ان کے احبار و رہبان ان کے ائمہ تہذیب و سیاست، ان کے عقائد و اخلاق، ان کے علوم و فلسفے، اور ادب و سیاست خس و خاشاک کی طرح بہے چلے جا رہے ہیں ———— وہ اس دعوے میں کسی شخص کو مخلص ماننے سے قطعاً عاجز تھے، اس لیے انھوں نے سمجھا کہ اس دال میں کچھ کالا ضرور ہے، ہو نہ ہو اس بلند بانگ دعوے کے پیچھے کچھ اور مقصد اور کوئی خواہش کام کر رہی ہے اس لیے انھوں نے ایک وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا جس نے اپنے خیال کے مطابق تین بڑی چیزیں آپ کے سامنے پیش کیں۔ اس نے کہا اگر آپ کا مقصد اس قسم کی باتوں سے یہ ہو کہ ہم آپ کو اپنا سردار تسلیم کر لیں تو چھوڑیئے ان باتوں کو ہمیں یہ منظور ہے اور یا اگر آپ بہت سے مال و دولت کے طالب ہوں تو ہمیں یہ بھی منظور ہے۔ اور یا اگر آپ کسی حسین عورت کے خواہشمند ہوں تو ہمیں یہ بھی منظور ہے، ہم ملک کی سب سے حسین عورت آپ کو پیش کریں گے، آپ نے جو یہ نئی بات اٹھانی شروع کی ہے اس سے دستبردار ہو جائیے!

مگر اللہ کے اس سچے رسول ﷺ اور خدا پرستی کے سب سے بڑے علمبردار نے نہایت بے نیازی سے جواب دیا کہ میں تم سے کچھ لینا نہیں دینا چاہتا ہوں، اور وہ میری یہی تین باتیں ہیں جن کی میں تمہیں دعوت دے رہا ہوں میں چاہتا ہوں کہ تمہیں موت کے بعد والی زندگی میں راحت ملے اور وہ میری ان تین باتوں کے قبول کرنے پر موقوف ہے۔ آپ کی زبان ہی نہیں بلکہ آپ کی پوری زندگی نے ان لوگوں کے اس خیال کی تردید کی کہ آپ دنیا کی کسی چیز کے خواہشمند ہیں، مخالفت نے اتنی شدت اختیار کی کہ آپ کو مکہ چھوڑ کر مدینہ جانا پڑا، مگر خدا پرستی کی دعوت کو نہیں چھوڑا۔ مخالفین کو اندازہ نہیں تھا کہ آپ نفس پرستی سے کتنی دور ہیں اور اس دھارے کے مخالف سمت میں تیرنے کی آپ میں کتنی طاقت تھی اور کتنا عزم تھا۔ آپ نفس پرستی سے اتنی دور تھے کہ جب مکہ چھوڑنے کے کچھ سال بعد آپ پھر مکہ میں آئے اور فاتحانہ حیثیت سے آئے اپنے مخالفوں کو مغلوب کر کے آئے، تب بھی آپ کی خدا پرستانہ شان میں ذرا تغیر نہ ہوا، فتح کا نشہ آپ پر ذرا بھی نہیں چڑھا، مکہ میں آپ کا داخلہ اس شان سے ہوا کہ اونٹ پر سوار تھے، بدن پر غریبانہ لباس تھا، اور زبان پر خدا کا شکر اور اپنی عاجزی کا اظہار تھا۔ اس موقع پر ایک آدمی آپ کے سامنے آیا اور رعب سے کانپنے لگا۔ آپ نے فرمایا گھبراؤ نہیں، میں قریش کی اس غریب عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھا گوشت کھایا کرتی تھی۔ سوچیے! کیا کوئی فاتح ایسے وقت میں ایسی بات کہہ سکتا ہے جس سے اس کا رعب لوگوں پر سے گھٹ جائے؟ ایسے وقت میں تو کوشش کی جاتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ رعب ڈالا جائے ——— آپ آج بھی دیکھتے ہیں اور آج سے پہلے کا حال تاریخ میں پڑھ سکتے ہیں کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں حکومت اور اقتدار آجاتا ہے، ان کی آل اولاد اس سے کتنا نفع اٹھاتے ہیں، اور اس کے بل پر کیسے کیسے عیش و آرام کے مزے لوٹتے ہیں، مگر خدا پرستی کے سب سے بڑے علمبردار کا حال اس معاملہ میں بھی دنیا سے مختلف تھا، آپ کی صاحبزادی اپنے گھر کا سارا کام اپنے ہاتھ سے کرتی تھیں، جس کی وجہ سے آپ کے ہاتھوں میں گھٹے پڑ گئے تھے اور جسم پر مشکیزہ اٹھانے کے نشانات ہو گئے تھے، ایک دن انھوں نے سنا کہ میدان جنگ سے کچھ غلام اور کنیزیں ابا جان کی خدمت میں لائی گئی ہیں، خیال کیا کہ میں بھی اپنے لیے ایک آدھ غلام یا کنیز مانگ لاؤں، تشریف لے گئیں، اپنی پریشانی کا حال بیان کیا، ہاتھوں کے گھٹے دکھائے، حضور نے فرمایا: بیٹی! میں تمہیں غلام اور باندی سے اچھی چیز دیتا ہوں، غلام اور باندی ان مسلمانوں کے حصے میں جانے دو، تم سوتے وقت تینتیس ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ، تینتیس ۳۳ مرتبہ الحمد للہ، اور چونتیس ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر پڑھ لیا کرو! یہ بے نفسی اور خدا پرستی کی کیسی عجیب مثال ہے جس کا آپ خدا پرستوں

کے سردار تھے، کیا کوئی پھر بھی آپ کی بے نفسی پر حرف لا سکتا ہے۔ دوسروں کے حق میں یہ فیاضی اور اپنے اور اپنی اولاد کے لیے فقر و غربت کو ترجیح دینا پیغمبر ہی کی شان ہے ۔

ہر دلیل ہمت ما قیمت فطرت عرفی — کہ حاتم دگراں و گدائے خویشتن است

آج ایسے لوگ آپ کے سامنے ہیں جنھوں نے پچھلے کچھ دنوں میں چند روز یا چند سال جیلیں کاٹ لی ہیں تو آج اقتدار حاصل ہونے پر ان تکلیفوں کا سارا حساب مع سود کے چکا لینے پر ہیں --- جب کسی شخص کو اقتدار اور قانون کی طاقت مل جاتی ہے تو عموماً وہ اپنے اعزہ، اور اپنی اولاد کو قانون کی گرفت سے بچانے کی سعی کرتا ہے، مگر خدا پرستوں کے سردار کی شان اس معاملہ میں بھی بالکل نرالی تھی۔ ایک عورت پر چوری کا الزام ثابت ہوا، آپ نے ہاتھ کاٹنے کا حکم دے دیا، لوگوں نے حضورؐ کے ایک مقرب اور محبوب صحابی سے سفارش کرائی کہ معاف فرما دیا جائے، حضورؐ کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا! اور فرمایا: "خدا کی قسم! اگر محمد کی (چہیتی) بیٹی فاطمہ رضہ سے بھی یہ جرم سرزد ہو جائے، تو محمدؐ اس کا بھی ہاتھ کاٹے گا۔"

اپنے آخری حج کے موقع پر مسلمانوں کے عظیم ترین اجتماع میں آپ نے کچھ قوانین اور احکام کا اعلان عام فرمایا تو ان کو سب سے پہلے اپنے رشتہ داروں اور اپنے خاندان پر جاری کیا۔ آپ نے مجمع عام میں کھڑے ہو کر اعلان فرمایا کہ جاہلیت کے تمام دستور ختم کئے جاتے ہیں، منجملہ ان کے سودی لین دین آج سے ختم، اور سب سے پہلے میں اپنے چچا عباسؓ کے سودی قرضے کو باطل قرار دیتا ہوں، اب ان کا سود کسی پر واجب نہیں، اب وہ سود کا روپیہ کسی سے وصول نہیں کر سکتے۔ یہ تھی خدا پرستی! ورنہ آج کل کے قانون ساز اگر اس قسم کے قانون بنانے والے ہوں تو اپنے رشتہ داروں اور ملنے والوں سے پہلے سے کہدیں کہ فلاں قانون آنے والا ہے ذرا جلدی جلدی اپنی فکر کر لو۔ زمینداری کے خاتمہ کا قانون پاس ہونے والا ہے، جتنی زمین نکال سکتے ہو نکال لو یا بیچنا چاہو تو بیچ دو۔ ایسے ہی اس موقع پر آپ نے اعلان فرمایا کہ زمانۂ جاہلیت (یعنی قبل اسلام) کے تمام خون باطل کیے جاتے ہیں، اب ان کا انتقام نہیں لیا جا سکتا، اور اس کے ماتحت میں سب سے پہلے (اپنے خاندان کا خون) ربیعہ بن الحارث کا خون باطل قرار دیتا ہوں ——— ہمارے حضورؐ اس بے مثال خدا پرستی کے ساتھ (جس کی صرف چند مثالیں میں نے بیان کی ہیں) نفس پرستی کے اس سیلاب سے لڑتے رہے جو دنیا کی ساری قوموں کو بہائے لیے چلا جا رہا تھا، اور آخرکار اس کو روکنے میں کامیاب ہوئے، اور لوگ مجبور ہوئے کہ آپ کی بات پر کان دھریں اور مانیں۔ چنانچہ جن لوگوں نے آپ کی ان تین بنیادی باتوں کو کماحقہٗ قبول کر لیا جو

سخت ناراض ہوئے، اور بڑے دین کی صدارت کے درپے ہوگئے۔

اور صرف یہی چند افراد ہی نہیں، بلکہ آپ نے پوری قوم اور سوسائٹی کی اسی اصول پر تربیت کی تھی کہ وہ ایک خدا پرست سوسائٹی ہو۔ یکایک یہ اصول تھا کہ جو کسی عہدے کا طالب ہو اور خواہشمند [illegible] ہو اسکو عہدہ نہیں دیتے تھے، ایسی سوسائٹی میں عہدے کے امید وار بننے اپنی تعریف و توصیف کرنے اور حکومت کے لیے ایک دوسرے کا مقابلہ کرنے کی کیا گنجائش تھی، جس جماعت کے سامنے ہر وقت قرآن مجید کی یہ آیت رہتی ہو:۔

تلك الدار الآخرة نجعلها للذين لا يريدون علوًا في الأرض ولا فسادًا والعاقبة للمتقين ۝

یہ آخرت کا گھر ہم ان لوگوں کے لیے مخصوص رکھیں گے جو زمین میں اپنی سربلندی نہیں چاہتے اور نہ فساد پھیلانا چاہتے ہیں اور انجام خدا سے ڈرنے والوں کا ہے۔

جس جماعت کا اس حقیقت پر ایمان ہو، وہ کیا اپنی سربلندی اور فتنہ و فساد کے جرم کا ارتکاب کرسکتی ہے؟

دوستو!! اور بزرگو! یہ خدا پرستی کی دعوت تھی جو حضورؐ نے دنیا میں پیش کی تھی، اور نتائج کے لحاظ سے یہ دنیا کی سب سے زیادہ نفع بخش کوشش ہے، کوئی شخص دنیا کی کسی اور دعوت کا نام لیکر نہیں بتلا سکتا کہ اس نے دنیا کو اتنا فائدہ پہنچایا۔ حالانکہ اس دعوت کے حصہ میں انسانوں کی اتنی کوششیں اور اتنے وسائل نہیں آئے جو عصر حاضر کی معاشی اقتصادی اور سیاسی تحریکوں کے حصہ میں آئے ہیں، مگر پھر بھی ان تمام تحریکوں کے فائدے مل کر بھی اس ایک دعوت کے فائدوں کا دسواں حصہ بھی نہ ہوسکے۔ آج بھی دنیا سے معاشی اور سیاسی ظلم اور اخلاقی برائیاں جبھی دور ہو سکتی ہیں جب دنیا اس دعوت کو قبول کرلے، لیکن اور کسی کے متعلق کیا کہا جائے جب [illegible] دعوت [illegible] نفس [illegible] ہوگئے۔۔۔ نفس پرستی تو چوٹ کھائے ہوئے بیٹھی تھی اس نے موقع پاکر خدا پرستی کے [illegible] انتقام لیا جس نے اسے شکست دی تھی، اور وہ مسلمان جس کا امتیاز [illegible] کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنهون عن المنكر افسوس! آج اس نفس پرستی کا [illegible] ہے۔

مسلمانو! تم نے بڑا ظلم کیا ہے، تمہارا کام تو خدا پرستی کا نمونہ بننا تھا، اور ساری دنیا کو اس کی دعوت دینا تھی، تم نے نفس پرستی کو اختیار کرکے اپنا بھی نقصان کیا، اور ساری دنیا کو بھی مشکلات میں پھنسا دیا۔ اگر تم اپنا فرض ادا کرتے رہتے، تو یہ نفس پرستی دنیا میں دوبارہ غالب ہوتی، اور نہ دنیا کا یہ حشر بنتا۔ آج دنیا کی سب سے بڑی مصیبت نفس پرستی ہے، دنیا کے بڑے بڑے لیڈر اور امن کے علمبردار ڈرومین، چرچل اور اسٹالن، سب سے بڑے نفس پرست ہیں، یہ اپنی نفس پرستی میں، اور قومی غرور میں (جو نفس پرستی کی ایک ترقی یافتہ اور وسیع شکل ہے) دنیا کو خاک سیاہ کرنے کے لیے

ہر وقت تیار ہیں، ایٹم بم سے زیادہ خطرناک نفس پرستی ہے جس نے دنیا کو تباہ کر دیا، لوگوں کو ایٹم بم پر غصہ آتا ہے کہ قیامت برپا کر دینے گا، میں کہتا ہوں کہ ایٹم بم کا کیا قصور؟ اصل مجرم تو اس کا بنانے والا ہے، اور اس سے بھی پہلے وہ درسگاہیں اور وہ تہذیب ہے جو اس ایٹم بم کو وجود میں لائی ہے اور اس سب کی جڑ وہ نفس پرستی ہے جس نے اس تہذیب کو جنم دیا ہے۔

دوستو! ہماری دعوت اور ہماری تحریک بس یہی ہے، اور اسی مقصد کے لیے ہے کہ نفس پرستی کے خلاف محاذ قائم کیا جائے، خدا پرستی کی زندگی کا طریقہ دنیا میں عام کیا جائے۔ ہم نے اسی مقصد کے لیے یہ خاص اجتماعات کیے ہیں، اور محض اسی مقصد کے لیے ہفتہ وار اجتماع کرتے ہیں، جہاں ہم قوم کے ہر طبقہ کو جمع ہونے کی دعوت دیتے ہیں اور ان کے سامنے خدا پرستی کی دعوت کے سب سے بڑے علمبردار حضرت محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کی تعلیمات ان کے حالات زندگی، اور ان کے سابقوں کے واقعات پیش کرتے ہیں جو سچی خدا پرستی کا راستہ دکھانے والے ہیں، اور ہمارے یقین کے مطابق انھیں میں انسانیت کی نجات، اور دنیا کی مشکلات کا حل ہے ــــ ہمارا کام، اور ہماری دعوت ایک کھلی ہوئی کتاب ہے جس کا جی چاہے پڑھ لے۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین ؑ

(الفرقان، بابت صفر و ربیع الاول ۱۳۷۱ھ)

مولانا محمد منظور نعمانی

انسانیت کا سب سے بڑا مسئلہ

اور

اُمّتِ مسلمہ کی ذمہ داری

> مدیر الفرقان کی ایک تقریر جو اپریل ۱۹۶۵ء میں صوبہ بہار کے شہر گیا کے ایک ایسے عام اجتماع میں کی گئی جس میں غیر مسلم حضرات بھی کافی تعداد میں موجود تھے

الحمد لِلّٰہِ الَّذِی ھَدَانَا لِھٰذَا وَمَا کُنَّا لِنَھْتَدِیَ لَوْلَا اَنْ ھَدَانَا اللّٰہُ لَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ۔

حضرات!

ہم سب خدا پرستوں کا عقیدہ ہے کہ اس ساری دنیا کو ایک اللہ نے پیدا کیا اور وہی دنیا کے اس کارخانہ کو چلا رہا ہے اور ہم آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ اس پوری کائنات میں اور اس سارے سنسار میں انسان کو اللہ نے وہ صلاحیتیں دی ہیں اور وہ طاقتیں بخشی ہیں جو دوسری مخلوقات کو نہیں ملی ہیں اس دنیا میں جو ترقیاں اور جو نئی نئی ایجادیں ہو رہی ہیں وہ سب انسان ہی کی قابلیت اور انسان ہی کی ترقی پسندی کا نتیجہ ہیں۔

انسان کو ترقی کرنے اور بڑھنے کی جو صلاحیت اور قابلیت دی گئی ہے اس کے ذریعہ وہ نیکی اور بھلائی میں بھی ترقی کر سکتا ہے اور اسی طرح بدی اور برائی میں بھی۔ وہ اگر اپنی صلاحیتوں اور طاقتوں کو نیکی کے راستہ پر لگائے تو ایسے بلند مقام تک پہنچ سکتا ہے اور وہ مرتبے حاصل کر سکتا ہے جہاں فرشتوں کی بھی

رسائی نہیں، اور اگر اپنی اسی طاقت اور قابلیت کو وہ برائی کے راستہ پر لگائے اور اس کے ذریعہ بدی اور شرارت میں ترقی کرے تو ایسا شریر اور موذی بن سکتا ہے کہ سانپ بچھو اور بھیڑیئے اور چیتے بھی اس سے پیچھے رہ جائیں۔

اللہ تعالیٰ نے نبوت اور پیغمبری کا سلسلہ اسی لیے جاری فرمایا اور مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں اور قوموں میں ہزاروں رسول اور پیغمبر اسی واسطے بھیجے کہ وہ انسان کو نیک بن کر دنیا میں رہنے اور نیکی کے راستہ پر اپنی طاقت صرف کرنے کا طریقہ بتلائیں اور اپنی تعلیم و تربیت سے ان کو نیک اور صالح بنا کر فرشتوں سے بھی آگے بڑھائیں۔

انبیاء علیہم السلام کی تاریخ سے ہم نے جو کچھ سمجھا اور جانا ہے وہ یہ ہے کہ انسانوں کو وہ زندگی کے تین بنیادی اصول دیتے ہیں اور ان ہی اصولوں کی بنیاد پر وہ پوری زندگی کی تنظیم اور تشکیل کرتے ہیں یعنی یہ بنیادی اصول جن کاموں کے کرنے کا تقاضا کرتے ہیں وہ حضرات اپنے ماننے والوں کو ان کے کرنے کا حکم دیتے ہیں اور جن چیزوں سے بچنے اور جن باتوں کو چھوڑنے کا تقاضہ کرتے ہیں وہ ان سے منع کرتے ہیں۔

ان میں پہلا بنیادی اصول وہ یہ دیتے ہیں کہ انسان اس پر یقین کرے اور دل سے اس کو مانے کہ میرا اور ساری دنیا کا بس ایک خالق اور رب ہے وہی دنیا کے اس پورے کارخانے کو بلا شرکت غیرے چلا رہا ہے اور اس پوری کائنات کی ہر چیز صرف اسی کے قبضہ اور اختیار میں ہے، جس کو جو چاہے دے اور جس سے جو چاہے لے۔ موت اور زندگی، بیماری اور تندرستی، رزق کی فراخی اور تنگی، خوشحالی اور بدحالی سب اسی کے ہاتھ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور اسی کے حکم سے آتی اور جاتی ہے اس لیے بس وہی عبادت کا مستحق ہے اور اس کو راضی کرنا اور زندگی کے سارے معاملات میں اس کی مرضیات پر چلنا اور اس کا حکم ماننا انسان کا سب سے اہم فرض ہے۔

یہ سب سے پہلا اصول ہے جو انبیاء علیہم السلام انسانوں کو زندگی کی بنیاد کے طور پر دیتے ہیں اور ہدایت کرتے ہیں کہ زندگی کے سارے معاملات میں اس اصول کو ملحوظ رکھا جائے، جو کچھ سوچا جائے اسی کی روشنی میں سوچا جائے اور جو کچھ کیا جائے اسی کی بنیاد پر اور اس کے تقاضے کے مطابق کیا جائے۔

دوسرا اصول وہ یہ دیتے ہیں کہ انسان اس کا یقین کرے اور دل سے اسکو حق اور یقیناً ہونے والا واقعہ مانے کہ اس زندگی میں وہ جو اچھے برے عمل کریگا مرنیکے بعد والی زندگی میں وہ ضرور اسکی سزا یا جزا پائیگا اگر وہ اچھے اور نیک اعمال کریگا اور زندگی اچھے طریقے اور اپنے پیدا کرنے والے کے حکموں پر چلتے ہوئے گزار کے مر جائیگا تو مرنیکے بعد وہ بڑی لذت اور مسرت والی زندگی

پائے گا اور ہمیشہ ہمیشہ اس سے لذتیں اور مسرتیں حاصل کرے گا ـــــ اور اگر وہ غلط طریقہ پر زندگی گزار کے اور اللہ کی نافرمانیاں اور بندوں کی حق تلفیاں کرکے اس دنیا سے جائے گا تو اگلی دنیا میں اسے بڑے سخت دکھ اٹھانا پڑیں گے اور وہاں اس کی زندگی بڑی ذلتوں اور مصیبتوں والی زندگی ہوگی اور وہاں کی وہ ذلتیں اور مصیبتیں اس دنیا کی بڑی سے بڑی ذلتوں اور مصیبتوں سے بھی ہزاروں لاکھوں گنا بڑی ہوں گی۔

تو انسانوں کی زندگی کے لیے دوسرا بنیادی اصول انبیاء علیہم السلام یہ دیتے ہیں کہ مرنے کے بعد کی جزا و سزا پر یقین رکھتے ہوئے اور اس کا دھیان فکر کرتے ہوئے وہ زندگی گزاریں۔

تیسرا بنیادی اصول انبیاء علیہم السلام یہ دیتے ہیں کہ انسان ہمیشہ اس حقیقت کو نظر کے سامنے رکھے اور کبھی اس سے غافل نہ ہو کہ اس کی دو حیثیتیں ہیں یعنی خود اس کی زندگی میں دو پہلو اور دو رخ ہیں ایک مادیت کا اور ایک روحانیت کا اور ان دونوں کے تقاضے باہم بہت مختلف ہیں، ہماری مادیت کی بعض خواہشیں وہ ہیں جو روحانیت کے لیے زہر ہیں اور روحانیت کے بعض تقاضے وہ ہیں جو مادی خواہشوں کے سراسر خلاف ہیں تو انبیاء علیہم السلام انسانی زندگی کا ایک بنیادی اصول یہ قرار دیتے ہیں کہ مادیت کو اور مادی خواہشات کو ہماری روحانیت پر غالب آنے اور اس کو دبانے کا موقع نہ دیا جائے بلکہ روحانیت کو غالب رکھ کر طبیعت کے مادی تقاضوں کو اس کا ماتحت اور تابع بنایا جائے۔

اللہ کے جو پیغمبر بھی جب کبھی کسی ملک میں اور کسی قوم میں آئے اگر ان کی تعلیم اور ان کے کام کے متعلق صحیح معلومات حاصل کرنے کا ہمارے آپ کے پاس کوئی ذریعہ ہو تو اس ذریعہ سے جو معلومات حاصل ہوں گی وہ یہی بتلائیں گی کہ انھوں نے زندگی کا جو نقشہ اور جو نظام ـــــــ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنی قوم کے سامنے پیش کیا تھا اس کی بنیاد ان ہی اصولوں پر تھی۔

پھر انسان جب ان سچے اصولوں کو مان لے تو اسے آپ سے آپ ضرورت محسوس ہوگی کہ وہ معلوم کرے کہ میں اللہ کی عبادت کس طرح کروں اور زندگی کے بارہ میں اس کے کیا احکام ہیں جن کی میں فرماں برداری کروں اور وہ کیا اعمال ہیں جن کو کرکے میں اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور مرنے کے بعد لذت و مسرت والی دائمی زندگی حاصل کرسکتا ہوں اور وہ کون اعمال ہیں جن کو خدانخواستہ اگر میں نے کیا تو مرنے کے بعد مجھے بے انتہا ذلتیں اور تکلیفیں اٹھانی پڑیں گی۔ اور وہ کون سا طریقہ ہے جس پر چل کر میری روحانی ترقی ہوتی رہے اور مادیت کو روحانیت پر غالب آکر اس کا گلا گھونٹنے کا موقع نہ ملے ــــــ اسلئے انبیاء علیہم السلام ان بنیادی اصولوں کے ساتھ انسانی زندگی کے متعلق اللہ کی طرف سے تفصیلی ہدایات بھی لاتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ تم کو یہ کام کرنے ہیں اور یہ باتیں چھوڑنی ہیں۔

ہمارا ایمان ہے کہ اللہ کے جو رسول اور پیغمبر جب کبھی کسی ملک اور کسی قوم میں آئے وہ اس سلسلہ کی ضروری ہدایتیں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائے اور جن لوگوں نے ان کی بات مانی اور ان کی پیروی قبول کی ان کی تعلیم و تربیت انھوں نے ان ہی اصولوں اور ان ہی ہدایات کے مطابق کی اور انھیں وہ ترقیاں حاصل ہوئیں اور وہ کمالات نصیب ہوئے کہ فرشتوں نے ان پر رشک کیا اور اللہ کے وہ پیارے ہو گئے، اور مرنے کے بعد ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ انھوں نے کیا کچھ پایا۔

اور جن لوگوں نے پیغمبروں کے لائے ہوئے ان اصولوں کو اور زندگی کے بارہ میں ان کی ہدایات کو نہیں مانا اور نہیں اپنایا اور خدا کی ہدایت اور مرنے کے بعد کی جزا و سزا کی فکر اور روحانیت کی تکمیل و ترقی سے بے پروا ہو کر جنھوں نے اپنی اغراض و خواہشات اور ہوئی و ہوس ہی کو زندگی کا منتہا اور نصب العین بنا لیا ان کا انجام اس کے سوا کچھ نہیں ہوا کہ وہ انسان نما درندے یا شکل آدم میں شیطان یا کم از کم ایک ترقی یافتہ حیوان بن گئے ہیں۔

ہماری بدنصیبی ہے کہ اس وقت دنیا ایسے ہی انسان نما حیوانوں اور آدم صورت شیطانوں سے بھری ہوئی ہے۔ خدا اور مذہب اور آخرت کا انکار کرنے والے تو اگرچہ اب بھی بہت کم ہیں لیکن زندگی کے بارہ میں انبیاء علیہم السلام کے لائے ہوئے اصول اور ان کی ہدایات اور تعلیمات سے بے پروا ہو کر اور خدا کے احکام اور آخرت کی جزا و سزا اور روحانیت کے تقاضوں سے بے فکر ہو کر خدا و مذہب کے منکروں کی سی زندگی گزارنے والوں سے ہماری یہ دنیا بھری ہوئی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان اپنی خداداد قابلیت سے صرف حیوانیت میں اور درندگی میں ترقی کر رہے ہیں اور روحانی کمالات سے روز بروز خالی اور دیوالیہ ہوتے ہوئے جا رہے ہیں۔

حضرات! ــــ آپ اگر عقل سلیم اور انصاف سے کام لے کر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اس وقت انسانی دنیا جن مصیبتوں میں مبتلا ہے اور تباہی و بربادی کے جو سخت خطرے اس وقت دنیا پر منڈلا رہے ہیں جن کا خیال کر کے تمام یورپ و ایشیا والے سہمے جا رہے ہیں یہ سب اسی کا نتیجہ ہے کہ ہماری اس دنیا نے انبیاء علیہم السلام کا لایا ہوا انسانی اور روحانی طریقہ زندگی چھوڑ کر اور خدا اور آخرت اور روح کے تقاضوں کو بالکل پس پشت ڈال کر شیطان کا بتلایا اور سکھایا ہوا حیوانی اور خالص مادی طریقۂ زندگی اختیار کر لیا ہے۔ کم از کم اجتماعی اور قومی معاملات میں تو ہم خدا اور آخرت اور روحانیت کو بالکل بھلا چکے ہیں ــــ اور خیر یورپ والوں نے اگر یہ مادہ پرستانہ طرز زندگی اختیار کیا تھا تو کیا تھا ان کی کورانہ تقلید میں ہم ایشیا والے بھی اسی راستہ پر چل پڑے

ہیں حالانکہ ایشیاء کی سرزمین نبیوں، رسولوں، رشیوں منیوں اور مہاتماؤں کی سرزمین ہے۔

آج حماقت اور جہالت سے یوروپ کی اس کورانہ تقلید کو ترقی سمجھا جارہا ہے حالانکہ میں نے جیسا کہ ابھی عرض کیا تھا یہ صرف حیوانیت میں شیطانیت میں اور درندگی میں ترقی ہے اور اگر یہ ترقی یوں ہی ہوتی رہی اور انبیاء علیہم السّلام کے انسانیت اور روحانیت اور عبدیت کے اصولوں کو پھر سے نہیں اپنایا گیا تو اس خدا فراموش اور آخرت سے بے پرواہ دنیا کے سامنے جلد ہی اس کا انجام آجائے گا اور تیسری جنگِ عظیم اگر برپا ہوئی تو اس سے جو بچ جائیں گے وہ دیکھ لیں گے کہ خدا اور اس کی ہدایت سے بے تعلق ہو کر اور آخرت کو بھلا کر ترقی کرنے والوں کا اور [illegible] کی ترقیوں کا حشر کیا ہوا کرتا ہے

وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ ط

حضرات!

ہمارے سامنے یہی مسئلہ ہے اور ہم اسی کو انسانیت کا سب سے بڑا مسئلہ سمجھتے ہیں۔ ہماری دعوت اور ہمارا پیام اپنے کو اور آپ سب حضرات کو بھی بس یہی ہے کہ اللہ کے نبیوں اور رسولوں کے بتلائے ہوئے ان اصولوں کو ہم پھر سے زندگی کی بنیاد بنائیں جو انسان کو خدا کا اچھا بندہ اور اچھا آدمی بناتے ہیں اور مادہ پرستی اور خدا فراموشی کے ان طور طریقوں کو چھوڑ دیں جنھوں نے ہماری زندگی کو حیوانی اور شیطانی زندگی بنا کر پوری انسانی دنیا کو جہنم کے کنارہ پر کھڑا کر دیا ہے۔

عجیب بات ہے! آج سڑکوں اور گلی کوچوں کی صفائی کا مسئلہ قابلِ فکر ہے، گندی نالیوں کی دھلائی کا مسئلہ فکر کے قابل ہے، مچھروں اور مکھیوں اور چوہوں کو مارنے اور کم کرنے کے لیے لمبی لمبی اسکیمیں بنائی جاتی ہیں اور ان کاموں پر ہزاروں لاکھوں آدمیوں کا وقت اور کروڑوں روپیہ صرف ہوتا ہے لیکن آدمیوں میں سے درندگی اور حیوانیت کی تباہ کن صفات نکالنے اور ان کو اچھا آدمی اور اللہ کا اچھا بندہ بنانے کی طرف بالکل توجہ نہیں کی جاتی۔ میرے نزدیک تو یہ اسی کا عذاب ہے کہ ہمارا کوئی مسئلہ سلجھنے میں نہیں آتا اور اگر برسوں کی محنت اور کروڑوں اربوں روپے کے صرف کے بعد کوئی ایک مسئلہ کچھ قابو میں آتا ہے تو چار اور الجھ جاتے ہیں ـــــ ابھی گزشتہ ہفتہ کے اخباروں میں آپ نے پڑھا ہوگا کہ صرف غذا کے مسئلہ پر اب تک اٹھاسی کروڑ روپیہ ہماری حکومت کا صرف ہو چکا ہے اور مسئلہ کی شکلیں جوں کی توں ہیں اور اس وقت خاص طور سے آپ کے صوبہ بہار کو قحط کا سخت خطرہ لاحق ہے بلکہ ابھی کل میں نے ایک دوست سے سنا کہ غذا اور غلہ کی کمی کے علاوہ اب بہار کے بعض علاقوں میں پانی کی کمی ہو رہی ہے اور کنوئیں سوکھ رہے ہیں اور ڈر ہے کہ بھوک کے عذاب سے پہلے بہت سے آدمی

اور جانور کہیں پانی نہ ملنے کے عذاب سے موت کا شکار نہ ہو جائیں۔

حضرات!

ہم خدا پرستوں کا ایمان ہے کہ دنیا اس وقت جن پریشانیوں میں مبتلا ہے وہ محض اتفاقی نہیں ہیں بلکہ اللہ کی بادشاہی میں کوئی چیز بھی آپ سے آپ اور محض اتفاق سے نہیں ہوتی، یہاں جو کچھ ہوتا ہے، وہ اللہ کے حکم سے ہوتا ہے اس لیے ہماری موجودہ پریشانیاں یقیناً خدا کے حکم سے ہیں اور وہ اللہ ظالم نہیں ہے اور نہ بلاوجہ ہمیں ستانے میں اسے کوئی لذت آتی ہے بلکہ انسانی دنیا کی یہ پریشانیاں اور بے چینیاں اس کی خدا فراموشی اور آخرت سے بے فکری کی سزا ہیں۔ (وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا)

پس ہمیں آپ سے صرف یہ کہنا ہے کہ جہاں آپ اور بہت سے قومی کاموں پر اپنا وقت، اپنا روپیہ اور اپنی طاقتیں صرف کرتے ہیں وہاں اس کام کی طرف بھی توجہ کریں، اس کے لیے جماعتیں اور سوسائٹیاں بنائیں۔ اس کے طریقے سوچیں، جب آپ خلوص اور دیانتداری سے ایسا کام کو شروع کریں گے اور صاف ذہن سے غور کریں گے تو آپ پر خود راہیں کھلیں گی، اور آپ کی طرف سے اپنے ملک اور اپنی قوم کی بلکہ ساری انسانیت کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔

اگر آپ نے اپنے کو اچھا خدا پرست اور خدا ترس آدمی بنا لیا اور اپنی قوم کے صرف دس بیس فیصدی افراد ہی کو آپ اچھا آدمی بنا سکے اور وہ زندگی کے ہر معاملہ میں خدا سے ڈرنے والے اور مرنے کے بعد والی زندگی کی فکر کرنے والے بن گئے تو یقین کیجئے کہ روحانی فائدوں کے علاوہ آپ ملک اور قوم کو موجودہ مصیبتوں سے نجات دینے میں بھی بڑی مدد دیں گے۔ اس وقت ہم جن مصیبتوں میں مبتلا ہیں۔۔۔ ان میں ۹۰-۹۵ فیصدی وہ ہیں جن میں ہم صرف اس لیے گھرے ہوئے ہیں کہ قوم میں خدا پرستی اور ایمانداری نہیں ہے اور مرنے کے بعد کی جزا و سزا کی کوئی فکر نہیں ہے، اگر ہمارے وزیروں اور چھوٹے بڑے افسروں میں اور حکومت کے تمام اہلکاروں میں، اسی طرح تاجروں میں، مزدوروں میں، اور دوسرے عام طبقوں میں انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کے مطابق بجائے غرض پرستی اور مادہ پرستی کے خدا ترسی اور ایمانداری آجائے، بجائے حرص اور طمع کے قناعت آجائے، ایثار و سخاوت آجائے دوسروں کی غمخواری اور دوسروں کے لیے خود تکلیف اٹھانے اور قربانی کرنے کا رواج ہو جائے تو ہماری ساری وہ مشکلیں ایک دن میں دور ہو جائیں گی جن کو حل کرنے سے کروڑوں روپیہ صرف کرنے کے باوجود ہماری وزارتیں آج عاجز ہیں۔

حضرات!

اتنی بات جو میں نے اب تک کہی یہ کسی مذہب و ملت سے مخصوص نہیں ہے اس لیے یہ بات تو ہم ہر مذہب اور ملت والے سے کہتے ہیں عیسائیوں سے بھی کہتے ہیں اور یہودیوں سے بھی، اسیطرح اپنے وطنی بھائیوں، ہندوؤں سے بھی کہتے ہیں اور سکھوں سے بھی۔

البتہ مسلمانوں سے ہم اس کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ تم تو اپنے کو مسلمان کہہ کر ان سب باتوں کا عہد اور اقرار کر چکے ہو کیونکہ کسی شخص کے مسلمان ہونے کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ وہ یہ فیصلہ کر چکا ہے کہ اپنی زندگی وہ ان اصولوں اور ان ہدایات کے مطابق گزارے گا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء علیہم السلام اور سب سے آخر میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم مکمل ترین شکل میں لے کر آئے، اور دنیا سے زیادہ فکر وہ آخرت کی کرے گا اور مادی خواہشات کے مقابلہ میں روحانی تقاضوں اور مطالبوں کو ترجیح دے گا۔

اس لیے ہر مسلمان سے ہمارا مطالبہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کو اس اقرار اور ان اصولوں کے مطابق بنائے۔ یعنی اس کی زندگی اللہ کی بندگی اور عبدیت والی زندگی ہو، وہ نفس کی خواہشات اور طبیعت کے تقاضوں کے بجائے اللہ کے احکام پر اور اس کی بھیجی ہوئی شریعت پر چلنے والا ہو، مرنے کے بعد کے حساب اور جزا و سزا سے ڈرنے والا اور دنیا سے زیادہ آخرت کی زندگی بنانے کی فکر کرنے والا ہو اسی طرح مادی ترقی سے زیادہ اس کو روحانی ترقی کی فکر ہو ——

مسلمان اسی لیے پیدا کیے گئے ہیں کہ وہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کی بتلائی ہوئی ایمانی اور روحانی زندگی گزاریں اور اسی مبارک زندگی کو دنیا میں رواج دیں۔ —— قرآن میں فرمایا گیا ہے۔

"كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ"

اگر ہم مسلمان اس سے غفلت برتیں تو خدا کے مجرم اور اپنے مقصد وجود سے باغی ہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں اپنا مقام و منصب سمجھنے اور اپنا فرض ادا کرنے کی توفیق دے۔

(الفرقان بابت رجب ۱۳۷۰ھ)

روحانیت!

(شفیق صدیقی جونپوری (مرحوم)

جبیں چمکے جو سجدوں کے نشاں سے
جھلکیں چاندنیوں پہ تارے آسماں سے

نگاہِ مردِ مومن کے اشارے
بلٹ دیتے ہیں تقدیروں کے پانسے

طلوعِ صبحِ نو کا منتظر ہوں
سمجھ لوں گا زمین و آسماں سے

مہ و خورشید سے اکتا گیا ہوں
نئے شام و سحر لاؤں کہاں سے

مرتب کرلے آزادی کے نغمے
شہیدوں کی حیاتِ جاوداں سے

مجاہد کی دعائیں اللہ اللہ
اتر آتی ہیں فوجیں آسماں سے

وہ دل کی روشنی از فرش تا عرش
حجابات اٹھ گئے تھے درمیاں سے

جنوں کی سرد بازاری کہاں تک
قلندر کام لے قلبِ تپاں سے

ذرا پھر اٹھ کے بِن نیازی کے جھونکے
نکل جائیں گرد کارواں سے

بہادر بی بیاں اللہ اکبر
مسلح حُسن بھی تیر و کماں سے

کہیں سلمیٰ کہیں عذرا کی محمل[ا]!
وہ منزل کے تقاضے ساربان سے

وہ چلنا لے کے مشکیزہ بردوش
زمین گلشن جبیں خونِ چکاں سے

زہے بے شمع خیموں کے تجلّی
اجالا آتش سوزِ نہاں سے

خوشا وقتیکہ پھر ایسی ہو محفل
سجی ہو ہوش نگاہانِ جہاں سے

[ا] محمل کو میں مؤنث استعمال کرتا ہوں، کیونکہ اس لفظ میں زیادہ نسوانیت ہے۔ ۱۲ (شفیق)

جناب مولانا عبد السلام صاحب قدوائی ندوی

ہندوستان کا نیا دور اور مسلمان

"ہم یہاں اس لیے آئے ہیں کہ اللہ کے بندوں کو بندوں کی بندگی سے نکال کر اللہ کی بندگی میں داخل کریں، دنیا کی تنگی سے نجات دیکر وسعت وکشائش کی راہ دکھائیں۔ ظلم وجور سے بچا کر عدل وانصاف کی فضا میں لائیں بنی آدم ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں ان کے درمیان برادرانہ محبت قائم ہونی چاہیے۔ ہماری نظر میں انسانوں کے درمیان شریف وکمینہ کی تقسیم صحیح نہیں ہے۔ ہم انسانوں کی خود ساختہ اونچ نیچ کے قائل نہیں ہیں۔ ہم تمام آدمیوں کو ایک ہی اصل کی شاخیں سمجھتے ہیں اور سب کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا چاہتے ہیں۔ ملک گیری اور کشور کشائی ہمارا مقصود نہیں ہے۔ ہم انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نجات دلانے کے لیے یہاں آئے ہیں، اگر ہماری بات مان لی جائے تو ہم واپس لوٹ جائیں گے۔"[1]

مذکورہ بالا الفاظ میں عرب قاصدوں نے امرائے ایران اور شاہ ایران کے سامنے اپنے مقاصد پیش کیے۔ یہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے عہد مبارک کا واقعہ ہے۔ مسلمان جب سرزمین عرب سے نکلے اور روما اور ایران کی حدود میں داخل ہوئے تو ان کے دلوں میں یہی پاک خیالات تھے اور وہ نوع انسانی کی ہمدردی وخیر خواہی کے غیر معمولی جذبات اپنے سینوں کے اندر رکھتے تھے۔ ملکوں کا فتح کرنا، سلطنتیں قائم کرنی، مال ودولت کے انبار لگانے، اور عیش وعشرت کی زندگی بسر کرنا ان کا مقصد نہ تھا درحقیقت وہ نوع انسانی کی پریشانیوں سے دلگیر تھے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ ظلم وستم کے مارے ہوئے انسانوں کو امن وسکون اور راحت وآرام نصیب ہو۔ سلاطین وامراء کی چوکھٹوں پر جھکے ہوئے سروں کو اٹھا کر وہ رب العالمین کے سامنے سربسجود

---

[1] ملاحظہ ہو وفود عرب کی گفتگو امرائے ایران سے طبری جلد ۴ تاریخ کامل ابن اثیر۔

کرنا چاہتے تھے۔ وہ ہر قسم کی مشکلیں عوام الناس کی راہ سے دور کرنا چاہتے تھے انھیں اپنی راحت و آرام کا ذرہ برابر بھی خیال نہ تھا بلکہ ان کی دلی آرزو تھی کہ خود تکلیف اٹھا کر دوسروں کو آرام پہونچائیں۔ وہ شاہانہ شکوہ و جبروت سے ناآشنا اور امیرانہ عیش و عشرت سے کوسوں دور تھے۔ ان کے حکمراں کو بادشاہت کا لفظ بھی گوارا نہ تھا، وہ موٹا جھوٹا کھا کر اور پھٹا پرانا پہن کر انسانوں کی خدمت کیا کرتے تھے۔ وہ کسی معاملہ میں اپنی فوقیت اور ترجیح کے روادار نہ تھے بلکہ ملک کے معمولی سے معمولی باشندہ کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیتے تھے اور سارے ملک کو کھلا کر خود کم سے کم پر گزر کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ شام سے ایک قاصد آیا۔ کھانے کے وقت اس نے دیکھا کہ امیر المومنین کے دسترخوان پر صرف جو کی روٹی ہے۔ یہ منظر اس کے لیے بڑا درد انگیز تھا کہ مسلمانوں کا امیر اس قدر تکلیف اٹھائے اس نے عرض کیا آپ گیہوں کی روٹی کیوں نہیں کھاتے۔ آپ کی حدود سلطنت میں تو گیہوں کی پیداوار بہت ہے اور آپ آسانی سے گیہوں کی روٹی کھا سکتے ہیں۔ قاصد کی گفتگو سن کر حضرت عمرؓ نے اس سے پوچھا بتاؤ تمہاری کیا رائے ہے اگر مملکت کے تمام لوگ گیہوں کھانے لگیں تو کیا اس سلطنت کے اندر اتنی مقدار میں گیہوں پیدا ہوتے ہیں کہ ہر شخص پیٹ بھر گیہوں کی روٹی کھا سکے۔ یہ سوال سن کر قاصد جھجک گیا اور کہنے لگا نہیں ہماری حدود سلطنت میں تو اتنے گیہوں پیدا نہیں ہوتے ہیں کہ اگر سب باشندے گیہوں ہی کی روٹی کھانا چاہیں تو کھا سکیں۔ قاصد کا جواب سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا پھر جب صورت حال یہ ہے تو میں گیہوں کیسے کھا سکتا ہوں میں تو وہی کھانا چاہتا ہوں جو سب لوگ کھا سکیں۔

وہ حکومت کو ذریعہ عزت نہیں سمجھتے تھے بلکہ اسے ذمہ داری کا ایسا بار گراں خیال کرتے تھے جس سے ہر دم لرزتے رہتے تھے وہ اپنے آپ کو ایک معمولی انسان کی طرح سمجھتے تھے۔ خطبۂ خلافت دینے کھڑے ہوتے تو برسر منبر اعلان کرتے کہ میں تمہارا حاکم مقرر کیا گیا ہوں لیکن تم سے بڑھ کر نہیں ہوں۔ جب تک میں قانون الٰہی کی پابندی کرتا ہوں تو میرا کہنا مانو اور اگر میں اس راہ سے منحرف ہو جاؤں تو تم پر میرے احکام کی اطاعت واجب نہیں ہے۔ ان کے یہاں ہر شخص کو اس کا حق تھا کہ اگر وہ خلیفہ کو غلط رو سمجھے تو بے جھجک ٹوک دے۔ ایک بڑھیا بھی خلیفہ کو متنبہ کرنے کا حوصلہ رکھتی تھی، ایک بدو برسر عام خلیفہ کو ڈانٹ دیتا تھا اور برملا کہتا تھا کہ اگر تم کجروی اختیار کرو گے تو ہم تمہیں سیدھا کر دیں گے ہر شخص کو اجازت تھی کہ خلیفہ سے باز پرس کر سکے۔ تاریخ کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ تقریر کر رہے تھے۔ آپ نے فرمایا لوگو! سنو اور مانو۔ ان الفاظ کو سن کر ایک شخص نے فوراً کہا ہم

تمہاری بات نہ سنیں گے۔ نہ مانیں گے، جو چادریں تقسیم ہوئی ہیں وہ چھوٹی تھیں اسمیں کسی طرح تمہارا کرتہ تیار نہ ہو سکتا تھا پھر یہ کیا بات ہے کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے جسم پر اسی چادر کا بنا ہوا کرتہ ہے آخر اتنا کپڑا زیادہ کہاں سے آیا جب تک مجھے اس سوال کا جواب نہیں ملے گا میں نہ تمہاری بات سنوں گا اور نہ تمہارا کہنا مانوں گا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹے عبداللہ کی طرف اشارہ کیا وہ اُٹھے اور اس شخص کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا تم صحیح کہتے ہو واقعی چادر چھوٹی تھی اور ایک چادر میں امیرالمومنین کا کُرتہ نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن میں نے اپنے حصے کی چادر بھی امیرالمومنین کو دیدی تھی اور دونوں کو ملا کر ان کا یہ کُرتہ تیار ہوا یہ سُن کر معترض مطمئن ہو گیا اور حضرت عمرؓ کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ فرمائیے اب آپ جو کہیں گے میں اسے سنوں گا اور جو حکم دیں گے اس کی تعمیل کروں گا۔

وہ پوری جدوجہد کرتے تھے کہ سارے ملک کے باشندے چین اور اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کریں۔ دن اسی فکر میں بیتتے اور راتیں اسی دُھن میں گزرتیں، جس دل کے ساتھ انھوں نے جو برتاؤ کیا وہ آج تک تاریخ اسلام کا طغرائے امتیاز ہے۔ ایک موقع پر جنگی حالات نے یہ صورت پیدا کر دی کہ مسلمانوں کو اپنی پوری طاقت سمیٹ کر محاذ پر لے جانی پڑی۔ حمص میں حفاظتی محصول وصول کیا جا چکا تھا جب حالات کی نزاکت کی بنا پر مسلمان امیر یہاں سے اپنے تمام سپاہیوں کو لے کر جانے لگا تو اس نے شہر کے باشندوں کو جو مذہباً عیسائی تھے بلا کر کہا۔ ہم نے تم سے کچھ رقم اس لیے وصول کی تھی کہ تمہاری حفاظت کا انتظام کریں گے لیکن ایسے حالات درپیش ہیں کہ ہمارے لیے تمہاری حفاظت دشوار ہے اس لیے ساری وصول شدہ رقم تمہیں واپس کئے دیتے ہیں۔ حمص کے عیسائی باشندوں نے مسلمان امیر شہر کے یہ الفاظ حیرت کے ساتھ سنے اور کہنے لگے خدا وہ دن جلد لائے کہ آپ لوگ پھر ہمارے شہر میں تشریف لائیں۔

اس قسم کے واقعات اسلامی تاریخوں میں بکثرت موجود ہیں اس مختصر مضمون میں مزید تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔ حالات کا اندازہ کرنے کے لیے چند اشارے کر دیے گئے ہیں۔ صدر اول کے مسلمانوں اور خلفائے راشدین کا یہی وہ نقطۂ نظر اور طرزِ عمل تھا جس کی وجہ سے وہ دنیا کے جس ملک میں گئے وہاں فرشتۂ رحمت سمجھے گئے اور ہر ملت و مذہب کے لوگوں نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور دل کھول کر ان کا استقبال کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صرف پندرہ سولہ سال کے اندر لاکھوں مربع میل زمین اُن کے زیرِ اثر ہو گئی۔ لوگوں کے دل ان کی محبت و عقیدت سے لبریز ہو گئے اور انھوں نے دل و جان سے اس عادلانہ نظامِ حیات کو قبول کر لیا اور ان کی زندگیاں

اسلامی رنگ میں رنگ گئیں گنتی کے چند برسوں میں اس عظیم الشان کامیابی کی نظیر تاریخ عالم میں کہیں ا
نظر نہیں آتی۔

لیکن ہندوستان کے مسلمان فاتحین کے اندر خلفاء راشدین کے عہد کی یہ روح موجود نہ تھی وہ سر
زمین ہند میں اللہ کے بندوں کو بندوں کی بندگی سے نکال کر اللہ کی بندگی میں داخل کرنے کا جذبہ لے ک
داخل نہیں ہوئے تھے بلکہ ملک گیری اور کشور کشائی کے جذبہ سے آئے تھے، اصلاحی مقاصد بہت کم
ان کے پیش نظر تھے، انسانی مساوات کا ان کی زندگی میں کہیں عکس مشکل ہی سے نظر آتا تھا۔ جمہو
کی رضامندی کے بجائے خاندانی وراثت اُن کا دستور حکومت تھا اور سلطنت عموماً جاگیر کی حیثیت
رکھتی تھی۔ یہ سچ ہے کہ وہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے اور اسلام کا کلمہ اپنی زبان سے ادا کرتے تھے لیکن
اسلام ان کی زندگی کا ایک نجی معاملہ تھا، بہترین حکمرانوں نے کبھی اسلام کے اجتماعی نظام کو نافذ کرنے
کی فکر نہیں کی اور جمہور کو کبھی یہ حق نہیں دیا کہ وہ اپنی رائے سے اپنے حکمراں منتخب کریں۔ نتیجہ یہ ہوا ک
سات آٹھ سو برس تک مسلمان ہندوستان میں برسر اقتدار رہے لیکن یہاں کے باشندوں کو وہ اپنے
راجوں مہاراجوں کی طرح نظر آئے، وہی اقتدار پسندی، وہی طمطراق، وہی جاہ و حشمت، وہی شان و شکوہ
وہی مطلق العنانی اور وہی عیش پرستی مسلمان بادشاہوں میں بھی پائی جاتی تھی۔ حق پسند زبانیں اکثر
خاموش رہیں، اگر کسی نے کلمۂ حق زبان پر لانے کی جرأت کی تو اسے پہلے اپنا سر ہتھیلی پر رکھنا پڑا۔

سلاطین ہند کے اس طرز عمل نے اسلامی نظام اور اسلامی زندگی کا دلکش مرقع اہل ہند
کے سامنے نہ آنے دیا، ان حکمرانوں کا طرز عمل اسلام کے لیے ایک حجاب بن گیا اور اس ملک کے غیر مسلم
باشندوں کو یقین ہو گیا کہ صرف نام اور تمدنی معاشرتی فرق کے علاوہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان
کوئی بڑا فرق نہیں ہے۔ مسلمان حاکموں کے برتاؤ کو دیکھ کر انھیں اسلام سے بدظنی ہو گئی اور ان کے
دل میں یہ خیال جاگزیں ہو گیا کہ اسلام نوع انسانی کے مصائب و مشکلات کا علاج نہیں بلکہ غلامی ک
ایک نیا پھندا ہے اس خیال کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مسلمان بادشاہوں اور امیروں کے ساتھ اسلام کے بھی
دشمن ہو گئے۔

سلاطین ہند کے حالات اور ان کے دور حکومت کے واقعات کی تفصیل کا یہ موقع نہیں
ہے یہاں صرف قارئین کی توجہ اس جانب منعطف کرانی ہے کہ ہندوستان کے بادشاہوں اور امیروں
کا طرز عمل بہت کچھ غیر مسلموں کے لیے اسلام تک پہونچنے کی راہ روکتا رہا ورنہ سات آٹھ سو برس تو
بہت بڑی مدت ہوتی ہے۔ صدر اول کے مسلمانوں کو اس ملک میں آنے کا موقع ملتا تو سات

آٹھ برس میں یہاں اسلام کی ایسی لازوال عمارت قائم ہوجاتی جو کبھی متزلزل نہ ہوسکتی۔

کئی سو برس تک زمام اقتدار ہاتھ میں رہنے کے بعد آخرکار ہندوستان سے مسلم دور حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ جو کچھ ہوا اس کی داستان غم اوراق تاریخ میں درج ہے آج بھی دیکھنے والے دیکھ سکتے ہیں کہ اس محرومی کا سبب اپنی کوتاہی، غفلت، نااہلی اور بدعملی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ انیسویں صدی عیسوی میں زمام حکومت انگریزوں کے ہاتھ میں آگئی۔ کچھ دنوں مسلمانوں کی بادشاہت کا نام باقی رہا۔ ۱۸۵۷ء میں یہ نام بھی ختم ہوگیا اور پورے طور پر انگریزی حکومت قائم ہوگئی۔ حالات کا یہ بڑا انقلاب تھا جو کبھی حاکم تھے وہ محکوم بن گئے۔

مسلمانوں کو اپنے اقتدار کے زوال کا بیحد صدمہ ہوا انھوں نے اس پر دردناک مرثیے لکھے اور عظمت رفتہ کے غم میں مدتوں خون کے آنسو روتے رہے لیکن اب بھی ان کی توجہ اصل سبب کی طرف نہیں ہوئی۔ ان کے دل میں صرف یہ ارمان تھا کہ آباؤ اجداد کی عزت پھر حاصل کرلیں اور وہی اقتدار پھر انھیں نصیب ہوجائے جو کبھی ان کے بزرگوں کو حاصل تھا اس دور کے لٹریچر میں آپ کو یہ روح ہر جگہ کارفرما نظر آئے گی۔

۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک نوے برس کا زمانہ تقریباً اسی حال میں گزر گیا۔ یعنی عظمت ماضی کو یاد کرکے رونا اور یہ تمنا کہ کسی طرح پھر وہی دور عروج واپس آجائے۔ اس اثنا میں اسلام پر سیکڑوں معترضانہ کتابیں لکھی گئیں۔ ان کے جواب میں مسلمانوں کی طرف سے بھی بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ ان تحریروں میں اسلامی نظام حیات کی خوبیاں واضح کی گئیں۔ انسانی مساوات کی دلآویزی کی مثالیں تاریخ اسلام سے نقل کی گئیں اور خلفاء راشدین کی سادگی، اخلاص، خدمت، بےغرضی اور ایثار کے بڑے پُراثر واقعات بیان کیے گئے۔ مسلمانوں کا عام طرز عمل اس کے برعکس ہی رہا اور "مسلمانی درکتاب و مسلمانان درگور" کی پرانی مثال عام طور سے صادق آتی رہی۔

ایک طرف مسلمانوں کا طرز عمل عموماً غیر مسلموں کو صحیح اسلام سے متعارف کرنے میں مانع رہا اور دوسری طرف غیر مسلموں کے دلوں میں سابق مسلمان حکمرانوں کے خلاف ناگواری موجود تھی۔ انگریزی حکومت بھی ایسی ترکیبیں کررہی تھی جس کی وجہ سے اس ناگواری میں اور اضافہ ہوتا جاتا تھا مسلمان سلاطین کے خلاف کتابیں لکھی جاتی تھیں۔ رسالوں میں انھیں بدنام کیا جاتا تھا۔ مسلمانوں کو قومی عصبیت کی بنا پر یہ امور ناگوار ہوئے۔ انھوں نے بھی اس کے جواب میں مضامین لکھے اور کتابیں شائع کیں اس کی وجہ سے تاریخی ناگواری ان کی جانب منتقل ہوگئی۔ تاریخ میں صحیح یا غلط جو بھی باتیں

مسلمان بادشاہوں کے متعلق درج کی جاتی تھیں، غیر مسلم انھیں بالکل صحیح سمجھ لیتے تھے اور موجودہ مسلمانوں کو سابق مسلمانوں کا جانشین سمجھ کر ان سے ان کے بزرگوں کے مفروضہ مظالم کا انتقام لینے کے لیے تیار رہتے تھے۔ یہ صورت حال خود بھی فضا کو تلخ کرنے کے لیے کافی تھی ...... پر عرصہ یہ ہوا کہ محض اظہار اقتدار کی خاطر روزمرہ کی زندگی میں، تقریبوں میں، تہواروں میں، میلوں اور عرسوں میں مناقشات پیدا ہوتے تھے۔

مسلمان اگرچہ اب حاکمانہ طاقت نہیں رکھتے تھے اور ہندوؤں کی طرح انگریزوں کے محکوم تھے لیکن چونکہ ان کی حکومت کے خاتمہ کو زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا اس لیے حاکمانہ احساس فنا نہیں ہوا تھا وہ ہندوؤں کو جو بعض حیثیتوں سے ان سے زیادہ صاحب اثر ہو چکے تھے، خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ وقتاً فوقتاً تصادم کی نوبت آجاتی تھی، ہندوؤں کے دل میں بھی تاریخی کتابوں کی رطب و یابس روایات کی بناء پر مسلمانوں کے خلاف تنفر موجود تھا اس لیے وہ بھی مسلمانوں کے سامنے جھکنے کے لیے تیار نہ ہوتے تھے اور آئے دن جھگڑے ہوتے رہتے تھے۔ اگر آپ ان جھگڑوں کی تفصیل پر غور کریں تو آپ محسوس کریں گے کہ ان جھگڑوں میں مذہب کا نام لے کر ہنگامے برپا کیے گئے لیکن انھیں مذہب سے کوئی واسطہ نہ تھا جلوسوں کے گزرنے، میلوں کے منعقد کرنے، تعزیوں کے گشت ــــ اور اسی طرح کے دوسرے معاملات عموماً باعث نزاع ہوتے تھے جنھیں یہی نہیں کہ مذہب سے کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ مذہب ان باتوں کا مخالف ہے۔

اگر مسلمان حقیقی طور پر اپنے مذہب کے پیرو ہوتے، ان کی انفرادی زندگی بھی اسلام کی چلتی پھرتی تصویر ہوتی اور ان کی اجتماعی زندگی میں بھی اسلام کی اعلیٰ اخلاقی صفات کا اظہار ہوتا تو ان کے خلاف ناگواری میں کمی ہوتی اور تجربہ کے بعد جب غیر مسلموں کو معلوم ہوتا کہ مسلمانوں کا وجود ان کے لیے مفید ہے اور مسلمانوں کے ساتھ رہ کر انھیں کوئی خطرہ نہیں ہے بلکہ بے شمار فوائد پہونچتے ہیں تو رفتہ رفتہ ان کی مخالفت ختم ہو جاتی اور وہ دل و جان سے مسلمانوں کے ہمدرد اور ہمنوا بن جاتے لیکن چونکہ عام طور سے مسلمان اسلام کی تعلیم سے گہرا عملی تعلق نہیں رکھتے تھے بلکہ اپنے مناقشات میں اسلام کا نام غلط طور پر لیتے رہتے تھے اس لیے غیر مسلموں کے دلوں میں قدرتی طور پر مسلمانوں کے ساتھ اسلام کے خلاف بھی دشمنی پیدا ہو گئی۔

حالات اسی طرح آگے بڑھتے رہے اور ناگواریوں میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔

انگریزی عہد کے نوے برس یوں ہی گزر گئے۔ مسلمان اپنے محکوموں کے برابر ہو گئے تھے بلکہ بعض حیثیات سے ان سے بھی کم حیثیت رکھتے تھے لیکن ان کی سمجھ میں اب بھی یہ بات نہ آتی تھی کہ وہ واقعی اپنے گزشتہ محکوموں کے برابر ہو گئے ہیں وہ فلک کج رفتار کا شکوہ کرتے زمانے کی نیرنگی کو برا بھلا کہتے طالع

ناسازگاری کی شکایت کرتے لیکن حقائق کو سمجھ کر اپنی کوتاہی کی تلافی کا انھیں زیادہ خیال نہ آتا تھا۔ بہرحال نوے برس کا یہ دور گزر گیا اور ۱۹۴۷ء سے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اس دور کے آغاز سے پہلے ایک طویل کش مکش کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کش مکش نے تاریخ کی پرانی ناگواریوں کو سیکڑوں گنا زیادہ کر دیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہندوستان اپنی وسعت کے باوجود دونوں قوموں کے لیے تنگ ہو گیا۔ بالآخر ملک تقسیم ہوا۔ اس تقسیم نے ناگواریوں کو تیز سے تیز تر کر دیا۔ اس کا جو افسوسناک انجام ہوا وہ سب کے سامنے ہے۔

اسوقت ہندوستان کے مسلمان ایک ایسی اقلیت کی طرح ہیں جس سے اکثریت کو ناگواری بھی ہے اور بے اعتمادی بھی۔ مسلمان افسردہ اور پریشان خاطر ہیں۔ انکے متعلق جو ناگواری ہے وہ صرف انھیں تک محدود نہیں ہے بلکہ اس مذہب سے بھی نفرت ہے جس کے وہ نام لیوا ہیں۔ اسوقت تک غنیمت یہ ہے کہ دستور حکومت میں کوئی بات نہیں جو مسلمانوں کیخلاف ہو یعنی ہندوستان کے آئین حکومت کے نقطۂ نظر سے مسلمانوں اور غیر مسلمانوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ قانوناً ہندوستان کے تمام باشندے خواہ وہ کسی نسل یا مذہب سے تعلق رکھتے ہوں یکساں حقوق رکھتے ہیں۔ شہری زندگی میں کوئی فرق نہیں رکھا گیا ہے۔ قانوناً ترقی کے مواقع سب کو دیے گئے ہیں۔ موجودہ حکومت [illegible] اپنے قانون اور دستور العمل کے اعتبار سے مسلم اور غیر مسلم میں کوئی فرق نہیں کرتی ہے۔ [illegible] مسلمانوں کے لیے غنیمت ہے ورنہ فضا میں وقتاً فوقتاً زیادہ خطرناک آوازیں آتی رہتی ہیں۔ ابھی تک اس قسم کے علی الاعلان متعصب گروہوں کو ملک کے نظام حکومت میں کوئی دخل نہیں ہے لیکن ملک میں ان کی آوازیں سنائی ضرور دیتی ہیں۔ اگر ان جماعتوں کو فروغ حاصل ہوا تو وہ مسلمانوں کی موجودہ حالت برقرار نہیں رکھیں گے۔ ابھی تک آئین حکومت کے مطابق مسلمان غیر مسلموں کے برابر ہیں لیکن متعصب فرقہ وارانہ جماعتوں کے ہاتھوں میں اگر نظام حکومت آ گیا تو پھر مسلمان قانوناً بھی مساوی حقوق سے محروم ہو جائیں گے اور ان کی حیثیت ایک ہاتھ متعصب اکثریت کے نیچے دبی ہوئی اقلیت کی ہو جائے گی جسے نہ عملاً ترقی کا کوئی موقع حاصل ہو گا نہ قانوناً۔

اس صورت حال کو روکنے کے لیے مسلمانوں کو بڑی ہمت، بڑے استقلال اور بڑی دانشمندی سے کام کرنا پڑے گا۔ تاریخ میں یہ تدریجی انحطاط جو انھیں منزل بہ منزل پیش آتا گیا ہے اس کا انھیں گہرا مطالعہ کرنا پڑے گا اور جذبات اور تمناؤں کے بجائے عقل اور تجربات کی روشنی میں اپنے لیے راہِ عمل بنانی پڑے گی۔ سیاست مذہبی حقائق کی طرح کوئی اٹل چیز نہیں ہے بلکہ حالات کے مطابق طرز عمل ضروری ہے۔ بات خواہ کتنی ہی خوشگوار کیوں نہ ہوں لیکن ان کے دھوکے میں رہنا صحیح نہیں ہے بلکہ عقل کی روشنی اور تجربات کی رہبری میں قدم اٹھانے چاہئیں۔ تہذیب اور رسم و رواج

بھی دائمی حقیقت نہیں سمجھتے بلکہ وہ بھی حالات کی بنا پر بنتے اور بدلتے ہیں یہی حال بہت سے زندگی کے اطوار اور آداب کا ہے۔ ان حقائق پر مسلمانوں کو ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا کام یہ ہے کہ ان بدلے ہوئے حالات میں مسلمانوں کو اپنی رہنمائی کے لیے ایسے لوگوں کو منتخب کرنا چاہیے جو حالات کو صحیح طور سے سمجھنے والے ہوں، جن کا ذہن تنگ اور نقطۂ نظر فرقہ وارانہ نہ ہو جن کی سیرت مضبوط، اخلاق بلند، اور زندگی بے داغ ہو، اسلام کی اعلیٰ قدریں ان کی زندگی سے نمایاں ہوں پھر وہ گمنام نہ ہوں بلکہ سارے ملک میں متعارف ہوں اور ایک حد تک بین الاقوامی شہرت کے مالک ہوں، سیاسی حقوق حاصل کرنے کے لیے اسلام کا نام استعمال نہ کیا جائے بلکہ ایک ہندوستانی کی حیثیت سے اپنے ملکی حقوق حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ مذہب کو اختلاف اور مخاصمت کے رنگ میں کبھی نہ پیش کیا جائے بلکہ اس طور پر سامنے لایا جائے کہ غیر مسلم اسلام کو نوعِ انسانی کے لیے پیامِ رحمت سمجھیں اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مذہب کو سیاست اور مصلحت کا تابع کیا جائے۔ یہ بھی مطلب نہیں ہے کہ مذہب کے اصولوں میں قطع برید کی جائے بلکہ غرض یہ ہے کہ جس طرح زمانۂ سابق میں مذہب کو ایک مفسدہ تحریک اور انسانیت کے لیے امن و سکون کا باعث ظاہر کرنے کے بجائے ایک اختلافی اور نزاعی معاملہ بنا دیا گیا تھا اور ہر جھگڑے میں کھینچ کر مذہب کو لایا جاتا تھا اب ایسا نہ ہونا چاہیے۔

مسلمانوں کے اندر صبر و تحمل، ضبط و برداشت کی عادت پیدا کرنا چاہیے۔ ان کے اندر اسلام کی حقیقی روح کو بیدار کرنے کی جد و جہد کی جائے تاکہ ان کا مذہب انسانیت کی خدمت کا بہترین ذریعہ سمجھا جائے۔ لوگ مسلمان کو بہترین رفیق، بہترین پڑوسی، بہترین مشیر، بہترین غم گسار، اور بہترین معین و مددگار سمجھیں، وہ اپنے اخلاق سے غیر مسلموں کے دل ہاتھ میں لینے کی کوشش کریں۔

خلافت راشدہ کے بعد جب سلاطینِ اسلام کی زندگی اسلامی اصولوں کے مطابق باقی نہیں رہی تو بہت سے اللہ کے مخلص بندوں نے ایک روحانی نظام قائم کیا۔ یہ حضرات اسلامی تعلیم کے سچے نمونے تیار کرتے تھے۔ ان کے ہاتھ میں زمین کی حکومت نہ تھی۔ لیکن یہ لوگ دلوں پر حکومت کرتے تھے۔ ان کا نظام طاقت پر قائم نہ تھا بلکہ محبت و عقیدت اور شفقت و خدمت کے رشتوں سے بندھا ہوا تھا، ان کی یہ تنظیم سلطنتوں کی تنظیم سے زیادہ مستحکم دیرپا اور اثر انگیز تھی، مسلمان حکمرانوں کی بے راہ روی کی روک تھام بھی ان بزرگوں کی توجہ سے بہت کچھ ہوتی رہتی تھی مطلق العنان سلاطین ان بزرگوں کی روحانی طاقت کے سامنے بسا اوقات سپر انگندہ ہو جاتے تھے۔ دوسری طرف غیر مسلموں کو بھی

اسلامی تعلیمات کا جلوہ انسانی زندگی میں دیکھنے کا موقع ملتا تھا اور وہ اسلام کے جمال دلکش سے متاثر ہوتے تھے اور اپنا سر نیاز ان کے آستانے پر جھکا دیتے تھے۔ یہ صوفیائے کرام کا مقدس گروہ تھا۔ ہندوستان میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ، حضرت شیخ نظام الدینؒ، حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ، حضرت علاء الدین صابرؒ، حضرت بابا فرید الدین شکر گنجؒ، حضرت سید حسین گیسو درازؒ وغیرہ بہت سے بزرگوں نے اپنی زندگی کے دلکش نمونے دکھا کر اہل ہند کو گرویدہ کر لیا تھا۔ آج کل ذکر و فکر کے آستانے سُونے پڑے ہیں، ہمیں ان کو پھر سے آباد کرنا چاہیے۔

اسی کے ساتھ اسلام کی صحیح تعلیمات سے لوگوں کو واقف کرنے کے لیے درس و تدریس کے حلقے جا بجا قائم کرنے چاہئیں تاکہ مسلمانوں کو کتاب و سنت کی صحیح تعلیم سے آگاہی ہو، وہ بدعات و خرافات کا شکار ہونے سے بچ جائیں، عقلی طور پر بھی اسلامی تعلیمات کے فضائل و محاسن سے واقف ہوں تا زندگی کی تیرہ و تار راہوں میں اسلام کی شمع ہدایت سے خود بھی رہنمائی حاصل کر سکیں اور دوسروں کو بھی لغزشوں اور ٹھوکروں سے بچا سکیں، اپنے آپ کو متحمل اور رواداار بنائیں۔ اپنی بات کہنے کے ساتھ دوسروں کی بات کو سمجھنے کی بھی کوشش کریں، جس بات کو صحیح سمجھتے ہوں، اس پر خود جمے رہیں، لیکن دوسروں کی نیت پر شبہ نہ کریں اور یہ سمجھیں کہ جس طرح ہمیں ایک رائے قائم کرنے اور اس کے مطابق راہِ عمل اختیار کرنے کا حق ہے اسی طرح دوسروں کو بھی حق ہے کہ وہ اپنی فہم و بصیرت سے کوئی رائے قائم کریں اور اس کے مطابق عمل کریں۔ دل آزار تبصروں اور ناگوار تنقیدوں سے سخت پرہیز کریں، ہر شخص کا احترام کریں اس طرح مسلسل عمل کرنے سے امید ہے کہ وہ مستقبل قریب میں خود بھی اپنی جماعت کو مضبوط کر لیں گے اور دوسری قوموں کو اپنے متعلق ہمدرد اور خیر خواہ بنا لیں گے اور اس ملک میں ایک صحیح پر اخلاص اور ہمدردانہ فضا پیدا کریں گے۔ (الفرقان رمضان ۱۳۷۳ھ)

اسلامی دنیا میں
تجدد و الحاد کے اثرات

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

دین کے خدمت گزاروں کیلئے سبق

پچھلے مہینہ مصر میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس میں ہمارے لئے بڑی عبرت — اور دین کے خدمت گزاروں کے لئے سیکھنے کے بہت سے سبق ہیں۔ مصر ترکی کے بعد تمام عالم اسلام میں نئی اصطلاح کے مطابق سب سے زیادہ "روشن خیال" "آزاد" اور مغربی تہذیب و تمدن کا پرجوش پیرو اور کامیاب نقال ہے۔ عورتوں کی آزادی اپنے مشرقی و اسلامی حدود سے کہیں آگے گزر چکی ہے۔ مخلوط تعلیم، بے پردگی، یورپ کے مقابلہ حسن میں شرکت، تعلیمی وفود (بعثات) میں رفاقت اور اعلیٰ تعلیم کے لئے طالبات کا یورپ کا سفر روزمرہ کے واقعات میں سے ہے جن پر اب بحث کی کوئی گنجائش نہیں۔ سیاسی و تعلیمی زندگی میں، ورزشوں اور تفریحات میں، طبقۂ اناث طبقۂ ذکور کے دوش بدوش ہے۔ نیم برہنہ لباس، ساحل سمندر کا غسل شمسی، فلم کمپنیوں میں تمثیل (ایکٹنگ) اور مصری روزناموں اور رسائل کی عریاں تصویریں، روزانہ زندگی کے ایسے واقعات ہیں جن پر چند باحمیت مسلمانوں اور بعض دینی جماعتوں کے سوا کوئی چیں بجبیں بھی نہیں ہوتا۔ نگاہیں ان تمام مناظر کی عادی، اور ذہن ان تمام واقعات کا خوگر ہو چکا ہے، اب ان میں استعجاب کا کوئی پہلو اور اعتراض کا کوئی موقع باقی نہیں رہا۔ قاسم امین نے المرأۃ المصریۃ کے ذریعہ مصر کی شاداب زمین میں جو بیج ڈالے تھے اور سیاسی جماعتوں اور قائدوں نے اپنے سیاسی مصالح سے ان کی آبیاری اور مصر کے ادیبوں اور افسانہ نگاروں نے ان کی پرورش کی تھی، وہ کھیتی اب پک کر تیار ہوئی ہے۔

۱؎ [illegible] میں حسین سری پاشا کی عبوری وزارت بنتی ہے اور وزارت تعلیم کا قلمدان احمد مرسی بدر بے کے سپرد ہوتا ہے۔ یہ صاحب یقیناً مصر کے جدید تعلیم یافتہ اشخاص میں سے ہوں گے جنھوں نے مصر اور

یورپ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہو گی اس لئے کہ ایک بڑی سیاسی پارٹی کا نمائندہ اور ایک ترقی یافتہ ملک کا وزیر تعلیم کوئی قدیم عالم یا معمولی تعلیم یافتہ آدمی نہیں ہو سکتا۔ معلوم نہیں کہ مصر کی حد سے بڑھی ہوئی بے حجابی اور اخلاقی انحطاط سے وزیر صاحب کا دل کب سے دکھا ہوا تھا، اور کتنے عرصے سے وہ موقع کے منتظر تھے کہ انھوں نے وزارت تعلیم کی ذمہ داری سنبھالتے ہی چند نہایت اہم احکام صادر کئے، جنھوں نے سارے ملک کی نگاہیں اور توجہ ان کی طرف منعطف کر دی، اور سارے مصر میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ انھوں نے سب سے پہلے ایک معلمہ کو اس جرم میں ملازمت سے برطرف کر دیا کہ اس نے جلتی ہوئی ٹرین میں بعض نوجوانوں کی فرمائش سے رقص کیا تھا۔ سابق وزیر تعلیم نے معلمہ پر معمولی سا جرمانہ کیا تھا۔ وزیر صاحب کی نگاہ میں یہ فعل خلاف اسلام اور غیر اخلاقی تھا، اور ایسی معلمہ فرائض درس و تدریس ادا کرنے اور مسلمان لڑکیوں کے لئے نمونہ بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی تھی؛ اس لئے وہ اپنے معزز عہدہ پر برقرار رہنے کے قابل نہیں تھی۔ اسی کے ساتھ انھوں نے تمام تعلیم گاہوں کے منتظمین کے نام حکم جاری کیا کہ معلمات و طالبات کو ایسے لباس میں آنے کی اجازت نہ دی جائے جو غیر ساتر ہو، مدرسہ کی استانیوں اور طالبات کو ہدایت کی جائے کہ مدرسوں میں آنے کے وقت ان کی قمیصوں کی آستینیں لانبی، اور لباس ڈھیلا ڈھالا ہو، اور ہدایت کی کہ سختی کے ساتھ اس حکم کی پابندی کی جائے۔

تیسرا حکم جس نے مصر کے ترقی پسند حلقوں میں سب سے زیادہ غم و غصہ اور ناراضگی کی لہر پیدا کی، یہ تھا کہ آئندہ سے مصر کی طالبات اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ نہیں جائیں گی۔ اس لئے کہ نوجوانوں کے ساتھ یورپ کا سفر اور وہاں کا قیام اخلاقی حیثیت سے سخت قابل اعتراض اور مشتبہ ہے۔ اس حکم نے آگ پر تیل کا کام کیا اور سارے مصر میں ایک طوفان سا اٹھ کھڑا ہوا۔ مصر کا ترقی پسند اور آزاد خیال پریس وزیر صاحب کی جان کو آگیا۔ ادیبوں اور نوجوانوں نے اس رجعت پسند اور تاریک خیال وزیر کے خلاف "مقدس جنگ" شروع کر دی۔ دریہ شفیق جیسی بے حجاب مقرر خواتین نے "مظلوم مصری عورت" کی حمایت کا علم بلند کیا۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین بے نے، جو جدید طبقہ کے مقبول ادیب اور مصنف ہیں پیرس میں بیٹھ کر مصر کے "الاھرام" میں اس رجعت پسندانہ اقدام کے خلاف مسلسل مضامین لکھے اور مصر کی عالمی شہرت اور اس کی ترقیوں کا واسطہ دیکر اس قدامت پرستی سے باز آنے کی تبلیغ کی۔ غرض معلوم ہوتا تھا کہ شاید مصر نے کوئی نہایت خطرناک قدم اٹھایا ہے یا خودکشی کا ارادہ کیا ہے، یا بربریت کو دوبارہ دعوت دی ہے۔ پورے مصر میں صرف چند سنجیدہ اشخاص اور شباب محمد اور خالص دینی جماعت نے وزیر تعلیم کے ان احکام کی حمایت اور ان کی اخلاقی ... تحسین و ترحیب کی اور ان کو مبارک باد کے

تار بھیجے، اور ان کی تائید میں مضامین شائع کئے۔

وزیر تعلیم احمد مرسی بدر بے اس طوفان کے مقابلہ میں اپنے فیصلہ پر قائم رہے، اور انہوں نے پامردی اور جرأت سے اس کا مقابلہ کیا، قریب تھا کہ یہ سرکاری احکام اور وزیر تعلیم کی استقامت مصر کی تعلیمی و تمدنی زندگی پر خوشگوار اثر ڈالے اور بے حیائی و بے حجابی کے سیلاب میں کسی حد تک پشتہ کا کام دے اور رفتہ رفتہ غم و غصہ میں سکون پیدا ہو اور ان نئے احکام سے فائدہ حاصل ہو، لیکن خدا بھلا کرے اس جمہوری نظام کا جو کسی کام کرنے والے کو بھی پورے طور پر کام کرنے کا موقع نہیں دیتا اور جس نے انسانوں کی سنجیدہ مملکت کو بچوں کا گھروندا بنا دیا ہے جو کسی ایک حال پر نہیں رہنے پاتا۔ آنے والے انتخابات کے سلسلے میں کسی اختلاف کی بنا پر وزارت نے استعفا دے دیا، نئی وزارت بنی، اور احمد مرسی بدر بے کی جگہ پر نئے وزیر تعلیم منتخب ہوئے۔ نئے وزیر صاحب نے سب سے پہلے اپنی ترقی پسندی اور آزاد خیالی کا ثبوت دیا اور وزارت تعلیم میں قدم رکھتے ہی پیشرو وزیر کے سب احکام منسوخ کئے، اور مصر کو وہ تمام آزادیاں مرحمت فرمائیں جو اس کو پہلے حاصل تھیں۔ عورتوں اور ان کے "محبت گواہوں" نے اپنی مسرت و رضامندی کا پُرجوش مظاہرہ کیا، اظہارِ مسرت کے لئے جلوس نکلے، جلسے ہوئے اور آئندہ کے لئے بھی یہ ظاہر کر دیا گیا کہ کسی وزیر کو رائے عامہ کو ناراض کرنے کی غلطی نہیں کرنی چاہیئے، اور اپنے کو غیر مقبول نہیں بنانا چاہیئے۔ اس طرح گویا مرسی بدر بے اور ان کے ہم خیالوں کے لئے کسی حلقہ سے منتخب ہونے اور وزارت میں آنے کے امکانات بھی کم رہ گئے اور ظاہر ہو گیا کہ مصر کا مقبول خیال کیا ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ مصر کی سب سے بڑی طاقت ور سیاسی جماعت وفد پارٹی برابر اعلان کر رہی ہے کہ وہ اپنی حکومت میں مصری عورتوں کے حقوق کی پوری حمایت و حفاظت کرے گی، اور سمجھنے والے سمجھتے ہیں کہ ان حقوق کے حدود کیا ہیں۔؟

مصر کے ان واقعات سے ہمیں یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ ہماری غفلت نے جدید تعلیم یافتہ طبقہ دین سے کس قدر بیگانہ اور اسلامی تہذیب سے نہ صرف ناآشنا بلکہ متوحش بنا دیا ہے، اور جدید نظام تعلیم و تمدن نے مغربی نظریات و افکار کا کس قدر حلقہ بگوش اور پُرجوش حامی بنا دیا ہے، اپنی تعلیمی صلاحیتوں، عصری واقفیت اور سیاسی جدوجہد کی وجہ سے آج یہی طبقہ تمام عالم اسلام میں ہر اسلامی ملک کی دستوری، سیاسی اور تعلیمی زندگی پر حاوی، اور حکومت کی کرسیوں پر فائز ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اسلام کا قانون معاشرت

و سیاست ان تمام ممالک سے بے دخل ہے اور باوجود مسلمان حکومتوں کے اسلامی نظام معاشرت و تمدن کے لئے ان ممالک میں کوئی جگہ نہیں ہے، قوم کا ذوق اتنا غیر اسلامی ہو چکا ہے کہ اسلام کے اخلاقی و معاشرتی اصلاحات اور ضوابط اس کی قوتِ برداشت سے باہر اور اس کے ذہن کے لئے ناقابل ہضم ہیں۔ ترکی، مصر، شام، عراق، افغانستان، ایران اور پاکستان سب جگہ وہی طبقہ برسر اقتدار ہے، جو خالص مغربی تہذیب و تعلیم کا پروردہ اور اپنے ذہن و ذوق کے لحاظ سے ٹھیٹھ مغربی ہے۔ اس کو جب کبھی اپنے صحیح خیالات اور ذوق کے اظہار اور آزاد قانون سازی کا موقع ملتا ہے وہ اپنی مغربی روح اور اصلی رجحانات و معتقدات کی صحیح ترجمانی کرتا ہے۔ ہمارے مذہبی گروہ کو اس موقع پر صدمہ بھی ہوتا ہے اور استعجاب بھی۔ حالانکہ کم سے کم استعجاب کا کوئی موقع نہیں، یہ طبقہ قلبی دماغی طور پر اسلام اور اس کی تہذیب سے جس حد تک غیر متاثر اور اندرونی طور پر غیر معتقد رہا ہے اس کا قدرتی و لازمی نتیجہ یہی ہونا چاہئے تھا۔ جب اس طبقہ کا دل و دماغ ڈھل رہا تھا اور اس کے ذہن و طبیعت کا سانچہ تیار ہو رہا تھا تو اس وقت اسلامی اثرات کہیں آس پاس بھی نہ تھے، کوئی چیز ان کے پاس ایسی نہ آنے پائی جو ان کے دل و دماغ پر اسلامی تعلیمات کی عظمت کا نقش قائم کرتی، اور اس کی وقعت ان کے دل میں پیدا کرتی۔ اب جب وہ اقتدار کی کرسی پر آ گئے اور ملک کی باگ ڈور انکے ہاتھ میں آئی تو ہم ان سے توقع کرتے ہیں کہ وہ اپنے ذہن، اپنی ساری تعلیم و تربیت اور اپنے عمر بھر کے خیالات اور ذوق کے خلاف کسی دینی ادارہ یا جماعت کی مروت سے ایک اسلامی ضابطۂ معاشرت یا اخلاقی قانون کو نافذ کریں یا اس قانون کو جو اتفاقاً باقی رہ گیا ہے یا نافذ ہو گیا ہے منظور کریں۔ اس لئے اہم ترین کام یہ ہے کہ اس طبقہ کا ذہن بدلنے کی امکانی کوشش کی جائے اور اُس کو ذہنی و علمی و قلبی طور پر دین سے متاثر کرنے کی کوشش کی جائے۔ اور جو طبقہ مستقبل میں اس کی جگہ لے گا اس سے غفلت برتنے کا دوبارہ جُرم نہ کیا جائے۔ اور ابھی سے اس میں اسلامی ذہن پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔

دین کی عام فضا پیدا کرنے کے لئے اور صحیح اسلامی ماحول تیار کرنے کے لئے عمومی کوشش نہایت ضروری ہے، یہ گویا زمین کی تیاری ہے جس کے بغیر باغ نہیں لگ سکتا۔ خواص اور اہل حکومت کا کوئی طبقہ عام فضا سے غیر متاثر نہیں رہ سکتا، کسی بڑی سے بڑی طاقت اور سیاسی جماعت کے لئے عوام کے رجحان اور جمہور کے مطالبہ کو نظر انداز کرنا اور اس کے معتقدات و مسلمات کو رد کرنا ممکن نہیں، دیرپا انقلاب اور مستحکم و متوازن تعمیر کے لئے یہ شرط ہے کہ قوم کے سب طبقے اس کے لئے تیار

ہو چکے ہوں اور ان میں اس کی استعداد و صلاحیت پیدا ہو چکی ہو۔ مصر کے وزیر تعلیم احمد مرسی بدر بے کی پشت
پر اگر ملک کی رائے عامہ اور مصری قوم کی تائید ہوتی تو ان کا جانشین اُن کے احکام کو منسوخ اور بیک
جنبشِ قلم ان کو کالعدم قرار نہیں دے سکتا تھا، اس لئے بیک وقت دونوں کوششوں کو جاری رہنا
چاہئے۔ حالات اس طرح حد سے گزر گئے ہیں اور خطرات اس طرح سر پر منڈلا رہے ہیں کہ کسی
ایک کوشش کے لئے دوسری کوشش کو ملتوی نہیں کیا جا سکتا۔ دین کی عمومی اشاعت و تبلیغ اور عوام
کی تعلیم و تربیت کو خواص کے انقلاب و اصلاح ملک کے لئے موقوف نہیں رکھا جا سکتا کہ مسئلہ کسی سیاسی
اصلاح و ترقی اور کسی معمولی تبدیلی کا نہیں ہے بلکہ لاکھوں بندگانِ خدا کی ہلاکت و نجات کا ہے، اور چند
افراد کے لئے لاکھوں انسانوں کو جہالت و ضلالت میں نہیں چھوڑا جا سکتا، دوسرے یہ کہ خود خواص کے
انقلاب و تغیر کے لئے عوام کی اصلاح اور بیداری ضروری ہے۔ دوسری طرف عوام کے کام کے لئے
خواص کی ذہنی تبدیلی اور انقلابِ حال کی کوشش کو ایک دن کے لئے ملتوی نہیں کیا جا سکتا، کہ زندگی
ان سے برابر متاثر ہو رہی ہے اور ان کی تھوڑی توجہ مسلمانوں کی زندگی میں محسوس و نمایاں دینی انقلاب
پیدا کر سکتی ہے اور ان کی بے راہ روی اور دین سے بغاوت برسوں کی کوششوں پر پانی پھیر سکتی ہے۔
اسی لئے حضرت خواجہ عبید اللہ احرارؒ نے اپنے لئے یہ میدان تجویز کیا، وہ ارکانِ سلطنت اور اہلِ رسوخ و
وجاہت کو دین سے متاثر کر کے ان کے ذریعہ احکامِ شریعت کا اجراء کراتے اور دین کو رواج دینے
کی کوشش کرتے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اکبر کے زمانہ میں حد سے گزری ہوئی حالت کو دیکھ کر یہی
راستہ اختیار کیا، انھوں نے بادشاہ اور اس کے اعیانِ دولت اور امرائے دربار کو دین کا حلقہ بگوش
بنا کر سلطنتِ مغلیہ کے رجحانات اور ذہن میں وہ انقلاب پیدا کر دیا جو بالآخر محی الدین اورنگ زیب عالمگیر
کی شکل میں ظاہر ہوا۔ دینی رجحان کا وہ تدریجی ارتقاء جو جہانگیر سے شروع ہو کر عالمگیر پر ختم ہوتا ہے مجدد
صاحبؒ کا دینی کارنامہ ہے جس کا اثر ہندوستان میں آج تک کسی نہ کسی شکل میں باقی ہے، جن ملکوں
میں برائے نام ہی سہی لیکن اسلامی سلطنتیں ہیں، وہاں کام کرنے والوں کو مجدد صاحبؒ کی سیرت اور
مکتوبات اور اُن کے طریقِ کار کا ضرور مطالعہ و تجربہ کرنا چاہئے۔

دوسری طرف اُمت کے سوادِ اعظم میں اس ایمان و یقین میں برابر انحطاط جاری ہے جو اس اُمت
کا اصل سرمایہ اور اصلی طاقت تھی۔ اور ساری زندگی اس کی تابع تھی۔ اللہ پر یقین، اس سے خوف و
محبت، رسولؐ سے تعلق، آخرت کا کھٹکا، جہنم کا خوف، جنت کا شوق، رضائے الٰہی کے حصول کا
جذبہ، یہ مزاج براہ راست پیغمبروں کی کوشش اور تعلیم سے پیدا ہوتا ہے، اور صحابہ کرامؓ کے حالات

پڑھ کر ہم کو بداہتہً نظر آتا ہے کہ ان کی عام سیرت اور مزاج یہی تھا، اس مزاج کا تغیر اور ان اوصاف میں زوال و انحطاط سب سے زیادہ تشویش ناک واقعہ ہے' ایمان و احتساب (اللہ کے وعدوں پر یقین اور اس کے انعامات کی لالچ میں زندگی کے کام انجام دینا) یہ وہ قوتِ محرکہ تھی جو اس اُمّت کی گاڑی کے لئے پہیہ کا کام دیتی تھی، اگر یہ قوتِ محرکہ جواب دے جائے تو کوئی چیز اس کے قائم مقام نہیں ہو سکتی، صدیوں سے یہ قوت ضعیف ہوتی جا رہی ہے اور خصوصیت سے اس پچھلے عرصہ میں یہ قوت بہت مضمحل اور کمزور ہو گئی ہے' اس قوت کی حفاظت اور اگر ضرورت ہو تو اس کا اعادہ وقت کا اہم ترین فریضہ ہے، جس کو ایک دن کے لئے بھی مؤخر نہیں کیا جا سکتا۔ صاحب علم و صاحب اختیار طبقہ کے ذہن کے اسلامی بننے سے پہلے بھی یہ کام ضروری ہے اور اس کے بعد بھی، در حقیقت نہ وہ کام اس کام کے قائم مقام ہو سکتا ہے اور نہ یہ کام اس کام کا بدل ہو سکتا ہے۔ ان دونوں کاموں کو بیک وقت جاری رہنا چاہئے، ان دونوں میں قطعاً کوئی تضاد نہیں، جو لوگ ان دونوں میں کوئی تضاد یا الگ الگ کام کرنے والوں میں کوئی مخالفت محسوس کرتے ہیں یہ صرف' ان کی تنگ نظری اور تنگ ظرفی ہے۔

(الفرقان۔ محرم ۱۳۶۹ھ)

بقیہ صفحہ (۲۹)

إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا، إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا دو دو بار کہہ کر اطمینان دلایا گیا، حقیقت یہ ہے کہ مشکلات سے کہیں زیادہ راحتوں اور سہولتوں کا دور خطرناک امتحان ہے کہ اس میں ذرا سی چوک بڑی گرفت کا سامان بن جاتی ہے۔ فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتَّىٰ إِذَا فَرِحُوا بِمَا أُوتُوا أَخَذْنَاهُم بَغْتَةً فَإِذَا هُم مُّبْلِسُونَ (جب وہ ان چیزوں کو بھول گئے جو ان کو یاد دلائی گئی تھیں، تو ہم نے ہر چیز کے دروازے اُن پر کشادہ کر دیے۔ یہاں تک کہ جب وہ اُن چیزوں پر اترا گئے جو ان کو دی گئی تھیں، ہم نے اُن کو دفعتہً پکڑ لیا پھر وہ بالکل حیرت زدہ رہ گئے) ـــــ اور راحتوں اور سہولتوں کے دور میں ہوشیار و خبردار رہنا اور دولت و قوت کے نشہ سے سرشار نہ ہونا بڑا مشکل اور قوموں کی تاریخ کا بڑا نادر واقعہ ہے، یہ انبیاء علیہم السلام کے جانشینوں اور صدیقین و صالحین ہی کا کام ہے جن کی اعلیٰ رُوحانی و اخلاقی تربیت ہو چکی ہو'

ورنہ ؎

تاریخ امم کا یہ پیام ازلی ہے
صاحب نظراں نشۂ قوت ہے خطرناک
اس سیل سبک سیر و زمیں گیر کے آگے
عقل و خرد علم و ہنر ہے خس و خاشاک

(الفرقان، ربیع الثانی ۱۳۶۰ھ)

شاندار
خوبصورت
اور۔ جدید ترین ڈیزائنوں میں
ٹائم اسٹار گھڑیاں
نیز
دیگر اقسام کی معیاری اور قابل اعتماد
گھڑیوں کے لیئے
ہمارے شوروم میں
تشریف لائیے
کنگ واچ ہاؤس
۲۔ امین آباد ـــــ لکھنؤ
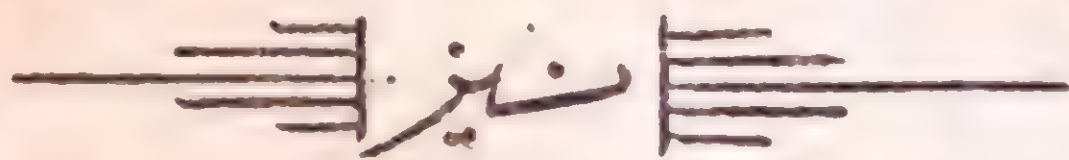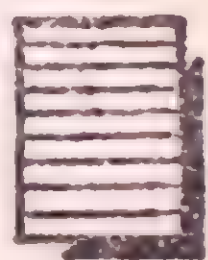
تعارف و تبصرہ

از: عتیق الرحمن سنبھلی

ہندوستان میں مذہب اسلام پر نظر ثانی کی ضرورت

[مندرجہ بالاعنوان سے جناب آصف بن علی اصغر فیضی صاحب کا ایک مقالہ کتابی شکل میں شائع ہوا تھا جس پر الفرقان جمادی الاولیٰ ۱۳۸۲ھ میں ناشر کی فرمائش پر حسب ذیل تبصرہ کیا گیا تھا۔]

ہندوستان میں مذہب اسلام پر نظر ثانی کی ضرورت۔

از۔ جناب آصف بن علی اصغر فیضی (سابق سفیر ہند برائے مصر)۔

ناشر:۔ مکتبہ جامعہ ملیہ۔ دہلی

یہ مقالہ دراصل انگریزی زبان میں واشنگٹن (امریکہ) میں منعقد ہونے والی ایک کانفرنس (COLLOQUIUM OF ISLAMIC STUDIES) کے لیے لکھا گیا تھا اب مصنف نے اس کو اردو ترجمہ کرا کے زیر تبصرہ رسالہ کی شکل میں شائع کیا ہے۔

بڑی حد تک اصل مقالہ اور کسی حد تک ترجمہ کا سب سے پہلا قابل تنقید پہلو یہ ہے کہ عبارت کے الجھاؤ اجزاء مقالہ کی بے ربطی، خیالات کی بے ترتیبی اور غیر منطقی طرز بیان کے باعث پڑھنے والے کو سخت انقباض سے واسطہ پڑتا ہے اور مطالعہ ختم کرنے کے بعد اگر سوچئے کہ اس پورے مقالہ میں وہ مرکزی نقطہ کیا ہے جس پر پوری بحث مرکوز رہی ہو اور جس کو سامنے رکھ کر کوئی ایک منضبط بات حاصل بحث کے طور پر ذہن نشین ہو تو شاید ہر قاری کو اس تلاش میں ناکامی رہے گی۔

دو باتیں جو بالکل الگ الگ ہیں انھیں مقالہ نگار نے ایک ہی مقالہ میں سمو کر گڈمڈ کر دیا ہے۔ یعنی ایک تو ہے یہ مسئلہ کہ جدید ہندوستان کے خاص حالات اور رجحانات اور اسلام کے موجودہ تصور میں

جو تصادم ہو رہا ہے اسے کیسے ختم کیا جائے؟ اور ایک مسئلہ یہ ہے کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے جو افراد اسلام کے موجودہ تصور سے غیر مطمئن ہیں ان کی بے اطمینانی کو کیسے دور کیا جائے؟ —— ہرچند کہ دونوں مسئلوں کا حل مقالہ نگار کے نزدیک یہ ہے کہ اسلام پر نظر ثانی کی جائے، مگر اس سے دو جداگانہ مسئلے ایک تو نہیں بن جاتے، کہ انھیں ایک ہی مقالہ میں گھسیٹ لایا جائے —— یہ تو ہے مقالہ کے مذکورہ بالا عیب کا بنیادی سبب اور اس پر مستزاد یہ (جیسا کہ ذکر کیا گیا) کہ مقالہ کے بعض اجزا میں تو اپنے ماسبق کے ساتھ کوئی منطقی ربط اور تعلق پایا ہی نہیں جاتا، بعض جگہ فی الواقع ربط موجود ہے، مگر بادی النظر میں نظر نہیں آتا۔ عبارت میں الگ الگ الجھاؤ اور اکھڑا پن ہے۔ بہت سے جملے اپنے ماقبل سے کوئی جوڑ نہیں کھاتے۔ جس کی بنا پر یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ اگر مقالہ نگار دو مختلف موضوعوں کے بجائے ایک ہی موضوع تک مقالہ کو محدود رکھتے تب بھی کسی نہ کسی درجہ میں مذکورہ بالا عیب موجود ہی رہتا۔

بہرحال اب اس قصہ کو ختم کر کے صاحب مقالہ کے خیالات پر نظر ڈالنی چاہیے۔

جیسا کہ مقالہ کے عنوان سے اندازہ ہو گیا ہوگا فیضی صاحب کا خیال یہ ہے کہ ہندوستان کے نئے حالات اور رجحانات کے پیش نظر اسلام پر نظر ثانی کی ضرورت ہے! وہ کیا حالات اور رجحانات ہیں جن کی بنا پر نظر ثانی کی ضرورت ہے؟ اور کس پہلو سے نظر ثانی کی ضرورت ہے؟ ان سوالات کا جواب ان کے یہاں کہیں نپے تلے اور واضح الفاظ میں نہیں ملتا کہ ان کی عبارت پیش کر دی جائے البتہ ہم نے کافی دردسری کے بعد جو کچھ سمجھا ہے وہ بڑی حد تک انھیں کے الفاظ میں یہ ہے:۔

گو موجودہ جمہوری حکومت نے مسلمانوں کے شخصی معاملات میں ان کا مذہبی قانون برتا جانے کا سلسلہ پیشرو حکومت کی طرح فی الحال برقرار رکھا ہے مگر جدید قوانین نے اس کے حصار میں کچھ رخنے ڈال دیے ہیں حتیٰ کہ ایک غیر جانبدار مبصر کو یہ صاف نظر آتا ہے کہ ہندوستان میں اسلامی قانون کے تار و پود میں، شریعت پر قانون نے بھرپور حملہ کر دیا ہے نیز زمانہ کی رفتار اور قانون سازی کے اس جدید اصول کے پیش نظر کہ "ہر شخص کے لیے ایک ہی قانون ہونا چاہیے" یہ بات یقینی ہے کہ مستقبل میں ایسے تمام انفرادی اور شخصی قوانین جو قدیم معاشرتی اور مذہبی اصولوں پر مبنی ہیں رفتہ رفتہ یا تو منسوخ ہو جائیں گے یا ان میں اتنی تبدیلی ہو جائے گی کہ قوانین کی ایک ایسی عام اسکیم کے ماتحت ہو جائیں جو بلالحاظ اختلاف مذہب ہر شخص پر عائد ہو۔

یہ ہیں وہ حالات اور جدید ہندوستان کے رجحانات جن کی بنا پر فیضی صاحب ہندوستان

تھیا مذہب اسلام نظر ثانی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں ـــــــ نظر ثانی وہ بایں معنی چاہتے ہیں کہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی (دنیوی) زندگی کے معاملات میں شریعت کے منصوص احکام اور ان کی روشنی میں مرتب شدہ فقہ کو جو ابتک جزو مذہب سمجھا جاتا رہا ہے اس تصور کو ختم کرکے مذہب کے قانونی حصہ یعنی شریعت کو مذہب سے الگ کیا جائے، اور اس میں ضروریات، زمانہ اور عصری رجحانات کے مطابق ترمیم و تنسیخ کا حق مانا جائے اور ایک مسلمان جو کسی غیر مذہبی اور جدید طرز کی حکومت میں رہتا ہو اسے جدید قوانین کی پیروی کی آزادی دی جائے خواہ وہ قانون مباحات شرعیہ کے ذیل میں آتا ہو یا نہ آتا ہو۔

اس نقطۂ نظر پر ہم بلا کسی برافروختگی اور جذباتیت کے یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اس میں کوئی معقولیت نہیں ہے۔ ایسے حضرات جو صرف اس بنا پر کہ کسی ملک کی حکمراں اور قانون ساز طاقتیں اسلام کے کسی حصہ کو معطل کر رہی ہیں اور ان کے رجحانات مستقبل میں اس حصہ کے عملی نفاذ کے لیے کوئی گنجائش باقی نہ رہنے دیں گے، یہ سوچتے اور مسلمانوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ اتنے حصہ کے خارج از اسلام یا قابل تنسیخ و ترمیم ہونے کا خود ہی اعلان کر دیا جائے، ان کے لیے اس سے زیادہ معقول طریقۂ کار یہ ہے کہ وہ اسلام سے اپنی وابستگی پر نظر ثانی کریں اور ضروری سمجھتے ہوں تو مسلمانوں کو بھی اسی کا مشورہ دیں، بلکہ وہ لوگ بھی جو صرف حالات سے مجبور ہو کر اسلام کے کسی سے دستبردار ہونا نہیں چاہتے بلکہ جدید افکار و رجحانات سے متاثر ہونے کی وجہ سے اسلام کے کسی حصہ کو غیر معقول اور ناقابل تسلیم سمجھتے ہیں اور اس بنا پر اس میں ترمیم و تنسیخ کا عمل کرنا چاہتے ہیں، ان کے لیے بھی معقول طریقہ کار یہی ہے۔ الا یہ کہ یہ ثابت کیا جائے کہ وہ حصہ کتاب و سنت کے منصوصات یا ان کے مقتضیات میں سے نہیں ہے بلکہ اگلے لوگوں نے اپنی ضروریات اور اپنے زمانہ کے حالات کے مطابق محض اپنے فہم و فکر سے کچھ چیزیں اختیار کی تھیں جنھیں بعد کے لوگوں نے غلطی سے جزو مذہب سمجھ لیا ـــــــ لیکن ہمارے مقالہ نگار نے اس طرح کی کوئی تحقیق پیش نہیں کی ہے۔ رہا ان کا خیال، کہ

> "یہ تواتر کی بتدریج تبدیلی، شریعت اسلام کی بنیادی حقیقت کو ضرر نہیں پہنچا سکتی۔ اس مسئلہ کو صحیح طور پر بہ نظر تعمق دیکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ یہ صرف اوپر کا چھلکا ہے جو اتر رہا ہے اور اندر کا پھل یعنی اسلام کا مرکزی نقطۂ نظر اسی طرح برقرار رہ سکتا ہے کہ اس کی ہر عہد میں اور تہذیب کے ہر دور میں پھر سے تشریح کی جائے۔" (صفحہ ۲۵)

یہ بس ان کا خیال اور مجرد دعویٰ ہے جو اس نظر ثانی کی معقولیت کی دلیل نہیں بن سکتا۔

علیٰ ہذا یہ کہنا بھی کہ :-

"موجودہ زمانہ میں یہ بہت اہم کام ہے کہ اس بات کا تعین کریں کہ اسلام میں کون سے عناصر باقی رہنے والے اور کون سے تبدیلی کے قابل ہوں گے" (صہ ۲۵)

اپنے لیے ایک حق کا محض دعویٰ ہے جو بلا کسی واجب التسلیم سند کے ہرگز قابل تسلیم نہیں۔ صرف اس بات سے کہ ہندوستان میں قانون سازی کا جدید رجحان شرعی قانون کے نفاذ کے لیے گنجائش نہیں چھوڑے گا کسی کو اسلام میں قطع و برید کا حق نہیں مل سکتا اور نہ اس کے لیے یہ بات کافی ہے کہ "علماء کی روایاتی شریعت موجودہ زمانے کے دماغوں کو مطمئن نہیں کرتی"۔

اب لیجئے دوسرے مسئلہ کو جس کو صاحب مقالہ نے اس مقالہ میں زیر بحث لاکر خلط مبحث کر دیا ہے۔ اور وہ یہ کہ چونکہ علماء کی روایاتی شریعت موجودہ زمانے کے دماغوں کو مطمئن نہیں کرتی (صہ ۲۵) اور راسخ العقیدہ شارحین، اسلام کے بنیادی عقائد کا جس شکل میں تعین کرتے ہیں وہ اس سے قطعاً غیر مطمئن ہیں (صہ ۱۹) اس لیے اسلام پر نظر ثانی ہونی چاہیئے۔

اس سلسلہ میں ان کا خیال ہے کہ دین کے اصول اور عقائد اور شریعت کے مسائل، سب پر از سر نو غور ہونا چاہیئے اور پھر اسلام کی ایسی تشریح اور تشکیل ہونی چاہیئے جو ان لوگوں کی تسکین کا باعث ہو جن کا اعتقاد اسلام کے پرانے اعتقادی اور عملی ڈھانچہ پر نہیں رہا ہے ——— انھوں نے صرف یہ مشورہ دینے، قابل نظر ثانی امور کی ایک عارضی فہرست پیش کرنے اور نظر ثانی کے لیے چند رہنما اصول (جن کے بیان میں منطقیت کا فقدان ہونے کی وجہ سے بعض جگہ ان کی اصولی حیثیت مبہم رہ گئی ہے) پیش کرنے پر اکتفاء کیا ہے۔ خود کسی تشریح و تشکیل جدید کی کوشش نہیں کی ہے۔ لیکن کچھ تو اس فہرست سے اور کچھ اس جائزہ سے جو انھوں نے "ہندوستان میں موجودہ مذہبی فکر اور شرعی روایات" کا لیا ہے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نئی تشریح و تشکیل کا ڈھنگ کیا ہوگا۔ ماضی قریب اور حال کی جدت پسند اور آزاد مذہبی فکر کا جائزہ لیتے ہوئے انھوں نے مولانا آزاد اور ان کے پرائیوٹ سکریٹری پروفیسر محمد اجمل خاں صاحب کے طرز فکر کو بہت سراہا ہے۔ چنانچہ وہ مولانا آزاد کا ذکر کرکے لکھتے ہیں کہ

"اصول شریعت میں اجابت کی تحریک کے لیڈر کی حیثیت سے آزاد کا کارنامہ مختصراً یہ ... خذ ما صفا و دع ما کدر کے اصول پر کاربند ہیں اور مذہب و سیاست

کے ذیلوں سے وہ سنی اور شیعہ کے اصول، جدید سائنس، دورِ جدید کے افکار اور گاندھیت
کا فلسفہ کام میں لا کر اسلام کو بطور مذہب انسانیت کے اس شکل میں پیش کرتے ہیں، جو
زمانہ حال کے نوجوانوں کے لیے قابل برداشت ہو۔ اس طرح ملک میں وہ سب سے ممتاز
مذہبی رجحان کی نمائندگی کرتے ہیں، لیکن جیسا کہ اندیشہ کیا جا سکتا تھا روایاتی علماء
ان کی قابلیت اور خلوص کا تو اعتراف کرتے ہیں مگر ان کے مذہبی نقطۂ نظر اور
معقولیت کے معیار کو قبول کرنے کے لیے پورے طور پر تیار نہیں ہیں۔" (صفحہ ۲۲، ۲۳)

پروفیسر محمد اجمل خاں صاحب کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"اسلام کے بنیادی اصولوں پر عہد حاضر کے مصنفین میں اجمل خاں کی حیثیت ایک
آزاد مفکر کی ہے۔ وہ قرآن کو ترتیب نزول کے مطابق مطالعہ کرنے کی اہمیت پر زور دیتے
ہیں، اسلام کے پس منظر پر مؤرخانہ انداز سے نظر ڈالتے ہیں۔ قرآن کو سمجھ کر پیغمبر اسلام
کی سوانح حیات کا خاکہ بناتے ہیں اور شروع سے آخر تک وہ اپنے نقطۂ نظر میں عہد جدید
کے دوش بدوش، سائنٹفک اصول سے محتاط ہو کر اسلام کا پورا پورا احترام کرتے
ہوئے بیسویں صدی کے عالم مشرقیات کی ناقدانہ صلاحیت کا اظہار کرتے ہیں۔ گو پرانے
طرز کے علماء ان کے خیالات پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں تاہم وہ عہد جدید کے افکار پر
اپنا سکہ جما کر رہیں گے۔" (صفحہ ۲۴)

مولانا آزاد کے خاص کارنامہ "اسلام کو مذہب انسانیت کی شکل میں پیش کرنے" سے بظاہر اشارہ
ان کی تفسیر کے اس حصہ کی طرف ہے جس کی بدولت مذہب کے ہندوستانی (یا گاندھیائی) تصور (وحدت
ادیان) کو خود قرآن سے سند اور تائید حاصل ہوئی[1]۔ اور اسی بنا پر ہم نے کہا تھا کہ مولانا آزاد کے طرزِ فکر
کو سراہنے سے خود مقالہ نگار کے طرزِ فکر کا اندازہ ہوتا ہے یعنی مقالہ نگار کے ذہن میں اسلام کا وہی تصور ہے
جو تصور وحدت ادیان کے قائلین مذاہب کے متعلق عموماً رکھتے ہیں، پس ظاہر ہے کہ ان کے ذہن میں اسلام کی
جدید تشریح و تشکیل کا کیا نقشہ ہوگا۔ علیٰ ہذا پروفیسر محمد اجمل خاں صاحب تو بہت کھلے ہوئے وحدت ادیان

---

[1] مولانا آزاد نے خود اس کا قصد کیا ہے یا نہیں اس بارہ میں قطعیت کے ساتھ کوئی بات کہنی مشکل ہے۔ مولانا موصوف کی بعض
تحریروں اور ان کے طرزِ عمل نے اس معاملہ کو ابہام کی تاریکی میں ڈال دیا ہے۔ افسوس کہ مولانا انتقال فرما گئے اور یہ فرض باقی رہ گیا
کہ اس اہم مسئلہ کے بارہ میں کوئی واضح بیان دے کر اس ابہام کو ختم کر دیں۔ (ع)

کے مبلغ ہیں۔ ان کی جن تین کتابوں کا تذکرہ نفیقی صاحب نے اس مقالہ میں کیا ہے ان میں سے ایک کتاب (مختصر سیرت قرآنیہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم) دیکھنے کا اتفاق ہمیں بھی ہوا ہے اور اسی بنا پر ہمیں حیرت ہے کہ اجمل خاں صاحب کو مولانا آزاد کی صف میں کیسے رکھ دیا گیا ہے! وہ عالم تبرقیات ہوں تو ہوں مگر ان کا نقطۂ نظر (جیسا کہ وہ پیش کرتے ہیں۔ سائنٹفک نظر آتا ہے اور نہ ان کے طرز تحریر اور انداز استدلال سے "ناقدانہ صلاحیت) کا اظہار ہوتا ہے ان کے اَن سائنٹفک (UNSCIENTIFIC) انداز فکر اور غیر منطقی طرز استدلال کا تو یہ حال ہے کہ وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ سورۂ علق کی ابتدائی پانچ آیتیں جو سب سے پہلے نازل ہوئیں ان میں سارا اسلام آگیا ہے یعنی اگر سلسلہ وحی بند ہو جاتا تو انسانیت کی ہدایت کے لیے جو حل ان میں پیش کیا گیا ہے وہ کافی تھا اور اس پر غزوہ احد میں نازل ہونے والی اس آیت سے استدلال کرتے ہیں کہ "اَفَاِن مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ؟" انداز استدلال یہ ہے کہ اگر یہ بات نہ ہوتی تو ان لوگوں کو زجر و توبیخ کی کوئی معقول وجہ نہیں ہو سکتی جو غزوۂ احد میں "اِن مَّاتَ اَوْ قُتِلَ" کے وقوع کی صورت میں دین اسلام کو چھوڑ دیتے اس لیے کہ اگر اس وقت تک دین مکمل نہیں ہوا تھا تو لوگ اسے ترک کر دینے میں معذور ہوتے لہٰذا ماننا چاہیے کہ یہ دین پورا کا پورا پہلے ہی وحی میں آچکا تھا بعد کے عرصہ میں محض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تشریحات فرماتے رہے۔ (ملاحظہ ہو" مختصر سیرت قرآنیہ صفحہ ۳۲ و ۳۴ و ۶۴)

ذرا غور تو فرمایئے اس استدلال اور انداز بحث پر! کیا اس کی مضحکہ خیزی میں کچھ شبہ ہے؟ اس مبلغ فہم اور انداز فکر کے اصحاب کو بھی جو لوگ مفکرین اسلام کا درجہ دینے لگیں سمجھ میں نہیں آتا کہ اسلام کے بارے میں خود ان کے فہم و فکر کو کیا درجہ دیا جائے۔؟

بہر حال —— بات میں بات نکل آئی، کہنا یہ تھا کہ نفیقی صاحب کے پیش نظر انھیں خطوط پر اسلام کی جدید تشریح و تشکیل ہے جن پر ابتدائی کام ان کے بقول مولانا آزاد کر چکے ہیں اور جس کو اپنے طرز پر اجمل خاں صاحب آگے بڑھا رہے ہیں، تو یہ تشریح و تشکیل فی الواقع اس اسلام کی تو ہوگی نہیں جس کو قرآن نے پیش کیا اور جس کی دعوت و تعلیم کے لیے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے بلکہ اپنی طرف سے اس اسلام کے سر چپکائی ہوئی ایک چیز ہوگی۔ یا یوں کہیے کہ تھوڑے سے اشتراک [illegible] اسلام سے مختلف ایک مستقل مذہب ہوگا کسی چیز کی کوئی ایسی تشریح جس میں اس کی حقیقت اور ماہیت بدل جائے اور ایسی تشکیل جو اس کی ماہیت کے

---

* اس بار ہم یہاں اس پر تنقید کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ ویسے الفرقان جلد ۱۴ نمبر ۲ میں اس "سیرت قرآنیہ" پر تبصرہ کے ذیل میں اس استدلال کی مضحکہ خیزی کو ظاہر کیا جا چکا ہے (ع س)

مزاج کے مطابق ہو جدت پسندانہ تو کہلائی جا سکتی ہے لیکن حقیقت پسندانہ ہرگز نہیں کہلائی جا سکتی۔ یہی وہ معیار ہے جس کی بنا پر ہم مولانا آزاد کو ان کے اس کارنامہ میں جسے نیفی صاحب ان کا کارنامہ قرار دے رہے ہیں اور پروفیسر اجمل خاں صاحب کو ان کی "مفکرانہ اور ناقدانہ" کاوشوں میں جدت پسند تو مان سکتے ہیں لیکن حقیقت پسند ماننے سے معذور ہیں۔

کسی چیز کی نئے زمانہ کے مطابق "نئی تشریح" کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔

۱۔ ایک یہ کہ اس کی حقیقت کو اس زمانہ کی زبان اور مانوس الفاظ و عبارات میں بیان کیا جائے اور اس کی صحت و حقانیت پر زمانہ کے مناسب طرز استدلال اختیار کیا جائے۔

۲۔ دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ اگر کسی خاص زمانہ کا ذہن اس کو اس کی نفس الامری حقیقت کے ساتھ قبول کرنے سے انکار کرتا ہے تو اس کی اصل حقیقت بدل کر کچھ اور بنائی جائے۔

پہلے معنی میں تو نئی تشریح کی ضرورت یقیناً اسلام کو ہے اور باخبر علماء ہر زمانہ میں اس ضرورت کو تسلیم کرتے ہیں لیکن دوسرے معنی میں "نئی تشریح" درحقیقت تشریح نہیں بلکہ تحریف ہو جاتی ہے۔ علماء اگر مولانا آزاد کی پیش کردہ اسلام کی شکل (بشرطیکہ وہ ویسی ہی ہو جیسی نیفی صاحب اور ان کے ہم مسلک حضرات سمجھتے ہیں) کو قبول نہیں کرتے یا اجمل خاں صاحب کی تجدیدی کدوکاوش پر "ناک بھوں چڑھاتے ہیں" تو اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ یہاں اسلام کی واقعی حقیقت کی جدید تشریح سے زیادہ (ایک جگہ خفی اور دوسری جگہ جلی) تحریف پاتے ہیں۔[1] اور ظاہر ہے کہ کوئی دیانتدار اور حقیقت شناس آدمی اس معنی میں کسی "نئی تشریح" و تشکیل کو نہ پسند کر سکتا ہے نہ قبول کر سکتا ہے۔

پس جو حضرات اپنے علم و مطالعہ کی بنا پر دیانتداری کے ساتھ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام جو اصول و عقائد اور احکام دیتا ہے ان میں سے بعض نظر ثانی اور ترمیم و تنسیخ کے محتاج ہیں۔ تو ان کے لیے بجائے اس کے کہ وہ ان چیزوں کو "روایاتی" اور کسی زمانہ کے لیے ناقابل قبول کہہ کر ان پر نظر ثانی شروع کریں، دیانتدارانہ راستہ یہ ہے کہ وہ اسلام کو خیرباد کہہ دیں۔ ہاں اسلام کے عقائد و احکام سے متعلق جو تفصیلات اور تفریعات منصوص نہیں، بلکہ متکلمین و مجتہدین کی کاوشوں کا نتیجہ ہیں (اور اس لیے سلف سے ... مختلف ... چلا آرہا ہے) ان پر بے شک ہر زمانہ میں غور و فکر ہو سکتا ہے لیکن ...

---

[1] ... نیفی صاحب کے بیانات پر ناک بھوں چڑھانا ... ہو سکتی ہے ... ان کے ... اور ... سے زیادہ کمی کے باعث ایک سلجھے ہوئے ذہن کے آدمی کا انقباض طبعی ہے۔

کو اصل سند اور دین کا اصل ماخذ مان کر ــــــ مگر معلوم یہ ہوتا ہے کہ فیضی صاحب کو یہ بنیادی اصول ہی تسلیم نہیں ہے کہ دین میں نفیاً و اثباتاً کچھ کہنے کے لیے کتاب و سنت کی سند ضروری ہے۔ اس لیے سب سے پہلے ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ "روایاتی علماء کے سلف سے خلف تک کے اس مسلمہ بنیادی اصول کی غلطی واضح فرمائیں ورنہ اس بنیادی اختلاف کی موجودگی میں کوئی گفتگو نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی۔

حرفِ آخر۔ اس رسالہ میں "اسلام پر نظرِ ثانی" کی جو تجویز پیش کی گئی ہے اس کو قابلِ اعتنا سمجھا جائے یا نہ سمجھا جائے۔ البتہ اس کی ضرورت کو ظاہر کرنے کے لیے ہندوستان کے حالات کی جو رفتار اور یہاں کی قانون ساز طاقتوں کے جو رجحانات صاحبِ مقالہ نے بیان کیے ہیں وہ یقیناً قابلِ اعتنا ہیں۔ کیونکہ ان کے بیان کی حیثیت "شَهِدَ شَاهِدٌ مِنْ أَهْلِهَا" کی ہے۔ ہمیں ماننا چاہیئے کہ جدید ہندوستان کی تعمیر کا کام جن لوگوں کے ہاتھوں میں ہے ان کی عملی سرگرمیوں کا رُخ اور ان کا ذہنی رجحان بے شک یہی ہے جس کی گواہی حرمِ قیادت کے ایک رازداں نے ہمارے سامنے پیش کر دی ہے اور اسی رجحان کے زیرِ اثر (صاحبِ مقالہ کے بیان کے مطابق) "ہندوستان میں قانون ساز (مسلم پرسنل لا کے تار پود میں) شریعت پر بھر پور حملہ کر دیا ہے اور کرتا رہے گا ــــــ اور اس کو مان لینے کے بعد ان تمام سوچنے سمجھنے والے مسلمانوں کو جو مذہب اور قانون کی علیحدگی کے اصول کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہے، پہلی فرصت میں اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اس صورت کا مقابلہ کس طرح کیا جائے۔

اس مقالہ کا یہی ایک پہلو ہماری نظر میں بہت قابلِ قدر ہے کہ صاحبِ مقالہ نے مسلمانانِ ہند کو ایک قریبی خطرہ سے بہت واضح الفاظ میں خبردار کیا ہے۔　(ع۔ س)

(بقیہ مضمون ص ۱۸۱)

تھا ان کے حکم سے کھانا آیا۔ ابن تیمیہؒ کے سوا سب نے کھایا، وجہ دریافت کی گئی تو صاف فرمایا کہ میں یہ کھانا کیسے کھاؤں، جو لوگوں کے مال سے لوٹ کر حاصل کیا گیا ہے اور لوگوں کے درختوں کو کاٹ کر پکایا گیا ہے۔

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

(الفرقان بابت شوال سنہ ۱۳۷۱ھ)

عتیق الرحمٰن سنبھلی

سیرت کے جلسوں میں وحدتِ ادیان کا ساز

اور اسلامی نقطۂ نظر سے اس کی حقیقت

(ذیل کا مضمون نگاہِ اولیں کے ماتحت تین قسطوں میں لکھا گیا تھا)

سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے اس عالم کی قسمت جاگی، اس کی مصیبتیں دور ہوئیں، اس کی زندگی کا ایک خوش منظر دور شروع ہوا، اور اللہ کے بندوں کو اللہ کی بندگی کا سیدھا راستہ ہاتھ آیا۔ اس لیے بجا ہے اگر اس محسنِ اعظم کی ولادت کے یومِ سعید پر احسان شناسوں کے دلوں میں مسرت کی ایک لہر دوڑ جائے۔ —— مگر احسان شناسی اور سپاس گزاری کا وہ کیسا مظاہرہ ہوگا جس میں بہت سی باتیں اس کی منشاء کے خلاف ہوں، اس کی مقدس روح کو تکلیف پہونچانے والی ہوں اور اس کے حیات آفریں پیغام پر پردہ ڈال دیتی ہوں؟

ابتک ایسی باتوں کا ارتکاب ہمارے کم پڑھے اور بے پڑھے عوام کرتے تھے اور ہم انھیں کوستے تھے اور ان کے ساتھ ان مولویوں کی جان کو بھی دعا دیتے تھے جو ان باتوں کو کارِ ثواب بتاتے تھے، مگر اب سمجھ میں نہیں آتا کہ "پنبہ" کہاں کہاں رکھا جائے کہ "تن ہمہ داغ داغ شد" —— چند برس سے ایک نئی صورت حال پیدا ہوئی ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ نے بھی یہ کام ذرا تعلیم یافتہ طریقہ سے شروع کر دیا ہے، یہاں ہمیں اس اپٹوڈیٹ قسم کے جشن مسرت کے پورے پروگرام سے تو بحث نہیں کرنا ہے کیونکہ اس کے اکثر اجزاء "نئی بوتلوں میں پرانی شراب" کے مصداق ہیں، البتہ اس کا ایک جزو بالکل نیا ہے، وہی گفتگو کا محتاج ہے۔

وہ نیا جزو جو اس پروگرام میں بڑی اہمیت کے ساتھ شامل کیا جا رہا ہے یہ ہے کہ غیر مسلم

سیاسیین کو خصوصاً بر سرِ اقتدار گروہ کے متقدر اصحاب کو تقریر اور پیغامات کے لیے مدعو کیا جاتا ہے بلکہ بعض جگہ مسندِ صدارت بھی پیش کی جاتی ہے۔ چنانچہ یہ حضرات "کمال نیازمندی" کے ساتھ تقریر ارشاد فرماتے ہیں اور پیغامات ارسال فرماتے ہیں اور حاضرین — جن میں نوے فیصدی سے زیادہ مسلمان ہوتے ہیں — ان کو "با ادب با ملاحظہ ہوشیار" ہو کر سنتے ہیں۔

برادرانِ وطن کی نفسِ شرکت یا نفسِ تقریر سے ہم کو کوئی اختلاف نہیں، بلکہ یہ تو ایک گونہ خوشی کی بات ہے کہ غیر مسلم بھی اس ذاتِ والا صفات کو نذرِ عقیدت پیش کرتے ہوئے نظر آویں، مگر اس نذرِ عقیدت میں نری عقیدت تو نہیں ہوتی، اس میں کچھ اور بھی ہوتا ہے جو اظہارِ عقیدت کی مٹھائی میں بڑی آسانی کے ساتھ مسلمانوں کے حلق سے اتر جاتا ہے اور غیر شعوری طور پر ان کے خیالات کا رنگ بدل دیتا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ان صاحبان کے پیغامات اور تمام تقریروں کی تان وحدتِ ادیان کی تلقین پر آکر ٹوٹتی ہے اور ان سب میں قدرِ مشترک یہی "ٹیپ کا بند" ہوتا ہے کہ

"تمام مذاہب کی تعلیمات یکساں طور پر اچھی اور سچی ہیں، یہ بظاہر مختلف راستے ہیں مگر ہر راستہ خدا تک پہونچتا ہے، اس لیے اس ظاہری اختلاف کی بنیاد پر [illegible] [illegible] اختلاف نہ ہونا چاہیے۔ ہر مذہب کی روح یہی ہے کہ لوگ پریم اور بھائی چارے کے ساتھ رہیں۔ تمام مذاہب کے بزرگوں کی تعلیمات کا حاصل ہی باہمی رواداری [illegible] [illegible] [illegible] تعلیم بڑے اچھے طور سے دی۔ ہم سب کو ان کی تعلیمات سے فائدہ اٹھانا چاہیے تاکہ ہم رواداری اور بھائی چارے کے ساتھ مل کر وطن کی خدمت کر سکیں۔"

[illegible] ہے کہ چند سال پیشتر مسلمان آسانی کے ساتھ سن نہیں سکتا تھا مگر اب [illegible] [illegible] [illegible] واقعہ سب سے پہلے غالباً جمعیۃ علماء ہند کے سالانہ اجلاس [illegible] [illegible] ان کے مبلغِ اعظم پنڈت سندر لال جی نے اپنی تقریر میں [illegible] [illegible] کی تلقین کی تھی — اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ داعیانِ اجلاس کے [illegible] تھا اور وہ عجیب شش و پنج میں پڑ گئے تھے کہ اپنے اس "بے تکلف" مہمان کے ساتھ کیا سلوک کریں — کہ دیکھنے والے جانتے ہیں کہ مسلمان پبلک کو یہ لمحات کس قدر شاق تھے، اور خود داعیین کو بھی یارائے ضبط نہ رہا تھا اور وہ برملا کہہ اٹھے تھے کہ "یہ ایک مجذوب کی بڑ ہے جس کو کوئی وقعت نہ دیجیے" — مگر یہ باتیں تب کی ہیں جب "آتش جواں تھا"۔ اب مسلمانوں میں یہ شعف

نہیں رہنے، اب وہ قریب آ رہے ہیں یا خود کو قریب لا رہے ہیں۔ اور اگر ان کے جانے پہچانے لوگ اس بدذوق کے لیے اپنے کندھے یوں ہی پیش کرتے رہے جیسے کہ اس وقت ہوا چل پڑی ہے تو کون جانے کب ہم اس انقلاب کی یہ حد بھی دیکھ لیں۔

ہمہ آہوان صحرا سر خود نہادہ برکف ۔ بامید آنکہ روزے بشکار خواہی آمد

پہلے یہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی کہ یہ باتیں ناقابل سماعت ہیں اور اسلام کی رو سے وحدت ادیان کا فلسفہ بالکل مہمل شے ہے، اللہ کے یہاں سند قبول صرف ایک ہی دین کو حاصل ہے اور وہ اسلام ہو (إن الدين عند الله الاسلام) مسلمان ہزار گنہگار اور بے عمل ہوتے ہوئے بھی اس بات پر پکا اعتقاد رکھتا تھا کہ نجات کی راہ صرف ایک ہے اور وہ اسلام ہے! ــــ مگر اللہ رے انقلاب زمانہ! کہ وہی مسلمان اب جلسۂ سیرت النبی میں دو زانو بیٹھ کر یہ سبق پڑھتا ہے کہ ہر مذہب راہ نجات ہے اور ہر راستہ بہ خدا ملتا ہو، اسلام ہی کی کوئی اجارہ داری نہیں ہے!

ہم اپنے ان بھائیوں سے جو دانستہ یا نادانستہ طور پر اس فتنۂ وحدت ادیان کی خدمت انجام دے رہے ہیں، پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا واقعی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام یہی تھا جس کو زندہ رکھنے کے لیے ہم سیرت کے جلسے منعقد کرتے ہیں؟ کیا آپ کی بعثت کی غایت اسی "ہندوستانی رواداری" کی تعلیم و تلقین تھی؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو پھر کوئی ہمیں سمجھائے کہ آپ نے اپنی قوم اور اپنے خاندان سے کیوں لڑائی مول لی تھی؟ کیا اس طرح کی رواداری میں ان باتوں کا کوئی بھی امکان تھا جو آپ کو تیرہ سال کی مکی زندگی میں پیش آئیں۔ اور بالآخر ہجرت تک لے گئیں؟ قریش کب کہتے تھے کہ آپ اپنے باپ دادا کے دین کو چھوڑ کر اپنی پسندیدہ راہ پر نہ چلیں؟ وہ تو صرف یہ چاہتے تھے کہ آپ باپ دادا کے دین کو غلط نہ کہیں، ان کے معبودوں کو معبودان باطل نہ بتلائیں۔ اور لوگوں کو پرانا طریقہ چھوڑنے کی تلقین نہ کریں، گویا وہ آنحضرتؐ سے اسی "ہندوستانی ٹائپ" کی رواداری کے طالب تھے، ــــ جس پر عمل پیرا نہ ہونا ہی آپ کی مخاصمت کی سب سے بڑی بنا تھی! اور اگر جواب اثبات میں نہیں نفی میں ہو اور ہمارے یہ بھائی الحمدللہ اس تاریخی اور مذہبی گمراہی میں مبتلا نہیں ہیں تو پھر برائے خدا بتلایا جائے کہ ان جلسوں کے پروگرام کے اس جزو کا کیا مقصد ہے؟ کیا اس سے خوشنودیٔ اقتدار اور رضائے اکثریت مطلوب ہے؟ ــــ سوال یقیناً بہت تلخ ہے مگر اس مجبوری کو کیا کیا جائے کہ ان دو کے علاوہ تیسری کسی بات کا امکان نہیں ہے، ان دونوں میں سے ایک نہ ایک بات بہرحال ہے اور جو بھی ہے وہ ہلکی نہیں ہے! پہلی بات نہایت دوررس اثرات کی حامل ضلالت ہے، اور دوسری حد درجہ کی گراوٹ۔

اگر وحدت ادیان کے اس تصور کو صحیح مان لیا جائے تو اس کا سب سے پہلا منطقی نتیجہ یہ ہو گا کہ غیر مسلموں میں اسلام کی تبلیغ کو قطعاً غیر ضروری سمجھا جائے اور اس میں وقت صرف کرنے کو اضاعت وقت سمجھا جائے کیونکہ جب ہر راہ، راہ نجات ہو تو انسان اپنے لیے جس راہ کو بھی پسند کرے گا لیکن دوسروں کو اس کی تلقین کی کوئی حاجت باقی نہیں رہتی اور پھر اسی کو اگر ذرا دور تک سوچیے تو ماننا پڑے گا کہ وہ ذات گرامی جس کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے ہم یہ جلسے منعقد کرتے ہیں (معاذ اللہ) عمر بھر اسی لایعنی کام میں مشغول رہی۔ کوئی قرآن و حدیث اور سیرت طیبہ سے چن چن کر ہزاروں باتیں بھی بزعم خود مذہبی رواداری کے اس تصور کے ثبوت میں پیش کر دے مگر اس تاریخی واقعہ سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کے تمام انسانوں کو اپنے لائے ہوئے دین کی دعوت دیتے تھے اور یہی بات قریش مکہ کو آپ کی جان کا دشمن بنائے ہوئے تھی۔ اس کے سوا اور کوئی شکایت انھیں آپ سے نہ تھی، لہٰذا اس منطقی نتیجہ کی رو سے یہ ذات گرامی بھی نہیں بچ سکتی! ---- تو کیا یہی ہے وہ "خراج عقیدت" جسے بارگاہِ رسالت میں پیش کرنے کے لیے ہر سال مسلمانوں کے لاکھوں روپے پانی کی طرح بہا دیے جاتے ہیں؟

اور اگر بفضل خدا ہم اس تصور سے بھی کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں تو ہمیں سوچنا چاہیے کہ ہم اس متبرک تقریب کے پروگرام کے اس جزو سے اپنی کس درجہ گراوٹ کا ثبوت پیش کر رہے ہیں۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام ہدایت کو وحدت ادیان کے اس تصور سے کوئی واسطہ نہیں ہے، اس تصور کی رو سے آپ کی اصل دعوت غلط ٹھہرتی ہے اور آپ کی ساری جدوجہد ایک لایعنی چیز بن جاتی ہے۔ مگر ملک کے سیاسی حالات کے پیش نظر ہم اس تبلیغ کو صرف سننا ہی گوارا نہیں کرتے، بلکہ اپنے خرچ پر اس کی نشر و اشاعت کا انتظام بھی کرتے ہیں! "کہ غیرت نام ہے جس کا گئی تیمور کے گھر سے" ---- ہم ابھی تک اتباع دین سے تہی دست ہوئے تھے، مگر حمیت دین سے ہمارے سینے خالی نہ تھے۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی نوعیت نے اس چنگاری کو خوب راکھ میں دبایا، مگر دھواں اس سے پھر بھی کبھی کبھی اٹھتا نظر آجاتا تھا، مگر کیا اب اس کی بچی کھچی حرارت کا خاتمہ خود ہمارے ہی ہاتھوں ہونا ہے؟

اس موقع پر ہم اس وحدت ادیان کے دامِ ہمرنگِ زمین کی حقیقت بھی واضح کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ ان جلسوں کی "برکت" سے اگر کوئی ناواقف مسلمان اس کا شکار ہو گیا ہو تو اس کی غلط فہمی کا ازالہ

ہو سکے۔

وحدت ادیان کے جس تصور پر گفتگو ہے جیسا کہ بتلایا جا چکا ہے وہ یہ ہے کہ ہر دین و ہر مذہب اور ہر دھرم سچا اور خدا رسی کا ذریعہ ہے۔ مختلف مذہبی راستوں میں سے جس راستہ کو بھی آدمی اختیار کرے وہ خدا کا قرب اور اس کی رضا حاصل کر سکتا ہے یا دوسرے الفاظ میں حق اور سچائی ایک ہی ہے ہر مذہب کا مقصد اس کی تلاش ہے، مختلف قومیں اور مختلف ملکوں کے باشندے اس کی تلاش کے لیے جن طریقوں کو بھی اپنائیں ان میں حق و باطل کی کوئی تفریق نہیں ہے بلکہ حق پرستوں کا کام یہ ہے کہ سب کو حق سمجھیں۔

یہ تصور دراصل ہندومت کا ہے۔ اسی لیے اس مذہب میں اپنے دائرہ سے باہر اپنی تبلیغ کا کوئی خیال اب سے کچھ عرصہ پہلے تک پیدا ہی نہیں ہوا تھا ـــــ مگر اب مسلمانوں کے سامنے اس طرح اس تصور کو پیش کیا جاتا ہے کہ گویا یہی قرآن کی بھی تعلیم ہے اور بعض لوگ تو بعض آیتیں بھی اس کے ثبوت میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں مثلاً

• إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔ (البقرہ ع ۸)	وہ لوگ جو ایمان لائے اور یہود و نصاریٰ اور صابئین جو بھی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لائے اور اچھے اعمال کیے بیشک ان کے لیے اجر ہے ان کے رب کے پاس اور انھیں نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔
(۲) إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيُرِيدُونَ أَنْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ أَنْ يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا ۝ أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا ج (النساء ع ۲۱)	(۲) جو لوگ منکر ہیں اللہ اور اس کے رسولوں سے اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں میں فرق کریں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض کو مانتے اور بعض کو نہیں مانتے اور چاہتے ہیں کہ کلی ایمان اور کلی انکار کے بیچ کی کوئی راہ نکالیں ـــ یہی لوگ ہیں اصل کافر۔

پہلی آیت سے اس طرح استدلال کیا جاتا ہے کہ دیکھئے آیت سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ نجات کسی ایک مذہب میں منحصر نہیں ہے مسلمان ہوں یا یہودی، نصرانی ہوں یا صابی ہر ایک

آخرت میں فلاح یاب ہو سکتا ہے بس شرط یہ ہے کہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھے اور اچھے اعمال کرے اصل چیز مطلق ایمان اور مطلق عمل صالح ہے نہ کہ اس کا کوئی متعین مفہوم اور متعین صورت ——— یہ گویا اس دعوے پر مثبت استدلال ہے۔

اور دوسری آیت سے استدلال اس طرح کیا جاتا ہے کہ اس آیت میں تفریق بین الرسل ... (رسولوں کے درمیان تفریق کرنے) کو حقیقی کفر قرار دیا گیا ہے لہذا مذاہب کی الگ الگ صورتیں اور مختلف ملتیں جو مختلف انبیاء ہی کی آمد سے وجود میں آئی ہیں ان میں سے کسی ایک کو حق اور کسی کو باطل سمجھنا یہ بھی کفر ہے کیونکہ اس سے وہی تفریق بین الرسل لازم آتی ہے جسے کفر حقیقی قرار دیا گیا ہے ——— یہ گویا منفی استدلال ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ وحدتِ ادیان کے جس تصور سے یہاں بحث ہے اس کی ذرا سی بھی تائید ان آیات سے نہیں ملتی۔ ان لوگوں نے غالباً وحدتِ دین اور وحدتِ ادیان کے فرق کو نہیں سمجھا ہے ورنہ کبھی ان آیات سے استدلال نہ کرتے۔ یہ آیات وحدتِ دین کا ثبوت ہیں نہ کہ وحدتِ ادیان کا۔ وحدتِ ادیان کا تصور تو اتنی غیر معقول بات ہے کہ خدائے حکیم کے کلام میں اس کی تائید تلاش کرنا ہی بے سود ہے البتہ وحدتِ دین ایک حقیقت ہے اور قرآنی حقیقت ہے ان دونوں آیتوں سے بھی بس اسی حقیقت کا اظہار ہوتا ہے۔

پہلی آیت میں بتلایا گیا ہے کہ دنیا کے تمام انسانوں اور تمام گروہوں کے لیے نجات کی شاہراہ صرف ایک ہے وہ ہے ایمان باللہ، ایمان بالآخرۃ اور عمل صالح جو اس پر چلے گا وہ منزل پر جا پہنچے گا اور جو اسکو چھوڑ دے گا وہ کبھی کامیاب نہ ہو سکے گا چاہے وہ انبیاء کی نسل سے ہو یا بت پرستوں کی نسل سے ——— قرآن بار بار کہتا ہے کہ اللہ کے تمام پیغمبروں نے اپنے مخاطبین کو یہی پیغام ہدایت دیا اور اسمیں کبھی کوئی فرق نہیں ہوا۔

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا ؕ	(یہ) خدا کی وہ بناوٹ ہے جس پر اس نے انسانوں
لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّیْنُ	کو بنایا (اور) اللہ کی بناوٹ کو کبھی تبدیلی نہیں
الْقَیِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ۔	(یہی) سیدھا دین ہے لیکن بہت سے لوگ
(الروم ع ۴)	جانتے نہیں۔

اللہ کا دین ہمیشہ سے انسانوں کی فطرت کے مطابق ہے اور فطرت انسانی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی اس لیے دین میں بھی کوئی ردوبدل نہیں ——— اور اس سے بھی صاف الفاظ میں قرآن کہتا ہے:

شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ

(الشوریٰ ع ۲)

اس نے (اللہ نے) متعین کر دی ہے تمہارے لیے دین کی وہی راہ جس کا حکم نوح کو دیا گیا تھا اور جس کی ہم نے تیری طرف وحی کی اور جس کا حکم ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا (یہی بات تھی) کہ اسی دین حق کو قائم رکھو اور اسمیں باہم اختلاف نہ کرو۔

اس آیت میں بتلایا گیا کہ سلسلہ نبوت کی پہلی کڑی (حضرت نوح ؑ) سے آخری کڑی (خاتم النبین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تک دین حق ایک ہی رہا ہے۔ یہی مطلب ہے وحدت دین کا۔ دوسری آیت میں جو بات کہی گئی ہے وہ گویا اسی کا لازمی نتیجہ ہے کہ جب یہ حقیقت ہے کہ اللہ کے تمام پیغمبر ایک ہی دین کے داعی ہیں تو پھر اس کے کیا معنی کہ بعض کی تصدیق کی جائے اور بعض کی تکذیب۔ پیغمبر کی تصدیق اور تکذیب کا مطلب اس کی دعوت کی تصدیق و تکذیب ہوتا ہے لہذا ایک پیغمبر کی تکذیب کرنے سے آدمی اس دین قیم کے انکار کا مرتکب ہوتا ہے جو شاہراہ نجات ہے پس اس کا شمار مومنین میں نہیں بلکہ کافرین میں ہوگا۔

بہرحال یہ ہے قرآن کا تصور وحدت دین اور اس کے برعکس وحدت ادیان کا مطلب جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے یہ ہے کہ دین ایک نہیں متعدد ہیں مگر وہ اپنی غرض و غائت کے اعتبار سے ایک ہیں یعنی سب کی غرض رضائے الٰہی کی طلب اور سب کی غائت رضا کا حصول ہے اور قابل اعتنا بس یہی چیز ہے ۔۔۔ بایں معنی وہ متعدد ہونے کے باوجود ایک ہی ہیں پس وہ تمام راہرو جو ایک ہی منزل کی جستجو میں مختلف راستوں پر گامزن ہیں ان کو چاہیے کہ ایک دوسرے کو مسافران جادہ حق سمجھیں اور ایک دوسرے پر اپنی مخصوص راہ کے لیے اصرار نہ کریں۔ بتلائیے کہ قرآن کی کوئی آیت اس نظریہ کی تائید کر بھی کیسے سکتی ہے جب کہ یہ قرآنی نظریہ کی بالکل ضد ہے؟ اور تفریق بین الرسل کی ممانعت کا تقاضہ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ دو باہم متضاد دینوں کی بیک وقت تصدیق کی جائے قرآن کی تفریق بین الرسل کی ممانعت تو اسی امر پر مبنی ہے کہ تمام انبیاء و رسل ایک ہی دین کے داعی تھے۔

قرآن اس نظریہ کے پہلے جزو کو تو مانتا ہے اور وہ بالکل واقعاتی چیز ہے کہ "دین متعدد ہیں" مگر اس دوسرے جزو کا کھلا انکار کرتا ہے کہ "وہ سب حق ہیں" وہ بنیادی طور پر دین کی دو قسمیں بتلاتا ہے ایک اسلام اور ایک کفر۔۔۔ اسلام دین کی اس قسم کا نام ہے جس کی دعوت اللہ کے پیغمبروں نے دی یہی حق ہے اور مقبول ہے اور کفر وہ ہے جسے لوگوں نے خود گھڑا۔۔۔ اور باطل ہے اور نامقبول ہے خواہ انسان اپنے اس دین میں خود کو فنا ہی کیوں نہ کر دے!

وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ۔ (آل عمران۔ ع ۹)	اور جو کوئی اسلام کے سوا دین کی کوئی اور راہ چاہے گا تو اس کی راہ ہرگز قبول نہ کی جاوے گی اور وہ آخرت میں ٹوٹے میں رہنے والوں میں سے ہوگا۔

یہاں ایک سطحی شبہ ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں، یہودیوں اور عیسائیوں کے دین میں تو باہم بہت کچھ اختلاف ہے تو پھر قرآن سب کی تصدیق کیسے کرتا ہے۔

یہ شبہ حقیقت میں بالکل بے بنیاد ہے اور اسی شخص کے ذہن میں آ سکتا ہے جس نے قرآن کا مطالعہ نہ کیا ہو بلکہ صرف یہ سن لیا ہو کہ قرآن ان سب کے دین کی تصدیق کرتا ہے۔ قرآن کہیں بھی ان مذاہب کی موجودہ شکلوں کی تصدیق نہیں کرتا بلکہ وہ کہتا ہے کہ اللہ نے ان سب کے پاس وہی دین بھیجا تھا جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ بھیجا ہے (پڑھیے سورہ شوریٰ کی وہ آیت جو اوپر گزری "شرع لکم من الدین ما وصّٰی بہ نوحاً الخ") مگر انھوں نے اسکو اصل حالت میں قائم نہیں رکھا جس سے قدرتی طور پر مذاہب کی الگ الگ صورتیں بن گئیں اور لوگ ان کو لے کر ٹکڑیوں میں بٹ گئے۔

فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ۔ (الروم۔ ع ۴)	انھوں نے (ایک ہی) دین کے الگ الگ کئی دین بنا لیے اور ان کے مختلف (مذہبی) گروہ بن گئے۔ ہر گروہ کا یہ حال ہے کہ جو کچھ اس کے پاس ہے وہ اسی میں مگن ہے۔

پھر اس دین کی اصلیت اور اختلاف باہمی کی وجہ بتلاتا ہے۔

إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ۔ (آل عمران۔ ع ۲)	دین اللہ کے یہاں (معتبر) صرف اسلام ہے اور یہ جو اہل کتاب کا باہمی اختلاف ہو یہ اس حقیقت سے واقف ہو جانے کے باوجود ہوا صرف آپس کی ضد میں!

قرآن ان مذاہب کی موجودہ صورتوں کو "اسلام" نہیں سمجھتا۔ بلکہ ان سب کو کفر و شرک کے اقسام قرار دیتا ہے اور مسلمانوں کو ان کے پیرووں کا طریقہ اختیار کرنے سے بچنے کا حکم دیتا ہے۔

وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ الآیہ۔	اور تم نہ ہو جاؤ مشرکین میں سے، ان میں سے جنھوں نے دین کی الگ الگ صورتیں بنا لیں

(الروم ۔ ع ۴) (اور اصل دین کو گم کر دیا)

پھر قرآن اصل دین کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اسکی اصلی صورت میں پیش کرتا ہو اور اہل کتاب کو یاد دلاتا ہے کہ دیکھو یہی تمہاری متاع گم گشتہ ہے آؤ اسکو مضبوطی سے پکڑ لو اگر تم اپنی اصل پر آجاؤ گے تو دیکھو گے کہ تمہارے اور مسلمانوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔

الغرض یہ خیال سراسر بے بنیاد ہے کہ قرآن ان مذاہب کی موجودہ شکل میں بھی تصدیق کرتا ہو قرآن نے اس مغالطے کے لیے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی ہے لہذا اس تصدیق کی بنیاد پہ ایک سے زیادہ ادیان کے حق ہونے کا نظریہ ثابت نہیں ہو سکتا۔ بلکہ قرآن کا کھلا ہوا نظریہ اس بارے میں یہی رہتا ہو کہ دین حق اور اللہ کے یہاں مقبول صرف ایک ہے اور وہ ہے ایمان باللہ، ایمان بالآخر اور عمل صالح لیکن مطلق ایمان اور مطلق عمل صالح نہیں کہ اس کا جو تصور بھی آپ قائم کرلیں اور اس کے مطابق جو شکل بھی آپ اسکو دیدیں وہ دین حق ہی رہے جیسا کہ قائلین وحدت ادیان کو سورۂ بقرہ کی اس آیت سے دھوکا ہوا ہے جو ابتدائے مضمون میں اُن کے استدلال کے طور پر پیش کی گئی ہے۔

(ان الذین آمنوا والذین ھادوا الخ)

بلکہ اس کا ایک خاص مطلب ہے جس کے بغیر یہ مقبول نہیں ——— اور وہ یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کی جائے، کسی چیز کو اللہ کا شریک نہ ٹھہرایا جائے اور کسی انسان کو رب کا درجہ نہ دیا جائے ——— یہی وجہ ہے کہ اہل کتاب کے پاس "ایمان" اور "عمل صالح" جس شکل میں موجود تھا قرآن نے اسکو غلط ٹھہرایا اور اسکو بدلنے پر اصرار کیا۔ علیٰ ھذا مشرکین عرب بھی خدا کو مانتے تھے اور اپنے خیال کے مطابق اسکی خوشنودی کے لیے "عمل صالح" بھی کرتے تھے مگر قرآن اس من مانی خدا پرستی پر راضی نہ تھا اس کے نزدیک خدا پرستی کی مقبول صورت صرف وہی ہے جو بیان کی گئی اس کو وہ مختصر الفاظ میں "الدین الخالص" کہتا ہے چنانچہ مشرکین کے معاملہ میں بھی صاف ارشاد ہے:۔

الا للہ الدین الخالص ط والذین اتخذوا من دونہ اولیآء ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفیٰ ط ان اللہ یحکم بینھم فیما ھم فیہ یختلفون۔ (الزمر ۔ ع ۱)	خوب سمجھ لو کہ اللہ کے لیے ہے دین بے آمیز بندگی اور جن لوگوں نے ٹھہرا لیے ہیں اس سے ورے کچھ معبود (کہتے ہیں) کہ ہم ان کو اس واسطے پوجتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں تو اللہ فیصلہ کرے گا فیصلہ کر دیگا ان کے اس جھگڑے کا۔

لہٰذا ایک مسلمان کے لیے اب کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ دیوی دیوتاؤں کی پرستش کے ساتھ (چاہے یہ پرستش خدا کے قرب کے حصول ہی کی نیت سے کیوں نہ ہو) خدا پرستی کا دعویٰ بالکل قابل قبول نہیں اور ایسے "ایمان" اور "عمل صالح" سے رضائے الٰہی کے حصول کی توقع ایک خواب پریشاں سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔

اب تک بحث سے جو باتیں ثابت ہوئیں وہ خلاصہ کے طور پر یہ ہیں۔

۱۔ دین حق ایک ہے متعدد نہیں۔

۲۔ اللہ کے تمام پیغمبروں نے مختلف زمانوں اور مختلف قوموں میں اسی ایک دین کی دعوت دی۔

۳۔ دین میں جو تعدد پیدا ہوا ہے وہ اللہ اور اس کے رسولوں کا پیدا کردہ نہیں ہے بلکہ انسانی آمیزشوں کا پیدا کردہ ہے۔

۴۔ ان آمیزشوں کے ساتھ دین، وہ دین نہیں جو اللہ کے یہاں مقبول اور موجب نجات ہو۔

۵۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دین پیش کیا وہی ہمیشہ کا مقبول دین ہو اور انسانی آمیزشوں سے پاک کر کے اس کے اصلی رنگ میں پیش کیا گیا ہے اور وہ رنگ توحید خالص ہے۔

پس ظاہر ہے کہ جس دین میں توحید خالص کا رنگ نہ ہو وہ دین اللہ کے یہاں مقبول نہیں ہو سکتا۔

اب ایک سوال یہ کیا جا سکتا ہے کہ اچھا اگر توحید کی اس کسوٹی پر کس کر تمام مذاہب کے پیرو اپنے مذاہب کو آمیزشوں سے پاک کر دیں لیکن عملی زندگی میں دین کے تقاضے پورے کرنے کے لیے اپنے قدیم دستور العمل پر کاربند رہیں یعنی شریعت محمدی کا اتباع نہ کریں تو کیا وہ فلاح یاب ہو سکتے ہیں؟

اس سوال کے متعلق پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ سوال صرف ان لوگوں کے حق میں کیا جا سکتا ہے جس کے متعلق یقینی طور پر معلوم ہو کہ ان کا تعلق کبھی اللہ کے کسی پیغمبر سے رہا ہے یعنی وہ زمانہ قدیم میں کسی نبی برحق کے متبع رہے ہیں، جن لوگوں کے متعلق یہ بات یقینی طور پر معلوم نہ ہو سکے اُن کے متعلق اس کا کوئی سوال ہی نہیں کیونکہ جب یہی نہیں معلوم کہ یہ کسی نبی کے متبع تھے بھی تو اس کا کیسے یقین ہو سکتا ہے کہ ان کا مذہبی دستور العمل بھی کوئی آسمانی شریعت ہے کیونکہ آسمانی شریعت تو نبی کے ذریعہ ہی مل سکتی ہے، پس اب یہ سوال صرف اُن لوگوں کے حق میں رہ جاتا ہے جن کا کسی نبی سے تعلق ہونا یقینی طور پر معلوم ہے جیسے یہود و نصاریٰ کہ ان کے اس تعلق کی خبر خود قرآن دیتا ہے۔ پھر ان کے بارے میں بھی یہ سوال جب قائم رہتا ہے جبکہ یہ ثابت ہو جائے کہ ان کے پاس جو مجموعہ احکام شریعت کے نام سے ہے وہ بعینہٖ وہی ہے جو ان کے نبی کے ذریعہ انھیں دیا گیا تھا۔ اگر اس میں شبہ ہے

تو پھر ان لوگوں کے حق میں بھی یہ سوال قائم نہیں رہتا اور آج یہ بات پوری طرح ثابت ہو چکی ہے کہ کسی سابقہ شریعت کے متعلق اس کی اصلی حالت میں ہونے کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا ـــــ اس تنقیح کے بعد یہ سوال صرف نظری رہ جاتا ہے کہ بالفرض اگر کوئی سابقہ شریعت من وعن موجود ہو یا اس کا کسی طور پر غیر محرف طور پر موجود ہونا ثابت ہو جائے تو پھر کیا حکم ہے؟ ہم کہیں گے اس سوال کا جواب نفی میں ہے ـــــ اور جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن شریعت محمدی کے اتباع پر زور نہیں دیتا وہ غلط سمجھتے ہیں ـ کیوں؟ اس لیے کہ جو نبی جن لوگوں کی طرف بھیجا جاتا ہے ان کے لیے اس کی مکمل اطاعت اور اس کے طریقہ کا اتباع لازم ہوتا ہے چنانچہ قرآن کہتا ہے:۔

ما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ ۔ (النساء ع ۹)	اور ہم نے کوئی رسول ایسا نہیں بھیجا جس کے متعلق یہ حکم نہ ہو کہ اس کی اطاعت کی جائے

اب اگر قرآن سے یہ ثابت ہو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کسی خاص وقت یا کسی خاص انسانی گروہ تک محدود نہ تھی بلکہ قیامت تک ساری دنیا کے لیے تھی تو پھر خود بخود آپ کی اطاعت کا ہم سب پر واجب ہو جاتی ہے ۔ اور کسی دوسری اطاعت کا سوال نہیں رہتا ۔

قرآن اس بارے میں صاف شہادت دیتا ہے کہ:۔

وما ارسلنٰك الا كافة للناس الآیہ (السباء ۔ ع ۳)	اور (اے محمد) بلاشبہ تمہاری رسالت کل عالم انسانی کے لیے ہے ۔

یہ تو ان چند مقدمات کے نتیجے کے طور پر ثابت ہوا ـــــ اور یہ ثبوت بھی قطعی ہے لیکن اگر صراحت چاہی جائے جس میں صاف طور پر یہ کہا گیا ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع ضروری ہے تو یہ صراحت بھی سنیئے ۔

قل یا ایها الناس انی رسول اللہ الیكم جمیعا الذی له ملك السمٰوٰت والارض لا اله الا هو یحیی ویمیت فاٰمنوا باللہ ورسوله النبی الامی الذی یؤمن باللہ وكلمٰته واتبعوه لعلكم تهتدون (الاعراف ع ۲۰)	(اے محمد) کہو کہ اے لوگو میں اللہ کا فرستادہ ہوں تم سب کی جانب وہ اللہ جس کی حکومت ہے آسمان و زمین پر کوئی معبود نہیں جز اس کے وہی جلاتا ہے اور مارتا ہے ۔ سو تم مانو اللہ کو اور اس کے بھیجے نبی امی کو جو مانتا ہے اللہ کو اور اس کے کلمات کو (یعنی اس کی سب کو کتابوں کو) اور اس کے قدم بقدم چلو تاکہ تم راہ پا جاؤ ۔

دو ٹوک انداز میں کہا جا رہا ہے کہ ہدایت پانا دو چیزوں پر موقوف ہے ۔ ایک اللہ اور نبی امی پر ایمان اور

دوسرے اس نبی کی اتباع۔ پھر یہ صرف لا مذہبوں اور مشرکوں سے نہیں کہا جا رہا ہے بلکہ خاص طور پر اس کے مخاطب وہ لوگ ہیں جن کو قرآن خود اہل کتاب کہتا ہے کیونکہ اس سے پہلی آیتوں میں مسلسل انہیں کا تذکرہ چلا آ رہا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی امت کے لیے رحمتِ حق کی دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے چند شرائط کے ساتھ رحمت کا وعدہ کیا ان میں سے ایک شرط یہ تھی انہیں کی امت میں سے رحمت کے مستحق وہ لوگ ہوں گے جو اس نبی امی کا اتباع کریں جس کا ذکر ان کے پاس تورات و انجیل میں موجود ہے اور اس کی یہ علامتیں ہیں اس کے بعد پھر حاصلِ کلام کے طور پر یہ بات کہی گئی کہ جو اس کو مانیں گے اس کی رفاقت و نصرت کریں گے اور اس کی کتاب شریعت کی روشنی میں ایمان کے تقاضے پورے کریں گے ــــــــ فلاح ابدی انہیں کا حصہ ہے۔ یہاں تک گویا اللہ نے اہل کتاب کو یاد دلایا کہ ہمارے تمہارے درمیان یہ وعدہ تھا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کہلوایا جاتا ہے کہ اللہ کا یہ وعدہ اب بھی قائم ہے اب وقت آ گیا ہے اس شرط کے پورا کرنے کا۔

الغرض ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مذکورہ بالا آیت میں "الناس" کے دائرہ عموم میں تو اہل کتاب آتے ہی ہیں مگر وہ خاص طور سے بھی پیش نظر ہیں اور اس کا بہت واضح قرینہ یہ ہے کہ انہیں فآمنوا باللہ و رسولہ' کہنے پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ رسول کی صفت میں النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ کا اضافہ کیا گیا اس اضافہ کا مقصد بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ "الناس" میں سے جو اہل کتاب ہیں ان کا ذہن اس طرف منتقل کرایا جائے کہ جس رسول کی تصدیق اور اتباع کا مطالبہ کیا جا رہا ہے یہ وہی رسول ہے جس کی تصدیق اور جس کے اتباع کو ان کے استحقاق رحمت و فلاح کی شرط قرار دیا گیا تھا کیونکہ اس شرط میں بھی اس رسول کی یہی صفت بیان کی گئی تھی ــــ بہتر یہ ہے کہ جن آیتوں کا تذکرہ کیا جا رہا ہے آپ ان کو خود ملاحظہ فرمالیں کہ یہ اس امر میں انتہائی تشفی بخش ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جس دعا کا ذکر کیا گیا ہے اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ کے ارشاد کو قرآن یوں بیان کرتا ہے۔

قال عذابی اصیب بہ من اشاء
ورحمتی وسعت کل شیء فسأکتبہا
.....للذین یتقون و یؤتون
الزکوٰۃ والذین ہم بآیاتنا یؤمنون
الذین یتبعون الرسول النبی

فرمایا اللہ تعالیٰ نے کہ میرا عذاب جو ہے سو اسے
واقع کرتا ہوں (خاص طور پر) اسی پر جس کو میں
چاہتا ہوں اور رحمت میری سو وہ ہر چیز کو شامل
ہے پس تیری قطعی طور پر لکھ دوں گا رحمت ان
لوگوں کے لیے جو میرا لحاظ کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے۔

الامی الذی یجدونه مکتوبا
عندهم فی التوراة والانجیل
یأمرهم بالمعروف وینهٰهم
عن المنکر ویحل لهم الطیبٰت
ویحرم علیهم الخبٰئث ویضع عنهم
اصرهم والاغلٰل التی کانت علیهم
فالذین اٰمنوا به وعزروه و
نصروه واتبعوا النور الذی
انزل معه اولٰئک هم المفلحون۔

(الاعراف۔ ع ۱۹)

اور ہماری باتوں پر یقین کریں گے (یعنی) وہ
لوگ جو اللہ کے بھیجے اس نبی امی کا اتباع کریں
کہ جس کو وہ اپنے پاس توراۃ و انجیل میں لکھا
ہوا پائیں گے جو انھیں حکم کرے گا پسندیدہ باتوں
کا اور روکے گا ناپسندیدہ باتوں سے اور حلال
کرے گا ان کے واسطے سب پاک چیزیں اور
حرام کرے گا ناپاک چیزوں کو اور وہ بوجھ اور
پھندے ان پر سے اتار کر الگ کرے گا جن
میں وہ دبے ہوئے اور پھنسے ہوئے ہوں گے۔

(الحاصل)

جو اس پر ایمان لائے اور اس کی رفاقت کی اور اسکی مدد کی اور اتباع کیا اس نور (ہدایت کا) جو اس کے ساتھ اتارا گیا ہے بس وہی لوگ ہوں گے کامیاب و بامراد ہونے والے۔ یہ وہ آیات ہیں جن کا خلاصہ ہم نے اوپر بیان کیا تھا اور انھیں کے بعد متصلاً وہ آیت شروع ہو جاتی ہے جو ان سے پہلے نقل کی گئی۔ یہ انیسویں رکوع کی آخری آیات ہیں اور وہ بیسویں رکوع کی پہلی آیت۔ اس کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ شریعت محمدی کے اتباع کے بغیر نجات و فلاح کی امید رکھنا کسی دیوانے کے خواب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ یہ امر و نہی تحلیل و تحریم شریعت ہی کے تو عناصر ہیں جنھیں نبی امی کے لیے ثابت کرنے کے بعد کہا جا رہا ہے۔ فالذین آمنوا به واتبعوا النور الذی انزل معه اولٰئک هم المفلحون جب صدق اہل کتاب تک کو اتحاد فی الدین کافی نہیں ہے بلکہ اتباع شریعت محمدی ضروری ہے تو پھر وہ لوگ کس شمار و قطار میں ہیں جن کا اہل کتاب ہونا بھی غیر مصدق ہے۔

بات گو بالکل صاف ہو چکی ہے مگر بعض آیتیں اب بھی ایسی ہیں جن سے کسی کو شبہ پیدا ہو سکتا ہے یا مغالطہ دیا جا سکتا ہے ان میں سے زیادہ اہم سورۂ مائدہ کی ایک آیت ہے۔ بہتر ہے کہ اس کو بھی صاف کر دیا جائے۔

فرمایا گیا ہے

لکلٍّ جعلنا منکم شرعة و

تم میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے (عمل کا)

مِنْهَاجًا ۚ وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلٰكِنْ لِيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ الخ

(مائدہ۔ ع ۷)

ایک ضابطہ اور طریقہ بنایا، اور اللہ اگر چاہتا تو یہ ہو سکتا تھا کہ تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا مگر ایسا نہ کرنے میں ایک حکمت یہ بھی تھی، کہ اپنے احکام میں تمہاری آزمائش کرے۔ پس سبقت کرو بھلائیاں قبول کرنے میں۔

اس سے بھی بعض لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں، اور یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ تمام انسانوں کے لیے ایک ہی شریعت کی پابندی ضروری نہیں ہے، بلکہ خود خدائے تعالے ہی الگ الگ شریعتیں اور الگ الگ امتیں رکھنا چاہتا ہے ــــ لیکن یہ محض غلط فہمی ہے، اور آیت کا مقصد قطعاً یہ نہیں ہے، جو ان لوگوں نے سمجھا ہو یہ آیت دراصل ماقبل کی آیات سے پیدا ہونے والے ایک سوال کا جواب ہے۔ لہٰذا ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ ماقبل میں کیا کہا جا رہا ہے اور اس سے کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔

ماقبل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہا جا رہا ہے کہ اگر اہل کتاب آپ سے کسی معاملے میں حکم دریافت کریں (جیسا کہ یہود نے زنا کی سزا کے بارے میں پوچھا تھا) تو آپ وہی حکم تبلائیں جو ہماری طرف سے آپ کو دیا گیا ہو، یعنی قرآن کے مطابق فیصلہ کریں۔ کیونکہ ہر کتاب کا ایک دور ہوتا ہو جس میں اسی (کتاب) کے مطابق فیصلہ کرنا ضروری ہوتا ہے۔ ہم نے جب توراۃ نازل کی تو انجیل کے نازل کرنے تک ہمارا حکم یہی تھا کہ اس کے احکام پر عمل کیا جائے، چنانچہ جو فرمانبردار تھے وہ اسی کے مطابق عمل کرتے رہے اس کے بعد ہم نے (حضرت) عیسیٰ کو انجیل دے کر بھیجا تو اسی قدیم دستور کے مطابق حکم یہ تھا کہ احکام انجیل کی پابندی کی جائے۔ اور اب آپ کو قرآن دے کر بھیجا ہے تو ٹھیک اسی دستور کے مطابق اب ہمارا حکم یہ ہے کہ ہر معالے کا فیصلہ قرآن کے مطابق کیا جائے، (اور بعد والی کتاب کا مقصد جہاں کچھ نئے احکام دینا ہوتا ہے وہاں اُس سے پہلی کتابوں کے اُن احکام کی تجدید بھی مقصود ہوتی ہے جن میں اہل کتاب تحریف کرنے لگتے ہیں، قرآن کی بھی بہت سی ہدایات اور بہت سے احکام وہی ہیں جو کتب سابقہ میں تھے۔ مگر جب ان کتابوں کے امین ان میں بد دیانتی کرنے لگے تو پھر اب ان کتابوں پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا، اور ضروری ہو کہ ہدایات الٰہی کی امانت اب از سر نو دوسرے لوگوں کے سپرد کی جائے۔ چنانچہ قرآن کی امانت کے لیے سابقہ اہل کتاب کو چھوڑ کر ایک نئی اُمت کا انتخاب کیا گیا) پس اب حکم کے حق و باطل ہونے کا معیار قرآن کی مطابقت ہے، جو حکم قرآن کے مطابق ہو وہ حق ہو، یعنی اللہ کا حکم ہے اور جو قرآن کے مطابق نہیں ہے وہ باطل یعنی غیر اللہ کا حکم ہے، چاہے وہ حکم توریت کے ٹھیکہ

دیں یا انجیل کے! ــــ یہ ہے ان آیات کا ذرا تفصیلی مطلب جو زیر بحث آیت کے ماقبل کی ہیں ــــ اس
پر اہل کتاب کی طرف سے یہ کہا جاسکتا تھا کہ ہم (یعنی اہل کتاب) اگر پوری دیانتداری کے ساتھ کتب سابقہ
کے احکام و ہدایات کو پیش کرنے لگیں تب بھی تو قرآن سے پوری مطابقت نہیں ہوسکتی، کیونکہ اسمیں کتنے ہی
احکام بدل کر نئے احکام رکھے گئے ہیں، ہم اپنی پہلی کتاب اور پہلی شریعت کو کیسے چھوڑ دیں حالانکہ وہ بھی
منجانب اللہ ہے اور ہم اپنے کو (حضرت) محمدؐ کے لائے ہوئے احکام کا کیسے پابند بنائیں جبکہ ان کے احکام ہماری
قدیم شریعت سے کہیں مختلف بھی ہوتے ہیں؟

اس سوال کا جواب دیا گیا لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجاً الخ۔ یعنی
بیشک یہ بات ہے کہ تمہاری قدیم شریعتوں میں اور اس نئی شریعت میں کچھ فرق ہے، اور یہی نہیں بلکہ پہلی
شریعتوں میں بھی خود آپس میں تھوڑا بہت اختلاف ہوا اور یہ اختلاف ہمارا ہی رکھا ہوا ہے لیکن اس فرق و اختلاف کی اور
بہت سی وجوہ و مصالح کے علاوہ ایک بڑی حکمت یہ ہے کہ ہر بعد والی شریعت کے ذریعہ پہلی شریعت والوں
کا امتحان ہوجاتا ہے، یعنی یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ کون لوگ اس شریعت کی پابندی خدا پرستی کے جذبہ سے کر
رہے ہیں اور کون لوگ آباء پرستی کے جذبہ سے، جو خدا پرستی کے جذبہ سے کرتے ہیں وہ یہ معلوم ہونے کے بعد کہ اب
خدا کا حکم یہ ہے، اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے ہیں، اور یہ سوال نہیں اٹھاتے کہ ہمارے پاس جو اللہ کا حکم سابق ہے
جس پر ہمارے باپ دادا چلتے رہے ہیں وہ اس سے مختلف ہے، اس لیے کہ اطاعت و فرمانبرداری کی روح یہی ہے کہ
جس وقت جو حکم دیا جائے، بے چوں و چرا مان لیا جائے، کل یہ حکم تھا کہ نماز میں رُخ بیت المقدس کی طرف کیا
جائے تو اس پر عمل تھا، اور آج اگر یہ حکم ہے کہ بیت المقدس کے بجائے مکہ کے بیت اللہ کی طرف کیا جائے
تو بلا تامل اس پر عمل ہوجائے، اور جن لوگوں کی اطاعت میں خدا پرستی کی روح کے بجائے آباء پرستی کی روح
آجاتی ہے وہ یہ کہہ کہہ کر کہ ہمارے پاس تو اللہ کا حکم یہ ہے، نئے احکام سے روگردانی کرتے ہیں، لیکن ان کی یہی ضد
یہ بتلا دیتی ہے کہ ان کو اپنی پہلی شریعت پر اصرار صرف اس لیے ہے کہ یہ ان کے باپ دادا کے زمانہ کی شریعت
ہے، نہ اس لیے کہ یہ خدا کا حکم ہے، اور نئی شریعت سے انکار اس لیے ہے کہ اس کے پیش کرنے والے ان میں
سے نہیں ہیں، کیونکہ اگر یہ حکم کے بندے ہیں تو پھر (اس بارے میں اطمینان کے بعد کہ نئے احکام اللہ ہی کی طرف سے
ہیں) کسی بھی حکم پر سمعنا و اطعنا کہنے میں پس و پیش نہ ہونا چاہیے، ــــ بس یہ مطلب ہے اس آیت کا جسمیں
کہیں سے بھی وہ بات نہیں نکلتی جو بعض لوگ سمجھتے ہیں۔

بے شک اگر آیت کا صرف اتنا ہی حصہ پڑھا جائے "لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجاً
وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً" تو یہ بات نکل سکتی ہے، لیکن اگر اس کے آگے "وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ

فی ما آتاکم فاستبقوا الخیرات" بھی پڑھ لیا جائے اور ساتھ ہی چند پہلی آیات پر بھی نظر ڈال لی جائے تو مفہوم بالکل دوسرا ہو جائے گی۔ اور وہ نتیجہ نکلے گا جو ہم عرض کر رہے ہیں یعنی یہ آیت شریعت محمدی کے بعد بھی سابقہ شرائع پر عمل کی سند نہیں دے رہی ہے، بلکہ صرف ان اختلافات کی توجیہہ کر رہی ہے جو ان شرائع کے درمیان واقعی طور پر پایا جاتا ہے۔ اور وہ توجیہ ہے "امتحان و آزمائش"! ـــ ظاہر ہے کہ یہ آزمائش اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ سابقہ شریعت والوں کو نئی شریعت کے اتباع کا حکم دیا جائے۔ پس اس آزمائش سے کامیاب ہو کر نکلنے کی تنہا یہی سبیل ہے کہ جس وقت جو حکم مل رہا ہے اس پر سر جھکا دیا جائے جیسا اور جس طرح سے کرنے کے لیے کہا جا رہا ہے وہ اپنی قدیم روایات اور خواہش کے علی الرغم ویسے ہی کیا جائے۔ ـــ یہی خدا پرستی ہے، یہی نیکی ہے، اور یہی خیر ہے! "فاستبقوا الخیرات" پس سبقت کرو نیکیوں اور بھلائیوں کی طرف!!

اس آیت کے بارے میں تو غالباً اب کوئی شبہ نہیں رہا ہوگا، لیکن قرآن کا یہ انداز کلام جو اس آیت میں ہے بعض لوگوں کے لیے اس غلط فہمی کا باعث ہوا کہ قرآن کسی ایک شریعت کی پابندی تمام اقوام عالم پر لازم نہیں کرتا۔ یہ اس آیت تک محدود نہیں ہے، بلکہ قرآن میں متعدد جگہ یہی انداز کلام اختیار کیا گیا ہے مثلاً۔

(۱) وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ (سورۂ بقرہ ع ۱۳)

اور ہر ایک گروہ کے لیے ایک سمت ہے جس کی طرف وہ (عبادت میں) رخ کرتا ہے۔ پس سبقت کرو بھلائیوں میں۔

(۲) لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ (سورۂ بقرہ ع ۲۲)

نیکی اسی میں نہیں (محض) ہے کہ تم اپنا رُخ پورب یا پچھم کی طرف کرو، بلکہ نیکی کا مدار ایمان اور اعمال صالحہ پر ہے۔

ان آیات سے بھی کچھ ایسا ہی مطلب سمجھا جا سکتا ہے، اگر سیاق و سباق کو نظر انداز کر دیا جائے۔ ان تمام مقامات کے بارے میں ایک اصولی نکتہ سمجھ لینا چاہیے کہ اس قسم کا انداز گفتگو جہاں کہیں اختیار کیا گیا ہے وہاں مخالفین اسلام کے اس اعتراض کے جواب میں ہے کہ اگر اللہ کے رسول ہیں تو ان کے اور ان کے پیروؤں کے بعض طریقے دوسرے انبیاء اور ان کی امتوں سے کیوں مختلف ہیں؟ ـــ چنانچہ مخلص [illegible] بات کہی گئی کہ یہ انداز فکر بالکل غلط ہے، دیکھنے کی چیز صرف یہ ہے کہ دعوت ایمان و عمل صالح کی ہے یا نہیں۔

رہ گئی بعض اعمال کی ظاہری شکل و صورت، تو بعض مصلحتوں اور حکمتوں کے پیش نظر ہر نبی کے لیے کچھ کر دی جاتی ہے اور اس کے لیے کچھ اختلاف [illegible] ہے جس سے مذکورہ بالا دونوں آیتیں متعلق ہیں

(باقی ۱۸۶ پر ملاحظہ ہو)

بریلوی فتنہ کا نیا روپ
بریلویت کے ایک نئے نقیب ارشد القادری صاحب کی کتاب
"زلزلہ"
کا نہایت تحقیقی جواب اور جائزہ
مولانا محمد عارف سنبھلی
(استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ)
کے قلم سے :
اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ ارشد القادری صاحب نے "زلزلہ" میں علماء دیوبند پر جو الزامات لگائے ہیں، وہ صرف دھوکہ اور فریب ہیں، ان میں ذرہ برابر بھی سچائی نہیں ہے توحید اور شرک کی حقیقت پر ایسی روشنی ڈالی گئی ہے اور "علم غیب" اور "تصرف" ان دونوں مسئلوں کی ایسی تنقیح و تحقیق کی گئی ہے جس کے بعد کسی غلط فہمی کی گنجائش نہیں رہتی.
آخر میں
بریلی کے
تکفیری فتنہ کی تاریخ اور تعارف پر ایک مستقل بصیرت افروز اور حیرت انگیز مضمون ہی شروع میں
مولانا محمد منظور نعمانی
کا
ایک مفصل مکتوب ہے وہی گویا اس کتاب کا پیش لفظ ہے۔ بہترین طباعت، عمدہ گلیز کاغذ، خوب صورت گرد پوش سے مزین۔ دوسرا ایڈیشن قیمت مجلد صرف -/۶ (علاوہ محصول ڈاک)
ناشر :
کتب خانہ "الفرقان" ۳۱ نیا گاؤں مغربی لکھنؤ

حق و اعتدال کی راہ

افراط و تفریط اور انحراف

ڈاکٹر احمد حسین کمال بھوپالی (پاکستان) (شائع شدہ الفرقان محرم ۱۳۷۸ھ م اگست ۱۹۵۸ء)

اسلام کی جدید تعبیر و تشریح

—— اپنی انتہا میں

اس صدی کے اوائل میں دین سے متعلق جن فکری گمراہیوں کا آغاز ہوا، ان میں سب سے بڑی گمراہی، عقلیت پرستی کا رجحان تھا، جو انیسویں صدی کے یورپ سے زور و شور کے ساتھ اٹھا، اور بعض مسلمان اہلِ قلم اُس سے شدید طور پر متاثر ہوئے۔ ان صاحبان تحریر نے کوشش کی کہ اسلام اور اس کے معتقداتِ دینی کو کسی نہ کسی طرح عقلیت اور نام نہاد سائنس کے تابع کر دیا جائے۔ ہر چند کہ بعد میں عقلیت پرستی کا یہ طوفان اپنا اثر کھونے لگا۔ تاہم اس کی وجہ سے اسلام کی جدید تعبیر و تشریح کا ایک نیا اور گمراہ کن سلسلہ شروع ہو گیا۔ جو کسی نہ کسی صورت میں ابتک جاری ہے اور دنیا کی ہر نئی بات، نئی تجویز اور نئے نظریہ پر اسلام کو چسپاں کرنے کی جسارت عام ہو گئی۔ چنانچہ سیاست و معیشت کا ہر پردہ تصور اور تحریک جو اس عہد میں پیدا ہوئی اسلام کو اس کے مطابق بنانے کی سعی و کوشش ضرور کی گئی اور بعض نکتہ رس دماغوں نے اسلام کی دعوت و ہدایت و رضائے الٰہی کے نصب العین تک کو ایک نظام حکومت و سیاست یا نظریہ معیشت و عمرانیت بنا ڈالنے کی جد و جہد شروع کر دی۔ البتہ جب اس بارے میں انھیں ٹوکا گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ یہ تو محض وقت کی زبان میں اسلام کی تشریح و توضیح ہے حالانکہ اس قسم کی تشریح و توضیح سے جن معنوی تحریفات کا اندیشہ تھا، اور جن کے مفاسد اب ظہور میں آنے لگے ہیں، انھیں ان جدید نقطہ ہائے نظر کے حاملین نے باوجود تنا ذہنی کے یکسر نظر انداز کئے رکھا۔

نیتوں کا خلوص اور ارادوں کی معصومیت کسی غلط چیز کو صحیح نہیں بنا دیتی۔ یہ نیا ذہن جن غلط تصورات کے ساتھ ابھرا ہے، ذہنی دیانت و صداقت کے باوجود مسلمانوں کے لیے ایک شدید فتنہ آزمائش بن گیا ہے ایک طرف اس کا ذہن یہ کہتا ہے کہ یہ دعوے ہیں کہ وہ اسلام کا تنہا صحیح ترجمان ہے اور اس کی تمام تر جد و جہد اقامت

ذہن کی ہے اور زندگی کے ہر شعبہ اور ہر گوشہ میں اسلام کا نفوذ چاہتا ہے اور پوری انفرادی و اجتماعی زندگی کی تعمیر کتاب اللہ پر کرنا اس کا مقصود ہے لیکن دوسری طرف جس گروہ بندانہ عصبیت کے ساتھ یہ ذہن اپنی اجتماعی تنظیم شروع کرتا ہے وہ نہ صرف انسانیت کی ہی تقسیم کر ڈالتی ہے بلکہ مسلمانوں کو بھی دو متقابل گروہوں میں بانٹ دیتی ہے اور پھر یہ تقسیم رفتہ رفتہ مسلمانوں کے درمیان بھی حق و باطل کی تقسیم بن جاتی ہے۔ ساتھ ہی نیک و بد کی آویزش کو جس طرح یہ تعبیر کرتا ہے اس سے دینی خلوص کے بجائے ذاتی اور گروہی عصبیت کا جذبہ بیدار ہوتا ہے اور بسا اوقات شخصی اغراض، اسلامی مقاصد کے ساتھ اس طرح خلط ملط کر دیے جاتے ہیں کہ ان کے درمیان نہ صرف تمیز کرنا ہی مشکل ہو جاتی ہے بلکہ انجام کار شخصی اغراض کی کامیابی پر ہی اسلامی مقاصد کی کامیابی منحصر کر دی جاتی ہے۔ پھر یہ کہ یہ ذہن اپنی پیش کردہ فکر کی انفرادیت کو برقرار رکھنے کیلئے ماضی و حال کے تمام افکار کی بے رحمانہ تنقید کرتا ہے اور دوسروں کی آواز کے جانچنے کے لیے ایک ایسا محدود اور تنگ سانچہ بنا لیتا ہے جس کے اندر کسی دوسرے کی رائے کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی جب کہ اپنی آراء کے تبدیلیوں کے لیے اسی سانچے میں اتنی وسعتیں پیدا کر لی جاتی ہیں کہ ہر قسم کے تضادات بھی بیک وقت اس میں سمو دیے جا سکیں۔ اس طرز عمل کے جواز کے لیے حکمت عملی کا نام لیا جاتا ہے اور خدا اور رسول کی بخشی ہوئی بعض رخصتوں کو جو محض اضطراری اور انفرادی حالات کے لیے دی گئیں تھیں۔ اختیاری اور اجتماعی صورتوں کے لیے دلیل بنا کر پیش کر دیا جاتا ہے۔

کتاب و سنت کے معیار کے علاوہ "حکمت عملی" کا معیار جس کے لیے ضوابط و اصول کی کوئی حد مقرر نہیں کی جا سکتی، اور جو تمام تر شخصی و ذاتی فکر و رجحان کا تابع ہے اور جس کے ذریعہ دین و دنیا کی ہر چیز کو اسلام و حق کے نام سے رد و قبول کیا جا سکتا ہے اس دور کی ایسی عظیم غلط فکری ہے جس کی اندیشناکیاں دور دور تک سرایت کئے ہوئے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ آج کی حکمت عملی کے تقاضے، کل کی حکمت عملی کے تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکتے ہیں، حکمت عملی صد فی صد ایک شخصی اور ذاتی چیز ہے اور ہر قسم کے طرز عمل کیلئے اگر ایک شخص کی عقل زرخیز ہو تو اسے دلیل جواز بنایا جا سکتا ہے۔

ہمیشہ ہی چھوٹی چھوٹی باتیں بڑے بڑے فتنوں کا سبب بنی ہیں، کتاب و سنت کے پہلو بہ پہلو جب کبھی دوسری بات کہی گئی وہ ابتداءً میں بظاہر کتنی ہی غیر اہم اور حقیر معلوم ہوئی ہو آخر کار کتاب و سنت سے علیحدہ اپنی مستقل حیثیت اختیار کئے بغیر نہیں رہی اور بسا اوقات اس نے کتاب و سنت کو ہی اپنا تابع بنایا اس خطرناک حقیقت کی طرف جب ایسے قائدین و مفکرین کی توجہ منعطف کرانے کی کوشش کی جاتی ہے تو وہ اور ان کے متبعین بجائے ان باتوں کے متوقع خطرات محسوس کرنے، سمجھنے اور رجوع کر لینے

کے، اپنے دو مرے ناقابل اعتراض اقوال و افکار کو سامنے لاکر جواب اور صفائی کی ایسی مہم شروع کر دیتے ہیں جسمیں تدلیس، اخفا، اور مغالطوں کی آمیزش کے علاوہ ٹوکنے والوں پر انشا پردازانہ گالیوں کی بھی بوچھار ہوتی ہے تاکہ اصل حقیقت عوام کے نظروں سے مستور رہ جائے اور چونکہ ہر زمانے میں بعض وقتی اور ہنگامی مسائل کا زور ہوتا ہے۔ عوام و خواص کی بیشتر توجہ ان ہی مسائل میں الجھی رہتی ہے، اس لیے یہ حضرات بھی ان ہی مسائل پر اپنے زور فکر و بیان کی عمارت تعمیر کرتے ہیں اور یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ان کی یہ خدمت انھیں ہر فکری و عملی لغزش سے غیر مسئول کر دے گی۔ حالانکہ اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ ان ہی ہنگامی مسائل کے ہجوم و یورش میں، خطاؤں اور لغزشوں کے امکانات بہت زیادہ اور قوی تر ہیں اور ایسے ہی حالات میں کتاب و سنت بطریق سلف کو مضبوطی سے پکڑے رہنا ضلالت و گمراہی سے بچے رہنے کا واحد ذریعہ ہے۔

اواخر خلافت راشدہ میں، جس گروہ نے قرآن سے ماخوذ نعرہ "الحکم للہ" پر عامۃ المسلمین کے خلاف خروج کیا تھا، اُس نے اپنی فہم و فراست کے مطابق، غالباً نیک نیتی کے ساتھ ہی اس خروج اور نعرہ کو وقتی مسائل کا وقتی حل سمجھا تھا۔ لیکن اُس دور کی سب سے زیادہ مستند اور محترم ہستی نے ان کے اس نعرہ کو مسترد کر دیا، حالانکہ آپ کو ان کی حمایت بھی حاصل ہو سکتی تھی۔

"قرآن مخلوق ہے" کا نظریہ جو بظاہر محض ایک علمی اور بے ضرر نظریہ نظر آتا ہے اور جسے ایک ایسے گروہ نے پیش کیا تھا جو بزعم خود، وقت کی زبان اور علمی سطح کے مطابق قرآن اور اسلام کی بہترین خدمات انجام دے رہا تھا اور دور حاضر کے متجددین تک کو جن کے افکار و استدلال سے گہری دلچسپی ہے اگر اس کے خلاف اُس زمانہ کا سب سے بڑا گوشہ نشین زاہد متقشف لب کشائی نہ کرتا اور انھیں نہ ٹوکتا تو آج دین کے جو صحیح خد و خال ہمارے سامنے موجود ہیں، خدا جانے تاویلات کے گورکھ دھندوں میں وہ اب تک کیا کیا بن چکے ہوتے۔ علیٰ ہذا القیاس ابتدائے اسلام سے سر سید احمد خاں مرحوم کے دور نیچریت اور مرزا غلام احمد صاحب کے دور نبوت تک ایسے اصحاب فہم و دانش کی ایک طویل فہرست تیار ہو سکتی ہے جن کی نیک نیتی اور جذبۂ خدمات مُسلّم، لیکن اُن کے فکری لغزشوں کے ایک معمولی اقدام کی جو ملّت فرسائی نے امت مسلمہ کے مستقبل پر نہایت اندوہناک اثر ڈالا۔ وہ گروہ متقدسین و زاہدین متقشف جن کی مخالفت کو اول اول ہمیشہ بیکارانہ مذہبیت سے تعبیر کیا گیا۔ بالآخر مستقبل کے مورخ نے اُن کے ہی "فرسودہ" نعروں پر مہر تصدیق ثبت کی۔

بے لگام آزادیٔ افکار کے اس دور میں، آزادانہ انشا پردازی ہی شہرت و عظمت کا واحد

ذریعہ ہے، چنانچہ انشا پردازوں کا ایک گروہ جدید اسلام کو بھی اپنی قلموں کی جولانگاہ بنائے ہوئے ہے حتی کہ آج کے جدید افسانوی ادیب نے بھی اُسے اپنی قلم کاریوں کا تختۂ مشق بنا رکھا ہے حالانکہ جو لوگ ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ دینی حقائق کے اظہار کے لیے شعر و افسانہ کا قلم ناموزوں ہی نہیں بلکہ گمراہ کن بھی ہے اور اسی لیے وحی الٰہی نے انبیاء و رسل کے شاعر و داستاں گو ہونے سے بار بار اور بشدت انکار کیا ہے۔

آج کے مسلمانوں میں اسلام سے بغاوت کا جو ذہن جگہ جگہ پھیلا ہوا ہے غور کیجئے تو اس کا آغاز عقلیت پرستی کے رجحان سے ہی ہوا ہے۔ یہ رجحان ابتداء میں نہایت معصوم و بے ضرر نظر آتا ہے۔ اس کا پہلا مقصد اسلام اور جدید دور کے نظریات و تقاضوں میں موافقت پیدا کرنا تھا۔ موافقت پیدا کرنے کی یہ کوششیں کبھی جدید معلومات کو دین پر منطبق کرنے اور کبھی دین کو جدید معلومات پر منطبق کرنے میں صرف ہوتی رہیں اور رفتہ رفتہ وقت کے افکار سے اذہان مرعوب ہوتے رہے، دین کے اصولوں پر جدت کا رنگ چڑھے بغیر دین کی خدمت کا تصور دقیانوسی نظر آنے لگا۔ چنانچہ شارحین اسلام نے اپنی ہمہ دانی کے زعم میں اسلام کو جدید نظریات و افکار کا ملغوبہ بنا ڈالا۔ ایک ایسا دین جو خالص ایمان و عمل کا دستور العمل تھا، جس پر وقت و ماحول کی کسی حدبندی کا اطلاق نہیں ہو سکتا تھا اور جس کی قوت فعالیہ انسانی زندگی کے حال کو آخرت کے مستقبل سے وابستہ کر دینے والی تھی۔ وہ ان نئے اسلام کے خیر خواہوں کی بدولت کبھی محض ایک نظام سیاسی کی صورت میں نظر آتا ہے کبھی ایک نظام عسکری کی شکل میں، کبھی نظام معاشی کے رنگ میں تو کبھی نظام اقتصادی کے لباس میں اور بعضوں نے اسے محض ایک نظام حکمرانی کا خاکہ بنا کر پیش کر رکھا ہے اور اب ایک اور نیا ذہن اس دعوے کے ساتھ نمودار ہو رہا ہے کہ اسلام بھی موجودہ دور کے ملکی، عدالتی اور بین الاقوامی قسم کے قوانین رکھنے والا مجموعۂ دستور و آئین ہے، جسے ہم آج کی قانونی موشگافیوں کی جگہ قائم کر سکتے ہیں۔

الغرض مسلمانوں کی تاریخ میں ایک ایسا گروہ برابر پیدا ہوتا رہا ہے، جس نے اسلام کی خدمت اسی میں سمجھی ہے کہ وقت کے علمی، سیاسی اور عمرانی نظریات کو جوں کا توں قائم رکھتے ہوئے اور ان میں سے کسی ایک یا سب کو معمولی ترمیم کے ساتھ اپنا کر اسلام کی شکل دے دی جائے اور افسوس ہے کہ وقت کا ایک بڑا قابل قدر گروہ جو اس ذہن سے لڑتا ہوا اٹھا تھا اس میں چونکہ خود جدت کا مادہ تھا، اسلئے تھوڑی دور چلنے کے بعد اب وہ خود بھی اسی راہ پر چل نکلا ہے۔ یہ لوگ اب اسلام کو جمہوریت کی تکمیل، مملکت کی تعمیر سیاست کی تنظیم اور امارت و سیادت کی تشکیل کا ذریعہ بنا دینا چاہتے ہیں: اگرچہ وہ

(باقی صفحہ ۱۲۲ پر ملاحظہ ہو)

ڈاکٹر احمد حسین کمال بھوپالی (پاکستان)

دین و اقتدار

(شائع شدہ الفرقان ربیع الثانی ۱۳۷۸ھ مطابق نومبر ۱۹۵۸ء)

"اسباب زوال امت" قریباً سو ڈیڑھ سو سال سے اہل قلم حضرات کا پسندیدہ موضوع رہا ہے اس موضوع پر مسلمانوں کے علاوہ مستشرقین یورپ نے بھی طویل بحثیں کی ہیں اور شاید جدید طرز کی تحریروں کا آغاز بھی ان ہی کی قلموں سے ہوا ہے، میرا گمان ہے کہ اس صدی کے جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں میں شاید ہی کوئی ایسا شخص ہوگا جو کسی نہ کسی طرح ان کے نقطۂ نگاہ سے متاثر نہ ہوا ہو، وہ نہایت تفصیل و دل سوزی سے مسلمانوں کی مادی کمزوریوں کو زوال اسلام کا بنیادی سبب قرار دیتے ہیں۔ ان کمزوریوں کو وہ دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں، ایک یہ کہ مسلمانوں کا وہ ملکی نظام قائم نہیں رہ سکا جو انھوں نے صدر اول میں قائم کیا تھا۔ اور وہ مادی اقتدار سے محروم ہو گئے دوسرے یہ کہ ان کے اندر وہ تنظیمی طاقت باقی نہ رہی جو انھیں ایک دوسرے سے مربوط کئے ہوئے تھی۔

وہ یہ بات درحقیقت اس بنا پر کہتے ہیں کہ ان کے نزدیک اسلام کی اولین کامیابی بھی اس اقتدار کی بدولت تھی جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ پہنچکر ایک ریاست کی صورت میں قائم کیا تھا، وہ جناب رسول اللہ صلعم کی مکی زندگی کو نعوذ باللہ ناکامی کا دور بتاتے ہیں ان کا خیال ہے کہ اسلام سیاسی قوت و اقتدار کے ذریعہ قائم ہوا اور پھیلا اور اس کے زوال کا سبب بھی یہی سیاسی قوت و اقتدار کا زوال ہے، کیونکہ وہ اسلام کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی شخصی اور ذاتی تحریک کہتے ہیں جو آپ کے اولوالعزمانہ مقاصد کے تحت وجود میں آئی تھی اس لیے وہ نہایت بے باکی سے سیاسی قوت اور ریاستی اقتدار کو تمام اسلامی کامیابیوں کا واحد سبب قرار دیتے ہیں۔

اگرچہ رسول اللہ صلعم کے مشن کی یہ تعبیر اور آپ کی مکی و مدنی زندگی کی اس طرح کی تقسیم مقام رسالت و نبوت کے قطعی منافی اور سیرت رسول و تاریخ اسلام کی نہایت غلط تشریح ہے تاہم ان کے نہایت تفصیلی اور بظاہر غیر جانب دارانہ تجزیوں نے اور اس صدی کے مادی افکار و نظریات اور جدید فلسفۂ سیاست و اجتماع نے مسلمان مفکرین کی بھی ایک بڑی کھیپ کو کم و بیش اسی قسم کے

انداز فکر کا قائل کر دیا ہے وہ بس مادی تصورات پر مبنی تنظیمات و تحریکات کو اسلام اور مسلمانوں کے شاندار مستقبل کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں اور صاف صاف کہتے ہیں کہ اقتدار نہ ہونے کی وجہ سے مکی زندگی میں اشاعت اسلام کی رفتار سست رہی اور جب مدینہ میں بقول ان کے سب سے پہلے ایک ریاست اور حکومت قائم کر لی گئی تو اسلام نہایت تیزی کے ساتھ پھیلتا چلا گیا ـــــــ قطع نظر اس کے کہ یہ بات حقیقت سے کس قدر مختلف ہے، اور "اسلام کے "دین اللہ" ہونے کو کس قدر اشتباہ میں ڈال دینے والی ہے ۔ اسلام کے بارے میں ان کے طرز فکر کو مستشرقین کے نظریات سے بہت ہی قریب کر دیتی ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ جس قدر یہ بات سچی ہے کہ "جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی" اس سے بھی زیادہ یہ بات صحیح ہے کہ اگر دین کو سیاسی اقتدار کے تحت کر دیا جائے تو پھر نہ صرف دین بے اثر ہو کر رہ جائے گا مسخ کر دیا جائیگا۔ بلکہ سیاستدانوں اور اقتدار رکھنے والوں کے ہاتھوں میں ان کے اغراض کا آلہ کار بن کر رہ جائے گا، ماضی اور حال کی تاریخ میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں، اور اگر ایسے اقتدار کے تحت کبھی کسی جگہ صحیح اسلام قائم ہو بھی گیا تو وہ خود اپنی قوت سے نہیں بلکہ اقتدار کے وسیلے سے قائم رہے گا اور اقتدار کے گرتے ہی خود بھی ختم ہو جائے گا۔

مقام شکر ہے کہ سلف صالحین، صدر اول کے بعد سے ہی اس نازک صورت حال کی طرف سے غافل نہیں رہے ـــــــ دین و اقتدار کا تعلق نہایت نازک ہے ۔ اس میں ذرا سی افراط و تفریط بے شمار مفاسد کا دروازہ کھول سکتی ہے، یہ ضروری نہیں کہ دین کو اقتدار کا ذریعہ بالارادہ بنایا جائے بلکہ عین ممکن ہے کہ نہایت نیک نیتی سے ایک شخص دین کی خدمت کے لیے ہی ایسا کرے لیکن اس کی یہ خواہش بھی بجائے خود ایک فتنہ بن سکتی ہے ۔ کیونکہ اقتدار کو سامنے رکھ لینے کے بعد وہ اور اس کا گروہ اپنے سے جائز اختلاف رکھنے والوں کو بھی شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھے گا ـــــــ وہ ہرگز گوارا نہیں کرے گا کہ اس کے دائرۂ کار میں کوئی دوسرا شخص مداخلت کرے، خواہ وہ مداخلت کتنی ہی ضروری، جائز اور دین کے لیے ہو ـــــ وہ تمام مسائل کو اپنے نقطۂ نگاہ سے حل کرے گا اور اسی نقطۂ نگاہ کو دینی نقطۂ نگاہ بنائے گا ـــــ وہ دوسروں کا مشورہ اپنی رائے کی حمایت کے لیے تو قبول کرے گا لیکن اصلاح و تردید کے لیے نہیں ـــــ وحی و رسالت کے انقطاع کے بعد اب اس کی عقل و بصیرت ہی فیصلہ کن ہو گی اور اگرچہ وہ نبوت کا مدعی نہ ہو لیکن مقام نبوت کی رعایتوں اور خصوصیات سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہے گا ۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس کا احساس فرض (اگر شعوری طور پر نہیں تو) غیر شعوری طور پر ہی احساس برتری میں تبدیل ہوئے بغیر نہیں رہے گا۔

اور یہ صورتِ حال نہ صرف امت کی اجتماعیت کے لیے مضر ہو جائے گی بلکہ مسلمانوں کے فرضِ عبدیت کا رُخ بھی پھیر سکتی ہے۔ چنانچہ اسی لیے ایک عظیم تربیت یافتہ جماعت، ایک صاحبِ کردار معاشرہ اور ایک مضبوط و بالاتر شورائیت کے بغیر دین و اقتدار کے باہمی تعلق کو موجودہ دور میں متوازن رکھنا ناممکن ہے اور جب تک ایسا نہیں ہو جاتا یہ بات دینی مصلحت اور دینی حکمت کے عین مطابق ہے کہ اقتدار اور دین کے درمیان واضح امتیاز قائم رکھا جائے۔

اقتدار خالص دینی ہو اور دین کے لیے ہو تو یقیناً وہ مقاصد پورے ہو سکتے ہیں جن کی طرف قرآن وسنت نے رہنمائی فرمائی ہے۔ ورنہ بصورت دیگر دین کے نام سے بڑی کا وہ فساد و طوفان اٹھے گا جو تاریخ پر نظر رکھنے والوں سے پوشیدہ نہیں خوارج و معتزلہ کی بے راہ رویاں دین کو اقتدار سے باندھ دینے کی ہی کارفرمائیاں تھیں اور دنیا کی بہت سی دیگر بڑی بڑی الفائیاں بھی مذہب کے نام عمل آئیں اور اس وقت عمل میں آئیں جبکہ مذہب کے نام سے اشخاص و جماعتوں نے اپنا اقتدار قائم کیا ہوا تھا ـــــ اسلام کو بھی اس صورت حال کی ذمہ داری میں شامل کر دینا بجز نادانی کے اور کیا ہے؟

جب تک خالص و کامل دینی اقتدار کا ماحول و موقعہ نہیں میسر آجاتا ہے اور جب تک اس قسم کا موقعہ و ماحول بنا لینے کی کوششیں بارآور نہیں ہو جاتی ہیں اس وقت تک دین و اقتدار کے مابین امتیاز رکھتے ہوئے اصلاحِ احوال اور دعوت و ہدایت کی کوششیں ضروری اور قابلِ قدر ہیں بلکہ یہ کوشش ہی اس ماحول اور موقع کو پیدا کرنے والی ہیں جس میں اسلام کی اصولی اور معیاری حکومت قائم ہو سکتی ہے اور جس سے دنیا کا ہر سعید و صالح انسان اتفاق کرے گا۔

اسلام کی برتری اور عظمت کا راز اس کی عظیم روحانی قوتوں میں ہے جن سے صرفِ نظر کرنے کی تعلیم اوّل اوّل یورپ کے مستشرقین نے دی۔ انھوں نے اسلام پر جو کچھ بھی لکھا مادی نقطۂ نگاہ سے لکھا اور غلط مفروضات و قیاسات پر لکھا، جن لوگوں نے ان ذرائع سے اسلام کا مطالعہ کیا اور متاثر ہوئے بعضوں نے [illegible] اسلام کی ایسی ہی تعبیرات کو صحیح تعبیرات سمجھا مستشرقین نے قبل اسلام عرب کے حالات کو اس طرح پیش کیا ہے کہ گویا اسلامی انقلاب کو بروئے کار لانے کے لیے تمام وسائل و اسباب موجود تھے صرف ان کو استعمال کرنے والوں کی ضرورت تھی، اور یہ ضرورت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے رفقاء رضوان اللہ علیہم اجمعین نے پوری فرما دی۔ اسی طرح انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی و مدنی زندگی کو غیر سیاسی اور سیاسی حیثیتوں میں تقسیم کر کے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اسلام کی کامیابی کا تمام تر دارومدار حصولِ اقتدار پر ہے اور اسی

طرح وہ خلافت راشدہ کے دور حکومت پر بھی اپنی مرضی اور قیاسی آراء کے حاشیے چڑھاتے جاتے ہیں ایک معترض و مخالف کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک دوست اور مورخ کی حیثیت سے۔ اس سے ان کا مقصد دراصل یہ ہوتا ہے کہ وہ اسلام کو دین کے بجائے محض ایک وقتی تحریک بتائیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول اللہ کے بجائے ایک نہایت اعلیٰ درجہ کا سیاسی و عسکری مدبر و مفکر قرار دیں اور اس طرح پورے رسالت و خلافت راشدہ کے دور کو صرف چند صاحب فکر اولوالعزم انسانوں کا دور ٹھہرا دیں جن کی شخصی کوششوں سے وقت کی ایک سیاسی اور تہذیبی تاریخ وجود میں آگئی اور اس نے دین و مذہب کی صورت اختیار کرلی۔

اب اگر ان ہی افکار کو نئے اسلوب و انداز پر احیاء اسلام کی بنیاد بنایا جائے تو یقیناً اول تو اسلام کی روحانی حیثیت کا انکار کرنا پڑے گا اور اس کی کامیابی کا دار و مدار تمام تر ریاست واقتدار پر رکھنا ہوگا۔ اور یہ ریاست واقتدار موجودہ دور کے ان طریقوں سے ہی حاصل ہو سکے گا جسے یوروپ کے فلسفۂ سیاست واجتماع نے مرتب کیا ہے۔ یہ فلسفۂ سیاست اول تو ایک چیز کو صرف نظری حیثیت سے پیش کرتا ہے اس نظریت سے ایک طبقہ کے جذبات کو سیراب کرتا ہے اور شدت کے ساتھ اصول پرستی کا مظاہرہ کرتا ہے لیکن جب عمل و اقدام کا موقع آتا ہے تو وہ سابقہ نظریت و اصول پرستی سے دست بردار ہونے لگتا ہے۔ اب اس کے سامنے صرف حصول اقتدار و قیام اقتدار کا مسئلہ سب سے زیادہ اہم رہ جاتا ہے۔ اور پہلا مقصد و نظریہ اس کی توضیح و تاویل کا کھلونا بن جاتا ہے۔ ماضی قریب کی یوروپ کی چند نظری تحریکات کا یہ حشر سب کے سامنے ہے۔ اس قسم کے طور طریقوں میں جو روحِ عمل کی کیفیت پائی جاتی ہے جب تک اس سے انھیں پاک و صاف نہ کر لیا جائے اس وقت تک اسلامی مقاصد کے لیے انھیں استعمال کرنا اسلام کے لیے کم اور استعمال کرنے والے گروہ کے لیے زیادہ فائدہ بخش اور دین کو روحانیت سے جدا کر کے مادیت کے تابع کر دینے کے مترادف ہے۔

(بقیہ مضمون صفحہ ۱۱۷)

اس بارے میں نیک نیتی ہیں کہ یہ سب کچھ وہ احیاء اسلام کے لیے ہی کر رہے ہیں لیکن افسوس ہے کہ انہیں کون سمجھائے کہ اسلام کے لیے اسلام کو ہی فکری طور پر مسخ کر ڈالنا اور ایک اصول کی بقا و استحکام کے لیے اس سے پیدا ہونے والے دوسرے اصول و ضوابط میں تبدیلیاں کر ڈالنا اسلام اور اس نئے اصول کی خدمت نہیں ہے۔

عتیق الرحمن سنبھلی

قربانی
حقیقت اسلام کا ایک رمز

عَنْ زَیْدِ بْنِ اَرْقَمَ قَالَ قَالَ اَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ مَاھٰذِہٖ الْاَضَاحِیُّ۔ قَالَ سُنَّۃُ اَبِیْکُمْ اِبْرَاھِیْمَ عَلَیْہِ السَّلَامُ

(الحدیث) رواہ احمد و ابن ماجہ۔ مشکوٰۃ۔ باب الاضحیۃ

زید بن ارقم رضی اللہ عنہ (صحابی) سے روایت ہے کہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ سے عرض کی کہ "یا رسول اللہ یہ (عید کی) قربانی کیا ہے؟" ارشاد ہوا کہ تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے؟

اللہ کے لیے قربانی ملّتِ ابراہیمیؑ کی روح ہے۔ یہ قربانی —— زندگی کے ہر ہر موڑ اور ہر ہر گوشہ میں قربانی —— ہی وہ طرۂ امتیاز ہے جس نے ابراہیمؑ کو "خلیل اللہ" بنایا (علیہ وعلیٰ انبیتنا الصلوٰۃ والسلام) سب سے پہلے محبت پدری کی قربانی دی۔ اور باپ کی زبان سے اللہ کے لیے۔

لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا۔ (مریم۔ ع ۳)

اگر تو اس دعوت توحید سے باز نہ آیا تو میں تیرا سر پھوڑ دوں گا، چل میرے پاس سے دفعان ہو جا!

جیسے الفاظ سنے۔ اور پھر

سَلٰمٌ عَلَيْكَ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا وَاَعْتَزِلُكُمْ

تم سلامت رہو میں تمہارے لیے اپنے رب سے معافی چاہوں گا کہ وہ مجھ پر بڑا مہربان ہے

وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اور تمہیں اور تمہارے ... کو چھوڑ کر الگ ہو جاؤں گا۔

ایضًا

رہتے ہوئے، جیتے جی باپ کے سایۂ شفقت سے محروم ہو گئے۔

باپ کے ساتھ ساتھ سارے اہلِ وطن دشمن جان ہو گئے تو اپنے وجود ہی کی قربانی کا سوال سامنے آگیا اور ساری خدائی نے دیکھا کہ

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق

یہ مرحلۂ عشق طے ہوا تو ... خیر باد کہنے کی باری تھی۔ قربانی کا ابراہیمی جذبہ اس گھاٹی کو بھی ہنستے کھیلتے پار کر گیا، اور ... بابل کے بجائے ارضِ کنعان اس دولتِ عشق کی وارث ہوئی۔ یہاں بڑھاپے کی عمر میں پہونچ کر پہلی اولاد عطا ہوئی تو عہدِ شیر خوارگی ہی میں حکم ملا کہ اس کو اور اس کی ماں کو (مکہ کی) وادی غیر ذی زرع میں چھوڑ آؤ۔ ——— عشق کا یہ مرحلہ بھی بلا حیل وحجت طے ہوا، یہ قربانی ہی کیا کم تھی؟ مگر اللہ کی "دوستی" اس سے کہیں زیادہ مہنگی تھی۔ اور "نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز" کی صدا ابھی تھمنے کا وقت نہیں آیا تھا۔

چند سال بیتے اور اس وادی غیر ذی زرع میں بسنے والے اکلوتے فرزند کی عمر اتنی ہوگئی کہ

بَلَغَ مَعَہُ السَّعْیَ (صٰفّٰت) بوڑھے باپ کا کچھ ہاتھ بٹانے کے قابل ہو گئے

تو قربانی کے اس مرحلے کا سامان بھی ابراہیمؑ کے لیے ہو گیا جس کے بعد اس بارگہ والا سے بھی "ارزانی ہنوز" کی نہیں۔

اِنَّ ھٰذَا لَھُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِیْنُ بے شک یہ بڑی کھلی ہوئی جانچ تھی۔

ایضًا

کی صدائے اعتراف اٹھی۔ ابراہیم علیہ السّلام نے ایک خواب سے سمجھا کہ بیٹے کی قربانی کا حکم دیا جا رہا ہے۔ بشرحِ صدر ہو گیا تو نہ باپ جھجکا نہ بیٹا کسمسایا۔ اور ساری خدائی نے دم بخود ہو کر یہ ماجرا دیکھا کہ بیٹا منھ کے بل زمین پر ہے اور باپ کی چھری بیٹے کی گردن پر۔ لیکن خدا کو اسمٰعیل کی قربانی مطلوب نہیں تھی، ابراہیمؑ کا دل دیکھنا یا کہیے کہ محبت کا آخری مرحلہ طے کرانا مقصود تھا، وہ طے کرا دیا گیا اور ابراہیمؑ کے جذبۂ عبدیت وفدائیت کی صداقت کو آزما لیا گیا، تو قبل اس کے کہ چھری اپنا کام کرے پکار آئی۔

یٰٓاِبْرٰھِیْمُ قَدْ صَدَّقْتَ اے ابراہیم ...

الرُّؤْيَا ۔ (الصّٰفّٰت) — خواب سچا کر دکھایا۔

اب تیرا بیٹا تجھے مبارک ہو۔

اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ — ہم صادقین محسنین کو اسی انداز سے جزا دیتے ہیں۔

پے در پے آزمائشوں کے سلسلہ کی یہ وہ آخری آزمائش تھی جس میں پورا اترنے کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نوع انسانی کی امامت کا مژدہ سنایا گیا۔ قرآن کا بیان ہے۔

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ۭ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ۔ (البقرہ ع ۱۵)

اور جب آزمایا ابراہیمؑ کو اس کے رب نے متعدد باتوں میں، اور وہ اُن میں پورا اترا فرمایا میں بناؤں گا تجھے بنی آدم کا امام۔

یہی امامت تھی جس کا کامل ظہور اس طرح ہوا کہ آپ کی نسل میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام نوع انسانی کا رسول بنا کر مبعوث کیا گیا اور اس کے لیے وہی طریقہ اور وہی دین پسند کیا گیا جو ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ اور اُن کا اُسوہ تھا۔ چنانچہ قرآن میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کہلوایا گیا۔

قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ رَبِّيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ڬ دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۔ (الانعام ع ۲۰)

(آپ کہہ دیجئے کہ) مجھے سجھائی ہے میرے رب نے سیدھی راہ۔ یعنی دین قیّم جو طریقہ ہے ابراہیم حنیف کا۔

اور اسی طرح ابراہیمی کیش و ملت کو تمام نوع انسانی کے لیے اسوہ ٹھہرا دیا گیا ۔۔۔۔ امت محمدی کے اولین طبقہ کو (جو نزول قرآن کے وقت داخل اسلام ہو چکا تھا) خطاب کر کے فرمایا گیا۔

هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ۭ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ۭ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ (الحج)

اس (اللہ) نے تم کو منتخب کیا ہے اور نہیں کی ہے دین میں تمہارے اوپر کوئی تنگی تمہارے باپ ابراہیم ہی کی تو ملت ہے اسی نے نام رکھا ہے تمہارا مسلمان۔

پس یہ وہ ابراہیمی کیش و ملت ہے جس کی روح ہی "قربانی" ہے اور جس کو اسلام کا نام بھی اسی عظیم آخری قربانی کے سلسلہ میں دیا گیا ہے جیسا کہ سورۂ صافات سے اسی موقع پر ارشاد خداوندی

فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ الخ — پس جب ان دونوں باپ بیٹوں نے کمال اطاعت (اسلام) کا مظاہرہ کر دیا اور ابراہیمؑ نے اسمٰعیل کو پیشانی کے بل لٹا دیا۔ الخ

یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ اس کیش و ملت میں کوئی مستقل نشان اس عظیم قربانی کا نہ ہوتا؛ جس بنا پر اسے اسلام کا نام دیا گیا تھا، بعد میں اس بنیاد کا کوئی اثر اس اسلام نامی ملت میں نظر نہ آتا؟ پس حق اور تقاضا یہی تھا کہ "اسلام" کے اس حقیقی مظاہرہ کی کوئی نہ کوئی یادگار اس ملت کے خاکہ میں مستقل جگہ پاتی۔ اور قربانی پیش کرنے کی کوئی نہ کوئی شکل اسلام کا دائمی شعار قرار دی جاتی۔ چنانچہ خداوند قدوس نے اس موقع پر خود حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھ سے قربانی کی شکل متعین کرائی کہ اسمٰعیل کی قربان گاہ پر اسی چھری سے ایک مینڈھا ذبح کرایا۔ اور ہر سال اسی دن اس عمل کے نہایت عظیم اور عالمگیر پیمانہ پر اعادہ کو ملت ابراہیمی کا جزو بنا دیا ــــــ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پیغمبر آخر الزماں نے جو دین حنیفی اور ملت ابراہیمی کا پیامبر تھا، بقر عید کی قربانی کے سلسلہ میں اپنے صحابہ کرام کو بتایا کہ یہ تمہارے باپ ابراہیم کی سنت ہے۔ اور تلقین کی کہ ان میں ہر ذی استطاعت اس سنت کی پیروی میں ذوق و شوق سے حصہ لے۔

اب سمجھ میں آتا ہے کہ قربانی کے بارے میں اس قسم کی احادیث کا مطلب (یا زیادہ صحیح الفاظ میں ان کا راز) کہ

(عَنْ عائشۃ قالت قال رسول اللہ — (حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ جناب

۱؎ اس آیت کے سلسلہ میں حضرت عبد اللہ بن عباس کا ارشاد گرامی ہے "والذی نفس ابن عباس بیدہ لقد کان اوّل الاسلام" (قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں ابن عباس کی جان ہے یہ اسلام کا سب سے پہلا کامل ظہور تھا۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۴)

۲؎ امام ابن جریر طبری نے حضرت حسن بصری سے نقل کیا ہے۔

انہ کان یقول ما یقول اللہ وفدیناہ بذبح عظیم لذبیحۃ التی ذبح فقط ولکنہ الذبح علی دینہ فتلک السنۃ التی الی یوم القیامۃ۔ (تفسیر طبری ج ۲۳) — کہ وہ فرمایا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد وفدیناہ بذبح عظیم صرف اس خاص ذبیحہ سے متعلق نہیں ہے جو ابراہیم علیہ السلام نے کیا تھا بلکہ اس میں ذبح عظیم سے مراد وہ عظیم رسم قربانی ہے جو اس ابراہیمی طریق پر ادا کی جاتی

صلی اللہ علیہ وسلم، ما عمل ابن آدم من عمل یوم النحر احب الی اللہ من اھراق الدم وانہ لیاتی یوم القیامۃ بقرونھا واشعارھا واظلافھا وان الدم لیقع من اللہ بمکان قبل ان یقع بالارض فطیبوا بہ انفسا۔ رواہ الترمذی وابن ماجہ۔ (مشکوٰۃ)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قربانی کے دن ابن آدم کا کوئی عمل اللہ کو اتنا محبوب نہیں جتنا خون بہانے کا عمل، تمہارے یہ قربانی کے جانور قیامت کے دن لے کر آئیں گے اپنے سینگ، اپنے بال اور اپنے کھر، (یعنی اس کا ایک ایک بال تک تمہاری میزان عمل میں نیکی بنا کر رکھا جائے گا۔) اور (کیا پوچھتے ہو) یہ خون جو تم بہاتے ہو قبل اسکے کہ زمین پر گرے، اللہ کے حضور میں گرتا ہے (یعنی شرف قبول پاتا ہے)، پس خوب اچھے دل سے قربانی کیا کرو۔

جس قربانی کی یہ تاریخ ہو کہ اس کی طرح خود خداوند قدوس نے اپنے خلیل کے ہاتھوں ڈلوائی ہو۔ اور وہ اس عظیم عمل کی یادگار اور رمزدار ہو، جس کی عظمت کا اعتراف "قد صدقت الرؤیا" کہہ کر اس دربار عالی سے برملا کیا گیا ہو، جس کی عظمت و کبریائی کے آگے ابن آدم کی بڑی سے بڑی پیشکش ہیچ و حقیر ہے جس کو کمالِ اطاعت و اسلام (اسلما) سے تعبیر کر کے اس کا درجہ مقبولیت بھی اس عظیم ہستی ہی کی طرف سے دنیا پر عیاں کر دیا گیا ہو، جس کی شان بے نیازی کو جاننے والا انسان، عمر بھر کی اطاعت گزاری پر بھی اطمینان نہیں کر پاتا کہ کوئی درجۂ قبولیت اس سب کو اس بارگاہ عالی میں مل پائے گا! ـــــ سچ کہیئے کہ اگر اس تاریخی قربانی والے دن میں اللہ کو ابن آدم کا کوئی عمل اس درجہ پسند نہیں جتنا یہ قربانی اور اہراق دم والا عمل پسند ہے، تو اس میں اچنبھے کی کون سی بات ہے؟ ـــــ حق یہ ہے کہ اس عمل کی یہی شان ہونی چاہیئے اور ابراہیمی خلوص و خوشدلی کی ادنیٰ جھلک بھی اگر کسی کے اس عمل میں پائی جائے تو اس کو یہی درجۂ محبوبیت و قبولیت ملنا چاہیئے جو حدیث بتا رہی ہے۔ ہاں! ہاں!! خون کے ان قطروں کو جو ابراہیمی ذوق و شوق کے ساتھ کسی عبد مسلم کے ہاتھ سے بہیں یہی رفعت عطا ہونی چاہیئے کہ زمین پر گرنے سے پہلے وہ کہیں عرش کے دامن قبول میں جگہ پالیں اور اس سنت ابراہیمی کی پیروی کا یہی صلہ قدرشناس جذبہ ابراہیمی سے

ملنا چاہیئے کہ قربانی کا ایک بال بھی رائیگاں نہ جائے۔ سچ کہا اور یقیناً خدا کی طرف سے کہا "دعائے خلیل" کے ظہور مجسم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کہ

بکل شعرۃ حسنۃ، قالوا	ہر بال کے حساب میں ایک نیکی! اصحاب
فالصوف یا رسول اللہ؟) قال	نے عرض کیا کہ حضور اور جو جانور اون
قال بکل شعرۃ من الصوف	والے ہیں؟) فرمایا اون میں سے بھی ہر بال
حسنۃ! (رواہ احمد وابن ماجہ (مشکوٰۃ)	کے حساب میں ایک نیکی۔

بعض لوگ جو روایاتِ حدیث کے استناد میں شک رکھتے ہیں اور بنا بریں دین میں کوئی بات محض حدیث کی بنیاد پر ماننے کو تیار نہیں ہوتے، بلکہ قرآن سے سند اور حجت چاہتے ہیں، آپ ان کو کہتا ہوا سنیں گے بلکہ بارہا سن چکے ہوں گے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس سنت (قربانی) کا تعلق تو صرف مناسک حج سے تھا اور قرآن نے بھی امت مسلمہ کے لیے صرف اسی ذیل میں اس سنت کا اجراء کیا ہے۔ حج اور حجاج کے دائرہ سے باہر اس سنت کے اجراء کی ہدایت قرآن میں کہیں نہیں ملتی۔

یہ بات ٹھیک ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی بیشک اسی موقع کی ہے، اور اس قربانی کو جاری کرنے کا حکم قرآن نے حج ہی کے سلسلہ میں دیا ہے لیکن اگر حدیث کی بنیاد پر دین میں کوئی چیز ماننے سے ان لوگوں کو صرف یہی خیال مانع ہے کہ حدیث کی روایات مستند نہیں ہیں، نہ یہ کہ قرآن کے سوا دین میں کوئی شئ حجت اور ماخذ دین ہی نہیں، اور وہ مانتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے کسی قول یا عمل کی کوئی روایت اگر قابل اطمینان ثابت ہو جائے تو وہ دین میں حجت ہو گی۔ اور اس سے ثابت شدہ امر دین ہی کا حکم سمجھا جائے گا، تو انھیں معلوم ہونا چاہیئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قربانی کی روایت ان روایات میں سے نہیں ہے جن کی صحت پر صحیح یا غلط طور پر کوئی بھی شک کیا جا سکے۔ یہ روایت صرف قول کی نہیں ہے کہ کہہ دیا جائے کہ پتہ نہیں کس نے گڑھ لی ہو۔ بلکہ ایسے مسلسل [illegible] عمل [illegible] کی روایت ہے۔ [illegible] اس سلسلہ میں جو بات ہے [illegible] قدم [illegible] نہیں چلی [illegible] عبد اللہ بن عمرؓ راوی ہیں، اور ان کی یہ روایت جامع ترمذی میں موجود ہے کہ

اقام رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کی پوری
بالمدینۃ عشر سنین یضحی۔	دس سالہ اقامت میں برابر قربانی کرتے تھے

(مشکوٰۃ۔ باب فی الاضحیۃ)

دوسری طرف انھیں عبد اللہ بن عمرؓ کی یہ بھی روایت ہے کہ

كان رسول الله صلى الله عليه — رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ

وسلم يذبح وينحر بالمصلى — عید گاہ ہی پر قربانی (بھی) کیا کرتے تھے۔

(رواہ البخاری)

کیا کوئی سمجھ سکتا ہے۔ کیا کوئی ذی ہوش آدمی سوچ سکتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اتنا بڑا جھوٹ بھی امت میں قبول پا سکے کہ ایک کام آپ نے سرے سے کیا ہی نہ ہو اور کہنے والا کہے کہ آپ دس سال تک متواتر عید گاہ کے ایسے بھرے مجمع میں یہ کام کرتے رہے ہیں؟ کس قدر بدعقلی کی بات ہے کہ ایسی روایات کو بھی یہ کہہ کر نظر انداز کر دیا جائے کہ پتہ نہیں سچ ہے یا جھوٹ! ---- حدیث کے مجموعے ہزار دیر سے مرتب ہوئے ہوں۔ مگر ان میں اس قدر کی باتیں کبھی اگر "عجمی سازش" کے تحت جھوٹ ہی گھڑ کے بھر دی گئی ہوں تو ایک طرف تو ان عجمیوں کی سازشی "عقل" کی داد دیجئے کہ جھوٹ کی وہ صنف اختیار کی کہ منہ سے نکلتے ہی پکڑ لیا جائے اور دوسری طرف حیرت میں ڈوب جائیے کہ کیا ایک عرب وہ بھلا جوان عجمیوں کا گریبان پکڑتا کہ ہماری پشتیں گزر گئیں۔ ہمیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اس مسلسل اور مجمع عام کے عمل کی خبر تک نہ ہوئی۔ آج تم تر تم نذ بخارا سے اٹھ کر ہمیں یہ خبر دینے آئے ہو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دس سال تک متواتر اور علی الاعلان ایک عمل کرتے رہے اور ہمارے آباؤ اجداد جو آپ کے ایک ایک قدم سے قدم ملا کر چلتے تھے، اس سے کوئی اعتنا ہی نہ کیا؟ ---- اور پھر یہ ہی نہیں، تم یہ بھی خبر دیتے ہو کہ آپ نے یوں یوں اس قربانی کے فضائل اپنے اصحاب سے بیان کئے اور ترغیب کے ساتھ ساتھ یہ زبردست تہدید بھی کی کہ

مَنْ كَانَ لَهُ يَسَارٌ فَلَمْ يُضَحِّ — جس کسی نے وسعت ہوتے ہوئے قربانی نہیں

فَلَا يَقْرَبَنَّ مُصَلَّانَا — کی وہ ہماری عید گاہ کے قریب بھی نہ آئے۔

مگر اس کے باوجود ہمارا پورا معاشرہ اور ہمارے اسلاف کی زندگی ہے کہ عید کی اس قربانی سے ناآشنائے محض! گویا رسول خدا کی ترغیب و تہدید سے بھی ان کے کانوں پر جوں نہ رینگی؟ جبھی تو ہمیں ان کے کسی ایسے عمل کی ہوا تک نہ لگی ---- قربان ہو جائیے اس عرب معاشرہ کی سادہ لوحی پر کہ اس "نئی دریافت" پر ایک عام ہیجان تو درکنار کسی ایک فرد کے ذہن میں بھی یہ بدیہی سوال پیدا نہ ہوا کہ آگے سب کے سب آمنا و صدقنا کہتے ہوئے قربانی کرنے۔ کیا یہ عقل میں آنے والی بات ہے اور کوئی عقل [illegible] بھی ایسا ہے؟

پھر اس سے کیا بات ثابت ہوئی؟ اس سے بالکل دو اور دو چار کی طرح یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قربانی کے عمل ہی کی نہیں، قربانی کے حکم کی بھی روایات ہر کذب و خطا سے پاک ہیں۔ اور امت کے عمومی توارث عمل نے ان کی اپنی طور پر تصدیق کی ہے ——— یعنی یہ روایتیں اگرچہ [illegible] بھی مدون ہو کر منظر عام پر آئی ہوں، لیکن ان پر کوئی انکار اور اعتراض [illegible] واحتجاج نہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ قربانی کا عمل اور اس حکم کے ساتھ مسلسل [illegible] امت میں منتقل ہوتا چلا آرہا تھا —— اور یہ عمومی توارث کی شہادت کسی دعوے کا وہ ثبوت ہے جس کی قوت اور قطعیت سے وہی شخص انکار کر سکتا ہے جو موجودہ قرآن کے اصلی قرآن ہونے میں شک کرنے کو تیار ہو کیونکہ اس کے لیے بھی ہمارے پاس آج سب سے بڑا ثبوت یہ توارث ہی ہے۔

بہرحال لاریب یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی حج کے مخصوص دن (۱۰ ذی الحجہ یوم النحر) والی قربانی (جس کی قربانی کے عنوان سے حج کے باہر بھی پابندی کے ساتھ کی ہے اور اس کا اسی طرح [illegible] ہوا ہے ——— پھر اب کیا [illegible] کہتا ہے کہ یہ قربانی رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین نہیں ہے، بلکہ بعد میں کسی کی ایجاد و اختراع!

یہ تو تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قربانی کے قولی و عملی ثبوت کی بحث اور ایک مومن کے لیے [illegible] قربانی کا [illegible] ہے، لیکن اس موضوع پر گفتگو صرف ایک خشک ثبوت اور ضابطے کی کارروائی پر ختم نہیں ہو جاتی ہے بلکہ اسلام میں قربانی کے اجراء کا جو پس منظر [illegible] میں بیان کیا گیا ہے اگر نگاہ میں رکھئے تو یہ بات بڑی صحیح اور وجدان و فطرت کا عین تقاضا نظر آتی ہے کہ قربانی کا یہ حکم حجاج کی تعداد ہی تک محدود نہیں ہونا چاہیئے تھا بلکہ پوری امت مسلمہ جس کی اکثریت حج کی استطاعت نہیں پا سکتی، اس سبھی کو اسلام کامل کا رمز رکھنے والے اس عمل سے بہرہ اندوز ہونے کا موقع ملنا چاہیئے، بالخصوص اگر ابراہیمی انداز کی قربانی ہی وہ عمل ہے جس سے "اسلام" کی اصل کیفیت ظاہر ہوتی ہے، اور اسی عمل کو اپنے کرنے کی حد تک گزرنے پر ابراہیمی کیش و ملت کو "اسلام" کا نام ملا۔ تو اس کیش و ملت کے پیرووں میں اسی کی حقیقی روح سدا برقرار رکھنے کے لیے اگر یہ مناسب اور تقاضائے عقل و فطرت تھا کہ اس جذبۂ ابراہیمی کا کوئی رمز ملت ابراہیمی میں مستقل طور [illegible] کوئی ایک [illegible] جو اس شیوۂ تسلیم و رضا کا غماز ہو مشروع کرکے مستقل [illegible] ملت بنا دیا جائے، تو کیا [illegible] کہ اس تشریع کو حجاج ہی تک محدود رکھا جاتا جن کی

ساز گار ہیں، اس روح کی آبیاری کے کسی سامان سے بالکل ہی محروم رہ جائے اس لیے تیسری آسمانی ترین چیز یہ عطا کی گئی کہ ۹ ذی الحجہ سے ۱۳ ذی الحجہ تک، ہر فرض نماز کے بعد اللہ کی تکبیر و تحمید کا علغلہ بلند کرو۔ اللہ اکبر اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد۔
پس اللہ کی رحمت اور سلام اس نبی پر جس کے صدقہ میں پوری امت مسلمہ کو اپنے امام و پیشوا کی سنت نصیب ہوئی۔

به مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی ست

بعض لوگ آپ کو اور ملیں گے، یورپ کی پھیلائی ہوئی افادیت پرستی جن کے روحانی حاسہ کو کھا گئی ہے انھیں آپ کہتا ہوا پائیں گے کہ آخر یہ قربانی سے کیا فائدہ ہے؟ ثواب ہی مطلوب ہے تو اتنا روپیہ انفرادی طور پر خیرات کر دیجیے یا کسی اجتماعی نظم کے تحت غریبوں کی فلاح و بہبود پر خرچ کیجیے اس میں تو سوائے اس کے کہ دو چار وقت آپ خود اور غربا، اناپ شناپ گوشت خوری کرلیں اور ایک خواہ مخواہ کی بہیمیت کا مظاہرہ ہو جائے اور کچھ نہیں! بھلا اللہ کو اس خوں ریزی کا کیا لینا ہے کہ یہ اس کی رضامندی کا ذریعہ بنے؟ اس کے نام پر کسی کو سلیقہ سے فائدہ پہنچائیے تو ثواب کی بات بھی ہے۔
یہ مسلمان کہلانے والے سب وہ لوگ ہوں گے جو گوشت خوری میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں، مگر انھیں اپنی گوشت خوری اور اس کے لیے جانوروں کے ذبیحہ پر بہیمیت کا خیال کبھی نہیں آتا۔ ان کی ساری رحملی اور لطیف الحسی سال بھر میں صرف اسی ایک دن بھڑکتی ہے جب جانوروں کا ذبیحہ خود ان کے خالق کے نام پر کیا جاتا ہے۔

بہ بیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا؟

دوسری بات یہ کہتے ہیں کہ اس خونریزی میں ثواب کا کیا کام ــــ اس سے اللہ کو کیا لینا؟ تو انھیں معلوم نہیں کہ یہ کوئی خاص عقلی انکشاف نہیں فرما رہے ہیں کہ اس سے قربانی کو عبادت سمجھنے والے مبہوت ہو کر رہ جائیں ــــ یہ بات جو وہ آج بڑے عقلی طنطنے کے ساتھ کہتے ہیں خدا نے اسی دن صاف صاف بتادی تھی جس دن قربانی کا حکم دیا تھا سورۂ حج ہے جس میں قربانی کا بڑے شدومد کے ساتھ ملتا ہے۔ اسی میں اللہ کی طرف سے اس حقیقت کا اظہار بھی ہے کہ

لَنْ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوْمُھَا وَلَا دِمَاءُھَا خدا کو ہرگز ہرگز نہ تمہاری ان قربانیوں کا گوشت

وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ (ع ۵) — پہنچتا ہے اور نہ ان کا خون اس کے حضور صرف تمہارے دل کا جذبۂ اطاعت و نیازمندی پہنچتا ہے[۱]۔

تو یہ کوئی ایسا انکشاف نہیں فرما رہے ہیں کہ قربانی کرنے والے سوچنے لگیں کہ ہم کیا بیکار کام کر رہے ہیں؟ (اور خاکم بدہن) خدا کو نظر ثانی کرنی پڑے کہ اس نے کیا بے فائدہ کام کا حکم دے دیا۔ قل اَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ (یونس ع ۲) — آپ کہیئے کہ کیا تم کوئی ایسی خبر اللہ کو دے رہے ہو جس کا پتہ اُسے نہیں تھا؟

اس حقیقت کا اسے اس وقت علم تھا، جب ہمارے اور ان اہلِ خرد کے ابو الآباءؑ بین الماء والطین تھے۔ مگر پھر بھی اس نے قربانی کا حکم دیا جس کی حکمت کی طرف سورۂ حج کی اسی آیت کے آخری الفاظ (ولکن ینالہ التقویٰ منکم) میں اشارہ بھی کر دیا گیا ہے —— جس کو یہ اہلِ خرد از خود نہیں سمجھ سکتے تھے —— اس حکمت کی تشریح آگے کریں گے۔

تیسری بات اسی دوسری بات پر بنیاد رکھ کر یہ لوگ صدقہ و خیرات کی کہتے ہیں۔ گو یہاں بھی سارے عقلی ادّعا کے باوجود یہ لوگ عقل سے اتنا بھی کام نہیں لیتے کہ قرآن کا خدا کیا صدقہ و خیرات سے ناآشنا تھا کہ اس نے قربانی جیسی (معاذ اللہ) "نامعقول" نیکی کا حکم دے مارا، کیا ان مسکینوں کو اتنی بھی خبر نہیں کہ قرآن میں صدقہ و خیرات، انفاق فی سبیل اللہ کی تعلیم کا کیا مقام ہے اور کس قدر کثرت کے ساتھ اس تعلیم کا اعادہ کیا گیا ہے۔

پھر جبکہ یہ معلوم ہے کہ جس خدا نے قربانی کا حکم دیا ہے وہ نہ صرف صدقہ و خیرات سے بھی آشنا ہے۔

---

[۱] یہ قرآن کا اعجاز ہے کہ اس کی ایک ہی آیت کسی زمانہ میں ایک سمت کی گمراہی کا استیصال کرتی ہے تو دوسرے زمانہ میں اس کی بالکل مقابل سمت کی گمراہی کا توڑ بھی اس طرح کرتی ہے کہ معلوم ہو کہ صرف اسی گمراہی کے سدِّباب کے لیے نازل ہوئی ہے۔ اس آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ مشرکین عرب قربانیوں کا گوشت اور خون خانۂ کعبہ کی دیواروں پر لگاتے اور چپاتے تھے اور اس طرح گویا اللہ کو پہنچاتے تھے۔ بعض مومنین کو بھی یہی خیال پیدا ہوا تو یہ آیت نازل ہوئی آج بات الٹ گئی ہے کہ لوگ لن ینال اللہ لحومھا ولا دماءھا کہہ کر مسلمانوں کو قربانی سے برگشتہ کرنا چاہتے ہیں تو یہی آیت انھیں جواب دے رہی ہے کہ تم یہ کون سی نئی بات بتا رہے ہو۔ یہ تو اللہ نے خود بتا دی تھی اور اسکے باوجود قربانی کا حکم دیا تھا۔

کی نسبت بہت عظیم اور دور رس فوائد پیدا ہو سکتے ہیں ـــــ مگر جیسا کہ عرض کیا گیا یہ اعتراض یورپ کی پھیلائی ہوئی اسی مادیت پرستی کا نتیجہ ہے جس کے مسلط ہو جانے کے بعد آدمی کی نظر میں انسانی اعمال کی قدر و قیمت کا واحد پیمانہ مادی اور ظاہری افادیت بن جاتی ہے۔ اور وہ روحانی حاسہ انسان کھو بیٹھتا ہے جس سے دینی اعمال کی بنیادی قدر و قیمت محسوس کی جاتی ہے اور اعمالِ دینیہ کے اسرار کھلتے ہیں۔

مادیت پرستی کے مارے ہوئے یہ لوگ نقد صدقات و خیرات کو اس لیے معقول نیکی سمجھتے ہیں کہ اس سے بڑے پیمانہ کی اور پائیدار مادی فلاح و بہبود پیدا ہوتی ہے، یا ہو سکتی ہے ـــ اور قربانی کی نیکی اس لیے ان کی سمجھ میں نہیں آتی کہ اس سے کسی بڑے اور دور رس مادی فائدے کا ظہور نہیں ہوتا۔ حالانکہ غرباء کو مادی افادیت کی ایک دینی قدر و قیمت کے ساتھ ساتھ صدقہ و خیرات کے نیکی ہونے اور اس میں دینی قدر و قیمت پیدا ہونے کی اصل بنیاد بالکل یہ نہیں ہے کہ اس سے کوئی چھوٹے یا بڑے مادی فوائد غرباء و مستحقین کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔ صدقہ و خیرات کی کسی شکل میں دینی قیمت پیدا کرنے والی اور اس کو ایک دینی نیکی بنانے والی چیز صرف رضائے الٰہی کی نیت اور دینے والے کا جذبہ و احساس ہے کہ یہ میرے مال کے مالکِ حقیقی کا حق تھا جو میں ادا کر رہا ہوں۔

اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد اب اصل بات کو سمجھئے کہ نقد صدقہ و خیرات کی بے شک ایک دینی قیمت ہے اور بہت بڑی ہے ـــــ مگر

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

قربانی کی جو خاص بات ہے وہ اس میں نہیں ہے۔ اس سے مال (سیم و زر) کا حق خداوندی ادا ہوتا ہے۔ اس حقیقت کی یاد دہانی ہوتی ہے کہ یہ اسی کی عطا و عنایت ہے اس سے جذبۂ شکر ابھرتا ہے اور اس طرح رشتۂ عبدیت و معبودیت مضبوط ہوتا ہے ـــــ مگر اللہ کی عطا صرف سیم و زر ہی تک تو محدود نہیں ہے۔ اس نے کتنے ہی انواع کے چوپایوں کی صورت میں بھی تو منافع کا ایک خزانہ دے رکھا ہے جس سے انسان دن رات متمتع ہوتا ہے، دودھ پیتا ہے، گوشت کھاتا ہے، کھیتی باڑی کا کام لیتا ہے۔ وغیرہ ذالک، کیا اس جاندار عطا و عنایت میں خدا کا کوئی حق نہیں ہے؟ کیا اس پر اس میں جذبۂ شکر نہیں ابھرنا چاہیے؟ اور اس حقیقت کو یکسر فراموش کیے رہنا چاہیئے کہ چوپایوں کی یہ منافع بھری دنیا کس کا فیض کرم ہے؟ اور اس عظیم کرم کو رشتۂ عبدیت کی مضبوطی میں سرے سے کام میں نہ آنا چاہیئے؟ـــ حالانکہ عبدیت و معبودیت کا تمام تر رشتہ انہی آبہائے گوناگوں پر استوار ہے ـــــ قربانی بھی کا دوام عام

دیتی ہے۔[5] چنانچہ فرمایا گیا ہے:

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ (الحج)

اور ہر اُمت میں ہم نے قربانی کا طریقہ رکھا ہے تاکہ لوگوں کو اللہ کی اس عنایت پر اس کا نام لینے کی توفیق ملے جو اس نے مویشیوں کی صورت میں فرمار رکھی ہے۔

ان سب اموال سے بڑھ کر انسان پر اللہ کی سب سے بڑی عنایت خود اس کی جان ہے مگر یہ اس کا کرم ہے کہ اُس نے اس جان کا ...... نذرانہ ان دوسرے جانداروں کی جان کی طرح طلب نہیں کیا لیکن اسلام میں قربانی کی بات جہاں سے چلی ہے یعنی سیدنا ابراہیم و اسمٰعیل (علیہما السلام) کا واقعہ وہ سوچنے والوں کو اس بات کا کھلا اشارہ دیتا ہے کہ قربانی کے حکم میں جہاں یہ حکمت تھی کہ مویشیوں کی صورت میں اللہ کی زبردست عطا کا شکرانہ ادا ہو وہاں ان جانداروں کی قربانی میں یہ رمز بھی رکھ دیا گیا ہے کہ قربانی کرنے والا خود اپنی جان بھی اسی طرح جان آفریں پر نذر کرنے کو تیار ہے[5] مگر چونکہ اجازت نہیں اس لیے اس کے بدلے میں ایک دوسری جان نذر کرتا ہوا وہ اپنے حقیقی جذبۂ فدائیت کو بشکل مجاز پیش کرتا ہے —— اس طرح اس قربانی میں ایک عظیم عطا کا شکرانہ بھی ہے اور خود اپنی جان کا نذرانہ بھی —— اور یہ بات نقد صدقہ و خیرات سے کسی طرح حاصل نہیں ہو سکتی۔ جبکہ اللہ سے رشتۂ عبدیت کی درستی اور مضبوطی کے لیے اس خانہ کا بھرا ہونا دوسرے والے خانہ کے بھرنے سے کسی طرح کم ضروری نہیں۔ بلکہ کچھ زیادہ ہی ضروری نظر آتا ہے۔

---

[5] قربانی کی یہی وہ حکمت ہے جس کی طرف "ولکن ینالہ التقویٰ منکم" میں بھی اشارہ موجود ہے۔

[5] راقم کا خیال ہے کہ ابراہیم علیہ السلام سے امتِ مسلمہ کے لیے قربانی کی سنت کا اجراء جو اس طرح کرایا گیا کہ پہلے اسمٰعیل علیہ السلام کو ... پیش کیا گیا پھر بچا دیا گیا ... اہل تحقیق کے نزدیک ابراہیم علیہ السلام کے خواب کا اصل اشارہ یہ نہیں تھا، یا تھا بھی تو کم از کم اسمٰعیل علیہ السلام کو قربانی کرا دینا تو منظور نہیں تھا، تو اس میں ایک حکمت یہ بھی تھی کہ اصل قربانی کو یہ رمز دیا جائے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

از لیوپولڈ [illegible] (ڈاکٹر [illegible] نومسلم)
ترجمہ جناب اشتیاق حسین صاحب، [illegible] کالج لکھنؤ

حدیث و سنّت

پچھلے برسوں میں اصلاح کی بہت سی تجاویز پیش کی جا چکی ہیں، اور بہت سے روحانی طبیب اسلام کی علالت کے لیے تیر بہدف دوا ڈھونڈتے رہے لیکن اس وقت تک تمام کوششیں بیکار رہیں کیونکہ یہ تمام اطبائے روحانی ـــ یا کم از کم وہ جن کو قوم میں شرف قبولیت حاصل ہے ـ اپنی ادویہ مقویات اور اکسیری نسخوں کے ساتھ اس قدرتی غذا کا تجویز کرنا بھول ہی گئے، جس پر مریض کے ارتقا کا ابتدائی دور بہ تمام و کمال منحصر تھا۔ یہ غذا سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور صرف یہی ایک غذا ہے جس کو اسلام کا جسم خواہ بحالت صحت ہو خواہ بیماری قبول کر کے جزو بدن بنا سکتا ہے۔ جب تیرہ سو سال قبل اسلام کے آغاز و ترقی کا راز بخوبی سمجھنے کے لیے سنت رسول ہی کی کنجی کام دیتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اسی کنجی سے اپنے موجودہ انحطاط اور زوال کو بھی نہ سمجھ سکیں اور اس کا مداوا نہ کر سکیں۔

اسلام اور اس کی ترقی در اصل سنت رسول کی پیروی ہی کا نام ہے۔ سنت رسول سے غفلت ہی اسلام کے انحطاط و تفریق کا مترادف ہے۔ عمارت اسلام کا آہنی ڈھانچہ سنت رسول تھا، اگر کسی عمارت کا آہنی ڈھانچہ[1] ... ـــــ نکال ڈالا جائے تو اس عمارت کا گر پڑنا کیونکر تعجب انگیز ہوسکتا ہے۔

یہ سادہ صداقت (یعنی سنت رسول کی پیروی کی ضرورت) جس کو اسلامی دور کی تاریخ میں علمائے اسلام مسلّمہ طور پر مانتے چلے آئے ہیں آج مغربیت کے اثر کے بنا پر نا قابل قبول ہو رہی ہے تاہم صداقت صداقت ہی رہے گی۔ واقعہ یہ ہے کہ صرف یہی صداقت ہے جو ہم کو موجودہ انحطاط اور ابتری سے بچا سکتی ہے۔

یہاں لفظ "سنت" کو وسیع ترین معنی میں استعمال کیا گیا ہے یعنی وہ اسوۂ حسنہ جو کہ رسول اللہ صلعم نے اپنے

---

* مشہور آسٹرین نومسلم محمد اسد صاحب
[1] ڈھانچہ .... یورپ اور امریکہ میں آہنی ڈھانچے پر تعمیر ہوتی ہیں، مصنف نے وہاں سے استعارہ کیا ہے۔

اعمال وارشادات سے ہمارے لئے پیش کیا ان کی حیرت انگیز زندگی قرآن کی زندہ تفسیر و تمثیل ہے اور ہم قرآن پاک کا حق اس سے زیادہ ادا نہیں کر سکتے کہ ہم صاحب نزولِ قرآن علیہ السلام کے نقش قدم پر گامزن ہو جائیں۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ اسلام کا ایک مخصوص کارنامہ یہ ہے کہ اس نے انسانی زندگی کے اخلاقی اور مادی پہلوؤں میں مکمل یگانگت پیدا کر دی ہے، یہ خصوصیت اسلام کو دوسرے فوق الادراک نظاموں (یعنی مذاہب) سے ممتاز کرتی ہے یہی وجہ تھی کہ اسلام اپنے شاندار ابتدائی دور میں جہاں پہنچا باعظمت کامیابی حاصل کی، اسلام دنیا کے لیے ایک نیا پیام لایا کہ آخرت کی بہبودی کے لیے دنیوی زندگی سے نفرت ضروری نہیں، اسلام کی اسی خصوصیت کی بنا پر رسول اللہ صلعم نے دنیا کو پیغام نبوت پہنچانے کے دوران میں انسانی زندگی کے بظاہر متضاد روحانی و مادی پہلوؤں میں یگانگت کی طرف خاص توجہ فرمائی۔

اسی لیے اگر کوئی شخص رسول اللہ کے ان احکامات کو جو عبادات و روحانیات کے متعلق ہیں ان مسئلوں سے جو اجتماعی .... زندگی سے متعلق ہیں ممتاز اور علیحدہ سمجھے تو (کہا جا سکتا ہے) کہ وہ اسلام پر گہری نظر نہیں رکھتا۔ بعض لوگوں کا یہ دعویٰ کہ احکامات متعلقہ عبادات لازمی ہیں اور اجتماعی اور معاشرتی احکامات لازمی نہیں، اتنا ہی سطحی اور معاند اسلام ہے جتنا کہ یہ خیال کہ قرآن کے بعض عام احکامات صرف نزول قرآن کے وقت کے عربوں کے واسطے تھے نہ کہ آج بیسویں صدی کے شائستہ لوگوں کے لیے۔ یہ خیال (اگر غور کیا جائے تو) دراصل رسول اللہ (صلعم) کی شان نبوت کی توہین ہے۔

جس طرح ہر مسلمان کی زندگی کو شرع کے تحت ہونا چاہیے تاکہ ذاتی [illegible] میں یگانگت اور توازن قائم رہے۔ اسی طرح رسول اللہ صلعم نے جو بھی تجویز عبادت کے دوران زندگی کو ایک نیا مجموعہ [illegible] دی زندگی کے اخلاقی، عملی، انفرادی اور اجتماعی مظاہروں سے ہوتی ہے۔ سنت کے حقیقی اور گہرے معنی یہی ہیں کہ رسول اللہ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے توازن پر غور کیا جائے اور اسی کو اپنا لائحہ عمل بنایا جائے، قرآن کہتا ہے:

مَاآتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا

اور جو کچھ رسول اللہ تم کو دیں اس کو قبول کرو اور جس چیز سے منع فرمائیں اس سے پرہیز کرو

اور نیز رسول اللہ نے فرمایا ہے:

تفرقت اليهود على احدى وسبعين فرقة وتفرقت النصارى على اثنتين وسبعين فرقة ستفترق امتى على ثلاث وسبعين فرقة

یہودیوں کے ۷۱ فرقے ہوئے تھے، اور انہوں (عیسائیوں) کے ۷۲ فرقے ہوئے لیکن میری اُمت کے بلد ہی ۷۳ فرقے ہو جائیں گے۔

(سنن ابو داؤد۔ جامع الترمذی۔ سنن الدارمی۔ مسند ابن حنبل)

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ عربی محاورہ "بہتر" تعداد کثیر کے لیے مستعمل ہوتا ہے اس سے کوئی مخصوص تعداد مفہوم نہیں ہوتی، بظاہر رسول اللہؐ کی مراد یہ تھی کہ مسلمانوں میں عیسائیوں اور یہودیوں سے بھی زیادہ فرقے پیدا ہو جائیں گے، اسی سلسلہ میں رسول اللہؐ نے یہ بھی فرمایا کہ

کلھم فی النار الا واحدۃ — اور علاوہ ایک کے ان میں سے سب دوزخی ہوں گے۔

صحابہؓ نے دریافت فرمایا کہ راہ راست پر کون ہوں گے، تو حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ

ما انا علیہ واصحابی — جو میرے اور میرے صحابیوں کے پیرو ہیں

اس سے واضح ہو گیا کہ روحانی کامیابی کی شاہراہ پر صرف وہی ہیں جو رسول اللہ اور اُن کے صحابہ کے اسوۂ حسنہ کو اپنے لیے شمع ہدایت بنائے ہوئے ہیں۔ قرآن کی بعض آیتیں بھی اس حقیقت کو اس قدر واضح بنا رہی ہیں کہ غلط فہمی کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝

نہیں نہیں خدا کی قسم ان کا ایمان نا پختہ ہے۔ تا آنکہ وہ اپنے جھگڑوں میں آپ کو حکم بنائیں اور جو کچھ آپ فیصلہ کر دیں اس میں کوئی اعتراض نہ کریں اور مکمل طور پر سر تسلیم خم کر دیں۔

دوسری جگہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ۝

(اے محمدؐ) کہدو کہ اگر تم خدا سے محبت رکھتے ہو تو مرا اتباع کرو (اگر تم نے ایسا کیا) تو خدا تم سے محبت کرے گا اور تمھارے گناہ بخش دے گا۔ خدا معاف کرنے والا اور مہربان ہے (یہ بھی) کہدو کہ خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ اگر وہ اس سے پھر یں گے (تو واضح رہے) کہ اللہ کافروں سے محبت نہیں کرتا۔

اس لیے اسلامی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے قانون کی بنیاد قرآن کے بعد سنت رسول ہی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہمیں سنت رسول کو قرآنی تعلیم کا واحد صحیح ترجمان سمجھنا چاہیے۔ قرآنی تعلیمات کو عملی زندگی کے ساتھ انطباق دینے اور ان کا مطلب متعین کرنے میں صرف سنت رسول ہی اختلافات کو دور کرنے کا واحد ذریعہ بن سکتی ہے۔ قرآن پاک کی بہت سی آیات کے معنی متشابہ ہیں اور جب تک ہمارے پاس تشریح و تاویل کا کوئی یقینی نظام موجود نہ ہو ان کو مختلف پیرایوں میں سمجھا جا سکتا ہے، علاوہ ازیں عملی زندگی کے بہت سے ایسے اہم مسائل ہیں جن پر قرآن پاک وضاحت سے بحث نہیں کرتا۔ یہ صحیح ہے کہ قرآن پاک میں شروع سے آخر تک

ایک ہی ڈھنگ غالب ہے کہ لیکن اس سے زندگی کے لئے قابل عمل مسائل کا اخذ کرنا آسان نہیں ہے۔ اگر ہمارا ایمان ہے کہ قرآن ارشاد ربانی ہے جو بہ اعتبار ہیئت خواہ بہ اعتبار مقصد ہر طرح سے مکمل ہے تو منطقی طور پر یہ نتیجہ نکالنا ناگزیر ہے کہ اس کے نزول کا مقصد ہی یہ نہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی ہدایت کے بغیر اس کو استعمال کیا جا سکے، اور اللہ کے رسول کی ذاتی ہدایت ہی کا نام سنّت ہے۔ اگلے باب میں یہ سمجھانے کی کوشش کی جائے گی کہ قرآن پاک کو ہمیشہ کے لیے رسول اللہ کی رہنمایانہ اور اثر آفرین شخصیت سے مربوط رکھنے کے بنیادی اسباب کیا ہیں لیکن عقل بتاتی ہے کہ قرآنی تعلیمات کی عملی ترجمانی کے لیے اس ذات سے بہتر کوئی حکم نہیں ہو سکتا تھا جس کے ذریعہ سے باری تعالیٰ نے (اپنی) تعلیمات کو نوع انسان کے سامنے منکشف کیا۔ آج کل ہم بسا اوقات لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنتے ہیں کہ "ہم کو قرآن کی طرف رجوع کرنا چاہیے ہمیں سنت کے غلام بننے کی ضرورت نہیں ہے"۔ یہ ان کی اسلام سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کہ ایک محل میں تو داخل ہونا چاہتا ہے لیکن اس اصلی اور واحد کنجی کو استعمال کرنا نہیں چاہتا جس کے علاوہ کسی دوسری کنجی سے اس محل کا دروازہ کھل ہی نہیں سکتا۔

اب ایک اور اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہ کی زندگی اور ان کے ارشادات کا ماخذ کہاں تک معتبر اور مستند ہے (ہمارے لیے رسول اللہ کی زندگی اور ان کے ارشادات کا) یہ مخرج احادیث ہیں۔ یہ رسول اللہ کے ارشادات اور عمل سے متعلق روایات ہیں جو کہ صحابہ کرام سے مروی ہیں۔ ہجرت کے بعد ہی والی صدیوں میں ان کو صحت اور درستی کے ساتھ جمع کر لیا گیا تھا۔ آج کل بہت سے مسلمان کہتے ہیں کہ ہم سنت پر عمل پیرا ہونے کو تو آمادہ ہیں لیکن ہمارے نزدیک احادیث کا وہ ذخیرہ جس پر (اس وقت) سنت رسول کا قیام ہے ناقابل اعتماد ہے۔

احادیث کے مستند ہونے سے اصولاً انکار کرنا اور اس طرح نظام ہی سے ہٹ کر رہنا آج کل فیشن بن گیا ہے لیکن اس طرز عمل کا کوئی باقاعدہ سبب جواز بھی ہے یا نہیں؟ کیا احادیث کو شریعت اسلام کا مستند ماخذ ماننے سے منکر ہونے کا کوئی اصولی ثبوت بھی ہے یا نہیں؟

چاہیئے تو یہ تھا کہ پرانے اعتقادات کے مخالفین احادیث کے ناقابل اعتماد ہونے کے ایسے یقینی ثبوت بہم پہنچا دیتے کہ احادیث کی صحت ہمیشہ کے لیے ناقابل قبول ہو جاتی لیکن واقعہ یہ نہیں ہے۔ نظام احادیث پر حملہ کرنے کی جملہ کوششوں کے باوجود عہد حاضر کے تمام نقاد خواہ مغربی ہوں یا مشرقی اپنی محض جذباتی نکتہ چینیوں کو باقاعدہ علمی تحقیقات سے ثابت نہیں کر سکے۔ مخالفین کے لیے اپنی مخالفت کے ثبوت بہم پہنچانا در اصل تھا بھی ناممکن کیونکہ احادیث کے قدیم جمع کرنے والوں نے خاص کر امام بخاری اور امام مسلم نے ہر ہر روایت کی صحت کو ہر امکانی

طریقے سے جانچنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، انھوں نے احادیث کی صحت کے جانچنے کے لیے جو سخت اور بلند معیار مقرر کیے وہ ان معیاروں سے کہیں زیادہ سخت ہیں جو کہ یورپ کے مورخ قدیم تاریخ کے ماخذ پر کام کرنے میں استعمال کرتے ہیں۔

قدیم محدثین یعنی بڑے بڑے فاضل جنھوں نے احادیث کی تحقیق پر پوری پوری توجہ صرف کی تھی انھوں نے انتہائی محتاط طریقہ تحقیق برت کر احادیث کی صحت کی جانچ کی تھی اس چھوٹے سے مقالہ میں ان کے تحقیق پر مکمل بحث تو ناممکن ہے لیکن اتنا بتلا دینا ضروری ہے کہ انھوں نے اپنی تحقیقی مساعی سے علم الحدیث کو ایک مکمل اور باقاعدہ مرتب کیا ہوا علم سائنس بنا دیا، جس کا مقصد یہ ہے کہ رسول اللہ کی روایات یعنی احادیث کے الفاظ و معانی اور اس کے طریقۂ روایت کی مکمل تحقیق کی جا سکے، اسی علم (علم الحدیث) کے ایک منضبط شعبہ نے بڑی کامیابی کے ساتھ تمام راویان احادیث کی مکمل سوانح عمریوں کا ایک مربوط سلسلہ مرتب کر لیا ہے۔ یعنی جن بزرگوں کے ذریعہ احادیث آنحضرتؐ کے زمانے سے سلسلہ بہ سلسلہ جامعین احادیث کو پہنچیں یا جامعین احادیث نے ان راویوں (جن میں مرد اور عورتیں دونوں شامل ہیں) کے حالات زندگی کی ہر ہر نقطہ سے مکمل تحقیق کر لی ہے اور ان میں سے صرف انھیں کو معتبر تسلیم کیا ہے، جن کی زندگی اور روایت حدیث کا طریقہ جامعین احادیث کے مقرر کردہ معیار پر پورا اترا ہے۔ واضح رہے کہ جامعین احادیث کا یہ معیار عام امکانی لحاظ سے زیادہ دشوار سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے اگر آج کوئی شخص کسی خاص حدیث کی صحت کو یا احادیث کی صحت کو بحیثیت مجموعی تسلیم کرنے سے انکار کرے تو ان کو غلط ثابت کرنے کی ذمہ داری اسی پر عائد ہوگی، کسی تاریخی واقعہ کے ماخذ میں کوئی نقص ثابت کیے بغیر اس کی صحت سے منکر ہونا اصولاً سخت بے انصافی ہے اگر کسی روایت کے ماخذ کی صحت کے خلاف یا اس کے کسی راوی کے معتبر ہونے کے خلاف کوئی باقاعدہ اور باضابطہ اعتراض موجود نہیں ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس واقعہ کی تردید میں کوئی اور بیان بھی محقق نہیں ہے تو ہم کو اس روایت یا حدیث کو صحیح تسلیم کرنا پڑے گا۔

فرض کیجئے کہ کوئی شخص محمود غزنوی کی ہندوستان کی جنگوں کا ذکر کر رہا ہو اور آپ کھڑے ہو کر یہ کہنے لگیں "مجھے یقین نہیں کہ محمود غزنوی کبھی ہندوستان آیا ہو۔ یہ محض ایک روایت ہے جس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں" اس صورت میں کیا ہوگا۔ فوراً تاریخ کے ماہر آپ کی غلطی کو درست کرنے کی کوشش کریں گے، اور ایسی تاریخوں اور تذکروں کے استنباط آپ کے سامنے پیش کریں گے جو اس مشہور سلطان کے ہمعصروں کی اطلاعات پر مبنی ہوں۔ یہی اس امر کا یقینی ثبوت ہوگا کہ محمود فی الواقعہ ہندوستان آیا۔ اس صورت میں آپ کو وہ ثبوت تسلیم کرنا پڑے گا ورنہ آپ کو وہمی سمجھا جائے گا کہ بلا کسی ثبوت ہی کے آپ مستند تاریخی واقعات کو جھٹلا رہے ہیں۔ اگر یہ طریقہ استدلال

صحیح ہے تو بآسانی کہا جا سکتا ہے کہ آج کل کے نکتہ چیں احادیث کے معاملہ میں اسی بااصول ایقد انے تنقید سے کام کیوں نہیں لیتے؟

کسی حدیث کے غلط ہونے کی پہلی وجہ تو یہ ہوسکتی ہے کہ اس کے پہلے راوی یعنی کسی صحابی نے عمداً دروغ بیانی کی ہے یا یہ کہ بعد کے کسی راوی نے جھوٹ سے کام لیا۔ جہاں تک صحابہ کرام یعنی آنحضرت صلعم کے صحبت یافتہ مسلمانوں کا تعلق ہے دروغ بیانی کا امکان ہی باقی نہیں رہتا۔ اس قسم کے مفروضات محض توہم کی خلاقی ہوسکتے ہیں۔ اور مسئلہ کے اس پہلو کو بخوبی سمجھنے کے لیے مسئلہ کے نفسیاتی پہلو پر غور و خوض کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ تاریخ انسانی کا ایک نمایاں واقعہ ہے کہ رسول اللہ صلعم کی شخصیت نے صحابہ کرام پر ایک زبردست اثر مرتب کر دیا تھا۔ تاریخ میں یہ واقعہ مکمل تحریری ثبوت کے ساتھ محفوظ ہے۔ کیا یہ بات قابل اعتماد ہوسکتی ہے کہ جو لوگ رسول اللہ صلعم کے حکم پر اپنی جان اور اپنا تمام دنیوی اثاثہ قربان کر دینے کو تیار ہوں وہ رسول صلعم کے الفاظ کو توڑ مروڑ کر کچھ کا کچھ کر دیں گے؟ رسول اللہ نے فرمایا ہے۔

من کذب علی متعمداً فلیتبوأ مقعدہ من النار۔ — جو جان بوجھ کر میری طرف سے جھوٹ بولے گا اس کا مقام دوزخ ہوگا۔

(صحیح بخاری، سنن ابو داؤد، جامع الترمذی، سنن ابن ماجہ، سنن الدارمی، مسند ابن حنبل)

صحابہ کرام کو اس کا علم تھا، وہ رسول اللہ کے الفاظ پر مکمل یقین رکھتے تھے کیونکہ وہ رسول کو خدا کی طرف سے بولنے والا تصور کرتے تھے، کیا نفسیاتی نقطۂ نظر سے ان حالات میں یہ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے رسول کے اس کھلے حکم کی نافرمانی کی ہوگی؟

عدالت فوجداری کی کارروائیوں میں جج کے سامنے ہمیشہ یہ سوال رہتا ہے کہ ارتکاب جرم سے کس کا مقصود تھا، احادیث کے مسئلہ میں بھی یہ اصول استعمال کیا جا سکتا ہے چند احادیث کے علاوہ جن کا تعلق چند افراد اور گروہوں کی حیثیت درتبہ سے ہے (مثلاً وہ احادیث جن کا تعلق رسول اللہ کی وفات کے بعد والی پہلی صدی کی مختلف سیاسی جماعتوں سے ہے اور جن کو قریب قریب تمام محدثین نے مسلمہ طور پر مان کر چھوڑ دیا ہے) کسی حدیث کے وضع کرنے اور رسول اللہ صلعم کی باتوں کو غلط پیش کرنے میں کسی شخص کا کوئی فائدہ "متصور" نہیں ہوسکتا تھا۔

جن احادیث میں کسی فرد یا گروہ کا فائدہ متصور تھا ان میں امکان تھا کہ ذاتی فائدہ کی بنا پر وضع کر لیا گیا ہو، اسی توجیہہ سے کام لیتے ہوئے محدثین میں سب سے زیادہ معتبر امام بخاری اور امام مسلم نے بڑی احتیاط سے اپنے مجموعوں سے ایسی تمام احادیث کو نکال دیا ہے جن کا تعلق ایسے گروہ بندیوں سے ہو

احادیث باقی رہیں ان سے کسی راوی کو ذاتی فائدہ پہنچنے کا امکان متصور نہیں ہو سکتا اس لیے ان کو موضوع قرار نہیں دیا جا سکتا۔

حدیث کی صحت پر اعتراض (۳) کرنے کی ایک ... بنیاد یہ بھی ہو سکتی تھی۔ کہا جا سکتا ہے ممکن ہے کہ ان ... سے جنھوں نے رسول اللہ سے سنا یا دوسرے کسی راوی یا راویوں سے غیر محسوس طریقہ پر محض غلط فہمی ... یا ... اور نفسیاتی سبب کی بنا پر غلطی ہوئی ہو لیکن کم از کم جہاں تک صحابہ کرامؓ کا تعلق ہے۔ حالات کی اندرونی یعنی نفسیاتی شہادت کی بنا پر اس قسم کی غلطی کا زیادہ امکان باقی نہیں رہتا۔ ان لوگوں کے لیے جو رسول اللہؐ کے ساتھ رہتے تھے، رسول اللہؐ کے افعال و الفاظ انتہائی وزنی اور قابل قدر تھے، اس کی وجہ صرف یہ نہ تھی کہ رسول اللہؐ کی شخصیت نے انھیں مسحور کر رکھا تھا بلکہ وجہ یہ تھی کہ ان کا اعتقاد تھا کہ خدا کا حکم ہے کہ ہم اپنی زندگی کو مکمل طور پر رسول اللہؐ کی ہدایت اور مثال کے مطابق منظم کریں، اس لیے رسول اللہؐ کے اقوال کا مسئلہ ان کے لیے غیر اہم نہ تھا بلکہ لوگ ان کے ہر ہر قول کو یاد کرنے اور اپنے ذہن میں محفوظ رکھنے کی کوشش میں بڑی بڑی تکلیفیں برداشت کرتے تھے، بیان کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلعم کے پاس رہنے والے صحابہ کرام نے دو دو کے جوڑ بنا رکھے تھے تاکہ باری باری ان دونوں میں سے ایک ایک رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر رہے اور دوسرا زندگی کی دوسری ضروریات میں مشغول ہو اور ان میں سے ہر ایک رسول اللہ کے پاس رہ کر جو کچھ دیکھتا سنتا دوسرے کو بتلا دیتا، اس سے پتہ چلتا ہے کہ صحابہ کرامؓ کو کس قدر فکر رہتی تھی کہ کہیں رسول اللہؐ کا کوئی فعل یا ان کا کوئی ارشاد ان کے علم میں ... نہ رہ جائے، جب یہ صورت حال تھی تو کیا یہ سمجھنا ... صحابہ کرامؓ، رسول اللہؐ کے عین الفاظ یاد رکھنے کی طرف سے بھی بے فکر نہیں ہوتے تھے جب کہ صد ہا صحابہ کرامؓ مکمل قرآن کو ایک ایک لفظ کے ... ... ساتھ اپنے حافظ میں محفوظ رکھ سکے تو اس میں شک نہیں ہو سکتا کہ انھیں صحابہ اور ان کے تابعینؓ[1] نے رسول اللہؐ کی ایک ایک حدیث کو بھی ... اپنے حافظہ میں محفوظ رکھا ہو، علاوہ ازیں محدثین نے صرف انھیں احادیث کو مکمل طور پر معتبر مانا ہے جو مختلف اور آزاد راویوں کے سلسلہ سے مروی ہیں۔

تحقیق کی صحت کے اس اہتمام کے باوجود بھی کسی مسلمان کے نزدیک کبھی بھی احادیث کا وہ مرتبہ یا غیر نزاعی حیثیت نہیں رہی جو کہ قرآن کی ہے۔ احادیث کی تحقیق کا سلسلہ کبھی بھی بند نہیں ہوا، یہ دفعہ

---

[1] تابعین، وہ بزرگ جنھوں نے صحابہ کرامؓ کی صحبت سے کسب فیض کیا ہو۔

کہ لاتعداد موضوع حدیثیں بھی موجود ہیں۔ محدثین کا نقطۂ نظر ... یورپ کے نکتہ چین غالباً شرارتاً ایسا سمجھے ہوئے ہیں۔ اس کے برخلاف احادیث کے باضابطہ تحقیقی علم کی ابتدا ہی اس وجہ سے ہوئی کہ صحیح اور موضوع احادیث میں تمیز کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور اگر مقابلتہً کم مستند محققوں کو بھی نہ شمار کیا جائے تو امام بخاری اور امام مسلم جیسے محقق حدیث تو اسی تحقیقی تخیل نے نے پیدا کئے۔ اس لئے موضوع حدیثوں کا وجود مستند احادیث کی صحت کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے اور یہ بالکل اسی طرح جیسے کہ "الف لیلہ" کے افسانے اسی زمانہ کے تاریخی واقعات کی صحت کے مخالف یا موافق کوئی ثبوت نہیں سمجھے جاسکتے۔

آج تک کوئی نکتہ چین باقاعدہ طور پر یہ نہیں ثابت کرسکا کہ معتبر محدثین کے مقرر کردہ معیار کے مطابق صحیح احادیث بھی غلط ہیں، مستند احادیث کو مجموعی طور پر یا جستہ جستہ ماننے سے انکار کرنا جیسے کہ پہلے بھی کیا جاچکا ہے محض ایک فطری امر ہے لیکن غیر متعصبانہ علمی تحقیقات سے ثابت نہیں مگر موجودہ زمانہ کے بہت سے مسلمانوں کی اختلافی روش کا مقصد اصلی سمجھنا زیادہ دشوار نہیں ہے ہم اپنے موجودہ ذلیل طرز معاشرت اور طرز تخیل کو اسلام کے اس صحیح معیار پر تو پہنچا نہیں سکتے جو ہمارے رسول کی سنت سے نمایاں ہے اسلئے اپنی اور اپنے اعمال کی کمزوریوں کو حق بجانب ثابت کرنے کیلئے احادیث کے نام نہاد نکتہ چین کوشش کررہے ہیں کہ سنت رسول کی اتباع کی ضرورت ہی کو باقی نہ رکھا جائے کیونکہ اگر سنت رسول کے اتباع سے چھٹکارا مل جائے تو اسلامی تعلیمات[1] کی روشنی میں اپنی تعلیمات کی حسب منشاء ترجمانی کی جاسکتی ہے، لیکن اس طرح اسلام کی وہ مابہ الامتیاز حیثیت کہ وہ فرد و ملت دونوں کے لئے ایک اعلیٰ اخلاقی اور عملی آئین پیش کررہا ہے مٹ کر رہ جائے گی۔

آج کل جب اسلامی ممالک میں مغربی تہذیب کا اثر روز بروز بڑھتا جارہا ہے مسلمان "دانشمند" جماعت کے اس عجیب و غریب طرز عمل کی ایک وجہ اور بھی ہے۔ مغربی طرز معاشرت کی پیروی اور سنت رسول کا اتباع بیک وقت ناممکن ہے لیکن عہد حاضر کے مسلمان مغربی تہذیب اور ہر مغربی شے کی قدر و منزلت کے لئے محض اس وجہ سے تیار ہیں کہ وہ غیر ملکی بااثر اور مادی حیثیت سے خیرہ کن ہے، رسول اللہ صلعم کی روایات اور ان کے ساتھ سنت رسول کے کل نظام ہی کی انتہائی غیر مقبولیت کا سب سے بڑا سبب یہی مغرب زدگی ہے۔"

مغربی تہذیب کا سنت رسول کے بنیادی اصولوں سے ... ناقد ... ہے کہ دلدادۂ مغرب کو سنت رسول ...

---

[1] تعلیمات ... مقاصد ... ہر قسم ... تشریح میں کرنے کا دعویٰ

سے متعلقہ باب کے لیے اس کے علاوہ کوئی چارہ باقی نہیں رہتا کہ سنتِ رسول ﷺ کو مسلمانوں کے لیے لازمی اصول سے یہ کہہ کر الگ کر دے کہ اس کی بنیاد غیر معتبر روایات پر ہے۔ اس سیدھے سادے لیکن بے اصولی عمل کے بعد قرآنی تعلیمات کا اس طرح توڑ موڑ لینا کہ وہ روحِ مغرب کے مطابق معلوم ہونے لگیں، چنداں دشوار نہیں رہتا۔

رُوحِ سُنّت

احادیث کے تاریخی طور پر قابلِ اعتماد ثابت ہو جانے کے بعد جب تک ان کی رسمی بلکہ شرعی حیثیت اہم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد یہ سوال اٹھتا ہے کہ ہم کو جاننا ہے کہ ان پر عامل ہونے کے لیے کوئی باطنی اور روحانی تائید بھی ہے یا نہیں۔ یعنی خود پیغمبر کی اخلاقی زندگی سے اخذ کیے ہوئے اعمال، رسوم اور اوامر و نواہی پر عامل ہوئے بغیر اسلام کی حقیقت سے فیض یاب ہونے کا کوئی طریقہ نہیں ہے، مگر جب کہ اوامر و نواہی میں سے بعض نہایت ہی معمولی باتوں سے متعلق ہیں، اس میں شک نہیں کہ آپ کی ذات نوعِ انسان میں سب سے افضل تھی لیکن اس کے باوجود کیا آپ کی زندگی کی تمام رسمی تفصیلات کی پیروی کو ضروری قرار دینا انسان کی انفرادی آزادی کے خلاف نہ ہوگا؟ یہ ایک ایسا اعتراض ہے جس کو مخالفِ اسلام نکتہ چین اکثر پیش کرتے رہے ہیں، ان کا خیال ہے کہ سنت کا سختی کے ساتھ ضروری قرار دینا ہی دنیائے اسلام کے مابعد زوال کا باعث ہوا۔ ان کا خیال ہے کہ سنت کا لازمی ہونا انسان کی آزادیِ عمل پر حملہ آور ہو کر بالآخر جماعت کی قدرتی ترقی کو روک لیتا ہے۔

کیا ہمارے پاس اس اعتراض کا کوئی معقول جواب ہے یا نہیں؟ اسلام کے مستقبل کے لیے یہ چیز انتہائی ضروری ہے کہ مسئلہ سنت کے متعلق ہمارا کیا طرزِ عمل ہونا چاہیے۔ اسلام کے متعلق ہمارے طرزِ عمل کا تعین بھی اسی پر مبنی ہے۔

ہمیں فخر ہے اور یہ فخر حق بجانب ہے کہ اسلام بحیثیت مذہب پراسرار کلیسائی اعتقادات[1] پر مبنی نہیں ہے۔ بلکہ عقلِ نکتہ چین اس کی صداقت کی ہر وقت تحقیق کر سکتی ہے، اس لیے ہمارا حق ہے کہ اس بات کے جان لینے کے علاوہ سنت کی پیروی ہم پر ضروری ہے یہ بھی سمجھیں کہ ایسا کیوں کیا گیا ہے۔

یہ مسئلہ خاص طور پر اہم ہے کہ اسلام زندگی کے تمام پہلوؤں کی وحدت اور یکانگت کی حقیقی تفہیم کی طرف رہبری کرتا ہے۔ اس وحدتِ مقصود تک پہنچانے کا ایک ذریعہ ہونے کے باعث اس مذہب میں خود بھی مختلف نظریوں کا ایک ایسا مکمل اجتماع موجود ہے جس میں کسی چیز کے شامل کرنے یا گھٹانے کی گنجائش نہیں، اسی لیے

[1] کلیسائی اعتقادات .... وہ عقیدے جن پر یقین رکھنا ضروری قرار دے دیا جائے خواہ عقلِ انسانی ان کو مانے یا نہ مانے۔

اسلام میں انتخاب مسائل و اصول (تلفیق[1]) کی قطعی گنجائش نہیں جو اسلامی تعلیمات قرآن یا ارشاد رسول سے ثابت ہو چکی ہیں ان کو بہ تمام و کمال تسلیم کرنا چاہیے ورنہ ان کی اہمیت باقی نہیں رہ سکتی، اسلام کے متعلق ایک بنیادی غلط فہمی یہ ہے کہ اسلام عقلی مذہب[2] ہونے کے باعث اپنی تعلیمات میں ہر فرد کو حق انتخاب دیتا ہے۔ یہ دعویٰ کہ مذہب استدلال کے متعلق ایک عام غلط فہمی پر مبنی ہے۔ عقل و استدلال کے حقیقی معنی اس معنی سے بہت مختلف ہیں جو کہ ہم نے عام طور پر سمجھ رکھے ہیں، مختلف زمانوں کے فلسفے بھی کافی طور پر ہماری تائید کرتے ہیں۔ مذہبی معاملات میں عقل کا کام ضبط و تنظیم کا ہے، اس عقل کا فرض یہ ہے کہ انسانی دماغ پر کوئی ایسا بار نہ پڑنے دے جس کا وہ متحمل نہ ہو سکے یعنی اس پر کوئی ایسے فرائض عائد نہ کئے جائیں جو اس کی سمجھ میں نہ آسکیں۔ اس کے لئے فلسفہ کی جادوگری کی حاجت نہ تھی، جہاں تک اسلام کا تعلق ہے غیر متعصب انسانی عقل بار بار اس پر مکمل اعتماد کا اظہار کر چکی ہے، اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر شخص جو اسلام سے دوچار ہو، اس کی تعلیمات کو لازمی طور پر تسلیم ہی کرلے۔ اس کا تعلق قلبی میلان اور بڑی حد تک روحانی تنویر یا بہ الفاظ قرآن پاک "ہدایت" پر مبنی ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ کوئی غیر متعصب انسان یہ نہیں کہہ سکتا کہ اسلام میں کوئی چیز بھی خلاف عقل ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس کی بعض چیزیں ماورائے عقل ہیں لیکن خلاف عقل کچھ نہیں ہے۔

اس حد تک مذہبی معاملات میں عقل کا کام صرف یہ ہوا کہ اپنی انفعالی حیثیت قائم رکھتے ہوئے تمام احکام مذہبی کا جائزہ لیتی رہے۔ عقل کو مذہبی احکام میں ان کی معقولیت و عدم معقولیت پر صرف ہاں یا نہیں کہنے کا اختیار ہے۔ گویا وہ صرف "ہاں" یا "نہیں" کہنے کا ایک آلۂ اندراج[3] ہے لیکن نام نہاد استدلال پسندی کا یہ حال نہیں ہے، یہ صرف جائزہ اور اندراج پر قناعت نہیں کرتا بلکہ جلد ہی تردیدی تفکر[4] شروع کر دیتا ہے، عقل محض کی طرح اس کی تاثر پذیری[5] بے لوث نہیں ہے بلکہ انتہائی اثر انداز[6] اور محکم جذبات ہے۔ عقل اپنی نارسائیوں سے واقف ہوتی ہے لیکن استدلال پسندی کا احمقانہ دعویٰ ہے کہ ہر فرد واحد اپنے چھوٹے سے دائرہ کے

۱؎ انتخابیت ...... مختلف گروہوں کے مسلکوں سے انتخاب کرنے اور اس مرکب سے ایک نیا مذہب ترتیب دے لینے کی روش تلفیق ہے۔ ۲؎ استدلال پسندی .... یہ اصول کہ مذہب کی بنا عقل پر ہونی چاہیے۔

۳؎ آلۂ اندراج .... آج کل اکثر آلات اپنے عمل کا اندراج بھی کرتے جاتے ہیں جس کو دیکھ کر بعد میں بتایا جا سکتا ہے کہ کیا اور کتنا کام ہوا۔

۴؎ تردیدی تفکر .... تردید ہی کی طرف بڑھنے والی ذہنی کیفیت۔

۵؎ اثر پذیری .... جو بیرونی اثرات کو قبول کرے لیکن بنا [illegible]

۶؎ اثر انداز .... وہ ذہنی کیفیت [illegible]

اندر بھی تمام عالم اور اس کے رموز پر حاوی ہے۔ یہ مذہبی معاملات میں چند امور کے وارثی یا مستقل طور پر ماورائے عقل ہونے کے امکان ہی کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوتا، لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ مذہب دستورالعمل کو سائنس کے اکثر حقائق میں ماورائے عقل ہونے کا امکان تسلیم ہے۔

اس ناکارہ استدلال پر ذہنی کے متعلق غیر معمولی مبالغہ ہی اور اسباب میں شامل ہے جس کی وجہ سے جدت پسند مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کے راستے میں تسلیم ختم کرنے کے منکر ہو رہے ہیں۔

لیکن آج یہ بدیہی امر ثابت کرنے کے لیے کہ انسانی عقل کی رسائی کا دائرہ نہایت محدود ہے، کانٹ جیسے فلسفی کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ فطرتاً ہمارا ذہن مخلوقات کو من حیث المجموع سمجھنے سے قاصر ہے ہم ہر شے کی تفصیل سمجھنے کی قدرت رکھتے ہیں لیکن مجموعی طور پر مخلوقات کی کنہ ہماری عقل کی دسترس سے باہر ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ ازل اور ابد کیا ہیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ "زندگی" کیا ہے۔ اس لیے مذہبی معاملات میں جن کا تعلق ماوراء عقل بنیادوں سے ہے، ہم کو لازمی طور پر ایک ایسے رہنما کی ضرورت ہے جس کا ذہن معمولی عقلی قوت استدلال کے علاوہ جو ہر انسان کو ملا ہے کچھ غیر معمولی توفیق لے کر پیدا ہوا ہو یعنی ایک ایسے شخص کی حاجت ہے جس کا قلب نور حق سے منور ہو یعنی ایک پیغمبر کی۔

اگر ہم کو یقین ہے کہ قرآن کلام اللہ ہے۔ اگر ہم کو یقین ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے پیغمبر تھے تو ہم نہ صرف اخلاقاً بلکہ ذہناً و عقلاً بھی مجبور ہیں کہ ان کی کورانہ پیروی کریں۔ یہاں لفظ "کورانہ" کے یہ معنی نہیں کہ ہم اپنے قوائے عقلیہ کو رخصت کر دیں۔ ہم کو چاہیے کہ اپنی عقلی قوتوں سے ان کے دائرہ کے اندر پورا پورا کام لیں۔ ہمیں کوشش کرنا چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی علت غائی کو معلوم کریں، لیکن خواہ ہم ان احکام کی علت غائی کو سمجھ سکیں یا نہیں بہرصورت ہم پر ان کی تعمیل لازمی ہے۔ اس لحاظ سے ایک مسلمان کی مثال اس فوجی سپاہی سے دی جا سکتی ہے جس کو اس کے جنرل کی طرف سے ایک اہم مورچہ سنبھالنے کا حکم ملا ہے ایک عمدہ سپاہی حکم کی فوری تعمیل کرے گا۔ اگر اس حکم کی تعمیل کے دوران میں وہ سپاہی اپنے جنرل کے حکم کی علت غائی کو سمجھ لے تو اس کو اور اس کی ذات اور نیز اس کی فوج کو اس سے مزید فائدہ پہونچے گا لیکن اگر سپاہی فوراً جنرل کے حکم کے باطنی مقصد کے سمجھنے سے قاصر رہتا ہے تو اس کو یہ حق نہیں ہے کہ جنرل کے حکم کی تعمیل سے باز رہے یا تاوقتیکہ اس کی علت سمجھ میں نہ آجائے اس کی تعمیل کو ملتوی رکھے یہی حال ہر مسلمان کا ہونا چاہیے۔ مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نوع انسان کا بہترین کمال سمجھتے ہیں اس لیے قدرتاً ہمارا دعویٰ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہماری نسبت مذہب کے روحانی اور اجتماعی پہلوؤں کا کہیں زیادہ علم تھا۔ ان کے ہر امر و نہی میں کوئی نہ کوئی اہم علت غائی مضمر تھی جو کہ ان کے نظام میں نوع انسان کی روحانی

درست ... کی بہبودی کے لیے لابدی ہوتی تھی، بعض معمولی امور میں تو یہ مقصد صاف نمایاں نظر آتا ہے اور بعض اوقات یہ مقصد اصلی معمولی انسان کی ناپختہ نظر سے کم و بیش پنہاں رہتا ہے۔ بعض اوقات ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتہائی گہرے مقصد کو بھی سمجھ لیتے ہیں لیکن بسا اوقات ہماری سمجھ صرف سطحی اور فوری مقصد تک پہنچتی ہے بہر حال ہم ہر صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی تعمیل کے لیے مجبور ہیں، خواہ ان احکام کی صحت معقول طور پر ثابت ہو جائے۔ اس کے علاوہ اور کوئی امر مانع نہیں ہو سکتا۔ یہ صحیح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض احکام بدیہی طور پر دوسرے احکام سے کہیں زیادہ اہم ہیں۔ اور ہم کو زیادہ اہم احکام کو مقابلۃً کم اہم احکام پر ترجیح دینا ضروری ہے۔ لیکن ہم کو کوئی حق نہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی حکم کو بھی خواہ وہ بظاہر کتنا ہی غیر ضروری معلوم ہوتا ہو پس پشت ڈال دیں کیونکہ قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ارشاد ربانی ہے کہ

وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۔ وہ اپنی مرضی سے بات نہیں کہتے۔

یعنی ان کے ارشادات کبھی نفسانی ضرورتوں پر مبنی نہیں ہوتے ہیں اور وہ وہی ارشاد فرماتے ہیں جو کہ حکم رب ہوتا ہے، اسی لیے ہمارا فرض ہے کہ اگر ہم سچے مسلمان بننا چاہتے ہیں تو سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صورتاً اور معناً عمل کریں۔

جب کہ مسلمان کے لیے سنت رسول ﷺ کی پیروی کی واقعی ضرورت ثابت ہو گئی تو اس کا حق بلکہ فرض ہے کہ اسلام کے مذہبی اور اجتماعی نظام کے اندر مقام سنت کی تحقیق کرے اور معلوم کرے کہ ان مفصل اخلاقی قوانین و ضوابط کا روحانی مقصد کیا ہے جو کہ مسلمان کی زندگی پر پیدائش سے لے کر موت تک حاوی رہتے ہیں، اور جن کے عمل سے زندگی کے اہم ترین پہلوؤں سے لے کر نہایت معمولی اور غیر اہم پہلو تک سب گھرے ہوئے ہیں۔ کیا یہ نظام بے معنی ہے؟ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم میں کہ آپ کے پیرو ہر حیثیت سے آپ کے نقش قدم پر چلیں کوئی خاص فائدہ مد نظر رکھا گیا ہے؟ اگر میرے دونوں ہاتھ یکساں پاک و صاف ہیں تو کیا مضائقہ ہے کہ میں خواہ داہنے ہاتھ سے کھانا کھاؤں یا خواہ بائیں سے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو اس قسم کی پابندیاں ہم پر کیوں عائد کر دی گئی ہیں؟ میرے داڑھی رکھنے یا منڈانے میں کیا فرق واقع ہوگا؟ کیا یہ امور محض رسمی نہیں ہیں؟ کیا افراد کی ترقی یا جماعت کی بہبودی میں ان امور کا کوئی خاص اثر ہے۔

اگر ہم پیروی سنت ہی پر اسلام کے قیام و زوال کا انحصار سمجھتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ ان اعتراضات کا جواب دینے میں اور زیادہ دیر نہ کریں۔

جہاں تک مجھے علم ہے قیام سنت کے تین مخصوص اغراض ہیں۔

پیروی سنت کی پہلی غرض یہ ہے کہ انسان کو اس طرح باقاعدہ تربیت ملے کہ اس میں بالا استقلال باطنی احساس، عمل، بیداری اور خود نظمی[1] کا مادہ پیدا ہو جائے اور بے ضابطہ اعمال کی عادت جاتی رہے کیونکہ بے ضابطہ اعمال و عادات انسان کی روحانی ترقی کے راستہ میں سخت رکاوٹیں پیدا کر دیتے ہیں جیسے کہ دوڑنے والے گھوڑے کے راستہ میں وہ پتھر وغیرہ جن سے گھوڑا ٹھوکر کھا کر پیچھے رہ جائے۔ چونکہ یہی بے ضابطگیاں روحانی سکون کو برباد کر دیتی ہیں۔ اس لیے ضرورت ہے کہ ان کو جس قدر ممکن ہو کم کیا جائے نیز ضرورت ہے کہ ہمارے ہر عمل کی تعیین قوت ارادی سے ہو اور یہ اخلاقی احتساب کے تحت رکھا جائے۔ لیکن اس مقصد کی انجام دہی کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی نگرانی خود کرنا سیکھیں۔ ایک مسلم کی اس دائمی احتساب نفس کی ضرورت کو حضرت عمر بن خطابؓ نے کیا خوب پیرایہ میں پیش کیا ہے:

حاسبوا انفسکم قبل ان تحاسبوا۔ محاسبہ کیے جانے سے قبل اپنا محاسبہ خود کرو۔

اور رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا ہے:

اُعبد ربک کانک تراہ۔ اپنے رب کی بندگی اس طرح کرو گویا کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو۔

(صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن النسائی)

پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ اسلام کے عبادت کے تخیل میں صرف رسمی نماز و روزہ ہی شامل نہیں ہے بلکہ وہ ہماری مکمل زندگی پر حاوی ہے اسلامی عبادات کا مقصد یہ ہے کہ ہماری ذات کے روحانی اور مادی پہلوؤں میں یگانگت پیدا کر دی جائے۔ اس لیے ہماری کوشش کا بین مقصد یہی ہونا چاہیے کہ تا بمقدور انسانی ہم اپنی زندگی کے غیر محسوس اور بے ضابطہ اجزائے عمل سے پرہیز کریں۔ خودنگرانی یا محاسبہ نفس اس مقصد کے حصول کی پہلی منزل ہے اور خودنگرانی کی تربیت کا بہترین ذریعہ یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی کے معتاد اور بظاہر غیر اہم کاموں کا بھی محاسبہ کرتے رہیں۔ یہی "چھوٹے چھوٹے" اور "غیر اہم" کام اور عادات زیر بحث ذہنی تربیت کے لیے ذہنوں کی بڑی اور اعلیٰ سرگرمیوں سے کہیں زیادہ ہیں۔ بڑے بڑے اور ممتاز کام اپنی امتیازی حیثیت کی وجہ سے ہمیشہ نمایاں رہتے ہیں اور اسی لیے وہ قریب قریب ہمیشہ دائرہ احساس کے اندر رہتے ہیں، اور اسی لیے ان میں غلطی کا احتمال کم ہوتا ہے لیکن اکثر چھوٹے چھوٹے کاموں پر توجہ قائم نہیں رہتی اور ذاتی محاسبہ قائم نہیں رہتا، اس لیے خودنگرانی کی قوتوں کو تیز کرنے کے لیے یہی چھوٹے چھوٹے کام کہیں زیادہ اہم ہیں۔ ممکن ہے کہ خود اس بات کی کوئی اہمیت نہ ہو کہ ہم کس پاؤں سے قدم اٹھائیں داہنے یا بائیں، لیکن

---

[1] خود نظمی۔ خودنگری۔

اصولاً یہ چیز تو انتہائی اہم ہے کہ ہمارے کل اعمال اگر اصولی ارادے کے ماتحت انصرام پذیر ہوں، اپنی پر متواتر نگرانی اور اخلاقی یا منطقی قائم رکھنا، خواہ ہماری قوتیں کتنی ہی ترقی یافتہ کیوں نہ ہوں، آ... نہیں ہے۔ ذہنی تساہل جسمانی تساہل سے کم نہیں ہوتا۔ اگر آپ ایک شخص سے جو بیٹھے رہنے کا عادی ہو کچھ فاصلہ تک پیدل چلنے کی فرمائش کریں تو یقین ہے کہ وہ جلد ہی تھک کر بیٹھ جائے گا، لیکن جس نے پیدل چلنے کی عادت ڈال رکھی ہے اس کی یہ حالت نہ ہوگی۔ پیدل چلنے کی جسمانی مشقت، مشقت نہ رہے گی، اس کے لیے تو یہ ایک خوشگوار جسمانی ورزش ہوگی جس کا وہ عادی ہے۔ الغرض زندگی کے ہر پہلو پر ... کے عادی ہونے کی یہ ایک اور توجیہ ہے، اگر ہم اپنے جمیع افعال کی، از قسم عمل ارتکاب فعل سے ہو یا ذہنی ہیجان ہو، روکیں، تو یہ ہمارے تردد و نگرانی کی مہارت متواتر ترقی کر کے فطرت ثانیہ بن جائے گی، اس عمل کے جاری رہنے ہونے روزانہ ہمارا اخلاقی تساہل گھٹتا جائے گا۔ (الفرقان بابت رجب ۶۷ھ)

مولانا محمد منظور نعمانی

مسئلہ حیاتُ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

(شائع شدہ الفرقان ربیع الاول ۱۳۷۹ھ مطابق نومبر ۱۹۵۹ء)

اب سے ایک سال پہلے میں پاکستان گیا تھا، اس وقت وہاں مختلف صحبتوں میں یہ بات سننے آئی تھی کہ دیوبند کے علمی اور دینی سلسلہ سے تلمذ اور عقیدت کی نسبت رکھنے والے یہاں کے حضرات میں ایک نیا اختلاف مسئلہ "حیات النبی" کے بارہ میں پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن جن لوگوں سے میں نے اس بارے میں وہاں کچھ سنا، وہ یا تو اصل حقیقت سے واقف نہ تھے یا اپنے علم و فہم کی خاص سطح کی وجہ سے نقطۂ اختلاف کو صحیح طور پر سمجھے ہوئے نہ تھے اس لیے ان کے بیانوں سے میں کچھ نہ سمجھ سکا کہ اس اختلاف کی اصل حقیقت کیا ہے ——— اور جن حضرات اہل علم کا اس نزاع کے فریق کے طور پر نام لیا جاتا تھا، اتفاق سے ان میں سے کسی سے بھی اس سفر میں ملاقات کی نوبت نہیں آئی اس لیے ان بزرگوں اور دوستوں سے حسن ظن کی بنا پر میرا یہی خیال رہا کہ یہ اختلاف غالباً نزاع لفظی کے قبیل سے ہو گا۔

پھر پاکستان سے میری واپسی کے بعد مختلف اوقات میں اس سلسلہ میں میرے پاس کچھ خطوط بھی آتے رہے اور ان سے معلوم ہوتا رہا کہ یہ کشمکش برابر بڑھ رہی ہے اور ایک نئے تفرقہ کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے۔

اس سلسلے کے بعض خطوط سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض لوگ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کی کتاب "آب حیات" کا حوالہ دے کر جماعت دیوبند کا مسلک یہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا ... دنیا نہیں ہوئی، بلکہ آپ جس حیات کے ساتھ اس دنیا میں رونق افروز رہتے تھے اسی حیات کے ساتھ قبر ... منتقل کر دیے گئے ——— ان میں سے بعض خطوط میں یہ بھی تھا کہ بعض دوسرے ... اس مسئلہ کی وجہ سے علماء دیوبند پر سخت طعن و تشنیع کر رہے ہیں ——— اور مجھ سے اصرار کیا گیا تھا

۔۔۔ ۔۔۔ ت۔ تھا تو بیشک اللہ تعالیٰ زندہ ہے اسے کبھی موت نہیں آئے گی۔

اور اس کے بعد آپ نے قرآن مجید کی یہ آیت بھی تلاوت فرمائی:-

وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَضُرَّ اللَّهَ شَيْئًا وَسَيَجْزِي اللَّهُ الشَّاكِرِينَ ۝ (آل عمران)

اور محمد تو اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول ہیں، ان سے پہلے بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں۔ کیا اگر ان کا انتقال ہو جائے یا وہ دشمنوں کے ہاتھوں شہید ہو جائیں تو تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے اور جو کوئی الٹے پاؤں پھرے گا تو وہ اللہ تعالیٰ کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا اور شکر کرنے والے بندوں کو اللہ تعالیٰ یقیناً اچھا بدلہ دے گا

اور بعض روایات میں ہے کہ صدیق اکبرؓ نے اس موقعہ پر حضورؐ کی وفات سے متعلق قرآن مجید کی چند اور آیتیں تلاوت فرمائیں۔

بہرحال آپ کے اس خطبہ کے بعد صحابہ کرام اس مسئلہ میں یکسو ہو گئے، حضرت عمرؓ نے بھی اپنی غلطی محسوس کرلی اور اگلے دن مجمع عام میں اس کا اعلان بھی کردیا۔

(۴) پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال ہی کی بنیاد پر خلافت و امامت کا مسئلہ اٹھا اور آخرکار سقیفۂ بنی ساعدہ میں ابوبکر صدیقؓ کو آپ کا خلیفہ منتخب کیا گیا اور بیعت ہوئی۔

(۵) پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کے پہنے ہوئے کپڑوں ہی میں غسل دیا گیا، پھر کفن پہنایا گیا۔

(۶) پھر صحابہ کرام نے ایک خاص طریقہ اور ترتیب سے آپ کی نماز جنازہ پڑھی، یعنی اس طرح کہ چند چند صحابہ کرام (بعض روایات کے مطابق دس دس) کی جماعتیں حجرہ مبارک میں داخل ہوتی تھیں اور بغیر کسی کو امام بنائے نماز جنازہ پڑھ کر باہر آجاتی تھیں۔ اسی طرح تمام صحابہ کرام نے آپ کی نماز جنازہ پڑھی (اور ابن سعد وغیرہ کی ایک روایت کے مطابق حضرت علی مرتضیٰؓ نے کسی کو امام نہ بنانے کی وجہ یہ بتائی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے زندگی میں امام تھے اسی طرح بعد وفات بھی امام ہیں۔ ــــــ "هو امامنا حيًّا وميتًا") ــــ بہرحال یہ مسلّم ہے کہ آپ کی نماز جنازہ صحابہ کرام نے بغیر کسی امام کے پڑھی۔

(۷) آپ کا وصال دوشنبہ کے دن چاشت کے وقت ہوا تھا، اس دن اس کے بعد کی رات اور سہ شنبہ کا پورا دن جنازہ اسی طرح حجرۂ شریفہ میں رکھا رہا اور لوگوں کی ٹولیاں باری باری نماز جنازہ ادا کرتی رہیں۔ یہاں تک کہ شب چہار شنبہ میں آپ کو اسی حجرۂ مقدسہ میں دفن کر دیا گیا۔

یہ سب وہ مسلم دینی اور تاریخی حقائق و واقعات ہیں جو حدیث و سیر کی کتابوں میں عام طور سے مذکور ہیں، اسی لیے میں نے کسی کتاب کا حوالہ دینے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی ــــ مجھے یقین ہے کہ ان میں سے کسی بات سے بھی کسی صحیح العقیدہ صاحب علم کو انکار یا اختلاف نہ ہوگا۔

(۸) اسی طرح کسی صاحب علم پر یہ بھی مخفی نہیں ہو سکتا کہ قرآن مجید میں ان بندگان خدا کو جو راہِ حق میں قتل کیے گئے اور دشمنان حق نے بظاہر جن کو موت کے گھاٹ اتار دیا "احیاء" یعنی زندہ کہا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے کہ "وہ اپنے رب کے پاس شاداں فرحاں ہیں اور ان کو وہاں انواع و اقسام کا رزق اور طرح طرح کی نعمتیں مل رہی ہیں۔

(۹) اور یہ بھی ظاہر ہے کہ حضرت انبیاء علیہم السلام بہر حال ان سے افضل ہیں اور بدرجہا افضل ہیں، یقیناً ان کا انجام اور مقام ان شہداء کرام سے خوشتر اور بلند ہی ہونا چاہیے اور اسی لیے اس دنیا سے جانے کے بعد ان کی حیات، شہداء کی حیات[۱] سے اعلیٰ اور اقویٰ ہی ہونی چاہیے۔

(۱۰) اور نص قرآنی کے اسی "اشارہ" اور اسی "اقتضاء" کی وضاحت ان احادیث سے ہوتی ہے جو کتب حدیث میں انبیاء علیہم السلام کی حیات کے بارہ میں روایت کی گئی ہیں ــــ جہاں تک اس ناچیز کو علم ہے ان حدیثوں کو سب سے پہلے امام بیہقی نے ایک مستقل رسالے میں جمع کیا ہے پھر اس رسالے کے قریب پورے مواد کو ساتویں اور آٹھویں صدی کے جلیل القدر محدث و فقیہ شیخ تقی الدین سبکی نے اپنی کتاب "شفاء السقام" میں نقل کر دیا ہے ــــ اور متاخرین حفاظ حدیث میں سے علامہ سیوطی نے بھی اس مسئلہ پر مستقل رسالہ لکھا ہے جس میں اس موضوع سے متعلق حسب عادت ہر طرح کی روایات کو جمع کر دیا ہے۔ زرقانی شرح مواہب میں بھی یہ حدیثیں دیکھی جا سکتی ہیں۔

---

(۱) حافظ ابن القیم نے "کتاب الروح" میں قرطبی کے حوالہ سے ان کے شیخ احمد بن عمرو کا ایک قول نقل کیا ہے جس کی ۲-۳ سطریں یہ ہیں۔ ان الشہداء بعد قتلہم وموتہم احیاء عند ربہم یرزقون فرحین، مستبشرین وھذہ صفۃ الاحیاء فی الدنیا و اذا کان ھذا فی الشہداء کان الانبیاء بذلک احق واولیٰ"

ان سب احادیث اور روایات سے مجموعی طور پر یہ ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ جس طرح اس دنیا سے جانے کے بعد شہداء کو ایک خاص طرح کی حیات حاصل ہو جاتی ہے، جس میں وہ دوسرے مومنین سے ممتاز ہیں اور جس کی بنا پر قرآن مجید میں ان کو "احیاء" کہا گیا ہے، اسی طرح حضرات انبیاء علیہم السلام کو ایک خاص الخاص حیات اس دنیا سے منتقل ہونے کے بعد حاصل ہو جاتی ہے اور وہ تمام انبیاء علیہم السلام کو اور خاص کر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے[1]

یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا (جس سے غالباً کسی صاحب علم کو بھی اختلاف نہ ہوگا) اس سے لازمی نتیجہ کے طور پر دو باتیں ثابت ہو جاتی ہیں۔

ایک یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات ناسوتی کا جو سلسلہ پیدائش سے لے کر ۶۳ سال کی عمر شریف تک جاری رہا تھا وہ تو وفات کے دن ختم ہو گیا اور "کل نفس ذائقة الموت" کے قانون عام کے مطابق آپ پر وہ کیفیت وارد ہوئی اور آپ اس منزل سے گزرے جس کی تعبیر موت کے

---

[1] علامہ ابن القیم نے قرطبی سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ ان کے شیخ احمد بن عمرو حیات انبیاء کے سلسلہ کی ان حدیثوں کی طرف اشارہ کر کے فرماتے تھے کہ [illegible]

اس سے ضمناً یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ مسئلہ میں اس طرح خیال کرنے والوں میں صرف زرقانی ابن حجر ہیثمی، سیوطی، اور شیخ عبدالحق دہلوی جیسے حضرات ہی نہیں ہیں بلکہ اس فہرست میں ان سے بہت پہلے ابو عبداللہ قرطبی اور شیخ احمد بن عمرو کے نام بھی ——— میں ہیں۔ لیکن ان حضرات کی ایسی عبارتوں کا یہ مطلب قرار دینا کہ انبیاء علیہم السلام پر موت وارد ہی نہیں ہوئی اور ان کو اپنی قبروں میں بعینہ دنیا والی ناسوتی حیات حاصل ہے، ایسا سمجھنے والوں کی خوش فہمی کے علاوہ ان بزرگوں پر تہمت بھی ہے۔ اسی طرح ہمارے بعض بزرگوں کی تحریروں میں مثلاً "التصدیقات" میں انبیاء علیہم السلام کی قبر والی حیات کو جو "حیواۃ دنیویۃ" کہا گیا ہے تو اس کا بھی ہرگز یہ مطلب نہیں ہے۔ اس کا مطلب تو صرف یہ ہے کہ وہ حیات دنیا کی سی ہے یعنی مع الجسد ہے، صرف برزخی روحانی نہیں ہے جو تمام مومنین کو بھی حاصل ہے جن کے اجسام مٹی ہو چکے ہیں۔ "التصدیقات" کے اردو ترجمہ ہی میں غور کرنے سے یہ مطلب خود واضح ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں ان بزرگوں کی ایسی عبارتوں کا یہ مطلب بیان کرنا اور ان کا یہ مسلک بتانا کہ انبیاء علیہم السلام پر موت وارد ہی نہیں ہوئی اور قبروں میں بعینہ دنیا والی ناسوتی حیات کے ساتھ موجود ہیں، صریحاً ان پر یہ الزام لگانا ہے کہ اس مسئلہ میں ان کی رائے قرآن و حدیث کے صریح نصوص و بینات اور اجماع صحابہ اور اجماع امت کے خلاف ہے۔ میں نہیں یقین کرتا کہ ہمارے علماء میں سے کسی نے ایسی لغویات کہی ہو۔ "سبحانک ھذا بھتان عظیم"

لفظ سے کی جاتی ہے۔ آپ کی اس رحلت کو صحابہ کرام نے موت ہی کہا اور موت ہی سمجھا، اور حضرت عمرؓ وغیرہ کو (کسی وقتی غلط فہمی یا غلبۂ حال کی وجہ سے) اس کے ماننے میں ابتداءً جو تامل اور تردد تھا وہ بھی حضرت ابوبکر کے خطبہ کے بعد ختم ہوگیا اور آخرالامر تمام صحابہ کرام کا اس پر اجماع ہوگیا کہ آپ کی ناسوتی حیات کا خاتمہ ہوچکا اور آپ پر موت وارد ہوچکی اور قرآن حکیم کی بات "انک میت وانہم میتون" پوری ہوگئی اور پھر اسی بنا پر آپ کو آخری غسل دیا گیا، موت کے بعد والا لباس یعنی کفن پہنایا گیا، قبر میں دفن کیا گیا (حالانکہ اگر کسی آدمی میں ناسوتی حیات کا شائبہ بلکہ شبہہ بھی ہو اور اس کی موت کا پورا یقین نہ ہوچکا ہو تو اس کو دفن کردینا شدید ترین شقاوت اور قطعاً حرام ہے۔ اور کسی پیغمبر کے ساتھ شقاوت وظلم کا یہ معاملہ کرنا تو صرف حرام ہی نہیں بلکہ سخت ترین اور خبیث ترین کفر ہے۔

اور دوسری بات مذکورہ بالا دینی اور تاریخی حقائق وواقعات سے یہ معلوم ہوئی کہ صحابہ کرام نے آپ کی وفات کو بالکل دوسرے آدمیوں کی سی موت نہیں سمجھا بلکہ اس کی نوعیت عام انسانوں سے کچھ مختلف سمجھی، اسی لیے آپ کو آخری غسل پہنے ہوئے کپڑوں میں دیا گیا۔ کرتا تک جسم اطہر سے نہیں اتارا گیا، نماز جنازہ بھی عام اموات مسلمین کی طرح نہیں پڑھی گئی بلکہ دوسرے طریقے سے پڑھی گئی (بلکہ بعض روایات سے تو معلوم ہوتا ہے کہ معروف نماز جنازہ کے بجائے صرف صلوٰۃ و سلام عرض کیا گیا اور آپ کے احسانات کے اعتراف کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے آپ کے لیے بس دعا کی گئی) اور اس سب سے بڑھ کر یہ کہ مردوں کے دفن کرنے کے بارے میں تاخیر نہ کرنے کا شریعت کا جو عام تاکیدی حکم ہے اس کے بالکل برخلاف تقریباً پورے دو دن گزر جانے کے بعد دفن کیا گیا۔ اور اس غیر معمولی تاخیر میں کوئی حرج نہیں سمجھا گیا اور کوئی اندیشہ نہیں محسوس کیا گیا۔ اور کسی ایک صحابی نے بھی اس معاملہ میں جلدی کرنے کا تقاضا نہیں کیا۔ پھر آپ کی ایک خاص ہدایت کے مطابق آپ کی زندگی کے عزیز مسکن یعنی حضرت صدیقہ کے اس حجرہ ہی کو آپ کا مدفن اور آپ کی دائمی آرام گاہ بنا دیا گیا اور آپ اسی میں دفن کیے گئے۔

اسی طرح آپ کی ایک ہدایت کے مطابق آپ کی املاک میں ترکہ اور وراثت کا عام قانون جاری نہیں کیا گیا بلکہ آپ کی حیات طیبہ میں ان کا جو مصرف اور جو نظام تھا وہی بدستور قائم رکھا گیا۔ اور وہ خلافت کی تولیت میں رہیں۔

اسی طرح آپ کی ازواج مطہرات کا یہ حق سمجھا گیا کہ وہ اپنے سکونہ حجروں کو تا زیست اپنے استعمال میں رکھیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے املاک سے اپنا نفقہ تاحیات حاصل کرتی رہیں جیسا کہ حضورؐ کے سامنے ان کو یہ دونوں حق حاصل تھے، حالانکہ کسی مسلمان کے مرنے کے بعد اس کی بیوہ بیوی

کے یہ حقوق صرف عدت کی مختصر مدت تک رہتے ہیں

ان سب استثنائی اور اختصاصی احکام و معاملات سے یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی نوعیت دوسرے تمام لوگوں کی موت سے بہت کچھ مختلف ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ اتنی بات سے ہمارے حلقے کے کسی صاحب علم کو اختلاف ہوگا۔ اسی طرح بعض احادیث سے جو یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نیز دیگر انبیاء علیہم السلام کو اپنے مدفنوں میں ایک خاص قسم کی حیات حاصل ہے (جو اس عالم کے مناسب ہے اور بعض حیثیات سے دنیا والی ناسوتی[1] حیات سے بھی اعلیٰ و اقویٰ ہے) غالباً اس سے بھی کسی صاحب علم کو اختلاف نہ ہوگا۔ ہاں اس کے آگے موت و حیات کی نوعیت کی تعیین اور تفصیلات میں کچھ اختلاف ہو سکتا ہے اور اس کی گنجائش بھی ہے اور ایسے اختلافات خود اہل سنت میں بلکہ اہل سنت کے ایک ایک حلقے میں بھی ہمیشہ رہے ہیں، ان کو اہمیت دینا اور ان باتوں کا باعث تفرقہ بننا بڑی بدقسمتی کی بات ہے۔

اس کے بعد چند کلمات میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے رسالہ "آب حیات" کے مضمون کے متعلق بھی عرض کرتا ہوں۔ جن حضرات نے حضرت نانوتویؒ کی تصنیفات اور مکاتیب کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ آپ کی اکثر تحریریں اردو زبان میں ہونے کے باوجود مضامین کے لحاظ سے اتنی مشکل اور ادق ہیں کہ آجکل کے ہمارے اصحاب درس علماء میں بھی شاذ و نادر ہی ایسے نکلیں گے جو ان کو پوری طرح سمجھ سکیں، اور اس ناچیز کے خیال میں آپ کی تصنیفات میں سب سے مشکل اور دقیق ترین یہی "آب حیات" ہے۔ درس نظامی کے جملہ فنون میں سب سے مشکل منطق، فلسفہ اور کلام سمجھے جاتے ہیں اور ان فنون کی درسی کتابوں میں سب سے مشکل ہمارے درسی حلقوں میں قاضی احمد اللہ، صدرا، اور خیالی کو سمجھا جاتا ہے۔ اس عاجز نے یہ کتابیں پڑھی بھی ہیں اور ان میں جو مشکل ترین ہیں وہ مدرسی کے زمانہ میں پڑھائی بھی ہیں، میں خود اپنا تجربہ عرض کرتا ہوں کہ ان میں سے کسی کتاب کے سمجھنے میں مجھے اتنی مشکل پیش نہیں آئی، جتنی کہ "آب حیات" کے سمجھنے میں پیش آئی تھی۔ میں نے آب حیات کا مطالعہ پہلی دفعہ اپنی طالب علمی کے آخری دور میں اس وقت کیا تھا جب کہ منطق و فلسفہ اور کلام کی سب درسی کتابیں میں پڑھ چکا تھا، اور ان فنون کے وہ مباحث مجھے خوب مستحضر تھے جن کے تکرار

---

[1] اس تحریر میں "حیات ناسوتی" سے ہر جگہ میری مراد وہ حیات ہے جس کے لوازم اور خصائص اس متغیر مادی عالم کے ساتھ مخصوص ہیں اور اسی کا سلسلہ ختم ہو جانے کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست استفادہ کوئی نہیں کر سکتا جو آپ کی اس ناسوتی حیات میں ...

کے بغیر آب حیات کو نہیں سمجھا جا سکتا، لیکن مجھے خوب یاد ہے کہ اس وقت بھی میرا احساس یہی تھا کہ
میں نے ساری عمر میں جو کتابیں دیکھی یا پڑھا ہیں ان میں سب سے زیادہ مشکل اور صعب الفہم
یہی کتاب ہے۔ اپنے اس ذاتی تجربہ کی بنا پر مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ ہمارے حلقہ کے علما
میں بھی آب حیات کو پوری طرح سمجھنے والے ہند و پاک کے طول و عرض میں اب گنتی کے چند ہی ہوں گے۔

لہ مجھے اپنی اس رائے پر مزید اطمینان اپنے مکرم و محترم مولانا قاری محمد طیب صاحب
زید مجدہم سے ابھی حال میں یہ سُن کر ہوا، کہ حضرت مولانا حبیب الرحمان صاحب رح سابق
مہتمم دارالعلوم دیوبند نے اپنے اخیر دورِ حیات میں ایک دن ان سے فرمایا کہ میرا جی
چاہتا ہے کہ میں تم کو آب حیات پڑھا دوں، لیکن مجھے اس کا مطالعہ کرنا ضروری ہوگا
اس لیے تم اس کا ایک نسخہ لاکر میرے سرہانے رکھ دو میں رات کو مطالعہ کر لیا کروں گا
قاری صاحب کا بیان ہے کہ میں نے نسخہ لاکر رکھ دیا۔ لیکن پھر یا تو مطالعہ کا وقت نہیں
مل سکا یا کوئی اور وجہ پیش آگئی کہ اس پڑھنے پڑھانے کی نوبت نہ آسکی۔ یہاں
تک کہ حضرت مولانا مرحوم کا وقت موعود آگیا اور یہ کام رہ ہی گیا۔
اس واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آب حیات کس قسم کی کتاب ہے کہ مولانا محمد
طیب صاحب جیسے ذکی عالم و فاضل کو بھی اس کے پڑھنے کی ضرورت تھی اور حضرت
مولانا حبیب الرحمان صاحب مرحوم جیسے راسخ العلم اس کے پڑھانے کے لیے، پہلے
مطالعہ کر لینا ضروری سمجھتے تھے۔ پھر جب کل ۷ رنومبر کو اس ناچیز نے اپنی یہ تحریر
سہارنپور میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہم العالی کو سنائی
تو دو واقعے حضرت ممدوح نے بھی اس کی تائید میں سنائے۔
ایک یہ کہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا جب وصال ہو تو حضرت شیخ الہند
منطق و فلسفہ کی کتابیں پڑھانا چھوڑ دیں۔ حالانکہ پہلے پڑھایا کرتے تھے، جب ...
اصرار کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ ان کتابوں کو ہم صرف اس
پڑھایا کرتے تھے کہ حضرت رحمۃ اللہ کی باتیں سمجھنے میں ان سے مدد ملتی تھی، اب
وہی نہیں رہے تو کیوں ہم خواہ مخواہ ان کتابوں پر مغز ماریں۔
دوسرا واقعہ اس سلسلہ کا یہ سنایا کہ حضرت شیخ الہند رح کے تدریسی دو...
ار بار یہ طے ہوا اور اس کا منصوبہ بنا کہ حضرت کے خاص تلامذہ حضرت مدنی رح
حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رح وغیرہ جب کہ ان حضرات کے پڑھانے کا زمانہ

اور بغیر کسی تکلف و انکسار کے عرض کرتا ہوں کہ اب میں بھی ان میں سے نہیں ہوں، کیونکہ اس کے سمجھنے کے لیے منطق و فلسفہ اور کلام کے جو مباحث مستحضر ہونے چاہئیں وہ اب مجھے مستحضر نہیں رہے ہیں، تاہم چونکہ ایک دفعہ اس کو سمجھ کر مطالعہ کیا تھا، اس لیے، اس کا حاصل و مدعا اور مرکزی مضمون الحمد للہ اب تک ذہن میں ہے۔ پھر ان سطروں کو لکھنے سے پہلے بھی میں نے اس پوری کتاب کا ایک سرسری مطالعہ حال ہی میں کیا ہے اور میں علیٰ وجہ البصیرت یہ کہنے کا اپنے کو حقدار سمجھتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات و ممات کے بارہ میں اس میں کوئی بات بھی جمہور امت اور اہل سنت کے ان تمام دینی اور تاریخی مسلمات اور معتقدات کے خلاف نہیں ہے، جن کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات بعد الممات کی خاص نوعیت کی تحقیق اور تعیین میں حضرت نانوتوی رح نے اپنے خاص طرز پر ایک نہایت دقیق و عمیق کلام کیا ہے (اور اسی کے ساتھ دجال کی حیات و ممات کی خاص نوعیت کے بارے میں بھی اسی طرز پر کچھ کلام کیا ہے) اور بلاشبہ یہ تحقیق اتنی دقیق ہے کہ عوام کے علاوہ اوساط کے فہم سے بالاتر ہے۔ پس اس کو عمومی مسئلہ بنانا از قبیل اتباع متشابہات اور غریب عوام کو فتنے میں ڈالنا ہے، وہ بے چارے اصل حقیقت کو تو نہ سمجھ سکیں گے، پھر یا تو کچھ کا کچھ سمجھ کے اندھی عقیدت میں اسی کو اپنا عقیدہ بنا کے گمراہ ہوں گے یا حضرت نانوتوی رح پر گمراہی اور بداعتقادی کے فتوے لگائیں گے۔ ہمارے علماء کرام کو للہ سوچنا چاہیئے کہ اس سارے ضلال و فساد کا ذمہ دار عند اللہ کون ہوگا۔

دیوبندیت کیا ہے؟

آخر میں چند کلمات "دیوبندی مسلک و مشرب" کے بارے میں بھی عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

ظاہر ہے کہ ہمارے اکابر و اساتذہ حضرت علماء دیوبند کا کوئی الگ اعتقادی یا فقہی مکتب فکر نہیں ہے عقائد میں اہل سنت و جماعت کے طریقہ پر اور فقہ میں حنفی ہیں۔ البتہ اصناف اہل سنت میں ہمارے اکابر کا ایک خاص رنگ ہے۔ بس اس کی تعبیر "دیوبندیت" سے کی جاتی ہے اور وہ رنگ مندرجہ ذیل خصوصیات کے اجتماع سے پیدا ہوتا ہے۔

(صفحہ ۱۵۸ کا) حضرت نانوتوی رح کی تصانیف حضرت شیخ الہند سے سبقاً سبقاً پڑھیں ہیں اس کی نوبت غالباً نہیں آئی۔

بہر حال جن حضرات نے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی مشکل تصانیف آب حیات وغیرہ خود نہیں دیکھی ہیں وہ ان واقعات سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ کس قسم کی کتابیں ہیں۔ اور اردو خواں عوام تو

(۱) فقہ حنفی پر اطمینان اور اس کے مطابق فتویٰ اور عمل کے ساتھ حدیث و سنت خاص تعلق و شغف، نیز دیگر آئمہ مجتہدین اور اسی طرح حضرات محدثین کا ادب و احترام اور دل میں ان سب کی عظمت و محبت۔

(۲) اس فقہی اور علمی خصوصیت کے ساتھ حضرات صوفیاء کرام کی "نسبت" کی طلب و تحصیل، یا کم از کم دل میں ان کی عظمت و محبت۔

(۳) اس سب کے ساتھ اتباع سنت، اور شرک و بدعت سے نفرت اور اس معاملہ میں ایک خاص صلابت و حمیت۔

(۴) اور پھر اس سب کے ساتھ اعلاء کلمۃ اللہ کا جذبہ اور اس راہ میں مر مٹنے کا شوق۔

پس "دیوبندیت" دراصل اس خاص رنگ کا عنوان ہے جو ان عناصر اربعہ کے اجتماع سے پیدا ہوتا ہے، ہمارے اس سلسلہ کے اکابر و اساطین مثلاً حضرت نانوتوی رح و حضرت گنگوہی رح (نور اللہ مرقدہم) اور ان کے خواص تلامذہ اور مسترشدین ان چیزوں کی جامعیت ہی میں ممتاز تھے۔ ورنہ یہ خصوصیات جدا جدا دوسرے حلقوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔

نیز یہ بھی عرض کر دوں کہ "دیوبندیت" کی یہ تحقیق اور اس کا یہ تجزیہ ایک صحبت میں اس عاجز نے مولانا عبید اللہ سندھی رح مرحوم سے سنا تھا، اس کے بعد سے جب اور جتنا اس پر غور کیا اتنا ہی اس کو صحیح اور واقعہ کے مطابق پایا۔

بہرحال طریق اہل سنت اور فقہ حنفی سے وابستگی کے بعد یہ ہے وہ خاص رنگ یا خاص مشرب، جس کا عنوان دیوبندیت ہے۔ پس جو ہم میں سے جتنا اس رنگ میں کامل یا ناقص ہے اتنا ہی وہ "دیوبندیت" میں کامل یا ناقص ہے۔

اور سب سے پہلے میں اقرار کا اعلان کرتا ہوں کہ میں اپنے حال اور عمل کے لحاظ سے بہت ہی ناقص قسم کا دیوبندی ہوں لیکن الحمد للہ میں نے اصل دیوبندیوں کو دیکھا ہے اور ان کے طریقہ اور ان کے مسلک پر جینے اور مرنے کی آرزو رکھتا ہوں

احب الصالحین ولست منہم لعل اللہ یرزقنی صلاحاً

آخر میں پھر عرض کرتا ہوں کہ بخدا نہ مجھے ابھی تک کسی ذریعہ سے معلوم ہو سکا ہے اور نہ میں خود غور کر کے سمجھ سکا ہوں کہ اس مسئلہ میں ہمارے علماء میں اصل نقطہ اختلاف کیا ہے۔ میں خود جس طرح اس مسئلے کو سمجھے ہوئے ہوں جو میرے نزدیک حق ہے اور ہمارے اکابر کا مسلک ہے وہ میں نے ان صفحات میں اپنے امکان کی حد تک صاف اور منقح طور سے پیش کر دینے کی کوشش کی ہے۔

یہ عاجز ذو فن دلوں سے مخدومنا حضرت مولانا شاہ عبد القادر صاحب رائے پوری دامت برکاتہم کی خدمت میں

احترام و اخلاص کے ساتھ ان کی خدمت میں گذارش ہے کہ جو کچھ ناچیز نے اس تحریر میں عرض کیا ہے اگر وہ صرف اتنے پر متفق ہوں تو یہ اختلاف ختم ہو جانا چاہیئے اور اس سے آگے کے نقطہ میں اگر بالفرض اختلاف ہو بھی تو اس کو ہرگز وجہ تفریق نہیں بنانا چاہیئے، بلکہ اعلان ہو جانا چاہیئے کہ یہ اختلاف اس قسم کا علمی اختلاف ہے جو ایک حلقہ کے اہل علم میں بھی ہو سکتا ہے، ہوتا رہے۔ اساتذہ دیوبند میں بعض مسائل کی تحقیق میں اختلاف ہوا ہے اور رہا ہے، اگر ضرورت ہو تو یہ عاجز اس کی بیسیوں مثالیں گنا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ ہم غیر ضروری بنیادوں پر تفریق کا باعث نہ بنیں۔

یہ تحریر مکمل کر لینے کے بعد میں دیوبند بھی حاضر ہوا، اور وہاں استاذی حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند کو بھی میں نے یہ تحریر سنائی۔ حضرت ممدوح نے "آب حیات" کے مضمون پر بڑی بصیرت افروز روشنی ڈالی جو بلاشبہ آپ ہی کا حق ہے۔

• لیکن جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں وہ صرف خواص اہل علم کے سننے اور سمجھنے والی بات ہے، اس لئے میں اس کو اس تحریر کا جزء بنانا نہیں چاہتا، اور ساتھ ہی مجھ سے فرمایا کہ اس تحریر کے آخر میں یہ اضافہ اور کر دو کہ "آب حیات" کے مضمون کو جو شخص ٹھیک ٹھیک سمجھ لے گا وہ اس کے نصوص قرآن وحدیث یا اجماع امت کے خلاف ہونے کا شبہ بھی نہیں کرے گا۔ یہ شبہ اسی کو ہو گا جو اس کا مطلب صحیح نہ سمجھ سکے گا۔ اور جو شخص اس کا مطلب ایسا بیان کرے جو نصوص اور اجماع کے خلاف ہو تو سمجھنا چاہیئے کہ اس نے اس کا مطلب صحیح نہیں سمجھا (اس کے ساتھ ہی ممدوح نے فرمایا کہ) آب حیات والی تحقیق ایک نہایت دقیق علمی تحقیق اور ایک عمیق علم ہے، اس کا سمجھنا یا ماننا نہ اہل سنت ہونے کی شرط ہے نہ دیوبندی المشرب ہونے کی، لہٰذا اس مسئلہ کو ہرگز وجہ تفریق نہیں بنانا چاہیئے دونوں فریق ہمارے ہیں اور ہماری جماعت کے افراد ہیں۔

——— دارالعلوم دیوبند۔ ۱۱۔ نومبر ۱۹۵۸ء

نوٹ

۱۔ رسالہ سے متعلق تمام خطوط میں خریداری نمبر کا حوالہ ضروری ہے بغیر اس کے تعمیل میں سخت مشکلات پیش آتی ہیں۔

۲۔ منی آرڈر کوپن پر اپنا پتہ بصاف صاف انگریزی میں بھی لکھیں۔ پرانے خریدار حضرات خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

۳۔ جواب طلب امور کے لیے جوابی خط آنا ضروری ہے۔

منیجر "الفرقان" لکھنؤ

حِکمت و مَوعِظت

ارشاداتِ حضرت شیخ جیلانیؒ

از مولانا محمد اویس صاحب ندوی نگرامی

محبوب سبحانی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحؒ کی مجلس وعظ درحقیقت انوار و برکات کی مجلس ہوتی تھی، جو کچھ فرماتے تھے قلوب اس سے متاثر ہوتے تھے، اللہ تعالیٰ کی بے شمار رحمتیں ہوں شیخ عفیف الدین بن مبارک پر کہ انھوں نے ان مواعظ میں سے باسٹھ وعظ قلم بند فرمائے جو آج تشنگان حق کے لیے چشمۂ آب حیواں سے کم نہیں ہیں۔ اہل مصر نے "الفتح الربانی" کے نام سے ان مواعظ کو شائع کیا تھا اور جناب مولانا عاشق الٰہی مرحوم نے اردو میں ان کا ترجمہ بھی فرمایا تھا جو غالباً اب نایاب ہوچکا ہے۔ اثنائے مطالعہ میں خیال آیا کہ ان مواعظ میں سے ملفوظات کے طور پر کچھ انتخاب کیا جائے اور اصحاب قلوب اور صاحبان ذوق کے سامنے پیش کرکے اُن کی دُعا حاصل کی جائے۔

(۱) ایمان والا قلب "کیوں" اور "کس طرح" نہیں جانتا وہ نہیں جانتا کہ "بلکہ" کیا ہے اس کا قول تو "ہاں" ہے۔

(۲) اپنے "بیدار" ہونے کو موت کے بعد کے لیے نہ چھوڑو کہ اس وقت بیدار ہونا تم کو مفید نہ ہوگا۔

(۳) قلب گویا پرند ہے بدن کے "پنجرہ" میں، موتی ہے ڈبہ میں، مال ہے صندوق میں، پس اعتبار پرند کا ہے "پنجرہ" کا نہیں، اعتبار موتی کا ہے ڈبہ کا نہیں، اعتبار مال کا ہے صندوق کا نہیں۔

(۴) اوّل اپنے نفس کو نصیحت کرو اس کے بعد دوسرے کے نفس کو نصیحت کرو۔

(۵) جب توحید گھر کے دروازے پر ہو اور شرک گھر کے اندر، تو یہی نفاق ہے۔

(۶) افسوس تجھ پر کہ تیری زبان تقویٰ پکارتی ہے اور دل فاجر بن رہا ہے زبان شکر کرتی ہے اور دل اعتراض کر رہا ہے۔

(۷) جب تم توبہ کرو تو چاہیئے کہ تمہارا ظاہر بھی توبہ کرے اور باطن بھی، توبہ حکومت کی

کا یا پلٹ ہے۔

(۸) یوں سمجھو کہ تمھاری عمر میں صرف یہی ایک دن باقی رہ گیا ہے پس آخرت کے لیے تیار ہو۔

(۹) کثرت سے وہ لوگ ہیں جو گھر میں بیٹھیں تو درماندہ و بیکار رہیں اور دوکان پر آئیں تو پرہیزگار رہیں کھانے پینے میں زندیق اور ممبر پر گویا صدیق،

(۱۰) جو شخص اہل فلاح کو نہیں دیکھتا وہ فلاح نہیں پاتا۔

(۱۱) مخلوق کے دروازے کو بند کرو اور اپنے اور خدا کے درمیان دروازے کھول لو۔

(۱۲) کھردرے اور موٹے کپڑے پہننے روکھا سوکھا کھانے میں شان نہیں ہے شان تیرے قلب کے زہد اختیار کرنے میں ہے سچا شخص پہلے اپنے باطن پر صوف پہنتا ہے اس کے بعد اس کا اثر ظاہر تک پہنچتا ہے۔

(۱۳) تنگ حالی کا مقابلہ کرو صبر سے اور خوشحالی کا شکر سے۔

(۱۴) قلب کی زندگی اس میں ہے کہ مخلوق (کے خیال) سے نکل جائے اور حق تعالیٰ کے ساتھ قائم ہو۔

(۱۵) افسوس ہے کہ تمہاری زبان مسلمان ہے مگر دل مسلمان نہیں، قول مسلمان ہے مگر فعل مسلمان نہیں۔

(۱۶) تمہارا علم تم کو پکار رہا ہے کہ میں تم پر حجت ہوں۔

(۱۷) اپنی آرزو کم کرو زہد پاؤ گے، کہ سارا زہد تمناؤں کا کم کرنا ہی ہے۔

(۱۸) بُرے ساتھیوں کو چھوڑ دو، ان کے تعلقات کو توڑ دو اور رشتہ اہلِ حق سے جوڑ دو۔

(۱۹) خالق کا شکوہ مخلوق سے مت کرو۔

(۲۰) اس دنیا کے سمندر سے ڈرو کہ بہتیری مخلوق اس میں ڈوب چکی ہے۔

(۲۱) اے مبتلائے مصیبت میں تجھکو دیکھتا ہوں کہ ہر مخلوق کو راضی کرتا ہے اور خالق کو ناراض، اپنی دنیا کی آبادی کے پیچھے اپنی آخرت کو ویران کرتا ہے۔

(۲۲) دنیا کے حاصل کرنے میں ایسے نہ ہو جاؤ کہ —— جیسے رات کے وقت لکڑیاں جمع کرنے والا کہ اسے خبر نہیں کہ اس کے ہاتھ میں کیا آتا ہے (یعنی لکڑی یا سانپ؟)

(۲۳) قناعت اختیار کرو کیونکہ قناعت کا خزانہ کبھی ختم نہ ہوگا۔

(۲۴) اے مسکین اپنے نفس پر رو، تیرا بچہ مرجاتا ہے تو تجھ پر قیامت قائم ہو جاتی ہے۔ اور تیرا دین مرجاتا ہے تو تجھ کو پرواہ نہیں ہوتی ہے اور نہ تو اس پر روتا ہے۔

(٢٥) افسوس کہ تو سانپوں کو کس طرح چھو رہا ہے اور الٹ پلٹ رہا ہے حالانکہ نہ تجھکو سانپ پکڑنے کا ہنر معلوم اور نہ تو نے تریاق کھایا۔ کیا یہ ڈر نہیں کہ زہر اثر کرے، تو خود اندھا ہے پھر لوگوں کی آنکھوں کا علاج کیونکر کرے گا۔ تو گونگا ہے پھر لوگوں کو تعلیم کس طرح دے گا۔ جاہل ہے پھر دین کیونکر درست کرے گا۔؟

(٢٦) اے غافلو، قبر اور موت کا اژدہا اپنا منہ کھولے ہوئے ہے شاہ قضا وقدر کا جلاد اپنے ہاتھ میں تلوار لئے ہوئے ہے صرف حکم کا منتظر ہے۔

(٢٧) صاحبو تم دنیا کے پیچھے دوڑ رہے ہو کہ وہ تم کو کچھ دے دے، اور دنیا اہل اللہ کے پیچھے دوڑ رہی ہے تاکہ ان کو کچھ دے دے، وہ ان کے سامنے سر جھکائے کھڑی رہتی ہے۔

(الفرقان بابت رمضان ١٣٧١ھ)

(ترجمہ از مولانا سید احمد قادری)

عورتوں کا ایمانی عہد نامہ

امام ربانی کا مکتوب ایک صالحہ کے نام

یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ اِذَا جَاءَکَ الْمُؤْمِنٰتُ یُبَایِعْنَکَ عَلٰی اَنْ لَّا یُشْرِکْنَ بِاللّٰہِ شَیْئًا وَّلَا یَسْرِقْنَ وَلَا یَزْنِیْنَ وَلَا یَقْتُلْنَ اَوْلَادَھُنَّ وَلَا یَاْتِیْنَ بِبُھْتَانٍ یَّفْتَرِیْنَہٗ بَیْنَ اَیْدِیْھِنَّ وَاَرْجُلِھِنَّ وَلَا یَعْصِیْنَکَ فِیْ مَعْرُوْفٍ فَبَایِعْھُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَھُنَّ اللّٰہَ، اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۔

اے نبی جب تیرے پاس مسلمان عورتیں آئیں بیعت کرنے کو اس بات پر کہ شریک نہ ٹھہرائیں اللہ کا کسی کو اور چوری نہ کریں اور بدکاری نہ کریں۔ اور اپنی اولاد کو نہ مار ڈالیں۔ اور طوفان نہ لائیں باندھ کر اپنے ہاتھوں اور پاؤں میں اور تیری نافرمانی نہ کریں کسی بھلے کام میں تو ان کو بیعت کر لے اور معافی مانگ ان کے واسطے اللہ سے بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

یہ آیت کریمہ فتح مکہ کے دن نازل ہوئی ہے۔ آنحضرت علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والسلام جب مردوں کی بیعت سے فارغ ہوئے تو عورتوں کی بیعت لینا شروع کی، آپ عورتوں سے بیعت صرف الفاظ میں لیتے تھے۔ دست مبارک عورتوں کے ہاتھ سے کبھی مس نہیں ہوا۔ عورتوں میں چونکہ بُرے اخلاق مردوں کی بہ نسبت زیادہ پائے جاتے ہیں، اس لیے ان کی بیعت میں خصوصیت کے ساتھ چند شرطیں بڑھائی گئی ہیں۔ آپ نے امر الٰہی کی تعمیل میں عورتوں کو بیعت کے وقت ان چیزوں سے

یہ بھی رائج ہے کہ جانوروں کو مشائخ کے نام پر نذر کرتے ہیں اور ان کی قبروں پر جاکر ان جانوروں کو ذبح کرتے ہیں۔ فقہ کی کتابوں میں اس عمل کو بھی شرک میں داخل کیا ہے اور پوری تاکید سے کیا ہے۔ فقہا نے اس ذبح کو ذبائح جن کی جنس سے سمجھا ہے (ذبائح جن وہ جانور ہیں جنھیں مشرکین جنوں کے نام پر ذبح کرتے تھے) اس لیے اس عمل سے بھی اجتناب کرنا چاہیے کہ اس میں شرک کا شائبہ ہے۔ نذر کے طریقے بہت ہیں۔ کیا ضرور ہے کہ کسی جانور کو ذبح کرنے کی نذر مانیں اور اس کو ذبائح جن کے ساتھ ملحق کریں۔ اور اپنے آپ کو عبدۃ جن (جنوں کے پجاریوں) کے ساتھ مشابہ کریں۔ یہی حال عورتوں کے ان روزوں کا ہے جو وہ پیروں اور بیبیوں کے نام پر رکھتی ہیں۔ اکثر ان ناموں کو انھوں نے خود تراشا ہے۔ اور انھیں ناموں پر اپنے روزوں کی نیت کرتی ہیں۔ اور افطار کے وقت ہر روزہ کے لیے خاص وضع متعین کرتی ہیں اور ان کے لیے مخصوص ایام کا تعین بھی کرتی ہیں۔ اپنے مطالب و مقاصد کو ان روزوں کے ساتھ جوڑتی ہیں اور ان کے توسل سے مقصد بر آری چاہتی ہیں۔ یہ عبادت میں شرک ہے اور اس طرح وہ غیر اللہ کی عبادت کے توسل سے اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ اس فعل کی قباحت پر اچھی طرح سوچنا چاہیے ــــ حدیث قدسی میں آیا ہے الصوم لی وانا اجزی بہ یعنی روزہ میرے لیے مخصوص ہے اور عبادتِ صوم میں میرے سوا کوئی شریک نہیں، ہر چند کہ کسی عبادت میں بھی غیر اللہ کی شرکت جائز نہیں۔ لیکن روزہ کی تخصیص محض اس اہتمام کے لیے ہے کہ اس عبادت میں نفی غیر کی نیت بہ تاکید کرنی چاہیے۔ بعض عورتیں اپنے ایجاد کردہ روزوں کے جواز میں یہ کہتی ہیں کہ ہم روزہ اللہ ہی کے لیے رکھتی ہیں صرف اس کا ثواب پیروں کی روحوں کو بخشتی ہیں۔ اگر وہ اپنے اس معاملہ میں سچی ہیں تو پھر روزوں کے لیے مخصوص ایام کی تعیین کیا کام ہے۔ اور پھر افطار میں مخصوص کھانوں اور مخصوص وضع و ہئیت کا التزام کیوں ہے، بسا اوقات دیکھا جاتا ہے کہ افطار کے وقت محرمات کا ارتکاب کرتی ہیں۔ بے ضرورت بھیک مانگتی ہیں اور اسی بھیک مانگی ہوئی چیز سے افطار کرتی ہیں۔ اور اپنی مقصد بر آری کو اسی امر محرم کے ارتکاب پر منحصر و موقوف سمجھتی ہیں۔ حقیقت میں یہ عین گمراہی اور شیطان کا فریب ہے۔

دوسری شرط عورتوں کی بیعت کے وقت یہ لگائی گئی ہے کہ وہ چوری نہ کریں۔ اس گناہ کبیرہ میں چونکہ اکثر عورتیں مبتلا ہوتی ہیں اس لیے مخصوص طور پر ان کو اس سے روکا گیا ہے۔ کم ایسی عورتیں ہوں گی جو اس برائی سے بالکل بچی ہوئی ہوں گی۔ جو عورتیں اپنے شوہروں کے اموال میں ان کی اجازت کے بغیر تصرف کرتی ہیں اور بے تحاشا خرچ کر کے مال کو ضائع کرتی ہیں وہ چوروں کے گروہ میں داخل ہیں۔ اور یہ گناہ ان کے اندر ثابت و متحقق ہے۔ یہ بات عام طور پر عورتوں میں پائی

جاتی ہے اور اس خیانت میں تقریباً تمام عورتیں مبتلا ہیں، کاش وہ اس بات کو برائی سمجھیں، اگرچہ حال یہ ہے کہ وہ اپنے اس تصرف بیجا کو حلال سمجھتی ہیں اور یہ نہایت خطرناک بات ہے، کیونکہ کسی ثابت شدہ برائی کو حلال سمجھنا کفر تک پہونچا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حکیم مطلق جل شانہ نے شرک کے بعد عورتوں کو چوری سے منع فرمایا۔ اپنے شوہروں کے اموال میں بیجا تصرف کرتے کرتے ان میں خیانت اور چوری جڑ پکڑ جاتی ہے اور پھر دوسروں کے اموال میں بھی چوری اور خیانت کرنے لگتی ہیں، دوسروں کے اموال کو بلا اجازت حاصل کر لینے کی برائی ان کے ذہن سے نکل جاتی ہے۔ اور چوری ان کی عادت میں داخل ہو جاتی ہے۔ ان تمام باتوں کے مشاہدے کے بعد یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ عورتوں کے لیے شرک کے بعد چوری کو کیوں اتنی اہمیت دی گئی۔ اموال میں سرقہ و خیانت کے سلسلہ میں یہاں ایک اور قسم کی چوری کا ذکر بھی مناسب ہے، ایک دن ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب سے پوچھا، بدترین قسم کا چور کون ہے؟ صحابہ نے عرض کیا کہ ہم نہیں جانتے۔ آپ نے فرمایا کہ بدترین قسم کا چور وہ ہے جو اپنی نماز میں چوری کرتا ہے۔ اور ارکان نماز کو تمام و کمال ادا نہیں کرتا اس لیے اس قسم کے چوری سے بھی بچنا ضروری ہے۔ تاکہ انسان بدترین قسم کے چوروں میں داخل نہ ہو۔ حضور قلب کے ساتھ نماز کی نیت کرنی چاہیے۔ کیونکہ نیت کے بغیر عمل صحیح نہیں ہوتا۔ پھر قرأت درست طریقے پر کرنی چاہیے۔ رکوع و سجود اطمینان کے ساتھ کرنا چاہیے۔ اسی طرح قومہ اور جلسہ بھی اطمینان سے بجالانا چاہیے یعنی رکوع سے اٹھنے کے بعد سیدھا کھڑا ہونا چاہیے۔ اور ایک بار سبحان اللہ کہنے کے انداز سے کھڑا رہنا چاہیے۔ جو شخص ایسا نہیں کرتا وہ اپنے کو چوروں کے گروہ میں داخل کرتا ہے۔

تیسری شرط عورتوں کی بیعت کے وقت یہ لگائی کہ وہ زنا نہ کریں۔ عورتوں کی بیعت میں خصوصیت کے ساتھ اس کبیرہ سے ممانعت کی وجہ بھی یہی ہے کہ اکثر اوقات زنا عورتوں کی رضا پر موقوف ہوتا ہے۔ نیز یہ کہ اکثر اوقات اس عمل بد کی علت یہ ہوتی ہے کہ عورتیں اپنے آپ کو مردوں کے سامنے پیش کرتی ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں زانیہ عورت کو زانی مرد پر اس آیت میں مقدم رکھا گیا ہے۔ الزانية والزاني فاجلدوا كل واحد منهما مأته جلدة۔ (زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والے مرد میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو)

یہ گناہ دنیا و آخرت میں انسان کو برباد کرنے والا اور تمام ادیان میں قبیح و منکر ہے۔ ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ نے آنحضرت علیہ و علی آلہ الصلوٰۃ والسلام سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا۔ اے

لوگو! زنا سے بچو کہ اس میں چھ برائیاں ہیں۔ تین دنیا میں اور تین آخرت میں۔ دنیا کی تین برائیاں یہ ہیں:-

(۱) زانی کے دل سے نورانیت اور اس کے چہرے سے رونق غائب ہو جاتی ہے (۲) اس سے فقر و افلاس آتا ہے (۳) عمر میں کمی ہوتی ہے۔ —— آخرت کی تین برائیاں یہ ہیں۔

(۱) اللہ کا غضب (۲) حساب کی سختی (۳) دوزخ کا عذاب۔

حدیث میں یہ بھی آیا ہے کہ آنکھوں کا زنا محرمات کو بُری نیت سے دیکھنا، ہاتھوں کا زنا محرمات کو بری نیت سے پکڑنا اور قدموں کا زنا محرمات کی طرف بری نیت سے جانا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ قل للمومنین یغضوا من ابصارھم و یحفظوا فروجھم ذلک ازکی لھم ان اللہ خبیر بما یصنعون وقل للمومنات یغضضن من ابصارھن و یحفظن فروجھن یعنی کہہ دے محمد مسلمانوں سے کہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور کہہ دو مسلمان عورتوں سے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔

جاننا چاہیے کہ دل آنکھوں کا تابع ہے۔ جب تک محرمات سے آنکھوں کو نہ بچایا جائے، دل کی حفاظت مشکل ہے اور جب دل گرفتار ہو جائے تو شرمگاہ کی حفاظت بہت مشکل ہے۔ لہٰذا آنکھوں کو بدنظری سے بچانا ضروری ہوا تاکہ شرمگاہ کی حفاظت ہو سکے اور دنیا و آخرت کے گھاٹے سے محفوظ رہے۔

قرآن میں اس کی بھی ممانعت آئی ہے کہ عورتیں اجنبی مردوں سے نرم و نازک گفتگو کریں، کیونکہ اس سے بدکار مردوں کے دل میں وسوسۂ زنا پیدا ہوتا ہے۔ اگر عورتوں کو اجنبی مردوں سے بضرورت گفتگو کرنی پڑے تو اس انداز سے بولنا چاہیے کہ ان کے دل میں اس قسم کا کوئی وسوسہ نہ پیدا ہو سکے۔ قرآن میں اس سے بھی روکا گیا ہے کہ عورتیں اپنی زینت کا اظہار غیر مردوں کے سامنے کریں اور ان کے دل میں خواہش پیدا کریں۔ اسی طرح عورتوں کو پازیب و خلخال پہن کر اس طرح زمین پر پاؤں مارنے سے بھی روکا گیا ہے کہ اس کی آواز پیدا ہو کیونکہ اس سے بھی ان کی طرف میلان پیدا ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ ہر وہ بات جو فسق اور گناہ کی طرف لے جائے زانی مرد قبیح اور ممنوع ہے۔ —— فکر کرنی چاہیے کہ حرام چیزوں کے مقدمات و مبادی سے بھی پرہیز کیا جائے تاکہ نفس محرمات سے سلامتی میسر ہو، یہ بات بھی پوشیدہ نہ رہنی چاہیے کہ ایک عورت کے لیے دوسری اجنبی عورت بھی اجنبی مرد ہی کے حکم میں ہے، ان باتوں میں جو اجنبی مرد سے ناجائز ہیں، مثلاً جس طرح عورت کے لیے اجنبی مرد کو شہوت سے دیکھنا یا چھونا ناجائز ہے اسی طرح عورت کو عورت کو بھی شہوت سے

اور چھوڑنا جائز ہے۔ اس بات کی بڑی نگہداشت کرنی چاہیے کیونکہ عورت کا مرد تک پہونچنا اختلاف صنف کی وجہ سے مشکل ہے، بہتیرے موانع درمیان میں ہوتے ہیں لیکن عورت کا عورت تک پہونچنا اتحاد صنف کی وجہ سے نہایت آسان ہے۔ اس لیے یہاں زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے اور اس نفسِ تبلیغ سے بچانے کے لیے بڑی تاکید و تبلیغ کرنی چاہیے۔

چوتھی شرط عورتوں کی بیعت کے وقت یہ لگائی گئی کہ اولاد کو قتل نہ کریں، فقر و احتیاج سے ڈر کر بچوں کو مار ڈالنا۔ صرف یہ کہ قتل ناحق ہے بلکہ قطع رحم کے گناہ کو بھی متضمن ہے اس لیے اس ایک کبیرہ میں دو کبائر کا ارتکاب ہے۔

پانچویں شرط عورتوں کی بیعت کے وقت یہ لگائی گئی کہ وہ افترا اور بہتان نہ باندھیں۔ یہ وصف عورتوں میں بہت پایا جاتا ہے اس لیے خصوصیت سے منع کیا گیا۔ یہ صفت بہت بری صفتوں میں سے ایک ہے۔ یہ جھوٹ ہے اور جھوٹ تمام ادیان میں حرام — اور قبیح ہے۔ اس میں ایذائے مومن بھی ہے اور مسلمان کو اذیت پہنچانا حرام ہے نیز اس میں فساد فی الارض بھی ہے جو بہ نص قرآنی ممنوع و قبیح ہے۔

آخر میں چھٹے نمبر پر ایک جامع شرط یہ لگائی گئی کہ وہ معروف و خیر میں پیغمبر کی نافرمانی نہ کریں۔ یہ شرط تمام اوامر شرعیہ کے امتثال اور تمام نواہی شرعیہ سے اجتناب پر مشتمل ہے۔

نماز پنجگانہ اپنے وقت پر پوری خوش دلی شوق کے ساتھ ادا کرنی چاہیے۔ مال کی زکوٰۃ مصارف زکوٰۃ میں بہ رغبت تمام صرف کرنی چاہیے۔ رمضان کا روزہ جو سال بھر کے چھوٹے گناہوں کا کفارہ ہے پوری احتیاط سے رکھنا چاہیے۔ حج بیت اللہ جس کی شان میں حضور نے فرمایا ہے کہ حج گزشتہ گناہوں کو ختم کر دیتا ہے، ادا کرنا چاہیے۔ اسی طرح ورع و تقویٰ سے بھی چارہ نہیں ہے کہ حضرت پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے ملاک دینکم الورع یعنی تمہارے دین کو قائم رکھنے والا ورع ہے۔ ورع نواہیات شرعیہ کو ترک کرنے کا نام ہے — نشہ آور چیزوں کے استعمال سے پرہیز کرنا چاہیے، اور نشہ آور چیز کو شراب کی طرح سمجھنا چاہیے غنا (گانے) سے بھی پرہیز کرنا چاہیے کیونکہ غنا لہو و لعب میں داخل ہے اور لہو و لعب حرام ہے۔ حدیث میں آیا ہے الغناء رقیۃ الزنا یعنی غنا زنا کا منتر ہے۔ چغل خوری اور غیبت سے بھی پرہیز لازم ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ مسخرہ پن کرنا اور ان کو اذیت دینا سخت ممنوع و حرام ہے۔ ان سے اجتناب ضروری ہے۔

بدفالی کا اعتبار نہ کرنا چاہیے اور نہ یہ خیال کرنا چاہیے کہ ایک کا مرض دوسرے کو لگ جاتا

ہے' مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں سے منع فرمایا ہے لاطیرۃ ولاعدوی یعنی بدفالی کوئی شے نہیں ہے اور نہ ایک کا مرض دوسرے کو لگتا ہے' کاہنوں اور نجومیوں کا اعتبار نہ کرنا چاہیے۔ نہ ان سے غیب کی باتیں پوچھنا چاہیے اور نہ یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ غیب کی باتیں جانتے ہیں' کیونکہ شریعت میں بڑی تاکید کے ساتھ اس سے روکا گیا ہے۔ نہ خود جادو کرنا چاہیے نہ کسی ساحر سے جادو کرانا چاہیے۔ ایسا ہے کہ یہ حرام قطعی ہے۔ اور کفر تک پہونچانے والی چیز ہے۔ کوئی گناہ کفر سے اتنا قریب نہیں ہے جتنا جادو اور سحر' حدیث میں آیا ہے کہ جب تک ایمان دل سے نکل نہ جائے سحر کا فعل وجود میں نہیں آتا گویا سحر اور ایمان ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ خلاصہ یہ کہ جو کچھ مخبر صادق علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے اور جسے علماء نے کتب شرعیہ میں بیان فرمایا ہے' دل وجان سے اس کو بجالانے میں سعی کرنی چاہیے اور اس کی مخالفت کو زہر قاتل سمجھنا چاہیے۔

جب بیعت کرنے والی عورتوں نے ان تمام شرائط کو قبول کر لیا تو آنحضرت نے ان کی بیعت قبول کر لی اور امر الٰہی کے مطابق ان کے لیے مغفرت کی دعا فرمائی۔ امر الٰہی سے جو استغفار آپ نے کسی جماعت کے لیے کیا اس کے متعلق پوری امید ہے کہ قبول ہو اور وہ جماعت مغفور ہو' ہندہ' ابو سفیان کی بیوی بھی اس بیعت میں داخل تھیں۔ بلکہ اس وقت ان عورتوں کی سرگروہ وہی تھیں اور سب کی نمائندگی کر رہی تھیں اس بیعت و استغفار سے ان کے حق میں بھی بڑی امید ہے' ان عورتوں کے بعد اب بھی جو عورتیں ان شرائط کو قبول کریں اور ان کے مقتضا کے مطابق عمل کریں وہ حکماً اس بیعت میں داخل ہوں گی اور استغفار کی برکت ان کی امید وار۔ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے مایفعل اللہ بعذابکم ان شکرتم وآمنتم یعنی اللہ تعالیٰ کیوں تم پر عذاب کرے اگر تم اس کا شکر ادا کرو۔ اور ایمان درست کرو۔ اللہ کا شکر بجالانے کا مطلب یہ ہے کہ انسان احکام شرعیہ کو قبول کرے اور ان کے مقتضا پر عمل کرے۔ طریق نجات اور رستگاری کی راہ صاحب شریعت علیہ السلام کی پیروی ہے۔ اعتقاد میں بھی اور عمل میں بھی۔ استاد اور پیر اس لیے ہیں کہ شریعت کی طرف رہنمائی کریں' اور ان کی برکت سے شریعت پر اعتقاد اور عمل میں سہولت ہو۔ نہ یہ کہ مرید جو جی چاہیں وہ کریں' جو چاہیں وہ کھائیں پیران کی ڈھال بن جائیں گے اور عذاب سے بچالیں گے' یہ تمنائے محض ہے' قیامت میں بے اجازت کوئی سفارش نہ کر سکے گا اور جب تک عمل پسندیدہ نہ ہو کوئی سفارش کرے گا بھی نہیں' اور عمل اسی وقت پسندیدہ ہوگا جب شریعت کے مقتضا کے مطابق کیا جائے' اور اگر بشریت کی بنا پر کوئی لغزش ہو گئی ہو تو شفاعت سے اس کا تدارک ممکن ہو۔ واللہ سبحانہ الموفق۔ (مکتوب ۴۱ ج ۳)

(الفرقان' صفر ۱۳۷۴ھ)

مَردانِ حق

مولانا محمد اویس ندوی نگرامی

تھوڑی دیر اہلِ حق کے ساتھ

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں دفترِ پارینہ را

(۱)

دل بیٹھے جا رہے ہیں، اہل دل سہمے جا رہے ہیں کہ آج مدینہ کے دار الامارۃ میں امام دار الہجرۃ حضرت مالک بن انس کو کوڑے لگائے جا رہے ہیں ـــــ امام کا فتویٰ ہے کہ خلافت نفس ذکیہ کا حق ہے منصور نے جبراً بیعت لی ہے اور جبر کا شرع میں کوئی اعتبار نہیں ہے۔ حدیث میں ہے کہ اگر کسی سے جبراً طلاق دلائی جائے تو واقع نہ ہوگی [1]

منصور کے عمال چاہتے ہیں کہ امام طلاق جبری کے عدم اعتبار کا فتویٰ نہ دیں مبادا لوگ بیعت جبری کا انکار نہ کر بیٹھیں۔ مگر یہ ممکن کیسے تھا امام کے نزدیک مسئلہ یوں ہی ثابت تھا وہ اس کے خلاف کیسے فتویٰ دیتے۔ حکم ہوا کہ ستر کوڑے لگائے جائیں۔

اللہ، اللہ، کیسا عبرت خیز سماں ہے وہ مالک بن انس جو مدینہ کی گلیوں میں کبھی گھوڑے اور خچر پر اسلئے سوار نہیں ہوتے کہ جو سرزمین قدوم نبوی (صلے اللہ علیہ وسلم) سے مشرف ہوئی ہے اس کو میں جانور کے سموں سے کیسے روندوں؟ آج انھیں کے جسم مبارک پر کوڑے پڑ رہے ہیں۔ تمام جسم خون آلود ہو گیا ہے۔ اور دونوں ہاتھوں کے مونڈھے اتر گئے ہیں، حکم ہوا کہ ان کو باندھ کر

---

[1] فقہ مالکیہ میں طلاق جبری واقع نہیں ہوتی۔ حنفیہ کے یہاں طلاق مکرہ واقع ہو جائے گی اس کے لیے حنفیہ کے پاس دلائل ہیں جن کے ذکر کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔

اونٹ پر بٹھا کر ان کی تشہیر کرو، امام مالک کی مدینہ میں تشہیر ہو رہی تھی (یعنی مجرموں کی طرح باندھ کے ان کو اونٹ پہ بٹھا کے مدینہ میں گھمایا جا رہا تھا) اور انکی زبان حقیقت ترجمان سے مسلسل یہ الفاظ ادا ہو رہے تھے:

من عرفنی فقد عرفنی ومن لا یعرفنی فانا مالک ابن انس اقول طلاق المکرہ لیس بشیٔ۔

جو مجھ کو جانتے ہیں وہ تو جانتے ہی ہیں، جو نہیں جانتے ہیں وہ جان لیں کہ میں مالک ابن انس ہوں فتویٰ دیتا ہوں کہ طلاق جبری کچھ نہیں، اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

(۲)

بغداد کا ایوان خلافت درباریوں سے بھرا ہے خلیفہ معتصم اپنے پورے شان و شکوہ کے ساتھ تخت خلافت پر جلوہ افروز ہے۔ امام اہل السنۃ والجماعۃ حضرت احمد بن حنبلؒ پا بہ زنجیر کھڑے ہیں بیڑیاں اتنی بوجھل ہیں کہ پیروں میں حرکت نہیں ہو سکتی ہے۔ خلیفہ اور معتزلی علماء امام سے خلق قرآن کی تائید چاہتے ہیں لیکن امام باآواز بلند فرماتے ہیں:۔

أعطونی شیئاً من کتاب اللہ وسنۃ رسولہ حتیٰ اقول۔

اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت میں سے کچھ میرے سامنے لاؤ تاکہ میں اسی کے مطابق کہوں۔

امام ربانی کی حق پرستی سے خلیفہ کا دل نرم ہوتا ہے اور کہتا ہے:۔

اے احمد میرے مسلک کی تائید کرو، تمہیں اپنا مقرب خاص بناؤں گا پھر تم کو اس قیمتی فرش پر چلنے کا فخر حاصل ہوگا۔

جواب میں پھر ارشاد ہوا۔

میرے سامنے اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت میں سے کچھ لاؤ تاکہ میں اسی کے مطابق کہوں حکم ہوا کہ احمد کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دی جائیں، درّے لگانے والے بلائے گئے اور امام کے ہاتھ باندھ دیئے گئے، اتمام حجت کے لیے ایک بار زبان حق کھلتی ہے اور یوں گویا ہوتی ہے کہ

"اے امیر المومنین قیامت کے دن کو یاد کیجئے جب کہ آپ منتقم حقیقی کے دربار میں کھڑے ہوں گے ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ اس وقت میں آپ کے سامنے ہوں، پھر آپ میرے اس خون کا کیا جواب دیں گے؟ متعصفین نے دیکھا کہ معتصم ان الفاظ سے متاثر ہو رہا ہے، چیخ اٹھے کہ اے امیر المومنین یہ شخص گمراہ ہے (نعوذ باللہ) اس کو ہرگز نہ چھوڑا جائے، انجام کار کوڑے پڑنا شروع ہو گئے۔ پہلا کوڑا پڑا تو امام نے فرمایا، بسم اللہ۔ دوسرے پر فرمایا لاحول ولا قوۃ الا باللہ، تیسرے پر فرمایا "القرآن کلام اللہ غیر مخلوق" (قرآن اللہ

کا کلام ہے غیر مخلوق ہے) چوتھے پر ارشاد فرمایا قل لن یصیبنا الا ما کتب اللہ لنا، (کہہ دیجئے گا کہ ہم کو ہرگز نہ پہنچے گی کوئی چیز (تکلیف یا مصیبت) لیکن وہ جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ دی ہے۔ شدت الم سے امام بے ہوش ہو گئے، تھوڑی دیر کے لیے کوڑے روک دیے گئے، جب ہوش آیا تو خلیفہ نے پھر کہا کہ میری بات مان لیجئے میں رہا کردوں! امام نے اس کا کوئی جواب نہ دیا اور پھر کوڑے پڑنا شروع ہو گئے۔ متعدد بار ایسا ہی ہوا۔ امام جب بیہوش ہو جاتے تو کوڑے روک دیئے جاتے جب ہوش آتا تو خلیفہ پھر درخواست کرتا مگر حق و استقامت کا یہ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹلنے کا نام نہ لیتا۔ جب آخری بار ہوش آیا تو اپنے کو معتصم کی قید و بند سے آزاد پایا۔ گھر لائے گئے ستو پیش کیا گیا مگر روزہ سے تھے اس لیے نوش نہیں فرمایا۔ ظہر کا وقت آیا تو تکلیف کی شدت کے باوجود جماعت سے نماز ادا فرمائی۔

(۳)

آج عروس البلاد بغداد کی زینت و آرائش کی کوئی حد نہیں، خلیفہ ہارون رشید تخت خلافت پر متمکن ہوئے ہیں، ہر مجلس مجلس عشرت و طرب، ہر محفل محفل لطف و مسرت، ہر جا نغمۂ عیش و نشاط، ہر سمت منظر فرحت و انبساط، کہیں علماء و فقہاء کا مجمع کہیں نامی گرامی شعراء کا اجتماع، انعام و اکرام کی بارش ہو رہی ہے، خزانۂ شاہی کے دروازے کھلے ہوئے ہیں اعزاز و مناصب کی تقسیم ہو رہی ہے لیکن کس قدر تعجب کا مقام ہے کہ حضرت سفیان ثوریؒ جن سے خلیفہ کو دلی عقیدت ہے اس جشن مسرت میں شریک نہیں ہیں خود ہارون رشید کو بھی حیرت ہے جس کا اظہار وہ اپنے خط میں یوں کرتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ کے بندے ہارون الرشید امیر المومنین کی طرف سے اپنے دینی بھائی سفیان سعید الثوری کی جانب!۔

میرے بھائی آپ کو معلوم ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے مسلمانوں کے درمیان بھائی چارہ قائم فرمایا ہے، مجھ کو بھی محض اللہ کے واسطے آپ سے محبت اور قلبی تعلق ہے اگر خلافت کا طوق میری گردن میں نہ ہوتا تو اپنی محبت و اخلاص کے باعث خود حاضر خدمت ہوتا، کوئی ایسا نہیں ہے جس نے اس موقع پر مجھے اس منصب جلیل کی مبارکباد نہ دی ہو، میں نے خزانوں کے دروازے کھول دیے ہیں، گرانقدر عطیات اور عظیم الشان بخششوں کی وجہ سے میری آنکھوں کو نور اور دل کو سرور حاصل ہو رہا ہے! ان تمام باتوں کے باوجود آپ ابتک میرے پاس تشریف نہیں لائے ہیں اور میں نہایت شوق سے یہ عریضہ خدمت اقدس میں بھیج رہا ہوں۔ اے ابو عبداللہ آپ کو مومن کی زیارت اور اس کی ملاقات کے فضائل بخو

معلوم ہیں اس لیے یہ خط دیکھتے ہی تشریف لائیے اور عجلت فرمائیے۔

ہارون الرشید نے عباد طالقانی کو یہ خط دیا اور حکم دیا کہ حضرت سفیان ثوری کی خدمت میں لے جائیں، عباد کہتے ہیں کہ میں خط لیکر کوفہ پہنچا اور حضرت موصوف کی خدمت میں پیش کیا حضرت سفیان ثوری نے خط اہلِ مجلس کے سامنے ڈال دیا اور فرمایا کہ میں اللہ سے پناہ مانگتا ہوں کہ اپنے ہاتھ ایسی چیز میں لگاؤں جس میں ظالموں کا ہاتھ لگا ہو۔ حضرت کے حکم سے بعض اہلِ مجلس نے خط پڑھنا شروع کیا پورا خط سننے کے بعد حضرت سفیان ثوری نے ارشاد فرمایا کہ اسی خط کی پشت پر ظالم کو جواب لکھو، لوگوں نے عرض کیا کہ اے ابو عبید اللہ خلیفہ کا معاملہ ہے اگر خط کا جواب اچھے اور صاف خط پر دیا جائے تو بہتر ہے۔ ارشاد فرمایا کہ نہیں اسی خط کی پشت پر جواب لکھو یہ خط اگر کسب حلال سے ہے تو ہارون الرشید کو اس کا عوض ملے گا ورنہ وہ اسی کے ساتھ ڈالا جائے گا، میرے یہاں ایسی کوئی چیز نہ رہے جس کو ظالم کے ہاتھ نے مس کیا ہو کہ مبادا وہ ہمارے دین کو خراب کر دے، عرض کیا گیا کہ جواب میں کیا لکھا جائے فرمایا کہ لکھو۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اللہ کے بندے سفیان کی جانب سے ہارون الرشید کی طرف، جو امیدوں اور آرزؤں کے فریب میں مبتلا ہے جس کی ایمانی حلاوت سلب کر لی گئی ہے جو تلاوت قرآن کی لذت سے محروم ہے، میں تم کو صاف لکھ رہا ہوں کہ میں نے تم سے محبت کا رشتہ توڑ دیا۔ میرے اور تمہارے تعلقات ختم ہو گئے تم نے میرے نام جو خط بھیجا ہے اس میں اقرار کیا ہے کہ مسلمانوں کے بیت المال سے تم بیجا اور غیر صحیح مصارف کر رہے ہو، گویا تم یہ لکھ کر اپنے اس فعل پر خود شاہد ہو گئے ہو۔ جن کے سامنے تمہارا خط پڑھا گیا ہے اور ہم لوگ کل اللہ کی بارگاہ میں اس کی شہادت دیں گے۔

اے ہارون، تم نے مسلمانوں کے مال پر حملہ کر رکھا ہے کیا تمہارے اس فعل سے مجاہدین فی سبیل اللہ اور مسافرین راضی ہیں؟ کیا تمہارا یہ فعل اہل علم کے نزدیک پسندیدہ ہے، کیا بیوہ عورتیں اور یتیم بچے اس سے راضی ہیں؟ کیا تمہاری رعایا کو اس سے مسرت ہے؟ اے ہارون اپنے ہاتھ کو روکو کل اللہ کے یہاں جواب دہی کے لیے تیار رہو، یقین کرو کہ تم کو ایک عادل اور حکیم کے دربار میں میں کھڑا ہونا ہے۔ اپنے معاملہ میں اللہ سے ڈرو، کیونکہ ایمان اور زہد کی صورت تم سے سلب کر لی گئی ہے تلاوت قرآن مجید کی لذت اور صلحاء کی ہم نشینی کے شرف سے تم محروم ہو گئے ہو اور تم نے اپنے لیے ظالم اور ظالموں کا سرگروہ بننا پسند کر لیا ہے۔

اے ہارون تم تخت شاہی پر بیٹھے ہوئے حریر و دیبا کے استعمال میں مصروف ہو اور دروازہ پر تم نے پردے ڈال رکھے ہیں، ظالم سپاہ تمہارے قصر معلّی کے سامنے کھڑی رہتی ہے، یہ لوگوں پر ظلم کرتی ہے۔ اس کا انصاف نہیں ہوتا ہے، دوسروں پر شراب کی حد جاری کرتے ہیں لیکن خود شراب خوار ہیں، زانی کو سزا دیتے ہیں لیکن خود زانی ہیں، چوروں کے ہاتھ کاٹتے ہیں لیکن خود چور ہیں، قاتل کو سزائے موت کا حکم سناتے ہیں لیکن خود قتل کرنے میں بے باک ہیں کیا یہ احکام تم پر اور تمہاری سپاہ پر ضروری نہیں ہیں قبل اس کے کہ وہ دوسروں پر جاری کیے جائیں؟

اے ہارون اس دن تمہارا کیا حشر ہوگا جب پکارنے والا پکارے گا کہ ظالمین اور ان کے اعوان و انصار کو جمع کرو، پھر تم مع اپنی پوری جماعت کے بارگاہ ایزدی میں جمع کیے جاؤ گے اور تم ان سب کے امام ہوگے!

اے ہارون رشید میری نصیحت پر عمل کرو۔ اپنی رعایا کے بارہ میں اللہ سے ڈرو اور اس پر غور کرو کہ جناب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا اپنی امت کے متعلق کیا حال تھا؟ اے ہارون جس طرح خلافت تم کو ملی ہے۔ اسی طرح تم سے کسی دوسرے کو ملیگی، دنیا کا یہی رنگ ہے پس کچھ لوگ تو وہ ہیں جو (اس سلسلہ میں) اپنے لیے نفع آخرت کا سامان کرتے ہیں اور کچھ لوگ وہ ہیں جن کی دنیا و آخرت دونوں تباہ ہیں اب تم آئندہ مجھے کوئی خط نہ لکھنا اس لیے کہ میں جواب نہ دوں گا۔

عباد طالقانی کہتے ہیں کہ حضرت سفیان ثوری کے نصیحت بھرے الفاظ مجھ پر اثر کر چکے تھے، میں خط لیکر کوفہ کے بازار آیا اور پکار کر کہا، کیا کوئی ایک اللہ کی طرف بھاگنے والے کا خریدار ہے؟ لوگ درہم و دینار لیکر دوڑے، میں نے کہا درہم و دینار نہیں ایک صوف کا جبہ چاہیئے، وہ لایا گیا میں نے اپنا امیرانہ لباس اتار کر اسی جبہ کو پہنا اور خلیفہ ہارون الرشید کے دربار میں پہنچا، پہلے تو دربان نے میرا مذاق اڑایا، پھر مجھے شرف باریابی حاصل ہوا، ہارون نے جب مجھے اس رنگ میں دیکھا تو کھڑا ہو گیا اور پھر بیٹھ گیا اپنا سر پیٹنے لگا کہ افسوس میں نامراد ہی رہا، اور قاصد بامراد ہو گیا پھر اس نے خط پڑھنا شروع کر دیا اور آنسو اس کے چہرہ پر جاری تھے۔

بعض مصاحبین نے عرض کیا کہ امیر المومنین سفیان نے آپ کے مقابلہ میں بڑے بیباکی سے کام لیا ہے انھیں پابہ زنجیر قید خانہ میں ڈال دیا جائے۔ ہارون الرشید نے کہا اے بندگان دنیا سفیان کو ان کے حال پر چھوڑ دو بیشک وہ شخص بدبخت ہے، جس کے تم ہم نشین ہو، یقیناً سفیان ایک

مرد متقی ہے!

عباد کہتے ہیں کہ ہارون الرشید نے اس روز سے معمول کر لیا کہ نماز پنجگانہ کے بعد اس خط کو پڑھتا اور خوب روتا۔

(۴)

۲۰ ذی قعدہ ۷۲۸ھ آج قلعۂ دمشق کا ایک قیدی قید حیات سے آزاد ہو گیا ہے کہتے ہیں کہ جب سانس نے آخری ہچکی لی تو اس کی زبان پر یہ آیت تھی۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ

یہ قیدی کہا کرتا کہ قید میری خلوت ہے، قتل میری شہادت ہے اور جلاوطنی میری سیاحت ہے، مقید وہ ہے جو اپنی خواہشات کا مقید ہے اور محبوس وہ ہے جس کا قلب خدا کی جانب سے بند ہے۔

اس قیدی کا نام شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ ہے، بلاشبہ علماء کی ایک جماعت نے ابن تیمیہؒ پر سخت تنقید کی ہے خود ان کے مؤیدین اور ان کے کمال کے معترفین نے بھی ان کے بعض تفردات سے اختلاف بلکہ اپنی برأت تک کا اظہار کیا ہے، مگر ان کے ولولۂ حق اور حمایت دین کے جوش کا سب کو اقرار ہے ان کو ایک سلسلہ میں زنداں خانہ جانا پڑا، وہاں دیکھا کہ سب قیدی خدا سے غافل ہیں آخرت سے بے پروا ہیں، لہو و لعب میں مبتلا ہیں، شیخ نے ان سب کو نصیحت کی، ان سے توبہ کرائی، عقائد کی تصحیح کی، جو کل تک چور اور ڈاکو تھے ان کی پیشانیاں سجدوں کے آثار سے چمک اٹھیں اور زبانیں ذکر الٰہی سے تر ہو گئیں۔

ایک مرتبہ شیخ الاسلام کی قازان سے ملاقات ہوئی قازان اور بہت سے تاتاری دائرۂ اسلام میں داخل ہو چکے تھے مگر اخلاق و اعمال میں کوئی تغیر نہیں ہوا تھا، ابن تیمیہؒ نے انتہائی بیباکی سے نصیحت کی، لوگوں کا خیال تھا کہ قازان اب قتل کا حکم دینا ہی چاہتا ہے مگر اس پر حق کی ہیبت طاری ہو چکی تھی زبان کھلی تو ان الفاظ پر کہ

میرے لیے دعا فرمائیے۔

اب ذرا سنئے کہ شیخ الاسلام نے کیا دعا شروع کی! ہاتھ اٹھائے اور عرض کیا خداوندا اگر قازان خدا اور رسول کے لیے لڑ رہا ہے تو اس کی مدد کر اور اگر مال و دولت اور سلطنت کی خواہش کے لیے لڑ رہا ہے تو اس کو اپنی مدد سے محروم رکھ۔ لوگوں نے دیکھا کہ قازان ہاتھ اٹھائے ہوئے ہر فقرہ پر 'آمین' آمین کہہ رہا تھا۔ (باقی مضمون ص۹۴ پر ملاحظہ ہو)

حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم

ایک درویش اپنے آخری وقت میں

حضرت شاہ شرف الدین منیری قدس سرہ کے وصال کا قلمی مرقع

ہندوستان کے صوبوں میں ایک صوبہ بہار بھی ہے، لیکن جیسے کابل، ملک کے نام کے ساتھ اسی ملک کی ایک آبادی کا بھی نام ہے، اسی طرح بہار کے صوبہ میں بھی ایک آبادی اس وقت تک "بہار" کے نام سے پائی جاتی ہے، جو اسلام اور قبل اسلام دونوں زمانوں میں اپنی ایک خاص تاریخ رکھتی ہے اب وہ چند ہزار کی ایک معمولی آبادی ہے۔ فقیر کے کھفی گوشہ گیلانی سے بجانب مغرب پانچ کوس کے فاصلہ پر یہ آبادی واقع ہے۔ انگریزی عہد میں اس علاقہ کا سب ڈویزن اسی قصبہ کو قرار دیا گیا تھا۔ اس کے نام بہار کے ساتھ شریف کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے، ڈاک خانہ کی مُہر میں بھی "بہار شریف" ہی کا ٹھپہ انگریزی عہد ہی میں منظور کر لیا گیا تھا۔

جس ذات شرافت سمات کے انتساب نے بہار شریف کے اس قصبہ کو شریف بنا دیا۔ یہ ان ہی کا آخری وداعی نظارہ ہے۔ حضرت مخدوم الملک شاہ شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری قدس اللہ سرہٗ کے نام سے آپ مشہور ہیں، ہندوستان کے اساطین صوفیہ میں شمار ہوتے ہیں، مکاتیب کے نام سے دین کے مختلف عنوانوں پر مقالہ نگاری کی ابتداء جہاں تک میری تحقیق ہے آپ ہی نے کی — ان مقالات طیبہ کے مختلف مجموعے مکتوبات یک صدی و سہ صدی کے نام سے عام طور پر اہل ذوق و مطالعہ میں متداول ہیں۔ اور بھی بہت کتابوں کے مصنف ہیں۔ فارسی نثر نگاری میں ہندوستان کی سرزمین شاید ہی ان کی نظیر پیش کر سکتی ہے۔

بہرحال کہنا یہ ہے کہ ایک سو اکیس سال کی طویل عمر حضرت مخدوم کی سلطان نصیر الدین محمود کے

عہد سے فیروز تغلق کے عہد تک گذری۔ اس طویل عرصہ میں مسلسل گیارہ بادشاہوں کے بیسیوں سیاسی جھونکوں سے ملک کو گزرنا پڑا۔ بڑے بڑے انقلابات ہوئے، حکومت کے خانوادوں پر خانوادے بدلتے چلے گئے۔ لیکن اللہ کا یہ راستباز بندہ بہار کے ایک گوشہ میں بیٹھا ہوا کچھ تو کتابیں لکھتا رہا اور کتابوں سے زیادہ زندہ انسانیت کے غلط مسودات کی کاٹ چھانٹ، اصلاح و ترمیم میں یکسوئی کے ساتھ مشغول رہا۔ تا آنکہ ایک سو اکیس سال کے بعد وہی "ناگزیر وقت" انک میت و انھم میتون کا اس کے سامنے بھی آہی گیا۔ خدام خاص میں زین بدر عربی ایک صاحب تھے، ناگزیر گھڑی جس وقت گزر رہی تھی، وہ بھی موجود تھے۔ ان کی آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی تھیں، کان جو کچھ سن رہے تھے، دل ان کا جو کچھ پا رہا تھا۔ سب ہی کو انہی زین بدر عربی نے قلم بند کرا لیا تھا جو الحمد للہ اس وقت تک کہیں نہ کہیں مل ہی جاتا ہے۔ اسی کی تلخیص مخدوم الملک بہار رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح عمری "سیرۃ الشرف"[1] نامی سے نقل کر رہا ہوں۔

مخدوم الملک بہار رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ۶ شوال ۷۸۲ھ میں نماز عشاء کے وقت ہوئی — چہار شنبہ کا دن گزر چکا تھا، پنجشنبہ کی رات تھی۔ زین بدر عربی نے لکھا ہے کہ چہار شنبہ کی صبح کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد تکیہ لگا کر حجرہ میں گدے پر تشریف فرما تھے۔ کچھ لوگ حاضر تھے کہ آپ نے لاحول ولا قوۃ الا باللہ کا ورد خود شروع کیا، اور جو موجود تھے ان سے اسی "کنز من کنوز الجنۃ" کے دہرانے کی فرمائش کی، پڑھتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے "ملعون! اس وقت مجھے پھسلانا چاہتا ہے، ہرگز نہیں اور تیری طرف تھوکتا ہوں"۔ مگر اس کے بعد الحمد للہ الحمد للہ، المنۃ للہ المنۃ للہ، کا ورد بآواز بلند شروع کیا تھا۔ [illegible] کے متعلق تشفی و تسلی کے کلمات کے بعد قرآنی آیت

لا تقنطوا من رحمۃ اللہ	نہ مایوس ہونا اللہ کی رحمت سے، بلاشبہ
ان اللہ یغفر الذنوب جمیعاً۔	تمام گناہوں کو وہ بخش دیتا ہے۔

---

[1] مرحومہ سلطان جہاں بیگم والیہ بھوپال کے پرائیویٹ سکریٹری مولوی ضمیر الدین بہاری مرحوم نے مدت ہوئی یہ کتاب مرتب کی تھی، فارسی و عربی کے سوا وہ انگریزی زبان سے بھی واقف تھے، حسن عقیدت کے ساتھ ساتھ جدید [illegible] خیالات سے متاثر ہونے کی وجہ سے کسی "مذہبی صوفی" کی عصری قالب میں شاید یہ پہلی سوانح عمری لکھی گئی تھی۔ آج سے باون سال پہلے ۱۹۰۱ء میں کتاب طبع ہوئی تھی، افسوس ہے کہ اب نہیں ملتی، کاش! کسی ناشر کو اس کتاب کی اشاعت جدید کی توفیق ہو۔ پڑھنے کی کتاب ہے۔ ۱۲

کی تلاوت میں مشغول ہوئے، کبھی کبھی اس کے ساتھ فارسی کا یہ شعر بھی زبان مبارک پر جاری ہو جاتا

خدایا رحمتت دریائے عام ست
از آنجا قطرۂ مارا تمام ست

اس سلسلہ میں کبھی کبھی یہ فقرہ بھی نکل جاتا۔

ما ہماں دیوانہ ایم
ما ہماں دیوانہ ایم

ہم وہی دیوانے ہیں، ہم وہی دیوانے ہیں۔

حاضرین سے خطاب کر کے پوچھا گیا، تم سے اگر دریافت کیا گیا تو کیا کہو گے؟
جواب خود ہی یہ بتاتے لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللهِ، إِنَّ اللهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا
بس یہی لایا ہوں، یہی اپنے ساتھ بھی لیے جا رہا ہوں، اچانک آواز آنے لگی

أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ

میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ و معبود نہیں ہے وہ ایک ہی ہے۔ اس کا کوئی ساجھی نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔

اسی کو دہراتے ہوئے سنا گیا کہ فرماتے ہیں:۔

رضیت باللہ ربّاً، وبالاسلام دیناً، وبمحمد علیہ السلام نبیّاً وبالقرآن اماماً وبالکعبۃ قبلۃ۔

میں خوش ہوں، اللہ کو رب، اسلام کو دین، محمد علیہ السلام کو نبی، قرآن کو پیشوا و امام، کعبہ کو قبلہ بنا کر۔

اسی کے ساتھ یہ اضافہ بھی سننے والوں کے کانوں تک پہونچا۔

وبالمومنین اخواناً وبالجنّۃ ثواباً وبالنار عقاباً۔

یعنی خوش ہوں ایمان والوں کو بھائی بنا کر، جنت کو ثواب اور جہنم کو سزا مان کر۔

آنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا، مولانا آمونی نامی کوئی بزرگ تھے۔ جب وہ سامنے آئے تو مخدوم الملک بہار نے ان کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر سینہ مبارک پہ ملتے ہوئے فرمایا تم نے میری بڑی خدمت کی
خاطر جمع رکھو، ہم سب ایک ہی جگہ ہوں گے،

اور فرمایا کہ

کل تم سے پوچھا جائے گا کہ تم کیا لائے؟

جواب میں پھر وہی لکھایا۔ لاتقنطوا من رحمۃ اللہ ان اللہ یغفر الذنوب جمیعاً۔

فرماتے تھے۔ "مجھ سے بھی پوچھا جائے گا تو یہی کہوں گا۔"

مولانا آمونی سے کہا کہ دوسرے جو منتظر ہیں ان سے بھی کہدو کہ خاطر جمع رکھیں۔

"اگر میری آبرو رہے گی تو کسی کو نہ چھوڑوں گا۔"

لٹت لگی چلی جاتی تھی، مخدوم الملک بہار کو پھر اپنا پرانا شغلہ یاد آجاتا ہے۔

"ایمان کا غم کھاؤ، رحمت و مغفرت کے امیدوار رہو۔"

اور وہی آیت قرآنی لاتقنطوا — الآیۃ بار بار زبان پر جاری ہے۔

مجمع کی طرف خطاب کرکے یہ بھی ارشاد ہوا:۔

میں جو کہا کرتا تھا، عاقبت عاقبت (انجام انجام) وہ یہی عاقبت (انجام) ہے۔

عزیزوں میں نوعمر کوئی بچہ سامنے بیٹھا تھا حکم ہوا کہ قرآن کچھ یاد ہو تو سناؤ، اس نے محمد رسول اللہ والذین معہٗ سورہ فتح کے خاتمہ کی آیتیں تلاوت کرنی شروع کیں، سنبھل کر دوزانو ہوکر جیسے قرآن سننے کے وقت ہمیشہ دستور تھا، بیٹھ گئے، تلاوت ختم ہوئی، بچے کو شاباشی دی گئی۔

وقت گذر رہا تھا۔ پانی طلب کیا گیا، انگا اتارا گیا قمیص کے ساتھ وضوء میں مشغول ہوئے لیکن آج کا رنگ ہی دوسرا تھا۔ ایک سو اکیس سال تک۔ وضوء کی مشق کرنے والے کو دیکھا گیا کہ منہ کا دھونا بھول گئے، یاد دلایا گیا۔ پھر از سر نو وضو کا اعادہ کیا گیا۔[1] بدن پر ارتعاش طاری تھا، پاؤں دھونے میں لوگوں کو محسوس ہوا کہ قابو نہیں چل رہا ہے مدد کی طرف متوجہ ہوئے لیکن اشارہ سے روک دیے گئے، اور جس طرح ممکن ہوا اپنے اس آخری وضوء کو خود ہی پورا فرمایا، کنگھی طلب کی گئی، محاسن مبارک کے بال سلجھائے گئے، اور دو رکعت نماز ادا کی گئی۔

کچھ زیادہ دقفہ نہیں گزرا تھا کہ بسم اللہ کے ساتھ

---

[1] حالات میں ان کے لکھا ہے کہ ایام جوانی میں جب راجگیر کی پہاڑیوں کے دامن میں آپ مجاہدہ دریاضت میں مشغول تھے۔ غسل کی ضرورت موسم سرما میں پیش آگئی، ٹھنڈے پانی کے تالاب میں غسل کیا۔ لیکن پھر ضرورت پڑی بار بار غسل کرتے، وہ ضرورت ہو جاتی۔ ۱۲

لا الہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین۔	کوئی الٰہ نہیں بجز تیرے پاک ہے تیری ذات میں ہی تھا ظلم کرنے والوں (حد سے تجاوز کرنے والوں) میں

تسبیح یونسی کا اعادہ بار بار فرمانے لگے۔

اسی کے ساتھ کبھی کبھی بسم اللہ، کلمۂ شہادت، حوقلہ (یعنی لاحول ولا قوۃ الا باللہ) کا ورد بھی درمیان میں کرتے، اسی قسم کے کلمات طیبات زبان مبارک پر جاری تھے کہ اچانک

"محمد رسول اللہ"

کی صدائے پر درد سینۂ بریاں سے اٹھی، اسی نعرے کے ساتھ جس کا پھر اعادہ کیا گیا کہ

" محمدؐ ، محمدؐ ، محمدؐ "

آوازے فضا گونج اٹھی، کفرستان ہند میں محمد کا ایک غلام اپنے آقا کو پکار رہا تھا، ہائے جس پہ جس کے نام پر اپنی ایک سو اکیس سال کی عمر نذر کر دی۔

سکون کی سی کیفیت اس کے بعد پیدا ہوئی، دعائے عیسوی

اللّٰھم ربنا انزل علینا مائدۃ من السماء تکون لنا عیدا لاولنا وآخرنا، وآیۃ منک وارزقنا وانت خیر الرازقین۔	اے اللہ! اے رب ہمارے! اتار ہم پر ایک خوان بھرا آسمان سے کہ وہ دن عید ہے ہمارے پہلوں اور پچھلوں کیلئے اور نشانی تیری طرف سے ہو۔ اور روزی

سنی گئی، کہ مانگی جا رہی ہے، دعائے عیسوی ختم ہوئی، پھر "اللہ ہی کو رب بنا کر پسند کر لیا، اسلام کو دین، محمدؐ کو نبی، قرآن کو امام، کعبہ کو قبلہ، ایمان والوں کو بھائی" یعنی رضیت باللہ ربا کے اقرار کو تازہ فرماتے ہوئے دیکھا گیا کہ دست مبارک آسمان کی طرف اٹھے ہوئے ہیں، اور عرض کیا جا رہا ہے، سنیے یہ مسلمانوں کے مخدوم کی زبان کے آخری کلمات ہیں:-

اللھم اصلح امۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم، اللھم ارحم امۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم، اللّٰھم اغفر لامۃ محمد، اللّٰھم تجاوز عن امۃ محمد، اللّٰھم	اے اللہ سنوار محمد کی امت کو، اے اللہ رحم کر محمد کی امت پر، اے اللہ بخش دے محمد کی امت کو، اور اے اللہ درگذر فرما محمد کی امت سے، اے اللہ فریاد رسی محمد کی امت کی اے اللہ مدد فرما محمد کی امت کی،

اغفر لامة محمد، اللهم ارحم امة محمد، اللهم فرج عن امة محمد فرجا عاجلا	اے اللہ محمد کی امت کی مصیبت کو ٹال، جلدی ٹال۔

اور آخر میں تھا:

اللهم انصر من نصر دين محمد صلى الله عليه وسلم اللهم اخذل من خذل دين محمد صلى الله عليه وسلم برحمتك يا ارحم الراحمين۔	اے اللہ مدد کر اس شخص کی جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی مدد کرے، اور برباد کر اس کو جو محمد کے دین کی تباہی کے درپے ہو، اپنی رحمت سے اے اللہ، اے سارے مہربانوں سے سب سے بڑے مہربان۔"

سارے جہان سے الگ ہو کر ہندوستان کے مختلف گوشوں، اور زاویوں میں جو بیٹھے ہوئے تھے وہ کن کے لیے بیٹھے ہوئے تھے، کن کا کام کرتے تھے؟

لکھنے والے آج اللہ کے ان برگزیدوں، امت محمدیہ کے ان چاہنے والوں کی شان میں جو چاہیں کہیں، جن بدگمانیوں سے اپنے آپ کو گندہ اور ناپاک کریں۔ لیکن ان واقعات کا ان کو اگر صحیح علم ہو، تو یورپ کی سکھائی ہوئی قوالی "عشق بازی" میں ان کو وہ روح نہیں ملے گی، جو مرنے والے کے ان زندہ کلمات میں مل رہی ہے۔ آواز کہتے ہیں، اسی آخری دعا کے پست ہو گئی، کان لگانے والوں نے صرف اتنا اور سنا کہ لب جو ہل رہے تھے اس سے

لاخوف علیہم ولاہم یحزنون لا الٰہ الا اللہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔	نہ ڈر ہے ان کو اور نہ کڑھیں گے۔ لا الٰہ الا اللہ، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ارتعاشی تموجات ان کے کانوں سے ٹکرا رہے تھے۔ زندگی کی ایک منزل کے اختتام کے بعد شاید دوسری منزل میں قدم رکھتے ہوئے پانے والا جو کچھ پا رہا تھا، کیا اسی کی یہ تعبیر تھی؟ گویا

—— سمجھنا چاہیئے کہ زندگی کی یہ دوسری منزل جو خوف و حزن سے پاک تھی اور وہی اللہ جو خاکی زندگی کے ابتدائی دور میں "الٰہ" بنا کر ایک سو اکیس سال تک پوجا گیا تھا، وہی جزائی رنگ میں الٰہ بن کر سامنے آگیا تھا، اسی لیے زندگی کی اس نئی اور جدید منزل میں قدم، کہنے والے نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھتے ہوئے قدم رکھا، سننے اور سنانے کا سارا قصہ آخری انجام، اور جدید آغاز پر ختم ہو گیا، فتغمدہ اللہ بغفرانہ، وصب علیہ شآبیب رضوانہ۔

(الفرقان شعبان ۱۳۷۲ھ)

نتیجہ ص ۱۱۰ کا بقیہ

ہمیں کسی خاص سمت کی پابندی اگر کی جائے گی تو صرف اس لیے کہ اللہ نے (کسی مصلحت سے) اس کی پابندی کا حکم دیا ہے۔ ورنہ اللہ تو ہر جگہ ہے جدھر بھی رُخ کر لیا جاتا، مل جاتا۔ قُلْ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ — (کہہ دیجیے کہ مشرق و مغرب سب اللہ کی سمتیں ہیں، پس تم جدھر بھی منہ کرلو اُدھر اللہ ہے) پس اب اللہ تعالیٰ اگر (حضرت محمد کے دور میں) کوئی دوسری سمت قبلہ کے لیے مقرر کرتا ہے تو اس کی طرف رُخ کر کے عبادت کرو۔ سمتوں میں خود کچھ نہیں رکھا ہے، نہ مشرق کی طرف رُخ کرنا فی نفسہ ثواب ہے، نہ مغرب کی طرف رُخ کرنا بذاتہٖ گناہ، گناہ و ثواب کا تعلق تمامتر حکمِ الٰہی کی تعمیل اور عدمِ تعمیل سے ہے، اگر کسی خاص سمت کا حکم دیدیا گیا تو پھر اس کا ترک گناہ اور اختیار ثواب ہے، پہلے کبھی اگر مشرق کو قبلہ بنانے کا حکم تھا تو اس سے انحراف گناہ تھا اور اب اگر مغرب کو قبلہ مقرر کر دیا گیا تو اس کا استقبال ثواب اور اس سے انحراف گناہ ہے' —— یہ ہے مقصد ان آیات کا، نہ یہ کہ کوئی خاص سمت متعین ہی نہیں ہے، جدھر کو بھی تم چاہو رُخ کر کے عبادت کرلو۔

یہ مقصد محض ہمارے ذہن کی پیداوار نہیں ہے بلکہ ان آیات کے آس پاس کی دوسری آیات اسی مقصد کو متعین کرتی ہیں جن میں مکرر سہ کرر تاکید کے ساتھ سمتِ کعبہ کو قبلہ بنانے کا حکم دیا جا رہا ہے اور اہلِ کتاب کی خواہش کے مطابق، بیت المقدس کو قبلہ بنانے کی سخت ہونے سے ممانعت کی جا رہی ہے۔ —— وہ آیات یہ ہیں :-

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ (بقرہ ع ۱۷)	پس موڑ دو تم (اے محمد) اپنا چہرہ مسجد حرام کی جانب، اور (اے مسلمانو!) تم جہاں کہیں بھی ہو اپنا رُخ اسی (مسجد حرام) کی طرف پھیر لو۔
وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ (بقرہ ع ۱۷)	اور اگر تم چلے ان کی (اہلِ کتاب کی) خواہشات کے پیچھے بعد اس کے کہ تمھیں (سمتِ قبلہ کے معاملہ میں اللہ کی مرضی کا) علم ہو چکا ہے، تو بے شک تم تجاوز کرنے والوں میں سے ہوگے۔
وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ؕ (بقرہ ع ۱۸)	اور جہاں سے بھی تم نکلو اپنا چہرہ (نماز میں) مسجد حرام کی طرف پھیر لو، اور یہی ٹھیک حق ہے تمہارے پروردگار کی طرف سے۔

بتائیے کہ ان آیات کا مقصد یہ ہے کہ جس کا جدھر جی چاہے منہ کر کے عبادت کر لے اللہ کے لیے یا سب قبلہ ان آیات کا یہ مقصد ہے؟ اور کیا یہ ہے کہ

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ط (رکوع ۱۷)	اور ہم نے نہیں مقرر کیا تھا وہ قبلہ[1] جس پر اب تک تم قائم تھے، مگر اس لیے کہ ممتاز کر دیں ان لوگوں کو جو رسول کا (بہرحال) اتباع کرتے ہیں۔ ان لوگوں سے جو (اپنی خواہشات کے خلاف ہوتا دیکھ کر) اُلٹے پاؤں پھر جاتے ہیں[2]۔

اور پھر کیوں کہا گیا ہے کہ

وَإِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً إِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ط (رکوع ۱۷)	اور بیشک یہ بات (تحویل قبلہ) بہت ہی گراں گزرنے والی تھی سوائے ان لوگوں کے جن کو اللہ نے ہدایت دی۔

سوچنے کی بات ہے کہ اگر قبلہ کے لیے کسی ایک سمت کی پابندی ضروری نہیں تھی، تو تحویل قبلہ کے واقعہ میں امتحان و آزمائش کا آخر کیا پہلو نکلتا تھا؟ اور اگر قبلہ کے معاملہ میں ہر چہار سو کی وسعت قرآن نے دے رکھی تھی، تو پھر کیوں ان لوگوں کو اَلَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ (وہ لوگ جن کو اللہ نے ہدایت دی) سے خارج کیا گیا ہے جو کسی ایک خاص سمت کے معاملہ میں رسول اُمی صلی اللہ علیہ وسلم کے پابند نہیں رہے؟ کیا (معاذ اللہ) اللہ کے یہاں یہ اندھیر ہے کہ ایک طرف تو یہ اعلان کیا کہ جدھر کو بھی رُخ کر لو اللہ مِل جائے گا! اور دوسری طرف ان لوگوں کو ہدایت سے محروم ٹھہرا دیا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک خاص سمت کے پابند نہیں ہوئے؟ ـــــ تعالى الله عن ذلك علوًا كبيرًا۔

پس بلاشبہ یہ بات غلط اور بالکل غلط ہے کہ قرآن بھی تنہا شریعت محمدی کو دستور العمل بنانا لازم نہیں ٹھہراتا، بلکہ مختلف شریعتوں کی اجازت دیتا ہے۔ اس کے برعکس صحیح بات یہ ہے کہ رسالت محمدی کا دور شروع

---

[1] مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ ہی کی طرف منہ کر کے عبادت کرتے تھے، مگر مدینہ آکر اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا کہ بیت المقدس کو قبلہ بنایا جائے۔ یہ حکم سولہ سترہ مہینے رہا۔ اس کے بعد پھر کعبہ ہی کو ہمیشہ کے لیے قبلہ قرار دے دیا گیا۔ آیت میں قبلہ سے مراد یہی عارضی قبلہ ہے۔ [2] یعنی ہمارا یہ حکم آزمائشی تھا، جب یہ حکم دیا گیا تو اُن مسلمانوں کی آزمائش ہو گئی جن کا آبائی قبلہ بیت اللہ تھا۔ اور جب یہ حکم واپس لیا گیا تو اُن کی آزمائش ہو گئی جن کا آبائی قبلہ بیت المقدس تھا ـــــ ان دونوں گروہوں میں جو سچے دل سے آپ پر ایمان لائے تھے انھوں نے اپنے آبائی قبلہ کی محبت پر آپ کی اطاعت کو ترجیح دی اور جو ایمان لانے میں مخلص نہ تھے وہ آپ کی اطاعت میں اپنے آبائی قبلہ کو چھوڑنے پر تیار نہ ہوئے۔

ہونے کے بعد قرآن شریعت محمدی کے علاوہ کسی اور شریعت کو دستور العمل بنانے کی اجازت نہیں دیتا۔ اور اگر کوئی سمجھنا چاہے تو اس کے لیے صرف تحویل قبلہ کے موقع پر نازل ہونے والی یہی آیت کافی ہے جو ابھی اوپر گزری ہے یعنی وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا (الخ) کیونکہ یہ حقیقت ظاہر کر دینے کے باوجود کہ "سمتوں میں کچھ نہیں رکھا ہوا، اللہ تعالیٰ ہر سمت ہے، مشرق میں بھی اور مغرب میں بھی پس جدھر کو بھی رُخ کرو گے اُدھر اللہ کو پا سکتے ہو۔" (خود اس حقیقت کے ظاہر کر دینے کے باوجود) یہ مطالبہ کرنا کہ جدھر کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رُخ کریں اُدھر ہی کو رُخ کرو، اور اسی سمت کو قبلہ بناؤ! جو لوگ اس کے خلاف ورزی کریں ان کو خواہشات کا بندہ اور ہدایت الٰہی سے محروم ٹھہرانا، یہ بلاشبہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہدایت پیغمبر وقت کے اتباع میں منحصر ہے اور اس کے طریقے سے انحراف خواہ فی نفسہ کیسے ہی ہلکے معاملہ میں ہو اور اس کے طریقہ کو چھوڑ کر خواہ کسی سابقہ پیغمبر ہی کا طریقہ اختیار کیا گیا ہو، بلکہ خود اسی پیغمبر ہی کا کوئی سابقہ معمول کیوں نہ اختیار کیا گیا ہو، وہ ہرگز ہرگز ہدایت کی فہرست میں نہیں آئے گا —— کیونکہ سمت قبلہ کا مسئلہ خود قرآن کے بیان کے مطابق فی نفسہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا، پھر یہ کہ اس مسئلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی نہ کرنے کی صورت میں واقعاتی امکان دو ہی تھے، ایک یہ کہ (جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس کا رُخ کرنے لگے تھے تو) مسجد حرام سے محبت رکھنے والے لوگ بدستور مسجد حرام ہی کو قبلہ بنائے رہتے، اور دوسرا یہ کہ (جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت المقدس کا رُخ چھوڑ کر پھر سے مسجد حرام کا رُخ اختیار کیا تو) بیت المقدس سے محبت رکھنے والے اس تبدیلی کو قبول نہ کرتے اور بدستور بیت المقدس ہی کو قبلہ بنائے رہتے، ہر دو صورتوں میں بعض انبیاء کا بلکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی ایک سابقہ طریقہ کا اتباع تھا، لیکن اس کے باوجود ہدایت یاب صرف اسی گروہ کو بتلایا گیا جو ہر تبدیلی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرتا رہا۔

الغرض پیغمبر وقت کے مکمل اتباع کے بغیر، ہدایت کا کوئی تصور قرآن میں نہیں ملتا ہے، قرآن کا تصور اس بارے میں بعینہ وہی ہے جو ایک حدیث کے ان الفاظ میں انتہائی صفائی کے ساتھ واضح کیا گیا ہے کہ

لَوْ كَانَ مُوسَىٰ حَيًّا مَا وَسِعَهُ إِلَّا اتِّبَاعِي۔	(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا) کہ اگر موسیٰ علیہ السلام (جیسے جلیل القدر اور صاحب شریعت نبی) بھی (میرے زمانہ میں) زندہ ہوتے تو انھیں بھی میرا ہی اتباع کرنا پڑتا۔
(بخاری شریف)	

مستند تفاسیر اور قرآنی علوم سے متعلق اہم کتابیں				اردو میں حدیث کی مستند کتابیں	
تفسیر ابن کثیر	۱۳۰/-	قصص القرآن غیر مجلد مکمل	۴۶/۲۵	صحیح بخاری اردو	۶۰/-
تفسیر حقانی	۱۱۰/-	نظریۂ دو قرآن پر ایک نظر	۳/-	" " مترجم مع متن	۱۰۰/-
تفسیر بیان القرآن مکمل مجلد چرمی	۱۶۰/-	قرآن اور پیغمبر	۰/۶۰	ایضاح البخاری ۱تا۱۳	۳۹/-
تفسیر موضح القرآن	۴۰/-	قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں	۲/۵۰	تقریر بخاری	۱۰/-
تفسیر حل القرآن	۷۵/-	قرآن کی معاشی تعلیمات	۱/-	مسلم شریف اردو	۶۰/
تفسیر ماجدی اول، دوم مجلد	۴۰/-	فضائل قرآن	۱/۲۵	" مترجم	۱۰۰/-
تفسیر مظہری کامل سیٹ	۲۱۰/-	قصص و مسائل	۴/۵۰	ترمذی شریف اردو	۳۰/-
اعلام القرآن	۲/۲۵	قرآن کا تعارف	۲/۷۵	مشکوٰۃ شریف اردو	۴۵/-
تفسیر رشیدی	۳/-	احسن التجوید	۱/۵۰	مظاہر حق شرح مشکوٰۃ مجلد مکمل سیٹ	۱۶۰/-
تفسیر تفہیم القرآن مکمل	۱۳۰/-	اعجاز القرآن	۱/۷۵	شمائل ترمذی اردو	۱۲/-
تفسیر الفوز الکبیر اردو	۲/۵۰	آداب القرآن	۰/۸۰	مؤطا امام مالک اردو	۱۲/-
قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟	۶/۵۰	ام الکتاب	۱۰/-	انتخاب صحاح ستہ	۸/-
قرآن مجید اور تخلیق انسان	۲/-	قرآن کی فضیلت	۱/-	ترجمان السنہ مکمل غیر مجلد	۷۲/۵۰
قرآن اور حدیث	۳/-	کلمات القرآن	۰/۶۰	حجۃ اللہ البالغہ اردو	۶۶/-
قاموس القرآن	۱۵/-	ارض القرآن مکمل	۱۴/-	معارف السنہ	۱۰/
لغات القرآن	۵۷/۵۰	قرآن مجید کا چیلنج	۳/۵۰	علم الحدیث	۲/۵۰
قرآن کی باتیں	۲/-	دین کا قرآنی تصور	۴/-	انتخاب حدیث مجلد	۵/۵۰
قرآن اور تعمیر سیرت	۷/۵۰	قرآن فہمی کے اصول	۰/۵۰	فن اسماء الرجال	۲/۵۰
قرآن اور تصوف	۵/-	تجرید القرآن	۰/۶۰	محدثین عظام (نیا ایڈیشن)	۱۰/-
فہم قرآن	۸/۵۰	قرآن عظیم اور جبریہ تعلیم	۱/-	کتابت حدیث	۲/-
جمع و تدوین قرآن	۳/۰۰	یسرنا القرآن	۱/-	فقہ الحدیث	۲/-
رہنمائے قرآن	۱/۲۵	قرآن مجید کی پہلی کتاب	۲/-	نصرت الحدیث	۳/-
				بہار حدیث	۰/۸۰
وحی الٰہی	۵/-			چار بنیادی باتیں	۱/۲۵

ملنے کا پتہ:- کتب خانہ "الفرقان" ۳۱ نیا گاؤں مغربی۔ لکھنؤ۔

ملفوظات ارشادات و مقالات

کتاب	قیمت
صحبتے با اولیاء	۷/۰
صحبتے با اہل دل	۷/۰
چالیس ارشادات	۱/۵۰
مواعظ حسنہ	۸/۰
ملفوظات مولانا الیاسؒ	۲/۵۰
اشرف المواعظ	۵/۰
خطبات ماجدی	۴/۰
ملفوظات شیخ الاسلامؒ	۴/۵۰
مقالات شیخ الہندؒ	۱/۵۰
مقالات شبلی اول تا ہشتم	۳۴/۵۰
مقالات امینی	۱۵/۰
خطبات شبلی	۳/۷۵
ترجمہ امداد السلوک	۵/۰
ارشاد الملوک مجلد	۱۰/۰
خطبات ماثورہ	۰/۷۵
خطبات مدراس	۶/۲۵
مقالات احسان	۱۲/۵۰
مقالات عبدالسلام	۱۲/۵۰
مقالات شیخ الاسلام	
خطبات (مودودی)	۷/۵۰
خطبات الاحکام	۴/۰

مکتوبات

کتاب	قیمت
حضرت ابوبکرؓ کے سرکاری خطوط	۷/۵۰
حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط	۱۱/۷۵
حضرت عثمانؓ کے سرکاری خطوط	۶/۲۵
شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات	۱۰/۰
مکاتیب محمد سعید	۳/۰
مکتوبات علمیہ اول مجلد	۸/۰
مکتوبات تصوف اول مجلد	۸/۰
مکتوبات شیخ دوم مجلد	۴/۰
مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط	۵/۰
مکاتیب شبلی	۱۵/۰
مکتوبات شیخ الاسلام	۴۰/۰

تصوف کے موضوع پر کچھ کتابیں

کتاب	قیمت
تصوف کیا ہے	۵/۰
تزکیۂ نفس	۸/۰
مکتوبات تصوف	۶/۰
مدارج سلوک	۸/۰
احسان اور تصوف	۰/۴۰
تصوف کی حقیقت	۵/۰
جوہر تصوف	
مولانا مودودی اور تصوف	۲/۰
تحفۃ الادوار جامی	۱/۰۰

تبلیغی کتابیں

کتاب	قیمت
تبلیغی نصاب اول سادہ	۱۲/۰
〃 〃 پلاسٹک	۱۷/۵۰
〃 〃 چرمی	۲۰/۰
〃 دوم پلاسٹک	۱۸/۰
〃 〃 چرمی	۲۰/۰
تبلیغ دین	۴/۵۰
تبلیغی چالیس سبق	۰/۴۰
تبلیغی جماعت پر اعتراضات کا جواب	۵/۵۰
تبلیغی تقریریں	۱/۰
ایک اہم دینی دعوت	۱/۸
اسلام اور فریضۂ تبلیغ	۰/۴۰
التبلیغ مکمل سیٹ	۴۰/۰
تبلیغ کیا ہے؟	۳/۵۰
تبلیغی سات نمبر	۲/۰
چھ باتیں	۱/۲۵
تبلیغی تحریک کے بنیادی اصول	۴/۸
مفتاح التبلیغ	۴/۰
طریقۂ تبلیغ	۲/۰
تبلیغی سرگرمیاں عہد سلف میں	۱/۵۰

(بقیہ نگاہِ اوّلیں)

اور کہیں نہ کہیں سے عیب چینی کا نشانہ بن جاتا ہے۔ شاہ مرحوم کا اسی دور میں ایسے بلند درجہ کے قائدانہ رول میں، جس کے اندر خلیفۃ المسلمین بنجانے تک کے امکانات دیکھے جا سکتے تھے، ایسی سلامتی کے ساتھ گزر جانا اور ہر طرف سے تعاون و اعتماد ہی پانا یہ ان ہی مخلصانہ اطوار کا کرشمہ تھا جنھیں مخلصانہ کے ساتھ دانشمندانہ بھی کہہ سکتے ہیں ـــ کیسے کہا جائے کہ اخلاص کا یہ کردار آج وہاں بھی مشکل ہی سے ملتا ہے جہاں سے اخلاص کا سبق رنگ پاتے ہیں یعنی دینی حلقے اور شخصیات! نفس عجب عجب ٹوٹکا اور دھوکے کے پھندے اس باب میں لگاتا ہے اور بڑے بڑے آدمیوں کو چھوٹا بنا کے ان کی قوت تاثیر و کشش کو کم سے کم کر دیتا ہے۔ اشخاص کی بھی کمی نہیں، اخلاص بھی بالکل عنقا نہیں مگر یہ اطوارِ اخلاص ڈھونڈے تو نایاب ہیں اور یہی ہمارے کاموں کی عموماً بے اثری اور بے برکتی کا راز ہے۔

مرحوم کی دوسری خصوصیت، جو خالص دانشمندی کے اطوار میں آتی ہے، کم بولنا اور زیادہ سوچنا، زیادہ کرنا۔ خاص کر جذباتی باتوں سے بالکل پرہیز رکھنا تھی۔

زیادہ بولنا اور خاص کر جذباتی بولی بولنا، اپنوں کا جوش بھڑکانا اور دوسروں کو لن ترانیاں دکھانا کم از کم آج کی نازک اور کمزور حالت میں مسلمانوں کے لیے وہ آفت ہے جو بڑی سے بڑی عالی دماغ، مضبوط اعصاب اور باعمل قیادت کو بھی اکارت کر دیتی ہے۔ گنجائش ہوتی تو مثالیں گنائی جا سکتی تھیں، لیکن شاید ضرورت ہی نہیں ہے، ان اوصاف کے لوگوں کی ناکامیوں اور نامرادیوں کی داستانیں ہمارے چاروں طرف بکھری ہوئی ہیں۔

شاہ فیصل مرحوم کی اعلیٰ دماغی اور عملی صلاحیتوں کو اخلاص اور اس کے جملہ آداب کی نگہداشت کے بعد جس چیز نے کامیابی اور بامرادی سے سرفراز رکھا وہ یہی دانشمندانہ اطوار تھے۔ بولنے میں بند نہیں تھے مگر کسی نے بھی کم بولنے کی عادت رکھی اور وہ مرحلہ بمرحلہ کامیابیاں جن پر دوسرے جھوم جھوم گئے اور وہ زبان کی چالیں جن پر ایک عالم ششدر رہ گیا، کبھی ایک بار بھی تو اس آدمی کو از خود رفتہ نہ کر سکیں۔ بیت المقدس کے لیے جہاد تک کی باتیں کیں پر وہاں بھی تو جذبات انگیزی کا کوئی جملہ کبھی زبان پر نہیں آیا۔

آج ہم میں کے ہر "میر کارواں" کو جس "رختِ سفر" کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ یہی دو باتیں ہیں! یہی شہید فیصل کی اصل میراث ہے اور یہی اپنے قدر شناسوں کو اس کی بامراد نعش کا اوّلیں پیغام!

Regd. No. LW/NP-62

Monthly 'ALFURQAN' Kutchery Road, Lucknow U. P.

VOL. 43 NO. 2, 3 ~~FEB., MARCH~~, 1975 Phone : 25547

5, 6 April May June 1975

Cover Printed at—Shining Press, Naya Gaon, Lucknow

مدیر

محمد منظور نعمانی

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
ایک پونڈ
(یا ہندوستانی بیس روپے)
ہوائی ڈاک کے لئے مزید
محصول ڈاک کا اضافہ ہوگا

سالانہ چندہ
ہندوستان سے: -/۱۲
پاکستان سے: -/۲۰
ضخامت ۴۸ صفحات
قیمت:
فی کاپی ۱/۲۰

جلد ۴۳	بابت جولائی ۱۹۷۵ء مطابق جمادی الاخریٰ ۱۳۹۵ھ	شمارہ ۷

اگر اس دائرہ میں ( ) سُرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدتِ خریداری ختم ہو گئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کیلئے چندہ ارسال کریں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۰ جولائی تک آ جائے ورنہ اگلا پرچہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے جو پتہ کی چٹ پر لکھا رہتا ہے۔

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے اگر ۲۰ تاریخ تک کسی صاحب کو پرچہ نہ ملے تو فوراً مطلع فرمائیں۔ ان کی اطلاع ۲۸ تاریخ تک آ جانی چاہیے۔ اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان اور کتب خانہ الفرقان کے پتہ میں تبدیلی: الفرقان کا دفتر اور کتب خانہ لکھنؤ ہی میں کچہری روڈ سے دوسری جگہ منتقل ہو گئے ہیں۔ اب پتہ یہ ہے:

۳۱۔ نیا گاؤں مغربی (نظیر آباد) لکھنؤ (یو پی)

مولوی محمد منظور نعمانی پرنٹر پبلشر اڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان ۳۱ نیا گاؤں مغربی لکھنؤ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

محمد منظور نعمانی

پچھلے مہینے جون میں تین مہینے کا جو مشترکہ شمارہ (دوسرا انتخاب نمبر) شائع ہوا تھا اس میں "نگاہِ اولیں" کے زیر عنوان مرحوم و مغفور شاہ فیصل شہید سے متعلق مولوی عتیق الرحمٰن کا مضمون ناظرین کرام نے پڑھا ہوگا، — اس کا تتمہ (یا اسکی دوسری قسط) اس شمارہ میں بھی شامل ہے ان سطروں کے بعد آپ وہی پڑھیں گے — جو کچھ ان دونوں قسطوں میں کہا گیا ہے قارئین کرام نے بھی محسوس کیا ہوگا کہ وہ رسم عام کے مطابق "مرثیہ" یا "اظہارِ غم" نہیں ہے بلکہ ہم زندوں کے لئے سبق اور پیام ہے — اسی غرض اور اسی نقطہ نظر سے مرحوم سے متعلق دو واقعے راقم سطور بھی یہاں حوالۂ قلم کر رہا ہے۔

(۱) قریباً ۸ سال پہلے کی بات ہے رجب ۱۳۸۷ھ (اکتوبر ۱۹۶۷ء) میں "رابطۂ عالم اسلامی" کا اجلاس مکہ مکرمہ میں ہو رہا تھا۔ یہ عاجز راقم سطور اور رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بھی اس میں شریک تھے۔ حسنِ اتفاق سے انہی دنوں میں رابطہ کے اس سے پہلے اجلاس کی ایک تجویز کے مطابق (مطاف میں وسعت اور طواف کرنے والوں کے لئے سہولت پیدا کرنے کے واسطے) "مقام ابراہیم" پر بنی ہوئی ترکی حکومت کے زمانہ کی پرانی عمارت کو ختم کر کے اس کو جدید شکل دینے کا کام ہو رہا تھا۔ ۱۰ رجب کو جمعہ تھا، پروگرام کے مطابق اس دن یہ کام مکمل ہو جانا تھا، چنانچہ ہو گیا۔ لیکن یہ پورا کام پردہ قائم کر کے اس طرح کیا گیا، کام کے کرنے والوں اور چند خواص کے علاوہ غالباً کسی کو بھی معلوم نہ ہو سکا کہ کیا بن رہا ہے۔ اور تکمیل کے بعد اس پر سبز کپڑے کا غلاف چڑھا دیا گیا۔ پھر معلوم ہوا کہ کل شنبہ کے دن عصر و مغرب کے درمیان اس کا باقاعدہ افتتاح ہوگا اور خود "جلالۃ الملک فیصل" آکر افتتاح کریں گے اور یہ ایک عظیم تقریب ہوگی — اس تقریب میں شرکت کا دعوت نامہ رابطہ کی وساطت سے ہم لوگوں کو بھی ملا — شنبہ کے دن عصر کی نماز کے لئے جب ہم لوگ حرم شریف پہونچے تو غیر معمولی

قسم کے انتظامات دیکھے، موجودین میں ہزارہا عام مسلمانوں کے علاوہ اعیانِ حکومت، اکابر علماء و مشائخ، دوسری حکومتوں کے مسلمان سفراء اور سیکڑوں کی تعداد میں مکہ مکرمہ اور مملکت کے دوسرے شہروں کے مختلف طبقوں کے خواص و اعیان، جنکو اس تقریب کے لئے مدعو کیا گیا تھا موجود تھے ــــ تھوڑی دیر کے بعد شاہ فیصل اپنے ساتھیوں کے ساتھ حرم شریف میں داخل ہوئے، عصر مغرب کے درمیان طواف کرنیوالوں کی تعداد روزانہ ہی زیادہ ہوتی ہے، آج اس تقریب کی وجہ سے اور بھی زیادہ تھی ــ شاہ اور اُن کے سب ساتھی پہلے سیدھے حجر اسود کے سامنے آئے، اور قاعدہ کے مطابق استلام کر کے عام طائفین کے ساتھ طواف کرنے لگے، تقریب کے منتظمین نے "مقام ابراہیم" کے پیچھے اس کے متصل ایک خوبصورت مخملی سجادہ (مصلّٰی) اس غرض سے بچھا دیا تھا کہ ملک فیصل طواف کرنیکے بعد دوگانۂ طواف اس مصلے پر پڑھیں گے، اور اسکے بعد یہ سبز غلاف اپنے ہاتھ سے "اُتارینگے"، اس مصلّے کے پیچھے مختلف طبقات کے خواص و اعیان متعدد صفوں میں بیٹھے تھے، سب سے اگلی صفوں میں اکابر علماء اور وزراء حکومت اور سفراء اور رابطہ کے ارکان اور اسی طرح کے دوسرے طبقوں کے اعیان و خواص تھے۔ یہ سب منتظر تھے کہ "جلالۃ الملک" طواف سے فارغ ہو کر یہاں ہمارے قریب اور ہمارے سامنے اس مصلّے پر دوگانہ طواف پڑھیں گے ــــ اسی اثناء میں منجانب اللہ ایک عجیب اور ہم جیسوں کیلئے بڑا ایمان افروز اور سبق آموز واقعہ پیش آیا۔ "جلالۃ الملک" ابھی طواف ہی میں تھے کہ ایک سیاہ فام جو غالباً کوئی غریب حبشی یا سوڈانی تھا، میلا سا احرام باندھے مطاف میں اپنا طواف ختم کر کے مجمع میں سے سیدھا مقام ابراہیم کے پاس آیا اور جو نہایت قیمتی اور خوبصورت مصلّٰی وہاں "جلالۃ الملک" کیلئے بچھایا گیا تھا، بے تکلف اس پر کھڑے ہو کر اللہ اکبر کہہ کے اس نے نماز شروع کر دی اور بڑے اطمینان سے نماز پڑھنے اور سلام پھیرنے کے بعد دُعا کر کے اسی طرح بے تکلفی سے اُٹھا اور چلا گیا۔ وزراء اور اعیان حکومت بھی موجود تھے، فوج و پولیس کے افسران اور سپاہی بھی، کوئی اشارہ سے بھی اللہ کے اُس غریب اور کالے کلوٹے اور میلے کچیلے بندے کو نہیں روک سکا، سب نے بالکل خاموشی کے ساتھ یہ منظر دیکھا، اور اس عاجز کا خیال ہے کہ اس وقت یہ دیکھکر سب ہی کو روحانی خوشی ہوئی کہ اللہ کے اس گھر میں شاہ و گدا کی کوئی تفریق نہیں، یہاں سب بندے ہیں اور صرف بندے ــــ یہ واقعہ تو ضمنی طور پر ذکر کر دیا گیا ورنہ مجھے بتلانا یہ تھا کہ شاہ فیصل نے جب اپنا طواف پورا کر لیا تو بجائے اسکے کہ وہ اُس قیمتی مخملی مصلّے پر آکر (جو خاص انکے لیے مقام ابراہیم کے بالکل متصل بچھایا گیا تھا) دوگانہ طواف پڑھتے، انھوں نے کافی پیچھے بالکل عام جگہ پر جہاں غالباً کسی قسم کا فرش بھی نہیں تھا دوگانۂ طواف ادا کیا، اور دیر تک دُعا کی، اس کے بعد اٹھ کر مقام ابراہیم کے پاس آئے اور وہ ڈوری کھولی جو سبز غلاف کے اوپر لپٹی ہوئی تھی ــ خوب یاد ہے کہ انکی اس

ادا سے کہ انھوں نے ہم لوگوں کی صفوں سے بھی کافی پیچھے بالکل عام جگہ پر اور حرم پاک کی غالباً کھلی زمین پر رکعتین طواف پڑھیں، دل بہت ہی خوش ہوا اور ایمانی روح کو غذا ملی اور اس دن سے دل میں انکی خاص وقعت اور عظمت بیٹھ گئی

---

(۲) دوسرا واقعہ بھی حجاز مقدس کے اسی سفر کا ہے رابطہ کے اسی اجلاس میں بعض فیصلے ایسے ہوئے تھے جن سے متعلق حکومت سعودیہ کے وزیر نشریات و اطلاعات سے رابطہ کے ایک وفد کا گفتگو کرنا طے ہوا تھا۔ اس کے لئے جن ارکان کو نامزد کیا گیا ان میں ہم دونوں (رفیق محترم مولانا ابوالحسن علی ندوی اور راقم سطور) بھی تھے مقررہ تاریخ پر یہ وفد وزیر موصوف سے گفتگو کے لئے دار الحکومت ریاض گیا۔ اس وفد میں شیخ محمود الصواف بھی تھے جو اگرچہ اصلاً عراقی ہیں لیکن عرصہ سے مکہ مکرمہ ہی کو انھوں نے وطن بنا لیا ہے وہ رابطہ کے اہم رکن اور حکومت کے مشیر تعلیم بھی ہیں ۔۔۔ اپنے کام سے فارغ ہونے کے بعد ہم لوگوں نے طے کیا کہ مغرب کے بعد مفتی اکبر شیخ محمد بن ابراہیم سے ملاقات کے لئے چلیں گے، وہ رابطہ کے صدر بھی تھے اور مملکت کی سب سے بڑی دینی شخصیت بھی۔ چنانچہ نماز مغرب سے فارغ ہو کر ہم تینوں مفتی اکبر سے ملنے کیلئے موٹر سے روانہ ہو گئے ۔۔۔ راستہ میں شیخ محمود الصواف نے کہا کہ ہم لوگوں کے یہاں آنے اور وزیر اعلام سے ملاقات و گفتگو کی خبر کل صبح یہاں کے اخبارات میں آ جائیگی۔ جلالۃ الملک کو ضرور اسکا احساس اور افسوس ہوگا کہ ہم لوگ ریاض آئے اور ان سے نہیں ملے، اسلئے میری رائے یہ ہے کہ جلالۃ الملک سے بھی ضرور مل لیا جائے۔ ۔۔۔ ہم لوگوں نے انکی رائے سے اتفاق کیا۔ انھوں نے کہا کہ پھر ان سے ملنے کیلئے یہی وقت زیادہ مناسب ہے، تھوڑی دیر کے بعد انکے کھانے کا وقت ہو جائیگا، مفتی اکبر سے ہم عشاء کے بعد مل لیں گے۔ ہم نے کہا کہ اسکو آپ ہی بہتر سمجھ سکتے ہیں۔۔۔ انھوں نے سواق (موٹر ڈرائیور) سے کہا کہ پہلے شاہی محل چلو، اس نے موٹر دوسری سڑک پر موڑ دی (مجھے اس پر بڑا تعجب ہوا کہ بغیر اسکے کہ ملاقات کے لئے پہلے سے وقت لیا گیا ہو یا اطلاع ہی دی گئی ہو "جلالۃ الملک" سے ملاقات ہو جائیگی، ہم تو اپنے جمہوری ملک کے وزیروں سے بھی اس طرح نہیں مل سکتے) بہر حال تھوڑی دیر کے بعد موٹر نے شاہی محل پہونچا دیا۔ معلوم ہوا کہ ملک ابھی ابھی کھانے کیلئے اٹھے ہیں جن صاحب نے یہ بات بتلائی انھوں نے ہم لوگوں سے کہا کہ آپ حضرات تشریف رکھیں ابھی چند منٹ میں فارغ ہو کر جلالۃ الملک تشریف لے آئینگے۔ ہم لوگ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ دس منٹ سے زیادہ وقت نہ گذرا ہوگا کہ وہ تشریف لے آئے۔ بڑے تپاک سے ملے اور بڑی خوشی اور ممنونیت کا اظہار فرمایا، عشاء کی اذان ہونے تک بالکل اسطرح گفتگو کرتے رہے گویا کہ دینی ذہن رکھنے والے چند ہم خیال و ہم مقصد احباب کی مجلس ہے۔ انکی گفتگو زیادہ تر عرب ممالک، مسلمانان عالم اور اقوام عالم سے متعلق تھی [illegible] اور مسلمانوں کے بارہ میں انھوں نے کہا کہ انکی کمزوری اور ذلت و پستی کا بنیادی سبب اعمال و اخلاق کا فساد ہے اور ہمارے لئے انابت الی اللہ، اعتصام بحبل اللہ اور تمسک بکتاب اللہ و سنۃ رسولہ کے سوا نجات کا کوئی راستہ نہیں ہے ۔۔۔ اس مجلس اور صحبت میں اپنے اس احساس کا بھی انھوں نے بڑی صفائی سے

اظہار فرمایا کہ غیر عرب ملکوں کے دوروں میں میں نے محسوس کیا کہ وہاں کے مسلمانوں کو اسلام کے ساتھ ہم عربوں کے بہ نسبت زیادہ تعلق ہے ـــ کسی بھی مجلس میں اُن کے خیالات اور اُن کی باتیں اس طرح سُننے کا اس سے پہلے بھی کبھی اتفاق نہیں ہُوا تھا اور اس کے بعد بھی نہیں ہُوا۔

قریباً آدھ گھنٹہ یہ صحبت جاری رہی، وہاں کے معمول کے مطابق چائے اور قہوہ اور بخورِ عود کا دور بھی چلتا رہا۔ جب عشاء کی آواز کانوں میں آئی تو ہم لوگوں نے اجازت چاہی، جلالۃ الملک نے از راہِ عنایت چند قدم چل کر ہم لوگوں کو رخصت فرمایا۔

اس صحبت اور ملاقات میں ملک کے متواضعانہ رویہ اور مومنانہ انداز فکر و گفتگو سے طبیعت بہت متاثر ہوئی ـــ حدیث شریف میں ہے "من تواضع للّٰہ رفعہ اللّٰہ" (یعنی جو بندہ اپنے کو اللہ کیلئے نیچا کرے اور تواضع کا رویہ اپنائے، اللہ تعالیٰ اسکو رفعت اور بلندی عطا فرماتا ہے) اس عاجز کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مرحوم شاہ فیصل شہید کو ان کی عمر کے آخری حصہ میں جو غیر معمولی اور بے نظیر رفعت و مقبولیت عطا فرمائی وہ منجانب اللہ ان کے اس متواضعانہ رویہ کا صلہ بھی تھا۔ انکی ذات اس ادنیٰ دَور میں اس حقیقت کا روشن برہان اور زندہ دلیل تھی کہ ایک شخص سچا مومن، کھلا خدا پرست اور متبع شریعت ہونے کے ساتھ نہایت کامیاب سیاستداں اور حکمراں بھی ہو سکتا ہے۔

میرے چھوٹے لڑکے مولوی خلیل الرحمان سجاد ندوی مدینہ طیبہ میں ہیں انھوں نے لکھا ہے کہ "مرحوم و مغفور کے قریبی لوگوں کا بیان ہے کہ اِدھر کچھ عرصہ سے وہ اپنے لئے شہادت کی دُعا بھی خاص طور سے کرتے تھے، اس سال دو تین مرتبہ اہم موقعوں پر تقریر میں بھی انھوں نے اپنے لئے یہ دُعا کی، گزشتہ حج کے پیغام میں بھی یہ دعا تھی ـــ بظاہر ربِّ کریم نے اس حادثۂ شہادت کو انکی دعا کی قبولیت اور آخرت میں ان کے لئے خصوصی مغفرت و رحمت اور رفع درجات کا وسیلہ بنایا ـــ اللہ تعالیٰ ایسا ہی کرے اور حرمین شریفین اور مملکت سعودیہ عربیہ اور مسلمانانِ عالم کو ان کا بہتر بدل عطا فرمائے۔ وَمَا هُوَ عَلَيْهِ بِعَزِيْزٍ۔

نئی مطبوعات پر تبصرہ

کتابوں رسالوں پر ریویو اور تبصرہ کا کام مولوی عتیق الرحمٰن سنبھلی کیا کرتے تھے، کئی برس سے ان کی خرابیٔ صحت کی وجہ سے یہ سلسلہ بالکل بند کر دیا گیا ہے ـــ پچھلے چند ہفتوں میں اُن کا حال خدا کے فضل سے کچھ بہتر رہا، ان دنوں میں انھوں نے چند کتابوں کا مطالعہ اور ان پر تبصرہ کیا، ان میں سے کچھ تبصرے اس شمارہ میں پیش کئے جا رہے ہیں، کچھ انشاء اللہ آئندہ شمارہ میں شائع ہوں گے ـــ

بہر حال اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ الفرقان میں تبصرہ کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا ہے ـــ ابھی یہ سلسلہ بند ہی سمجھا جائے اور اس غرض سے نئی مطبوعات فی الحال نہ بھیجی جائیں۔

فیصل شہید — اپنی ایک اپیل کے آئینے میں

(الفرقان کی پچھلی اشاعت (اشاعت خاص) میں شاہ فیصل شہید پر دس گیارہ صفحے لکھے گئے جبکہ گنجائش آٹھ ہی کی تھی۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ سیری نہیں ہوئی اور ع "سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کیلئے" کا مضمون ہو کر رہ گیا۔ اس تحریر میں جہاں مرحوم کے دعوتی و اصلاحی جذبے اور اندرونِ مملکت کی ان کی روش میں اس کے مظاہر کا تذکرہ آیا تھا وہاں ایک متعین اور مخصوص مثال کے طور پر مرحوم کی ایک ناصحانہ دعوت یا اپیل کو بھی جزوِ تحریر بنایا گیا تھا جو چند ہی مہینے پہلے عالمگیر خشک سالی کی صورت حال پر نمازِ استسقاء کی ادائیگی کے لیے جمیع مسلمانانِ مملکت کے نام مرحوم نے جاری کی تھی۔ یہ اپیل .... مرحوم شاہ کے اصلاحی جذبے، دینی و ایمانی فکر اور مقدس مملکت میں اس ذہن و فکر کو فروغ دینے کی کوشش کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے ـــــ مگر جگہ کی تنگی نے تحریر کا یہ حصہ آخر وقت میں روک لینا پڑا، اور اس کی جگہ یہ وعدہ درج ہوا کہ "انشاء اللہ آئندہ اشاعت میں اس سلسلے کی ایک اہم چیز آئے گی"۔ ذیل میں اسی وعدہ کے مطابق مرحوم شاہ فیصل کی اپیل کا عربی متن مع ترجمہ دیا جا رہا ہے۔ ترجمہ محبِ عزیز جناب شمس الحق صاحب ندوی استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء کے قلم سے ہے۔ ع)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم[1]

"من فیصل بن عبد العزیز	فیصل بن عبد العزیز کی جانب
الی من یراہ من المسلمین	سے اُن تمام مسلمانوں کے نام جنکی نظر سے
سلك اللہ بنا وبهم سبيلا	یہ گزرے دعا ہو کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اور ان سبکو

[1] شاہ فیصل مرحوم کی اپیل کا متن "اخبار العالم الاسلامی" مکہ مکرمہ بابت ذی الحجہ ۱۳۹۵ھ سے لیا گیا ہے۔

عبادہ المومنین واعاذنا وایاھم
من طریق المغضوب علیھم
ولا الضالین امین

سلام علیکم ورحمۃ اللہ
وبرکاتہ۔

اما بعد

فلا یخفی علی کل من لہ أدنی
بصیرۃ انہ ما نزل بلاء الا بذنب
ولا رفع الا بتوبۃ وان اللہ
سبحانہ یبتلی عبادہ بالسراء
والضراء والشدۃ والرخاء
والخصب والقحط لیشکروہ
علی النعم ولیتوبوا الیہ من
التقصیر کما قال سبحانہ:
(وما اصابکم من مصیبۃ فبما
کسبت ایدیکم ویعفوعن کثیر)
وقال عزوجل:
(وبلوناھم بالحسنات
والسیئات لعلھم یرجعون
وقال تعالیٰ

اپنے مومن بندوں کی راہ پر چلائے اور
مغضوب علیہم اور ضالین کی راہ سے حفاظت
فرمائے۔

اما بعد ـــــ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
جو شخص ذرا بھی بصیرت رکھتا ہے اس پر یہ
بات مخفی نہیں کہ جو بھی آفت و بلا آتی ہے وہ کسی
گناہ کی پاداش میں آتی ہے اور پھر توبہ و استغفار
کے بغیر دور نہیں ہوتی، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو
راحت و تکلیف، تنگی و فراخی، قحط و شادابی ہر
طرح سے آزماتا ہے تاکہ وہ نعمتوں پر شکرگزار اور
کوتاہیوں پر تائب و شرمسار ہوں، اللہ تعالیٰ
خود فرماتا ہے "اور تم کو جو کچھ مصیبت پہنچتی
ہے تو وہ تمہارے ہی کیے ہوئے کاموں سے!
اور زیادہ تر سے تو وہ درگزر فرما دیتا ہے۔" اور
فرماتا ہے "اور ہم ان کو خوش حالیوں اور بدحالیوں
سے آزماتے رہے کہ شاید باز آجائیں!" فرماتا ہے
"اور ہم نے کسی بستی میں کوئی نبی نہیں بھیجا کہ
وہاں کے باشندوں (کی سرکشی پر) ان کو محتاجی
اور بیماری میں نہ پکڑا ہو تاکہ وہ ڈھیلے پڑ جائیں"
ایک اور جگہ فرماتا ہے اور وہ وقت یاد کرو جبکہ
تمہارے رب نے تم کو جتلا دیا کہ اگر تم شکر کرو گے
تو تم کو زیادہ عطا کروں گا اور اگر ناشکری کرو گے
تو میرا عذاب بڑا سخت ہے! اللہ تعالیٰ نے اپنے

(وما ارسلنا فی قریة من نبی
الا أخذنا اھلھا بالبأساء والضرآء
لعلھم یضرعون)

وقال جل شأنه:

(واذ تأذن ربكم لئن شكرتم
لازیدنكم ولئن كفرتم ان
عذابی لشدید)

واخبر سبحانه ان تقواه والتوبة
الیه سبب لغفران الذنوب وتفریج
الكروب وانزال الغیث وزوال
الجدب والشدة كما قال سبحانه:

(وتوبوا الی الله جمیعا ایھا
المؤمنون لعلكم تفلحون)

وقال تعالیٰ:

(یآ ایھا الذین آمنوا توبوا الی
الله توبة نصوحا عسی ربكم ان
یكفر عنكم سیأتكم ویدخلكم
جنات تجری من تحتھا الانھار)

وقال عزوجل:

(ولو ان أھل القری آمنوا
واتقوا لفتحنا علیھم بركات
من السماء والارض)

وقال تعالیٰ:

بندوں کو بتلایا اور باخبر کیا ہے کہ اس کا پاس لحاظ
اس کی طرف رجوع و استغفار اور گناہوں کی معافی
مصائب سے نجات، باران رحمت کے نزول اور
قحط و بلا کے دفعیہ کا ذریعہ ہے۔ فرمایا ہے ۔
"اور مسلمانو! تم سب اللہ کے سامنے توبہ کرو تاکہ
فلاح پاؤ!"

دوسری جگہ فرمایا ہے "اے ایمان والو تم
اللہ کے آگے سچی توبہ کرو اور امید ہے کہ تمہارا
رب تمہارے گناہ معاف کرے گا اور تم کو ایسے
باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں
جاری ہوں گی۔" نیز ارشاد ہے "اور اگر یہ
بستیوں والے ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے
تو ہم ان پر آسمان و زمین کی برکتیں کھول دیتے۔"
اور ارشاد ہے "اور جو شخص اللہ سے ڈرتا ہو
اللہ اس کے لیے نجات کی شکل نکال دیتا ہے
اور اس کو ایسی جگہ سے رزق دیتا ہے جہاں
سے اسکو گمان بھی نہیں ہوتا۔"

اللہ نے اپنے نبی نوح علیہ السلام کے
متعلق بتایا ہے کہ انھوں نے اپنی قوم سے کہا۔
"تم اپنے پروردگار سے گناہ بخشواؤ بیشک وہ
بڑا بخشنے والا ہے (فراوانی سے) بارش برسائے
گا، تمہارے مال و اولاد میں ترقی دے گا، باغات
اور نہریں عطا کرے گا۔" ھود علیہ السلام

(ومن يتق الله يجعل له مخرجا
ويرزقه من حيث لا يحتسب)
واخبر سبحانه عن نبيه نوح
عليه السلام انه قال لقومه:
(استغفروا ربكم انه كان
غفارا يرسل السماء عليكم مدرارا
ويمددكم باموال وبنين ويجعل
لكم جنات ويجعل لكم انهارا)
وقال عن نبيه هود عليه السلام
انه قال لقومه:
(ويا قوم استغفروا ربكم ثم
توبوا اليه يرسل السماء عليكم
مدرارا ويزدكم قوة الى قوتكم
ولا تتولوا مجرمين)
وقال تعالیٰ:
(ولو استقاموا على الطريقة
لاسقيناهم ماء غدقا لنفتنهم
فيه ومن يعرض عن ذكر ربه
يسلكه عذابا صعدا) ...
والايات في هذا المعنى كثيرة
وصح عن النبي صلى الله عليه
وسلم انه قال:
(ايها الناس توبوا الى الله

کے متعلق بتایا کہ انھوں نے اپنی قوم سے کہا: "اور
اے میری قوم تم اپنے گناہ اپنے رب سے معاف کراؤ
پھر اس کی طرف متوجہ رہو وہ تم پر خوب بارش
برسائے گا، تم کو قوت پر قوت دے گا (دیکھو)
مجرمانہ اعراض مت کرو۔" نیز ارشاد فرمایا ہے۔
"اور اگر یہ لوگ ہمارے راستہ پر قائم رہتے تو ہم ان
کو فراغت کے پانی سے سیراب کرتے تاکہ اس میں
ان کا امتحان کریں۔ اور جو شخص اپنے پروردگار
کی یاد سے روگردانی کرے گا اللہ اس کو سخت
عذاب میں داخل کرے گا۔"

اس مفہوم کی اور بہت سی آیتیں ہیں اور
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بروایت صحیح
ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا اے لوگو (اپنے رب)
اللہ سے توبہ و استغفار کرو۔" میں دن بھر میں
سو مرتبہ خدا سے توبہ کرتا ہوں!

آپ جانتے ہیں کہ اس وقت بہت سے
ملکوں میں قحط، خشک سالی اور پانی کے تہہ
میں چلے جانے کی بڑی سنگین صورتحال پیدا
ہو گئی ہے۔ بلاشبہ یہ صورت گناہوں اور خطاؤں
کا نتیجہ ہے۔ لہٰذا تمام مسلمانوں پر فرض ہے کہ
وہ اللہ پاک سے توبہ کریں، اس کے دین پر
عمل کریں اور ثابت قدم ہوں اور اس کی نافرمانی
سے بچیں، تاکہ اللہ تعالیٰ ان پر اپنے فضل و کرم کا

واستغفروه فانی اتوب الی اللّٰہ فی کل یوم مائة مرة)

وتعلمون ما حصل فی کثیر من البلاد من الحرب والقحط وغور المیاہ ... ولا شک ان ذلک بسبب الذنوب والخطایا

فالواجب علی المسلمین جمیعا التوبة الی اللّٰہ سبحانه والاستقامة علی دینه والحذر من معاصیه حتی یجود علیهم من فضله ویرفع عنهم ما اصابهم من الشدة کما قال تعالی :

(ومن یتق اللّٰہ یجعل له من امره یسرا).

وقال تعالی :

(ولو انهم اقاموا التوراة والانجیل وما انزل الیهم من ربهم لاکلوا من فوقهم ومن تحت ارجلهم) الآیة ..

واللّٰہ سبحانه علیم حکیم فیما یقدره علی عباده من خصب وجدب وشدة ورخاء کما قال تعالی :

(ولو بسط اللّٰہ الرزق لعباده لبغوا

دروازہ کھول دے، اور مصیبت و پریشانی دور فرمادے جیسا کہ اللہ کا وعدہ ہے کہ "اور جو شخص اللہ سے ڈرے گا اللہ اس کے معاملات آسان کردے گا ــ"

نیز ارشاد ہوا ہے کہ "اور اگر یہ لوگ توریت کی اور انجیل کی اور جو کتاب اب ان کے پروردگار کی طرف سے ان کے پاس بھیجی گئی ہے اس کی پوری پابندی کرتے تو یہ اپنے اوپر سے اور پیروں کے نیچے سے خوب خوب کھانے کے لیے پاتے۔"

اللہ سبحانہ اپنے بندوں پر شادابی وخشک سالی، تنگی وخوشحالی کی جو جو صورتیں رونما کرتا رہتا ہے اس کی مصلحتوں سے وہ خوب واقف ہے اور بڑا حکیم ہے! فرماتا ہے: "اور اگر اللہ اپنے سب بندوں کے لیے روزی فراخ کردیتا تو وہ اودھم مچانے لگتے۔ (اس لیے ایسا نہیں کرتا) بلکہ ایک خاص اندازے سے جتنا رزق چاہتا ہے اتار دیتا ہے، وہ اپنے بندوں کو جاننے والا دیکھنے والا ہے اور وہی ہے جو لوگوں کے ناامید ہو جانے کے بعد مینہ برساتا ہے اور اپنی رحمت پھیلاتا ہے اور وہ کارساز قابل حمد ہے۔"

لہٰذا ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اپنا محاسبہ

فی الارض ولکن ینزل بقدر ما یشاء انه لعباده خبیر بصیر وهو الذی ینزل الغیث من بعد ما قنطوا وینشر رحمته وهو الولی الحمید).

فعلی کل مسلم ان یحاسب نفسه ویتوب الی الله من ذنوبه توبة صادقة وان یجتهد فی اداء ما اوجب الله علیه وترك ما حرم لان ذلك هو سبب السعادة والنجاة فی الدنیا والاخرة وهو ایضا من اسباب اصلاح المجتمع وتیسیر اموره وسلامته من کل ما یضره.

فاتقوا الله عباد الله وتوبوا الیه من جمیع الذنوب وتواصوا بحق الله وتعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان وامروا بالمعروف وانهوا عن المنکر تفوزوا بکل خیر وتسلموا من کل شر..

وقد عزمنا علی الاستغاثة ان شاء الله یوم الاثنین الموافق الحادی عشر من شهر ذی القعدة عام ۱۳۹۴ھ .. فقدموا معشر المسلمین بین یدی الله التوبة الصادقة

کرے، اور پھر اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی صدق دل سے معافی مانگے، اور پھر خدا نے اس پر جو ذمہ داریاں ڈالی ہیں ان کے ادا کرنے کی کوشش کرے اور ان تمام چیزوں سے دست کش ہو جائے اور انھیں ترک کر دے جن کو خدا نے اس پر حرام فرمایا ہے کہ یہی دنیا و آخرت کی بھلائی اور نجات و گلو خلاصی کا ذریعہ ہے، اور یہی معاشرہ کے سدھار اور اس کے معاملات کو تمام ضرر رساں چیزوں سے بچانے اور آسان و سہل بنانے کا راستہ ہے۔

پس اے بندگان خدا! خدا سے ڈرو، اور اپنے تمام گناہوں کی اس سے معافی چاہو، اور ایک دوسرے کو حقوق اللہ کے ادا کرنے کی نصیحت کرو، بھلے اور نیک کاموں میں باہم تعاون کرو، نافرمانی و سرکشی میں کوئی تعاون نہ کرو، بھلے کاموں کا حکم دو اور برے کاموں سے روکو، تاکہ تمہیں ہر بھلائی اور سعادت نصیب ہو اور ہر برائی اور بلا سے محفوظ رہو۔

اللہ کو اگر منظور ہے تو ہم نے ۱۱ ذیقعدہ سنہ ۱۳۹۴ھ بروز دوشنبہ صلوٰۃ استسقاء پڑھنے کا ارادہ کیا ہے، پس اے برادران اسلام اس دن خدا کی بارگاہ میں سچی توبہ کرو، نیک عمل نفراً

والعطف ايضا لهم ورحمة الفقراء والمساكين ومواساتهم والاحسان اليهم وصلة الرحم والحذر من الشحناء والتهاجر .. والله المسؤول ان يصلح قلوبنا واعمالنا جميعا وان يرحمنا برحمته الواسعة وان يغيث القلوب بالايمان والارض بالمطر وان يعيذنا من شرور انفسنا وسيئات اعمالنا وان ينزل علينا الغيث ولا يجعلنا من القانطين انه جواد كريم ..

والسلام عليكم ورحمة الله وبركاته.

ومساکین کی غمخواری اور ان کے ساتھ حسن سلوک نیز صلۂ رحمی اور عداوت و قطع تعلق سے پرہیز کا عمل پیش کرو!

خدا ہی سے التجا ہے کہ وہ ہمارے دلوں کی اصلاح فرمائے، ہمارے اعمال کو درست فرمائے، اپنی رحمت بیکراں سے نوازے، دلوں کو دولت ایمان سے اور زمین کو باران رحمت سے شاداب کرے۔ ہمارے نفس کی شرارتوں اور اعمال کی نحوست سے ہمیں پناہ دے، بارش کی رحمت عطا کرے اور مایوس اور نامرادوں میں سے ہمیں نہ کرے کہ وہ بڑا سخی و فیاض کریم و بندہ نواز ہے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

اپیل کا مضمون ختم ہوا۔ اس کے بعد یہ بات بھی ذکر کردینی بجا ہے کہ پروگرام کے مطابق صلوٰۃ استسقاء ہوئی اور رب العباد نے اس کے ساتھ ہی آسمان کے دہانے پیاسی زمین کی سیرابی کے لیے کھول دیے۔ خصوصاً سعودی مملکت کے پورے علاقہ میں بھرپور بارش ہوئی ـــــ خدا نے چاہا تو اس حسن ایمان و عمل کو آخرت میں بھی وزن ملے گا اور مرحوم کا شمار ان خوش نصیبوں کے زمرے میں ہوگا جن کے لیے ارشاد ربانی ہے۔

وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّن دَعَا إِلَى اللَّهِ

وَعَمِلَ صَالِحًا وَقَالَ إِنَّنِي مِنَ الْمُسْلِمِينَ ○

(ترجمہ: اور اس سے اچھی بات کس کی ہے جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کو اپنایا اور کہا میں فرمانبرداروں میں سے ہوں) (سورۂ حم السجدہ ع ۵)

درسِ قرآن ــــ محمد منظور نعمانی

مرکزوالی مسجد ــــ یکشنبہ ۱۸ مئی ۱۹۷۵ء

● اُمّتِ مُسلمہ کا مقام ومنصب اور لائحہ عمل
● عبادت، نیکوکاری اور راہِ حق میں جانبازی
● اللہ تعالیٰ کی طرف سے پشت پناہی اور مددگاری کا وعدہ

حمد و صلوٰۃ، اعوذ اور بسم اللہ کے بعد

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ○ وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ ۚ هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ ۚ مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ ۚ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِنْ قَبْلُ وَفِي هَٰذَا لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ ۚ فَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَاعْتَصِمُوا بِاللَّهِ هُوَ مَوْلَاكُمْ ۖ فَنِعْمَ الْمَوْلَىٰ وَنِعْمَ النَّصِيرُ ○

(سورۃ الحج آیات ۷۷ - ۷۸)

اے ایمان والو! تم رکوع و سجود کیا کرو اور اپنے پروردگار کی عبادت میں سرگرم رہو، اور نیکی اور بھلائی کے سب کام کیا کرو، تاکہ تم فلاح پاؤ، اور بامراد ہو جاؤ۔ اور اللہ کی راہ میں جدوجہد

کرو اور جان لڑا دو، جیسی جدوجہد اور جانبازی اُس کا حق ہے، اُس نے (بڑی سعادت اور اپنے دین حق کی امانت و خدمت کے لئے انسانی گروہوں میں سے) تم کو چُن لیا ہے۔ اُس نے تمہارے لئے دین میں کوئی مشکل اور تنگی نہیں رکھی (بلکہ وسعت اور آسانی رکھی ہے) راہِ عمل تمہارے بزرگوار ابراہیم کی، اس نے تمہارا نام "مسلمین" رکھا ہے پہلے سے اور اِس (آخری کتاب قرآن) میں بھی، تاکہ ایسا ہو کہ رسُول تم کو بتانے والا ہو اور تم دوسرے سب لوگوں کو بتانے والے ہو جاؤ۔ پس پورا اہتمام کرو تم نماز کا اور ادا کیا کرو زکوٰۃ اور مضبوطی سے تھام لو اللہ کو (اور اس کے دین کو) وہ تمہارا کارساز ہے سو بہت ہی اچھا کارساز ہے اور بڑا اچھا حامی و مددگار۔

(سُورۂ حج آیۃ ۷۷، ۷۸)

(تفسیر و تشریح) یہ سورۂ حج کی بالکل آخری دو آیتیں ہیں، انہی پر سُورت ختم ہوگئی ہے۔ میں نے اس سے پہلے بھی بار بار بتلایا ہے کہ اکثر ایسا ہے کہ قرآن پاک کی بڑی سورتوں کے آخری حصہ اور خاتمہ میں سورت کا خاص پیغام ہوتا ہے۔ ان دو آیتوں کی نوعیت بھی یہی ہے ـــــ یہ بہت تھوڑے سے الفاظ میں اُمّتِ مسلمہ کا جامع منشور ہے، اس میں اُمت کا نصب العین اور لائحہ عمل متعین کیا گیا ہے اور اس کی پیروی کی شرط پر دُنیا و آخرت میں فلاح و کامیابی اور خداوندی حمایت و نصرت کا وعدہ فرمایا گیا ہے۔

سورت کے شروع میں خطاب منکرین اور مشرکین سے تھا۔ پہلے رکوع میں جو "یَا اَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمْ اِنَّ زَلْزَلَۃَ السَّاعَۃِ شَیْئٌ عَظِیْمٌ" سے شروع ہوا تھا، قیامت کی ہولناکی کا بیان کیا گیا تھا اور ایک حد تک الفاظ میں اس کی تصویر کھینچ دی گئی تھی، اور اسی کے ساتھ قیامت کے منکروں اور اس کے بارہ میں شک شبہ کرنے والوں پر عقلی حجت بھی قائم کی گئی تھی (یَا اَیُّھَا النَّاسُ اِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ تُرَابٍ الخ) ـــــ پھر دوسرے رکوع میں شرک کی بُرائی بیان کی گئی تھی اور دلائل سے سمجھایا گیا تھا کہ شرک سب سے گندی معصیت ہے اور عقل و فطرت کے بھی خلاف ہے اور اس کا آخری انجام دوزخ کا بے پناہ عذاب ہے۔

اس کے بعد مشرکین مکہ کے اس ظالمانہ رویّہ کا بیان ہوا تھا کہ وہ ایمان والوں اور خدائے واحد کے پرستاروں کو خانۂ کعبہ میں اور مسجد حرام میں عبادت کرنے سے روکتے ہیں۔ حالانکہ کعبہ کے معمارِ اوّل

حضرت ابراہیمؑ نے اس کو خدائے واحد کی عبادت ہی کے لیے بنایا تھا اور توحید کا مرکز قرار دیا تھا۔ — اس کے بعد ضمناً حج کے اُن ارکان و مناسک کا کچھ بیان فرمایا گیا تھا جن کی بنیاد بحکم خداوندی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ڈالی تھی اور توحید اور خدائے واحد کا ذکر ہی ان سب ارکان و مناسک کی روح تھی اور ہے — اس کے آگے اُن ظالم مشرکینِ مکہ کے خلاف جو خانۂ کعبہ پر قابض تھے اور جنھوں نے اہلِ ایمان کو اپنے ظلم و ستم کا تختۂ مشق بنا رکھا تھا اور اللہ کے خاص شہر مکہ میں اُن کو امن سے رہنے بھی نہیں دیتے تھے، اُن کے خلاف جہاد کا اعلان کیا گیا تھا، اور مظلوم مسلمانوں کو طاقت استعمال کرنے کی اجازت دی گئی تھی۔ یہ مضمون اس آیت سے شروع ہوا تھا۔ "أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ" اس سلسلہ مضمون میں یہ بشارت بھی دے دی گئی تھی کہ اللہ تعالیٰ مظلوم مسلمانوں کی مدد کا فیصلہ کر چکا ہے اور وہ ظالم دشمنوں پر غالب آئیں گے اور فتح یاب ہوں گے — پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اعلان فرمایا گیا تھا اور آپؐ پر ایمان لانے والوں اور انکار و مخالفت کرنے والوں کا اخروی انجام بیان کیا گیا تھا، اور اس مضمون سے متعلق کچھ ضمنی باتیں بیان فرمائی گئی تھیں۔

اس سب کے بعد اس آخری رکوع میں توحید کے حق میں اور شرک و مشرکین کے خلاف ایک بہت ہی عام فہم اور روشن ترین دلیل گویا چیلنج کے طور پر یہ پیش کی گئی کہ — اے مشرکو! جن خود ساختہ معبودوں کو تم حاجت روا اور مشکل کشا سمجھ کر اپنی حاجت روائی اور مشکل کشائی کے لیے پکارتے ہو اور انکی دہائی دیتے ہو وہ تو اتنے عاجز اور بے بس ہیں کہ سب مل کر ایک مکھی بھی نہیں بنا سکتے اور اگر ان کے چڑھاوے وغیرہ میں سے مکھی کچھ اُچک لے جائے تو اس سے یہ چھین بھی نہیں سکتے — پس ایسی عاجز اور بے بس مخلوق کو حاجت روا سمجھ کر پکارنا اور اُن سے حاجتیں مانگنا اور ان پر چڑھاوے چڑھانا کتنی بڑی حماقت اور سفاہت ہے — فرمایا گیا تھا "إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ لَن يَخْلُقُوا ذُبَابًا وَلَوِ اجْتَمَعُوا لَهُ ۖ وَإِن يَسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَّا يَسْتَنقِذُوهُ مِنْهُ ۚ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوبُ" — آگے فرمایا گیا کہ ان کی یہ گمراہی بنیادی طور پر خدا سے اُن کی ناآشنائی اور اس کی معرفت سے محرومی ہے — "مَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ"۔

بالکل یہی حال ہمارے زمانے کے تعزیہ پرستوں اور قبر پرستوں کا ہے، یہ بھی خدا کی معرفت سے محروم اور اس کی رحمت سے ناامید ہیں، اس لئے بجائے خدا کے تعزیوں اور قبروں کو سجدے کرتے ہیں اور اُن سے حاجتیں اور مرادیں مانگتے ہیں، ان کے لئے نذریں اور منتیں مانتے اور ان پر چڑھاوے چڑھاتے ہیں ــــ قرآن مجید ان کو بھی پکار کے کہہ رہا ہے ــــ "اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ لَنْ یَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَہٗ ..... مَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ۔"

اس کے بعد ایک آیت میں مقام رسالت کا بیان فرمایا گیا ہے اَللّٰہُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ط اِنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌۢ بَصِیْرٌ ۝ مطلب یہ ہے کہ تمہارے یہ خود ساختہ معبود تو کچھ بھی نہیں، ہاں اللہ تعالیٰ جن ہستیوں کو منصبِ رسالت یعنی اپنی پیغام بری اور پیام رسانی کے لئے انتخاب فرماتا ہے خواہ وہ فرشتے ہوں یا انسان، وہ اللہ کے برگزیدہ اور صاحبِ مقام بندے ہوتے ہیں، لیکن خدائی میں دخیل و شریک وہ بھی نہیں ہوتے ــــ جو کچھ ہوتا ہے اللہ ہی کے حکم سے ہوتا ہے اور سب کچھ اسی کے اور صرف اسی کے اختیار میں ہے، فرمایا، وَاِلَی اللّٰہِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ۔

اس کے بعد سورت کی یہ دو آیتیں ہیں جو اس وقت زیر درس ہیں، ان میں خطاب اور روئے سخن اہلِ ایمان اور اُمتِ مسلمہ کی طرف ہے اور ان کو ہدایت دی جا رہی ہے کہ تم کو کیا کرنا ہے اور تمہارے لئے فلاح و کامیابی کی راہ کیا ہے اور تمہارا کیا مقام اور منصب ہے۔ ارشاد ہے "یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ارْکَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّکُمْ وَافْعَلُوا الْخَیْرَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝" یعنی اے ایمان والو! ایمان لانے کے بعد تمہارا سب سے اہم اور مقدم کام یہ ہے کہ رکوع و سجود یعنی نماز کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ عبودیت کے رشتہ اور رابطہ کو مضبوط کرو اور اس کی عبادت میں سرگرم رہو اور دوسرے نیک اعمال بھی کرو، مثلاً بندوں کے ساتھ حُسنِ سلوک اور ان کے حقوق کی ادائیگی اور اہلِ حاجت کی خدمت و اعانت وغیرہ ــــ یہی تمہارے لئے سرمایۂ فوز و فلاح ہے ــــ (لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝)۔

اس کے آگے فرمایا گیا ہے "وَجَاہِدُوْا فِی اللّٰہِ حَقَّ جِہَادِہٖ ط ہُوَ اجْتَبٰکُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ" ــــ یعنی نماز و عبادت اور دیگر اعمالِ خیر کے

علاوہ یہ بھی کرو کہ اللہ کے لئے یعنی اُس کے احکام کی تعمیل میں اور اُس کے دین کے فروغ اور اس کی مرضیات کو پھیلانے کے لئے اور اس کی رضا حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کرو اور جان لڑادو، جیسی جدوجہد اور جانبازی اس کا حق ہے، اُس اللہ نے تم پر یہ خاص الخاص انعام واحسان فرمایا ہے کہ اپنے دین کی امانت اور اس کی دعوت وخدمت کے لئے اور ختم نبوّت کے بعد کارِ نبوّت کی انجام دہی کے لئے دُنیا بھر کے انسانی گروہوں میں سے اس نے تمھارا انتخاب فرمایا ہے اور پیمبری کی نیابت کے مقام پر تم کو فائز فرمایا ہے، اور تم کو ایسا دین اور ایسی شریعت عطا فرمائی ہے جس میں تنگی اور بیجا مشقت بالکل نہیں بلکہ وسعت اور سہولت ہے اور انسانوں کی کمزوریوں اور مجبوریوں کی پوری رعایت ہے (وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ)

آگے ارشاد فرمایا گیا ہے "مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ" یعنی خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ جو دین وشریعت اور جو ضابطۂ حیات تم کو ملا ہوا ہے یہ وہی ہے جو تمھارے پدرِ بزرگوار ابراہیمؑ کو عطا ہوا تھا۔ یہ تمھارا بہت بڑا شرف ہے اور اللہ تعالیٰ کا تم پر یہ عظیم انعام واحسان ہے کہ تم کو "ملتِ ابراہیمی" کا حامل و وارث اور داعی بنایا گیا ہے، لہٰذا اس کی قدر کرو اور اس کا حق ادا کرنے کے لئے جان لڑادو۔

یہاں شبہ ہو سکتا ہے کہ امت مسلمہ میں تو دُنیا کی بہت ہی نسلوں کے لوگ ہیں، سب تو ابراہیم علیہ السّلام کی نسل سے نہیں ہیں، پھر حضرت ابراہیمؑ کو سب کا باپ کیسے کہا گیا۔؟ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابراہیمؑ کی نسل سے ہیں اور آپؐ اُن کے نسلی فرزند ہیں تو آپ کی ساری امت بھی آپ کے رشتہ سے حضرت ابراہیم کی اولاد میں داخل ہوگئی، اس حیثیت سے حضرت ابراہیمؑ پوری اُمت مسلمہ کے بھی پدرِ بزرگوار ہیں ——— ایک دوسری بات یہ بھی کہی گئی تھی کہ اس آیت کے خاص مخاطب صحابہ کرام تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی براہِ راست دعوت پر ایمان لائے تھے اور ان میں بہت بڑی تعداد انہی حضرات کی تھی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے تھے۔

آگے فرمایا۔ "هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِنْ قَبْلُ وَفِي هَٰذَا" مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرا شرف وامتیاز اے اہل ایمان تم کو یہ بخشا ہے کہ اگلے زمانوں اور اگلی

کتابوں میں بھی اس نے تمہارا نام "مسلمین" رکھا اور اس آخری کتاب قرآن میں بھی یہی مبارک نام رکھا (جس کے معنی ہیں فرمانبردار اور اطاعت شعار) ——— یہ گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے امتِ محمدی کے لئے وفاداری اور فرمانبرداری کا سرٹیفکیٹ ہے، اور ساتھ ہی اس میں یہ تنبیہ بھی ہے کہ تم ہماری رحمت اور نصرت کے مستحق اس وقت تک ہو جب تک تم فرمانبردار اور اطاعت شعار رہو۔

آگے فرمایا گیا ہے "لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ" ——— "شہید" کے معنی بتانے والے اور حاضر و نگراں کے بھی ہیں اور گواہ کے بھی، حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے اس آیت میں شہید کا ترجمہ بتانے والا کیا ہے، یہاں یہی راجح معلوم ہوتا ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اے اہلِ ایمان اللہ تعالیٰ نے تمہارا انتخاب اس کارِ عظیم کے لئے فرمایا ہے کہ اس کے آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم الٰہی دین و شریعت اور ملتِ ابراہیمی کی تم کو تعلیم دیں اور پھر تم یہ تعلیم و ہدایت دنیا کے دوسرے انسانی گروہوں کو دو۔ ——— اس طرح ختمِ نبوت کے بعد نبوت کی نیابت والا کام یعنی اللہ تعالیٰ کے نازل فرمائے ہوئے دین و شریعت اور ابراہیمی ملت کو دنیا بھر کے انسانوں تک پہنچانے کی ذمہ داری قیامت تک کے لئے امتِ مسلمہ کے سپرد کر دی (لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ ۚ) ——— اور بلاشبہ یہ بہت بڑی ذمہ داری اور بہت بھاری کام ہے اور یہ راستہ بڑا کٹھن ہے۔ اسی لئے آخر میں فرمایا گیا "فَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَاعْتَصِمُوا بِاللَّهِ هُوَ مَوْلَاكُمْ ۖ فَنِعْمَ الْمَوْلَىٰ وَنِعْمَ النَّصِيرُ" مطلب یہ ہے کہ اس بڑی ذمہ داری کو تم جب ادا کر سکو گے جب ان تین چیزوں کو خاص طور سے اپنا کر اللہ تعالیٰ سے خاص رابطہ اور تعلق پیدا کر لو اور اس قادرِ مطلق کی حمایت و سرپرستی حاصل کر لو۔ ایک یہ کہ نماز کا بہت اہتمام کرو اور اسی طرح ادائے زکوٰۃ کا اہتمام کرو (فَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ) اور تیسرے یہ کہ اللہ سے پوری طرح وابستہ ہو جاؤ اور اس کی خاص ولایت و سرپرستی حاصل کر لو (وَاعْتَصِمُوا بِاللَّهِ هُوَ مَوْلَاكُمْ) جب تم ان چیزوں کو پوری طرح اپنا لو گے اور اپنا وظیفۂ حیات بنا لو گے تو اللہ تعالیٰ اپنی [illegible] ساتھ تمہارا حامی و والی اور مددگار رہے گا۔ (فَنِعْمَ الْمَوْلَىٰ وَنِعْمَ النَّصِيرُ ۝) اور پھر تم نیابتِ نبوت کی ذمہ داری ادا کرنے میں کامیاب ہو سکو گے۔

اب یہ بات پوری وضاحت کے ساتھ سامنے آگئی کہ سورۂ حج کی ان دو آخری آیتوں میں امّتِ مسلمہ کا مقام و منصب اور نصب العین اور لائحۂ عمل مرتب طور پر بیان فرما دیا گیا ہے۔ صحابہ کرام کی زندگی (جو آج بھی کتابوں میں محفوظ ہے) ان آیتوں کی عملی تفسیر تھی اور قدم قدم پر "هُوَ مَوْلَاكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلَىٰ وَنِعْمَ النَّصِيرُ" کا ظہور ہوتا تھا لیکن آج جو "مسلمان قوم" موجود ہے اس میں ۹۹ فیصدی سے زیادہ وہ ہیں جن کا "امّتِ مسلمہ" کے اس نصب العین اور لائحۂ عمل سے کوئی تعلق نہیں یا بس برائے نام تعلق ہے۔ اس کا یہ نتیجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اُس نصرت و سرپرستی سے محرومی ہے اور مرنے کے بعد اس کا جو نتیجہ سامنے آنے والا ہے وہ تو بہت ہی سخت ہے "وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَشَدُّ وَأَبْقَىٰ" اللہ تعالیٰ ہمارے اندر اصلاح کی فکر پیدا فرمائے اور سچی توبہ کی توفیق دے۔

اس آیت سے یہ بھی واضح ہدایت ملی ہے کہ امّتِ مسلمہ کا سب سے مقدم فریضہ اور بنیادی کام یہ ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ اور ادائے زکوٰۃ اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ اعتصام و وابستگی کا اہتمام کرے یہی دُنیا و آخرت کی فلاح کا وسیلہ اور اللہ تعالیٰ کی رحمت و نصرت اور اسکی ولایت کے حصُول کا ذریعہ ہے ــــ کس قدر فکر کی بات ہے کہ آج امّت کی غالب اکثریت ان بنیادی ایمانی فرائض سے اسی طرح غافل ہے جس طرح اگلی امتیں یہود و نصاریٰ غافل ہو چکے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ موجودہ "مسلمان قوم" کو "خیر امّت" کا مصداق سمجھنا بہت بڑا دھوکا ہے۔ اس وقت کا سب سے اہم فریضہ اور مقبول ترین جہاد یہ ہے کہ عام مسلمانوں میں اس کا احساس و شعور پیدا کرنے کی اور اس بگاڑ کے اصلاح کی فکر اور کوشش کی جائے۔ اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے ــــ وآخر دعونا ان الحمد للہ رب العلمین و سلام علی المرسلین

مولانا حافظ مجیب اللہ ندوی
جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ

وقت کے ایک صاحبِ حال شیخ کی خدمت میں چند دن

اپنی آنکھوں کے دیکھتے دیکھتے نہ جانے کتنے علماء حقانی اور مشائخ ربانی اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور ہم لوگ ان کے فیض صحبت سے محروم رہے، دن بدن یہ تعداد گھٹتی چلی جارہی ہے اور انکی جگہ لینے والے پیدا نہیں ہو رہے ہیں بلکہ افسوسناک بات یہ ہے کہ عوام تو عوام خواص سے بھی فیض صحبت کا احساس ہی نکلتا جارہا ہے اور وہ اب اس "جنس گرانمایہ" کی تلاش کی کوئی ضرورت ہی نہیں سمجھتے اس وقت چند اہل دل جو باقی رہ گئے ہیں وہ بھی دبا غنیمت ہیں مگر احساس کی کمی یا لاعلمی یا بعض دوسرے حجابات انکی خدمت میں پہنچنے سے مانع بنے ہوئے ہیں جنکی وجہ سے امت کے بہت سے نیک فطرت اور ذی استعداد حضرات اس سعادت سے محروم رہ جاتے ہیں، اس لئے راقم الحروف کا بہت دنوں سے خیال تھا کہ جو مشائخ وقت اس حیثیت سے مشہور و معروف ہیں انکے بارے میں تو کسی تعارف کی ضرورت نہیں مگر وہ حضرات جو زہد و اتقاء، کیفیت عشق و محبت اور اتباع سنت میں بلند مقام رکھتے ہیں مگر اپنی تواضع، کسر نفسی اور فنائیت کی وجہ سے انھوں نے ہمیشہ گوشۂ خموشی اور گمنامی ہی کو پسند کیا اور شہرت کے مواقع سے عموماً دور رہے یہی وجہ ہوئی کہ ان حضرات کے بلند مرتبے سے اہل طلب اور ذی استعداد حضرات جتنا فائدہ اٹھا سکتے تھے وہ نہیں اٹھا سکے۔ ان کا ایک عمومی تعارف کرایا جائے اور یہ تحریر اسی احساس کا نتیجہ ہے۔

راقم الحروف کے نزدیک انہیں بزرگوں میں ایک مولانا محمد احمد صاحب پرتاپ گڑھی مدظلہ ہیں جن کی [زندگی] میں عشق و محبت کی وہ کیفیات نظر آتی ہیں جو ہم مولانا فضل الرحمن گنج مرادآبادی کے حالات میں پڑھتے ہیں ا

کے اندر مولانا محمد قاسم نانوتوی کی سی سادگی، اور نرمی اور مولانا رشید احمد گنگوہی جیسا تقویٰ اور دینی حمیت نظر آتی ہے، راقم الحروف کو اِدھر تین چار مہینے کے اندر کئی بار حاضری کی سعادت حاصل ہوئی اور برسوں سے آنکھیں جن باتوں کو ڈھونڈ رہی تھیں وہ سب اُن کی ذاتِ گرامی میں دیکھیں اور اپنے ذوق کو سو فیصدی تسکین ہوئی۔ اس لئے جی چاہا کہ ہر حاضری کے تاثرات لکھ کر الفرقان میں بھیجدوں، ممکن ہے کہ دوسرے لوگ بھی میرے شریکِ ذوق بن جائیں اور ان کو اس سے کوئی دینی فائدہ پہونچے مگر مولانا کے مزاج کو دیکھتے ہوئے ہمت نہیں ہوئی تھی، مگر اب میں اپنے شدتِ احساس اور بعض دوسرے اہلِ علم کے اصرار سے مجبور ہو کر یہ قدم اٹھا رہا ہوں، اس میں خود اپنے لئے بھی اعجابِ نفس کا خطرہ ہے اور میں اپنے کو اس کا اہل نہیں پاتا کہ اس سلسلہ کے میرے تاثرات شائع کئے جائیں مگر بعض دوستوں کے حسنِ ظن کی بنا پر اسے قلم بند کر دیا ہے اور شائع کرنے کے لئے مولانا نعمانی مدظلہ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتا ہوں کہ وہ عجبِ نفس کے شر سے محفوظ رکھے اور اسے دوسروں کی بھی اصلاح و ہدایت کا سبب بنائے۔

حضرت مولانا محمد احمد صاحب سے سب سے پہلا تعارف ۱۹۶۴ء میں مولوی نور الحفیظ ندوی کے ذریعہ ہوا جو اُس وقت جامعۃ الرشاد میں مدرس تھے اور اُن کے والد مولانا سے تعلق رکھتے تھے وہ اُن کی صحبت میں رہ چکے تھے، رمضان میں وہ مولانا کو قرآن سنایا کرتے تھے اسکے بعد کئی بار حضرت مولانا وصی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں ان کو دیکھنے کا اتفاق ہوا، جب وہ آتے تھے تو مولانا اُن کا بے حد احترام کرتے تھے۔ اور اُن کو اپنی مسند پر بٹھاتے تھے مگر قریب سے انکی خدمت میں حاضری کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ جنوری ۱۹۷۵ء کی کسی تاریخ میں جامعۃ الرشاد کے کام سے الہ آباد جانے کا اتفاق ہوا وہاں یہ علم ہوا کہ مولانا تشریف فرما ہیں۔ مولانا قمر الزماں صاحب اور مولانا عماد الحسن صاحب کے ساتھ مولانا کی خدمت میں ان کے قیام گاہ صابری منزل پہونچا، مولانا نے ازراہ تواضع کھڑے ہو کر ہم لوگوں کا استقبال کیا اور محبت سے معانقہ کیا اور کسی خاص تعارف کے بغیر اس عاجز کو انھوں نے پہچان لیا اور مجلس میں بیٹھتے ہی ان کی شفقتیں دیکھ کر ایسا محسوس ہوا کہ کسی وادیٔ محبت میں پہونچ گیا ہوں اور قلب سکون سے بھر گیا ہے۔ مولانا ہم لوگوں کے ساتھ بیٹھ گئے۔ اور پھر تیزی سے اُٹھے اور چائے کے لئے کسی کو حکم دیا۔ چائے آنے سے پہلے ہی مولانا نے عشق و محبت پر گفتگو شروع کر دی۔ فرمایا کہ اصل چیز محبت ہے، محبت سے ہر راستہ آسان ہو جاتا ہے اور راستے کی ہر تکلیف میں ایک لذت محسوس ہوتی ہے۔ پھر فرمایا کہ محبت اہلِ محبت ہی سے پیدا ہوتی ہے مگر اس راہ میں بہت کم لوگ ٹھہرتے ہیں۔ بعض کچھ دُور چل کر ہمت

بار جاتے ہیں اس سلسلہ میں قرآن کی متعدد آیات اور احادیث سے استدلال فرمایا اور درد و سوز کے متعدد اشعار سنائے۔ دو شعر یاد رہ گئے ہیں ؎

بوالہوس پاؤں نہ رکھیو کبھی اس راہ کے بیچ
منزلِ عشق ہے یہ رہ گزرِ عام نہیں

جا ہے کس واسطے اے درد میخانے کے بیچ
اور ہی مستی ہے اپنے دل کے پیمانے کے بیچ

دل میں اک آگ سی لگی ہے   احسن مجھے زندگی ملی ہے

احسن صاحب مولانا تھانوی کے مجازین میں تھے مولانا اُن کے اور مجذوب صاحب اور خود اپنے اشعار اکثر پڑھا کرتے ہیں، مولانا استدلال میں جب قرآن مجید کی آیات پڑھتے ہیں تو ایک ایک لفظ دل میں اُتر جاتا ہے اسی طرح عشق و محبت کے اشعار وہ جس خاص کیفیت اور پُر درد لہجہ میں پڑھتے ہیں وہ سننے سے تعلق رکھتا ہے۔ درمیان گفتگو میں چائے آگئی تو خود اپنے ہاتھ سے سب کو چائے دی۔ اور خود نہیں پی اور گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ تقریباً ایک گھنٹہ کے بعد ہم لوگوں نے اجازت طلب کی اور واپس اپنی قیام گاہ پر آگئے۔ دوسرے دن مغرب بعد پھر حاضری ہوئی اور عشق و محبت کی گفتگو گھنٹوں جاری رہی۔

۱۲ مارچ ۱۹۷۵ء کو دوبارہ پھر الہ آباد حاضر ہوا، پہونچ کر معلوم ہوا کہ مولانا اپنے وطن پھولپور میں ہیں۔ بہت افسوس ہوا، مگر مولوی عمار احسن صاحب نے اس افسوس کو یہ کہہ کر کم کر دیا کہ کل میں پھولپور جا رہا ہوں آپ بھی ساتھ چل سکتے ہیں۔ دوسرے دن پھولپور کے لئے رختِ سفر باندھ لیا، مگر عین وقت پر مولوی عمار صاحب نے کسی خاص ضرورت سے اپنا سفر ملتوی کر دیا، اُن کے التواء سے مجھے بھی تنہا سفر کرنے میں قدرے تامل ہوا، اس لئے کہ میں راستہ سے ناواقف تھا۔ مگر پھر چند لمحہ بعد ارادہ کر لیا کہ پھولپور ضرور جاؤں گا۔ چنانچہ دس بجے میں پرتاب گڑھ کے لئے روانہ ہوا، بس تقریباً بارہ بجے پرتاب گڑھ پہونچ گئی۔ اب وہاں سے رانی گنج اجگرا کے لئے دوسری بس لینی تھی، جہاں سے اتر کر پیدل یا یکّے کے ذریعہ پھولپور جانا ہوتا ہے چنانچہ دوسری بس ڈیڑھ بجے ملی اور آدھ گھنٹے میں رانی گنج اجگرا

پہونچ گیا۔ اُتر کر یکہ والوں سے پھول پور چلنے کے لئے کہا تو یکہ والے نے پہلا سوال یہ کیا کہ بڑے مولانا کے یہاں چلیں گے یا چھوٹے مولانا کے یہاں۔؟ وہ کسی کا نام نہیں جانتا تھا۔ میں نے اپنے عظمت تصور کی بنا پر جواب میں بڑے مولانا ہی کے یہاں چلنے کو کہا، اور میرا اندازہ صحیح نکلا اور میں یکہ پر بیٹھ گیا۔ اس گاؤں میں ایک دوسرے مسلک کے ایک اور مولوی صاحب ہیں ..... یکہ والے نے چھوٹے مولانا سے انہی کی طرف اشارہ کیا تھا۔ رانی گنج سے پھول پور کا راستہ بہت ہی خراب ہے اس لئے بارہا خیال آیا کہ یکہ کے بجائے پیدل ہی چلنا مناسب تھا، راستہ میں ہی میری چھڑی یکہ سے گر گئی۔ کچھ دور جا کر خیال آیا تو یکے والے سے کہا۔ اُس نے رانی گنج جانے والے ایک سائیکل سوار سے کہا کہ دیکھو مولوی صاحب کی چھڑی گر گئی ہے اگر ملے تو بڑے مولانا صاحب کے یہاں پہونچا دینا۔ ابھی یہ بات وہ کر ہی رہا تھا کہ دور سے ایک شخص تیزی سے سائیکل پر آتا دکھائی دیا۔ قریب آکر اس نے پوچھا کہ آپ ہی کی چھڑی تو نہیں گری ہے۔؟ ہاں میں جواب دیا گیا اور اُس نے فوراً چھڑی حوالہ کی۔ میں نے دل میں کہا کہ یہ اس سفر کی پہلی سعادت ہے۔ غرض افتاں وخیزاں ۱۰ بجے پھول پور مولانا کے دولت کدہ کے سامنے یکہ جا کر رُکا۔ ایک صاحب باہر بیٹھے ہوئے تلاوت کر رہے تھے، اور کچھ مزدور کام کر رہے تھے۔ گھر میں اطلاع کی گئی، مولانا بھی کچھ پڑھنے میں مشغول تھے مگر راقم کا نام سُن کر فوراً باہر تشریف لے آئے اور گلے سے لگا لیا، اور بار بار تبسم میں اپنی خوشی کا اظہار فرماتے رہے اور میں پانی پانی ہو رہا تھا۔ اُن کی تواضع کی بات تھی کہ انھوں نے اس مسرت کا اظہار کیا، ورنہ اُن کے یہاں مجھ سے کتنے زیادہ صاحبِ علم وفضل حاضری دیا کرتے ہیں۔

ملاقات کر کے فوراً اندر تشریف لے گئے اور پھر ایک تشتری میں بسکٹ، کچھ ٹوٹی اور کچھ سالم مٹھائی لئے ہوئے آگئے۔ تھوڑی دیر میں چائے بھی آگئی، مولانا اس وقت تک بیٹھے رہے جب تک میں ناشتہ سے فارغ نہیں ہو گیا۔ فارغ ہونے کے بعد فرمایا کہ کچھ آرام کر لو! میں نے کہا کہ حضرت آرام کی ضرورت نہیں ہے مگر وہ پھر گھر تشریف لے گئے اور بستر لئے ہوئے واپس ہوئے اور چارپائی پر بچھانے لگے۔ مشکل سے میں اس کے بچھانے میں اُن کا شریک ہو سکا۔ حکم کے مطابق میں دس منٹ لیٹا اور پھر اُٹھ گیا۔ باہر آیا تو مولانا کے مکان کی ایک دیوار کی بنیاد کھود کر کاریگر ومزدور اس پر دیوار اُٹھانے کی تیاری کر رہے تھے، میں نے بنیاد دیکھی تو ۲۵ - ۳۰ فٹ لمبی بنیاد کئی جگہ سے ترچھی تھی۔ میں نے کاریگر سے کہا کہ یہ بنیاد تو ٹیڑھی ہے اس نے

کہا کہ اوپر درست ہو جائے گی۔ میں نے کہا بنیاد درست نہ ہوگی تو پھر دیوار کیسے سیدھی ہوگی۔ میں نے اس سے کہا کر سوت لگاؤ، سابل گراؤ، غرض دس منٹ میں میں نے اس کو بنیاد سیدھی کرنے پر راضی کر لیا۔ مزدور کاٹ کر بنیاد سیدھی کر رہے تھے کہ پھر مولانا پھر باہر تشریف لائے اور کھڑا دیکھ کر پوچھا کیا بات ہے۔؟ میں نے بتایا تو فرمایا، بھائی اچھا کیا درست کرادی۔ گویا اُن کے نزدیک سیدھی اور ٹیڑھی کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔ فرمایا کہ لوگوں کے اصرار سے یہ کمرہ بنوانے پر راضی ہونا پڑا۔ مولانا کا پورا مکان زنانہ و مردانہ کچّا ہے بلکہ مردانہ تو کئی جگہ سے گرا پڑا ہے اور ایک کمرہ پختہ بننے جا رہا ہے، اسی درمیان میں مولانا نے مولانا لئیق صاحب کو بازار بھیج دیا اور ایک صاحب کو کہیں اور، ایسا محسوس ہوا کہ مولانا کھانے کا اہتمام کر رہے ہیں اور کھانے کے وقت دیکھا تو واقعی اس دیہات میں جتنا اہتمام ممکن تھا وہ سب تھا۔ تھوڑی دیر بعد عصر کی نماز پڑھی گئی۔ جماعت مولانا کے گھر ہی پر ہوئی۔ عصر بعد مولانا اور ہم لوگ کچھ پڑھنے میں مشغول ہو گئے، پھر مغرب کی نماز پڑھی گئی۔ مغرب کی نماز کے بعد کوڑے میں آگ لگا دی گئی، اور ہم سب لوگ آگ تاپنے لگے، تھوڑی دیر بعد مولانا تشریف لائے اور پوال کے بنے ہوئے بیٹھن پر زمین ہی پر بیٹھ گئے اور ہم لوگوں کو چارپائی پر بیٹھے رہنے کا حکم دیا! کسی طرح چارپائی پر بیٹھے رہنے کو جی نہیں چاہتا تھا مگر مجبوری تھی کہ مولانا نے اس پر اصرار کیا۔ پھر مولانا نے نہایت بے تکلفی سے تعلق مع اللہ اور عشق و محبت کی باتیں شروع کر دیں۔ بہت افسوس ہے کہ میں ساری باتیں محفوظ نہیں کر سکا۔ اگرچہ ان میں سے ایک ایک بات حرزِ جان بنانے کے قابل تھی مگر ڈبری کی روشنی میں وہاں نوٹ کرنے کا موقع ہی نظر نہیں آیا۔ یہ سلسلہ عشاء کے وقت تک جاری رہا۔ عشاء سے پہلے کھانا کھایا گیا اور پھر ہم لوگ سو گئے۔

رات کو چار بجے کے قریب نیند میں ایسا محسوس ہوا کہ مولانا آواز دے رہے ہیں کہ اٹھو چار بج گئے۔ میں اُٹھا ضروریات سے فارغ ہو کر بڑے ذوق و شوق سے کچھ پڑھا پڑھایا، پھر اذان ہوئی اور ہم نے فجر کی نماز با جماعت پڑھی جی چاہتا تھا کہ نماز مولانا پڑھاتے اسلئے کہ وہ قرآن بڑے سوز سے پڑھتے ہیں مگر مجھے حکم دیا۔ اسلئے تعمیل کرنا پڑی، میں نماز پڑھانے کا عادی ہوں مگر مولانا کے سامنے آواز بھرّا رہی تھی۔ فجر بعد ہی مجھے روانہ ہونا تھا۔ نماز بعد مولانا چائے خود اپنے ہاتھ سے گھر سے لائے اور چائے پلا کر رخصت کرنے کے لئے ساتھ ہوئے۔ تھوڑی دور چل کر فرمایا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ تم کو ایک تسبیح اور کچھ تحفہ دے رہا ہوں۔ اور ایک تسبیح عنایت کی اور مدرسہ کے لئے مَدِ زکوٰۃ سے پچاس روپے دیئے۔ میں چاہتا تھا کہ مولانا اپنے مکان کے

سامنے کے باغ سے رخصت کر کے واپس چلے جائیں مگر ازراہِ تواضع تقریباً ایک میل تک پیدل مشایعت فرمائی اور پھر بڑے اصرار سے واپس ہوئے، میرے ساتھ اپنے ایک متوسل مولوی ارمان علی کو کر دیا تھا وہ کہنے لگے کہ حضرت کمزوری کی وجہ سے کئی ماہ سے ایک فرلانگ بھی نہیں چل پاتے مگر آج اتنی دور تک چلے آئے اگر آپ جیسے لوگ آتے رہیں تو ان کی کمزوری ہی دور ہو جائے۔ بفضلہ تعالیٰ اس عاجز کو اس دور کے بہت سے بزرگوں کی خدمت میں جانے کا اتفاق ہوا ہے اور سب کے اندر اللہ تعالیٰ نے افادیت کے بے شمار پہلو رکھے ہیں مگر اسکے اظہار میں کوئی مضائقہ نہیں کہ غیر معمولی علم و فضل کے باوجود جو خاکساری، بے نفسی، فنائیت اور عشق و محبت کی کیفیت اور سنّتِ نبویؐ سے شغف (مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے بعد) مولانا کے اندر پایا وہ کم جگہوں میں دیکھنے میں آیا، اکثر مشائخ کی صحبت میں راقم کو کچھ وسوسے بھی پیدا ہوئے مگر ان کی خدمت میں ایک ادنیٰ وسوسہ بھی پیدا نہیں ہوا، جس وقت آخرت پر گفتگو کرتے ہیں تو آخرت کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے آدمی کچھ دیر تک دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا ہے اور اپنے کو سراپا تقصیر محسوس کرنے لگتا ہے۔

ہمارا مزاج ہو گیا ہے کہ ہم اپنے بڑوں کو مرنے کے بعد پہچانتے ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ سارے مسلمانوں تک یہ بات پہونچا دی جائے کہ موجودہ دور میں جو اہل دل رہ گئے ہیں ان سے فائدہ اٹھائیں ورنہ زمانہ ایسا آرہا ہے کہ ہماری آنکھیں انکے جیسا بھی نہ دیکھ سکیں گی، میری نظر میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب، مولانا مسیح اللہ خاں صاحب جلال آبادی، مولانا ابرار الحق صاحب ہردوئی، اور مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی، مولانا قاری محمد طیب صاحب مولانا مفتی محمود صاحب، مولانا انعام الحسن صاحب مرکز نظام الدین، یہ حضرات ہمارے دور کی غنیمت ہستیاں ہیں جن لوگوں کو ان میں سے جن حضرات سے زیادہ مناسبت محسوس ہو وہ ان سے فائدہ اٹھائیں۔ اس وقت راقم الحروف کے پیش نظر مولانا محمد احمد صاحب مدظلہٗ کی ذات گرامی ہے اسلئے انھیں کے بارے میں اپنے کچھ تاثرات اوپر پیش کر چکا ہوں اور کچھ اور واقعات اور تاثرات پیش کر رہا ہوں۔ مولانا محمد احمد صاحب مدظلہٗ اس دور میں اپنی بعض خصوصیات میں ممتاز اور بعض خصوصیات میں اپنی مثال آپ ہیں، اپنی کوتاہ بینی کے باوجود ان کی جلوت و خلوت کی زندگی کے سرسری مطالعہ سے جو امتیازی باتیں انکی ذات گرامی میں نظر آئیں وہ یہ ہیں:-

سب سے پہلی چیز ان کا علم و فضل ہے وہ رشد و ہدایت کی جو بات بھی کرتے ہیں اس کے لئے قرآن کی آیات سے ایسا عمدہ استدلال فرماتے ہیں کہ جی عش عش کرنے لگتا ہے، قرآن کا اتنا اچھا استحضار کم لوگوں میں دیکھنے میں آیا۔ اسی طرح حدیثِ نبویؐ اور مشائخ کے اقوال اور مغز تصوّف کی باتیں بھی ان کے نوک زبان رہتی

ہیں ہم جیسے ناقص لوگوں کو جنھیں کچھ علمی خبط بھی ہے اس سے بڑی تسکین ہوتی ہے۔

دوسری ان کی نمایاں خصوصیت اُن کی بے نفسی، تواضع، معصومیت اور فنائیت ہے، اُنکی کسی ادا سے یہ محسوس نہیں ہوتا کہ وہ کوئی بڑے آدمی ہیں۔ حالانکہ وہ بہت بڑے آدمی ہیں۔ اور جب توحید و آخرت، تعلیم و تزکیہ کی باتیں کرتے ہیں تو انکی بڑائی کا پورا اندازہ ہوتا ہے مگر وہ خود کو کچھ نہیں سمجھتے۔ عام طور پر مشائخ کے یہاں ملاقات اور مجلس کا وقت مقرر ہوتا ہے مگر ان کا دربار عام ہر وقت ہر شخص کے لئے کھلا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ راستہ میں لوگ روک کر اپنی ضرورت پوری کرا لیتے ہیں۔ صبح ہو، شام ہو، رات ہو یا دوپہر ان کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا ہے حضرت مولانا فتحپوری رح کے بعض مسترشدین نے بتایا کہ مولانا فتحپوری جب الٰہ آباد میں مقیم ہو گئے تو مولانا اپنے مریدین کو حضرت فتحپوری کی خدمت میں بھیجتے تھے اور مرید ہونے والوں کو بھی اُن کے یہاں جانے کا مشورہ دیتے تھے۔ مولانا فتحپوری فرماتے تھے کہ میں نے ایسا بے نفس شخص نہیں دیکھا جو اپنے مریدوں کو دوسرے کے یہاں بھیجتا ہو۔

ان کی تیسری خصوصیت اُن کا حال ہے، وہ سراپا درد و سوز اور پیکر عشق و محبت ہیں جب وہ خدا اور رسولؐ اور دین سے عشق و محبت کی بات کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آدمی کسی وادیٔ محبت میں پہونچ گیا ہے۔ بات بات پر رقت طاری ہو جاتی ہے۔ اس کیفیت میں وہ پُرسوز انداز میں جب قرآن کی آیتیں پڑھتے ہیں اور پھر اپنے اور حضرت مجذوب صاحب اور دوسرے اہلِ دل کے اشعار ایک خاص انداز سے پڑھتے ہیں تو سننے والا کچھ دیر کے لئے کھو جاتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ جنت کے مزے لوٹ رہا ہے۔

ان کی چوتھی خصوصیت ان کا اتباع سنت اور زہد و اتقا ہے، وہ جہاں انتہائی نرم اور سراپا حلم ہیں وہیں دین کے معاملے میں اُن کی وہی کیفیت ہے جو عام صحابہ کے سلسلہ میں بیان کی گئی ہے کہ وہ اپنی مجلس میں بے تکلف باتیں کرتے رہتے تھے مگر کسی نے اگر خلاف شریعت بات کر دی تو پھر وارث حمایق جیسے (اُن کی آنکھیں بدل جاتی تھیں) یہی حال مولانا کا ہے، وہ ایک طرف انتہائی نرم ہیں لیکن کسی خلافِ سنت کام کی شرکت میں وہ انتہائی سخت بھی ہیں اور اس میں وہ بڑے سے بڑے آدمی کی پروا نہیں کرتے ——

دو واقعات سے ان کی حمیتِ دینی کا اندازہ ہو جائے گا۔ ان کو وراثت میں اچھی خاصی بڑی کاشت کاری ملی تھی۔ ایک بار ایک بڑے زمیندار نے اپنے یہاں شادی کی ایک تقریب میں مولانا کو بھی مدعو کیا۔ مولانا کے یہاں جو صاحب پیغام لے کر آئے اُن سے مولانا نے کہہ دیا کہ بھائی اُن کے یہاں تمام خلافِ شریعت باتیں ہوں گی، اسلئے میں شریک نہیں ہو سکتا —— زمیندار کو یہ بات بہت ناگوار ہوئی اور انھوں نے کہلا بھیجا

کہ اگر وہ نہیں آئیں گے تو ساری کاشت کاری لے لوں گا۔ مولانا نے سُنا تو فوراً ساری کاشت کاری سے دست برداری لکھ کر بھیج دیا۔ اور کہلایا کہ معلوم نہیں وہ لیتے یا نہیں لیتے میں خود ہی اس قصّہ کو ختم کرتا ہوں تاکہ آئندہ پھر کسی خلاف شریعت بات پر وہ مجبور نہ کر سکیں ــــ چنانچہ اس وقت ایک باغ اور کچھ کھیت کے علاوہ اُن کے پاس کچھ باقی نہ رہا ــ مگر معلوم ہوا ہے کہ اُن حضرت کا حشر بھی بہت بُرا ہوا۔

شہر الہ آباد میں ایک معزز آدمی نے اپنے یہاں بیان فرمانے کے لئے مولانا کو مدعو کیا۔ مولانا نے کچھ شرطیں طے کر کے جانا منظور کر لیا۔ مولانا کے ساتھ مولانا قمر الزماں صاحب اور ڈاکٹر ابرار احمد صاحب وغیرہ تھے۔ پہلے مولانا قمر الزماں صاحب سے بیان کروایا اور پھر خود کچھ فرمایا۔ مولانا کا دعا ختم ہوتے ہی ایک بڑے دولت مند گھرانے کے دو لڑکے سلام پڑھنے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ مولانا نے پوچھا کہ یہ کیا۔ تو کہا کہ سلام پڑھ رہے ہیں۔ مولانا اسی وقت تخت سے اُٹھے اور جوتا پہنے بغیر تیزی سے سڑک پر آگئے۔ اب سارے مجمع میں ایک عجیب کیفیت پیدا ہو گئی میزبان وغیرہ سب سڑک پر آگئے اور مولانا ان پر خفا ہوتے رہے فرمایا کہ آپ لوگوں کو یہی کرنا تھا تو پھر مجھے کیوں بلایا تھا؟ انھوں نے واپسی کے لئے موٹر منگائی تو فرمایا کہ میں موٹر پر نہیں بیٹھوں گا۔ پھر بڑے اصرار سے ڈاکٹر ابرار صاحب نے اپنی موٹر میں سوار کیا اور واپس لے آئے۔ دوسرے دن وہ صاحب پھر معذرت کے لئے آئے تو فرمایا کہ بھائی میں کسی مومن کی دل شکنی نہیں کرتا اور نہ کرنا چاہتا ہوں۔ مگر میں خدا اور رسولؐ کو بھی کسی کی وجہ سے ناراض نہیں کرنا چاہتا اور اس سلسلہ میں آپ کی دل شکنی ہوئی ہو تو مجھے معذور سمجھیں۔

عام طور پر مشائخ طریقت اپنے تجربات کی بنا پر اپنی دعوت و اصلاح کا دائرہ اپنے متوسلین تک ہی محدود رکھتے ہیں مگر مولانا کے اندر تبلیغ اور دعوتِ دین کا ایک اُبلتا ہوا جوش معلوم ہوتا ہے، ایک وقت تک جب اُن کے قویٰ مضبوط تھے تو اپنے دیار کے گاؤں گاؤں میں جاکر تبلیغ کرتے تھے۔ اس دیار میں حضرت مولانا سید امین صاحب نصیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ کی اصلاح کا بہت گہرا اثر تھا، مگر آہستہ آہستہ وہ اثر ختم ہو رہا تھا مولانا نے ان اثرات کو باقی رکھنے کی پوری کوشش کی۔ اس سلسلہ میں ان کو بڑی بڑی اذیتیں اور تکلیفیں دی گئیں مگر اُن کی استقامت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ اپنے تبلیغی سفروں میں ہمیشہ اپنا کھانا اپنے ساتھ رکھتے تھے آج بھی وہ کھانے کے معاملہ میں بہت محتاط ہیں۔ شادی بیاہ میں مشکل ہی سے کہیں کھانا کھاتے ہیں۔

مولانا کے خصوصی شیخ تو بس مولانا بدر علی صاحبؒ ہیں جو حضرت گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ کے اجل خلفاء میں تھے۔ مگر انھوں نے اپنے وقت کے تمام مشائخ کی خدمت میں حاضری دی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ مشکل ہی سے کوئی قابل ذکر شیخ ہندوستان کے باقی ہوں گے جن کی خدمت میں مولانا نہ پہنچے ہوں اور ان سے کسب فیض نہ کیا ہو۔ اپنے شیخ مولانا بدر علی صاحب سے ان کو عشق ہے ان کے بارے میں فرماتے تھے کہ وہ غیر معمولی علم و فضل کے مالک تھے انھوں نے مصر و شام جا کر اپنی تعلیم کی تکمیل کی تھی، پوری بخاری شریف ان کے نوک زبان تھی، اگر اپنے کو ایسا مٹایا کہ شیخ کے ہو کر رہ گئے اور دنیا نے ان کی علمی حیثیت کو جانا ہی نہیں، فرمایا کہ وہ اس سادگی سے رہتے تھے کہ اجنبی آدمی ان کو پڑھا لکھا آدمی سمجھ ہی نہیں سکتا تھا، ان کا حال بالکل اپنے شیخ مولانا گنج مراد آبادیؒ کا سا تھا کہ ان کو جب کرتا وغیرہ پہننے کے لیے کہا جاتا تو فرماتے کہ میں بڑوں جیسا لباس پہنوں۔

(بقیہ صفحہ ۴۴)

کو آخری نقطہ تک پہونچا دیا جائے بذات خود حملہ میں شریک ہوگیا سلطان کو اپنے دوش بدوش دیکھ کر تو پھر فوج کے جوش کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ اور آخر کار وہ لمحہ آگیا کہ باب آدرنہ کے قریب ایک برج پر عثمانی جھنڈا بلند ہوگیا۔

قسطنطین یہ دیکھ کر اس کی طرف کی خبر لینے کے لیے جھپٹا، مگر اس وقت شہر میں ترکوں کا داخلہ شروع ہو چکا تھا قسطنطین گھوڑے سے اتر پڑا، شاہی لباس جسم سے الگ کر دیا۔ اور تلوار سونت کر ترکوں پر حملہ آور ہوا، یہاں تک کہ ایک ترک کی تلوار نے اس کا کام تمام کر دیا۔ اور [illegible] اس پچاس روزہ صبر آزما جنگ کا فیصلہ ترکوں کے حق میں ہو گیا۔

ماہنامہ تجلی دیوبند کا

"مولانا عامر عثمانی نمبر"

دو سو سے زائد صفحات [illegible] یہ نمبر انشاء اللہ جولائی کے آخر میں منظر عام پر آ رہا ہے۔ یہ اپنے مواد [illegible] اور تاریخی [illegible] ہمیشہ کے لیے محفوظ [illegible] پیش کیا جائے گا۔

[illegible] تو فوراً سالانہ چندہ ارسال فرما دیں۔ جو [illegible] روپے ہے اگر تجلی [illegible] کے لیے مزید [illegible] بھی روانہ فرما دیں تو پھر نور علیٰ نور۔

[illegible] دفتر ماہنامہ تجلی۔ دیوبند (یو۔ پی)

ڈاکٹر سالم الرشیدی (فاضل ازہر)
ترجمہ: عتیق الرحمٰن سنبھلی

فتح قسطنطنیہ

عزم و استقلال کی ایک عجیب و غریب مثال

[یہ مضمون ۱۸ سال پہلے ربیع ۱-۲ سنہ ۱۳۷۷ ہجری کے شماروں میں شائع ہوا تھا۔ "دوسرے انتخاب نمبر" کے لیے اس کی کتابت کرائی گئی تھی لیکن عدمِ گنجائش کی وجہ سے اُس میں شامل نہ ہوسکا تھا، اب اس شمارے میں شائع کیا جارہا ہے۔]

قسطنطنیہ (جو مملکت ترکیہ کا ایک بڑا شہر ہے اور آج کل استنبول کہلاتا ہے) دُنیا کے نقشہ میں ایک غیر معمولی اہمیت کا مقام ہے۔ یہ اپنے محل وقوع کے اعتبار سے یورپ اور ایشیا کا سنگم ہے۔ فرانس کے نپولین بوناپارٹ کا کہنا تھا کہ "اگر پوری دُنیا ایک مملکت ہوتی تو اس کے دار السلطنت کے لیے قسطنطنیہ سے زیادہ موزوں کوئی مقام نہ تھا"۔ نپولین کی نظر میں اس کی اہمیت اس درجہ تھی کہ روس سے کشمکش کے دوران میں اس نے بارہا [illegible] مملکت ترکیہ کی باہم تقسیم کے معاہدہ پر روس سے صلح کرلی مگر بات ہمیشہ قسطنطنیہ پر آکر ٹک گئی۔ روسی حکومت کا اصرار تھا کہ قسطنطنیہ اُسے ملے مگر نپولین صلح کی انتہائی ضرورت کے باوجود صلح کی یہ قیمت ادا کرنے پر کبھی تیار نہ ہوسکا۔ اس کی نظر میں قسطنطنیہ کی قیمت ترکی کی [illegible] ممالک سے زیادہ تھی۔ وہ کہتا تھا کہ قسطنطنیہ پوری دُنیا کی کنجی ہے، اگر اس پر قبضہ [illegible] تو سارا عالم فتح کیا جاسکتا ہے۔

اپنی اس غیر معمولی اہمیت کی بنا پر یہ شہر ہمیشہ اولو العزم فاتحین و سلاطین کا مرکزِ نظر بنا رہا۔ کتنی ہی قوموں نے اس پر یورش کی، طویل طویل محاصرے ہوئے مگر اپنے خاص نوعیت کے محل وقوع اور اپنی شہر پناہوں کی بے پناہ مضبوطی کی بنا پر عموماً یہ حملہ آوروں

کی دستبرد سے بچا ہی رہا۔

مسلمانوں نے بھی اس کو فتح کرنے کی متعدد کوششیں کیں۔ بعض احادیث میں چونکہ اس فتح کی بشارت وارد ہوئی تھی اس لیے اس کی فتح کی کوششوں کا سلسلہ پہلی ہی صدی ہجری سے شروع ہو گیا تھا۔ پہلی صدی ہجری میں دو بڑی کوششیں اس سلسلہ میں ہوئیں۔ ایک امیر المومنین حضرت معاویہؓ کے عہد میں اور دوسری سلیمان بن عبد الملک کے عہد میں مگر ہر قسم کی زبردست جنگی تیاریوں اور بے پناہ ہمت و شجاعت کے مظاہروں کے باوجود مسلمان فوجیں اس مہم کے سر کرنے میں ناکام رہیں۔

اس بشارت کی تکمیل کی سعادت عثمانی ترکوں کے لیے مقدر تھی۔ عثمانی سلطنت کی داغ بیل ساتویں صدی ہجری میں ایشیائے کوچک کے ایک علاقہ میں پڑی جس کا دائرہ عثمانی سلاطین کی اولوالعزمی سے تھوڑے ہی عرصہ میں جنوب مشرقی یورپ تک پھیل گیا۔ عثمانی سلطنت کا یہ حصہ جو جنوب مشرقی یورپ میں واقع تھا، قسطنطنیہ سے ملا ہوا تھا۔ قسطنطنیہ رومی سلطنت کے مشرقی بازو کا پایہ تخت تھا۔ رومی حکومت نے اس نوخیز طاقت سے خطرہ محسوس کیا اور اس کے خلاف طرح طرح کی ریشہ دوانیاں شروع کر دیں۔

تخت قسطنطنیہ کی ان حرکتوں نے عثمانی سلاطین کو یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ قسطنطنیہ کو زیر کیے بغیر انھیں اطمینان نہیں نصیب ہو سکتا۔ چنانچہ بعض سلاطین نے اسے فتح کرنے کی کوششیں کیں مگر اس میں کامیابی نہ ہو سکی اور تخت قسطنطنیہ کی حرکتیں برابر بڑھتی گئیں۔

نویں صدی ہجری کے اواخر یعنی ۸۸۵ھ مطابق ۱۴۵۱ء میں سلطان مراد ثانی کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا محمد تخت نشین ہوا۔ جس کی عمر اس وقت ۲۱ سال تھی۔ اس نے اپنے باپ کے زمانے میں اچھی طرح اندازہ کر لیا تھا کہ قسطنطنیہ کی حکومت عثمانی سلطنت کے پہلو میں ایک کانٹا تھی جسے نکالے بغیر اطمینان حاصل کرنا مشکل ہے۔ علاوہ ازیں تخت پر بیٹھتے ہی اسے قسطنطنیہ کی حکومت کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا ذاتی طور پر بھی تجربہ ہو گیا۔ اس لیے اس نے ضروری سمجھا کہ وہ قسطنطنیہ پر ایک فیصلہ کن حملہ کرے اور اس کے خرخشوں سے ہمیشہ کے لیے نجات پائے۔ چنانچہ اس نے تیاریاں شروع کر دیں اور تقریباً دس ماہ کی لگاتار تیاریوں کے بعد ۲۶ ربیع الاول ۸۵۷ھ مطابق ۶ اپریل ۱۴۵۳ء کو ایک جرار لشکر کے ساتھ قسطنطنیہ کے سامنے پہنچ کر اس کا محاصرہ شروع کر دیا۔

یہ محاصرہ کوئی سات ہفتے یعنی پچاس دن تک جاری رہا۔ اس پورے عرصہ میں سلطان کی فوج کو پیہم ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑا۔ غیر معمولی نقصانات ہوئے اور کوئی تدبیر، شہر میں داخل ہونے کی کارگر نہ ہو سکی۔ مگر با ایں ہمہ نہ سلطان کی فوج میں ایک لمحہ کے لیے بھی بد دلی پیدا ہوئی اور نہ سلطان کے پائے ثبات کو کوئی لغزش بلکہ اس کے برعکس بالکل یہ حال رہا ہے جیسے

بڑھتا ہے یہاں ذوقِ گنہ ہر سزا کے بعد

اور آخر کار اسے فتح نصیب ہوئی جس کے بعد اس کا نام ہی "محمد فاتح" پڑ گیا۔

عزیمت و استقلال کی یہ مثال آج پانچ صد یاں گزر جانے کے بعد بھی اپنے اندر بڑی تازگی رکھتی ہے اور اس سے بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے، اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے مخدوم و محترم جناب مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کو کہ ان کے توسط سے انڈونیشی فاضل ڈاکٹر سالم الرشید (فاضل ازہر) کی کتاب "محمد الفاتح" ہمارے مطالعہ میں آئی جو سلطان موصوف پر ایک تحقیقی کتاب ہے ۔۔۔

فتح قسطنطنیہ کی یہ داستان جو ذیل میں پیش کی جا رہی ہے۔ اسی کتاب کی دو فصلوں کی تلخیص ہے اور اس کے پیش کرنے کا مقصد یہی دکھانا ہے کہ عزم و استقلال کے آگے کیسی کیسی مشکلات پانی ہو جاتی ہیں]

ع، س

قسطنطنیہ یورپ کے جنوب مشرقی گوشہ کا آخری، ساحلی مقام ہے جسے تین طرف سے سمندر نے گھیر کر مثلث بنا دیا ہے۔ اس مثلث کا ایک زاویہ مشرق میں ہے، دوسرا جنوب مغرب میں اور تیسرا شمال مغرب میں۔ جنوب میں (جنوب مغربی زاویہ سے مشرقی زاویہ تک) بحر مرمرہ ہے۔ شمال میں (شمال مغربی زاویہ سے مشرقی زاویہ تک) "القرن الذہبی" (GOLDEN HORN) نامی ایک خلیج ہے جو آبنائے باسفورس سے نکلتی ہے۔

شمال اور جنوب کے دونوں ساحلی خط مشرق میں آبنائے باسفورس پر جا کر مل جاتے ہیں۔۔۔ اس طرح قسطنطنیہ تین طرف سے سمندر سے گھر جاتا ہے جو ان سمتوں سے اس کی حفاظت کا ایک قدرتی انتظام ہے۔ باقی رہی مغربی سمت تو ادھر خشکی ہے اور قسطنطنیہ اسی سمت سے یورپ کے باقی حصہ سے ملتا ہے۔

شمال اور جنوب میں خلیج قرن ذہبی اور بحر مرمرہ کے کنارے سے آبنائے باسفورس تک کھڑی شہر پناہ کی یکے بعد دیگرے تین دیواریں تعمیر کی گئی تھیں جو جنوبی دیوار سے شمالی دیوار تک کوئی چار میل کی لمبائی میں تھیں، پہلی (یعنی اندرونی) شہر پناہ تقریباً چالیس فٹ بلند تھی اور اس میں مناسب فاصلے سے بڑے بڑے زبردست برج بنے ہوئے تھے۔ عملی ہ۔ دوسری (یعنی بیرونی) شہر پناہ تقریباً پچیس فٹ اونچی تھی اور اس میں بھی اسی طرح کے برج تھے۔ ان دونوں لائنوں میں کوئی پچاس ساٹھ قدم کا فاصلہ تھا۔ دفاعی نقطۂ نظر سے ازمنۂ وسطیٰ میں کسی شہر کی حفاظت کے لیے یہ دوسری دفاعی لائن بجائے خود بہت کافی تھی مگر نہ صرف اس سے بھی زیادہ مستحکم ایک شہر پناہ اس سے پہلے تھی (جسے اندرونی شہر پناہ سے تعبیر کیا گیا) بلکہ اس کے بعد تھوڑا سا میدان چھوڑ کر ایک تیسری شہر پناہ اور تھی۔ جو اگرچہ پہلی دو کی طرح مضبوط اور اونچی نہ تھی مگر بہرحال تھی۔ اور پھر اس کے آگے ایک وسیع خندق تھی جس کا عرض تقریباً ساٹھ قدم تھا۔

اس طور پر گویا قسطنطنیہ کی مغربی سمت میں جو خشکی کی سمت تھی چار دفاعی خطوط تھے۔ ایک خندق۔ اور اس کے بعد یکے بعد دیگرے تین شہر پناہیں۔

خارجی شہر پناہ کے اندر متعدد دروازے تھے جن میں تین کا ذکر محاصرہ اور حملہ کی کیفیت سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔ (۱) باب ادرنہ (۲) باب القدیس رومانس یا توپ دروازہ (۳) باب العسکری۔

یہ ہے اس وقت کے قسطنطنیہ کا نقشہ اور اس کے دفاعی استحکامات کی مختصر کیفیت، اب محاصرہ کی کیفیت ملاحظہ فرمائیے۔

سلطان محمد فاتح نے ۵ اپریل ۱۴۵۳ء کو اپنے لشکر کے ساتھ قسطنطنیہ اور اس جانب کی زبردست دفاعی لائنوں کے مقابلہ میں مورچہ جمایا۔

سلطان نے اپنے لشکر کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔

(۱) میمنہ لشکر کا یہ حصہ (یعنی دایاں بازو) قسطنطنیہ کی بیرونی شہر پناہ کے سامنے بحر مرمرہ کے کنارے سے توپ دروازہ تک پھیلا ہوا تھا۔

(۲) میسرہ (یعنی بایاں بازو) یہ حصہ قرن ذہبی کے کنارے سے باب ادرنہ تک تھا۔

(۳) قلب لشکر جس میں بہت چیدہ سپاہی تھے اور جس کی کمان محمد فاتح نے خود اپنے ہاتھ میں رکھی تھی یہ حصہ توپ دروازہ سے باب ادرنہ تک کے درمیانی حصہ میں جما ہوا تھا۔ لشکر کا ایک ٹکڑا بعض مصالح کے پیش نظر قرن الذہب کے اس پار یعنی شمالی جانب میں بھی متعین کیا گیا تھا۔

یہ خشکی کی سمت سے محاصرہ کی کیفیت تھی بحری راستے روکنے کے لیے یہ صورت کی گئی کہ آبنائے باسفورس

جس کے ذریعہ بحر اسود (Black Sea) سے کوئی مدد قسطنطنیہ کو پہنچ سکتی تھی اس کے ایشیائی ساحل پر تو پہلے ہی سے عثمانیوں کا ایک قلعہ (اناطولی حصار) بنا ہوا تھا۔ دوسری سمت یورپی ساحل بھی چونکہ عثمانی سلطنت کے قبضہ میں تھا اس لیے محمد فاتح نے جب قسطنطنیہ پر فوج کشی کا ارادہ کیا تھا تو پہلا کام اس سلسلہ میں یہ کیا تھا کہ ٹھیک "اناطولی حصار" کے سامنے یورپی کنارے پر ایک دوسرا نہایت مستحکم قلعہ "رومی حصار" کے نام سے تعمیر کرلیا تھا اور دونوں طرف قلعوں میں توپیں نصب کرکے نگراں دستے متعین کردیے گئے۔ یوں اس طرح شمال مشرقی سمندر بحر اسود کی طرف سے آبنائے باسفورس میں داخلہ اور قسطنطنیہ سے اُس طرف جانے کا راستہ تو قطعی طور پر بند ہوگیا۔ البتہ اس کے مقابل سمت جنوب مغربی سمندر سے آنے والی امداد کے راستے میں اس قسم کی کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ اگر ادھر سے کوئی امداد آتی تو درۂ دانیال سے گذر کر بآسانی بحر مرمرہ میں ہوتی ہوئی باسفورس میں داخل ہوکر قسطنطنیہ تک پہنچ سکتی تھی۔ اس راستہ کی ناکہ بندی کے لیے محمد فاتح نے تقریباً چار سو کشتیوں کا ایک بیڑا تیار کرایا، اور اسے بحر مرمرہ میں پھیلا دیا گیا تاکہ درۂ دانیال سے آنے والی کوئی امداد آگے نہ بڑھ سکے۔

ان تمام انتظامات کی تکمیل کے بعد مغربی موچوں سے شہر پناہ پر گولہ باری شروع کی گئی۔ جنگ کا اصل مورچہ چونکہ مغربی شہر پناہ ہی تھی۔ ترکوں کا سارا لشکر تقریباً ادھر ہی تھا۔ اس لیے قسطنطنیہ کے فرمانروا شہنشاہ قسطنطین نے بھی اپنی زیادہ تر فوجی طاقت اسی طرف لگا رکھی تھی خود اپنا مستقر اس نے عثمانی جیش کے ٹھیک "قلب" کے مقابلہ میں باب ادرنہ اور توپ دروازہ کے مابین بنایا تھا۔

رومیوں کے سپہ سالار جان جستنیان (JEAN JUSTINIAN) کا ہیڈ کوارٹر بھی اسی حصہ میں تھا۔ ترکی توپ خانوں کی گولہ باری سے جیسے جیسے شہر پناہ کو نقصان پہنچتا تھا رومی سپاہ ویسے ویسے اس کی مرمت کرتی جاتی تھی اور ترکوں کو اس نقصان سے فائدہ اٹھانے کا کوئی موقع نہ دیتی تھی۔ مگر شہر پناہ کا وسطی حصہ جس پر طرفین کی زیادہ توجہ تھی اور جو ایک نہر کی وادی میں واقع ہونے کی وجہ سے نسبتاً کمزور تھا، ۱۸ اپریل کو دن رات کی مسلسل گولہ باری سے اس میں ایک بڑا شگاف پڑ گیا، اور بیچ میں جو خندق حائل تھی وہ ملبہ سے اتنی بھر گئی کہ عبور کی جاسکتی تھی۔

پہلی ناکامی

عثمانی جیش نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شگاف پر زبردست ہجوم کیا سیڑھیاں لگا لگا کر کچھ سپاہی شہر پناہ کے اوپر بھی چڑھ گئے۔ رومی سپہ سالار جستنیان نے جب یہ صورت دیکھی تو وہ اپنی ساری قوت سمیٹ کر ادھر ہی لے آیا اور شدید جنگ شروع

ہوگئی۔ عثمانی فوج نے شام کے وقت یہ حملہ شروع کیا تھا۔ جب اندھیرا چھانے لگا اور کامیابی کی صورت پیدا نہ ہوسکی تو مجبوراً محمد فاتح نے فوج کو پلٹ آنے کا حکم دے دیا۔

دوسری ناکامی

اسی دن ۱۸/اپریل کو عثمانیوں کی ناکامی کا ایک دوسرا واقعہ پیش آیا قسطنطنیہ کے شمال میں "القرن الذہبی" (GOLDEN HORN) نامی جو خلیج تھی جس کا ذکر شروع میں آچکا ہے۔ یہ قسطنطنیہ کی بندرگاہ تھی۔ رومی کشتیوں کا بیڑا اور اطالوی کشتیاں جو ان کی مدد کے لیے آئی تھیں وہ اس میں مقیم تھیں۔ بندرگاہ کی حفاظت کے لیے ان لوگوں نے خلیج کے دہانہ پر فولادی زنجیروں سے رکاوٹ قائم کر دی تھی تاکہ آبنائے باسفورس سے عثمانی بیڑا اس میں داخل نہ ہوسکے اس دن عثمانی بیڑے کی کچھ کشتیوں نے اس رکاوٹ کو توڑنے کی کوشش کی۔ مگر رومی کشتیوں نے سخت مقابلہ کرکے اس کوشش کو ناکام بنادیا۔

تیسری زبردست ناکامی

۲۰/اپریل کی صبح کو سلطان کو اطلاع ملی کہ عیسائیوں کی پانچ جنگی کشتیاں رسد اور فوجی کمک لے کر درۂ دانیال سے بحر مرمرہ میں داخل ہوئی ہیں اور قسطنطنیہ کی طرف بڑھ رہی ہیں، جوں ہی یہ اطلاع ملی سلطان فوراً اپنے ہیڈ کوارٹر سے نکلا اور گھوڑے پر سوار ہوکر نہایت سرعت کے ساتھ باسفورس کے ساحل غلطہ پر پہنچ جہاں بحری کمانڈر بالطہ اوغلی کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ اور بالطہ اوغلی کو یہ حکم دیتے ہوئے کہ فوراً جاکر بحر مرمرہ میں ان کشتیوں سے مڈبھیڑ کرے۔ کہا کہ اگر تم ان کشتیوں کو گرفتار یا غرق نہ کرسکو تو زندہ واپس نہ آنا۔

بالطہ اوغلی کشتیوں کا ایک دستہ لیکر ان کشتیوں کی طرف روانہ ہوا۔ ہوا ان کشتیوں کے موافق تھی اور وہ نہایت تیزی سے بڑھتی چلی آرہی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر میں دونوں طرف کی کشتیاں آمنے سامنے ہوگئیں اور جنگ شروع ہوگئی۔ اس بحری معرکہ کو دیکھنے کے لیے ایک طرف شہنشاہ قسطنطنیہ اور بہت اہل قسطنطنیہ شہر پناہ کے برجوں میں کھڑے ہوئے تھے۔ دوسری طرف محمد فاتح اپنے افسروں کے ساتھ ساحل غلطہ سے اس معرکہ پر نظر جمائے ہوئے تھا۔ ترکوں کو امید تھی کہ ان کی کشتیاں فتحیاب ہوں گی لیکن مقابل کی کشتیاں اگرچہ تعداد میں کم، مگر بہت مضبوط، بڑی اور اعلیٰ درجہ کی تھیں اور اس کے برعکس ترکی کشتیاں اگرچہ کثرت میں تھیں مگر چھوٹی کمزور اور معمولی قسم کی تھیں۔ اس لیے کہ محاصرہ شروع کرنے سے کچھ ہی پیشتر بعجلت بنائی گئی تھیں پھر مقابلہ اطالوی کشتیوں سے تھا جنھیں اس دور میں بحری لڑائی میں مسلّمہ فوقیت حاصل تھی۔ ترک بحری فنونِ جنگ کے مبتدی تھے جبکہ اطالوی اس فن کے مانے ہوئے استاد

اور ماہر۔ پھر ہوا بھی اطالویوں کے موافق، نتیجہ یہ ہوا کہ ان پانچ کشتیوں نے دیکھتے دیکھتے ترکی کشتیوں کے ٹکڑے اڑا دیے اور خلیج القرن الذہبی کے قریب جا پہنچیں، لیکن ابھی کچھ فاصلہ تھا کہ یکایک ہوا رُک گئی اور ساتھ ہی اِن پانچوں کشتیوں کو رُک جانا پڑا۔ اس قدرتی امداد نے ترکوں میں پھر ایک امید کی لہر دوڑا دی۔ بالطہ اوغلی نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی پراگندہ قوت کو جمع کیا اور ایک بار پھر پوری شدت کے ساتھ ان کشتیوں پر حملہ کیا۔ ترک سپاہیوں نے اس حملہ میں اپنی جان کی بازی لگا دی۔ اور ہر قیمت پر اس بات کی کوشش کی کہ قبل اس کے کہ دوبارہ ہوا چلے ان کشتیوں کو سمندر کی تہہ میں پہونچا دیں مگر وہ اس کوشش میں ناکام رہے۔ بالطہ اوغلی پلٹ پلٹ کر حملے کرتا تھا، حتیٰ کہ اس کی ایک آنکھ بھی اس معرکہ میں کام آ گئی۔ ترک سپاہی بُری طرح زخمی ہو رہے تھے۔ پانی میں گر رہے تھے، مگر سود و زیاں سے تمام تر بے خبر ہو کر ایک ہی بات ان سب کی زبان پر تھی کہ بڑھو! آگے بڑھو!!

سلطان فاتح، کنارے پر کھڑا جنگ کا یہ ہولناک منظر دیکھ رہا تھا۔ اپنے آدمیوں اور کشتیوں کی اس بے پناہ تباہی کی وہ تاب نہ لا سکا بے چین ہو کر اپنی جگہ سے بڑھا اور پانی میں اتنی دُور تک گھستا چلا گیا کہ گھوڑا سینے تک پانی میں ڈوب گیا، اب لڑائی کی جگہ کے اور اس کے درمیان مشکل سے گولی کی زد کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ یہاں سے اس نے اپنے کمانڈر کو زور سے للکارا۔ ہاتھ ہلا ہلا کر سپاہیوں کا جوش بڑھایا۔ ترک سپاہی اپنے بادشاہ کے اشارہ پر پروانہ وار نثار ہونے لگے اور قریب تھا کہ غنیم ہتھیار ڈال دے کہ یکایک ہوا حرکت میں آئی اور اتنی تیزی کے ساتھ آئی کہ پانچوں اطالوی کشتیاں تیر کی طرح ترکی کشتیوں کے درمیان سے نکل کر خلیج میں داخل ہو گئیں اور خلیج کا دہانہ پھر سے بند کر دیا گیا۔

کتنی حوصلہ شکن ناکامی تھی۔ اہل قسطنطنیہ اپنی اس فتح پر جتنی خوشی منا سکتے تھے! انھوں نے منائی اور انھیں پورا وثوق ہو گیا کہ ترکوں کو اب مایوس ہو کر واپسی کا فیصلہ کرنا پڑے گا۔ مگر سلطان فاتح اتنی زبردست شکست کھا کر بھی، ایک لمحہ کے لیے بھی یہ سوچنے کو تیار نہیں تھا کہ محاصرہ چھوڑ دے اور قسطنطین کی طرف سے صلح کی جو پیشکش شروع میں آ چکی تھی، اس پر راضی ہو جائے۔ سلطان فاتح کا ایک وزیر جو اندرونی طور پر قسطنطین سے ساز باز رکھتا تھا اور اس فکر میں رہتا تھا کہ کسی طرح سلطان کو فتح کے خیال سے دست بردار کرا دے اس نے بھی اس موقع کو غنیمت جانا، اور یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ وقت اس مقصد میں کامیابی کے لیے نہایت موزوں ہے اس نے سلطان سے کہا کہ مناسب ہوگا کہ اب قسطنطین کی صلح کی پیشکش پر غور فرمائیں اس لیے کہ جب ہم یورپ سے آنیوالی اس معمولی سی مدد کا مقابلہ

نہ کرسکے (اگر کوئی بڑی مدد آگئی (جیسا کہ سنتے ہیں) تو ہم بڑی آزمائش میں پڑجائیں گے اور پھر حملے کا موقع بھی ہاتھ سے نکل جائے گا۔

مگر سلطان تو جیسے قسم کھائے ہوئے تھا کہ قسطنطنیہ فتح کئے بغیر یہاں سے نہ ہٹے گا چنانچہ اس نے اس مشورہ پر مطلق کان نہیں دھرا اور اب اس نے ساری فکر اس پہلو پر مرکوز کردی کہ اپنی کشتیاں کس طرح قرن ذہبی (GOLDEN HORN) میں پہنچائی جائیں۔ کیونکہ اس ایک کام سے بہت سے فائدے تھے۔ ایک طرف تو قسطنطنیہ کی یہ بندرگاہ قبضہ میں آتی تھی۔ دوسری طرف قسطنطنیہ پر اس کی کمزور ترین جانب سے حملہ کرنے کا موقع ملتا تھا کیونکہ شہر پناہ کی جو دیوار اس جانب تھی وہ سب سے زیادہ کمزور تھی، تیسرا فائدہ یہ تھا کہ رومیوں نے اور تمام جوانب سے محفوظ ہونے کی وجہ سے اپنی ساری دفاعی طاقت خشکی کی سمت جو لگا رکھی تھی، ترکوں کے خلیج میں پہونچ جانے پر اس کا منتشر ہونا یقینی تھا اور اس طرح لڑائی کا فیصلہ جلد ہو جانے کی توقع تھی۔ مگر یہ کام ہو تو کیسے ہو خلیج میں داخلہ کا راستہ رومی بیڑے کے قبضہ میں تھا اور عثمانی بیڑا اس کو شکست دینے سے قاصر تھا۔ سلطان نے ایک عجیب و غریب تدبیر سوچی اور ایک رات کے اندر اس پر عمل بھی ہو گیا تدبیر یہ تھی کہ بندرگاہ قرن ذہبی سے تین میل شمال میں اور آگے بڑھ کر آبنائے باسفورس کی ایک دوسری بندرگاہ بشکطاش تھی، (جو عثمانیوں کے قبضہ میں تھی، اور عثمانی بیڑا یہیں لنگر انداز رہتا تھا) اس بندرگاہ سے اور قرن ذہبی کے درمیان جو تین میل کی خشکی ہے اس پر لکڑی کے تختے بچھوائے جائیں اور ان پر روغن اور چربی مل دی جائے اور اس کے بعد بشکطاش سے کشتیاں اٹھوا کر ان تختوں پر ڈال دی جائیں اور انھیں پھسلاتے ہوئے قرن ذہبی میں پہنچا دیا جائے۔

تین میل کا یہ درمیانی راستہ کوئی ہموار راستہ نہیں تھا، کافی نشیب و فراز اس راستہ میں تھے مگر جفاکش ترکوں نے ایک ہی رات کے اندر راستہ کو ہموار بھی بنایا، اس پر تختے بھی بچھائے اور ان پر تیل اور چربی کی مالش بھی کی اور صبح ہونے سے پہلے ستر کشتیاں اسی تدبیر سے قرن ذہبی کے عقبی حصہ میں پہونچا دیں۔ یہ سارا کام ۲۱ اور ۲۲ اپریل کی درمیانی شب میں راتوں رات ہوا اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ رات کے سکون میں اس لمبی نقل و حرکت کا کم از کم احساس رومیوں کو ضرور ہو جاتا خصوصاً جبکہ رومی بیڑا خلیج میں موجود تھا، مگر اس کے سد باب کے لیے فاتح نے دوسری تدبیر یہ کرلی تھی جو بیڑا باہر لگا ہوا تھا اس سے مسلسل گولہ باری ہوتی رہی۔ الغرض کشتیوں کو منتقل کرنے کا کام بالکل حسبِ منشا طریقہ پر انجام پا گیا اور کوئی ناخوشگوار حادثہ پیش نہ آیا۔

ان کشتیوں کے خلیج میں پہونچ جانے کے بعد فاتح نے ایک پل بنوایا جس پر توپیں نصب کی گئیں اور اب خشکی کی سمت کے ساتھ ساتھ اس سمت کی فصیل بھی عثمانی توپوں کی زد میں آگئی۔

چوتھی ناکامی۔ عثمانی توپوں نے جس دن سے گولہ باری شروع کی تھی اس دن سے وہ مسلسل شدید گولہ باری میں مصروف تھیں اور جب کبھی فوج کو پیش قدمی کا موقع مل جاتا تھا وہ بھی حملہ آور ہوتی تھی مگر تقریباً سوا مہینہ اس جدوجہد میں گزر جانے کے باوجود کوئی کامیابی نہ ہو سکی تھی۔ بالآخر فاتح نے ایک اور صورت سوچی اور ۱۶ مئی کی رات میں اہل قسطنطنیہ نے محسوس کیا کہ زمین کے اندر کھدائی ہو رہی ہے۔ سرنگ کی تدبیر تھی اور سوچا گیا تھا کہ فوج اس طریقہ سے شہر میں داخل ہو جائے مگر اہل قسطنطنیہ اس چالاکی کو بھانپ گئے اور جہاں کھدائی محسوس ہو رہی تھی اس کے سامنے زمین کو دور تک خود ہی کھود ڈالا اور پھر اوپر گھات لگا کر بیٹھ گئے اور جیسے ہی ترک نمودار ہوئے ان پر آگ اور آتشیں مادوں کی بارش شروع کر دی۔ جس میں بہت سے ترکوں کی جانیں گئیں۔ کچھ گرفتار ہوئے اور باقی جو لوٹ سکے وہ لوٹ گئے گرفتار شدہ ترکوں کے سر کاٹ کر رومیوں نے شہر پناہ پر سے عثمانی لشکر میں پھینکے اور اس طرح انھیں پست ہمت کرنے کی کوشش کی مگر ترک تو جیسے پست ہمتی اور مایوسی کو جانتے ہی نہ تھے وہ ہمت تو کیا ہارتے۔ سرنگ والی اس تدبیر سے بھی باز نہ آئے۔ اور اس تدبیر کا جو مقصد تھا وہ تو اگرچہ بار بار کے اعادہ سے بھی حاصل نہ ہو سکا، مگر اس کا اثر یہ ضرور ہوا کہ قسطنطنیہ والوں کی جان ضیق میں آگئی اور انھیں ہر وقت یہ دھڑکا لگا کہ پتہ نہیں کب اور کہاں سے ترک نمودار ہو جائیں۔ دہشت و ہراس کا یہ عالم ہو گیا تھا کہ رومیوں کو چلتے پھرتے اور سوتے جاگتے یہ وہم ہوتا تھا کہ ترک سرنگ لگا رہے ہیں اور بس اب ہمارے پاؤں کے نیچے سے نمودار ہوئے۔

پانچویں ناکامی سرنگ والی تدبیر بھی جب مقصد برآری میں ناکام ہوئی تو فاتح کو ایک اور تدبیر سوجھی، اور وہ اس شکل میں ظاہر ہوئی کہ ۲۱ مئی کی صبح کو جب اہل قسطنطنیہ نیند سے بیدار ہوئے تو انھوں نے اچانک دیکھا کہ خارجی فصیل کے سامنے ایک زبردست قلعہ موجود ہے۔ جو اس فصیل سے بھی اونچا ہے۔ یہ پورا قلعہ لکڑی کا تھا اور اس پر موٹی موٹی کھالیں چڑھائی گئی تھیں جنھیں پانی سے تر کر دیا گیا تھا تاکہ آگ اثر نہ کر سکے۔ اس قلعہ میں اوپر نیچے تین خانے تھے، ہر خانہ میں پورے ساز و سامان کے ساتھ سپاہی تھے۔ نیچے کے خانہ میں خاص طور سے مٹی، پتھر اور لکڑی کا ایک بڑا ذخیرہ تھا جو خندق بھرنے کے لیے جمع کیا گیا تھا، اوپر کے خانہ میں خاص طور پر کی سیڑھیاں تھیں جن کے سروں پر آنکڑے لگے ہوئے تھے تاکہ یہ سیڑھیاں فصیل پر ڈالی جائیں تو آنکڑے دیوار کو پکڑ لیں اور ان کے ذریعہ ترک سپاہی فصیل پر پہونچ جائیں۔

ایک عیسائی جو اس قلعہ کا عینی شاہد ہے وہ لکھتا ہے کہ "ترکوں نے جیسا قلعہ ایک رات، بلکہ چار گھنٹے سے بھی کم مدت میں بنا کر کھڑا کر دیا قسطنطنیہ کے سارے عیسائی بھی مل کر ایک مہینے میں بھی ایسا زبردست قلعہ تیار نہیں کر سکتے تھے" اسے جب اہل قسطنطنیہ نے دیکھا تو ان کے اوسان خطا ہو گئے۔

بہر حال یہ قلعہ توپ دروازہ کے سامنے کھڑا کیا گیا، مسلسل گولہ باری سے شہر پناہ میں یوں ہی اس قدر شگاف پڑ چکے تھے کہ اب انھیں بھرنا رومیوں کے بس میں نہ رہا تھا، مزید برآں اس قلعہ سے بھی پتھر برسانے والے آلات کے ذریعہ سنگ اندازی کی گئی جس کے نتیجہ میں فصیل کا ایک بڑا برج ڈھیر ہو گیا اور اس طرح ایک نیا شگاف پیدا ہو گیا، قلعہ کو سنگ باری کے ساتھ ساتھ آگے بڑھاتے ہوئے بیرونی فصیل تک پہونچا دیا گیا، اور برج کے گرنے سے جو نیا شگاف پڑا تھا، اس پر دھاوا بولنے کے لیے باقی لشکر بھی آگے بڑھا، الغرض ادھر نیچے سے بھی یورش ہوئی اور ادھر قلعہ پر جو سپاہی تھے وہ رسیوں کے ذریعہ شہر پناہ پر پہونچنے لگے۔ دوسری طرف رومی بھی مدافعت پر کمربستہ تھے، انھوں نے ایک طرف پوری طاقت سے مدافعت کی اور دوسری طرف قلعہ پر ایسے آتش گیر مادے پھینکے کہ قلعہ پر جو بھیگی ہوئی دبیز کھالیں چڑھی ہوئی تھیں وہ بھی جل اٹھیں اور پورا قلعہ راکھ کا ایک ڈھیر بن گیا۔

یہ جنگ صبح سے شروع ہوئی تھی، رات تک جاری رہی اور کوئی کامیابی ترکوں کو نہ ہوئی، مگر محمد فاتح کے عزم کا حال اس کے باوجود یہ تھا کہ اس نے جب صبح کو وہ عظیم الشان قلعہ راکھ کا ڈھیر بنا ہوا دیکھا تو مسکرایا اور اپنے ماہرین سے مخاطب ہو کر بولا "کل ہم اس ایک کی جگہ چار قلعے بنا کر کھڑے کریں گے"

عام حملہ کا فیصلہ

رومیوں نے مدافعت میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی اور ان کا عزم بھی ترکوں سے اب تک مات نہیں کھا سکا تھا مگر سلطان فاتح نے ہار نہ مان کر بالآخر انھیں تھکا دیا اور اب تک شہر پناہ کے نقصانات کی وہ جس تیزی سے مرمت کرتے رہے تھے، وہ بات اب باقی نہ رہی۔ اور عثمانی لشکر کے تینوں حصّوں (میمنہ، میسرہ، قلب) کے سامنے شہر پناہ میں اب ایسی مستقل جگہیں بن گئیں جن پر عام حملہ کر کے شہر میں داخلہ ممکن تھا۔ سلطان نے جب یہ صورت حال دیکھی تو سمجھ لیا کہ اب فیصلہ کن معرکہ کا وقت آ گیا ہے، چنانچہ اس نے مناسب سمجھا کہ قسطنطین کو ایک آخری پیغام ہتھیار ڈالنے کے لیے بھیجے تاکہ مزید کشت و خون نہ ہو، مگر قسطنطین نے اس کا جواب دیا کہ جزیہ پر صلح کرنے کو تیار ہوں لیکن قسطنطنیہ دے کر صلح نہیں کر سکتا ہوں۔ اس کے لیے تو میں عہد کر چکا ہوں کہ یا قسطنطنیہ کے تخت پر میں رہوں گا یا قسطنطنیہ کی دیواروں کے نیچے دفن ہو جاؤں گا۔

سلطان نے بھی جب اس جواب کو سنا تو یہی کہا کہ میں بھی قسطنطنیہ کو نہیں چھوڑ سکتا ہوں اب یا تو قسطنطنیہ کا تخت میرے قدموں کے نیچے آئے گا یا وہاں میری قبر بنے گی۔

سلطان کے ساتھ ساتھ اس کے لشکر کے عزم و حوصلہ کا بھی یہی حال تھا۔ چنانچہ جب سلطان نے اپنی جنگی کونسل کا اجلاس منعقد کر کے عام حملہ کا فیصلہ کیا اور پھر اپنے سپہ سالار کو ہدایت کی کہ وہ اس فیصلہ پر فوج کا ردّعمل معلوم کرے۔ تو سپہ سالار نے جونہی لشکر میں اس بات کا اظہار کیا کہ سلطان معظم عام حملے کا حکم دینے والے ہیں ان کی زبانوں سے مارے خوشی کے نعرے بلند ہونے لگے۔

یہ فیصلہ غالباً ۲۵ رمئی کو ہوا، سلطان نے طے کر لیا کہ اب اس فیصلہ کو بلا تاخیر عملی جامہ پہنانا ہے۔ چنانچہ منجملہ دیگر تیاریوں کے حکم ہوا کہ ۲۷ رمئی کو پورا لشکر روزہ رکھے ۲۸ رتک حملہ کے تمام انتظامات مکمل ہو گئے۔
۲۹ رکی شب میں سلطان نے اپنے افسران کو جمع کر کے ضروری ہدایات دیں، جہاد کے سلسلہ کے مخصوص احکام یاد دلائے کہ شریعت نے اس باب میں کیا کیا پابندیاں عائد کی ہیں۔ نیز فتح قسطنطنیہ کی اہمیت بیان کی کہ دنیوی نقطۂ نظر سے سلطنت عثمانیہ کے حق میں اس کے کیا فوائد ہیں اور دینی نقطۂ نظر سے یہ کتنا بڑا اعزاز ہے اور اس کے بعد پورا لشکر صبح کو تازہ دم ہو کر اٹھنے کے لیے آرام میں مصروف ہو گیا۔

رومیوں کو بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ ترک اب کسی بڑے حملہ کی تیاری میں مصروف ہیں۔ چنانچہ وہاں بھی مدافعت کے لیے ہر ممکن تیاری کی جانے لگی۔ ۲۹ رکی شب میں قسطنطین نے بھی اہل قسطنطنیہ کے سامنے ایک پرجوش تقریر کی اور انھیں فوج کے شانہ بشانہ جنگ کرنے پر آمادہ کیا۔

فیصلہ کن حملہ اور فتح

۲۹ رمئی ۱۴۵۳ء مطابق ۲۰ رجمادی الاول ۸۵۷ھ کی صبح ہوتے ہی عثمانی لشکر میں طبل جنگ بجا اور لشکر تیار ہو کر قسطنطنیہ کی فصیل کی طرف بڑھنا شروع ہوا۔ حملہ کی ابتدا عثمانی لشکر کے میسرہ (بائیں بازو) نے کی۔ یہ حصہ جب فصیل شہر سے ایک تیر کی زد پر پہنچ گیا تو ترک کر تیر اندازی شروع کی۔ مدافعین نے بھی جواب میں تیر چلائے طرفین سے تیروں کی بارش ہو رہی تھی کہ ترکوں کی ایک جماعت تیروں کے سایہ میں بڑھ کر فصیل کے نیچے پہنچ گئی اور آن کی آن میں سینکڑوں کمندیں ڈال کر فصیل پر چڑھنے لگے۔ رومی پوری طاقت سے مزاحم ہوئے۔ ترک مع کمندوں کے زمین پر آرہے۔ بار بار کی کوشش میں کچھ اوپر چڑھنے میں کامیاب بھی ہو گئے۔ مگر رومی انھیں برابر نیچے ڈھکیلتے رہے۔ یہ جنگ کوئی دو گھنٹے تک جاری رہی اور اس کے بعد محمد فاتح نے میسرہ کو واپس بلا لیا۔

رومی خوش ہوئے کہ انھوں نے ترکوں کو پسپا کر دیا۔ مگر فوراً ہی عثمانی میمنہ (دایاں بازو)

حرکت میں آیا اور بڑی شدت کے ساتھ حملہ آور ہوا۔ اب رومیوں نے اپنی پوری طاقت اس کے مقابلہ میں جھونک دی یہاں بھی کچھ ترک فصیل پر پہنچ جانے میں کامیاب ہو گئے مگر ترک سپاہیوں کا نقصان زیادہ ہو رہا تھا، فاتح نے جب یہ صورت دیکھی تو فوج کو واپس بلا لیا اور توپ خانہ کو حکم دیا کہ بہت قریب سے فصیل کے اس حصہ پر گولہ باری کی جائے۔ اور شدید گولہ باری کے بعد جب دھواں چھٹ گیا تو میمنہ کو پھر بڑھنے کا حکم دیا۔ لیکن رومی اس دوسرے حملہ کو بھی جھیل لے گئے۔ اور کافی دیر کی جنگ کے بعد محمد فاتح کو پھر، میمنہ کی واپسی کا حکم دینا پڑا۔

اب کی تو گویا رومیوں کو ترکوں کی پسپائی کا بالکل یقین ہو گیا۔ رومی لشکر میں فتح و ظفر کے نعرے بلند ہونے لگے، رومی سپہ سالار جان جسٹنیان جو اس مدافعت کا ہیرو، اور اس کی کامیابی کا اصل باعث تھا۔ اس نے بڑے فخر کے ساتھ شہنشاہ قسطنطین سے کہا عالیجاہ آپ مطمئن ہو جائیے ہماری تلواروں نے دشمن کو پسپا کر دیا ہے۔ لیکن اس غلط فہمی کے ماتحت انہوں نے ذرا سستانے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ ترکوں نے توپوں کے منہ کھول دیے اور اب قلب لشکر نے بڑھنا شروع کیا قلب لشکر بہ نفس نفیس سلطان کی قیادت میں بڑھا۔ خندق پر پہنچ کر سلطان نے لشکر کو ذرا روکا اور تیر اندازوں کو حکم دیا کہ وہ تیر برسائیں اور اس شدت سے برسائیں کہ رومی فصیل سے اوپر سر نہ نکال سکیں اور پھر لشکر کو تیروں کی حفاظت میں آگے بڑھایا جو غضب کی پھرتی سے فصیل کے نیچے جا پہنچا، اور کمندیں ڈال کر آن کی آن میں ترک سپاہی فصیل کے اوپر جا پہنچے اور ایک بار پھر زور و شور سے جنگ چھڑ گئی۔ فریقین نے سمجھ لیا کہ بس یہ آخری معرکہ ہے۔ اس میں جو جیتا وہ جیتا اور جو ہارا سو ہارا۔ رومیوں کی ہمتیں بلند تھیں کہ وہ ایسے دو حملے پسپا کر چکے تھے رومی سپہ سالار جو غضب کا لڑاکا اور جانباز تھا وہ صبح سے بذاتِ خود ہر ہر محاذ پر لڑ رہا تھا بجلی کی طرح کبھی یہاں کوندتا تھا کبھی وہاں، یہ چیز رومیوں کی ہمت اور بڑھائے ہوئے تھی مگر ترکوں نے بھی یہ آخری حملہ بڑی بے جگری کے ساتھ کیا تھا، بعض ترک سپاہیوں نے اس حملہ میں جاں سپاری کے عجیب عجیب نمونے پیش کیے اور بالآخران کا یہ عزم و استقلال رنگ لایا، رومی سپہ سالار شدید طور پر زخمی ہو گیا۔ اس کا میدان سے ہٹنا تھا کہ رومی فوج جی چھوڑ گئی اور اب اگرچہ لشکر کی قیادت قسطنطین نے خود اپنے ہاتھ میں لے لی۔ مگر رومیوں کے حوصلہ پر ایک زبردست ضرب پڑ چکی تھی اور ادھر ترکوں کے حوصلے بڑھ چکے تھے۔ اب ترکوں کے حملے اور تیز ہو گئے اور پھر سلطان بھی یہ محسوس کر گئے کہ اب فیصلہ کی گھڑی آ پہونچی اور ضرورت ہے کہ فوج کے جوش

نئی مطبوعات

(۱) پرانے چراغ
از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
سائز $\frac{22 \times 18}{8 \times 1}$ صفحات ۴۶۴، مجلد قیمت ۱۶/-

(۲) جب ایمان کی بہار آئی
از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
سائز $\frac{22 \times 18}{8 \times 1}$ صفحات ۲۸۰ مجلد قیمت ۱۰/-

ناشر:- مکتبہ فردوس، مکارم نگر، لکھنؤ

مکتبۂ فردوس، تازہ واردانِ بساطِ نشر و اشاعت میں سے ہے۔ مگر اپنی ان ابتدائی مطبوعات میں بھی اس نے دیدہ زیبی کا اچھا معیار پیش کرتے ہوئے اپنے نام کی زیبائی و شگفتگی کی لاج رکھنے کی قابلِ اعتراف کوشش کی ہے۔ مطبوعات کی معنوی قدر و قیمت کے بارے میں کافی ضمانت دینے کے لیے، مولانا علی میاں، مدظلہٗ کا نام نامی کم نہیں ہے۔

"پرانے چراغ" مولانا کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو کچھ معاصر شخصیتوں سے متعلق ان کی وفات کے بعد لکھے گئے۔ یہ ہیں پچیس مضامین ہیں، کچھ غیر مطبوعہ اور زیادہ تر مطبوعہ۔

اس فہرست میں بامحاورہ "مصنف" مشاہیر علماء اور مصنفین بھی ہیں، اساتذہ اور شیوخ بھی، دوست اور رفیق کار بھی، نامور اور شہرۂ آفاق بھی اور ایسے گوشہ نشین و مستور الحال باکمال بھی جن کو ایک محدود حلقۂ احباب کے سوا بہت کم لوگوں نے جانا اور پہچانا"

ان شخصیتوں کو پانچ زمروں میں تقسیم کیا گیا ہے:-

(۱) چند بلند پایہ عالم و رہنما (۲) چند مشائخ کبار و مصلحین (۳) چند اساتذۂ کرام (۴) چند ہستیاں بلند مقام لیکن گمنام۔ (۵) کچھ دوست کچھ بزرگ۔

سب شخصیتوں کے نام درج کرنا تو مشکل ہے۔ چند اُن میں سے یہ ہیں ـــــ مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا سید مناظر احسن گیلانی، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا احمد علی صاحب لاہوری، شاہ حلیم عطا صاحب سلونوی، مولانا مسعود عالم ندوی، جگر مراد آبادی، ڈاکٹر سید محمود

تذکرہ نویسی اور سوانح نگاری مولانا کا خاندانی ذوق ہے۔ اور بقول خود "اس دشت کی سیاحی میں کم سے کم تیسری پشت ہے۔" اس ذوق کے سلسلے میں ان کا یہ خاص مذاق ہے کہ محاسن و مناقب ہی بیان ہوں، خامیوں اور کمزوریوں کا ذکر زبان قلم پر نہ آنے پائے اور اگر ناگزیر طور پر آ ہی جائے تو حسن تاویل سے دبا دیا جائے۔ اس مجموعہ میں بھی شاید صرف ایک .... تذکرہ ایسا ہے جس میں صاحب تذکرہ کی بعض "کمزوریوں" اور ان کی "قابل گرفت" باتوں کی طرف کچھ اشارات مل جاتے ہیں اگرچہ بہت لپے ہوئے۔ در اصل یہ مضمون (ڈاکٹر سید محمود) اپنے انداز اور مواد کے لحاظ سے اس کتاب میں اپنی نوعیت کا ہے ہی اکیلا، مگر ہے بہت معلومات افزا، اور کم از کم تاریخ و اجتماعیات سے ذوق رکھنے والوں میں سب سے زیادہ دلچسپی کے ساتھ پڑھا جانے والا۔

یہ مضامین، جو سب کے سب ایسی شخصیتوں سے متعلق ہیں جو اپنے حالات اور خصوصیات کے لحاظ سے طرح طرح کے بڑے افادی پہلو رکھتی ہیں، ان سے جہاں ان شخصیتوں کے بارے میں قاری کو معلومات حاصل ہوتی ہیں یا اس کی معلومات میں کوئی اضافہ ہوتا ہے، وہاں یہ بھی جاننے کا موقع بھی ملتا ہے کہ ان حضرات کی نظر میں مصنف کا مقام کیا تھا اور کس نوعیت کے تعلقات طرفین کے درمیان تھے؟ ـــ کیونکہ ان تذکروں کا محور ان شخصیتوں سے مصنف کے تعلقات و روابط ہی ہیں اور اسی وجہ سے وہ حالات و خصوصیات جو روابط کے اس محدود دائرے میں منعکس نہیں ہو پائے، قاری کو ان تذکروں میں نہیں ملیں گے۔ ایک دو مضمون البتہ اس سے مستثنیٰ ہیں، جو "گمنام ہستیوں" کے زمرہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

گمنام ہستیوں ہی کے سلسلہ میں ایک بات تبصرہ نگار نے حضرت مصنف کی توجہ دلانے والی بھی نوٹ کی ہے۔ ایک تذکرہ میں شدت جذبات سے یہ شعر مصنف کے قلم سے نکلا ہے:

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنجہائے گراں مایہ کیا کیے

شاعر کے لیے یہاں "لئیم" کا پیرایۂ تعبیر مناسب ہو تو ہو مگر علمائے دین کا اس کو مستعار لیکر بھی زبان وقلم پر لانا بہت عجیب سا محسوس ہوتا ہے، خدا ہی جانے کیسے مکرر اشاعت میں بھی یہ شعر برقرار رہ گیا!

خیر، بڑی باغ و بہار اور متنوع معلومات کی کتاب مصنف کے فیض قلم سے تیار ہوئی ہے۔ اس کے زیادہ تر کردار وہ ہیں جن سے مصنف کو گہرا قلبی لگاؤ تھا یا اُن کی عظمت دل میں [illegible] ہوئے تھی اور یا خود اُن کی طرف سے اپنے ساتھ مصنف کو اس طرح کے تعلق کا احساس تھا اور یہ وہ چیزیں ہیں جن سے بعد از وفات تذکرہ میں وہ رنگ آجاتا ہے جو "خواجہ گیا بود شئے کسی پیکر منقش ورنگ" یا مجموعۂ "حرف وصوت" میں! جہاں کہیں ان چیزوں میں کمی ہے وہاں قدرتی طور سے یہ رنگ بھی اتنا ہی کم ہو گیا ہے۔ مگر جیسا کہ کہا گیا ایسے [illegible] تذکرہ میں کم ہیں۔

ان تذکروں کو محض ذاتی تاثرات ومشاہدات کا مرقع بنا کر مصنف نے کسی شخصیت کے بارے بخل، حق تلفی یا غلط ترجمانی وغیرہ کی کسی شکایت کا موقع کسی دوسرے مداح ومعترف یا معتقد کے لیے نہیں رکھا ہے۔ پھر بھی حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے سلسلے میں تبصرہ نگار کو یہ حیرانی ہوئی ہے اور قابل ذکر محسوس ہوتی ہے کہ خود محترم مصنف کے بیان کردہ مشاہدات وتاثرات سے حضرت مرحوم کی باخدائیت، اوصاف اہل اللہ میں اُن کی عظمت واستقامت اور اعلیٰ ذوق ومذاق کے اعتبار سے نیابت نبوت وفکر کا خدمت بھی سامنے آتی ہے، مگر یہ چیز مجموعی تذکرے میں ایسی دب کر رہ گئی ہے کہ مصنف جیسے اس وصف وکمال کے قدرشناس سے یہ بات حیرت کے سوا کچھ نہیں پیدا کرتی۔

ڈاکٹر سید محمود صاحب کے تذکرے میں ایک بیان کی اشاعت کے لیے ندائے ملت کا حوالہ دیا گیا ہے۔ یہ سہو ہے کیونکہ واقعہ ۶۱ء کا ہے اور یہی لکھا بھی گیا ہے جبکہ ندائے ملت کا اجراء ۶۲ء میں ہوا ہے۔ اسی طرح کچھ اور بھی سہو اس تذکرے میں نظر آتے ہیں مگر اُن کے ذکر سے طوالت ہو جائے گی۔

"جب ایمان کی بہار آئی" ـــــ یہ مولانا کی ایک عربی تالیف کا ترجمہ ہے۔ جو عربوں کو

ہندوستان کی اُس ایمان افروز تحریکِ احیائے دین سے واقف کرانے کے لیے وجود میں آئی تھی جس کا سرحلقہ حضرت سید احمد شہید رائے بریلوی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ اس تالیف کو تحریک کے اُن جستہ جستہ واقعات سے ترتیب دیا گیا تھا جن میں تحریک کی پوری روح اس کی اثر کاری اور قائدِ تحریک کا مقام و مرتبہ پوری طرح آشکارا ہو جائے۔

مولانا کے برادر زادہ مولوی محمد الحسنی صاحب نے (جو عربی اور اردو دونوں میں مولانا کا نقشِ ثانی ہیں) اس کتاب کو اب اردو میں منتقل کیا ہے۔ واقعات کا مآخذ تمامتر مولانا کی "سیرت سید احمد شہید" ہے۔ واقعات کی حد تک ترجمہ میں اسی کے الفاظ بھی محفوظ رکھے گئے ہیں۔ شروع میں ایک مضمون مولانا کے خواہرزادہ مولانا محمد ثانی حسنی کے قلم سے ہے جس میں تیس صفحات کے اندر سید صاحب کے سوانح حیات کی تلخیص کر دی گئی ہے۔

جو لوگ طویل کتابیں پڑھنے کا ذوق یا فرصت نہیں رکھتے انھیں اس مختصر اور ہلکی پھلکی کتاب کے مطالعہ سے اپنی ایمانی روح کو تازہ کرنا چاہیے اور جو مفصل پڑھ چکے ہیں وہ قندِ مکرر کا ایک گونہ لطف اس تلخیص و انتخاب سے اٹھا سکتے ہیں۔

۴۔ دریائے کابل سے دریائے یرموک تک | از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

صفحات ۳۰۰۔ سائز $\frac{18 \times 22}{8}$ مجلد قیمت ۱۴/-

ناشر:- مجلس تحقیقات و نشریاتِ اسلام۔ پوسٹ بکس ۱۱۹ لکھنؤ۔

مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ نے اسلامی نشریات کا جو صاف ستھرا اور سنجیدہ طباعتی معیار قائم کیا ہے یہ کتاب اُس کا بہت پُراثر اور جاذبِ نظر نمونہ ہے۔ مجلس کے صدر و سرپرست مولانا علی میاں ندوی نے رابطہ عالم اسلامی کے ایک وفد کی قیادت کرتے ہوئے افغانستان، ایران، لبنان، شام، عراق اور اردن کا ایک دورہ دو سال قبل (۱۹۷۳ء میں) کیا تھا۔ یہ اسی دورہ کی روداد اور اسی سفر کی داستان ہے۔

دورہ کا مقصد، ان ملکوں کے مسلمانوں کے حالات جاننا، اُن کے علمی و تہذیبی اداروں سے قریبی واقفیت حاصل کرنا، ان کی ضروریات کو سمجھنا اور رابطہ کے مقصد و پیام سے وہاں کے لوگوں

کرایا کرتا تھا۔

یہ روداد سفر عربی میں لکھی گئی اور اولاً اسی زبان میں ترکی سے شائع ہوئی بعد میں چند ندوی فضلاء کے قلم سے اس کا یہ ترجمہ اس اردو ایڈیشن کی شکل میں اردو خواں حضرات کیلیے پیش کیا گیا ہے دورے کے جو مقاصد کتاب کے پیش لفظ سے اوپر نقل کیے گئے ہیں، ان کی وسعت دیکھتے ہوئے اگر کوئی شخص یہ توقع کرے گا کہ ان ملکوں کے مسلمانوں کے ہر قسم کے حالات یا بالخصوص ان کے علمی اور تہذیبی اداروں کی تفصیلات و کیفیات کی تصویر اس کتاب میں دیکھنے کو مل جائے گی تو یہ وسیع پیمانے کی توقع یہاں پوری نہ ہوسکے گی۔ ہاں ایک محدود پیمانے کی معلومات اور ان معلومات سے زندگی کے چند مخصوص دائروں میں ان مسلمانوں کے حالات کا ایک تصور حاصل کرنے میں ضرور اس سے مدد مل سکے گی ——— اور ہم دور افتادہ لوگوں کے لیے اتنی چیز بھی مولانا کا مشکور کرانے کو کم نہیں ہے۔ بالخصوص افغانستان و ایران ان چھ ملکوں میں ایسے ہیں جن کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر سے براہ راست معلومات حاصل ہونے کے مواقع کم از کم ہم ہندوستانی مسلمانوں کے لیے اب تک نایاب سے ہیں، اس لیے جو کچھ بھی ان دو ملکوں کے بارے میں آپ جیسے معتمد سے معلوم ہو جائے وہ قدر ہی کی چیز ہے۔

مولانا کے اس سفر کی پہلی منزل افغانستان تھا جس سے ایک زمانے میں مسلمانان ہند کے اتنے ہی قریبی روابط رہے ہیں جتنی اب دوری ہے اور یہ زمانہ کچھ دور کا نہیں، اب سے پچاس سال پہلے تک کا ہے، اس وقت کا افغانستان دینی صلابت اور اسلامی حمیت کے لیے ضرب المثل تھا۔ تصور بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ بے اعتدالی کی حد تک کی یہ صلابت و حمیت اب قصہ ماضی بن چکی ہوگی۔ سنتے تھے کہ تجدد آگیا ہے، بے پردگی چھانے لگی ہے مگر پھر بھی اندازہ یہاں تک نہیں پہونچتا تھا کہ وہاں کا تجدد ترکی کے کمالی تجدد کے نقش قدم پر ہے۔ اور وہ بھی اس زمانے میں جبکہ خود ترکی میں اس نقش قدم کی مٹی خراب ہونے لگی ہے! لیکن مولانا نے یہ سنا کر ہوش اڑا دیے ہیں کہ جدید تعلیمیافتہ خواتین اور زیر تعلیم لڑکیوں سے خطابات کے مواقع پر ان کے وفد کو نہ صرف مردوں کے حق طلاق، تعدد ازدواج اور پردے کے موضوع پر "گرما گرم" بحثوں کا سامنا ہوا۔ بلکہ ایک موقع پر یہاں تک بھی پیش آیا کہ

"کالج کی خاتون پرنسپل نے مطالبہ کیا کہ تعدد ازدواج کی حرمت کا متفقہ فتوے صادر کردیا جائے۔"

یہ واقعہ جو افغانستان میں پروگرام کے بالکل ابتدائی دنوں میں پیش آیا اس کے بعد کی ساری روداد
یہ بتاتی ہے کہ کم از کم مولانا پر بھی اس ہوش رُبا تجربہ نے ایسا اثر چھوڑا کہ وہ (قیام افغانستان کے) آخر تک
اپنی پراگندہ اعصابی قوت کو مجتمع نہ کر سکے۔ دوسرے واحد رکن وفد سعودی عرب کے پروفیسر شیخ احمد محمد
جمال غالباً کچھ زیادہ مضبوط اور آزمودہ اعصاب کے آدمی تھے، باقی دنوں میں ایسے مواقع پر زیادہ
وہی سامنے ہوتے رہے۔

افغانستان کے بعد ایران آتا ہے: ذرا یہاں سے مولانا کسی خلاف توقع ہوش رُبا خبر کے
بجائے یہ غیر متوقع مژدہ جانفزا سناتے ہیں کہ ایران میں عالمگیر اسلامی اتحاد و اخوت کا وہ جذبہ
تمام مسلمانوں کے ساتھ اپنائیت کا وہ احساس، دینی غیرت وحمیت کا وہ انداز، نیز اسلامی آثار اور
عربی زبان سے وہ دلچسپی اور قرآن پاک کے ساتھ شیفتگی واحترام کا وہ معاملہ دیکھنے میں آیا جس نے
انھیں بڑی خوشگوار مسرت کا ذائقہ دیا۔

یہ خبر ہم سب کے لیے بھی ایسی ہی مسرت کا باعث ہونی چاہیے۔ لیکن مولانا نے چونکہ پیش لفظ
میں یہ لکھ رکھا ہے کہ جیسے بہت سے سیاح طویل قیام اور تفصیلی جائزے اور شخصی ذاتی واقفیت
کے مواقع نہ پانے کی بنا پر دوسرے ملکوں کے متعلق بیانات میں غلطیوں کا شکار ہو جاتے ہیں اس
طرح اُن کے بارے میں بھی اس امکان کو ملحوظ رکھنا چاہیے، اس لیے ایران کے متعلق مولانا کے ان
بیانات کو، جو ٹھوس واقعات و مشاہدات کی شہادت سے خالی محض احساس و تاثرات پر مبنی ہیں، عین
واقعہ مان کر مسرت حاصل کرنے لگنا آسان نہیں رہ جاتا ـــــ جبکہ افغانستان کی روداد سے ٹھیک موا
ہی کی طرح تاثر لینے کی معقول گنجائش اس لیے ہے کہ وہاں ٹھوس واقعات کے حوالے ہیں ـــ تاہم اتنا
اطمینان بھی نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ کسی نہ کسی درجہ میں یہ بیانات مطابق واقعہ ضرور ہیں
کوئی اچھا نمایاں طبقہ ایران میں ضرور ایسا پیدا ہو گیا ہے جس سے مل کر یہ اچھے تاثرات ہوئے ہیں۔

دورہ کے باقی ملکوں کی روداد میں تبصرہ نگار کو کوئی قابل ذکر ندرت شاید اس لیے نہیں معلو
ہو سکی کہ مولانا ہی کے زبان و قلم سے وہاں کے حالات مدتوں سے سننے کا اتفاق رہا ہے اور یہی با
فی الجملہ ناظرین الفرقان کے حق میں بھی کہی جا سکتی ہے۔

کتاب کو مقصد کی روداد ہی تک محدود نہ سمجھا جائے، مصنف کے ذوق کے مطابق ع

سیاحانہ روداد بھی اس کا ایک حصہ ہے۔ تاریخی مقامات و آثار کی سیر و زیارت اور وہاں کے واردات و تاثرات میں اپنے قارئین کو بھی شریک کرنے میں مولانا کی فیاض طبیعت نے کسی طرح کا بخل نہیں کیا ہے۔

خاصا بڑا حصہ تقریروں کا ہے جو مولانا نے اس دورے میں جگہ جگہ فرمائیں۔ کچھ مفصل اور کچھ مختصر — یہ تقریریں جہاں اپنی ایک افادیت رکھتی ہیں وہاں تبصرہ نگار کی طرح کے کچھ قارئین بھی ہو سکتے ہیں جو ایک سفرنامہ میں تفصیلی تقریروں کے بجائے اُن کے تلخیصی ذکر ہی کو زیادہ موزوں خیال کریں۔

ایک بات کچھ عجیب سا اتفاق محسوس ہوئی ہے کہ گو مولانا نے اس دورہ میں جو کچھ فرمایا وہ رابطہ کے متعدد پیام کی ترجمانی ہی ہے مگر رابطہ کا نام ان خطابات میں شاید کہیں بھی نہیں آیا۔ یا کہیں اتفاق ہی سے آیا ہے کہ ان سطروں کی تحریر کے وقت تک وہ ذہن سے نکل گیا — مگر

غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے

۲۔ النبی الخاتم

از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
ناشر:۔ المجمع الاسلامی العلمی۔ ص۔ب ۱۹ لکھنؤ

یہ مولانا کی عربی تصنیف ہے۔ مجلس تحقیقات و نشریات ہی نے شائع کی ہے اور اسی کا عربی نام پتہ درج ہے۔ $\frac{۲۲\times۱۸}{۱۲۸}$ سائز کے ۹۲ صفحات ہیں۔ ندوہ کے عربی پریس میں خوبصورت ٹائپ اور عمدہ کاغذ پر چھپی ہے۔ قیمت درج نہیں۔

نام سے خیال ہو سکتا ہے کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص و فضائل کا بیان ہوگا مگر واقعہ میں اصل موضوع "مسئلہ ختم نبوت" ہے اور پس منظر میں ہے قادیانیوں کا دعوئے "بقائے نبوت"۔ بذات خود کوئی مستقل کتاب نہیں ہے بلکہ مصنف کی کافی دن پہلے کی ایک عربی کتاب "النبوۃ والانبیاء فی ضوء القرآن" میں ایک نیا اضافہ کردہ باب ہے۔ عنوان غالباً اسی کی رعایت سے ختم النبوۃ کے بجائے "النبی الخاتم" رہا ہے — اور یہیں سے اس سوال کا جواب بھی نکل آیا ہے کہ ہندوستان میں بجائے اردو (یا انگریزی ترجمہ) کے عربی زبان کو اس موضوع بحث کے لیے کیونکر ترجیح حاصل ہوئی۔

مستقل کتاب نہ سہی اور مختصر بھی سہی مگر حضرت مصنف کے شایان شان اور "ماقل ودل" کا مصداق ہے! اطمینان آفریں بھی اور فکر انگیز بھی — تھوڑے سے صفحات میں بحث کے تین دائرے ہیں (۱) کتاب و سنت سے استدلال (۲) دوسرے مذاہب کی تاریخ سے عبرت اور (۳) دین و ملت کی

بقا و استحکام کے پہلو سے (یا بزبان جدید فلسفۂ اجتماع کی روشنی میں) دونوں مذہبوں کا موازنہ ——— تینوں بحثیں جیسا کہ اظہار کیا گیا، اطمینان آفریں بھی اور ذہن کو مزید حصولِ اطمینان کی راہ دکھانے والی بھی؛ ذہنوں کی ساخت مختلف ہوتی ہے، ہو سکتا ہے کہ ایک ذہن مصنف کے بعض نکتوں کو شافی نہ پائے لیکن وہ از خود تشفی کے حصول کی راہ ان نکتوں میں بھی پالے گا۔ اور یہ ایک تحریر کی انتہائی خوبی ہے۔

قادیانی مسئلہ اتنا پرانا ہے اور اتنا اس پر اسلامی اہل علم و قلم کی طرف سے لکھا جا چکا ہے کہ اگر کوئی نیا پن اس سلسلے کی کسی نئی تحریر میں ہو تو یہ اس کی ایک قابل ذکر و قابل قدر خصوصیت ہوگی ہمیں خوشی ہے کہ مولانا کی اس تحریر میں یہ خصوصیت بھی پائی جاتی ہے اس مسئلے پر ان کے اپنے خاص انداز فکر اور اسلوب بحث کی بنا پر ایک نئی چیز کے مطالعہ کی سی دلچسپی قاری کو ملتی ہے ——— مولانا کے اسلوب بحث کے سلسلے میں یہ بات ضرور ذہن میں رہنی چاہیے کہ وہ صرف اپنی بات کہتے ہیں۔ قادیانی تاویلات و منطق سے تعرض نہیں فرماتے۔

بریلوی فتنہ کا نیا روپ
ارشد القادری صاحب کی کتاب "زلزلہ" کا
تنقیدی جائزہ اور تحقیقی جواب
اس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ
آخر میں
مولانا محمد منظور نعمانی
قیمت - پانچ روپے

Regd. No. LW/NP-62

Monthly **ALFURQAN** Kutchery Road, Lucknow U. P.

VOL. 43 NO. ~~3-4~~ ~~FEB~~ ~~MARCH~~, 1975 (7-July 1975) Phone : 25547

Cover Printed at- [illegible] Press, [illegible]

مدیر

محمد منظور نعمانی

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
ایک پونڈ
(یا ہندوستانی بیس روپے)
ہوائی ڈاک کے لیے مزید
محصول ڈاک کا اضافہ ہوگا

سالانہ چندہ
ہندوستان سے: ۱۲/-
پاکستان سے: ۲۰/-
ضخامت ۴۸ صفحات
قیمت
فی کاپی: ---- ۱/۲۰

جلد نمبر ۴۳	بابت اگست ۱۹۷۵ء مطابق رجب ۱۳۹۵ھ	شمارہ نمبر ۸

اگر اس دائرہ میں ◯ سُرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں۔ یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۰ اگست تک آجائے ورنہ اگلا پرچہ وی پی ارسال ہوگا۔

نمبر خریداری:۔ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے جو پتہ کی چٹ پر لکھا رہتا ہے۔

تاریخ اشاعت:۔ الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے، اگر ۲۰ تاریخ تک کسی صاحب کو پرچہ نہ ملے تو فوراً مطلع کریں۔ اس کی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانی چاہیے۔ اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی

دفتر الفرقان اور کتب خانہ الفرقان کے پتہ میں تبدیلی:۔ الفرقان کا دفتر اور کتب خانہ لکھنؤ ہی میں کچہری روڈ سے دوسری جگہ منتقل ہو گئے ہیں ———— اب پتہ یہ ہے:۔

۳۱۔ نیا گاؤں مغربی (نظیر آباد) لکھنؤ (یو پی)

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، اڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان ۳۱۔ نیا گاؤں مغربی لکھنؤ سے شائع کیا

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نگاہِ اوّلیں

محمد منظور نعمانی

اکثر ناظرین کرام کو اخبارات اور دوسرے ذرائع سے ندوۃ العلماء لکھنؤ کے اس عظیم عالمی اجتماع و اجلاس کا علم ہو چکا ہو گا جو انشاء اللہ ۳ ہی مہینے کے بعد شوال کے آخری ہفتہ میں منعقد ہونے والا ہے — یہ اجتماع غالباً ہندوستان میں اپنی نوعیت کا پہلا اجتماع ہو گا۔

عام طور سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ "ندوۃ العلماء" لکھنؤ میں واقع ایک بڑے عربی دینی دارالعلوم کا نام ہے جس کی کچھ خصوصیات ہیں، حالانکہ واقعہ یہ نہیں ہے — در اصل "ندوۃ العلماء" ایک دینی، علمی، اصلاحی تحریک کا عنوان، یا کہیے کہ اُس انجمن کا نام تھا جو اب سے ۸۰-۸۵ سال پہلے اُس تحریک کو منظم طور پر آگے بڑھانے کے لیے قائم ہوئی تھی، اُس کے پہلے داعی اور روح رواں اُس دور کے ایک روشن دماغ عالم و عارف حضرت مولانا محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ تھے؛

ندوۃ العلماء نے جو مقاصد اپنے سامنے رکھے تھے اور جن کو اپنی دعوت اور جد و جہد کا خاص ہدف اور نشانہ بنایا تھا، اُن میں یہ دو باتیں خاص اہمیت رکھتی تھیں۔

ایک یہ کہ دین و ملت کے بنیادی اور متفق علیہ مقاصد و مفادات کے لیے ملت کے مختلف طبقات خاص کر علماء کرام کے مختلف حلقوں میں اتحاد عمل اور اشتراک و تعاون کی فضا پیدا کی جائے اور اُس دوری اور اجنبیت کو ختم کرنے یا کم سے کم کرنے کی کوشش کی جائے جو صرف فروعی فروق اور غیر اہم اختلافات کی وجہ سے ان کے درمیان پیدا ہو گئی ہے — اور دوسرے یہ کہ دینی مدارس اور دارالعلوموں کے نصاب تعلیم میں وہ تبدیلیاں کی جائیں جن کا وقت تقاضی ہے تاکہ اُن سے ایسے فضلا تیار ہوں جو زمانہ کی تبدیلی سے پیدا ہونے والے جدید سوالات اور نئی ذمہ داریوں سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہو سکیں۔

قیام ندوۃ العلماء کے ابتدائی دور میں اِن مقاصد کی، زبان و قلم سے بس تبلیغ و اشاعت کی جاتی تھی،

ملک کے بڑے اور مرکزی شہروں میں ندوے کے جلسے ہوتے تھے، اُن میں تقریریں کی جاتی تھیں اور مقالات و مضامین لکھے جاتے اور شائع کیے جاتے تھے۔

کچھ عرصہ کے بعد تحریک کے ذمہ داروں نے محسوس کیا کہ نصاب تعلیم کی اصلاح کے منصوبہ کو عمل میں لانے کے لیے ضروری ہے کہ ندوۃ العلماء خود اپنا ایک دار العلوم قائم کرے اور اس کو اپنی تجربہ گاہ اور اپنے عزائم کا نمونہ بنا کر دکھائے — اس مرحلہ پر لکھنؤ میں "دار العلوم" قائم کیا گیا جو "دار العلوم ندوۃ العلماء" کے نام سے معلوم و معروف ہے۔

اسّی، بچاسی سال کی اس طویل مدت میں ندوۃ العلماء اور اُس کے دار العلوم پر مختلف دور گزرے جو اس کی تاریخ کا جز ہیں — راقم سطور کی آمد و رفت اِس دار العلوم میں اب سے قریباً چالیس سال پہلے اُس وقت شروع ہوئی جب رفیق محترم مولانا سید ابو الحسن علی میاں صاحب کے ساتھ ذہنی فکری، اور ذوقی ہم آہنگی کی وجہ سے ابتدائی رابطہ قائم ہوا؛ وہ اُس وقت دار العلوم کے نوجوان اساتذہ میں تھے اور میرا قیام بریلی تھا اور لکھنؤ کبھی کبھی آنا جانا ہوتا تھا — اُس وقت ندوۃ العلماء کے میر کارواں اور اس کے دار العلوم کے معتمد و سربراہ حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ تھے؛ اُن سے بھی اس عاجز کو نیاز حاصل تھا اور وہ اتحقاق سے بہت زیادہ عنایت فرماتے تھے۔

یہ وہ دور تھا جب اللہ تعالیٰ نے حضرت سید صاحبؒ کے قلب میں — علمی کمال اور شہرت کی معراج پر پہنچنے کے بعد — اصلاحِ باطن اور سلوک کا داعیہ پیدا فرمایا اور اس کے لیے انھوں نے اپنے کو خانقاہ تھانہ بھون سے وابستہ کیا اور پھر تکمیل سلوک کے بعد حضرت حکیم الامت تھانویؒ کی اجازت و خلافت سے بھی سرفراز ہوئے۔ یہ واقعہ ہے کہ اس لطیفہ غیبی نے دیوبند اور ندوۃ العلماء کو قریب کرنے کا سامان آخری حد تک فراہم کردیا۔ (اس سے پہلے تحریک خلافت نے ملت کے مختلف طبقات کو قریب کرنے اور جوڑنے کا کام بہت آگے بڑھادیا تھا)

پھر حضرت سید صاحبؒ کے بعد رفیق محترم مولانا سید ابو الحسن علی ندوی ہی دار العلوم ندوۃ العلماء کے معتمد و سربراہ ہوئے (اور اب وہی ندوۃ العلماء کے سرکارواں ہیں) — موصوف پر اللہ تعالیٰ کا یہ خاص فضل تھا کہ وہ کم سنی ہی میں ایک ابھرتے ہوئے صاحب لسان و قلم عالم دین ہونے کے ساتھ اپنے صاحب نسبت والدین کی خاص میراث، خدا طلبی و فکر آخرت کے بھی وارث تھے، اس عنایت خداوندی نے

اُن کو حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ، حضرت مولانا محمد الیاسؒ، اور اُن کے بعد حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہٗ جیسے ربانی اکابر و مشائخ سے وابستہ کیا اور اس کا جو نتیجہ ہونا چاہیے تھا وہ ہوا۔ اور خانقاہ تھانہ بھون سے حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی وابستگی کی وجہ سے دارالعلوم ندوۃ العلماء پر جو اثرات پڑے تھے، اُن میں خاصا اضافہ ہوا اور استحکام آیا۔

اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے خاص فضل و کرم سے مولانا علی میاں کی سربراہی نے اس دور میں دارالعلوم کی عمارات، اور طلبہ و اساتذہ کی تعداد وغیرہ میں بھی کئی گنا اضافہ ہوا، اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس کو وہ غیر معمولی عالمی شہرت اور مقبولیت حاصل ہو گئی جس سے دارالعلوم اور ندوۃ العلماء کے مقاصد کے علاوہ دین و ملت کے دوسرے اہم معاملات و مسائل میں بھی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

اس صورت حال کا یہ تقاضا تھا کہ اس منزل پر دارالعلوم کی طرف سے ایسا عالمی اجتماع بلایا جائے جس کے ذریعہ ندوۃ العلماء کی دعوت اور اس کے مقاصد کی تجدید اور وسیع پیمانہ پر تبلیغ و اشاعت ہو اور اس سلسلہ کے جو کام ابتک نہیں کیے جا سکے ہیں اُن کے لیے راہ ہموار کی جائے اور جو ابتک کیا جا سکا ہے اس کا جائزہ لیا جائے اور نظر ثانی کی جائے۔ نیز اگلی منزلوں کی طرف قدم اٹھائے جائیں۔ اس کے علاوہ دین و ملت کے لیے جو فائدے ایسے عالمی اجتماع سے حاصل کیے جا سکتے ہیں امکانی حد تک ان کو بھی حاصل کرنے کی کوشش کی جائے ۔۔۔ انھیں مقاصد و اغراض کے لیے اجتماع کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا جو ان شاء اللہ شوال کے آخری ہفتہ میں منعقد ہو گا جس میں مختلف اسلامی ممالک کی اہم دینی شخصیتیں اور خاص کر وہ حضرات بھی شریک ہوں گے جن کو دینی تعلیم کے موضوع سے خاص تعلق ہے اور اُن کو اس میں امتیاز و اختصاص کا مقام حاصل ہے۔

یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ حالات اور زمانہ کی تبدیلی کے ساتھ دینی تعلیم کے نظام میں بھی تجدید کی ضرورت ہوتی ہے اور ہمیشہ ہوتی رہی ہے۔ امید ہے کہ اس ہونے والے اجتماع سے اس سلسلہ میں جدید ترین رہنمائی ملے گی اور اُس سے فائدہ اٹھایا جا سکے گا ۔۔۔ معلوم ہوا ہے کہ ہندوستان میں تعلیم کے لحاظ سے جتنے بھی قابل لحاظ دینی عربی مدارس ہیں، اُن سب کے ذمہ دار حضرات کو شرکت اجلاس کی دعوت دی جائے گی۔ خدا کرے زیادہ سے زیادہ حضرات شریک ہوں اور جس حد تک بھی اجلاس کے مذاکروں اور مشوروں سے فائدہ اٹھا سکیں اٹھائیں۔

آخر میں اجلاس کے داعی اور مدعو سب ہی حضرات کو ایک چیز کی طرف توجہ دلانا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہمارا نظام تعلیم اور نصاب تعلیم اصلاح طلب بلکہ تجدید کا محتاج ہے اور اب یہ بات کم و بیش عام طور پر محسوس بھی کیا جا رہا ہے، لیکن اس سے زیادہ فکر و توجہ کا مستحق یہ سوال ہے کہ ہمارے ان دینی مدارس کی جو اصل غایت اور روح تھی یعنی (ابتغاء وجہ اللہ، ثواب آخرت اور دین کے مخلص خادم تیار کرنا۔ یہ روح ہمارے مدارس اور اہل مدارس میں کہاں تک باقی ہے؟ — دینی مدارس سے تعلق و واقفیت رکھنے والے کسی شخص کے لیے یہ کوئی راز نہیں ہے کہ ہم میں سے اور ہمارے مدارس میں سے یہ روح نکلتی چلی جا رہی ہے — اس لیے ضروری ہے کہ ہونے والے عظیم عالمی اجتماع و اجلاس میں اس مسئلہ کو بھی فکر و توجہ کا خاص نشانہ بنایا جائے۔ اگر سب کچھ ہو اور خدا نخواستہ یہ نہ ہو تو اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ہمارے ان مدارس اور مظاہروں کی کوئی قیمت نہیں — اور ہماری جو قوتیں، جو اوقات اور جو قومی سرمایہ صرف ہو رہا ہے، آخرت میں اس کا حساب دینا آسان نہ ہوگا۔

اللہ تعالیٰ اس اجتماع و اجلاس کو خاص کر ہم مسلمانان ہند کے لیے اور ہمارے دینی مراکز و مدارس کے لیے خیر و صلاح کا وسیلہ بنائے اور ہر قسم کی غلطیوں اور شرور و فتن سے ہم سب کی حفاظت فرمائے۔

• مولوی عتیق الرحمٰن سلمہم اللہ تعالیٰ کی خرابیٔ صحت اور ضعف اعصاب کا ذکر ان صفحات میں بار بار آیا ہے۔ اس سلسلہ میں اس کی ضرورت محسوس کی جاتی تھی کہ وہ کچھ مدت کے لیے کسی دوسرے ملک میں قیام کریں جہاں کی آب و ہوا صحت کے لیے یہاں سے بہتر ہو — انگلستان میں مقیم ایک مخلص دوست نے اُن کو دعوت دی اور ٹکٹ بھی بھیج دیا چنانچہ وہ ۱۲؍ جولائی کو بمبئی سے روانہ ہو کر بخیر و عافیت وہاں پہنچ گئے۔ قریباً ایک مہینہ ہو چکا ہے۔ اُن کے خطوط سے معلوم ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ان کی صحت پر اچھا اثر پڑ رہا ہے۔ ناظرین کرام بھی دعا فرمائیں۔ یہ سطریں اسی غرض سے لکھی جا رہی ہیں۔

> لکھنؤ کے جو خوشنویس قریباً ۲۰ سال سے الفرقان کی کتابت کر رہے تھے ان کی طویل علالت کی وجہ سے قریباً دو سال سے الفرقان کی لکھائی اور اس کی وجہ سے چھپائی بھی غیر معیاری بلکہ بہت ناقص ہو رہی ہے، جس کا بے حد افسوس ہے۔ اب ایک نیا انتظام ہوا ہے امید ہے کہ انشاء اللہ آئندہ شمارہ سے کتابت طباعت بہتر ہو گی۔
>
> ناظم دفتر الفرقان۔ لکھنؤ

درسِ قرآن ـــــ محمد منظور نعمانی

مرکزی والی مسجد　　　۸ جون ۱۹۷۵ء

○ــــ کامل فلاح یابی کے لیے خداوندی منشور

○ــــ جنت الفردوس کے وارثوں کی لازمی صفات

حمد و صلوٰۃ اور اعوذ اور بسم اللہ کے بعد

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِیْنَ ھُمْ فِیْ صَلٰوتِھِمْ خَاشِعُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِلزَّکٰوۃِ فَاعِلُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِفُرُوْجِھِمْ حَافِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰی اَزْوَاجِھِمْ اَوْمَا مَلَکَتْ اَیْمَانُھُمْ فَاِنَّھُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰی وَرَاءَ ذٰلِکَ فَاُولٰئِکَ ھُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِاَمٰنٰتِھِمْ وَعَھْدِھِمْ رَاعُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَلٰی صَلٰوتِھِمْ یُحَافِظُوْنَ ۝ اُولٰئِکَ ھُمُ الْوَارِثُوْنَ ۝ الَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ھُمْ فِیْھَا خَالِدُوْنَ ۝　(سورۃ المومنون آیات ۱-۱۱)

یقیناً فلاح یاب اور کامیاب ہیں وہ ایمان والے جو اپنی نمازیں خشوع کے ساتھ ادا کرتے ہیں اور جو لغو و فضول (باتوں اور کاموں) سے الگ اور دور رہنے والے ہیں اور جو اپنے (اعمال و اخلاق کا) تزکیہ کرنے والے ہیں، اور جو اپنی جائے شہوت کی حفاظت کرتے (اور اس پر کنٹرول رکھتے) ہیں، سوائے اپنی بیویوں اور مملوکہ باندیوں کے (کہ ان سے شہوت

زانی نہیں کرتے) تو اُن پر (بیویوں اور شرعی باندیوں سے تقاضائے شہوت پورا کرنے کی بنا پر کوئی) ملامت اور سرزنش نہیں، ہاں جو اس کے سوا (حرام محل میں شہوت رانی) کے طلبگار اور خواہشمند ہوں تو وہ (اللہ کی مقرر کی ہوئی حد سے نکلنے والے (اور سخت مجرم) ہیں ـــ اور (وہ اہل ایمان) جو اپنے ذمہ لی ہوئی امانتوں اور اپنے عہد معاہدوں کی رعایت اور نگہداشت رکھنے والے ہیں، اور وہ جو اپنی نمازوں کی پابندی اور اہتمام کرتے ہیں۔ وہی لوگ وارث ہونے والے ہیں، جو جنت الفردوس کے وارث ہوں گے، وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ (سورہ مومنون۔ آیت ۱ تا ۱۱)

(تفسیر و تشریح) یہ سورۂ "مومنون" شروع ہوئی۔ اور اٹھارواں [۱۸] پارہ بھی یہیں سے شروع ہوا، یہ بات میں پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ سورتوں کی تقسیم اور حد بندی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھی، چنانچہ حدیثوں میں سورتوں کے نام آتے ہیں۔ لیکن پاروں کی یہ تقسیم حضور کے زمانہ میں نہیں تھی، بعد میں کسی زمانہ میں غالباً... روزانہ تلاوت کا حساب کسی درجہ میں برابر کرنے کے لیے اور مہینے میں دور ختم کرنے کے لیے قرآن پاک کو تیس [۳۰] پاروں میں تقسیم کر لیا گیا ہے۔ میں یہ بھی تحقیق نہیں کر سکا کہ یہ کس زمانہ میں ہوا اور کس نے کیا۔ اور میں یہ بھی نہیں سمجھ سکا کہ اس تقسیم میں کیا اصول اور کیا معیار استعمال کیا گیا ہے ـــ ایسا بھی نہیں ہے کہ سب پاروں کے الفاظ و کلمات یا آیتیں برابر ہوں، بلکہ کم و بیش کا اچھا خاصا فرق ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ تقسیم میں کسی مضمون کے شروع ہونے یا ختم ہونے کا بھی کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا ہے ـ مثلاً پانچواں [۵] پارہ "وَالْمُحْصَنَات" کے لفظ سے شروع ہوتا ہے حالانکہ یہ پہلے کلام کا جز ہے اور اگر اس سے پہلی آیت کے ساتھ اس کو ملا کر نہ پڑھا جائے تو اس کے کوئی معنی ہی نہیں بنتے ـــ اور مثلاً چودھواں پارہ "رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا" سے شروع ہوتا ہے، حالانکہ اس سے پہلے صرف چند لفظوں کی ایک چھوٹی سی آیت ہے جس سے سورۂ "حجر" شروع ہو رہی ہے۔ میں غور کرنے کے باوجود نہیں سمجھ سکا کہ اسی پہلی آیت سے چودھواں پارہ شروع کیوں نہیں کیا گیا۔

بہرحال جس نے بھی یہ تقسیم کی ہو اُس نے کوئی اصول اور معیار ضرور سامنے رکھا ہوگا اگرچہ میں اس کا علم حاصل نہیں کر سکا ـــ اور یہ واقعہ ہے کہ اس تقسیم سے عوام کے لیے تلاوت کا نظام آسان

ہو گیا، اللہ تعالیٰ اُن کو جزائے خیر دے

یہ پاروں کی تقسیم کی بات تو یوں ہی ضمناً گفتگو میں آ گئی، میں عرض یہ کر رہا تھا کہ آج درس میں سورۂ مومنون شروع ہوئی ہے اور میں نے جو آیتیں تلاوت کی ہیں یہ اُس کی ابتدائی دس گیارہ آیتیں ہیں۔ ان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں کے لیے فلاح و کامیابی کا پورا نصاب بیان فرما دیا گیا ہے اور یہ گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے امت مسلمہ کے لیے حصولِ فلاح کا جامع اور مکمل منشور ہے۔ اس لیے یہ آیتیں بڑی اہم ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا گیا ہے کہ آپ نے بیان فرمایا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیتیں نازل ہوئیں تو آپ نے ایک خاص کیفیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا کی، اُس کے بعد آپ نے فرمایا کہ "مجھ پر اس وقت ایسی دس آیتیں نازل ہوئی ہیں کہ جو شخص اُن پر پورا عمل کرے تو سیدھا جنت میں جائے گا ـــــ پھر آپ نے یہ آیتیں پڑھ کر سنائیں۔

ان آیتوں کا حاصل یہ ہے کہ اللہ کے وہ بندے فلاحیاب اور آخرت میں جنت الفردوس کے وارث ہوں گے جو ایمان لانے کے ساتھ وہ چند ایمانی صفات اپنے اندر پیدا کر لیں جن کا ان آیتوں میں ذکر کیا گیا ہے ـــ ان میں پہلی صفت اور پہلی چیز ہے خشوع کی کیفیت کے ساتھ نماز ادا کرنا ـ فرمایا گیا ہے "قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلٰوتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ہ" عربی زبان میں "خشوع" کے معنی ہیں سکون اور پستی و فروتنی اور یہاں اس سے وہ کیفیت مراد ہے جو اللہ تعالیٰ کے جلال اور ہیبت کی وجہ سے بندے کے ظاہر و باطن پر طاری ہوتی ہے جس کی وجہ سے دل بھی خشیت و انابت اور تذلل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اس کے اثر سے ظاہری جسم پر بھی سکون اور فروتنی اور نیازمندی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، یہ خشوع نماز کی روح ہے، یہ جس درجہ میں کسی کو نصیب ہو اُسی درجہ میں اُس کی نماز کامل اور مقبول ہے اور اس میں جتنی کمی ہو اتنا ہی نماز میں قصور اور نقصان ہے ـ ہماری اور خاصانِ خدا کی نمازوں میں بظاہر تو کوئی خاص فرق نہیں ہوتا وہ جس طرح نمازوں میں دست بستہ قبلہ رو کھڑے ہوتے ہیں اور رکوع و سجود کرتے ہیں اور قرآن مجید اور التحیات اور درود شریف وغیرہ پڑھتے ہیں وہی سب ہم بھی کرتے ہیں اور اسی طرح ہم بھی سب کچھ پڑھتے ہیں لیکن فی الحقیقت ہماری اور ان کی نمازوں میں شاید زمین و آسمان سے بھی زیادہ فرق ہوتا ہے اور وہ خشوع ہی کی کیفیت کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ اور یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کو ہم حاصل نہ کر سکتے ہوں۔ اللہ تعالیٰ بندوں سے کسی

ایسی چیز کا مطالبہ بھی نہیں کرتا جو اُن کے اختیار سے باہر ہو۔ اللہ کا جو بندہ بھی اس کی فکر و کوشش کرے گا اور نماز دھیان کے ساتھ اور خشوع کی کیفیت کے ساتھ پڑھنے کا اہتمام کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کی استعداد اور صلاحیت کے مطابق یہ کیفیت ضرور نصیب فرما دے گا۔

بعض اکابر علماء نے لکھا ہے کہ ہر شخص کو اس کی کوشش ضرور کرنی چاہئے کہ کم از کم نماز شروع کرتے وقت دل خشوع کی کیفیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو، اور اسی طرح نماز کے خاتمہ کے وقت دل متوجہ ہو، اگر اتنا بھی ہوا تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں خشوع والے بندوں کے ساتھ شامل فرما دے گا اور انشاء اللہ اس میں ترقی بھی ہوتی رہے گی۔

بہر حال کامل فلاح و کامیابی اور جنت الفردوس حاصل کرنے کی پہلی شرط ایمان کے بعد یہ ہے کہ نماز خشوع کی کیفیت کے ساتھ ادا کرنے کی عادت ڈالی جائے اور اس کا اہتمام کیا جائے۔ (قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤمِنُوْنَ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلٰوتِهِمْ خَاشِعُوْنَ o)

اس کے بعد فلاحیابی کی دوسری شرط اور دوسری صفت یہ بیان فرمائی گئی ہے۔ "وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ o" "لغو" ہر وہ بات اور ہر وہ کام ہے جس میں خیر اور منفعت کا کوئی پہلو نہ ہو، ایسی باتوں اور ایسے کاموں کو ہم آپ بھی 'لغو' ہی کہتے ہیں۔ تو فرمایا گیا ہے، وہ اہل ایمان فلاحیاب ہوں گے جو نمازیں خشوع کی کیفیت سے ادا کرنے کے ساتھ "لغو" باتوں اور "لغو" کاموں سے اپنے کو بچانے اور دور رکھنے کی بھی فکر رکھتے ہوں۔ اور ظاہر ہے جو آدمی لغو اور فضول باتوں اور کاموں سے پرہیز کرے گا وہ گناہ کی باتوں اور گناہ کے کاموں سے اور زیادہ دور رہے گا۔ تو اس آیت سے معلوم ہوا کہ کامل فلاح کا مقام حاصل ہونے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ بندہ گناہوں کے علاوہ لغویات و فضولیات سے بھی اپنے کو بچائے (وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ o) اور حدیث شریف میں ہے۔ "من حسن اسلام المرء ترکہ ما لا یعنیہ" یعنی آدمی کے ایمان و اسلام کا حسن و کمال یہ ہے کہ جس چیز میں کوئی خیر اور نفع نہ ہو وہ اس کو ترک کر دے اور اُس میں مشغول نہ ہو۔

اس کے بعد کامل فلاحیابی کی تیسری شرط اور فلاح پانے والوں کی تیسری صفت یہ بیان فرمائی گئی ہے کہ "وَالَّذِیْنَ هُمْ لِلزَّکٰوةِ فَاعِلُوْنَ o" جس کا لفظی ترجمہ یہ ہو گا کہ "جو بندے زکوٰۃ کا عمل کرتے ہیں" یہاں "زکوٰۃ" کے لفظ سے وہ "زکوٰۃ" بھی مراد ہو سکتی ہے جو اسلام کا تیسرا رکن

ہے اور جس کو سب جانتے ہیں، اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ فلاح یابی کی شرط یہ بھی ہو کہ شریعت کے حکم اور قانون کے مطابق اللہ کے دیے ہوئے مال کی زکوٰۃ نکالی جائے (اس صورت میں اس آیت کا تعلق صرف اُن لوگوں سے ہوگا جن پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے)

اور "زکوٰۃ" کے اس لفظ سے نفس کا اور اعمال و اخلاق کا تزکیہ بھی مراد ہو سکتا ہے۔ قرآن پاک میں یہ لفظ اس معنی میں بھی استعمال ہوا ہے ـــــ سورۂ کہف میں فرمایا گیا ہے "فَاَرَدْنَا اَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّاَقْرَبَ رُحْمًا" اس آیت میں "زکوٰۃ" کے معنی نفس کی پاکیزگی ہی کے ہیں۔ اور "قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا" اور "قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى" میں بھی "زکوٰۃ" کا مادہ تزکیہ نفس ہی کے لیے استعمال ہوا ہے ـــــ بلکہ مال کی جو "زکوٰۃ" نکالی جاتی ہے اُس کا نام اسی لیے زکوٰۃ رکھا گیا ہے کہ اُس سے مال پاک ہو جاتا ہے اور نکالنے والے کے نفس کا بھی تزکیہ ہو جاتا ہے۔ سورۂ توبہ میں فرمایا گیا ہے "خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا" ـــــ الغرض سورۂ مومنون کی اس آیت "وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۝" میں "زکوٰۃ" کے معنی نفس اور اعمال و اخلاق کے تزکیہ کے بھی ہو سکتے ہیں اور اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ کامل فلاح اُن بندوں کو حاصل ہوگی جو ایمان اور نماز میں خشوع اور لغویات و فضولیات سے دور رہنے کے ساتھ اپنے نفس اور اعمال و اخلاق کے تزکیہ کا اہتمام بھی کرتے ہوں ـــــ اور یہی مطلب میرے نزدیک راجح ہے، اس کا ایک قرینہ تو یہ ہے کہ مال کی زکوٰۃ ادا کرنے کے لیے قرآن مجید میں عام طور سے "ایتاءِ زکوٰۃ" کا عنوان استعمال کیا گیا ہے، "فعلِ زکوٰۃ" کا عنوان کہیں نہیں استعمال کیا گیا "آتوا الزکوٰۃ" بیسیوں جگہ فرمایا گیا ہے، "افعلوا الزکوٰۃ" ایک جگہ بھی نہیں فرمایا گیا اور ذوق بھی اس کو قبول نہیں کرتا ـــــ دوسرا ایک قرینہ یہ ہے کہ قرآن پاک میں جہاں بھی کسی سلسلۂ مضمون میں "نماز اور زکوٰۃ" دونوں کا ذکر کیا گیا ہے تو ان دونوں کا ذکر بلا فصل کیا گیا ہے اور قرآن پاک سے اور احادیث نبویہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں میں ایسا رابطہ ہے کہ گویا یہ دونوں "توأم" (جڑواں بہنیں) ہیں۔ پس اگر اس آیت میں "زکوٰۃ" سے مراد وہی مالی زکوٰۃ ہوتی جو ایمان اور نماز کے بعد اسلام کا تیسرا رکن ہے تو سورۃ کی پہلی آیت "قد افلح المومنون، الذین ہم فی صلوٰتہم خاشعون" کے ساتھ متصلاً یہ آیت ہونی چاہیے تھی "والذین ہم للزکوٰۃ فاعلون ۝

—— بہرحال ان وجوہات سے یہی راجح معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں "زکوٰۃ" سے مراد نفس اور اعمال واخلاق کا تزکیہ ہے ۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ کامل فلاح وکامیابی ان بندوں کو حاصل ہوگی جو ایمان اور نماز میں خشوع اور لغویات وفضولیات سے دوری کے ساتھ اپنے نفس کو رذائل اور گندے جذبات سے اور اپنے اعمال واخلاق کو ریا وغیرہ کی آمیزشوں سے پاک کرنے کا اہتمام کرنے والے ہوں، اور اس صورت میں اس آیت کا تعلق ماقبل ومابعد کی ساری آیتوں کی طرح تمام اہل ایمان سے ہوگا اور جیسا کہ میں نے عرض کیا یہی بات دل کو زیادہ لگتی ہے۔

آگے فلاحیابی کی چوتھی شرط اور فلاح پانے والوں کی چوتھی صفت یہ بیان کی گئی ہے "وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْنَ" —— واقعہ یہ ہے کہ جو بداعمالیاں بہت سے اچھے خاصے بندوں کو فلاح سے محروم کر دیتی ہیں اُن میں بہت خطرناک وہ جنسی بداعمالیاں ہیں جن میں آدمی شہوتِ نفس کے بحرانی تقاضے سے کبھی کبھی مبتلا ہو جاتا ہے، مثلاً زنا اور لواطت وغیرہ، تو اس قسم کے فواحش سے پرہیز بھی فلاحیابی کے شرائط میں سے ہے، اس کے لیے قرآن پاک کی اس آیت میں عنوان یہ استعمال کیا گیا ہے کہ وہ اپنی شہوتِ نفس کی حفاظت ونگہداشت اور اُس پر کنٹرول رکھتے ہوں —— آگے فرمایا گیا ہے کہ اپنی منکوحہ بیویوں اور شرعی باندیوں کے ساتھ اس فطری تقاضے کو پورا کرنے کی اجازت دی گئی ہے، اس پر کوئی ملامت نہ ہوگی —— ہاں اگر کسی نے اس جائز حد سے تجاوز کیا اور حرام محل میں شہوت رانی کی تو وہ خدا کے قانون کے باغی اور مجرم ہے اور اس کے ساتھ وہی معاملہ ہوگا جو باغیوں اور مجرموں کے ساتھ ہونا چاہیے۔ (اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعَادُوْنَ ۔

آگے پانچویں شرط فلاحیابی کی یا کہیے کہ پانچویں صفت کامل فلاح پانے والے اہل ایمان کی یہ بیان فرمائی گئی ہے کہ "وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ" —— "امانت" اور "عہد" یہ دونوں لفظ ایسے ہیں جو ہماری اُردو زبان میں بھی مستعمل ہیں لیکن ہماری زبان اور ہمارے محاورہ میں اِن کا مفہوم بہت محدود ہو گیا ہے۔ قرآن مجید کی اور دین کی اصطلاح میں امانت کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ ہم پر اور ہمارے ذمہ کسی کا جو حق ہے خواہ خدا کا ہو یا کسی بندے کا، اور خواہ مالی ہو یا غیر مالی اور ہم پر جو ذمہ داری عائد ہے وہ امانت ہے اور اس کو صحیح طور پر ادا کرنا ہم پر واجب ہے۔ مثلاً شوہر کا بیوی کی

پر اور بیوی کا شوہر پر اور چھوٹوں کا بڑوں پر بڑوں کا چھوٹوں پر جو حق ہے اسی طرح آقا کا نوکروں اور نوکروں مزدوروں کا آقا پر جو حق ہے، علیٰہذا حکمرانوں کا عوام پر اور عوام کا حکمرانوں پر جو حق ہے یہ سب حقوق "امانت" کے وسیع مفہوم میں داخل ہیں اور کامل فلاح کی یہ بھی شرط ہے کہ یہ حقوق دیانتداری کے ساتھ ادا کیے جائیں۔ اسی طرح "عہد" کا مفہوم بھی وسیع ہے، آپس کے سارے عہد معاہدے، خواہ وہ مالیات سے متعلق ہوں یا دوسرے شعبوں سے اور اسی طرح خدا سے کیا ہوا عہد، سب میں اسمیں شامل ہیں۔ مثلاً کلمہ شریف پڑھ کر ایمان لانا اس بات کا عہد ہے کہ ہم اللہ کے ساتھ کسی قسم کا شرک نہیں کریں گے اور اللہ و رسول کے احکام کی فرمانبرداری کریں گے۔ اگر ہم اس کے خلاف کرتے ہیں تو ہم نے عہد شکنی کی اور ہم مجرم ہیں۔ بہر حال اس آیت میں کامل فلاح پانے والے اہل ایمان کی پانچویں صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ امانت کے ادا کرنے اور عہد کو پورا کرنے میں سچے پکے ہوتے ہیں۔

(وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ) "امانت" کے بارہ میں ایک دوسری آیت میں فرمایا گیا ہے۔ "اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا" (یعنی اللہ کا تم کو حکم ہے اور فرمان ہے کہ جس کی جو امانت ہو اور جو حق ہو اسکو ادا کرو) ۔۔ اور "عہد" کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔ وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا ۝ (یعنی جو عہد معاہدہ تم نے کیا ہے اس کو پورا کرو، آخرت میں اس کی تم سے بازپرس ہوگی اور ہر عہد کے بارے میں تمہیں خدا کے حضور میں جواب دینا ہوگا۔

اور غالباً حضرت انس رضی اللہ سے یہ حدیث مروی ہے کہ بہت کم ایسا ہوا ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ اور وعظ ارشاد فرمایا ہو اور اس میں یہ نہ فرمایا ہو کہ

الا لا ایمان لمن لا امانة له ولا دین	جس میں امانت کی صفت نہیں اس میں
لمن لا عهد له	ایمان نہیں اور جو عہد معاہدہ کا پابند نہیں اس کا دین میں حصہ نہیں۔

قرآن پاک کی آیات اور حضورؐ کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ ادائے امانت اور وفائے عہد ایمان کے لوازم اور ہمارے فرائض و واجبات میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو توفیق دے کہ دین کے ان احکام کی اہمیت اور سنگینی کو سمجھیں۔۔ (باقی)

جواہر پارے

اقتباساتِ مکاتیبِ رشیدیہ

(از مولانا نسیم احمد فریدی امروہی)

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے نام[1]

از بندہ رشید احمد عفی عنہٗ بعد سلام مسنون

خط آپ کا موصول ہو کر کاشف مافیہ ہوا۔ اگر یہ خوف و حزن امورِ آخرت سے ہے تو محمود ہے بزرگوں کو اسی خوف سے بڑی بڑی شدت سے قبض واقع ہوا ہے حتی کہ بعض نے جان بھی دی ہے۔

بس ایسی حالت اور اس صورت میں تو جائے شکر ہے نہ جائے غم — امام غزالیؒ اسی غم میں بیت المقدس میں دس سال تک پریشان اور محزون رہے کہ اطباء ان کے علاج سے عاجز ہو گئے۔ آخر ایک یہودی طبیب نے ان کو دیکھا اور تشخیص کی کہ ان کو کوئی حسی مرض نہیں ہے بلکہ خوف آخرت ہے۔ اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔ پس مژدہ ہو کہ حق تعالیٰ نے یہ دولت آپ کو دی۔ ایسے حزن پر ہزار فرحت قربان اور اس حالت کی موت شہادت کبریٰ ہے۔ اور اگر کوئی امر دیگر ہے تو اس کا جواب بدون دریافت حقیقتِ حال کے میں نہیں لکھ سکتا۔ اور یہاں آنے کے باب میں جو آپ استفسار فرماتے ہیں تو

[1] حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی فاروقیؒ — آپ ۱۲۸۰ھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم میرٹھ اور اپنے وطن میں پاکر ۱۲۹۵ھ میں مدرسہ اسلامیہ عربیہ دیوبند میں داخلہ لیا (مسلسل اگلے صفحہ پر)

بقول ع

از خویشتن گم است کرا رہبری کند

مگر مع ہذا (اس کے باوجود) اگر آپ تشریف لادیں گے تو خود ہی امید نفع کی رکھتا ہوں کہ صحبت صلحاء جس قدر میسر آوے غنیمت ہے۔

حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری کے نام[۱]

از بندہ رشید احمد عفی عنہ بعد سلام مسنون آنکہ خط پہونچا۔ حال معلوم ہوا۔ جو کچھ آپ نے حیرت لکھی ہے۔ وہ عین تقرب ہے "مقرباں را بیش بود حیرانی" بزرگان دین فرما گئے ہیں)۔ اور ذاتِ حق تعالیٰ ادراک سے مبرّا ہے۔ لَا تُدْرِکُهُ الْاَبْصَارُ[ع] ۔ قلب و عقلِ بشر ادراک سے عاجز ہے۔

دوربینانِ بارگاہ الست غیر ازیں پے نبردہ اند کہ ہست

ع (ترجمہ) اس کو تو کسی کی نگاہ محیط نہیں ہو سکتی۔

(بقیہ صفحہ گزشتہ): سنہ ۱۳۰۱ھ میں فراغت کے بعد دستارِ فضیلت حاصل ہوئی۔ آپ کی تصانیف سیکڑوں ہیں کئی سو وعظ بھی آپ کے طبع ہو چکے ہیں۔ سلوک و طریقت کی رہنمائی کے لئے بھی آپ کی بہت سی تصانیف ہیں۔ فراغت کے بعد تقریباً ۱۴ سال آپ نے کانپور میں مدرسہ فیضِ عام اور مدرسہ جامع العلوم میں درس دیا۔ آپ شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کے خاص خلفاء میں سے تھے۔ طالب علمی کے زمانے میں آپ کا ارادہ حضرت مولانا گنگوہیؒ سے بیعت ہونے کا تھا مگر حضرتؒ نے تعلیم کے زمانے میں بیعت کرنا مناسب نہ جانا۔ آپ حضرت گنگوہیؒ کا اتنا ہی ادب و احترام کرتے تھے جتنا کہ پیر و مرشد کا کیا جاتا ہے۔

آپ کے تلامذہ اور آپ کے خلفاء کی بھی بہت بڑی تعداد ہے۔ آپ کے علمی و روحانی کمالات اظہر من الشمس ہیں۔

خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ نے اشرف السوانح کے نام سے چار جلدوں میں آپ کے حالات قلمبند کیے ہیں۔ ۱۶ رجب ۱۳۶۲ھ شب سہ شنبہ یعنی ۱۹، ۲۰ جولائی ۱۹۴۳ء کی درمیانی شب میں بعد نماز عشاء آپ کا وصال ہوا۔ عمر شریف ۸۲ سال تین ماہ گیارہ دن کی ہوئی۔ مزار تھانہ بھون میں ہے۔ (تذکرۂ مشائخ دیوبند بحوالہ اشرف السوانح)

[۱] حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری: آپ انبیٹھ ضلع سہارنپور کے رہنے والے تھے۔ آپ حضرت محدث گنگوہیؒ سے بیعت ہونے والوں میں سے اوّل ہیں۔ حضرتؒ کے خلفاء میں آپ کا بڑا مقام ہے۔ آپ کو شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ سے بھی اجازت خلافت اور دستار حاصل تھی۔ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ

(باقی اگلے صفحہ پر)

وہ ذات (ایسی) ہستی مطلق ہے کہ ہستی و اطلاق سے بھی بالاتر ہے۔ اطلاق کو بھی وہاں گنجائش نہیں۔ اور جو کچھ کسی کے قلب میں یا عقل میں آیا ہے یا آتا ہے وہ سب غیر ہے۔ ذاتِ پاک اس سے مبرا ہے۔ پس ایسی حالت میں کسی کیف کا ہونا کیا گنجائش رکھتا ہے۔ محض حضور خط بندہ کا ہے اور بس — سو الحمد للہ کہ آپ کو اس سے حصہ حاصل ہے۔ ان تعبد ربک کانک تراہ[عـه] — الحدیث — مقصود سب کا رہا ہے اور یہی مدعا شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ہے۔ جس قدر اس سے کسی کو میسر ہو وہ ہی صاحبِ نصیب ہے۔ سوائے اس کے جو کچھ حالات ہیں وہ کوئی مقصود نہیں۔ پس بحکم "لئن[1] شکرتم لازیدنکم" نسبت حضور میں کوشش کرتے رہو اور کسی شے کے طالب مت ہو۔ لطفِ حق کے امیدوار رہو ؎

کہ ہر چہ ساقیٔ ما ریخت عین الطاف ست

عـه عبادت کرے تو اپنے رب کی اس طرح گویا کہ تو اسے دیکھتا ہے — یہ حدیث جبریل کا ایک ٹکڑا ہے اس میں احسان کی تعریف کی گئی ہے۔

[1] (ترجمہ) اگر تم شکر ادا کرو گے تو میں ضرور ضرور تمہارے لیے نعمتوں میں اضافہ کروں گا۔

(حاشیہ گزشتہ سے پیوستہ) کو مولانا سے خاص محبت تھی۔ ایک مرتبہ آپ کے بارے میں فرمایا "جو میں وہ خلیل احمد۔" آپ نے مظاہر علوم سہارنپور میں مدتوں درس حدیث دیا۔ آپ کے تلامذہ میں کثیر التعداد علماء و فضلاء ہوئے۔ آپ کے خلفاء میں حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلویؒ اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب دامت برکاتہم جیسی عظیم البرکت اور بافیض شخصیتیں ہیں۔

بذل المجہود شرح سنن ابی داؤد آپکی معرکۃ الآرا تالیف ہے۔ آپکے فیوض و برکات سے نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام عالم اسلامی متاثر ہوا۔ ۱۳۴۴ھ میں مدینہ منورہ کی جانب ہجرت فرمائی۔ آپ کے دل میں دیارِ رسول صلعم میں مدفون ہونے کی تمنا تھی۔ آپ چاہتے تھے کہ کسی طرح جنت البقیع کی مٹی نصیب ہو جائے۔ آپ نے بارہا فرمایا کہ اگرچہ میں اس سرزمین کے قابل تو نہیں مگر کیا عجب ہو کہ قبول کر لیا جاؤں اور قدرت کو کیا مشکل ہے کہ وہ اہلیت عطا فرمائے۔ اسی تمنا میں آپ نے رنج کے بالآخر یہ تمنا اللہ تعالیٰ نے پوری فرمائی اور آپ نے ۱۵ ربیع الثانی ۱۳۴۶ھ بروز چہار شنبہ بعد عصر مدینہ منورہ میں وصال فرمایا اور جنت البقیع میں مزار حضرت عثمان غنیؓ کے قریب مدفون ہوئے۔

تذکرۃ الخلیل آپ کی ایک مستقل مبسوط سوانح عمری ہے جو حضرت مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے تحریر فرمائی ہے۔

مولانا صدیق احمد صاحب انبیٹھوی آپ کے چچا زاد بھائی اور ہم عمر تھے۔ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب اور مولانا صدیق احمد صاحب کی تعلیم و تربیت ساتھ ساتھ ہوئی۔ حضرت سہارنپوری گرالیا۔ پڑھنے گئے تو وہ بھی گئے (باقی اگلے صفحہ پر)

بندہ کے واسطے بھی دعائے خیر کریں اور بندہ آپ کے لیے دعا کرتا ہے۔

(۱۴ ذی قعدہ ۱۳۱۵ھ)

از بندہ رشید احمد عفی عنہ، بعد سلام مسنون مطالعہ فرمایند۔ بندہ بخیریت ہے۔ آپ کے لیے دعائے خیر کرتا ہے۔ آج آپ کا خط خلوت میں پڑھا گیا۔ آج تک اس کے سننے کی نوبت نہیں آئی تھی لہٰذا مختصراً جواب لکھتا ہوں ـــــ کہ طالب کا حال جو کچھ کہ خلوت میں ہوتا ہے، جلوت میں نہیں ہو سکتا خصوصاً جبکہ کوئی شغلہ درس و تدریس کا ہو، سو کیفیت، اعتکاف رمضان کی برابر اب کیسے ہو سکتی ہے۔ اور ہر مبتدی اور منتہی پر قبض و بسط کا ورود دائمی ہوتا ہے۔ لہٰذا کسی وقت میں خواطر کا پاش پاش ہونا اور کسی وقت ہجوم خواطر (وساوس) ہونا ضروری ہے۔ پس جس وقت ہجوم خواطر ہو اس وقت استغفار و اظہار عجز و نیاز کرنا چاہیے اور بوقت رفع خواطر (وسوسوں کے دور ہونے کے وقت) حمد و شکر لازم ہے...... اور انوار لطیفہ حسِ باطنی سے بھی محسوس نہیں ہوتے اور وہ حجب نورانیہ (نورانی حجابات) جن کا ذکر حدیث میں ہے وہ وجود منبسط کے غیر ہیں۔ والسلام۔

(۲۹ رجب ۱۳۱۵ھ)

(از سفر حج[ع]) از بندہ رشید احمد عفی عنہ، السلام علیکم۔ آپ کا نامہ آیا۔ یاد الفت کو دلایا۔ تم کو

(گذشتہ سے پیوستہ) آپ دیوبند گئے تو وہ بھی دیوبند گئے۔ حضرت نے قرآن شریف حفظ کیا تو انھوں نے بھی حفظ کیا۔ آپ حضرت گنگوہی سے بیعت ہوئے تو وہ بھی ہوئے۔ دربار رشیدی سے حضرت سہارنپوریؒ کو خلافت ملی تو انھیں بھی ملی۔ چنانچہ مولانا صدیق احمد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ مجھے تو حضرت مولانا خلیل احمد کی حرص و منافست نے بڑھایا ہے۔

(ماخوذ از تذکرۃ الرشید و تذکرہ مشائخ دیوبند و تاریخ مظاہر جلد ۲)

[ع] حضرت گنگوہیؒ نے تین حج کیے۔ پہلا حج ۱۲۸۰ھ میں دوسرا ۱۲۹۴ھ میں اور تیسرا ۱۲۹۹ھ میں ـــــ یہ مکتوب تیسرے سفر حج کا ہے۔ اس سفر کا تہیہ دفعتاً ہوا۔ وقت اتنا تنگ ہو گیا تھا کہ حج میں شریک ہونے کی امید نہیں رہی تھی۔ بہر ذیقعدہ ۱۲۹۹ھ کو آپ روانہ ہوئے۔ اس زمانے میں جزیرہ کامران میں دس روز کا قرنطینہ سلطان روم کی طرف سے حکماً قائم ہو گیا تھا کہ جو حجاج براہ عدن جدہ جائیں وہ اس جگہ صحت جسمانی کے امتحان کے لیے دس دن ایک خس پوش مکان میں ٹھہریں۔

بمبئی سے حجاج روانہ ہو چکے تھے۔ چند نفر باقی تھے جو کسی جہاز کے منتظر تھے۔ خدا کی شان کہ جہاز آیا اور جدہ کا ٹکٹ تقسیم ہونے لگا۔ حج میں صرف ۱۲، ۱۴ دن باقی تھے جن میں سے قرنطینہ کے دس دن نکال کر دیکھا جائے تو ۴، ۵ دن کا ہی وقفہ تھا۔ ہر چند لوگوں نے منع کیا کہ اب جدہ کا ٹکٹ لینا فضول ہے۔ امسال کسی طرح حج نصیب نہیں ہو سکتا۔ روپیہ خراب نہ کیجیے۔ مگر (باقی اگلے صفحہ پر)

ذخیرۂ خیرات (خود بیوں کا ذخیرہ) جانتا ہوں، تم قابل فراموشی نہیں ہو۔ دعا کا طالب ہوں۔ سہ شنبہ ۱۲ کو یہاں (بمبئی) آیا تھا۔ کرایہ تو تنگ عٰہ تھا اب ساٹھ کو نوبت پہونچی۔ آج ہماری چھٹی بھی ہو گئی مگر اس وقت تک یہ تحقیق نہیں ہوا کہ کس قدر میں ہوئی۔ یہ مولوی عنایت اللہ صاحب کی عنایات سے چھٹی وصول ہو گئی مگر روپیہ پھر شام تک دیا جاوے گا۔ معاملہ بہت نیک (اچھا) ہو رہا ہے۔ اس وقت سیٹھ لنڈ اور رما۔ روپیہ تو تنگ کے لگتا ہے۔ جمعہ ۱۶ اکتوبر کو روانگی جہاز ٹھہری ہے۔ اگرچہ وقت تنگ ہے مگر تیز روی جہاز کے سبب مقرر ہے۔ اگر مرضیٔ مالک تعالیٰ شانہٗ ہے تو قبل حج فائز مکہ ہو جاویں گے۔ ورنہ جو کچھ (اللہ کی) رضا ہے اس پر (ہماری) رضا ہے۔ منشی تجمل حسین، عبد اللہ شاہ، محمد یعقوب، امیر شاہ وغیرہم سب سلام علیک کہتے ہیں۔ (چاند کی) تاریخ کا حال اگر خدا تعالیٰ نے چاہا تحقیق کیا جاوے گا۔ جو میرے واقف ہوں ان کو سلام علیک پہونچے۔

از بندہ رشید احمد عفی عنہ، گنگوہی۔ بعد سلام مسنون مطالعہ فرمایند۔ آپ کے دو خط پہونچے۔ ہر دو خطوط کے مضمون سے نہایت مسرور ہوا۔ حق تعالیٰ ترقی فرماوے۔ تلاوت قرآن میں ایسی حالت میں بیشک بے مزگی ہوتی ہے، مگر جب یہ کیفیت راسخ ہو جاوے گی تو اس وقت میں دلچسپی قرآن کے ساتھ بھی حاصل ہو جاوے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ ـــ آپ کچھ تردد نہ فرمائیں۔ اس سے زیادہ کچھ جواب کی حاجت نہیں۔ مگر یہ بات محقق ہے کہ جو امر خلوت میں حاصل ہوتا ہے وہ مجمع میں اور مشغولی دیگر شے میں نہیں ہوتا۔

فقط والسلام

(گزشتہ سے پیوستہ) حضرت گنگوہی قدس سرہٗ نے کچھ توجہ نہ فرمائی۔ اور ٹکٹ لے کر جہاز پر سوار ہو گئے۔ جہاز نے جب لنگر اٹھایا تو ساتویں دن عدن پہونچا، اور چند گھنٹے بندرگاہ عدن پر ٹھہرا۔ وہاں سے چلا تو سیدھا حجاز کا رخ کیا۔ یہاں تک کہ نویں دن جدہ نظر آنے لگا۔ کسی کو خبر بھی نہ ہوئی کہ کامران کدھر واقع ہے محض اللہ کے فضل سے یہ حج حضرت کو نصیب ہوا ورنہ کامران میں ٹھہرنے کی صورت میں حج نہیں مل سکتا تھا (تذکرۃ الرشید جلد اول)

عٰہ مولانا عنایت اللہ صدیقی مدراسی۔ آپ بمبئی میں خالباً ... پال کی جانب سے امین الحجاج کی حیثیت سے مقیم تھے اس وقت کے تمام اکابر آپ سے ملاقات اور مشورہ کر کے حج بیت اللہ کا سفر کرتے تھے۔ حضرت مولانا حافظ عبد الرحمٰن صدیقی امروہی مفسر و محدث آپ ہی کے باکمال فرزند تھے۔ آپ کے حالات زیادہ معلوم نہ ہو سکے۔ اتنا معلوم ہوا کہ حضرت سید احمد شہید کی جماعت مجاہدین سے آپ کا رابطہ تھا۔ ۱۳۰۵ھ میں طویل عمر پا کر بمبئی میں آپ کی وفات ہوئی۔

مکرمی مولوی خلیل احمد صاحب. مد فیوضکم السلام علیکم و رحمۃ اللہ تعالیٰ و برکاتہ، بخیریت ہوں۔
مادام حیوٰۃ (تاحیات) آدمی مبتلائے بلیات رہتا ہے. تشویشات سے جب رہا ہو کہ بایمان اس عالم سے چلا
جاوے۔ شنبہ ۲۵ شعبان کو قاضی امانت علی لکھنوتوی فوت ہوئے رحمۃ اللّٰہ تعالیٰ علیہ۔ یکشنبہ کو خبر
مرض عزیزم الحاج علاء الدین پہونچی۔ اور یہاں کے قصبہ جات کسی کا مرنا کسی کا جینا آخر ہر روز ہی افسانہ
ہے۔ آپ کے دو خط پہونچے۔ فرصت جواب نہیں پائی۔ آج بوجہ بارش مریض نہیں آئے۔ جواب لکھتا ہوں،
فرصت مغتنم ہوئی۔ پہلے اس سے کہ تا حسب طلب روانہ کر چکا ہوں پہونچا ہوگا ـــ ...... کلمات جو میری
نسبت تم لکھتے ہو سوائے اس کے کہ نادم ہوں اور کیا ہوتا ہے۔ آپ کا حسن ظن میرا رہبر ہو جاوے۔ آمین۔ قوتِ
دماغ کے واسطے کچھ دوا کھانی بہ نیت نیک عبادت ہے اور کام اس قدر کرنا کہ تحمل اس کا ہو سکے ضرور ہے۔
حق تعالیٰ تمہارا معاون و ناصر ہو۔

مولوی محمد مظہر صاحب لکھنوتی تشریف رکھتے ہیں۔ اس قدر مبتلائے بخار ہیں کہ مضامین یاس
حیوٰۃ فرماتے ہیں ـــ مولوی پیر محمد ان کی خدمت میں حاضر ہیں ـــ کسی (اور) وقت فارغ ہو (کر) بیٹھنا
(اس کی) حاجت نہیں۔ یہی وقت ذکر معین از عصر تا مغرب و از مغرب تا عشاء کافی ہے۔ اس شغل کو بہی توجہ
تصور فرمائیں۔ جب علاقہ حب کا ہوتا ہے تو کچھ مئیت کذائی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آخر تمام طرق میں
غیر نقشبندیہ یہ طریق کوئی نہیں کرتا تو غیر ضروری ہی جان کر ترک کیا ہے۔ سو اس کی کوئی حاجت نہیں اور
نہ شیخ ظاہر کچھ کر سکے۔ محل ظن کی راہ سے حق تعالیٰ اپنے خزانۂ غیب سے حسب وسعت و مقدرہ عطا
فرماتے ہیں، وسایط کا نام ہوتا ہے۔ خود وسایط کو خبر بھی نہیں ہوتی .... میاں عبد الرحمن صاحب
کو بعد سلام فرما دیں کہ یا باسط گیارہ سو بار بعد عشاء ہر روز پڑھتے رہو کچھ مضائقہ نہیں، اور سب امور کہ
مقدر جانو اپنے وقت پر ظہور ہوگا۔ داروغہ عبد الحق کو بعد سلام مسنون فرما دیں کہ جو امر حاصل شدہ جاتا ہو
یا عدم اہتمام سے جاتا ہے کہ اس کی چنداں آدمی نگہداشت نہیں کرتا۔ یا معصیت کی شامت سے فرو
ہوتا ہے، یا کھلنے کے نشیب و فراز سے۔ سو تلاش کر کے اگر ثالث امر ہے تو احتیاط چاہیے اور جو ثانی ہو تو
استغفار و ترک ابتلا اس کا ہو۔ اور جو اول ہے تو مناجات و اظہار عجز و انکسار بدرگاہ واہب العطیات ہو، اور
اپنی غفلت پر ملامت نفس کو (کی جائے) ـــ مجملاً علاج یہ ہے۔ بہر حال کثرت استغفار و ندامت ضروری ہو
...... عبد اللہ شاہ اور سب طلبا اپنے وطن کو گئے ہوئے ہیں۔

مولوی خلیل احمد صاحب مدفیضہم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آپ کا خط آیا، حال معلوم ہوا واردات رجوع الی اللہ تعالیٰ موجب فرحت ہیں۔ حق تعالیٰ کا نہایت شکر کرنا لازم ہے کہ یہ بڑی نعمت کبریٰ ہے کہ بمقابلہ اس کے لاکھوں جہان مثل پرپشہ (مچھر کے پر کی برابر) بھی نہیں۔ اور اس احقر کو تو نہایت ہی باعث شکر و افتخار ہے کہ اگر خود ایسی عطیات سے محروم ہے، بارے احباب کو عطا دمتواتمہ ہے۔

در گور برم از سر گیسوئے تو تارے　　تا سایہ کند بر سر من روز قیامت

آمین

مولوی صدیق احمد دہلی سے آکر کوٹلہ کو گئے ہیں۔ ماشاءاللہ عمدہ حال میں ہیں۔ فقط والسلام

تاریخ دعوت و عزیمت

عالم اسلام کی اصلاحی و تجدیدی کوششوں کا تاریخی جائزہ، امور مصلحین اور ممتاز اصحاب دعوت و عزیمت کا مدلل تعارف

تین جلدوں میں مکمل ۲۴/- روپے

انگریزی ایڈیشن اول ۲۸/- دوم ۳۵/-

ہندوستانی مسلمان پر ایک نظر

یعنی موجودہ ہندوستانی مسلمانوں کا مذہبی، تمدنی اور معاشرتی تعارف۔ ان کے عقائد، عبادات، مذہبی تہوار اور رسم و رواج، عادات و اخلاق اور ان کی قومی خصوصیات کا بیان۔ ایک غیر جانبدارانہ جائزہ۔ ایک واقعی تصویر

قیمت: پانچ روپیہ

پیام انسانیت ـــــ ۲/۵۰

مقام انسانیت ـــــ ۲/-

طالبان علوم نبوت ـــــ -/۶۰

محبت، فاتح عالم ـــــ -/۲۵

دریائے کابل سے یرموک تک

مغربی ایشیا کے مسلم اور عرب ممالک، افغانستان، ایران، لبنان، شام، عراق اور مشرقی اردن کے ایک معلوماتی دورہ کی مفصل رُوداد و ڈائری جس میں ان ممالک کی دینی، فکری اور اقتصادی صورت حال کی سچی تصویر اور وہاں کے دینی و انقلابی تحریکات۔ متضاد عوامل واثرات اور ذہنی و روحانی کش مکش کا دیانتدارانہ جائزہ آگیا ہے۔ صفحات ۳۰۴۔ قیمت مجلد ۱۴/-

ہندوستان اسلامی عہد میں

تالیف: مولانا حکیم سید عبدالحی

مسلمانوں کے عہد کے ہندوستان کا مفصل انتظامی، تعمیری اور تمدنی جائزہ، نظم مملکت، مالیہ، عدلیہ، فوجی نظام، حکمرانوں کے آئین، رسوم، رفاہ عام وامور خیر اور وہ ضروری اور بنیادی معلومات جن کے بغیر اسلامی عہد کی تاریخ کا سمجھنا مشکل ہے۔　قیمت مجلد ۱۲/- روپے

کتب خانہ الفرقان، ـــــ لکھنؤ

ڈاکٹر محمد اقبال انصاری
صدر شعبۂ اسلامیات علیگڑھ مسلم یونیورسٹی

شعوبی تحریک اور اس کا انجام

انسان آزادی پسند ہے، کوئی قوم یہ پسند نہیں کرتی کہ کسی دوسری قوم کی غلامی تسلیم کرے، غلامی تو بڑی بات ہے، ذہنی برتری بھی مستقل طور پر تسلیم کرنا کسی کو گوارا نہیں ہوتا، اسلام نے اسی انسانی جذبہ کا لحاظ کر کے خاندانی حکومت اور سرداری کو پسند نہیں کیا، بلکہ خاندان کے بجائے صفات کو اہمیت کی بنیاد قرار دیا، قرآن مجید نے صاف طور سے کہا کہ

یا ایھا الناس انا خلقنا کم من ذکر و انثیٰ و جعلنا کم شعوبا و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم[1]	اے لوگو ہم نے تمہیں ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے اور ہم نے تمہیں جماعتوں اور قبیلوں کی شکل میں اس لیے کیا تاکہ باہم تعارف ہو سکے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ تم میں شریف وہ ہے جو اللہ کے نزدیک خدا ترس اور پرہیزگار ہے۔

اس آیت نے نسلی غرور کا ... خاتمہ کر دیا، اور تمام انسانوں کو ایک مرد و عورت کی اولاد قرار دیکر خاندانی افتخار کی جڑ کاٹ دی،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کی وضاحت اس طرح کی:

الا لا فضل لعربی علیٰ عجمی و لا لعجمی علیٰ عربی و لا لاحمر	خوب سمجھ لو کہ کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے نہ کسی

---

[1] قرآن مجید ۴۹: ۱۳

علیٰ اسود ولا لاسود علیٰ احمر الا بالتقویٰ[1]

نہ کالے کو کسی گورے پر فضیلت حاصل ہو مگر تقویٰ کے سبب سے،

اسلام کی اس تعلیم پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں عمل ہوتا رہا، ایک مرتبہ حضرت ابوذر غفاریؓ نے اپنے غلام کو سخت الفاظ میں کوئی نامناسب بات کہدی تھی اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں تنبیہ فرمائی تھی اور کہا تھا "ابوذر تم میں ابھی تک جاہلیت کی خو باقی ہے"[2]، آپ تاکید فرماتے تھے کہ غلاموں کو غلام نہیں بلکہ مولیٰ کہا جائے، اور انھیں وہی کھلایا اور پہنایا جائے جو آقا کھائے اور پہنے، آپؐ نے غلاموں کو اتنا بلند مرتبہ دیدیا تھا کہ حضرت عمرؓ حضرت حضرت بلالؓ کو سیدنا کہتے تھے[3]۔ غیر عربوں کا اعزاز اس حد تک بڑھایا کہ حضرت سلمان فارسیؓ کے بارے میں فرمایا، اگر ایمان ثریا کے پاس ہوتا تو بھی یہ لوگ اسے حاصل کر لیتے[4]، حضرت صہیب رومیؓ، اور حضرت بلالؓ حبشی غلام تھے، لیکن ان کو وہ عزت عطا کی کہ بڑے بڑے قریشی اور انصاری ان کی نیازمندی پر فخر کرتے تھے، حضرت زیدؓ عرب نہیں تھے عجمی نژاد تھے اور غلام کی حیثیت سے خدمت کرتے تھے، مگر آپؐ نے اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینبؓ کے ساتھ ان کی شادی کر دی[5]، ان کے بیٹے حضرت اسامہؓ کو بڑے بڑے مہاجرین و انصار کے سرداروں کا افسر مقرر کیا، یہی طرز عمل خلفائے راشدین کا رہا، انھوں نے کبھی کسی شخص کو محض خاندانی بنیاد پر کسی فوج کی سرداری یا کسی علاقہ کی حکمرانی کا اہل نہیں سمجھا، بلکہ ہمیشہ یہ دیکھا کہ اس کی ذاتی صلاحیت، خدا ترسی، نیکی، عملی اور کاردانی کی کیا حالت ہے۔ لیکن خلفائے راشدینؓ کے بعد جب بنو امیہ کا دور دورہ ہوا تو وہ محاسن اور فضائل کے اعتبار سے اپنے مخالفین کے ٹکر کے نہیں تھے، اس لیے انھوں نے قبائلی عصبیت کو ہوا دی اور اس عصبیت کے سہارے اپنی خاندانی حکومت کو مستحکم کرتے رہے، ان کے طرز عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ جاہلیت کی نسل پرستی پھر ابھر آئی، ان کے زمانہ میں غیر عربوں کے لیے یہی راستہ رہ گیا کہ وہ خفیہ سازشیں کریں، اور کسی ایسی حکومت کو برسر اقتدار لانے کی کوشش کریں، جس کے ماتحت وہ عزت کی زندگی بسر کر

---

۱ سیرۃ النبی ج ۲ ص ۱۸۱ بحوالہ مسند احمد ۔ ۲ بخاری کتاب الایمان ۳ مشکوٰۃ جامع المناقب بحوالہ بخاری،

۴ ایضاً بحوالہ ترمذی ۵ حیات محمد حسین ہیکل، سیرت کی دوسری کتابوں میں بھی یہ حالات مذکور ہیں۔

سکیں، چنانچہ اس عہد کی بغاوتوں کا اگر تجزیہ کیا جائے تو ان کے اندر انہی جذبات کی کارفرمائی نظر پڑے گی بالآخر انہی عناصر نے عباسیوں کی سربراہی میں اموی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔

عباسی کہنے کو عرب تھے، لیکن ان کے دست و بازو درحقیقت عجمی تھے، ابومسلم خراسانی ہو یا برامکہ یہ سب ایرانی انقلاب پسندوں کے ترجمان تھے، اور کچھ ہی عرصہ کے بعد یہ بات نمایاں ہو گئی کہ اس انقلاب کی تہ میں کیا چیز کارفرما ہے، منصور ہوں یا ہارون، مامون ہوں یا معتصم سب ایرانیوں کے اقتدار سے گھبرانے لگے اور ایرانی سپہ سالاروں اور وزیروں کو قتل کرا کر اپنی خاندانی خلافت کو بچانے کی کوشش کرنے لگے۔

عرب اقتدار ہٹانے کے لیے عربوں کی بالادستی کا تصور ختم ہونا ضروری تھا، اس لیے ذہنی تبدیلی کے لیے ایک تحریک اٹھی، جو تاریخ میں "شعوبیت" کے نام سے مشہور ہے، یہ لفظ شعب سے ماخوذ ہے، شروع میں ان لوگوں کی طرف سے اس کا یہ مطلب ظاہر کیا جاتا تھا کہ اسلامی تصور کے مطابق عربوں کے نسلی تفوق کے خلاف یہ احتجاج ہے، لیکن رفتہ رفتہ عربوں کی تحقیر کرنے والے شعوبی کہلانے لگے۔[1]

آگے بڑھ کر یہ تحریک عرب دشمنی کی حد تک ہی نہیں پہونچ گئی، بلکہ خود اسلام بھی معرض بحث میں آگیا، کچھ لوگ تو اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ ان کے خیالات کفر و الحاد تک پہونچ گئے، بڑے بڑے ادیب و شاعر اس خیال کی وکالت کرنے لگے، ان کے جواب میں عربوں کی طرف سے بھی نثر و نظم میں بہت کچھ لکھا جانے لگا، یہ لوگ سمجھاتے تھے کہ عربوں ہی کی بدولت لوگوں کو یہ عزت و حکومت اور دولت و ثروت حاصل ہوئی، اور اسلام اور پیغمبر اسلام کی بدولت زوال پذیر عجمی نئی قوت و توانائی حاصل کر سکے، لیکن شعوبی اپنی قدیم تاریخ اور قدیم تہذیب و تمدن اور علوم و فنون پر فخر کرتے تھے، بعض لوگوں نے خوارج کو بھی شعوبیہ کی ایک قسم قرار دیا ہے، لیکن درحقیقت ان کا اختلاف سیاسی اور ایک حد تک مذہبی تھا، عرب بیزاری ان میں شعوبیوں کی طرح نہ تھی۔[2]

اموی دور میں عرب بیزاری جو سطح کے نیچے دبی ہوئی تھی، وہ عباسی عہد میں اوپر ابھر آئی، ایک

---

[1] ملاحظہ ہو لسان العرب طبع بیروت ۱۹۵۵ء ج ا ص ۵۰۰ اور صحاح طبع مصر ۱۲۸۲ھ ص ۱۶۷،

[2] گولڈ زیہر اور احمد امین ضحی الاسلام ج ا ص ۶۰۔۶۱،

طرف ایرانی تہذیب کے پھیلنے پھولنے کے مواقع پیدا ہو گئے، اور دوسری طرف عربوں کے خلاف لکھنے کی نسبتاً زیادہ جرأت ہو گئی، بالآخر ایرانی عناصر نے ایسی قوت پیدا کر لی کہ معمولی تدابیر ان کو زیر کرنے کے لیے کافی نہ ہو سکیں، اور آگے چل کر عباسی خلفاء نے ان کا زور توڑنے کے لیے ترکوں کا سہارا لیا، لیکن یہ ترک بھی آگے چل کر اپنے اقتدار کے خواہاں ہوئے، چنانچہ آئندہ ان ترکوں کے ہاتھوں عباسی خلفاء کٹھ پتلیوں کے درجہ کو پہونچ گئے، جس کو چاہتے تخت پر بیٹھاتے اور جس کو چاہتے تلوار کے گھاٹ اتار دیتے۔

شعوبی تحریک اگر صرف عربوں کی بالادستی کے خلاف رہتی، اور اسلامی روایات کی مدد سے عربوں کے نسلی تفوق کے خلاف آواز بلند کرتی تو اس کا اثر مستحکم ہوتا، لیکن انتہا پسند اشخاص نے اسلامی عقائد پر بھی ضرب لگانی شروع کی، اس کی وجہ سے یہ تحریک نسل پرستی کے خلاف احتجاج کے بجائے الحاد و زندقہ کی علامت بن گئی، عجمی سارے کے سارے منافق نہیں تھے، بلکہ ان کی بھاری اکثریت دل سے مسلمان تھی، اور اپنے اسلام پر فخر کرتی تھی، تفسیر و حدیث اور فقہ و سیر کے بڑے بڑے ائمہ سچے مسلمان تھے، امام ابو حنیفہ امام بخاری، امام مسلم، امام ابوداؤد، امام ترمذی، امام ابن ماجہ، حسن بصری، طاؤس اور ان جیسے بے شمار علماء مصنفین اور داعیان اسلام سچے مسلمان تھے، وہ کسی حال میں اسلاف کے خلاف کوئی بات نہیں سن سکتے تھے، اس لیے اسلام، اکابر اسلام اور روایات اسلام کے خلاف اظہار خیال کرنے والوں کو انھوں نے سخت ناپسند کیا، اور ان کے اس طرز عمل کو کفر و الحاد سے تعبیر کیا، اس کی بنا پر ایسے لوگوں کا زیادہ اثر نہیں ہونے پایا، بلکہ اپنی انتہا پسندی کی وجہ سے آسانی کے ساتھ ان کا قلع قمع ہو گیا، ان کی تحریک تاریخ کے اوراق میں دب کر رہ گئی، اور ان کی یاد برائی کے ساتھ لوگوں کے دلوں میں رہ گئی، فراعنہ اور اکاسرہ پر فخر کرنے والے مٹ گئے، عرب انشاپردازوں ہی نے نہیں، بلکہ عجمی اہل قلم نے بھی ان شعوبیوں کو ترکی بہ ترکی جواب دئیے، اسی طرح عربی زبان کے خلاف اظہار خیال بھی شعوبیوں کی ناکامی کا باعث ہوا، عربی قرآن و حدیث کی زبان تھی، کوئی مسلمان اس کی تحقیر گوارا نہیں کر سکتا تھا، اس لیے عربوں ہی نے نہیں بلکہ غیر عرب لغویوں، ادیبوں اور شاعروں نے عربی زبان کے تفوق کا اقرار اور اس کی خوبیوں کا اعتراف کیا، اسی طرح علمائے انساب نے بھی شعوبی نسابوں کی غلط بیانیوں کا پردہ چاک کیا، اور نبطیوں، قبطیوں، رومیوں، ایرانیوں، مجوسیوں، یہودیوں اور عیسائیوں کی ان سازشوں کو ناکام بنا دیا، جو وہ عرب دشمنی کے پردہ میں اسلام کے خلاف کر رہے

تھے، جاراللہ زمخشری جیسے ایرانی نژاد کو ان خیالات سے برأت ظاہر کرنی پڑی، اور کتاب المفصل کے دیباچہ میں لکھنا پڑا کہ

خدا کا شکر ہے کہ اس نے ان کے دل میں عربوں کے لیے عصبیت پیدا کر دی اور شعوبیت کی طرف میلان سے انھیں محفوظ رکھا[1]، گولڈ زیہر وغیرہ متعصب مستشرق خواہ کتنے ہی زور سے کہیں کہ عباسی خلفاء کے دربار میں موالی کے مقابلہ میں عربوں کے لیے باریابی دشوار ہوتی تھی، اور حاتم طائی اور احنف وایاس کا دربار میں مضحکہ اڑایا جاتا تھا[2]، لیکن صاحبان نظر پران بیانات کی کمزوری عیاں ہے، مامون کی اسلامیت شک وشبہ سے بالاتر ہے، اس نے ایرانی تراجم اسلام دشمنی میں نہیں کرائے تھے، بلکہ علمی سرپرستی مقصود تھی، اسی طرح دوسرے مذاہب کے اہل علم کی قدر دانی اس کی رواداری اور علم دوستی کا مظہر ہے، عربوں پر زیادتیوں کے جن واقعات کو ان مستشرقین نے اس کی ایران نوازی قرار دیا ہے، ان کے اسباب سیاسی ہیں، تاج وتخت کے لیے تو بادشاہوں نے باپ، چچا، بھائی کو تہ تیغ کرنے سے دریغ نہیں کیا ہے، اور عزیزوں کو قید وبند میں مبتلا کیا ہے، ان واقعات کو قومی تحقیر سے کیا تعلق، عرب ہوں یا عجم جس سے اقتدار خطرہ میں ہوا اسے ختم کر دیا گیا۔

ان تاریخی واقعات ونتائج سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک طرف نسلی عصبیت اور خاندانی تفوق کی بنیاد پر جو عمارت تعمیر کی جائے گی اسے عوامی تائید حاصل نہیں ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ کچھ عرصہ تک تلوار کے زور اور سیاسی جوڑ توڑ سے اس خاندانی سیادت کو قائم رکھا جا سکے، لیکن عوام الناس کے دل کبھی اسے پسند نہیں کر سکتے، اور نہ وہ ایسی نسلی اور قومی حکومت کے حقیقی وفادار ہو سکتے ہیں، انھیں جب بھی موقع ملے گا ایسی حکومت کو بدلنے کی کوشش کریں گے، کیونکہ غیروں کی غلامی کوئی بھی خوشی سے قبول نہیں کر سکتا ہے، عربوں کے خلاف جو بغاوتیں ہوئیں اور ان کی حکومت کا تختہ الٹنے کی جو کوششیں کی گئیں، ان کا سبب یہی تھا، اور پھر عثمانی ترکوں کے خلاف خود عربوں نے جو بغاوت کی اس کی وجہ بھی یہی تھی، ان کے خلاف عربوں کی نفرت اس درجہ کو پہونچ چکی تھی کہ انگریزوں اور دوسری عیسائی قوموں سے

---

[1] ضحی الاسلام جلد ۲ از احمد امین ص ۰، [2] گولڈ زیہر ص ۱۳۸،

ساز باز کرنے میں بھی انھیں تکلف نہیں ہوا، ایک ہاشمی کو ناموس دین مصطفےٰ کے بیچنے میں کوئی باک نہیں ہوا، نہ خاک حجاز کو خشت بنیاد کلیسا بنا دینے میں تکلف ہوا، باہر کے لوگ چاہے جو کچھ سمجھتے رہے ہوں، مگر عرب ہر قیمت پر ترکی سیادت کا جوا اپنے کندھے سے اتار پھینکنا چاہتے تھے، ایسے نہ جمال پاشا کا تشدد روک سکا، نہ سلطان عبدالحمید کا استبداد، نہ مدحت پاشا کی سیاست اور انور پاشا کی دستور پسندی اور جمہوریت نوازی، نسلی برتری اور قومی تفوق کے تصور پر کسی حکومت کی بنیاد "برات عاشقاں برشاخ آہو" کی طرح ناقابل اعتبار ہے، اسی طرح اس تفوق کے خلاف جدوجہد کرنے والوں کو بھی اس تجربہ سے یہ سبق ملتا ہے کہ بنیادی عقائد و خیالات پر ضرب لگائی جائے گی تو انقلاب کی دعوت بادِ ہوا ثابت ہوگی۔

(معارف اعظم گڑھ کے شکریہ کے ساتھ)

قاضی خان ظفرآبادی

از مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی استاذ جامعہ اسلامیہ
ریوڑی تالاب بنارس

ظفرآباد جون پور سے ۶ میل پورب اور دکھن میں واقع ہے۔ یہ قدیم اور تاریخی مقام ایک زمانہ میں علماء و مشائخ کا مرکز رہ چکا ہے۔

اس کا اصل اور قدیم نام منیچ تھا۔ جب مسلمانوں کی آمد اور فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا اور اس علاقہ پر ان کا قبضہ ہو گیا اس وقت سے منیچ کے بجائے ظفرآباد کے نام سے مشہور ہوا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ۵۸۹ھ میں سلطان شہاب الدین غوری کے نائب السلطنت قطب الدین ایبک نے گوالیار، بدایوں اور کالپی وغیرہ کی تسخیر کے بعد منیچ پر حملہ کیا اس وقت یہاں کا راجہ اودے پال نامی ایک راجپوت تھا۔ اودے پال ایبک کے مقابلہ میں ٹھہر نہ سکا اور اپنے خاندان کو لے کر مارواڑ کی جانب بھاگ گیا۔

ایبک فاتحانہ شہر میں داخل ہوا اور چند دن یہاں قیام کر کے انتظامات درست کیے اور اپنی جانب سے اودے پال کے وزیر جیت سنگھ کو شہر کا حاکم بنا کر خود دلی چلا گیا۔ اس تاریخ سے منیچ اسلامی قلمرو میں شامل ہو گیا۔ لیکن عملاً حکومت جیت سنگھ اور اس کی اولاد کے قبضے میں رہی۔ یہ لوگ برابر سالانہ خراج دہلی بھیجتے رہے اور اپنی نیازمندی اور ماتحتی کا اقرار کرتے رہے۔

لیکن جیت سنگھ کی پانچویں پشت میں سرکیٹ سنگھ نامی ایک ایسا راجہ ہوا جو ناعاقبت اندیش ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت متعصب بھی تھا۔ اس نے ایک طرف تو شاہان دہلی کی برتری کا انکار کر کے خود مختاری کا اعلان کر دیا اور دوسری جانب جو مسلمان اس کی حدود سلطنت میں تھے ان کے درپے آزار ہو گیا۔

اور نت نئے مظالم ان پر توڑنے لگا۔ اس کے تعصب کی پیاس جب ان مظالم سے نہ بجھ سکی تو اعلان کر دیا گیا کہ کوئی مسلمان اس کی حدود سلطنت میں رہنے نہ پائے جو مسلمان اس اعلان کے بعد اپنی مجبوریوں سے ہجرت نہ کر سکے وہ اس کی جارحیت و بربریت کے ہاتھوں ہلاک و برباد ہوئے۔ [1]

انھیں ایام میں جبکہ سکیٹ سنگھ مسلمانوں پر جبر و تشدد کے پہاڑ توڑ رہا تھا۔ شیخ سید اسدالدین آفتاب ہند المتوفی ۷۹۳ھ [2] جو اس عہد کے اولیائے کاملین میں تھے اپنے شیخ مخدوم رکن الدین ملتانی المتوفی ۷۳۵ھ کے حکم سے دیار پورب میں مقیم تھے انھیں جب سکیٹ سنگھ کی زیادتیوں کی اطلاع ملی تو وہ مسلمانوں کی مدد اور انھیں ظلم و ستم کے خونیں پنجے سے نجات دلانے کے لیے بیچین ہو گئے۔ اور فوراً ایک خط اپنے پیر و مرشد شیخ ملتانی کی خدمت میں ارسال کیا۔ انھیں راجہ کے ظلم و تعصب سے باخبر کر کے اجازت چاہی تاکہ منیچ جاکر مسلمانوں کی نصرت و حمایت کی جائے اور راجہ کو ظلم و عدوان سے روکا جائے۔

مخدوم آفتاب ہند نے اس سلسلہ میں جو مکتوب شیخ رکن الدین ملتانی کی خدمت میں بھیجا تھا اس مکتوب سے راجہ کی جارحیت اور مسلمانوں کی مظلومیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ مکتوب ملاحظہ ہو۔

کمترین بندگان اسد حسینی امیدوار برکت مخدوم مد اللہ ظلال جلالہ بر آں جماعہ کہ ایں بندہ بعد ادائے آداب بجماعت در دعا مشغول می ماند رجاء کہ مددے درکار بندہ باخدائے تعالیٰ اسباب دینی و دنیوی ساختہ گرداند۔

دیگر عرض می گفتہ چوں بندۂ بندگان بحکم آں مخدوم زمان در جہاد بنادی مشغول و سرگرم ست لاکن معرکہ آرائی ختم نشد ہمدریں اثنا اخبار بدعت آثار راجہ منیچ کہ او سخت قلب ظلم و کشت

---

[1] تاریخ ظفرآباد ص ۱۹ [2] شیخ مخدوم سید اسدالدین ۶۶۱ھ میں پیدا ہوئے کڑا مانک پور میں شیخ ضیاء الدین زاہد کڑوی سے علوم و فنون کی تعلیم بیس سال کی عمر میں مکمل کی، پھر ملتان جاکر شیخ رکن الدین ابوالفتح بن محمد ملتانی سے بیعت کی اور خلافت پائی۔ آپ فقہ، اصول فقہ اور تفسیر میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ سبعہ کے قاری بھی تھے۔ ملتان سے دہلی آکر حضرت سلطان الاولیا شیخ نظام الدین بدایونی سے بھی کسب فیض کیا۔ ۱۶ر جمادی الاول ۷۹۳ھ میں بمقام ظفرآباد وفات پائی۔ محلہ سید واڑہ ظفرآباد میں دریائے گومتی کے ساحل پر آپ کا مزار ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے... تجلی نور ص ۱۱ و چراغ نور ص ۴۳-۴۸ و نزہۃ الخواطر ص ۱۲ ج ۲

بے گناہان و بر مسلماناں انواع انواع بدعت و ایذا می رسانند و از خوف و رجاء یوم انتقال غافل است
جماعت فقراء کہ در زاویۂ ایں بندۂ بندگان مامور است بجوش و خروش می خواہد کہ براں ناعاقبت اندیش
نعرۂ تکبیر بلند کنند الا انتظار ایں معرکہ موقوف بدل گزیں اگر توجہ در کار ما بندۂ بندگان شود حق سبحانہ
تعالیٰ آں سخت قلباں را بخلعت نور اسلام مزین کند و جملہ مسلماناں را فیروزمندی را باد بلند کرمہ[1]

مخدوم آفتاب ہند اس وقت بناوی[2] میں مصروف تھے اس لیے شیخ ملتانی نے اپنے دوسرے خلیفہ مخدوم صدر الدین چراغ ہند[3] المتوفی ۹۴۲ھ کو جو اس وقت مرزا پور کے علاقہ میں ارشاد و تبلیغ کے اہم کام میں مصروف تھے منیچ کی جانب متوجہ ہونے کا حکم دیا۔

شیخ کے حکم پر مخدوم چراغ ہند مرزا پور سے منیچ کے لیے روانہ ہو گئے۔ ان کے پہونچتے پہونچتے مخدوم آفتاب ہند بھی بناوی سے فارغ ہو کر منیچ پہونچ گئے۔ دونوں بزرگوں نے معاملہ کی اہمیت و نزاکت کے پیش نظر شاہ دہلی غیاث الدین تغلق سے امداد کی فرمائش کی۔ ان حضرات کی طلب پر سلطان نے شاہزادہ ظفر خاں کی معیت میں چھ ہزار کا لشکر منیچ روانہ کر دیا۔ شہزادہ ظفر خاں نہایت تیز رفتاری سے شب و روز منزلیں طے کرتے ہوئے بہت جلد منیچ کے قریب پہونچکر دریائے گومتی کے ساحل پر خیمہ زن ہو گیا۔[4]

ظفر خاں کے آجانے کے بعد راجہ کو پیغام بھیجا گیا کہ سرکشی اور ظلم و تشدد کے راستہ کو چھوڑ کر اطاعت قبول کرے اور اگر یہ منظور نہیں ہے تو پھر جنگ کے لیے آمادہ ہو جائے۔ راجہ کی جانب سے اس پیغام کا کچھ جواب نہیں ملا جسے مسلمانوں نے اس کے کبر و نخوت اور آمادگیٔ جنگ پر محمول کیا اور قہر کا محاصرہ کر لیا۔

---

[1] تاریخ ظفر آباد بحوالہ مناقب درویشیہ قلمی ص ۲۱ و تاریخ شیراز ہند ص ۹۲۵۔

[2] بناوی تحصیل سگڑی ضلع اعظم گڑھ کا ایک مشہور موضع ہے۔

[3] شیخ صدر الدین ظفر آبادی ۸۰۵ھ میں ملتان میں پیدا ہوئے اور اس دور کے اساتذہ سے حفظ قرآن اور دیگر علوم معارف کی تکمیل کی پھر اپنے ماموں زاد بھائی شیخ رکن الدین ملتانی سے بیعت کی اور خلافت پائی اور شیخ کے حکم سے تبلیغ دین کی غرض سے دیار پورب میں تشریف لائے۔ آپ نے سات بار پیدل حج کیا تھا۔ ۸ ذی قعدہ ۹۴۲ھ یا ۹۹۰ھ یا ۹۹۵ھ میں وفات پائی۔ آپ کا مدفن محلہ شیخ دائرہ ظفر آباد میں ہے۔ دیکھئے چراغ ہند ص ۲۰۳ و تجلی نور ص ۱۰-۱۱ و نزہۃ الخواطر ص ۶۰ ج ۲۔ [4] تاریخ ظفر آباد ص ۲۳

راجہ سکیٹ سنگھ اپنے اندر مقابلہ کی طاقت نہ پاکر قلعہ میں محصور ہو گیا۔ اور مسلمانوں کے پاس پیغام بھیجا کہ لڑنے کے بجائے ہمارے درمیان مذہبی مباحثہ ہو جائے اگر مسلمان اس مباحثے میں کامیاب ہو جائیں گے تو مجھے قبول اسلام سے کوئی عذر نہ ہوگا اور اگر بازی ہمارے ہاتھ رہی تو پھر مسلمان کو ہمارا شہر خالی کر دینا پڑے گا۔ مخدوم چراغ ہند نے راجہ کی تجویز تسلیم کر لی اور محاصرہ اٹھا لیا۔

دونوں فریق کے لوگ جمع ہوئے اور مجلس مناظرہ منعقد ہوئی۔ فریقین کے نمائندوں نے اپنے اپنے دلائل پیش کیے۔ انجام کار میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔ راجہ کے مناظرین اسلام کی حقانیت کے معترف ہو کر مسلمان ہو گئے۔ راجہ کو جب اس شکست کی خبر ملی تو وہ بدعہدی کرتے ہوئے اپنے خاندان کے افراد کو ہمراہ لیکر چپکے سے جان بچا کر مرزاپور بھاگ گیا۔ اور فوجیوں نے قلعہ کا دروازہ بند کر لیا۔ ناچار مسلمان پھر لڑنے پر مجبور ہوئے چونکہ راجہ فرار ہو چکا تھا اس لیے فوج زیادہ دیر تک مقابلہ میں قائم نہ رہ سکی اور معمولی مزاحمت کے بعد قلعہ کا دروازہ کھول دیا اور مسلمان فاتحانہ شہر میں داخل ہوئے۔[1]

یہ جنگ ۷۲۱ھ میں پیش آئی ہے اور اس وقت سے یہ قدیم اور تاریخی شہر منیچ کے بجائے ظفرآباد کے نام سے موسوم ہوا۔

اس سن کی تصدیق اس کتبہ سے ہوتی ہے جو حضرت چراغ ہند کے مقبرہ کے صدر دروازہ پر نصب ہے جس پر یہ اشعار کندہ ہیں۔

بعہد ملک ذوالقرنین ثانی	بنائے شہر را از عدل بانی
غیاث دین و دنیا بوالمظفر	سلیمان خاتم و جمشید و افسر
شہ آفاق تغلق شاہ اعظم	کہ بر وے شد جہانگیری مسلم
دو شنبہ بست و ہفتم روز بودہ	ربیع الاول ماہ ستودہ
ہمایوں سال و ساعت وقت مسعود	ز ہجرت ہفت و صد و بست یک بود
مظفر شد چوں شد معمور ایں شہر	ظفرآباد نامش ماندہ در دہر

---

[1] تاریخ ظفرآباد صفحہ ۲۲ و تاریخ شیراز ہند صفحہ ۹۲۔ تاریخ ظفرآباد صفحہ ۲۳ و تاریخ شیراز ہند صفحہ ۱۰۱۳۔

یہ کتبہ دراصل اس شہر پناہ کا تھا جسے شاہزادہ ظفر خاں نے شہر پر قبضہ ہو جانے کے بعد بنوایا تھا مگر جب شہر پناہ گر گئی تو بعد میں وہ پتھر یہاں لاکر نصب کر دیا گیا۔[1]

شہر کے فتح ہو جانے کے بعد مخدوم آفتاب ہند و چراغ ہند نے اسی جگہ اقامت اختیار کرلی۔ ان دونوں بزرگوں کے ہمراہ اس تبلیغی و جہادی قافلہ میں شیخ نظام الدین شامی، قاضی عزالدین، ملا بہرام منطقی، شیخ محمد کرفی، قاضی تاج الدین ناصحی، ملا بدرالدین، ملا آدم وغیرہ بھی تھے جو اپنے وقت کے مشاہیر علماء و صوفیاء میں شمار ہوتے تھے جن کی وجہ سے ظفرآباد علماء و مشائخ کا عظیم ترین مرکز بن گیا۔[2]

قاضی تاج الدین ابراہیم ناصحی ظفرآباد کے اولین قاضی منتخب ہوئے۔ یہ حافظ قرآن اور نہایت خوش الحان قاری تھے اور مخدوم آفتاب ہند کے ممتاز خلفاء میں تھے۔ سلطان الشرق ابراہیم شاہ شرقی کے عہد میں ۸۰۳ھ میں فوت ہوئے۔[3]

انھیں قاضی تاج الدین ناصحی کی چوتھی پشت میں نویں صدی کی ابتداء میں اس نادرۂ روزگار ہستی کا وجود ہوا جس نے بیک وقت درسگاہ اور خانقاہ دونوں کو اپنی علمی و روحانی سرگرمیوں سے آباد رکھا اور جس کے دست قناعت نے فقر و فاقہ کے باوجود کسی امیر و رئیس کا شرمندۂ احسان ہونا پسند نہیں کیا۔ اسی قدسی صفات بزرگ کی ذات آج زیب عنوان ہے۔

اسم گرامی اور تاریخ ولادت نام نامی جلال الدین اور لقب قاضی خاں اور ناصحی ہے۔ ناصحی آپ کا خاندانی لقب ہے جس سے پورا خاندان ملقب ہے۔ اس لقب کے سلسلے میں صاحب مناقب درویشیہ لکھتے ہیں کہ حضرت ابراہیم ادہم قدس سرہ نے جب تاج و تخت سے کنارہ کش ہو کر درویشانہ اور فقیرانہ روش اختیار کرلی تو ان کے ایک صاحبزادہ محمود نے آپ کو

---

[1] سید سلیمان ندوی قدس سرہ نے حیات شبلی کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ غیاث الدین تغلق نے مخدوم چراغ ہند کے لئے ظفرآباد میں ایک محل بنوایا تھا، یہ کتبہ اسی محل کا ہے مگر تمام کتب اس روایت سے خالی ہیں اس کے برخلاف تاریخ شیراز ہند ص ۱۰۱-۱۰۲ پر ہے کہ یہ کتبہ شہر پناہ کا تھا جسے بعد میں شہر پناہ کے منہدم ہو جانے کے بعد روضہ کے دروازے پر نصب کر دیا گیا ہے۔

[2] چراغ ہند ص ۲۲ [3] چراغ ہند ص ۱۲ بحوالہ مناقب درویشیہ۔

پند و نصائح کے ذریعہ پھر سلطنت و حکومت کی جانب مائل کرنا چاہا اسی پند و نصیحت کی وجہ سے لوگ محمود کو محمود ناصح کہنے لگے اور اس کی اولاد ناصحی کی نسبت سے مشہور ہوئی[1]

آپ کی ولادت ۸۵۰ھ میں بمقام ظفرآباد ہوئی۔ مادۂ تاریخ پیدائش خاصان حق ہے۔

شجرہ نسب اور اصلی وطن

آپ نسباً شیخ فاروقی اور حضرت ابراہیم ادہم کی اولاد سے ہیں شجرہ نسب یہ ہے۔ جلال الدین قاضی خاں بن قاضی یوسف ناصحی بن نظام الدین ناصحی بن شیخ صدر عالم ناصحی بن قاضی تاج الدین ابراہیم ناصحی بن سلطان حسین ناصحی بن سلطان سلیمان ناصحی بن سلطان محمود ناصح بن شیخ ابراہیم ادہم قدس اسرارہم[2]

حضرت ابراہیم قدس سرہٗ کے تارک الدنیا ہو جانے کے بعد بھی کئی پشتوں تک اُن کے خاندان میں حکومت باقی رہی لیکن سلطان حسین ناصحی کے عہد میں شاہ عباس فرماں روائے ایران نے حملہ کر کے حکومت بخارا کو تاخت و تاراج کر دیا اور خاندان ناصحی کا شیرازہ اقصائے عالم میں منتشر ہو گیا

اسی حملہ کے بعد [illegible] میں شیخ تاج الدین ناصحی نے بخارا کی سکونت ترک کر کے دہلی کو اپنا مسکن و وطن بنایا بعد ازاں حضرت آفتاب ہند کی معیت میں ۷۲۱ھ میں ظفرآباد تشریف لائے اور یہاں کے قاضی مقرر ہوئے۔ یہی عہدۂ قضاۃ میں خاندان ناصحی کے ظفرآباد میں قیام کا سبب ہوا[3]

شیخ تاج الدین نے ظفرآباد میں جس مقام کو اپنی قیام گاہ بنایا تھا وہ جگہ محلہ ناصحی سے مشہور ہوئی اور آج تک اسی نام سے موسوم ہے۔

خاندانی وجاہت

قاضی خاں نے جس وقت آنکھ کھولی آپ کا گھر علم و فضل کا گہوارہ تھا۔ والد بزرگوار قاضی یوسف ناصحی ظفرآباد کے قاضی تھے۔ گھر میں علوم و فنون کے چرچا کے ساتھ فراغت و رفاہیت بھی تھی۔ ابھی آپ چھ ماہ کے تھے کہ ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا جس

---

[1] چراغ ہند ص ۴۷ نزہۃ الخواطر صفحہ ۲۶۵ ج ۴ [2] چراغ نور ص ۱۲۵ - ناصحی خاندان کے شیوخ اپنا سلسلہ نسب حضرت ابراہیم تک پھر اس کے اوپر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ تک لے جاتے ہیں لیکن یہ محل نظر ہے کیونکہ علامہ ابن اثیر کامل میں لکھتے ہیں کہ ابراہیم بن ادہم قبیلہ بکر بن وائل سے تھے اور حافظ نے تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم عجلی تھے اور بعض نے تمیمی لکھا ہے۔ امام بخاری بھی قتیبہ کے حوالے سے انھیں تمیمی بیان کرتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

[3] بیان الانساب سادات زیدیہ ص ۱۲۹ بحوالہ تاریخ شیراز ہند

نے آپکو ایک قاضی کے گھر سے وزیر اعظم کی آغوش میں پہونچادیا۔

آپ کے والد قاضی یوسف ایک شب اپنے خسر عماد الملک بختیار خاں وزیر اعظم کے بالاخانہ پر تہجد کے بعد ذکر و شغل میں منہمک تھے۔ اتفاقاً شیخ بہاء الدین جونپوری قدس سرہ[1] کا گزر بالاخانہ کے پاس سے ہوا۔ شیخ نے قاضی یوسف کو دیکھ کر بڑے پر درد لہجے میں بلند آواز سے یہ اشعار پڑھے ؎

دارم سخنے اگر نہی گوشش من رسم سوئے تو خاموشش

ایوان ترا اگرچہ بلند است اینجا حرص و ہوا کمند است

باید در عشق خانہ بردوشش مجنوں شدہ کوہ کوہ بخروشش

خدا جانے شیخ کی آواز میں کیا جادو تھا کہ ان اشعار کے سنتے ہی قاضی یوسف از خود رفتہ ہو گئے اور ایک آہ سرد مار کر بیابان کی راہ لی۔ سلطان الشرق اور عماد الملک نے ہر چند تلاش و جستجو میں آدمی دوڑائے مگر کچھ خبر نہ ملی کہ کہاں گئے اور کیا ہوئے[2]۔

قاضی یوسف کے اس طرح لاپتہ ہو جانے کے بعد قاضی خاں کی نگہداشت اور تربیت کی تمامتر ذمہ داری ان کے نانا عماد الملک کے سر آئی — عماد الملک جملہ علوم و فنون میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ اور وزیر السلطنت بھی تھے اس لیے علمی ماحول کے ساتھ ہر طرح کی آسائش اور آسودگی بھی میسر تھی جس کا اثر محترم قاضی خاں کی نشو و نما پر بہت اچھا پڑا اور سترہ سال کی قلیل مدت میں علوم متداولہ کی تعلیم و تحصیل سے فراغت ہو گئی۔

نزہۃ الخواطر میں ہے

ونشاء فی مھد جدہ لامہ الوزیر	اپنے نانا عماد الملک وزیر جونپور کی آغوش میں
عماد الملک الجونپوری واشتغل بالعلم	پروان چڑھے اور بچپن ہی میں تحصیل علم میں مشغول

---

[1] شیخ بہاء الدین جونپوری چشتی مشہور مشائخ چشتیہ میں سے ہیں۔ مولانا عبدالحئی رائے بریلوی نزہۃ الخواطر ج ۴ میں شیخ بہاء الدین جونپوری کے ترجمہ میں لکھتے ہیں العالم الفقیہ المورث جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ علوم باطن کے ساتھ علوم ظاہر میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ شیخ محمد عیسیٰ تاج جونپوری کے مرید اور راجہ حامد شاہ مانکپوری کے خلیفہ تھے بقول صاحب تحفہ خلد ۹۰۰ھ میں وفات پائی تفصیل کیلئے دیکھیے تجلی نور ۲/۲ [2] چراغ نور ۴۶ و گنج ارشد ۸ص ونزہۃ الخواطر ج ۴۔ اخبار الاخیار ص ۳۰۳

من صباہ و قرء فاتحۃ الفراغ فی السابع عشر من سنہ [1]	ہوگئے اور سترہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہوگئے۔

مخدوم قاضی خان نے کن کن اساتذہ سے تعلیم حاصل کی اس کی تفصیل سے تمام تذکرہ نگار خاموش ہیں لیکن اتنی بات واضح ہے کہ انھوں نے عماد الملک کی زیر نگرانی علمی مراحل طے کئے اور جملہ علوم و فنون کی تحصیل جونپور ہی میں کی۔ عماد الملک خود ایک تبحر عالم اور علم و علماء کی عظمتوں سے واقف، بیدار دل، روشن ضمیر بزرگ تھے اور جونپور سلطان الشرق کی علم پروری اور علماء نوازی سے چمنستان علم و فضل بنا ہوا تھا۔

اس لیے یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ شفیق نانا نے عزیز نواسے کی علمی تربیت کے لیے وقت کے علماء و فضلا کی خدمات حاصل کی ہوں گی۔

عرفان و سلوک علوم ظاہری کی تحصیل سے فراغت کے بعد علوم باطنی کی جانب متوجہ ہوئے اور سلسلۂ چشتیہ کے مشہور بزرگ شیخ حسن بن طاہر جونپوری کی خدمت میں وہاں پہونچے اور مسلسل تیس سال انکی صحبت میں رہ کر عبادت و ریاضت میں مشغول رہے اور ولایت کے اعلیٰ مدارج طے کرکے شیخ سے خلافت حاصل کی۔

مولانا عبد الحئی مرحوم نزہۃ الخواطر میں رقمطراز ہیں۔

ثم لازم الشیخ حسن بن الطاہر العباسی الجونپوری و صحبہ ثلاثین سنۃ و اخذ عنہ الطریقۃ [2]	پھر وہ شیخ حسن بن طاہر عباسی جونپوری کی خدمت میں جا پڑے اور پورے تیس سال ان کی صحبت میں رہ کر راہ سلوک طے کی۔

شیخ حسن طاہر جونپوری اپنے عہد کے مشاہیر علماء و مشائخ میں سے تھے۔ علوم باطنی کے ساتھ علوم ظاہری کے زیور سے بھی آراستہ تھے۔ شیخ کو راجہ حامد شاہ مانکپوری المتوفی ۹۰۱ھ سے خلافت حاصل تھی۔ شیخ حامد فرماتے تھے کہ قیامت کے دن حسن میرے لیے حجت و دلیل ہوں گے۔ سلطان سکندر لودی کی خواہش پر جونپور سے آگرہ پھر وہاں سے دلی تشریف لے گئے اور وہیں بیچ منڈل میں ۹۰۹ھ میں ہمیشہ کے لیے اقامت گزیں ہو گئے [3] (باقی)

---

[1] نزہۃ الخواطر ص ۲۶۵ ج ۴ و تجلی نور ص ۱۰ وفیات الاعلام ص ۱۰۔ [2] نزہۃ ص ۲۶۵ ج ۴ اخبار الاخیار ص ۲۲۹
[3] اخبار الاخیار ص ۲۱۰ تذکرہ علمائے ہند ص ۴۸ نزہۃ الخواطر ص ۹۶ ج ۴۔

مولوی محمد زکی کیفی مرحوم

حضرت میاں صاحب مولانا اصغر حسین دیوبندیؒ

کچھ نقوش و تاثرات

(مخدومنا حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی (مقیم کراچی) دامت فیوضہم کے ایک صاحبزادے مولوی محمد زکی مرحوم تھے، بڑے ذہین فطین اور بڑے اچھے شاعر بھی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اور بھی بہت سے کمالات سے نوازا تھا، لاہور میں قیام اختیار کر لیا تھا اور معاش و وسیلہ کے طور پر "ادارۂ اسلامیات" کے نام سے ایک وسیع تجارتی کتب خانہ وہیں قائم کر لیا تھا، عمر ابھی پچاس ہی کے قریب تھی، گزشتہ محرم میں جبکہ چند ہی دن پہلے (بظاہر) پاک صاف ہو کر سفر حج سے واپس ہوئے تھے، قلب کا دورہ پڑا اور دعوتِ اجل کو لبیک کہا — ارحم الراحمین اپنی شانِ عالی کے مطابق مغفرت و رحمت کا خاص معاملہ فرمائے۔

مرحوم نے کئی سال پہلے استاذنا حضرت مولانا میاں اصغر حسین صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ (استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند) پر ایک مضمون لکھا تھا، جو ماہنامہ "البلاغ کراچی" میں شائع ہوا تھا (یہ ماہنامہ اُن کے چھوٹے بھائی مولانا محمد تقی عثمانی کی ادارت میں نکل رہا ہے اور پاکستان کے ممتاز ترین دینی جرائد میں سے ہے۔)

صاحب مضمون مولوی زکی کیفی مرحوم کے انتقال کے بعد، اُن کی نشانی کے طور پر صفر سنہ رواں کے "البلاغ" میں اس کو پھر شائع کیا گیا ہے اور راقم سطور نے اسی میں پڑھا ہے۔ لیکن ہندوستان میں شاید چند ہی حضرات کی نظر سے گزرا ہو، — اس عاجز نے مناسب سمجھا کہ اس مضمون

نے بہت ہی متاثر کیا، اللہ تعالیٰ اس تاثر کو قائم رکھے اور اس سے نفع اٹھانے اور سبق لیتے رہنے کی توفیق دے۔

حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم دیوبند کے باکمال اساتذۂ حدیث میں سے تھے، اُن کی ولایت پر اُن کے معاصر واقف اہل علم و اصحاب قلوب کا گویا اتفاق تھا، دارالعلوم میں دورۂ حدیث کی جماعت کو ابوداؤد شریف مدت تک وہی پڑھاتے رہے، راقم سطور نے بھی اب سے ٹھیک پچاس سال پہلے (۱۳۴۵ھ) میں سنن ابی داؤد حضرت میاں صاحبؒ ہی سے پڑھی تھی۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ پر خود کچھ لکھنے کی کبھی ہمت نہیں آئی "الفرقان" میں اس مضمون کی اشاعت سے ناظرین کے دینی نفع کے علاوہ اپنی اس تقصیر کی کسی درجہ میں تلافی کی بھی امید ہے — رب کریم کی توفیق سے "اللہ والوں کا تذکرہ" "الفرقان" کا خاص موضوع بھی ہے — نعمانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقریباً تیس بتیس سال پہلے کی بات ہے۔ گرمیوں کی ایک صبح کو لڑکپن کی مست نیند سے بیدار ہوا تو گھر بھر کو مغموم اور گریاں پایا، معلوم ہوا کہ شاہ صاحبؒ کا انتقال ہو گیا۔ خبر سنتے ہی دل بیٹھ گیا۔ اس لیے نہیں کہ مجھے شاہ صاحب سے عقیدت تھی بلکہ صرف اس تصور سے کہ ہمیں جو مٹھائی ہر دفعہ اُن کے پاس جانے سے ملا کرتی تھی وہ بند ہو جائے گی۔

یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ اس وقت شاہ صاحب (مولانا انور شاہ کشمیریؒ) کا انتقال ہوا تھا، میاں صاحب مولانا اصغر حسین کا نہیں۔

شاہ۔ اور میاں کے فرق کو سمجھنے کا اس وقت شعور ہی کہاں تھا؟ بہرحال میاں صاحب مولانا اصغر حسین کی شفقت و محبت کا میرے ذہن پر یہ پہلا نقش تھا۔

اس کے بعد میاں صاحب کی زیارت سفر و حضر میں بارہا ہوتی رہی اور ہر بار ایک گہرا نقش چھوڑتی رہی۔ اس پر میں جس قدر بھی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کروں وہ کم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان گناہگار آنکھوں کو بھی اپنے اُن مخلصین کی زیارت کا شرف بخشا جو دور اول کے علم و عمل اور اخلاص و محبت کا چلتا پھرتا نمونہ تھے، اگرچہ اپنی بداعمالیوں اور لغزشوں کے تصور سے بھی کانپ اٹھتا ہوں۔ اور سوچتا ہوں کہ کیسے کیسے رحمتوں کے بادل برسے لیکن میں اپنی بدنصیبی اور شامت اعمال کی وجہ سے

اپنے نفس بھی تر نہ کرسکا اگر اسی بات پر پوچھ ہو گئی تو خدا کو کیا جواب دے سکوں گا۔

میاں صاحب حضرت مولانا اصغر حسین رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق خود میاں صاحب کے بزرگوں اور اساتذہ کو ان کا احترام کرتے دیکھا اور فرماتے سنا کہ یہ تو مادر زاد ولی ہیں۔ اساتذہ بھی نام لینے کے بجائے میاں صاحب ہی کہتے تھے۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب قدس سرہٗ جو اس وقت دارالعلوم کے سید الطائفہ تھے وہ بھی ان کو ہمارے سید صاحب کہہ کر خطاب فرماتے۔

میاں صاحب کے علم و عمل اور صلاح و تقویٰ کو تو اہل علم صاحب باطن اور صاحب بصیرت حضرات ہی جانتے ہوں گے اس تباہ حال و گناہ گار نے اس مجسمۂ شفقت و اخلاص کو جن حالتوں میں دیکھا جو الفاظ زبان فیض ترجمان سے سنے جو نصائح و عبر اُن کی صحبت سے حاصل ہوتے رہے ان کے جس رُخ پر کتنا ہی زیادہ سے زائد لکھا جائے کم ہے اور اس کی ضرورت بھی بہت ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ کام کسی عالم اہل دل کے کرنے کا ہے میں نہ تحریر پہ قدرت رکھتا ہوں نہ ان علوم و معارف سے آشنا جن کے میاں صاحب شناور تھے۔

تفصیلی حالات زندگی لکھنے کی نہ مجھ میں صلاحیت ہے اور نہ اس کا یہ موقع ہے، اس وقت صرف چند واقعات جو اس وقت ذہن میں آگئے، پیش کر رہا ہوں ممکن ہے میری اس بے سروپا تحریر کو دیکھ کر ہی کسی صاحب کے دل میں اس عظیم شخصیت پر جامع مضمون لکھنے کا داعیہ پیدا ہو جائے۔

میری عمر پندرہ سولہ سال کی ہوگی۔ ایک روز میاں صاحب کی خدمت میں حاضری کا داعیہ پیدا ہوا، صبح کے دس بجے ہوں گے کہ میں اس آستانۂ ہدایت پر پہنچا۔ میاں صاحب کی زیارت سے دولت سرمدی حاصل کی۔ میاں صاحب تو سراپا شفقت اور پیکر محبوبیت تھے۔ مختلف نصیحتیں فرماتے رہے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت! میں عربی کی ابتدائی کتب پڑھ رہا ہوں دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ علم عطا فرمائے۔

میاں صاحب معمول کے مطابق کچھ دیر تسبیح و استغفار میں مشغول رہے پھر فرمانے لگے۔ میاں علم انسان میں تکبر پیدا کر دیتا ہے اور انسان خود کو عام لوگوں سے بلند و بالا سمجھنے لگتا ہے اگر علم کے ساتھ تقویٰ اور خشیت نہ ہو تو جہل اس سے بدرجہا بہتر ہے! اہل علم کے لیے ان جملوں میں جو درس عبرت ہے اس کی اہمیت و قیمت کا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے نور بصیرت عطا فرمایا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اہل علم کے لیے علمی برتری کا احساس ہی ایک روگ ہے جو ان کی اس فضیلت کو

معصیت میں تبدیل کر دیتا ہے اور خدمت خلق اور افادۂ عوام کے لیے سبزۂ سکندری بن جاتا ہے۔

حضرت میاں صاحب کو حق تعالیٰ نے مرجع خلائق بنایا تھا ہر وقت آنے والوں کا ہجوم رہتا تھا۔ ادھر طبعی مذاق خلوت پسندی کا تھا اس کے ساتھ علمی خدمات تھیں جن کی وجہ سے اکثر دروازہ بند کرکے بیٹھتے تھے۔ عصر کے بعد عام مجلس ہوتی تھی دوسرے اوقات میں دروازہ بند رہتا تھا۔ اس وقت کوئی حاضر ہوتا تو دروازے پر دستک دے کر اجازت لینے کا معمول تھا۔ کچھ یہ بھی مقصود ہوتو بعید نہیں کہ شریعت کا یہ حکم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ سنت کہ کسی کے مکان پر جاؤ تو بلا اجازت داخل نہ ہو عام لوگوں میں متروک ہو رہی ہے۔ اس سنت کا احیاء کرنا پیش نظر تھا لیکن مجھ پر چونکہ بے حد شفقت تھی اور میرے لڑکپن کی وجہ سے کبھی صرف نظر بھی فرماتے تھے میں بغیر اطلاع ہی اندر چلا جاتا تھا۔

ایک روز حاضر ہوا تو دروازے پر چند ذی وجاہت لوگوں کو اجازت ملنے کا منتظر پایا، فوراً ہی دل میں فخر و غرور کا ایک جذبہ بیدار ہوا کہ ہمیں میاں صاحب نے اس قانون سے مستثنیٰ کر رکھا ہے اسی فخر کے اظہار کے لیے بلا تامل اندر پہنچ گیا۔ میاں صاحب صحن مکان کے ایک گوشہ میں چارپائی پر تشریف فرما تھے۔ جاکر سلام عرض کیا۔

میاں صاحب کی نظر حقیقت شناس نے فوراً ہی دل کا چور پکڑ لیا۔ غصے کے انداز میں ہلکی سی گوشمالی فرماتے ہوئے ارشاد ہوا "اے مولوی کے لڑکے! تم بڑے بدتمیز ہو کر بغیر اجازت حاصل کیے مکان میں گھس آتے ہو نکلو یہاں سے اور دروازہ پر جاکر بلند آواز سے کہو کہ "نذیر آیا ہے اور حاضری کی اجازت چاہتا ہے۔" بادل ناخواستہ پسپا ہو کر تعمیل ارشاد کی گئی اور تھوڑے سے وقفۂ امتحان کے بعد حاضری کی اجازت مل گئی۔

اُس وقت نصیحت پر ہی اکتفا کر لیا جاتا تو یہ اثر کہاں ہوتا۔ اس معمولی سے سبق نے وہ کام کیا کہ شاید عرصۂ دراز کی محنت سے بھی وہ مطلب حاصل نہ ہوتا۔ فخر و غرور نفس و تکبر و ادعا کے امراض ایک مسیحا نفس کی ہلکی سی تنبیہ سے دفعتاً غائب ہوگئے۔

وہ دن اور آج کا دن نہ کبھی پھر اس پر غرور اور تکبر ہوا اور نہ ایسی بے احتیاطی اور اسی کا ثمرہ ہے کہ اب سنت نبوی کے مطابق اپنے گھر میں بھی آواز دیکر جانے کی توفیق ہوجاتی ہے۔

کہاں میں اور کہاں وہ نکہت گل ۔۔۔ نسیم صبح تیری مہربانی

شام کو بعد نماز عصر عام مجلس ہوا کرتی تھی جس میں ہر شخص کو حاضری کی اجازت تھی عموماً دارالعلوم دیوبند میں زیر تعلیم طلباء اور میاں صاحبؒ کے عقیدتمند اہل شہر اتنی کثیر تعداد میں جمع ہو جاتے کہ میاں صاحبؒ کے مکان کا خاصا بڑا صحن بھر جایا کرتا تھا۔

ایک روز میں بھی حاضر ہوا۔ مجمع زیادہ تھا میں بھی ایک گوشہ میں جا کر بیٹھ گیا، اور ملفوظات سنتا رہا مغرب کی اذان پر یہ علوم و معارف کی مجلس برخاست ہوئی میں بھی اٹھ کر چلا۔ قریب پہنچنے پر سلام عرض کیا۔ دیکھ کر پہچان لیا اور روک کر اشارہ فرمایا کہ جب کسی مجلس میں پہنچو تو صاحب خانہ کے علم میں تمہاری موجودگی ہونی چاہیے خاموشی سے بغیر اطلاع دیے بیٹھ جانا درست نہیں بعض اوقات اس سے بہت غلط نہیاں پیدا ہو سکتی ہیں ممکن ہے میں کوئی بات تم سے مخفی رکھنا چاہتا ہوں اور تمہاری موجودگی کا علم نہ ہونے کی بناء پر وہ بات کہدوں تو؟

یہ تو ارشاد فرمایا اور ایک سبب اس کا یہ بھی تھا کہ حضرت میاں صاحب کی عادت تھی کہ کتنا ہی بڑا مجمع ہو جائے ہر ایک سے کچھ خصوصی خطاب فرما کر اس کی دلجوئی کیا کرتے تھے۔ یہ پسند نہ تھا کہ کوئی شخص مجلس میں آئے اور چلا جائے نہ حضرت کو اس کا علم ہو اور نہ وہ حضرت کے خصوصی خطاب سے مستفید ہو سکے۔

تعلیم کے زمانے میں طلباء کا عملی سیاست میں الجھنا میاں صاحب کو ناپسند تھا اور اس سلسلہ میں ہمیشہ طلباء کو اپنے مخصوص مشفقانہ انداز میں نصیحت فرماتے تھے۔ - - - - - - - -

- -

. . . .

. . . .

ایک روز والد صاحب مدظلہم (حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب) اور یہ ناکارہ بعد مغرب در دولت پر حاضر ہوئے۔ فرمانے لگے آم چوسو گے؟ والد صاحب نے عرض کیا آم اور پھر حضرت کے عطا فرمودہ نورٌ علیٰ نور! ضرور عطا ہوں، میاں صاحب اٹھے ایک ٹوکری میں آم لا کر رکھے اور ایک خالی ٹوکری گٹھلی چھلکوں کے لیے سامنے لا کر رکھ دی ہم آم چوس کر فارغ ہوئے تو والد صاحب گٹھلی اور چھلکوں سے بھری ٹوکری اٹھا کر پھینکنے کے لیے چلے، پوچھا چھلکے کہاں لے کر چلے؟ عرض کیا چھلکے باہر پھینکنے کے لیے جا رہا ہوں، ارشاد ہوا کہ پھینکنے آتے ہیں یا نہیں؟ والد صاحب نے فرمایا کہ حضرت

یہ چھلکے پھینکنا کون سا خصوصی فن ہے جس کو سیکھنا ضروری ہے؟ فرمایا ہاں! تم اس فن سے واقف نہیں لاؤ مجھے دو، خود ٹوکری اٹھا کر پہلے چھلکے گٹھلیوں سے علیحدہ کیے اس کے بعد باہر تشریف لائے اور سڑک کے کنارے تھوڑے تھوڑے فاصلے سے متعین جگہوں پہ چھلکے رکھ دیے اور ایک خاص جگہ گٹھلیاں ڈال دیں، والد صاحب کے استفسار پر ارشاد ہوا کہ

ہمارے مکان کے قرب و جوار میں تمام غرباء و مساکین رہتے ہیں زیادہ تر وہی لوگ ہیں جن کو نان جویں بھی بمشکل ہی میسر آتی ہے اگر وہ پھلوں کے یکجائی چھلکے دیکھیں گے تو ان کو اپنی غریبی کا شدت سے احساس ہوگا اور بے مائیگی کی وجہ سے حسرت ہوگی۔ اور اس ایذا دہی کا باعث میں بنوں گا اس لیے متفرق کر کے ڈالتا ہوں اور وہ بھی ایسے مقامات پر جہاں جانوروں کے گلے گزرتے ہیں یہ چھلکے ان کے کام آجاتے ہیں اور گٹھلیاں ایسی جگہ رکھی ہیں جہاں بچے کھیلتے کودتے ہیں، بچے ان کو بھون کر کھا لیتے ہیں، یہ چھلکے اور گٹھلیاں بھی بہرحال ایک نعمت ہے ان کو بھی ضائع کرنا مناسب نہیں...

یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہنے کی ہے کہ میاں صاحب خود تو شاید ہی کبھی کوئی آم چکھ لیتے ہوں۔ عموماً مہمانوں ہی کے لیے ہوتے تھے اور محلے کے غریب بچوں کو بلا بلا کر کھلانے میں استعمال ہوتے تھے اس کے باوجود چھلکے گٹھلیوں کا یکجا ڈھیر کر دینے سے گریز فرماتے تھے کہ غریبوں کی حسرت کا سبب نہ بن جائیں بعض فقہاء نے بازار کے کھانے سے اسی لیے پرہیز فرمایا ہے کہ ان پر غریبوں کی نظریں پڑتی ہیں اور ناداری کے سبب وہ ان کی حسرت کا سبب بنتی ہے۔

دیکھئے ان اللہ والوں کی نظر دنیا کے کاموں میں کیسی دقیق ہوتی ہے اور ہر چیز کا حق کس کس طرح ادا کرتے ہیں۔

حضرت میاں صاحب کے لیے جو کھانا گھر سے آتا تھا خود تو بہت کم خوراک تھے باقی کھانا محلے کے بچوں کو بلا کر کھلاتے تھے جو روٹی بچ جائے اس کو بلی کے لیے دیوار پر رکھ دیتے تھے اور جو ٹکڑے بچ جاتے ان کو چھوٹا چھوٹا کر کے چڑیوں کے لیے اور دسترخوان کے ریزوں کو بھی ایسی جگہ جھاڑتے تھے جہاں چیونٹیوں کا بل ہے حق تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر پہچاننا ان کو ٹھکانے لگانا انھیں صاحب بصیرت بزرگوں کا حصہ تھا آج تو ہر گھر میں بچا ہوا کھانا سڑتا ہے اور نالیوں میں جاتا ہے جس کا اگر اہتمام کیا جاتا تو بہت سے غریبوں کا پیٹ بھرتا۔

اعزا و اقربا، احباب، اہل محلّہ کے حقوق و جذبات کی جس قدر رعایت کرتے ہوئے اس مرد باخدا کو دیکھا اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ میاں صاحبؒ کا اکثر مکان کچا تھا جس پر ہر سال کہگل ہونا ضروری تھی اگر نہ کی جاتی تو مکان منہدم ہونے کا خطرہ تھا، ہر سال برسات سے پہلے اس پر کہگل کرانے کا معمول تھا۔ اور اس وقت گھر کا سارا سامان باہر نکالنا پڑتا تھا۔ ایسے ہی ایک موقع پر والد صاحب نے عرض کیا کہ حضرت ہر سال آپ کو یہ تکلیف ہوتی ہے اور ہر سال کا خرچ بھی جو اس پر ہوتا ہے وہ جوڑا جائے تو پانچ سات سال میں اتنا ہو جائے گا کہ اس سے پختہ اینٹوں کا مکان بن جائے۔

اخلاق کریمانہ سے کسی کی بات کاٹنے کا وہاں دستور ہی نہ تھا بڑی دلداری اور حوصلہ افزائی کے ساتھ فرمایا "ماشاءاللہ آپ نے کیسی عقل کی بات کہی میرا بھی اندازہ یہی ہے کہ پانچ سات سال میں جتنا خرچ اس پر ہو جاتا ہے اتنے خرچ میں پختہ مکان بنا کر اس غم سے نجات ہو سکتی ہے ہم بڈھے ہو گئے اتنی عقل نہ آئی کہ ایک دفعہ ایسا کر لیتے۔ یہ کہہ کر خاموش ہو گئے اس کی جو اصل حقیقت تھی اس کا اظہار اس طرح فرمایا کہ میرے پڑوس میں جتنے مکان ہیں سب غریبوں کے ہیں اور کچے ہیں ایسی حالت میں میاں صاحب کو کیا اچھا لگتا کہ اپنا مکان پختہ بنا کر بیٹھ جاتا پڑوسیوں کو حسرت ہوتی۔

اس وقت یہ راز کھلا کہ یہ حضرات کس مقام بلند پر ہیں ان کے اعمال و افعال کا اندازہ لگانا دشوار ہے کہ ان میں کیسے کیسے اسرار پوشیدہ ہیں۔ پڑوسیوں اور غریبوں کی رعایت اور ان کی خدمت جو حضرت میاں صاحب کی فطرت بنی ہوئی تھی دوسروں کا اس کی طرف دھیان جانا بھی آسان نہ تھا ؎

در نیابد حالِ پختہ ہیچ خام　　پس سخن کوتاہ باید والسلام

میں نے دیکھا کہ اس کے بعد بھی ہمیشہ سالانہ یہ تکلیف برداشت کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ پڑوسیوں نے اپنے مکانات پختہ بنائے تب حضرت میاں صاحبؒ نے بھی اپنے مکان کو پختہ بنایا۔

یہ حضرات ہیں جن کو سلف کا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ حضرت فاروق اعظمؓ کے عہد خلافت میں ایک مرتبہ مدینہ طیبہ میں گھی گراں ہو گیا، تو امیر المؤمنین فاروق اعظمؓ نے گھی کھانا ترک کر دیا اور فرمایا میں اس وقت گھی کھاؤں گا جب مدینے کے عوام گھی کھانے لگیں۔

یہ واقعہ تاریخ میں پڑھا اور سنا تھا مگر ایثار، ہمدردی اور اخوت کے اس مقام بلند کی جیتی جاگتی تصویر حضرت میاں صاحبؒ ہی کی زندگی میں نظر آئی۔

ایک مشہور عالم دین بزرگ سے بعض سیاسی مسائل میں حضرت میاں صاحبؒ کو شدید اختلاف تھا جس کا اظہار ہمیشہ برملا فرماتے رہے لیکن اس کے باوجود ان کی شان میں اگر کسی سے کبھی کوئی نامناسب کلمہ نکل بھی جاتا تو بڑی سختی سے تنبیہ فرماتے۔ اختلاف بھی اختلاف اُمتی رحمۃ کی تشریح پر تھا اختلاف کی حدود سے سرمو تجاوز ان کی فطرت ہی نہیں تھی۔

انہی مختلف الخیال بزرگ نے ایک دفعہ امساک باراں کی شدت دیکھ کر نماز استسقا پڑھنے کا اعلان کیا۔ میاں صاحبؒ کو غالباً کشف کے ذریعہ معلوم ہو چکا تھا کہ ان ایام میں بارش نہیں ہوگی لیکن اس کے باوجود والد صاحب سے فرمایا کہ میاں بارش تو ہوتی نہیں البتہ نماز کا ثواب حاصل کرنے کے لیے چلنا ضرور ہے چنانچہ والد صاحب نے اُن کی معیت میں نماز استسقا ادا کی۔ بارش کو نہ ہونا تھا نہ ہوئی ان بزرگ نے دوسرے روز کے لیے بھی نماز کا اعلان فرمایا تو اس دن بھی وہی پہلے دن والی بات فرما کر نماز ادا کرنے پہنچ گئے اور بغیر بارش ہوئے واپس آگئے۔ تیسرے روز پھر نماز کا اعلان ہوا تو میاں صاحبؒ تیسرے دن بھی نماز کے لیے میدان میں پہنچ گئے اور خود اُن بزرگ سے کہا کہ اگر آپ اجازت دیں تو آج نماز میں پڑھا دوں۔ ہر شخص حیرت سے دیکھ رہا تھا کہ میاں صاحبؒ تو پنج وقتہ نماز لوگوں کے اصرار پر بھی نہیں پڑھاتے آج انھوں نے خود نماز پڑھانے کی پیش کش کیسے کی؟

بہرکیف نماز استسقا میاں صاحب کی امامت میں شروع ہوئی۔ میاں صاحبؒ کی عقیدتمند دل کے دل میں بار بار یہ خیال پیدا ہو رہا تھا کہ آج بارش ضرور ہو جائے گی شائد میاں صاحب نے کشف کے ذریعہ معلوم کر کے یہ تبدیلی کی ہوگی۔ لیکن آج بھی دھوپ اسی شدت کے ساتھ چمکتی رہی اور بادل کا دور دور بھی نام و نشان نہ تھا مجبوراً پورا مجمع شکستہ دل اور مغموم واپس ہوا۔

والد صاحب نے اس خلاف عادت عمل پر استفسار کیا کہ آپ تو کبھی نماز پنجگانہ میں بھی امامت نہیں فرماتے۔ آج یہ کیا ماجرا تھا؟ تو فرمایا میرا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ جو عالم دین دو روز سے نماز پڑھا رہے ہیں لوگوں کو ان پر بدگمانی نہ ہو میں بھی اس میں شریک ہو جاؤں کیونکہ مجھے اندازہ تھا کہ بارش اس وقت ہونا مقدر نہیں کسی عالم یا مقدس ہستی کا اس میں کیا قصور ہے اب اگر بدنامی ہوتی ہے تو تنہا ایک عالم کی نہ ہو۔

سوچیے! ان اہل اللہ اور ہم دنیاداروں میں کس قدر بعد المشرقین ہے؟ ہماری تمام کوشش اور سعی کا محور صرف یہ ہوتا ہے کہ اپنے مخالف کا کوئی کمزور پہلو تلاش کر کے اس کو مجروح کرنے کی کوشش کی جائے اور اس کے لیے ہر جائز و ناجائز حربہ آزمایا جائے اور اگر قابو چل جائے تو اس کو پوری طرح ذلیل و رسوا کیا جائے۔

لیکن یہی اختلاف جب اسلامی سانچہ میں ڈھلتا ہے تو کس درجہ حسین اور دلفریب ہو جاتا ہے کہ جس پر سیکڑوں اتحاد قربان کیے جا سکتے ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ان بزرگوں کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ دنیا میں رہنے اور دنیا کو برتنے کا لطف و سلیقہ بھی ان اہل اللہ ہی کو آتا ہے اور جو خود کو دنیا دار کہتے ہیں ان کو اس کے لطف کی ہوا بھی نہیں لگتی۔

حضرت میاں صاحبؒ کو روزمرہ کے واقعات سے عبرت آموزی کا خاص انداز تھا آنے والے ہر واقعہ سے کوئی عبرت و نصیحت حاصل کرتے تھے آپ کا مکان دارالعلوم سے کافی فاصلہ پر محلہ قلعہ میں ہے شہر سے باہر باہر آنے کا دستور تھا راستہ میں کچھ جنگل بھی پڑتا تھا۔

دارالعلوم میں تشریف لانے کے بعد معمول یہ تھا کہ ایک کمرہ جس میں حضرت مولانا کی تصانیف کی اشاعت کا سلسلہ بھی تھا "دارالتصنیف والاشاعت" کے نام سے موسوم تھا، میرے والد ماجد مولانا مفتی محمد شفیع صاحب بھی درس سے فارغ اوقات میں یہاں بیٹھتے تھے اور حضرت میاں صاحب بھی سبق پڑھانے سے پہلے اور بعد میں کچھ دیر یہاں تشریف رکھتے تھے۔

ایک روز مکان سے تشریف لائے تو والد صاحب کو مخاطب کر کے فرمایا کہ آج ہم ایک عجیب تماشا دیکھ کر آئے ہیں۔ والد صاحب اس تماشے کی حقیقت سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہو گئے۔

فرمایا کہ محلہ کوٹلہ سے باہر جنگل میں چند چھوٹی چھوٹی لڑکیاں بیٹھی ہوئی آپس میں لڑ رہی تھیں ایک دوسرے کو مار رہی تھیں۔ ہم قریب پہنچے تو معلوم ہوا کہ یہ سب مل کر جنگل سے گوبر چن کر لائی ہیں اور ایک جگہ ڈھیر کر دیا ہے اب اس کی تقسیم کا مسئلہ زیر نزاع ہے۔ حصوں میں کمی بیشی پر لڑنے مارنے پر تلی ہوئی تھیں۔ اول نظر میں مجھے ہنسی آئی کہ یہ کس گندی اور ناپاک چیز پر لڑ رہی ہیں۔ ہم ان کی کم عقلی اور بچکانہ ذہنیت پر ہنستے ہوئے ان کی لڑائی بند کرانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ قدرت نے دل میں ڈالا کہ ان کی بیوقوفی پر ہنسنے والے جو دنیا کے مال و دولت اور جاہ و منصب پر لڑتے ہیں اگر ان کو

چشم حقیقت بیں نصیب ہو جائے تو وہ یقین کریں گے کہ عقلائے زماں اور حکمائے وقت کی سب لڑائیاں بھی ان بچوں کی جنگ سے کچھ زیادہ ممتاز نہیں۔ فنا ہونے والی اور چند روز میں اپنے قبضہ سے نکل جانے والی یہ سب چیزیں بھی آخرت کی نعمتوں کے مقابلہ میں ایک گوبر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مضمون کے لیے ارشاد فرمایا الدنیا جیفۃ وطالبہا کلاب۔ دنیا ایک مردار جانور ہے اور اس پر جھپٹنے والے کتے ہیں۔

غور کیجیے اس طرح کے سیکڑوں واقعات سب کی نظروں سے گزرتے ہیں مگر کہاں ہے وہ نظر فکر جو اُن سے عبرت حاصل کرے۔

لمحاتِ زندگی کی قدر شناسی ایک روز والد صاحب حسب معمول مغرب کے بعد حاضر خدمت ہوئے۔ عموماً مغرب سے عشا تک مجلس رہا کرتی تھی۔ آج خلاف عادت فرمایا کہ آج ہماری گفتگو عربی میں ہوگی۔ سبب پوچھنے کی توجہ اُس نہ ہوئی خود ہی گفتگو کی ابتدا عربی میں فرمادی پھر والد صاحب نے بھی جو کچھ کہا عربی میں کہا لیکن طرفین کو عربی زبان میں مکالمہ کی عادت تو تھی نہیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سوچ سوچ کر صرف ضروری باتیں کہی اور سنی گئیں۔ اپنی زبان میں جس بسط و تفصیل سے کلام ہوا کرتا تھا اور ایک منٹ کی بات میں پانچ منٹ خرچ ہو جایا کرتے تھے اس کا ایسا انسداد ہوا کہ وقت سے پہلے ہی مجلس ختم ہو گئی۔

اس وقت فرمایا کہ زندگی کا ایک ایک منٹ بڑا قیمتی بلکہ بے بہا جواہرات ہیں جن کو فضول کام یا کلام میں صرف کرنا بڑی بے عقلی ہے۔ میں جانتا تھا کہ گفتگو عربی میں کریں گے تو صرف ضروری کلام ہی ہوگا اس لیے یہ کہا تھا اور فرمایا کہ ہماری مثال اس دولت مند انسان کی سی ہے جس کے خزانے میں بے شمار گنیاں بھری ہوئی ہیں اور وہ بے دریغ خرچ کر رہا ہے مگر اسی طرح ایک ایسا وقت آگیا جب خزانہ خالی ہونے کے قریب آیا اور چند گنی چنی گنیاں رہ گئیں تو وہ اب دیکھ بھال کر خرچ کرنے میں ہاتھ روکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں عمر کے بے شمار جواہرات عطا فرمائے تھے جن کو ہم بے دریغ کر چکے ہیں۔ اب عمر آخر ہے خزانہ خالی ہونے کو ہے اس لیے ایک ایک منٹ دیکھ کر خرچ کرنا چاہیے۔

میاں صاحب کی زندگی کا ہر گوشہ بلکہ ہر حرکت و سکون ہر بات ہر ادا صحیح اسلامی زندگی کا ایک عظیم درس تھا۔ کاش ہم اس سے سبق حاصل کرتے۔

اس وقت جو واقعات دیکھے ہوئے، یا سنے ہوئے حافظہ میں محفوظ تھے بغیر کسی ترتیب کے حوالہ قرطاس کر دیے ہیں اگر کچھ واقعات یاد آگئے تو کسی دوسری صحبت میں پیش کر دیے جائیں گے۔

موقوف ہو غم میر کہ شب ہو چکی ہمدم　　بس اور کسی روز یہ افسانہ کہیں گے

چند جملوں کا ایک خط

حضرت میاں صاحب پر یہ مضمون حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دامت برکاتہم نے ملاحظہ فرمایا تو مندرجہ ذیل چند سطریں بطور تتمہ تحریر فرمائیں۔ ادارہ

برخوردار عزیز مولوی محمد زکی سلمہٗ نے حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کچھ حالات و مقالات مجھ سے ہی سنے ہوئے لکھ لیے، اس سے تو خوشی ہوئی کہ انھوں نے ان کلمات کی قدر پہچانی اور یاد رکھا۔ لیکن اس یگانۂ روزگار ہستی کے علمی و عملی کمالات اور محض طرز زندگی کی کوئی جھلک بھی ان چند کلمات کے ذریعہ نہیں دیکھی جا سکتی برخوردار نے یہ چند سطور لکھ کر اپنی کی ایک ایک بھولی ہوئی مجلس کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کر کے تڑپا ہی دیا، حضرت میاں صاحبؒ کا نورانی چہرہ گویا سامنے آگیا۔ آپ کے کلمات دلنواز کانوں میں گونجنے لگے، کبھی کبھی کے واقعات یاد آنے لگے، مگر ان کو ضبط تحریر میں لانے کی طاقت، فرصت کہاں سے لاؤں۔ صرف ایک خط کے الفاظ اس وقت بے ساختہ قلب و زبان پر آگئے جو حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شگفتہ اور معنی خیز تحریر کا ایک نمونہ ہے۔ اس جگہ لکھنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا تجارتی کتب خانہ آخر میں تھوڑی سی قیمت لگا کر مجھے عطا فرما دیا تھا اور اس کی قیمت بھی بہت کم مقدار کی ماہوار قسطوں میں ادا کرنا طے ہوا تھا۔ آخر عمر میں ایک مرتبہ بطور علاج آپ کو کسولی پہاڑ گئے ہوئے تھے، یہ مہینہ کی قسط میں نے بذریعہ منی آرڈر بھیجی اس کے جواب میں والا نامہ صادر ہوا جس کے یہ کچھ الفاظ یاد ہیں۔

"آپ کا مرسلہ عطیہ احب الاشیاء والبغضہا وصول ہوا، روز روز کے احسانات کا شکریہ کہاں تک۔ بس دعا کرتا ہوں اور آپ سے بھی حیاً و میتاً دعا کا امیدوار ہوں۔"

دو سطر کا خط ہے مگر ذرا دیکھئے اس میں سموئے ہوئے مضامین ایک قرض کو قسطوں میں وصول کرنے کا جو احسان مجھ پر فرمایا تھا اس کو میرا احسان قرار دیتے ہیں اس کا نام تحفہ رکھتے ہیں اس کے ساتھ مال دنیا کی حقیقت اس عربی جملہ میں کیسی واضح فرمائی کہ شاید اس سے زیادہ متصور نہیں کی جا سکتی کہ مال ایسی چیز ہے کہ ایک طرف اس کی برابر کوئی چیز محبوب نہیں کیونکہ وہ ساری محبوب چیزوں کے حصول کا ذریعہ ہے دوسری طرف وہ ایک ایسی چیز ہے کہ اس کے برابر دنیا کی کوئی چیز مبغوض نہیں ہو سکتی کہ باپ کو بیٹے سے بیٹے کو باپ سے شوہر کو بیوی سے بیوی کو شوہر سے لڑا دیتی ہے انسان ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کو تیار ہے۔ آخری جملہ میں مروت و محبت کے استغنا کو واضح کرتے ہوئے دعا کی ترغیب فرمائی۔ فللہ درہٗ وعلیہ اجرہٗ　بندہ محمد شفیع

۱۰ ربیع الاول ۱۳۹۶ھ

نئی مطبوعات

اقبال اور قادیانی

از جناب نعیم آسی

سائز: $\frac{۲۲ \times ۱۸}{۸ \times ۱}$ صفحات ۱۸۸ - مجلد قیمت =/۱۲

ناشر:- مسلم اکاڈمی - وزیر پورہ - سیالکوٹ - پاکستان

کتابت، طباعت، کاغذ اور فنکارانہ سجاوٹ کے اعتبار سے یہ دیدہ زیب کتاب قادیانی تحریک سے متعلق علامہ اقبال کی مختلف تحریروں کا مجموعہ ہے، جسے مولف نے اپنی "اولین طالب علمانہ کاوش" کہتے ہوئے اتنے سلیقے اور حسن نفاست کے ساتھ پیش کیا ہے کہ اس کام سے ان کی فطری مناسبت ثابت ہونے کے لیے کسی اور تجربہ کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔

علامہ اقبالؒ ہندوستان (ماقبل تقسیم) کے جدید طبقے کے وہ فرد فرید تھے جنھیں قادیانی تحریک پر ٹھیک ٹھیک وہی مومنانہ بکلی لاحق ہوئی جو ہم مولانا سید محمد علی مونگیریؒ اور علامہ انور شاہ کاشمیریؒ جیسے اکابر علماءؒ کے حالات میں دیکھتے ہیں۔ مئی ۱۹۳۵ء کے اپنے ایک بیان میں وہ بڑے کرب کے ساتھ لکھتے ہیں کہ:-

> "نام نہاد تعلیم یافتہ مسلمانوں نے ختم نبوت کے تمدنی پہلو پر کبھی غور نہیں کیا اور مغربیت کی ہوا نے انھیں حفظ نفس کے جذبہ سے بھی عاری کر دیا ہے۔" (کتاب ہذا کا صـ۱۰۲)

اسی طرح تکفیر کے مسئلہ پر اس طبقے کے انداز فکر کی تردید میں ایک جگہ لکھتے ہیں:-

"لفظ کفر کے غیر محتاط استعمال کو آجکل کے تعلیم یافتہ مسلمان جو
مسلمانوں کے دینی مناقشات کی تاریخ سے بالکل ناواقف ہیں
ملت اسلامیہ کے اجتماعی و سیاسی انتشار کی علامت تصور کرتے ہیں
یہ ایک بالکل غلط تصور ہے۔" (ایضاً ص۱۱۶)

قادیانی تحریک کے ابتدائی دور میں سینکڑوں دوسرے مخلص مسلمانوں کی طرح علامہ اقبال کے والد ماجد شیخ نور محمد بھی اس کے دام میں پھنس گئے تھے اور اقبال جو اُس وقت اسکولی عمر میں تھے قدرتی طور پر وہ بھی اس تحریک سے اپنائیت محسوس کرنے لگے تھے۔ مگر تھوڑا ہی سا شعور بڑھنے پر اُن کی نظر میں اس کی حقیقت کھلنے لگی۔ اور پھر جلد ہی اپنائیت کے جذبے کی جگہ بغاوت اور جنگ کے جذبے نے لے لی خود تحریر فرماتے ہیں:

"ذاتی طور پر میں اس تحریک سے اُس وقت بیزار ہوا تھا جب ایک
نئی نبوت ـــــ بانی اسلام کی نبوت سے اعلیٰ تر نبوت ـــــ کا
دعویٰ کیا گیا اور تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیا گیا۔ بعد میں یہ بیزاری
بغاوت کی حد تک پہنچ گئی۔ جب میں نے تحریک کے ایک رکن کو
اپنے کانوں سے آں حضرتؐ کے متعلق نازیبا کلمات کہتے سنا۔ درخت
جڑ سے نہیں پھل سے پہچانا جاتا ہے۔" (ایضاً ص۵۶)۔

نعیم آسی صاحب نے کوشش کی ہے کہ قادیانیت کے متعلق علامہ کی تمام ہی چھوٹی بڑی تنقیدی تحریریں اس کتاب میں جمع کر دیں۔ ان میں سے بعض تحریروں میں قادیانیت پر اس قدر سیر حاصل بحث ہے کہ اس موقع پر جبکہ یہ مسئلہ ایک بار پھر چھڑ گیا ہے اور مسلمانوں کے جدید تعلیم یافتہ طبقے کی وہی ذہنی کیفیت (خاص طور پر ہندوستان میں) سامنے آ رہی ہے جس کے علامہ اقبالؒ تحریری خاکی تھے، ان تحریروں کی از سر نو اشاعت ان شاء اللہ نعیم صاحب کو بڑی گرانقدر اسلامی خدمت کے اجر کا مستحق بنائے گی۔ یہ تحریریں علاوہ جدید تعلیم یافتہ طبقے کے ہمارے قدیم تعلیم یافتہ طبقے کے اصحاب فکر و نظر کے مطالعہ میں بھی آنے کی ہیں۔ خاص طور پر بعض نکات تو انھیں کے سمجھنے اور غور کرنے کے ہیں۔

کتاب کے ابتدائی ۵۰ صفحات تو مرتب کے قلم کے ہیں جن میں قادیانیت کا "تاریخی و سیاسی پس منظر"

پیش کرکے "قادیانیت اور اقبال" کا ایک تمہیدی اور تعارفی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے بعد علامہ کی تحریریں چار ابواب میں تقسیم ہو کر آئی ہیں ۔ (۱) فلسفۂ ختم نبوت۔ (۲) فتنۂ قادیانیت اور مضامین اقبال۔ (۳) مکاتیب اقبال۔ (۴) چند توضیحات۔

کتاب میں سب کچھ اچھا لگتے ہوئے چند صفحات میں ایک چیز لطفِ مطالعہ کو کچھ کرکرا کرنے والی بھی ثابت ہوئی۔ یہ صفحات "فلسفۂ ختم نبوت" سے متعلق پہلی اور دوسری تحریر کے ہیں۔ جن میں (انگریزی سے اردو کرنے والے) مترجم کے قلم کی عموماً غیر ضروری بین القوسین توضیحات، دخل در معقولات کا مضمون محسوس ہوئیں، مرتب اگر ان کو حذف کر دیا ہوتا تو اچھا ہوتا، کہیں کہیں تو یہ توضیحات نادرست بھی ہو گئی ہیں۔

اسی طرح شاید آئندہ اڈیشن میں یہ بات کام آنے کی ہو کہ مولانا حسین احمد مدنیؒ کے نام والے اقتباس پر فٹ نوٹ کئی سطروں کا ہوتے ہوئے بھی اصل مقصد کے اعتبار سے ناکافی رہا اس کشمکش کے اختتام والی تحریر کی نوعیت پر بھی ایک آدھ لفظ اس میں ہونا چاہیے تھا۔

کتاب کے "انتساب" کو مصنف و مولف کا بالکل ذاتی معاملہ سمجھا جانا چاہیے۔ پھر بھی اتنی بات کہہ دینے کی ہے کہ شہدائے یمامہ کی عظمت کو اس سے بہت رفیع سمجھا جانا چاہیے۔ پنجاب کے جاں نثاران ناموس ختم نبوت اس انتساب کے لیے زیادہ موزوں اور مؤلف کے جذبہ کی تسکین کے لیے بھی کافی تھے۔

قیمت، کتاب کی نفاست، سجاوٹ اور اقبال کے افکار عالیہ کی قدر و قیمت پر نظر کرتے ہوئے کچھ بھی زیادہ نہیں۔ مگر کیا کیا جائے کہ ہندوستان کے معیار قیمت سے تو ابھی خاصی زیادہ ہی محسوس کی جائے گی۔

انجیل برناباس کا مطالعہ

از بشیر محمود صاحب ایم-اے

سائز $\frac{30 \times 20}{16 \times 1}$ ۱۸۰ کتابت، طباعت اور کاغذ معمولی، قیمت درج نہیں۔

ناشر۔ شعبۂ تصنیف و تالیف دارالعلوم اسلامیہ بفہ، ضلع ہزارہ (پاکستان)

انجیل برناباس کا ذکر اب اسلامی لٹریچر میں کافی آ چکا ہے اس کے مضامین عیسائی دنیا کی مسلمہ

چار انجیلوں سے مختلف اور عموماً اُن تعلیمات اور بیانات کے حامل ہیں جن کا ذکر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت قرآن مجید میں ملتا ہے۔ اس ضمن میں یہ بات خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ اس انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صلیب کا قصہ بہت تفصیل کے ساتھ اس طرح بیان کیا گیا ہے جس سے اس بارہ میں قرآن مجید کے بیان کی پوری تصدیق ہوتی ہے اور حواری برنا باس نے اس کو روایت کی بنیاد پر نہیں بلکہ ذاتی مشاہدہ کی بنیاد پر بیان کیا ہے۔ عیسائی دنیا کو اس سے انکار ہے کہ یہ واقعی حضرت مسیحؑ کے حواری برنا باس کی مرتبہ ہے، وہ اسے کسی مسلمان کی جعلسازی بتاتے ہیں، لیکن اس نام کی انجیل کا ذکران کی تاریخ میں بہرحال ملتا ہے اس لیے جب تک اس بسینہ نسخے سے مختلف کوئی نسخہ نہ پیش کردیا جائے پوری گنجائش اسی نسخہ کو اصل نسخہ ماننے کی ہے۔ مگر دوسری طرف جیسا کہ زیر تبصرہ کتاب کے مقدمہ نگار ڈاکٹر غلام جیلانی برقؔ صاحب نے لکھا ہے اِس نسخہ کی اصلیت کا دعویٰ عیسائی انکار کے پیش نظر اسی وقت مضبوط ہو سکتا ہے جبکہ اس کا کوئی مخطوطہ آنحضرتؐ کی بعثت سے پہلے کا دریافت شدہ سامنے لے آیا جائے جو کہ ابھی تک نہیں ہو سکا ہے۔

بہرحال یہ انجیل ہے جس کا ایک نیا اردو ترجمہ (۱۹۱۶ء کے پہلے ترجمہ کے بعد) انگریزی (ترجمہ) سے بشیر محمود صاحب نے کیا ہے۔ یہ مکمل نہیں ہے بلکہ منتخب اٹھائیس بابوں کا ترجمہ ہے۔ اس کے ساتھ اس انجیل کے مرتب اور مولف کے حالات اور اُن کی طرف اُس کے انتساب کی صحت کے سوال پر بھی کافی شرح وبسط سے روشنی ڈالی گئی ہے اور اسی بنا پر اس ترجمہ کا نام "انجیل برنا باس اور اُس کا مطالعہ" ہوا۔

مولف نے یہ بہت اچھا کیا ہے کہ اس انجیل کے عربی ترجمہ پر مرحوم سید رشید رضا (مصری) کے تحقیقی نوٹ کا ترجمہ بھی اس مطالعہ میں شامل کر دیا۔ اسی طرح اپنی تحقیقی بحث میں مولانا مودودی کی تفہیم القرآن سے بھی ایک نوٹ اس انجیل کے استناد کے موضوع پر مولف نے نقل کر دیا ہے۔ اس انجیل کے استناد کے سوال پر یہ دونوں قابل لحاظ تحریریں ہیں۔

پیٹ میں بھاری پن اور سینے میں جلن سے
جلد آرام کے لیے
پچنول
لیجیے
نہایت مفید ہے۔
ہمدرد

Regd. No. LW/NP-62

Monthly 'ALFURQAN' 31, Naya Gaon West Lucknow (U.P.)

VOL. 43 NO. 8 AUGUST, 1975 Phone : 25547

Cover Printed at—Shining Press, Naya Gaon, Lucknow-1

مدیر

محمد منظور نعمانی

پکوان کے
عمدہ تیلوں میں
آپ کی خاص پسند۔

پوسٹ مین برانڈ
صاف کیا ہوا مونگ پھلی کا تیل
۱، ۲، ۴، ۱۰، ۵ اور ۱۵ کیلو

عمدہ وناسپتی
۱، ۲، ۴، ۱۰، ۵ اور ۱۲ کیلو

خالص تل کا تیل
۲، ۴، ۱۰، ۵ اور ۱۵ کیلو

۱۰۰ برانڈ خالص ناریل کا تیل
۲، ۴، ۱۰ اور ۱۶ کیلو

کوکو جار
صاف کیا ہوا ناریل کا تیل
۲، ۴، ۱۰، ۵ اور ۱۵ کیلو

ای سلاد تیل
۲، ۴، ۱۰، ۵ اور ۱۵ کیلو

احمد ملز، بمبئی ۹

سالانہ چندہ
ہندوستان سے: -/۱۲
پاکستان سے: -/۲۰
بنگلا دیش سے: -/۱۳
قیمت
فی کاپی ۱/۲۰

جلد ۴۳ | بابت ستمبر ۱۹۷۵ء مطابق شعبان المعظم ۱۳۹۵ھ | شمارہ ۹

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہو، تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدتِ خریداری ختم ہو گئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۰؍ ستمبر تک آجائے ورنہ اگلا پرچہ بصیغۂ وی۔ پی ارسال ہوگا۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے جو پتہ کی چٹ پر لکھا رہتا ہے۔

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے اگر ۲۰ تاریخ تک کسی صاحب کو پرچہ نہ ملے تو فوراً مطلع کریں۔ اس کی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانی چاہیے۔ اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان اور کتب خانہ الفرقان کے پتہ میں تبدیلی: الفرقان کا دفتر اور کتب خانہ لکھنؤ ہی میں کچہری روڈ سے دوسری جگہ منتقل ہو گئے ہیں ـــــــ اب پتہ یہ ہے:

۳۱ ـ نیا گاؤں مغربی (تنظیم آباد) لکھنؤ (یو۔پی)

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، اڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان ۳۱۔ نیا گاؤں مغربی لکھنؤ سے شائع کیا۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

سخنہائے گفتنی!

ہم نے چاہا تھا کہ ستمبر کا یہ شمارہ رمضان مبارک سے پہلے ستمبر کے پہلے ہفتہ میں شائع ہو جائے اور ماہ مبارک میں "الفرقان" کے سلسلہ کی کوئی فکر اور مشغولیت نہ رہے —— اس پروگرام کے مطابق اس شمارہ کی ترتیب وغیرہ کا کام حضرت مولانا نعمانی مدظلہ نے ۲۰ شعبان سے پہلے پورا کر دیا تھا اور مضامین کتابت کے لیے دیدیئے گئے تھے لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیت ہمارے نئے کاتب صاحب (جنھوں نے اسی مہینے سے الفرقان کی کتابت کی ذمہ داری قبول کی ہے) اپنی ایک واقعی مجبوری کی وجہ سے کتابت کا کام وقت پر پورا نہیں کر سکے، اسی وجہ سے کچھ صفحات دو اور کاتبوں سے لکھانا پڑے، تاہم کوشش ہے کہ یہ رسالہ رمضان مبارک کے پہلے عشرہ ہی میں شائع ہو جائے —— اس کے بعد اکتوبر اور نومبر کا مشترک شمارہ انشاء اللہ شروع نومبر میں شائع ہو گا۔ ناظرین کرام اس کو نوٹ فرمالیں۔

بیرونی ممالک کے لیے "الفرقان" کا زرِ تعاون (سالانہ چندہ)

غیر ممالک کے لیے ڈاک کی شرح میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب امریکہ اور انگلستان، فرانس وغیرہ یورپین ممالک کو ہوائی ڈاک سے بھیجے جانے والے الفرقان کے ایک شمارہ پر تقریباً ڈھائی تین روپے کے ٹکٹ لگتے ہیں اور بحری ڈاک سے بھیجے جانے والے شماروں پر ۴۰ پیسے کے ٹکٹ لگائے جاتے ہیں —— محصول ڈاک میں اس اضافہ کی وجہ سے اب بیرونی ممالک کے لیے الفرقان کے زرِ تعاون (سالانہ چندہ) کی تفصیل یہ ہے:- امریکہ اور کناڈا کے لیے ہوائی ڈاک سے تین پونڈ

افریقہ اور یورپین ممالک کے لیے ہوائی ڈاک سے ڈھائی پونڈ　　بحری ڈاک سے ایک پونڈ پانچ شلنگ

ممالک عربیہ کے لیے　　ہوائی ڈاک سے　　دو پونڈ　　بحری ڈاک سے ایک پونڈ پانچ شلنگ

معاونین خصوصی: جو حضرات الفرقان کے اس کام اور اس کے معیار کو بہتر بنانے کے لیے خصوصی اعانت فرمانا چاہیں وہ سو روپیہ سالانہ یا اس کے مساوی رقم مرحمت فرمائیں، ان کو رسالہ ہوائی ڈاک سے جائے گا اور وہ "الفرقان" اور ادارہ الفرقان کے خصوصی معاون ہوں گے۔　　ناچیز ناظم الفرقان ۲، ستمبر ۱۹۷۵ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

عتیق الرحمٰن سنبھلی

[گزشتہ شمارہ میں بہت مختصر لفظوں میں مولوی عتیق الرحمٰن سلمہ اللہ تعالیٰ کے سفر انگلستان کا ذکر کیا گیا تھا۔ آج نگاہ اولیں کے ان صفحات میں اُن کی ایک تازہ مکتوب شائع کیا جارہا ہے جو انھوں نے ۲۹ اگست کو اپنے چھوٹے بھائی حسان میاں کے نام لکھا ہے جس میں اپنے حالات اور سفر کی کیفیات بھی لکھے ہیں، اس سے ناظرین کرام کو موجودہ انگلستان کے بارہ میں ایسے معلومات بھی حاصل ہوں گے جو ان کی ایمانی روح کے لیے انشاء اللہ خوش کن ہوں گے — نعمانی]

باسمہٖ سبحانہ وتعالیٰ

حسان میاں! سلام ورحمت

یہاں آئے ہوئے اب ڈیڑھ مہینہ ہوا جارہا ہے۔ خط پر خط لکھتا رہا ہوں تمھارے ہی ہاتھ سے والد ماجد وغیرہ کو پہنچتے رہے ہوں گے۔ مگر خود تمھیں کوئی خط اب تک نہیں لکھا۔ کل تھوڑی دیر کے لیے برمنگھم جانا ہوا — جو اس وقت لندن کے بعد انگلینڈ کا سب سے بڑا شہر ہے۔ یہاں ایک صاحب کے پاس تازہ الفرقان پہنچ گیا تھا۔ میرا ڈیوزبری کے پتہ پر آیا ہوگا۔ مگر میں دو ہفتے سے وہاں نہ ہونے کی وجہ سے اس سے بےخبر تھا۔ اس میں میرے سفر کا ذکر آگیا ہے۔ اس سے تحریک ہوئی کہ تمھیں خط لکھوں اور سفر کی اس وقت تک کی کچھ سرگزشت بھی لکھ دوں۔

باہر سفر کرنا ہی نہ تھا، یا اتنا بڑا سفر ایک دم سے حصے میں آگیا۔ اس سلسلے کا یہ لطیفہ شاید میں نے گھر کے کسی خط میں اب تک نہیں لکھا ہے کہ لندن کے ہوائی اڈے پر اُتر کر جب اہلکاران کسٹم کا سامنا ہوا تو اس کا کافی امکان نظر آیا کہ اُلٹے پاؤں واپس جانا پڑے۔ ویزا لیکر تو چلا نہیں تھا کیونکہ مولانا

یعقوب صاحب نے لکھا تھا کہ اس کی بالکل ضرورت نہیں ہے لندن کے ہوائی اڈے پر ہی مل جائے گا۔
اس ویزا کے سلسلے میں ان کا سوال ہوتا ہے کہ کیوں آئے ہیں؟ محسوس ہوا کہ میرے جواب سے اُن کو تشفی نہیں
ہوئی۔ یہ بات سفر کے بعض ساتھیوں سے معلوم ہوگئی تھی کہ وہاں چونکہ لوگ روزگار کی تلاش میں کافی جاتے
ہیں اور اس کی اب پہلے کے برخلاف سختی سے روک تھام ہے اس لیے یہ لوگ ہر آنے والے کے متعلق اس
بات کا اچھی طرح اطمینان کرنا چاہتے ہیں کہ وہ پڑنے کے لیے تو نہیں آیا ہے۔ اپنے متعلق ان کا عدم اطمینان
اس سے محسوس ہوا کہ چند منٹ کھڑے کھڑے سوال وجواب کے بعد مجھ سے کہا گیا کہ ذرا تشریف رکھیے تھوڑی
دیر میں آپ کے بارے میں فیصلہ کریں گے۔ میرا خیال ہے کہ جواب میں عدم تشفی کی کوئی بات نہ تھی مگر میری
صورت انھیں شک پر مجبور کر رہی تھی کہ ہو نہ ہو یہ کوئی پریشان حال آدمی ہے جو تلاش معاش ہی میں آیا
ہے انھیں کیا پتہ تھا کہ یہ "صورت" پریشان حالی کا نتیجہ نہیں، صحت کی خرابی کا نتیجہ ہے۔ خیر اس تھوڑی
دیر کے بعد ایک صاحب تشریف لائے اور مجھ سے اپنے ساتھ آنے کو کہا۔ چند ہی قدم چل کر ہم ایک ہال میں
پہنچ گئے جو مجھ جیسے لوگوں کے لیے گویا فیصلے کا ویٹنگ روم تھا۔ اس میں داخل ہونے کے ساتھ ہی مجھے
ایک کاغذ تھمایا گیا کہ آپ امیگریشن ایکٹ (EMIGRATION ACT) کی دفعہ فلاں کے تحت اس
وقت تک یہیں رہیں گے جب تک کہ امیگریشن افسران آپ سے مزید انکوائری کر کے کوئی فیصلہ نہ کرلیں
یہاں ایسوں کا ایک جم غفیر تھا۔ اور سب کے سب پریشانی کی تصویر بنے ہوئے۔ کئی ایک ایسے تھے جو
کئی کئی دن سے یہاں پڑے ہوئے تھے۔ یوں سمجھو کہ ایک شکنجہ میں آنا ہو گیا۔ کہاں تو جہاز سے اتر کر یہ تصور تھا
کہ اب منزل آ گئی۔ باہر ان شاء اللہ مولانا یعقوب صاحب وغیرہ ہوں گے۔ چند منٹ بعد اُن سے ملاقات و
معانقہ اور پھر ان شاء اللہ دیوزبری کو روانگی ہو جائے گی۔ قاہرہ میں چوبیس گھنٹے کا اسٹاپ ہونے کی وجہ سے
دو دن سفر میں ہو گئے تھے، قدرتی طور سے یہ حالتِ سفر ختم ہونے کی خواہش بھی تھی۔ مگر یہاں ایک برزخ
درپیش ہو گئی۔ مگر اللہ کا کیسے شکر ادا کروں کہ بالکل خلافِ طبع اور خلافِ توقع بھی اس صورت حال سے
لطف لینے کا موڈ بن گیا۔ ہنسنا ہنسانا ویسے بھی زیادہ نہ آتا تھا اور صحت کی مستقل پریشان کن خرابی نے تو
جو تھوڑا بہت آتا تھا وہ بھی گویا ختم کر دیا تھا۔ اس ویٹنگ ہال میں بیٹھنے کا انتظام معقول تھا۔ صوفے پڑے
ہوئے تھے، جو تقریباً سب بھرے ہوئے۔ جن صاحب کے پاس بیٹھنے کی جگہ ملی وہ ایک پاکستانی (مہاجر) تھے،
پہلے انھی سے بات ہوئی، بڑے گرم تھے۔ کئی دن کے بعد اسی وقت انھیں واپس جانے کا فیصلہ دیا گیا تھا۔

مگر ان کا کچھ سامان غائب تھا اس لیے رُکے ہوئے تھے۔ میں نے کہا یہ بتائیے کھانے پینے اور لیٹنے سونے کا انتظام کیسا ہے معلوم ہوا غنیمت ہے۔ میں نے کہا بس پھر کوئی فکر نہیں۔ اور یہ کہہ کر اپنے بیگ میں سے کچھ بسکٹ نکالے کہ بھائی مجھے تو بھوک لگی ہے، آپ بھی لیجیے۔ ان کے ساتھ اوروں کو بھی اس دعوت شیرازہ میں شرکت کی دعوت ان کا غم غلط کرنے کے انداز میں دی۔ مگر صرف وہی ایک آدھ بسکٹ کی حد تک شریک ہوئے۔ اس کے بعد نماز کی فکر کی کہ ظہر ابھی تک پڑھی نہ تھی اور وہاں لگ ایسا رہا تھا جیسے عصر کا وقت آگیا ہو۔ (حالانکہ واقعہ ایسا نہ تھا) پانی کی جستجو کی تو دستیابی مشکل نظر آئی۔ تیمم سے نماز ادا کی، مجھ سے پہلے کے وہاں پچیس تیس مسافر بیٹھے ہوئے تھے اندازہ ہوا کہ دیر لگے گی۔ میں گرم کپڑے پہنے ہوئے نہیں تھا۔ وہ لگیج میں تھے جو کسٹم سے باہر ہو کر ہی دستیاب ہو سکتے تھے اور ضرورت تھی کہ ابھی دستیاب ہوں کیونکہ سردی لگنے لگی تھی۔ اس لیے امیگریشن والوں میں سے ایک صاحب جو ہال میں آئے تو میں نے اُن سے کہا کہ یہ صورت ہے اس لیے اگر میرے معاملے میں دیر ہو تو براہ مہربانی میرا سوٹ کیس لگیج سے منگوا دیجیے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام آسانی سے ہونے والا نہیں تھا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ دو ایک دفعہ کہنے سننے پر میری باری ایک دو گھنٹے کے اندر آگئی۔ اس دوران میں یہ لوگ باہر مولانا یعقوب صاحب سے بھی مل کر سوال و جواب کر آئے تھے اور مجھے بھی بتا دیا تھا کہ وہ باہر موجود ہیں کچھ تشفی تو شاید اُن کی بات سے ہو گئی تھی۔ مگر پھر بھی انداز ایسا تھا کہ جیسے مطمئن نہ ہوں۔ بہت سے سوالات کیے جن کے ذریعہ خصوصیت سے وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ ہندوستان میں میرا کوئی معقول ذریعہ معاش ہے یا نہیں؟ خیر وہ کچھ مطمئن سے ہوئے اور جو کسر باقی تھی وہ اس سے پوری ہوئی کہ میں نے کہا میرا ٹکٹ دیکھیے یہ نہ صرف واپسی کا ہے بلکہ جدہ ہو کر واپسی کا ہے یعنی مجھے یہاں سے حج کو جانا ہے۔ اس کے بعد آپ کو کسی قسم کا اندیشہ نہ ہونا چاہیے کہ میں یہاں رہ پڑوں گا، لیکن اگر اس کے بعد بھی کوئی اندیشہ باقی رہتا ہے تو مجھے بالکل اصرار نہیں ہے۔ یہیں سے واپسی کا انتظام کریں۔ لیکن اس میں [illegible] دیر بالکل نہ کریں۔ آپ جیسا کہ دیکھتے ہیں میں کمزور صحت آدمی ہوں۔ ادھر یا اُدھر جو بھی فیصلہ ہو جلد ہی ہونا چاہیے اور خدا کا شکر ہے کہ اس کے بعد دیر بالکل نہ ہوئی۔ میں نے دو ماہ ٹھہرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا، اتنی مدت کا ویزا فوراً دے کر مجھے باہر مولانا یعقوب صاحب کے پاس پہنچا دیا گیا۔ رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

اس علاقے کا پانی مجھے بہت موافق آیا۔ لوگوں نے بھی اتنی محبت کی کہ یاد رہے گی۔ کہنے کو تو جون سے گرمی کا موسم چل رہا تھا۔ مگر میں ۲۶ جولائی تک کافی سردی محسوس کرتا رہا۔ بارش بھی ہوتی رہتی تھی۔ سب سے زیادہ پریشان کن چیز یہاں کی ہوا تھی جس میں اندر اتر جانے والی ٹھنڈک ہوتی تھی۔ ۲۶ سے واقعی معنی میں گرمی شروع ہوئی۔ بارش بند اور کھلی صاف دھوپ۔ اتفاق سے اسی تاریخ سے میں نے یہاں کے ڈاکٹر کی دوا بھی شروع کر دی۔ کیونکہ طبیعت اچھی نہیں چل رہی تھی۔ اسے دوا کا اثر کہو یا ڈاکٹر کی نیکی اور خلوص کی برکت کہوں (ڈاکٹر رحمت علی چودھری ایک مہاجر پاکستانی جو ڈیوزبری سے دس بارہ میل دور ہیلی فیکس کے جنرل ہاسپٹل میں ہیں اور تبلیغی کام کی تاثیر کا ایک نمونہ۔ جو ڈیوزبری میں مولانا یعقوب صاحب سے میرا ذکر سن کر اپنے ہاسپٹل میں آنے کی دعوت دے گئے۔ بہرحال ان کی نیکی اور خلوص کی برکت کہوں) یا موسم کی تبدیلی کا اثر کہ اسی دن سے طبیعت اچھی ہونے لگی۔ اور پھر الحمدللہ چار پانچ دن کے قیام میں ہفتے کی منزلیں اس نے طے کر لیں۔

بلیک برن (لنکاشائر) سے ۱۳ اگست کو واپسی ہوئی۔ ایک ہفتہ بعد کے لیے وسطی انگلینڈ کے ایک ٹاؤن ننی ٹن (NUNEATON) کا پروگرام بنا ہوا تھا اس کا ضلع وارک شائر (WARWICK SHIRE) ہے۔ ۲۰ کو یہاں آنا ہو گیا۔ اور آج ۲۹ تک یہیں قیام ہے۔ یہ یہاں کے قیام کا ان شاء اللہ آخری دن ہے۔ شام کو ڈیوزبری واپس چلا جانا ہے۔ ۳۰، ۳۱ کو یعنی کل سے وہاں آل انگلستان تبلیغی اجتماع بالکل ملے ہوئے دوسرے ٹاؤن باٹلی (BATLEY) میں ہو رہا ہے۔ یہاں بھی گجراتی حضرات ہی میں قیام ہے۔ بڑے ہی محبت کے لوگ ہیں۔ ایک ہفتہ سے دو ہفتے ہو گئے۔ ان کا جی اب بھی نہیں چاہتا کہ جاؤں۔ جگہ جگہ لیے پھرتے ہیں۔ سیر کرانے کو بھی اور تقریریں کرنے کو بھی۔ میں نہ بیان و تقریر کا کبھی عادی رہا تھا اور نہ اس کے لائق کبھی اپنے آپ کو سمجھا۔ مگر یہاں کے لوگوں کی محبت اور خلوص کی برکت نے اس میدان میں بھی اتار دیا۔ اپنے حال سے شرم آتی ہے۔ مگر کرنا پڑتا ہے۔ اور اللہ کا احسان ہے کہ اس نے مدد بھی فرمائی۔ مجھے یہاں آکر صحت کے لحاظ سے تو فائدہ ہوا ہی دینی لحاظ سے بھی بڑا فائدہ ہوا۔ کیسا کرم اللہ کا ان لوگوں کے حال پر ہے کہ رہ رہے ہیں انگلستان میں اور رنگے ہوئے ہیں اسلام میں۔ میں جن صاحب کے یہاں مقیم ہوں (جناب نصر اللہ خان صاحب) وہ یہاں ریلوے میں گارڈ ہیں۔ مگر ماشاء اللہ پوری داڑھی اور کرتے کے ساتھ۔

ایک خاص بات ان مقامات کی جو اب تک دیکھی یہ بھی قابل ذکر ہے کہ ہر شہر کے ساتھ مکتب بھی ہے۔ سیکڑوں بچے ابتدائی دینی تعلیم (مع قرآن مجید) پاتے ہیں۔ نیوٹن خصوصیت سے حفظ قرآن کا بھی مرکز ہے۔ مسجد یہاں ایک ہی ہے۔ آبادی بھی تھوڑی ہے۔ مگر امام صاحب ایسے ملے ہیں کہ ماشاءاللہ اُن کی زندگی میں برکت دے۔ واقعی اس منصب کے لائق۔ اپنے کام سے خصوصی شغف۔ حفاظ پر حفاظ تیار کر رہے ہیں۔ نیوٹن کے قیام میں نصر اللہ خاں صاحب کے علاوہ جن دو دوستوں کی خصوصی مہربانیاں شامل حال رہیں ان کا تذکرہ نہ کرنا بڑی ناسپاسی ہوگی۔ یہ ہیں بھائی یعقوب صاحب احمد آبادی اور جناب حافظ محمد شفیع صاحب۔

بہت سی باتیں اور بھی ذکر کرنے کی ہیں۔ خصوصاً یہاں کی عام زندگی سے متعلق۔ مگر وہ ان شاء اللہ آئندہ۔ ابھی دیکھنے کو بھی بہت کچھ باقی ہے، خاص کر لندن دیکھنے کی نوبت ابھی تک نہیں آئی ہے۔ اس کے بغیر یہاں کی عام زندگی سے متعلق کچھ کہنا بھی نہیں چاہیئے۔ علاوہ ازیں آج جمعہ بھی ہے اور پھر سفر کرنا ہے۔ زیادہ تفصیل میں جاؤں گا تو یہ خط آج پوسٹ نہ ہو سکے گا۔ بلکہ کئی دن مؤخر ہو جائے گا۔ اس لیے باقی ان شاء اللہ آئندہ۔

والسلام
عتیق الرحمٰن

درسِ قرآن　　محمد منظور نعمانی

مرکز والی مسجد ــــــ ۵ر جون ۱۹۷۵ء

ــ کامل فلاحیابی کے لیے خداوندی منشور
ــ جنت الفردوس کے وارثوں کی لازمی صفات
ــ ایمانی صفات و اعمال میں نماز کا خاص مقام

(گزشتہ سے پیوستہ)

[اس درس میں سورۂ "المومنون" (اٹھارویں پارہ) کی ابتدائی گیارہ آیتیں تلاوت کی گئی تھیں، جو قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ سے شروع ہو کر هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ پر ختم ہوئی ہیں، یہ آیتیں اور ان کا ترجمہ اور آٹھ آیتوں کی تشریح و تفسیر بھی الفرقان کے پچھلے شمارہ میں ناظرین کرام ملاحظہ فرما چکے ہیں (ان آیتوں کا حاصل یہ تھا کہ کامل فلاحیابی اُن اہل ایمان کو حاصل ہوگی جو اپنے اندر یہ چند ایمانی صفات پیدا کر لیں، نماز خشوع کی کیفیت کے ساتھ ادا کرنا۔ معصیات درکنار فضولیات و لغویات سے بھی بچنا۔ نفس و اخلاق کا تزکیہ یا زکوٰۃ ادا کرنا ـــ شہوتِ نفس کے تقاضے کو اللہ کی مقرر کی ہوئی حدود کے اندر پورا کرنا اُس سے تجاوز بالکل نہ کرنا ـــ امانتوں اور عہد معاہدوں کو صحیح طرح پر ادا کرنا ـــ تشریح و تفسیر کے ذیل میں ان سب کی بقدر ضرورت وضاحت بھی کی جا چکی ہے) آخری تین آیتوں کی تفسیر و تشریح جو گزشتہ شمارہ میں درج نہیں ہو سکی تھی ذیل میں ملاحظہ فرمائی جائے۔]

اس کے بعد چھٹی اور آخری صفت فلاح پانے والے اہل ایمان کی یہ بیان فرمائی گئی ہے،

"والذین ھم علیٰ صلوٰتھم یحافظون o (کہ وہ اپنی نمازوں کی محافظت کرتے ہیں)۔— اس محافظت علی الصلوٰۃ سے مراد بظاہر نماز کی پابندی اور احکام و شرائط کے مطابق اس کے ادا کرنے کا اہتمام ہے۔ جس میں جماعت کی پابندی اور مسجد میں ادا کرنے کا اہتمام بھی شامل ہے۔

ایمانی صفات و اعمال میں نماز کا امتیاز اور اُس کی تاثیر

کامل فلاحیابی کی پہلی شرط اور فلاح پانے والے اہل ایمان کی پہلی لازمی صفت شروع کی آیت میں خشوع کی کیفیت کے ساتھ نماز ادا کرنے کو بتلایا گیا تھا، اور آخری شرط اور آخری صفت اس آیت میں محافظۃ علی الصلوٰۃ یعنی نمازوں کو سنن و آداب وغیرہ کی رعایت کے ساتھ اہتمام اور پابندی سے ادا کرنے کو بتلایا گیا۔— گویا ایمان کے بعد نماز کو ظاہر و باطن کے لحاظ سے بہتر طریقہ سے ادا کرنا اور اس کا خاص اہتمام کرنا فلاح یابی کی اول و آخر شرط ہے— اور واقعہ یہ ہے کہ اگر ہم نماز، خشوع کی کیفیت کے ساتھ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق پابندی اور اہتمام سے ادا کریں تو اللہ کی توفیق سے ہمارا ظاہر و باطن سب درست ہو جائے اور فلاحیابی کے لیے جو دوسری صفات شرط اور مطلوب ہیں ہمارے اندر وہ بھی پیدا ہو جائیں۔

امام مالکؒ نے اپنی مؤطا میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک مراسلہ اور گشتی فرمان نقل کیا ہے جو انھوں نے اپنے دورِ خلافت میں اسلامی قلمرو کے تمام والیوں اور ذمہ دار حاکموں کو بھیجا تھا، اس کے الفاظ مجھے یہ یاد رہ گئے ہیں

ان اھم امورکم عندی الصلوٰۃ من حفظھا وحافظ علیھا حفظ دینہ ومن ضیعھا فھو لما سواھا اضیع۔

میرے نزدیک تمھارے کاموں میں سب سے زیادہ اہم نماز ہے جس نے اس کی نگہداشت اور پابندی کی اُس نے اپنے دین کو محفوظ کر لیا اور جس نے نماز کو ضائع کیا وہ اس کے سوا دوسرے کاموں کو (جو اس کے ذمہ ہیں) اور زیادہ خراب و برباد کرے گا

واقعہ یہ ہے کہ دینی نظام میں یا یوں کہیے کہ انسانوں کی دینی اور ایمانی زندگی کے نظام میں نماز کی

حیثیت وہ ہے جو ہمارے وجود میں اور ہمارے زندگی کے نظام میں قلب اور دل کی ہے، کہ اگر وہ ٹھیک ہے تو ہماری زندگی کا نظام ٹھیک ہے اور اگر اُس میں خرابی آئی تو ہماری زندگی کے نظام میں ضرور خرابی آئے گی، اور اگر اُس کی حرکت بند ہوئی تو زندگی ہی ختم ہو جائے گی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث روایت کی گئی ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ قیامت میں بعض لوگوں کے اعمال کی جانچ اس طرح ہوگی کہ ان کی بس نماز دیکھی جائے گی، جس کی نماز صحیح اور ٹھیک ہوگی اس کے لیے فیصلہ کر دیا جائے گا کہ اس کی زندگی ٹھیک ہے اور یہ نجات اور جنت کا مستحق ہے۔

ہماری اس دنیا میں اس کی مثال یہ ہے کہ پرانے زمانہ میں جو صاحب فن طبیب اور طب و حکمت کے ماہرین ہوتے تھے، آپ لوگوں نے بھی سنا ہوگا کہ وہ صرف نبض دیکھ کر انسانی جسم کی ساری بیماریوں کا پتہ چلاتے تھے اور ان کا علاج کرتے تھے ــــ نبض کا تعلق سارے جسم سے نہیں ہے بلکہ صرف قلب سے ہے اور اس سے بس قلب ہی کی حالت اور کیفیت کا پتہ چلتا ہے، تو وہ پرانے طبیب نبض کے ذریعہ قلب کی حالت کو سمجھ کر سارے جسم کی صحت اور بیماری کے بارے میں رائے قائم کر لیتے تھے۔

اس سلسلہ میں عجیب و غریب قسم کے قصے مشہور ہیں، اور طبیبوں حکیموں کے تذکروں میں لکھے ہوئے ہیں آپ حضرات نے بھی سنے ہوں گے۔ ایک واقعہ خود میرا چشم دید اور ذاتی تجربہ ہے ــــ قریباً پینتالیس (۴۵) سال پہلے کی بات ہے میرے بڑے بھائی مولوی محمد حسن صاحب جو مجھ سے قریباً دس سال بڑے ہیں اور الحمد للہ حیات ہیں، گردے کے درد کی تکلیف میں مبتلا ہوئے، مرض نے بہت طول کھینچا، مقامی طور پر جو علاج ممکن تھا وہ سب ہوا لیکن مرض نہیں گیا تو علاج کے لیے لکھنؤ آئے، یہاں میڈیکل کالج میں کافی دنوں داخل رہے کئی دفعہ ایکسرے کیا گیا، ڈاکٹروں نے کہا کہ ایکسرے سے تو گردے میں پتھری کا پتہ نہیں چلتا لیکن ہماری رائے یہی ہے کہ پتھری ہے اور درد اسی کی وجہ سے ہے، اس لیے آپریشن کرانا چاہیے۔ بھائی صاحب اس کے لیے آمادہ نہیں ہوئے۔ اس کے بعد علاج کے لیے دہلی گئے۔ میں بھی ساتھ گیا۔ اس وقت دہلی میں سب سے بڑے طبیب حکیم اجمل خاں مرحوم کے چچا زاد بھائی حکیم محمد احمد خاں سمجھے جاتے تھے، جن کے متعلق مشہور تھا کہ نبض سے مرض پہچاننے میں وہ حکیم اجمل خاں صاحب سے بھی فائق ہیں۔ ہم ان کے مطب میں گئے تو دیکھا کہ مریض صف بہ صف حلقہ بنائے بیٹھے ہیں، جس کا نمبر آتا ہے وہ ہاتھ بڑھا دیتا ہے، حکیم صاحب اس کی نبض پر اپنی انگلیاں رکھ کر نبض دیکھتے ہیں اور فوراً ہی نسخہ بول دیتے ہیں جو ان کے

شاگرد لکھ کر مریض کے حوالہ کر دیتے ہیں۔ کسی مریض کو اپنا حال بیان کرنے کی اجازت نہیں دیتے، کبھی کسی مریض سے خود ہی کوئی بات پوچھ لیتے ہیں اور بس چند سکنڈ میں یہ سب کچھ ہو جاتا ہے —— ان کے اس طریقہ سے طبیعت مطمئن نہیں ہوئی، ہم لوگ ان کا مطب اور یہ عجیب و غریب طریقہ دیکھ کر واپس آگئے، اور اس طرح ان کا علاج کرانے پر دل راضی نہیں ہوا —— لیکن اُن کی مہارت کی شہرت کی وجہ سے جی یہی چاہتا تھا کہ کسی طرح ان کا علاج کرائیں —— "جید برقی پریس دلی" کے مالک حکیم ذکی احمد خاں صاحب جو خود بھی دلی کے بڑے طبیبوں میں تھے اور حکیم اجمل خاں صاحب کے پرائیویٹ سکریٹری رہے تھے اُن کا حکیم محمد احمد خاں صاحب سے برادرانہ سا تعلق تھا اور میری اپنی کتابوں کی طباعت کے سلسلہ سے اُن سے کچھ شناسائی تھی اور علم دین کی نسبت سے وہ میرا لحاظ بلکہ اکرام فرماتے تھے۔ میں اُن کے پاس پہنچا اور اُن سے کہا کہ حکیم صاحب! مجھے آپ سے ایک بہت ہی نامناسب درخواست کرنی ہے۔ میرے بڑے بھائی صاحب مریض ہیں، میں علاج کے لیے ان کو یہاں لیکر آیا ہوں اور حکیم محمد احمد صاحب کا ہم لوگ علاج کرانا چاہتے ہیں مگر یہ چاہتے ہیں کہ وہ مریض کا کچھ حال سن لیں۔ حکیم صاحب نے کہا کہ ان کا یہ طریقہ نہیں ہے اور وہ بہت بے ڈھب آدمی ہیں، آپ ایسا کیجیے کہ مختصر حال لکھ کر مجھے دیدیجیے، میں آپ کے ساتھ ان کے مطب میں چلوں گا اور خود ان سے حال بیان کر دوں گا —— اگلے دن ہم لوگ حکیم ذکی احمد خانصاحب کے ساتھ اُن کے مطب میں پہنچ گئے، بھائی صاحب وہاں کے قاعدے کے مطابق مریضوں کے حلقہ میں بیٹھ گئے۔ جب اُن کی باری آئی حکیم محمد احمد صاحب نے نبض پر ہاتھ رکھا اور فوراً نسخہ بولدیا جس میں صرف دو دوائیں تھیں، جو مجھے اب تک یاد ہیں —— برگ کسوندی، فلفل سیاہ —— حکیم ذکی احمد خانصاحب جو پیچھے کی جانب بیٹھے تھے انھوں نے کہا کہ ان مریض کے بارہ میں مجھے کچھ کہنا ہے۔ حکیم صاحب بولے فرمائیے! حکیم ذکی احمد خانصاحب نے کہا کہ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ گردہ میں پتھری ہے، حکیم محمد احمد خاں صاحب نے زور سے ڈانٹ کر کہا، غلط کہتے ہیں، نبض نہیں کہتی۔ بالکل یہی اُن کے لفظ تھے۔ انھوں نے دوبارہ نبض بھی نہیں دیکھی اور نسخہ وہی رہا، برگ کسوندی، فلفل سیاہ —— کسوندی ایک جھاڑی ہے جو جنگل میں ہوتی ہے اُس کے پتے اور سیاہ مرچ کے سات دانے، بس یہی نسخہ تھا۔ اللہ کی شان کہ اسی سے بھائی صاحب کو اُس وقت صحت ہو گئی۔

میں عرض کر رہا تھا کہ نبض کا تعلق صرف قلب سے ہے تو سمجھنا چاہیے کہ محمد احمد صاحب نے نبض ہی سے یہ معلوم کر لیا کہ قلب کی وہ حالت نہیں ہے جو گردے میں پتھری کی صورت میں ہونی چاہیے اسی لیے انھوں نے یقین کے ساتھ کہدیا گردے میں پتھری نہیں ہے نبض نہیں بتلاتی!

بس یونہی سمجھیے کہ نماز دینی زندگی کے نظام کا قلب ہے اگر وہ خشوع کے ساتھ ادا ہوتی ہے اور اس کے بارہ میں جو احکام ہیں اور جو اس کے شرائط اور آداب ہیں اُن کا اہتمام کیا جاتا ہے تو دین کا قلب درست ہے۔ دینی اعمال میں یہ شان صرف نماز کی ہے۔ اس لیے ان آیتوں میں کامل فلاح اور حصولِ جنت کا جو منشور بیان فرمایا گیا ہے اُس میں سب سے پہلے بھی نماز کی بات کہی گئی ہے اور سب سے آخر میں بھی نماز کے لیے فرمایا گیا ہے "وَالَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَوٰتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ" تو جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا نماز کی محافظت اور اس کے اہتمام میں یہ سب داخل ہے کہ اس کے لیے طہارت اور وضو اور لباس وغیرہ کا وہ اہتمام کیا جائے جو شریعت میں بتلایا گیا ہے، اگر کوئی عذر اور مجبوری نہ ہو تو جماعت سے اور مسجد میں ادا کی جائے، اور جو کچھ اس میں پڑھا جاتا ہے اور اُس کے ارکان رکوع و سجود وغیرہ کے ادا کرنے کا جو صحیح اور مسنون طریقہ ہے اس کو اہتمام سے سیکھا جائے اور اپنے امکان کی حد تک سنت کے مطابق بہتر سے بہتر طریقہ پر نماز ادا کرنے کی کوشش کی جائے۔ حدیث شریف میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "صلوا کما رأیتمونی اصلی" تم اس طرح نماز پڑھو جس طرح مجھے نماز پڑھتے دیکھتے ہو۔ تو یہ سب باتیں "وَهُمْ عَلٰی صَلَوٰتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ" آ گئیں ــــ آگے ارشاد فرمایا گیا ہے

"أُولٰٓئِكَ هُمُ الْوَارِثُوْنَ الَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ"

یعنی وہ اہل ایمان جن میں یہ صفات ہوں جن کا اوپر کی آیتوں میں ذکر کیا گیا۔ یعنی وہ نماز خشوع کی کیفیت کے ساتھ ادا کرتے ہوں۔ فضولیات و لغویات سے بھی الگ رہتے ہوں اور اپنے نفس و اخلاق کا تزکیہ کرتے ہوں، شہوت نفس کا تقاضہ پورا کرنے میں اللہ کی مقرر کی ہوئی حدود کی پابندی کرتے ہوں اور امانتوں، اور ذمہ داریوں کے ادا کرنے اور عہد معاہدوں کے پورا کرنے کا اہتمام رکھتے ہوں اور اپنی نمازوں کی محافظت کرتے ہوں تو یہ اہل ایمان "جنت الفردوس" کے وارث ہوں گے وہ اُن کی میراث ہے (أُولٰٓئِكَ هُمُ الْوَارِثُوْنَ الَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ) حدیثوں میں بیان کیا گیا ہے کہ جنت میں مختلف درجے اور طبقے ہیں اور "فردوس" اس کا ممتاز اور اعلیٰ درجہ ہے۔

اللہ تعالیٰ ایمان اور اعمال صالحہ کے صلہ میں اپنے بندوں کو جو جنت عطا فرمائے گا اُس کے لیے قرآن مجید میں متعدد جگہ یہ عنوان اختیار فرمایا گیا ہے کہ ہم ان کو جنت کا وارث بنائیں گے اور وہ جنت کے وارث ہوں گے۔ ایک جگہ فرمایا گیا ہے۔ "تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي نُورِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا" دوسری جگہ فرمایا گیا ہے: "وَنُودُوا أَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ" اس تعبیر میں بڑی لطافت ہے۔ ہماری اس دنیا میں تجارت اور کاروبار وغیرہ کے ذریعہ آدمی جو کچھ حاصل کرتا اور کماتا ہے وہ یقینی نہیں ہے: تجارت میں کبھی خسارہ بھی ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کھیتی باڑی اور کاشتکاری وغیرہ کا نتیجہ بھی مشکوک ہے، بارش نہ ہونے یا کسی اور حادثہ کی وجہ سے کبھی کبھی کھیتی بالکل تباہ ہو جاتی ہے، لیکن وراثت کے ذریعہ جو کچھ ملتا ہے وہ بالکل یقینی ہے اور اس کے لیے محنت مشقت بھی نہیں اٹھانی پڑتی تو ان آیتوں میں جنت کو اللہ کے نیک بندوں کی وراثت قرار دیا گیا ہے اور اُن کو جنت کا وارث کہا گیا ہے اس میں یہ اشارہ ہے کہ بندوں کو جنت کا ملنا بالکل یقینی ہے اس میں کوئی شک شبہ نہیں، اور وہ اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہوگی، اس کے حاصل کرنے کے لیے وہاں کوئی محنت مشقت نہیں کرنی ہوگی، دنیا میں جو نیک اعمال بندے کرتے ہیں وہ تو بندگی کا وظیفہ ہے: اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو نعمتیں دنیا میں ملی ہوئی ہیں، اس دنیا والے ہمارے اعمال تو اس کی بھی قیمت نہیں ہیں، جنت تو گویا صرف انعام کے طور پر ملے گی۔ یہ اللہ تعالیٰ کا انتہائی کرم ہے کہ وہ اپنے نیک بندوں کو جنت کا وارث اور وارثوں کی طرح حقدار اور جاگیردار قرار دیتا ہے۔

آخر میں فرمایا گیا ہے "هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ" یعنی وہ بندے اُس جنت الفردوس میں ہمیشہ رہیں گے ــــ قرآن مجید میں جا بجا اہل جنت کو یہ بشارت سنائی گئی ہے "هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ" غور کیا جائے ان دو لفظوں میں کتنی بڑی بشارت ہے کہ وہ ابدالآباد تک جنت میں رہیں گے، نہ کبھی وہ خود فنا ہوں گے اور نہ جنت کبھی فنا ہوگی۔

انسان کی فطرت میں یہ خواہش اور آرزو ہے کہ وہ ہمیشہ زندہ اور باقی رہے اس کو کبھی موت نہ آئے اور ہمیشہ ہی راحت و آرام اور چین سے رہے، اُس کا جس چیز کو جی چاہے وہ ملتی رہے لیکن آپ سب جانتے ہیں کہ اس دنیا میں یہ کسی کے لیے ممکن نہیں۔ یہ دنیا اور یہاں جو کچھ ہے سب فانی ہے "كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ" اور "كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ" ــــ لیکن دل کہتا ہے اور عقل سلیم

کہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کرم اور اس کی رحمت سے یہ بہت بعید ہے کہ وہ اپنے بندوں کی فطرت میں ایسی خواہش اور تمنا پیدا کرے جس کا پورا ہونا ممکن ہی نہ ہو، یہ تو ایسے ہوگا جیسے کہ اللہ تعالیٰ انسان میں بھوک اور پیاس تو پیدا کرے لیکن پانی اور غذا پیدا نہ فرمائے۔ اس لیے عقل یہ کہتی ہے کہ انسان کی اس فطری خواہش اور آرزو کے پورا ہونے کی بھی کوئی صورت ہونی چاہیے کہ وہ ہمیشہ زندہ اور باقی رہے کبھی موت نہ آئے، اس کو ہر طرح کی راحتیں اور لذتیں نصیب رہیں۔ تو واقعہ یہ ہے کہ آخرت میں جنت بندوں کی اسی فطری خواہش اور دلی تمنا کے پورا ہونے کا انتظام ہے۔ "هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ٥" میں یہی بشارت سنائی گئی ہے اور دوسری جگہ اسی جنت کے بارہ میں فرمایا گیا ہے "فِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ وَأَنْتُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ٥" اور ایک اور جگہ ارشاد فرمایا گیا ہے " وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِي أَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ ؛ یعنی جنت میں وہ سب کچھ ہے جس کی تمھیں خواہش اور چاہت ہو اور جس سے تمھارے دلوں اور آنکھوں کو لذت اور مسرت ملے۔

افسوس ہے کہ ان آیتوں پر ہم اُس طرح غور نہیں کرتے جس طرح غور کرنا چاہئے اور ہمیں ویسا یقین نہیں جیسا یقین ہونا چاہیے، اگر وہ یقین ہو تو اُس جنت کی فکر اور اُس کے حاصل کرنے کی کوشش سے کبھی غفلت نہ ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم لوگ جو اس زمانہ میں دیندار اور ان میں بھی خواص سمجھے جاتے ہیں، ہمارا خود یہ حال ہے کہ جنت کی اتنی فکر اور طلب بھی نہیں ہے جتنی دنیا کی معمولی معمولی چیزوں کی ہے۔ دراصل یہ یقین کی کمی اور کمزوری کا نتیجہ ہے۔ حدیث شریف میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا" جنت جیسی عظیم اور قیمتی چیز کوئی نہیں جس کے طالب سوئے ہوئے ہوں اور غافل ہوں؛" ہم لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے پورے مصداق اور نمونہ ہیں ــــ تمام انبیاء علیہم السلام اسی لیے آئے کہ وہ اللہ کے بندوں کو جنت اور اللہ کی رضا و رحمت حاصل کرنے کا طریقہ بتلائیں اس کی دعوت و ترغیب دیں، اور اس کے غضب و عذاب سے ڈرائیں اور بچانے کی کوشش کریں۔

سورۂ مؤمنون کی ان آیتوں میں ابدالآباد تک کے لیے جنت اور اس کی نعمتیں حاصل کرنے کا پورا نسخہ بتلا دیا گیا ہے کہ ایمان اور یہ چند ایمانی صفات و اعمال اپنے اندر پیدا کرلو جن کا ان آیتوں

میں ذکر کیا گیا ہے) پھر تم جنّت کے وارث ہو اور ہمیشہ ابدالآباد تک اس جنت میں رہو گے ، نہ تم فنا ہو گے اور نہ جنّت فنا ہو گی - اور نہ کبھی تم اس جنّت سے بے دخل کیے جاؤ گے - بلکہ جائداد کے ایک حق دار وارث کی طرح جنّت تمہاری جاگیر بنا دی جائے گی -

"أُولَٰئِكَ هُمُ الْوَارِثُونَ الَّذِينَ يَرِثُونَ الْفِرْدَوْسَ، هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ "

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سیدنا محمد وآلہ واصحابہ اجمعین ہ

مَعَارِفُ الحَدِیث جلد ششم (حصہ اوّل)

اس میں حقوق العباد اور معاشرت سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سواتین سو حدیثوں کی تشریح کی گئی ہے　اگر حضورؐ کی ان ہدایات پر عمل کیا جائے تو پوری زندگی عبادت اور یہ دنیا ہی جنت بن جائے -

مضامین کے تعارف کے لیے قریباً دو سو عنوانات میں سے چند ذیل میں ملاحظہ ہوں -

- حقوق العباد اور معاشرت و معاملات کی خاص اہمیت
- پیدائش ، اور ماں باپ کی ابتدائی ذمہ داریاں
- نومولود بچہ کے کان میں اذان و اقامت
- عقیقہ اور تسمیہ (اچھا نام رکھنا)
- حسن ادب اور دینی تربیت
- لڑکیوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی خاص اہمیت اور تاکید
- نکاح اور شادی کی ذمہ داری
- ماں باپ کے حقوق اولاد پر
- اللہ کی رضا والدین کی رضا سے وابستہ
- والدین کی خدمت بعض حالات میں جہاد سے بھی مقدم
- خدمت اور حسن سلوک کا فرشتہ کے والدین کا بھی حق ہے
- ماں باپ کے مرنے کے بعد ان کے خاص حقوق
- اہل قرابت کے حقوق اور صلہ رحمی کی اہمیت
- قطع رحمی کرنے والے اقرباء کے ساتھ بھی صلہ رحمی
- میاں بیوی کے باہمی حقوق اور ذمہ داریاں
- حضورؐ کی خاص وصیت بیویوں کے ساتھ حسن سلوک کے بارے میں
- بیویوں کے ساتھ حضورؐ کا معیاری اور مثالی برتاؤ
- ہمسایوں کے حقوق
- پڑوسیوں کے ساتھ اچھا برتاؤ ایمان کی شرط
- کمزور اور حاجتمند طبقوں کے حقوق
- یتیموں ، مسکینوں اور بیواؤں کی سرپرستی
- بیماروں اور مصیبت زدوں کی خدمت و اعانت
- مسلمانوں کے باہمی حقوق اور برتاؤ کے بارہ میں ہدایات
- عام مخلوقات کے ساتھ برتاؤ کے بارے میں ہدایت
- جانوروں کے ساتھ بھی اچھے برتاؤ کی ہدایت
- آداب ملاقات اور آداب مجلس
- لیٹنے بیٹھنے اور سونے کے بارہ میں آپ کا طریقہ اور ہدایات
- چھینکنے اور جمائی لینے کے بارے میں ہدایات
- کھانے پینے کے احکام و آداب
- کھانے پینے کی چیزوں میں حلت و حرمت کی بنیاد -
- حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ٹھنڈا مشروب مرغوب تھا -
- لباس کے احکام و آداب اور ان کی اساس و بنیاد
- خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لباس مبارک
- ستر اور پردہ کے بارے میں ہدایات
- عورتوں کے لیے پردہ ضروری - بے پردگی موجب فتنہ

۳۳۲ صفحات ، کتابت طباعت اعلیٰ معیاری ، ــــ قیمت ۱۲/۵۰ مجلد ۱۶/-

کتب خانہ الفرقان - ۳۱ نیا گاؤں مغربی (نظیر آباد) لکھنؤ

جواہر پارے

اقتباسات مکاتیب رشیدیہ

(از مولانا نسیم احمد فریدی امروہی)

(گزشتہ سے پیوستہ)

مولوی خلیل احمد صاحب۔ السلام علیکم۔ آپ کا خط آیا۔ مافیہ (جو اس میں لکھا تھا) دریافت ہوا۔ آپ کے حسنِ احوال سے دل کو سرور ہوا۔ جس قدر ہو سکے اپنے شغل یادداشت میں مشغول رہیں۔ حجاب سیاہ سے ہراساں نہ ہوویں۔ جب وقت آئے گا یہ حجاب خود مُعینِ کار ہو جائے گا۔ کیف ما کان جس قدر ہو سکے مشغول رہو ؎

کار کن کار بگذر از گفتار　　　کاندریں راہ کار دارد کار[1]

تمہاری بہبودی سے توقع کرتا ہوں کہ خود بھی کچھ نفع پاؤں کہ تم نے بہ حسن ظن (مجھے) دلیل (رہبر) بنایا ہے۔ ورنہ اپنی شومی کیا کہوں۔ اول تو کچھ حاصل نہ ہوا تھا، اگر کچھ بطفل تسلی اپنی کی تھی۔ اب ضعفِ قوت اور ہمت نے اس سے بھی جواب دیا سو خیر دوستوں کی وجہ سے شاید کچھ حصہ مل جاوے۔ اب التفات بندہ کا آپ کی طرف سائلانہ ہے نہ معطیانہ ــــ من دَقَّ بابَ الکریم انفتح[2] حق تعالیٰ آپ کو

---

[1] (ترجمہ) کام کیے جاؤ اور گفتار سے درگذر کرو، اس لیے کہ اس راہ طریقت میں کام ہی کی ضرورت ہے۔

[2] (ترجمہ) جس نے سخی کا دروازہ کھٹکھٹایا اس کا کشود کار ہو گیا۔

فتح باب نصیب فرمادے۔ دس روز سے تو بخار نہیں ہوا مگر شدت نزلہ و درد و حرکتِ دندان ہے کہ بجائے سے زیادہ اذکار رفتہ ہوگیا ہوں۔ ایک باعث (دانت) شاید دو چار روز میں ساقط ہوجائے۔ ہُزال (لاغر پن) و ضعف کبرسنی اور عود بخار (یعنی بخار کے لوٹنے) سے بھی امن نہیں۔ ان سب پر بجز رضا، اور کیا چارہ ہے۔ اب تمنائے خیریت خاتمہ ہے اور بس۔

مولوی عبدالغنی صاحب مرحوم اور محرم کو فوت ہوئے۔ تم صاحبوں کو یہاں کے لوگوں کا سلام پہونچے۔

عزیزم مولوی خلیل احمد صاحب و عزیزم ... السلام علیکم۔ آپ کا خط آیا اور حال معلوم ہوا۔ اولاً آپ بغور ملاحظہ فرمادیں۔ اگرچہ خود واقف ہو مگر دوسرے کے قول کو آدمی خوب سمجھ لیتا ہے —— کہ نسبت لغت میں دو شئے کے ارتباط کا نام ہے۔ طرفین میں جو علاقہ ہے وہ نسبت ہے اور جو دنیا میں مخلوق ہے اس کو اپنے خالق تعالیٰ شانہٗ کے ساتھ ربط ہے —— وہ ربط جس کی کوئی انتہا نہیں۔ جس قدر اسماء و صفات اور نزولِ رحمت ہے اسی قدر نسبات ہیں۔ مثلاً خالق مخلوق میں نسبت خلق ہے۔ رازق مرزوق میں نسبت رزق ہے۔ رحیم مرحوم میں نسبت رحمت ہے۔ علیٰ ہذا۔ پس نسبت سے واقع اور نفس الامر میں کوئی خالی نہیں۔ خالی کیونکر ہو سکے کہ خلو محال ہے اور اس کا علم سرسری جس کو نفس علم کہہ سکیں سب ذوی العقول کو حاصل ہے ورنہ ایمان ہی نہ ہے۔ وہ کون مومن غافل ہو جائے گا کہ حق تعالیٰ کو خالق، رازق موجد نہ جانے گا۔ بلکہ کافر کو بھی علم ناتمام غیر معتبر اس امر کا حاصل ہے کہ (یہ) اصل فطرت ہے۔ پس اب دیکھو کہ مشائخ نے کس شئے کا نام نسبت رکھا۔ اُس ہی شئے کو وہ نسبت کہتے ہیں جو لغت میں نسبت ہے۔ وہ وہی شئے ہے جو واقعی سب عباد سے حاصل ہے۔ وہ وہی امر ہے کہ سب عباد اس کو جانتے ہیں۔ لیکن حصولِ نسبت یہ ہے کہ علم الیقین حاصل ہو کر موثر ہو جائے اور حضور کا درجہ ہو جائے۔ پس اب ضرور ہے کہ صاحب مقام کو یہ عین الیقین ہو جائے تاکہ یہ امر جو سالہا سال میں مجھ کو حاصل ہوا کوئی شئے حاصل نہیں کہ سب خلق میں یہ موجود ہے اور یہ امر صحیح ہے کیونکہ بعد جد و جہد کے وہ ہی امر صاف ہوا کہ اول فطرت سے آج تک اس میں رکھا تھا۔ خارج سے کوئی شئے کسی کو کا ہے (کبھی) حاصل نہیں ہوئی نہ ہووے۔ کس نے فولاد میں جوہر داخل کردیے، بلکہ فطرتی ہیں۔ کس نے خام آہن میں جوہر

داخل کیا؟ ہرگز (کسی نے) داخل نہیں کیا۔ اگر کہیں مشاہدہ ہو تو عارضی امر ہووے گا ـــــ غرض نسبت اندر سے سالک کے نکلی اور ہر روز اس کو اپنے اندر جانتا تھا اور سب کے اندر اس کے ہونے کا علم تھا۔ اب جو اس کو تشخیص و تعین سے بعلم لیقین پایا تو دوسروں کے اندر ہونے کا یقین بھی بڑھ گیا۔ بلکہ اس دوسرے کو یقین بلکہ علم بھی نہ ہو۔ اگر کسی کے گھر میں خزانہ مدفون ہو اور اجداد سے مسموع (سنا گیا) ہو کہ اس گھر میں خزانہ ہے اور تحصیل (یعنی حاصل) نہ ہو۔ اور بعد مشقت بسیار اس کو مل گیا تو پہلے علم سرسری تھا، اب یقین ہو گیا۔ اور دوسروں کے گھروں میں بھی خزانہ ہونے کا جو مسموع ہو کر علم تھا اب یقین بڑھ جاوے گا کہ بے شک ہے۔ مگر علم الیقین میں یہ شخص اُن اشخاص کی برابر نہ ہووے گا اور نہ غنا میں مساوی، بلکہ یہ غنی اور واجد (پانیوالا) اور صاحب یقین، اور دیگر محتاج، فاقد (نہ پانے والے)، صاحب ظن بلکہ صاحب شک، (ہوں گے) ع

بہ بیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

پس بعد اس کے اب فرق مراتب عوام و خواص باعتبار اس قوت علم کے ہوا کہ خاص کا ایک مُد (پیمانہ) عوام کے جبل اُحد کے برابر ہوا کما فی الحدیث ـــ پس قلیل عبادت اس خاص کی حسب یقین عبادت کثیر عوام سے غالب ہووے گی۔ بہ شہادت حدیث ـــــ اور وقت حضور خطرات کا عدد رہی گو کوئی امر جدید نہیں ـــ وہ کون ہے جو خطرات سے خالی ہو۔ تمام امور دین و دنیا سب خطرات ہیں۔..... اگر خطرہ نہ ہو، قصد طاعت و عبادت سب رفع ہو جائے وَهُوَ مُحَالٌ ـــــ ہاں خطرات خیر، خیر ہیں اور شر شر ـــ خطرہ شر کا دفع کرنا اہل اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ صحابہ کو خالق میں خطرہ (وسوسہ) ہوا اور ازالہ اس کا ارشاد ہوا۔ چنانچہ حدیث مَنْ خَلَقَ اللہ خود شاہد ہے ـــ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ـــــ وَلَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ ـــــ الحمد للہ فالحمد للہ ـــــ معہذا جو کچھ شوق مزید ہے وہ عین مطلوب ہے اور جو کچھ پیچ و تاب نایافت باوجود یافت ہے [illegible] وسعت [illegible] ہے مزید او هل من مزید اد آمین آمین ثم آمین جس وقت وہ خطرہ [illegible] ہووے اس کو دفع کرے اور [illegible] کی قسم کا خیال کرے اس کی ضد تواضع نفس کرنا علاج ہے ذلت نفس کو [illegible] جب [illegible] اپنی صغر یاد آوے گا پھر خطرہ

کہ خدا اس کے ذریعہ سے آپ کو شفا بخشے اور اسلام اور مسلمانوں کی خوب خدمت کا موقع دے۔ اپنے احباب پر رہ گیا اور بس — حافظ مسعود دہلی بشوق طلب مقیم ہیں۔ آپ کو سب کا سلام پہونچے زیادہ فرصت نہیں یہ خط بھی کچھ قلیل حرج سے لکھا گیا۔ خاطر عزیز نے تقاضۂ تحریر کیا۔ فقط والسلام

مولوی خلیل احمد صاحب السلام علیکم ——— نامۂ سامی نے مسرور فرمایا۔ بندہ سہارنپور گیا تھا۔ میری غیبوبت میں خط آیا تھا لہٰذا جواب میں تاخیر ہوئی۔ جب حضور تام ہوتا ہے تو اس وقت جہت کا کیا محل و امکان ہے۔ اور حضور کے ساتھ جب دوسری شے کا علم ہے تو حضور میں کمی ہے اور یہ لازم بشری ہے ورنہ سب امور معطل ہو جاویں۔ معًا ابن آدم جو فوق کا خیال باقی ہے، امر طبعی ہے، وسوسہ شیطانی سے کچھ علاقہ نہیں۔ ——— این اللہ فقالت فی السماء (الحدیث)۔ زوجنی اللہ من فوق العرش (الحدیث) سب اس کی تائید کرتی ہیں۔ کچھ اندیشہ کی جائے نہیں۔ اب آپ قلب کی طرف توجہ زیادہ کریں اور عین حالت شغل حضور میں متوجہ بقلب ہو دیں۔ سو یہ شائبہ جہت بھی رفع ہو جاوے گا۔ ورنہ کچھ اندیشہ نہیں طبعی امر مضرت رساں نہیں (ہوتا) خصوصاً وہ خطرہ کہ اوائل میں بھی موجود تھا...... تعبیر خواب مستغنی البیان ہے۔ تم کو اپنا فخر (اور) باعث نجات جانتا ہوں کچھ نہیں ہوں مگر اچھوں سے مربوط ہوں ——— فقط والسلام

مولوی خلیل احمد صاحب مد فیوضکم۔ بعد سلام مسنون مطالعہ فرمایند۔ اب کے سال رنج و محن ہی مقدر تھا۔ مرض ہیضہ میں گنگوہ وغیرہ میں دوست عزیز فوت ہوئے۔ خود بھی ایک ماہ سے بخار میں مبتلا رہا۔ اب افاقہ ہوا ہے۔ ضعف اور خفیف بخار اب بھی ہے۔ سبق ترک، جوابات مسائل مسدود ہیں مگر جو (مسائل) سہل ہیں (ان کا جواب دیا جاتا ہے) .... براہین قاطعہ طبع ہو چکی۔ فروخت شروع ہو گئی۔ ۱۲ر قیمت قرار دی گئی۔ ۱۷ جزو ہوئے۔ حاشیہ پر انوار ساطعہ ہے۔ برابر فروخت ہو رہا ہے۔ ایک نسخہ عرب کو بھی مولوی محمود حسن نے روانہ کر دیا ہے.... چندہ رسالہ ردِّ شیعہ[1] میں کچھ

---

[1] یہ رسالہ غالباً "ہدایات الرشید الی افحام العنید" مؤلفہ مولانا خلیل احمدؒ ہے جو ۸۰۰ صفحات پر مشتمل ہے اور طبع ہو چکا ہے۔ یا "مطرقۃ الکرامۃ" ہے جو حضرت مولانا خلیل احمد صاحب نے مدرسہ مصباح العلوم بریلی سے تعلق کے وقت لکھا تھا، اس کی ایک جلد شائع ہو چکی ہے۔ دوسری جلد نہیں چھپ سکی۔ "تاریخ مظاہر" جلد دوم میں یہ دونوں کتابیں فہرست تصانیف حضرت مولانا سہارنپوری میں درج کی گئی ہیں۔ ۱۲

بندہ بھی دیوےگا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ جس کی مقدار اب مقرر نہیں کر سکتا ہوں۔ افحام[1] کا جواب اس رسالہ میں مناسب نہیں نہ دوسری بات ہے۔

از بندہ رشید احمد عفی عنہ، برادرم مولوی خلیل احمد صاحب مدفیوضہم السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

آپ کا خط آیا۔۔۔۔ مجھ پر ایک پریشانی ایسی ہے کہ کسی کام میں دل نہیں لگتا۔ مولوی ابو الطیب بیمار ایک سال سے تھے، اب چار پانچ ماہ سے شدت ہو گئی۔ بخار دائمی اور ضعف معدہ بہ شدت ہو گیا۔ دو ماہ سے وطن آئے تو اب یہ حالت ہے کہ کروٹ بھی نہیں لے سکتے۔ ان کی صلاحیت اور جوانی پر بسبب رشتہ چند در چند کے ایک رنج و ملال ہے اور تقدیر میں کچھ دخل نہیں۔ حکیم ضیاء الدین صاحب (ساکن رامپور منیہاران) کو بھی چار پانچ روز سے بلا کر شریک علاج کیا ہے۔ حق تعالیٰ اسکو شفاء عطا فرمائے۔ آپ بھی دعا کریں۔ سب کی طرف سے سلام پہونچے۔

مولوی خلیل احمد صاحب السلام علیکم۔ آپ کا خط آیا۔ بندہ کو بعد سخت بیماری بخار موسم کے اب افاقہ ہوا ہے۔ آپ کا جواب لینے آیا تھا۔ ان کی تحسین میں خط لکھنا ضرور نہ جانا تھا۔ اب حادثہ جدید یہ ہوا کہ مولوی محمد مظہر[2] مرحوم ۲۴ شب ذی الحجہ یکشنبہ کو فوت ہوئے۔ عالم (میں) اندھیر ہو گیا۔ اب سب رفیق رخصت ہوئے۔ دیکھئے کب تک میری قسمت میں اس دنیا کے دھکے لکھے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

---

[1] مشہور مناظر اہل سنت و جماعت مولانا حیدر علی فیض آبادیؒ نے منتہی الکلام ایک ضخیم کتاب رد روافض میں لکھی اس کے جواب میں مولوی حامد حسین شیعی لکھنوی نے استقصاء الافحام لکھی تھی۔ افحام سے مراد غالباً یہی استقصاء الافحام ہے۔

[2] الشیخ العالم المحدث محمد مظہرؒ بن لطف علی بن محمد حسن الصدیقی الحنفی النانوتویؒ

آپ نانوتہ میں پیدا ہوئے۔ جب ہوش سنبھالا تو تحصیل علم کے لیے دہلی کا سفر اختیار کیا۔ وہاں مولانا مملوک علی صاحب نانوتویؒ، مفتی صدر الدین دہلویؒ اور مولانا رشید الدین [illegible] سے تحصیل کیا۔ بعد کو حدیث حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ سے بھی پڑھی۔ آپ نے مکتبہ نولکشور میں [illegible] کی تصحیح کا کام کیا۔ اور طلباء علوم دین نے آپ سے [illegible] اور علم کلام کی کتابیں پڑھیں۔ بعض کتب ابتدائیہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے بھی آپ سے پڑھیں۔ آپ [illegible]

(باقی اگلے صفحہ پر)

حامداً و مصلیاً۔ مولوی خلیل احمد صاحب السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

آپ کا خط پُر شوق و وَلہ آیا۔ بندہ بتقریب جلسہ دستار بندی[ع۵] دیوبند گیا تھا۔ فرصت جواب نہ ملی اب ۱۶؍ روز سہ شنبہ کو واپس دیوبند سے آیا ہے۔ جواب لکھتا ہوں۔ عزیزم اولاً تو بغور سنو کہ مقصد جملہ اشغالات و مطلب منتہی جملہ مراقبات کا وہ حضورِ قلب بے کیف ہے کہ حق تعالیٰ نے آپ کو نصیب فرمایا۔ نسبتِ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین یہی حضور تھا۔ نہ وہاں فنا تھا، نہ وہاں اضمحلالِ اشیاء کسی نور میں تھا، نہ وجود کی تحقیق نہ شہود کی تدقیق۔ نہ فرق دونوں حال میں [illegible] نہ کرامت، نہ انکشاف، نہ ابنا ارتباط تجلی اعظم کے ساتھ کسی کو ظلیٌ یا عینی واضح ہوا۔ نہ مراتب الوان کو ادراک کیا۔ محض عبادت تھی۔ عبادت ــ باغیریتِ خود ــ اور فرق عابد و معبود تنزیہ تمام کی حالت میں کرتے تھے۔ ہاں حُب اللہ تعالیٰ کا غلبہ تھا کہ جان و مال کو اس کی جنب (مقابل) میں کچھ اصل نہ جانتے تھے۔ ہزارہا جان اور ساری دنیا کے عوض رضائے نائب الٰہی کو مقدم پہچانتے تھے اور اس حالت کے عطیہ کو کونین سے بہتر سمجھتے

(حاشیہ پچھلے صفحہ کا بقیہ) ــ و سنت کی تدریس میں اپنی پوری عمر صرف کی۔ مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں بھی آپ نے درس دیا۔ شوال ۱۲۸۳ھ سے مدرسہ مظاہر علوم میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیا۔ اس مدرسہ کی بنیاد مولانا سعادت علی سہارنپوریؒ نے (جو حضرت سید احمد شہیدؒ کی جماعت سے تعلق رکھتے تھے) ڈالی تھی۔

آپ بڑے متبحر عالم تھے۔ آپ نے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور اجازت بھی حاصل کی تھی۔ آپ تلاوت قرآن مجید کثرت سے کرتے تھے اور دائم الذکر تھے۔ اسم ذات سے رطب اللسان رہتے تھے۔ تکلف سے بعید تھے۔ چہرے پر رعب و جلال تھا۔ ۲۴ ذی الحجہ ۱۳۰۲ھ بروز یکشنبہ انتقال ہوا۔ ستر سال کی عمر پائی۔ اس مصرع سے آپ کی تاریخ وفات نکلتی ہے ؎ زین جہاں نقل مکان کرد بدارِ جنات ۱۳۰۲ھ (نزہۃ الخواطر جلد ۷)

ع۵ یہ دستار بندی کا چوتھا جلسہ تھا جو ۱۴ ربیع الاول ۱۳۰۱ھ میں منعقد ہوا۔ اس میں گیارہ علماء کے سروں پر دستار فضیلت باندھی گئی جس میں مشہور و نمایاں حضرات کے نام یہ ہیں: حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، حضرت مولانا محمد یحییٰ کاندھلویؒ، حضرت مولانا عبدالمومن دیوبندیؒ، حضرت مولانا ناظر حسن دیوبندیؒ۔ مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ اس جلسہ کی روداد بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں [illegible] ان گیارہ علماء کی جن کے سروں کا تاج وہ عمامہ تھا جس کے پیچ قطب العالم کے ہاتھوں نے ڈالے اور [illegible] عطیہ امام ربانی کے ہاتھوں علماء کے سروں پر رکھا گیا۔ (تذکرۃ الرشید جلد اول ص ۲۴۹)

تھے۔ طمع جنت الٰہی و خوف نار غضب ان کا اشعار تھا۔ پس یہ نسبت یاد داشت و احسان تھی کہ شمہ اس کا میرے سعید ازلی قرۃ العینین خلیل احمد کو نصیب ہوئی جس پر ہزار فخر و ناز یہ بندۂ ناساز کر کے اپنا دل قرار دئیے مطمئن بیٹھا ہے۔ اگرچہ خود اس دولت سے محروم رہا مگر ناودان (پرنالہ) اپنے دوستوں کا بنا۔ اگرچہ سواقی (پانی کی چھوٹی نالیوں) کو ماء نہر سے تحفظ نہ ہو کہ مبدء حوض ہے اور منتہیٰ مزرعہ۔ مگر تاہم کوئی حصہ سواقی کو بھی ہے۔ گو معتد بہا نہ ہو، پھر یاد صوف اس کیفیت مبارکہ کے اور حصول نسبت اصحاب کرام کے وہی طلب کا لقا اور ازدیاد و اضمحلال کی خواہش ہل من مزید میں داخل ہے، اعلیٰ حالات والے اسفل کے بھی متمنی رہتے ہیں ...... پس حاصل آنکہ مولوی صدیق احمد کا اصل حال وہی یاد داشت ہے مگر ریزائی انوار زاہرہ و اضمحلال اشیاء کا انکشاف خواہ کشفاً خواہ وجداناً مزید ہے ...... پھر آپ کی پوری تسلی کرتا ہوں کہ مولوی صدیق احمد کو جو کچھ یہ انکشافات ہیں ان کے ہی قلبی ہیں۔ نہ اس مدبر (بے اقبال) کی طرف سے۔ سوائے راہ بتانے کے اس کا کام کچھ نہیں۔ (یہ بندہ) ان انوار و واردات سے خود بھی عاطل رہا ہے۔ مدت العمر میں اس قسم کو مشاہدہ نہیں کیا۔ ہاں نسبتِ حضور کا (بہ) قدر نصیب مقدر حصہ ملا ہے۔ جس کا ہم پلہ اُن ہزارہا انوار کو کچھ نہیں جانتا ہوں۔ تو جب خود ان سے غافل ہوں، تم کو کہاں سے آگاہ کروں۔ ہاں اس قدر ہے کہ آپ کی نسبت کو جس قدر اس عاجز سے مناسبت ہے مولوی صدیق احمد صاحب سے اُس قدر مناسبت نہیں ہے ...... میرے واسطے بھی دعا و توجہ فرمادیں کہ بہ سبب مناسبت ساتھ ہی رہوں اور دوستوں کی ترقی کا طالب ہوں۔ المرء مع من احب حب اسفل سے اعلیٰ کی جانب مرعی ہے۔ اعلیٰ سے اسفل میں بھی ملحوظ ہے۔ زیادہ بجز دعاء ترقی کے کیا لکھوں۔ واللہ یهدینا وایاکم والسلام۔

(۱۷ر جمادی الاولیٰ ۱۳۰۱ھ یکشنبہ)

علامہ شیخ عبد اللہ بن حمید
الرئیس العام للاشراف الدینی علی المسجد الحرام (مکہ مکرمہ)

ترجمہ: خلیل الرحمن سجاد ندوی
متعلم جامعہ اسلامیہ (مدینہ منورہ)

رؤیت ہلال میں اختلاف مطالع کا اعتبار دلائل شرعیہ کی روشنی میں

(رابطہ عالم اسلامی (مکہ مکرمہ) کے اجلاس منعقدہ ۱۳۹۰ھ میں یہ مسئلہ ایک تجویز کی شکل میں بحث و غور کے لئے آیا تھا کہ اگر عالم اسلامی کے کسی حصہ اور دنیا کے کسی شہر میں رمضان یا عید کا چاند دیکھ لیا جائے تو ساری دنیا کے مسلمان اسی حساب سے روزے رکھیں اور عید کریں۔ اس طرح پورے عالم اسلامی میں رمضان مبارک ایک ہی دن شروع اور ایک ہی دن ختم ہوگا اور ایک ہی دن عید منائی جائے گی۔ "توحید اہلہ" اس مسئلہ کا عنوان تھا۔

رابطہ کے ارکان کی رائیں اس بارے میں مختلف تھیں اس لئے اس وقت یہ طے ہوا کہ اس مسئلہ کو آئندہ اجلاس کے لئے ملتوی کیا جائے اور عالم اسلام کے مشاہیر علماء و اصحاب فتویٰ کو رابطہ کی طرف سے سوال بھیجا جائے اور آئندہ اجلاس میں اُن حضرات کے جوابات بھی سامنے رکھ کر اس پر غور کیا جائے — راقم سطور بھی اس اجلاس میں شریک تھا۔

محرم ۱۳۹۱ھ کے الفرقان میں "رابطہ" ہی کے حوالہ سے اس عاجز نے یہ سوال کسی قدر تفصیل اور وضاحت کے ساتھ حضرات علماء کرام کی خدمت میں پیش کیا تھا اور الفرقان کے اس سال کے مختلف شماروں میں متعدد حضرات کے جوابات بھی شائع ہوئے تھے۔

پھر اگلے سال ۱۳۹۱ھ میں جب "رابطہ عالم اسلامی" کا تیرھواں اجلاس ہوا (جس میں اس مسئلہ پر غور وفکر کے بعد کوئی فیصلہ ہونا تھا) تو کسی مجبوری کی وجہ سے یہ عاجز اُس اجلاس میں شریک نہیں ہو سکا، لیکن ایک رکن کی حیثیت سے اس سلسلہ سے متعلق اپنی رائے لکھ کر بھیجدی، جس میں "توحید اہلّہ" کے نظریہ سے میں نے اختلاف کیا تھا اور اپنے محدود مطالعہ کے مطابق اس کے دلائل بھی لکھ دیے تھے — بعد میں جب اس اجلاس کی کارروائی رابطہ کے اخبار میں شائع ہوئی تو معلوم ہوا کہ اجلاس میں "توحید اہلّہ" کی تجویز کے حق میں فیصلہ کیا گیا اور اس کے متعلق بیان میں میرے اور بعض دوسرے ارکان کے اختلافِ رائے کا بھی ذکر کر دیا گیا۔

رابطہ کے اسی اجلاس میں نجد کے ایک بہت بڑے اور ممتاز عالم دین علامہ شیخ عبداللہ بن حمید کو (جو حکومت سعودیہ کے المسجد الحرام (مکہ مکرمہ) سے متعلق شعبہ دینی کے سربراہ اعلیٰ ہیں) رابطہ کا رکن منتخب کیا گیا تھا، وہ جب رابطہ کے اختتامی اجلاس میں ایک رکن کی حیثیت سے شریک ہوئے اور معمول کے مطابق پورے اجلاس کی منظور شدہ قراردادیں پڑھ کر اس اجلاس میں سنائی گئیں تو رؤیتِ ہلال سے متعلق اس قرارداد سے ممدوح نے اختلاف ظاہر کیا اور فرمایا کہ "توحید اہلّہ" کا یہ نظریہ احادیث صحیحہ اور مذاہب اربعہ کے محققین فقہا کی تصریحات سے مطابقت نہیں رکھتا، اور جغرافیہ اور جدید ہیئت کے مسلمات کے بھی یہ خلاف ہے۔ اس لیے میرے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے۔

اس کے بعد ممدوح نے اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ تحریر فرمایا جو "تبیان الادلہ فی اثبات الاھلہ" کے نام سے شائع ہو چکا ہے — واقعہ یہ ہے کہ اس مسئلہ پر ایسی جامع اور مدلل کوئی تحریر اب تک راقم سطور کی نظر سے نہیں گزری۔

جب یہ رسالہ رابطہ کی طرف سے اس عاجز کے پاس آیا تھا اسی زمانہ میں الفرقان کے واسطے ترجمہ کے لیے عزیزم خلیل الرحمٰن سلمۂ کے سپرد کر دیا تھا — لیکن اتفاق سے اب تک اس کی اشاعت کی نوبت نہیں آئی — اب اس شمارہ میں یہ ترجمہ ہدیۂ ناظرین کرام کیا جا رہا ہے — واللہ الموفق للصواب والسداد۔ نعمانی]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ الذی جعل الشمس ضیاءً والقمر نورًا وقدرہ منازل لتعلموا عدد السنین والحساب، واشہد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ شہادۃً مبرّأۃً من الشکوک والارتیاب واشہد ان محمدًا عبدہ ورسولہ اشرف نبی انزل علیہ اشرف کتاب صلی اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ ومن تبعہم باحسان الی یوم الدین وسلّم تسلیمًا کثیرًا ——— اما بعد

شعبان ۱۳۹۵ھ میں جب رابطہ عالم اسلامی (مکہ مکرمہ) کا تیرھواں اجلاس ہوا تو اس میں چند قراردادیں منظور کی گئیں۔ ایک قرارداد میں پورے عالم اسلام کے لیے "توحید اہلہ" کا فیصلہ کرتے ہوئے طے کیا گیا کہ "اگر مثلاً مراکش یا ایران میں (یا ان کے علاوہ کسی اور خطہ یا ملک میں) چاند دیکھ لیا جائے تو روئے زمین کے سارے مسلمانوں کے لیے لازم ہوگا کہ وہ اس رویت کے حساب سے رمضان کے روزے رکھیں اور افطار کریں (یعنی عید منائیں) ——— اور یہ بھی طے کیا گیا کہ رابطہ کا سکریٹریٹ تمام ممالک اسلامیہ کے سربراہوں سے رابطہ قائم کرے اور ان سے اس فیصلہ کے مطابق عملدرآمد کے لیے کہے کیونکہ یہ شریعت کا تقاضا ہے۔"

رابطہ کے اس اجلاس کے اختتامی جلسہ میں میں بھی شریک تھا۔ جب اجلاس کی منظور شدہ قراردادیں پڑھ کر سنائی گئیں اور انہی کے ضمن میں "توحید اہلہ" والی یہ قرارداد بھی سنائی گئی تو میں نے اس سے اس بنیاد پر اختلاف ظاہر کیا کہ یہ نظریہ نہ تو احادیث صحیحہ سے مطابقت رکھتا ہے نہ محققین مذاہب اربعہ (حنفیہ، مالکیہ، شافعیہ، حنابلہ) کی تحقیقات کے مطابق ہے اور جغرافیہ اور ہیئت جدیدہ کے مسلمات کے بھی خلاف ہے ——— اگرچہ بعض علماء کے اقوال رابطہ کی "مجلس تاسیسی" کے بعض ارکان کے اس نظریہ (توحید اہلہ) کی موافقت میں بھی ملتے ہیں لیکن ان کے پاس اس کی تائید میں نہ کوئی عقلی دلیل ہے نہ نقلی، اس کے برعکس اس قول کا غیر صحیح ہونا دلائل کی روشنی میں بالکل بدیہی ہے، جیسا کہ ان شاء اللہ ابھی وضاحت کے ساتھ آپ کے سامنے بھی آجائے گا۔

یہی واقعہ اس کا محرک ہوا کہ میں اس موضوع پر ایک رسالہ لکھ دوں جس سے حق واضح ہو جائے اور معلوم ہو جائے کہ اہل بصیرت و معرفت کا اس پر اتفاق ہے کہ ہلال کے مطالع مختلف ہیں اس لیے

ہر علاقہ کے لیے اسی علاقہ والوں کی رویت کا اعتبار ہو گا اس تفصیل کے ساتھ جو آگے بیان ہو گی۔

علاوہ ازیں ہمارے اس زمانہ کی اسلامی حکومتوں کی حالت اور دین سے اُن کی دوری اور بے تعلقی اور اللہ کی کتاب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت و شریعت سے ان کی بے نیازی بلکہ مخالفانہ روش ایسی کھلی حقیقت ہے جسے ہر باخبر جانتا ہے (ایسی حالت میں رویت ہلال جیسے خالص دینی مسئلہ کو اُن کے حکم کا تابع بنا دینا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا ——— بہرحال انہی وجوہ سے میں نے یہ رسالہ لکھنے کا ارادہ کیا) اور "تبیان الادلہ فی اثبات الاہلہ" اس کا نام رکھا۔ واللہ الموفق والہادی الیٰ سواء السبیل۔

سب سے پہلے وہ حدیثیں پیش کی جاتی ہیں جو بتلاتی ہیں کہ کسی علاقہ کی رویت اسی علاقہ والوں کے لیے ہے۔

(پہلی حدیث) امام مسلم نے (اپنی متعدد سندوں سے حضرت عبد اللہ بن عباس کے آزاد کردہ غلام کریب سے) اپنی صحیح میں یہ حدیث روایت کی ہے

ان ام الفضل بنت الحارث بعثته الیٰ معاویۃ بالشام، قال فقدمت الشام، فقضیت حاجتها واستهل علیّ رمضان وانا بالشام فرأیتُ الهلال لیلة الجمعة، ثُمّ قدمت المدینة فی آخر الشهر فسألنی عبد الله بن عباس رضی الله عنهما ...... ثم ذکر الهلال فقال متی رأیتم الهلال؟ فقلت رأیناه لیلة الجمعة، فقال انت رأیته؟ فقلت نعم، ورآه الناس وصاموا وصام معاویۃ، فقال لکنا رأیناه لیلة السبت فلا نزال نصوم حتی نکمل ثلثین او نراه، فقلت: ولا تکتفی

کہ مجھے (عبد اللہ بن عباس کی والدہ) ام الفضل بنت الحارث نے اپنے ایک کام سے ملک شام (خلیفہ وقت) حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا، چنانچہ میں ملک شام پہنچا جس کام کے لیے مجھے ام الفضل نے بھیجا تھا وہ میں نے کر لیا اور مجھے وہیں رمضان کا مہینہ آگیا تو شب جمعہ کو میں نے رمضان کا چاند وہیں شام میں دیکھا اور پھر میں آخر رمضان میں مدینہ واپس آگیا تو عبد اللہ بن عباس نے (رضی اللہ عنہما) مجھ سے پوچھا کہ تم نے رمضان کا چاند کب دیکھا؟ میں نے کہا کہ ہم نے جمعہ کی رات میں دیکھا تھا۔ انھوں نے کہا تم نے خود دیکھا تھا؟ میں نے کہا ہاں (میں نے بھی دیکھا تھا) اور وہاں لوگوں نے عام طور سے دیکھا

برؤیۃ معاویۃ وصیامہ فقال لا: ھکذا امرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم........

اور جمعہ کو پہلا روزہ رکھا، اور خود حضرت معاویہ نے بھی اس دن روزہ رکھا ۔۔ تو عبداللہ بن عباس نے فرمایا لیکن ہم (مدینہ والوں) نے تو شنبہ کی رات میں چاند دیکھا تھا تو ہم برابر روزے رکھتے رہیں گے یہاں تک کہ تیس ۳۰ پورے ہو جائیں! (اس سے پہلے ۲۹ کو) ہمیں چاند نظر آجائے (تو ۲۹ ہی رکھیں گے کریب کہتے ہیں) میں نے کہا کیا خلیفہ وقت معاویہ کا چاند دیکھنا اور روزہ رکھنا آپ کے لیے کافی نہیں ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ نہیں! ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی حکم دیا ہے۔

یہ حدیث اس بات کی صریح دلیل ہے کہ ہر علاقہ کے لیے وہیں کی رؤیت معتبر ہے۔ اور حضرت ابن عباس کا یہ فرمانا کہ "ھکذا امرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی حکم دیا ہے) اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ اور ظاہر ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس نے کریب کی اطلاع کو اس بنیاد پر ناقابل قبول نہیں ٹھہرایا کہ وہ صرف ایک آدمی کی خبر ہے، کیونکہ اگر یہ بنیاد ہوتی تو وہ حضرت معاویہ کو خط لکھ کر تصدیق کر سکتے تھے۔ یا خود حضرت معاویہ اہل مدینہ کو خط کے ذریعہ شب جمعہ کی رؤیت کی اطلاع دیتے تاکہ وہ اپنے پہلے روزہ کی قضا رکھیں۔ لیکن جب ان میں سے کوئی بات بھی نہیں ہوتی، (نہ حضرت ابن عباس نے خط لکھا نہ حضرت معاویہ نے خط لکھنے کی ضرورت سمجھی) تو یہ بات معلوم ہو گئی کہ ان حضرات کے نزدیک شریعت کا حکم یہی تھا کہ ہر علاقہ کے لیے وہیں کی رؤیت کا اعتبار ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کے زمانہ میں عام معمول اور طریقہ تھا کہ نہ وہ حضرات دوسرے شہروں کو خط لکھ کر رؤیت ہلال کے بارہ میں دریافت کرتے تھے اور نہ دوسرے شہروں والے اُن کو خط لکھ کر دریافت کرتے تھے، حالانکہ وہ حضرات دینی امور کا ہم سے بہت زیادہ اہتمام کرنے والے تھے اور (نماز روزہ جیسے) اعمال خیر کے ہم سے زیادہ حریص تھے۔

امام نووی نے شرح مسلم میں اس حدیث پر ترجمۃ الباب (یعنی عنوان) یہ قائم کیا ہے۔ "باب ہے اس بیان میں کہ ہر علاقہ کے لیے وہیں کی رؤیت ہے، اور جب کسی علاقہ کے لوگ چاند دیکھ لیں تو دور دراز کے دوسرے علاقہ والوں کے لیے رویت کا حکم ثابت نہیں ہوتا۔"

اور امام ابوداؤد نے اپنی سنن میں کریب کی اسی حدیث پر یہ باب قائم کیا ہے "جب کسی شہر میں ایک رات پہلے چاند دیکھ لیا جائے ہو (تو اس کا حکم)"

اور امام ترمذی نے اپنی جامع میں یہ باب قائم کیا ہے "باب ہے اس بیان میں کہ ہر علاقہ کے لیے اُن کی اپنی رؤیت ہے" پھر کریب کی مندرجۂ بالا حدیث درج کرنے کے بعد امام ترمذی لکھتے ہیں کہ "اہل علم کا اسی پر عمل ہے، ہر علاقہ کے لیے وہیں کی رؤیت معتبر ہے" اور امام ترمذی نے اس بارہ میں (ائمہ اور اہل علم میں سے) کسی کا اختلاف بھی نقل نہیں کیا (حالانکہ ان کی عادت ہے کہ جس مسئلہ میں ائمہ سلف کا اختلاف ہوتا ہے وہ حدیث کے ذیل میں اس کو ذکر کر دیتے ہیں)۔

اور امام نسائی نے باب باندھا ہے کہ "رؤیت ہلال میں اہل آفاق کے اختلاف کا بیان"

اور ان سب حضرات نے ان ابواب کے ذیل میں کریب کی مذکورۂ بالا حدیث درج کی ہے۔
اس سے معلوم ہوا کہ یہ سب حضرات (اس حدیث کی روشنی میں) اسی کے قائل ہیں کہ ہر علاقہ کے لیے وہیں کی رؤیت معتبر ہے۔ جیسا کہ اُن کے قائم کیے ہوئے تراجم ابواب سے پتہ چلتا ہے۔

اور کریب کے اس سوال کا کہ "آپ رؤیت ہلال کے ثبوت میں حضرت معاویہؓ کی رؤیت اور ان کے روزہ رکھنے کو کافی کیوں نہیں سمجھتے؟" حضرت ابن عباسؓ نے جو یہ جواب دیا کہ "ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی حکم دیا ہے" تو اس سے حضرت ابن عباس کا مطلب یہ تھا کہ اہل مدینہ اہل شام کی رویت کی بنیاد پر رمضان کے ختم ہو جانے کا فیصلہ کر کے عید نہ منائیں۔ اُن کا استدلال اس حدیث سے تھا "لا تصوموا حتی تروا الهلال ولا تفطروا حتی تروه" (چاند دیکھنے سے پہلے رمضان کا روزہ نہ رکھو اور چاند دیکھنے سے پہلے افطار یعنی عید کا فیصلہ نہ کرو)

(دوسری حدیث) اور صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لا تصوموا حتی تروا الهلال ولا تفطروا   رمضان کا روزہ نہ رکھو جب تک کہ چاند دیکھ نہ لو اور

حتی تروہ فان غبّ علیکم فاقدروا لہٗ والشہر تسع وعشرون لیلۃ فلا تصوموا حتی تروہ فان غم علیکم فاکملوا العدۃ ثلاثین۔

افطار نہ کرو (یعنی عید نہ کرو) جب تک کہ چاند نہ دیکھ لو۔ پس اگر چاند تم کو نظر نہ آئے تو حساب سے گنتی پوری کرو۔ اور آپ نے فرمایا کہ مہینہ ۲۹ دن کا بھی ہوتا ہے پس رمضان کا روزہ نہ رکھو جب تک کہ چاند دیکھ نہ لو۔ پس اگر چاند نظر نہ آئے تو تیس کی گنتی پوری کرو۔ (یعنی شعبان کے تیس دن پورے کر کے روزہ رکھو)

(اس حدیث کے الفاظ صحیح بخاری ہی میں مختلف ابواب کی روایتوں میں مختلف آئے ہیں اور سب متقارب ہیں۔ فاضل مؤلف شیخ عبداللہ بن حمید نے یہ سب مختلف روایتیں نقل کی ہیں۔ اس کے بعد فرماتے ہیں) ان تمام روایات سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ روزہ تب رکھا جائے جبکہ شعبان کے پورے تیس دن ہو جائیں یا انیسویں شعبان کو چاند نظر آ جائے۔

صوموا لرؤیتہ وافطروا لرؤیتہ (چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر افطار کرو)

اگرچہ اس کی مخاطب تمام امت ہے لیکن یہ بات تو واضح ہے کہ روزہ اور افطار کا ایک متعین سبب ہے یعنی چاند کا نظر آ جانا (جیسا کہ حدیث مذکور سے معلوم ہوتا ہے) تو جس علاقہ کے لوگوں نے چاند دیکھ لیا ان کے لیے سبب متحقق ہو جانے کی وجہ سے روزہ یا افطار لازم ہو گیا اور جن علاقوں میں رؤیت نہیں ہوئی وہاں چونکہ سبب نہیں پایا گیا اس لیے روزہ یا افطار لازم نہ ہوگا۔

نماز کے اوقات اس کی واضح مثال ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو زوال آفتاب کے بعد نماز ظہر ادا کرنے کا حکم دیا تو جس وقت مدینہ میں زوال ہو جائے گا مدینہ والوں کے لیے ظہر کی نماز کا وقت آ جائے گا، لیکن جو علاقے مدینہ سے مغرب میں واقع ہیں (مثلاً مراکش و اندلس وغیرہ) وہاں اس وقت ظہر کا وقت آئے گا جب وہاں زوال ہوگا۔ اسی بنا پر اہل مشرق فجر، ظہر، عصر، مغرب مغربی ممالک کے رہنے والوں سے پہلے ادا کرتے ہیں کیونکہ ان کے یہاں سبب پہلے متحقق ہو جاتا ہے۔ بس اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کو سمجھا جائے کہ "چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور دیکھ کر افطار کرو"

اور حدیث نبوی "لا تصوموا حتی تروہ ولا تفطروا حتی تروہ" نے روزہ اور افطار

کے حکم کو ایک سبب سے وابستہ کر دیا ہے اور وہ رؤیت ہلال ہے۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مثلاً مکہ اور مدینہ میں چاند نظر آ گیا مگر اُس وقت کسی علاقہ میں دن ہو گا تو اُن کو اس وقت روزہ رکھنے کا حکم کس طرح دیا جا سکے گا۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اختلافِ مطالع کا اعتبار ضروری ہے۔ اور متعدد اہل علم نے اس پر اجماع نقل کیا ہے۔ (جیسا کہ آگے ذکر کیا جائے گا)

فقہائے تابعین کا فتویٰ:۔ ابن ابی شیبہ نے اپنی "المصنف" میں ترجمۃ الباب قائم کیا ہے "فی القوم یرون الھلال ولا یراہ الآخرون" (اُن لوگوں کے بارہ میں جن کو چاند نظر آ جائے اور دوسرے لوگ یعنی دوسرے علاقوں کے لوگ نہ دیکھیں، تو شریعت کا حکم کیا ہے) اس باب کے ذیل میں اپنی سند سے ابن ابی شیبہ نے یہ روایت نقل کی ہے۔

ذکروا بالمدینۃ رؤیۃ الھلال وقالوا إن اھل استارۃ قد رأوہ فقال القاسم وسالم مالنا ولاھل استارۃ۔

ایک دفعہ مدینہ میں رؤیت ہلال کے بارہ میں لوگوں میں بات چیت ہوئی کچھ لوگوں نے کہا کہ استارہ والوں نے چاند دیکھا ہے تو قاسم و سالم نے کہا کہ اہل استارہ کی رؤیت سے ہمارا کیا سروکار!

حنفیہ کے ائمہ کبار اور محققین کی تصریحات:۔

صاحب تجرید وغیرہ نے لکھا ہے کہ مطالع کے اختلاف کی وجہ سے چاند کے احکام میں فرق ہو جاتا ہے۔

مفتی ابو السعود "شرح مراقی الفلاح" میں لکھتے ہیں کہ صاحب تجرید نے جو لکھا ہے وہ زیادہ قرینِ صحت ہے کیونکہ سورج کی شعاعوں سے چاند کا جدا ہونا مختلف اقطارِ عالم کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے۔ یہ بات علم الافلاک اور ہیئت سے بھی ثابت ہے۔ اور کم سے کم وہ مسافت جس کی وجہ سے مطلع مختلف ہو جاتا ہے ایک مہینے کے سفر کی مسافت ہے۔ جیسا کہ الجواہر میں ہے۔ ملخصاً

اور تاتارخانیہ میں ہے کہ اگر ایک علاقہ کے لوگ چاند دیکھ لیں تو کیا اس کے مطابق عمل کرنا سارے علاقوں کے لوگوں کو لازم ہو جاتا ہے؟ اس بارہ میں ہمارے مشائخ کے اقوال مختلف ہیں۔ بعض حضرات کا قول ہے کہ لازم نہیں ہوتا اور ہر علاقہ کے لوگوں کے لیے اسی علاقہ کی رؤیت معتبر ہے۔

اور زیلعی شرح کنز میں ارقام فرماتے ہیں کہ ہمارے اکثر مشائخ کا قول یہ ہے کہ اختلاف مطالع معتبر نہیں ہے۔ مگر زیادہ صحیح یہ بات ہے کہ اختلاف مطالع کا اعتبار کیا جائے گا۔ اس لیے کہ ہر قوم اپنے حال کے لحاظ سے مخاطب ہے۔ اور چاند کا سورج کی شعاعوں سے جدا ہونا مختلف اقطار کے

اعتبار سے مختلف ہو جاتا ہے اور اس کی دلیل وہ حدیث ہے جو (امام مسلم وغیرہ نے) کریب سے روایت کی ہے۔ (جو صحیح مسلم کے حوالہ سے اوپر نقل کی جا چکی ہے)

اور "مختارات النوازل" میں ہے کہ ایک شہر والوں نے اپنے یہاں کی رؤیت کے حساب سے ۲۹ روزے رکھے اور دوسرے شہر و علاقہ کے لوگوں نے چاند دیکھ کر تیس روزے رکھے اور دونوں کا مطلع ایک ہے، تو اس صورت میں اول الذکر ایک دن کے روزے کی قضا رکھیں، اور اگر دونوں شہروں کا مطلع مختلف ہے تو پھر قضا واجب نہیں۔

ابن عابدین فرماتے ہیں "معلوم ہونا چاہیے کہ (فقہاء کے درمیان) اس واقعی حقیقت میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ دو شہروں اور دو علاقوں کے درمیان اتنا بُعد مسافت ہوتا ہے کہ ایک میں رؤیت ہو جائے اور دوسرے میں رؤیت نہ ہو۔ اسی طرح سورج کے مطالع کا حال ہے۔ چاند کا سورج کی شعاعوں سے دور ہونا مختلف علاقوں کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے۔ چنانچہ مشرق میں اگر زوال آفتاب ہو جائے تو ضروری نہیں کہ اس وقت مغرب میں بھی ہو جائے۔ اسی طرح طلوع فجر اور غروب آفتاب کا معاملہ ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جونہی سورج ایک درجہ حرکت میں آئے گا تو یہ کسی علاقہ میں صبح صادق کا وقت ہوگا اور کسی علاقہ کے لیے طلوع آفتاب کا وقت ہوگا کہیں غروب کا اور کہیں آدھی رات ہوگی۔ جیسا کہ زیلعی نے بیان کیا ہے اور اختلاف مطالع کے لیے ایک مہینہ یا اس سے زیادہ کا بعد مسافت ضروری ہے جیسا کہ قہستانی نے جواہر کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ (بہرحال اس واقعی حقیقت میں علماء اور فقہاء کے درمیان اختلاف نہیں ہے کہ علاقوں کے اختلاف اور بعد مسافت کے لحاظ سے رؤیت ہلال میں اختلاف ہوتا ہے کہ ایک علاقہ میں رؤیت ہو اور دوسرے میں نہ ہو۔) دراصل اختلاف اس میں ہے کہ روزہ وغیرہ کے شرعی حکم میں اس اختلاف مطالع کا اعتبار کیا جائے گا یا نہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر علاقے کے لوگوں پر اپنے ہی مطلع کی رؤیت کے احکام نافذ ہوں اور کسی کے لیے دوسروں کے مطلع کی رویت کے مطابق عمل کرنا لازم نہ ہو۔ یا ان دونوں کے اختلاف مطالع کا اعتبار ہی نہ کیا جائے بلکہ کسی علاقہ میں بھی اگر پہلے رؤیت ہو جائے تو سب کے لیے اسی کے مطابق عمل کرنا ضروری ہو۔ حتیٰ کہ مغرب میں اگر جمعہ کی رات کو چاند نظر آ جائے اور مشرق میں اس سے پہلے ہفتہ کی رات کو چاند دیکھا جائے تو مشرق والوں پر اہل مغرب کی رؤیت کے مطابق عمل کرنا واجب ہو۔ بعض لوگ پہلے نظریہ کے قائل ہیں امام زیلعی اور صاحب الفیض نے اسی کو

قابل اعتماد قرار دیا ہے، شوافع کے نزدیک یہی صحیح ہے اس لیے کہ ہر قوم اپنے حال کے مطابق شرعی احکام کی مخاطب ہے جیسا کہ اوقات نماز کا حال ہے۔ اور "غرر" میں اس کی تائید میں اُس مسئلہ کا حوالہ دیا ہے جو پہلے گزر چکا ہے کہ "وتر اور عشا کی نماز ایسے لوگوں پر واجب ہی نہیں جن کے لیے اُن کا وقت نہیں آتا۔"[1]

اور زیلعی شارح کنز نے لکھا ہے کہ اختلاف مطالع کا عدم اعتبار دراصل کم مسافت پر واقع علاقوں میں ہے، لیکن جن علاقوں کے درمیان بعدِ مسافت زیادہ ہو اُن میں اختلاف مطالع کا اعتبار ضروری ہے، اور یہی بات "تجرید القدوری" میں کہی ہے۔ اور جرجانی نے بھی یہی کہا ہے۔"

اور "مشکوٰۃ المصابیح" کی شرح "مرقاۃ المفاتیح" کے مصنف فرماتے ہیں کہ "اختلاف مطالع کے بارہ میں) زیلعی کا (مذکورہ بالا) قول تسلیم کرنا ناگزیر ہے، اگر اس کو تسلیم نہ کیا جائے (اور رؤیت ہلال کے بارہ میں اختلاف مطالع کے اثر انداز ہونے کا کلی طور پر انکار کیا جائے) تو لازم آئے گا کہ عید کہیں ۲۷ رمضان یا ۲۸ رمضان ہی کو کر لی جائے یا اس کے برعکس ۳۱ یا ۳۲ روزے رکھ کر عید ہو کیونکہ قسطنطنیہ کے علاقہ میں کبھی کبھی چاند ہمارے ہاں سے دو دن پہلے ہو جاتا ہے۔ تو اگر کبھی ایسا ہوا کہ ہم نے اپنے ہاں کی رؤیت کے حساب سے روزے رکھنے شروع کیے، پھر ہم کو قسطنطنیہ کی (دو دن پہلے کی) رؤیت کی خبر مل گئی تو اس کی بنا پر عید کو (ایک یا دو دن) مقدم کرنا پڑے گا، اسی طرح اس آدمی کی عید مؤخر ہو جائے گی جس نے قسطنطنیہ میں چاند دیکھ کر روزہ رکھنا شروع کیا اور عید سے پہلے ہمارے یہاں آگیا۔

نیز مرقاۃ المفاتیح میں ہے کہ محققینِ حنفیہ، مالکیہ اور عام شافعیہ کا قول ہے کہ اگر دو شہروں کے درمیان اتنا بعد مسافت ہے کہ ان کا مطلع مختلف نہیں ہے۔ جیسا کہ بغداد اور بصرہ تو ایک شہر کی رؤیت سے دوسرے شہر والوں پر روزے لازم ہو جائیں گے، اور اگر ان کے مابین اتنی دوری ہے

---

[1] ہماری اسی دنیا میں بعض علاقے ایسے ہیں جہاں غروبِ آفتاب کے بعد مغرب کی جانب میں افق پر شفق باقی رہتی ہے اور اس کے غائب ہونے کے ساتھ ہی مشرق میں صبح صادق نمودار ہو جاتی ہے، اس لیے وہاں عشا کا وقت ہی نہیں آتا، ایسی جگہ کے رہنے والوں پر عشا کی نماز فرض ہی نہ ہوگی، کیونکہ ہر نماز اپنا وقت آنے پر فرض ہوتی ہے۔ (الفرقان)

کہ مطالع مختلف ہیں جیسا کہ عراق اور حجاز میں ہے تو ہر شہر والے اپنے ہاں کی رؤیت کے مطابق عمل کریں گے۔

اور مولانا عبدالرحمان مبارک پوریؒ شارح جامع ترمذی لکھتے ہیں کہ "جن بلاد کے مطالع مختلف نہیں ہیں وہاں ایک شہر کی رویت دوسرے شہر والوں کے لیے لازم ہے۔ امام ابو حنیفہؒ سے ایک روایت یہی ہے۔

صاحب "بدائع" لکھتے ہیں "یہ اُس وقت ہے جب کہ مسافت اتنی ہو کہ مطلع مختلف نہ ہو اور اگر زیادہ بُعد ہو تو ایک بلدہ کی رؤیت کے احکام دوسرے بلدہ والوں پر لاگو نہیں ہوں گے۔ اس لیے کہ زیادہ بعد مسافت کی وجہ سے مطالع مختلف ہو جاتے ہیں جیسا کہ سورج کے غروب کا وقت مختلف ہوتا ہے تو ہر ایک کے لیے اُس کے اپنے وقت غروب کا اعتبار کیا جاتا ہے۔" انتہی

اور شیخ مرتضیٰ زبیدی شرح احیاء العلوم میں لکھتے ہیں۔ "مطالع کا مختلف ہونا ایک حقیقت ہے بلاد مشرقی میں رات پہلے آتی ہے اور غربی میں بعد کو۔ اگر دو شہروں کا مطلع ایک ہے تو ہر ایک کی رؤیت دوسرے کی رؤیت کو مستلزم ہے۔ اور اگر مطلع مختلف ہے تو مشرق کی رویت سے مغرب کی رُویت لازم ہے۔ مگر مغرب کی رویت سے مشرق کی رُویت لازم نہیں حدیث کریب کا مفاد بھی یہی ہے۔"

اور ابن عابدین شامی نے اپنے رسالہ "تنبیہ الغافل والوسنان علی احکام ہلال رمضان" میں یہ تصریح فرمائی ہے کہ

"معلوم ہونا چاہیے کہ چاند کے مطالع میں مختلف اقطار و بلاد کے لحاظ سے اختلاف ہوتا ہے پس کہیں چاند نظر آ جاتا ہے کہیں نہیں جس طرح سورج کے مطالع مختلف ہیں کہ کسی شہر میں سورج طلوع ہوتا ہے (یعنی صبح ہوتی ہے) تو دوسرے کسی شہر میں ابھی رات ہی ہوتی ہے۔ یہ باتیں کتب ہیئت میں محقق اور روزمرہ کا مشاہدہ ہیں۔

اور محقق ابن حجر مکی کے فتاویٰ میں ہے کہ "سبکی اور اسنوی نے تصریح کی ہے کہ مطالع جب مختلف ہوں تو مشرق میں واقع کسی شہر کی رُویت ہلال سے مغربی شہر کی رویت لازم ہے اس کے برعکس نہیں یعنی مغرب کی رویت سے مشرق میں رویت لازم نہیں ہوتی۔ کیونکہ مشرق میں رات پہلے آتی ہے ـــ اور اگر مطلع ایک ہی ہے تو ایک شہر کی رویت سے دوسرے شہر کی رویت لازم ہے۔

اسی لیے علماء کی ایک جماعت کا فتویٰ ہے کہ اگر دو بھائی زوال کے وقت فوت ہو جائیں ایک مشرق میں ہے اور دوسرا مغرب میں، تو مغربی، مشرقی کا وارث ہو گا اس لیے کہ مشرقی کی موت پہلے واقع ہوئی ہے، جب عام اوقات میں یہ بات محقق ہے تو چاند کے بارے میں بھی ایسا ہی سمجھ لیا جائے۔ نیز ایسا ہو سکتا ہے کہ مشرق میں چاند سورج کے نہایت قریب ہو اور سورج کی شعاعوں کی وجہ سے نظر نہ آسکے۔ مغرب میں سورج دیر سے غروب ہو گا تو اس اثنا میں چاند بھی سورج سے دور ہو چکا ہو گا اس لیے وہاں نظر آجائے گا (آگے لکھتے ہیں) چاند کا سورج کی شعاعوں سے دُور ہونا مختلف علاقوں کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے۔ مشرق میں سورج کا زوال ہو تو مغرب میں زوال لازم نہیں ہے۔ اسی طرح طلوع اور غروب کا معاملہ ہے۔ جب سورج ایک درجہ حرکت کرے گا تو یہ کسی علاقہ کے لیے صبح صادق ہو گی اور کسی دوسرے علاقوں کے لیے دن ہو چکا ہو گا اور کہیں غروب ہو گا اور کسی جگہ آدھی رات کا وقت"۔

نقل کیا جاتا ہے کہ فقیہ ابو موسیٰ ضریر مؤلف "المختصر" اسکندریہ آئے تو ان سے یہ مسئلہ دریافت کیا گیا کہ اگر ایک شخص منارۂ اسکندریہ پر چڑھ جائے اور وہ شہر والوں سے بعد تک سورج کو دیکھتا رہے تو کیا وہ افطار کر سکتا ہے؟ ابو موسیٰ نے جواب دیا "نہیں البتہ شہر والے افطار کر سکتے ہیں کہ ان کے لیے غروب ہو چکا ہے۔

اور شیخ بخیت المطیعی اپنے رسالہ ارشاد اہل الملۃ الی اثبات الاہلۃ" میں لکھتے ہیں۔

واضح رہے کہ مطالع کے مختلف ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں ہے کہ یہ مشاہدہ اور ثابت شدہ حقیقت ہے۔ دوسرے عام امور کی طرح اس بارے میں بھی شریعت کا حکم عقل کے مطابق ہے۔ دیکھیے شریعت نے کئی احکام کی بنا اختلافِ مطالع پر رکھی ہے۔ نماز اور حج کے اوقات ہی کو دیکھ لیجیے۔ حج میں اہل مکہ کے مطلع کا اعتبار کیا گیا ہے۔ میراث میں تقدم و تاخر کا اعتبار بھی اسی طور پر کیا گیا ہے کہ پہلے موت کس کو آئی ہے۔ یہ تمام مسائل متفق علیہ ہیں۔ اختلافِ مطالع کو حقیقت کے طور پر تسلیم کر لینے کے بعد البتہ اس میں اختلاف ہوا کہ رمضان و شوال کے چاند میں اس کا اعتبار کیا جائے یا نہ کیا جائے؟

(اس کے بعد فرماتے ہیں کہ) "واقع اور نفس الامر کو دیکھا جائے تو تم محسوس کرو گے کہ اختلافِ مطالع ایک ناقابلِ انکار بدیہی بات ہے اور مطالع کے اختلاف کی وجہ سے اوقات کا اختلاف ایک دیکھی بھالی حقیقت ہے۔ بعض ایسے علاقے ہیں جہاں کے باشندوں کے سامنے دو یا تین مہینے تک سورج رہتا ہے۔

اور جو کوئی وہاں جائے وہ اس کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اسی طرح یہ حقیقت معلوم و مسلم ہے کہ قطب کی سمت میں چھ مہینے سورج نکلا رہتا ہے اور چھ مہینے غائب رہتا ہے۔ تو کیا یہ ممکن ہے کہ جب اہل مصر نے اپنے ہاں کے غروب کے وقت رمضان کا چاند دیکھ لیا تو مذکورہ بالا مقامات کے باشندوں کو اہل مصر کی رویت کی وجہ سے روزہ رکھنے کا مکلف قرار دیا جائے۔ اسی طرح ہمارے اور امریکہ کے اوقات میں بھی بہت اختلاف ہے۔ کیا ہم انھیں اہل مصر کی رؤیت کی وجہ سے (جو مصر میں غروب کے وقت ہوگی) فوراً روزہ رکھنے کا مکلف قرار دے سکتے ہیں؟ نہیں۔ اس لیے کہ یہ وقت ان کے ہاں صبح صادق کے طلوع کا ہوگا یا سورج نکلنے کا۔ خلاصہ یہ ہے کہ اختلاف مطالع کا اعتبار نہ کرنا عقل اور نقل دونوں کے خلاف ہے۔"

یہ تمام تصریحات محققین ائمہ حنفیہ کی ہیں جن سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ان سب کے نزدیک اختلافِ مطالع کا اعتبار ضروری ہے یعنی ایک علاقے کی رویت دوسرے شہر کے لیے کافی نہیں۔ الا یہ کہ دونوں کا مطلع ایک ہو۔ پس کسی مغربی ملک میں اگر چاند نظر آ جائے جیسے "اندلس" والے دیکھ لیں، تو اُن کی رویت سے مشرق میں رویت لازم نہیں جیسے مکہ وغیرہ میں، اس لیے کہ سورج جب اُن کے افق سے گزر رہا تھا تو چاند ان کی شعاعوں میں چھپا ہوا تھا ان کے ہاں رؤیت ممکن ہی نہیں تھی۔ لیکن مغرب میں کچھ اور آگے بڑھنے سے چاند اس کی شعاعوں سے منفصل ہو جائے گا اور رویت ممکن ہو جائے گی اور پھر اس سے بھی آگے کے لیے چاند اور بھی نمایاں ہوتا چلا جائے گا اور اس کا الٹ نہیں ہوتا پس اگر مکہ مکرمہ میں چاند دیکھ لیا جائے تو اس کے مغرب میں ضرور دیکھا جائے گا بشرطیکہ کوئی مانع حائل نہ ہو۔

(اس مقام پر رسالہ کے مؤلف (شیخ عبداللہ بن حمید) نے "ہلال" کے معنی کے بارے میں لغوی بحث بھی کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ اس کے معنی ظاہر اور نمایاں ہونے کے ہیں اس لیے ازروئے لغت بھی نئے چاند کو ہلال اسی وقت کہا جائے گا جب وہ ظاہر ہو اور نظر آ جائے۔ اس لغوی بحث میں انھوں نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ وغیرہ کا کلام بھی نقل کیا ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں) اس سے واضح ہو گیا کہ ہلال میں ظہور اور نمایاں ہونے کے معنی ہیں۔ ظاہر اور نمایاں ہونے سے پہلے ہلال نہیں۔ پس اہل مشرق اہل مغرب کی رویت کی بنا پر نہ روزے رکھیں نہ افطار کریں۔ اس لیے کہ مشرق میں ہلال ہے ہی نہیں کیونکہ ان کے سامنے ظاہر نہیں ہوا۔

محققین مالکیہ کے اقوال:- ابن عبد البرؒ التمہید میں لکھتے ہیں۔ علماء کا اس پر اجماع ہے کہ بہت دور کے شہروں میں ایک دوسرے کی رؤیت کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ جیسا کہ خراسان اور اندلس کے درمیان دوری ہے۔ اس لیے کہ ہر علاقہ کا ایک مخصوص حکم ہے جو اسی سے مخصوص ہے جیسا کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ ہاں جو شہر قریب قریب ہیں اُن میں ایک کی رؤیت کافی ہو گی۔"

نیز انھوں نے کہا کہ "چاند کی خبر خواہ حاکم مجاز کے حکم کی ہو یا دو عادل گواہوں کے دیکھنے کی ہو یا کسی بڑی جماعت کے دیکھنے کی، بہر صورت قریبی بلاد ہی کے لیے معتبر ہے بہت دور کے لیے نہیں۔ ابن عرفہ نے بھی اسی قول کو پسند کیا ہے۔

اور ابن البناء کہتے ہیں "میرے والد نے ابو محمد بن الفاسیؒ کے بارہ میں بتلایا کہ ان سے یہ سوال کیا گیا کہ کیا اسکندریہ کی رؤیت سے ہم روزے رکھیں؟ انھوں نے جواب دیا" نہیں" قریب کی رویت کی وجہ سے تو روزے رکھے جائیں، دور کی رؤیت سے نہیں۔ اور محمد بن سابق کا قول ہے کہ اہل قیروان کہ اور مدینہ اور ان کے جیسے دیگر دور کے شہروں کی رویت سے روزے نہ رکھیں، یہ مسئلہ اجماعی ہے۔ نیز ابن البنا کہتے ہیں کہ غسانی اور حربی ابن عباس کی مذکورۂ بالا حدیث میں یہ الفاظ زیادہ ذکر کرتے ہیں کہ اہل نجد نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی کہ ہمارے یہاں مدینہ سے ایک دن پہلے رؤیت ہوئی ہے تو آپ نے فرمایا" ہر شہر والوں کے لیے انھیں کی رؤیت ہے۔"

اور شیخ محمد بن عبد الوہاب بن عبد الرزاق "خلاصہ العذب الزلال فی مباحث رؤیۃ الہلال" میں یہ تصریح کرتے ہیں کہ ابن رشد نے "ہدایہ" میں کہا ہے کہ علماء کا اس پر اجماع ہے کہ ایک دوسرے سے بہت دوری پر واقع علاقوں میں جیسے کہ اندلس اور حجاز، اس کی رعایت نہ کی جائے (یعنی ایک جگہ کی رؤیت کے مطابق دوسری جگہ والوں پر عمل کرنا لازم نہ کیا جائے۔)

اور ابن جزی "القوانین" میں لکھتے ہیں کہ "امام شافعی کے نزدیک ایک شہر والوں کی رؤیت سے دوسرے شہر والوں پر حکم نافذ ہو جائے گا۔ ابن ماجشون اس کے خلاف ہیں، البتہ دور دراز مسافت پر واقع شہروں میں اس کا اعتبار نہ ہوگا۔ جیسا کہ اندلس اور حجاز۔"

ابن البناء کہتے ہیں کہ "محمد بن نسیم نے کتاب المواقیت میں کہا ہے کہ اس بارے میں علماء کے درمیان اختلاف نہیں کہ بُعدِ مسافت کا اعتبار کیا جائے ـــــ جو شخص علی الاطلاق ایک جگہ

کی رؤیت کا حکم سب کے لیے ثابت کر دیتا ہے اور مسافت کے قرب و بعد میں فرق نہیں کرتا وہ غلط تعلیم دے رہا ہے اور اس کا یہ فیصلہ چاند کے وجود سے متعلق حکمت الٰہی سے ناواقفیت کا نتیجہ بھی ہے اور انسانوں کے لیے اللہ کے احکام کے مخالف بھی۔

نیز بدایۃ المجتہد میں ابن رشد لکھتے ہیں کیا کسی شہر والوں پر لازم ہے کہ دوسرے شہر والوں کی رویت پر عمل کریں یا ہر شہر میں الگ الگ رویت کا حکم ہے؟ اس میں امام مالک کے فتوے کے بارہ میں اختلاف ہے ابن القاسم اور مصر والے امام مالکؒ سے روایت کرتے ہیں کہ جب کسی شہر والوں کو معلوم ہو جائے کہ فلاں شہر میں چاند دیکھا گیا تھا اور انھوں نے اس دن روزہ نہیں رکھا تو یہ ایک دن کا روزہ قضا کریں۔ امام شافعی اور امام احمد نے بھی یہی کہا ہے اور اہل مدینہ امام مالک سے روایت کرتے ہیں کہ چاند دیکھنے کی خبر سے دوسروں پر رویت کا حکم لازم نہیں ہوتا الّا یہ کہ "امام" لوگوں کو اس کا حکم دے۔ اصحاب مالک میں سے ابن ماجشون اور مغیرہ کا بھی یہی مذہب ہے۔ اور ان سب کا اس پر اجماع ہے کہ بہت دوری پر واقع علاقوں میں ایک دوسرے کی رؤیت کی رعایت نہیں کی جائے گی جیسا کہ اندلس اور حجاز میں۔ انتہی۔

امام قرطبیؒ تفسیر میں لکھتے ہیں۔۔۔۔ "کسی شخص نے خبر دی کہ فلاں شہر میں چاند نظر آگیا، یا تو وہ شہر قریب ہوگا یا دور اگر قریب ہے تو حکم ایک ہی ہے اور اگر دور ہے تو ہر شہر کے لیے ان کی اپنی رؤیت کا اعتبار ہے۔"

عکرمہؒ، سالمؒ، قاسمؒ سے بھی یوں ہی مروی ہے۔ ابن عباسؓ نے بھی ایسا ہی کہا ہے۔ اسحٰق بن راہویہ کا مسلک بھی یہی ہے۔ امام بخاریؒ نے بھی اپنی صحیح کے باب "لا ھل کل بلد رؤیتھم" میں اسی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ ابن عباسؓ کے مقولہ ھکذا امرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وضاحت کرتے ہوئے قرطبیؒ فرماتے ہیں۔

"ہمارے علماء نے کہا ہے کہ ابن عباسؓ نے یہ کہہ کر تصریح کر دی ہے کہ یہ مرفوع حدیث ہے۔ اور یہ دلیل ہے اس بات پر کہ شام اور حجاز جتنے دور کے علاقوں میں ہر شہر والے اپنی اپنی رؤیت پر عمل کریں الا یہ کہ مسلمانوں کا امام اعظم (خلیفۃ المسلمین) لوگوں کو دوسرے علاقہ کی رؤیت ماننے کا حکم دے تو اس کی مخالفت جائز نہیں ہے۔"

اور ابن العربی نے لکھا ہے کہ ابن عباسؓ کے اس قول کی توجیہ میں اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ کریب کی بات کو اسلیے قبول نہیں کیا کہ یہ خبرِ احاد تھی بعض کہتے ہیں اس لیے رد کیا کہ دونوں علاقوں میں اختلاف مطالع کا تھا اور یہی صحیح ہے۔ اس لیے کہ کریب نے گواہی روایت نہیں کی بلکہ شہادت پر مبنی ایک فیصلے کی خبر دی ہے۔ اور بلا اختلاف خبرِ ایک فرد کی بھی مقبول ہے۔ اس کی ایک نظیر یہ بھی ہے کہ "اغمات" میں جمعہ کی رات کو چاند نظر آجائے اور اشبیلیہ میں ہفتہ کی رات کو تو ہر ایک کی رویت ان کے اپنے لیے ہوگی۔ اس لیے کہ سہیل ستارہ اغمات میں منکشف ہوتا ہے اشبیلیہ میں نہیں معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کا مطلع مختلف ہے۔

اور خلاصۃ العذب الزلال میں ہے کہ۔ قرافی نے "الفروق" میں کہا ہے کہ چاند کی رویت میں اختلاف اس لیے ہو جاتا ہے کہ مشرقی بلاد میں چاند شعاعوں میں ہوتا ہے۔ جوں جوں سورج مغرب میں جائے گا چاند شعاعوں سے نکل جائے گا اور اہل مغرب اسے دیکھ لیں گے۔ اہل مشرق اسے پھر دوسری رات دیکھ سکیں گے۔ یہ ایک بدیہی بات ہے۔ رویتِ ہلال میں اختلاف کا یہ ایک سبب ہے۔ اور بھی اسباب ہوتے ہیں جیسا کہ علم ہیئت میں مذکور ہے۔ (انتہی)

نیز کہا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ اختلاف مطالع کا اعتبار کیا جائے۔ جو لوگ اعتبار نہیں کرتے ان کی انھوں نے سختی سے تغلیط کی ہے۔

قرافی "الفروق" میں مزید لکھتے ہیں: یہ بات متفق علیہ ہے کہ آفاق کے اختلاف سے نماز کے اوقات میں اختلاف ہوتا ہے۔ ہر قوم کے لیے ان کی اپنی صبح صادق اور ان کے زوال کا اعتبار ہے۔ اسی طرح چاند کے بارہ میں بھی ہونا چاہیے اس لیے کہ مشرقی بلاد میں جب چاند شعاعوں میں ہوتا ہے اور سورج چاند کے ساتھ مغربی جہت میں حرکت پذیر ہوتا ہے تو اس وقت سورج کے افق مغرب تک پہنچتے ہی چاند شعاعوں سے نکل جاتا ہے پس اسے اہل مغرب دیکھ لیتے ہیں اور اہل مشرق نہیں دیکھ پاتے۔ یہ بھی اختلاف مطالع کے اعتبار کے اسباب میں سے ایک سبب ہے اس کے علاوہ اور بھی اسباب ہیں جو علم ہیئت میں مذکور ہیں جن کا ذکر یہاں غیر ضروری ہے۔ یہاں میں نے وہی سبب بیان کیا ہے جو قریب الفہم ہے۔ جب یہ بات ہے کہ چاند آفاق کے مختلف ہونے کے ساتھ طلوع و غروب میں مختلف ہو جاتا ہے تو ہر علاقہ کے لیے اس کی اپنی ہی رویت معتبر ہوگی۔ جس طرح ہر قوم کی اپنی فجر اور دیگر

اوقات نماز ہیں۔ یہی بات صحیح اور صواب ہے اور ایک جگہ کی رویت سے تمام اقالیم میں روزوں کو ضروری قرار دینا قواعد اور ادلہ کی رو سے صحیح نہیں ہے۔

ابن الماجشون نے کہا۔ "شہادت کی بنا پر حکم اس شہر والوں کے لیے ہوگا جس میں شہادت ہوئی الآیہ کہ سلطانِ اسلام کے ہاں شہادت متحقق ہوا اور وہ تمام لوگوں پر حکم لازم کر دے تو سب پر حکم ثابت ہو جائے گا کیونکہ اس کے حق میں تمام بلاد ایک بلد کے حکم میں ہیں کہ اس کا حکم کل بلاد میں نافذ ہے۔"
(بحوالہ عون المعبود شرح السنن لابی داؤد)

یہ مالکی ائمہ محققین کے اقوال ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر شہر کے لیے وہیں کی رؤیت کا اعتبار ہے جب کہ دونوں میں بُعد مسافت ہو۔ جیسا کہ کُریب مولیٰ ابن عباس کی حدیث دلالت کرتی ہے۔ اور ابن عباسؓ کا یہ فرمانا کہ "ابھی کہ ہم روزے چاند دیکھ کر ہی رکھیں گے یا پھر تیس دن کی گنتی پوری کریں گے۔ اسی طرح ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے۔" اس میں صراحت ہے کہ اہل مدینہ اہل شام کی رویت پر عمل نہیں کرتے کیونکہ اُن کے درمیان مسافت بعیدہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے۔ "چاند دیکھ کر روزہ رکھو۔ دیکھ کر افطار کرو۔" اسی طرح آپؐ نے فرمایا: "نہ روزہ رکھو حتی کہ چاند دیکھ لو اور نہ افطار کرو یہاں تک کہ دیکھ لو۔" یہ بھی صریح ہے کہ روزہ اور افطار تب واجب ہوں گے جب کہ ان کا سبب (چاند کو دیکھنا) ثابت ہو جائے۔ نماز کے اوقات اس کی نظیر ہیں۔ صبح کی نماز صبح صادق کے وقت ہوگی، ظہر زوالِ آفتاب کے بعد۔ عصر اُس وقت جب ہر چیز کا سایہ اس کے مثل ہو جائے۔ مغرب جب سورج غروب ہو جائے اور عشاء جب سرخ شفق غائب ہو جائے یہ نماز کے مقررہ اوقات ہیں تو کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب مدینہ یا مکہ میں نماز کا وقت ہو جائے تو تمام بلاد میں یہ حکم ثابت ہو جائے گا؟ کوئی بھی مسلمان ایسا نہیں کہتا۔ بس چاند کا حکم بھی اسی طرح ہے۔ ہر شہر والوں کے لیے ان کی رویت ہے۔ بالخصوص جب کہ دو شہروں میں اتنی دوری ہو کہ ایک میں رؤیت ہو جائے تو دوسرے شہر والوں کے لیے چاند دیکھنا ممکن ہی نہ ہو۔ یہ ایک واضح بات ہے جسے علماء نے ثابت کیا ہے۔ جیسا کہ تفصیل سے ذکر کیا جا چکا ہے۔

شوافع علمائے محققین کے اقوال:۔

امام نوویؒ شرح المہذب میں لکھتے ہیں "جب ایک شہر میں رمضان کا چاند دیکھ لیا جائے اور

دوسرے کسی شہر میں نظر نہ آئے تو دونوں اگر قریب قریب ہیں تو ایک شہر کے حکم میں ہوں گے۔ بلا اختلاف دوسرے شہر والوں پر روزہ واجب ہوگا اور اگر ان دونوں شہروں کے درمیان بُعدِ مسافت ہے تو اس صورت میں (علماء شوافع کے) دو مشہور قول ہیں ایک یہ کہ ایک شہر کی رؤیت سے دوسرے شہر والوں پر روزہ واجب نہیں ہوگا۔ المہذب کے مصنف (ابو اسحاق شیرازی) اور شیخ ابو حامد اور بندنیجی اور دوسرے حضرات کا یہی فیصلہ ہے اور العبدری، الرافعی اور اکثریت نے اسی کو صحیح قرار دیا ہے۔ اور یہی نظریہ درست ہے اس لیے کہ اگر شہر دور دور ہیں تو ہر ایک کی رویت ان کے اپنے لیے ہی ہے۔ کیونکہ مختلف بلاد میں طلوع و غروب کے اوقات مختلف ہوتے ہیں۔ ہر قوم اپنے طلوع و غروب کے احکام کی مخاطب ہے۔ دیکھیے فجر کا طلوع ایک علاقہ میں پہلے ہوتا ہے اور کسی جگہ بعد میں تو وہاں کے ساکنین کے لیے اسی علاقہ کا طلوع و غروب معتبر ہوتا ہے۔ اسی طرح چاند کا معاملہ ہے۔ انتہی۔

اور ابن المنذر نے یہ نظریہ (رویت ہلال میں اختلاف مطالع کا اعتبار کیا جانا) عکرمہ، قاسم، سالم، اسحٰق بن راہویہ سے نقل کیا ہے۔ اور امام ترمذی نے عامہ اہل العلم کا یہی فیصلہ بتایا ہے اور دوسرا کوئی مسلک بیان نہیں کیا۔

اہلِ عراق، صیدلانی اور دوسرے شوافع کہتے ہیں کہ اس مسئلہ میں جس دوری کا اعتبار ہے وہ یہ ہے کہ مطالع مختلف ہوں۔ جس طرح حجاز، عراق اور خراسان کے مطالع مختلف ہیں، اور قریب ہونا یہ ہے کہ مطلع مختلف نہ ہو جس طرح بغداد، کوفہ، رے اور قزوین کا حال ہے۔ امام نوویؒ نے تحفۃ المنہاج اور شرح المہذب میں اسی کو صحیح کہا ہے۔

اور رملی نہایۃ المحتاج شرح المنہاج میں لکھتے ہیں کہ جب ایک شہر میں چاند دیکھ لیا جائے تو اس کے قریبی شہر میں حکم نافذ ہو جائے گا جس طرح بغداد و کوفہ ہیں کہ یہ دونوں ایک بلد کے حکم میں ہیں۔ دور کے شہروں میں حکم نافذ نہ ہوگا جیسا کہ حجاز اور عراق کے علاقوں میں دوری ہے۔ صحیح تر بات یہی ہے اور دوسرا خیال یہ ہے کہ دور کے شہروں میں بھی حکم نافذ ہوگا اور اس کا معیار ان کے نزدیک مسافتِ قصر ہے۔ مصنف (نوویؒ) نے شرح مسلم میں اسی کو صحیح کہا ہے اس لیے کہ شریعت کے بہت سے احکام اس سے متعلق ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ بُعد کا معیار مطالع کا مختلف ہونا ہے۔

میں کہتا ہوں اور یہی زیادہ صحیح ہے (واللہ اعلم) کیونکہ چاند کے مسائل کا مسافت قصر سے کوئی تعلق

نہیں۔ نیز اس لیے بھی کہ کُریب کی روایت میں ہے کہ میں نے شام میں چاند دیکھا پھر میں مدینہ آیا۔ تو ابن عباسؓ نے کہا تم نے چاند کب دیکھا ہے؟ میں نے کہا جمعہ کی رات کو، انھوں نے کہا کہ ہم نے ہفتہ کی رات کو چاند دیکھا ہے، ہم اس کے مطابق روزے رکھ کر گنتی پوری کریں گے، میں نے کہا کیا آپ حضرت معاویہؓ کی رؤیت اور ان کے روزہ رکھنے پر اکتفا نہ کریں گے؟ فرمایا "نہیں"، ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی حکم ہے۔ نیز طلوع صبح صادق اور آفتاب کے طلوع و غروب پر قیاس کا تقاضا بھی یہی ہے۔ اور اختلافِ مطالع کی وجہ سے مناظر کائنات میں اختلاف رونما ہوتا ہے اس لیے بھی اس کا اعتبار کرنا زیادہ قرین قیاس ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ مطالع کے اعتبار میں منجمین کے فیصلوں اور علم الحساب پر اعتماد کرنا پڑے گا حالانکہ ان کے اقوال کا شرعیات میں کوئی اعتبار نہیں ہے۔؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اصول اور امورِ عامہ میں ان کے عدمِ اعتبار سے یہ لازم نہیں کہ فروع اور خاص معاملات میں بھی ان کا اعتبار نہ کیا جائے۔ اگر بالفرض منجمین اور اہل حساب کو دو علاقوں کے مطلع کے مختلف ہونے نہ ہونے میں شک ہو تو یہی مانا جائے گا کہ ان کا مطلع مختلف ہے اس لیے ایک کی رویت کی بنا پر دوسرے شہر والوں کو روزہ کا حکم نہ دیا جائے گا کیونکہ اس کی بنیاد مطلع کی وحدت پر ہے اور وہ ثابت نہیں ہو سکی۔ ہاں اگر اتفاق ہو جائے کہ فلاں اور فلاں شہر کا مطلع ایک ہے تو ایک کی رؤیت سے دوسرے میں رویت کا فیصلہ کرنا لازمی ہو گا۔

تاج تبریزی نے کہا ہے کہ اختلافِ مطلع چوبیس فرسخ (۷۲ میل) سے کم میں ممکن نہیں ہے۔ والدؒ نے یہی فتویٰ دیا ہے۔

سُبکیؒ نے بھی یہی فرمایا کہ اختلافِ مطلع کی صورت میں مشرقی شہر میں چاند نظر آ جائے تو مغربی شہر میں چاند ضرور نظر آئے گا۔ اس کا الٹ ضروری نہیں ہے۔ سُبکی نے اس مسئلہ پر طویل بحث کی ہے۔ اسنوی اور دیگر علماء بھی اس کے مؤید ہیں۔ مگر یہ اصول وہاں ہے جہاں بلاد کی جہت اور عرض میں اتحاد ہو۔ اسی وجہ سے دو شخص جو ایک دوسرے کے وارث ہیں ایک مشرق میں رہتا ہے اور دوسرا مغرب میں اور اپنی اپنی جگہ وہ زوال کے وقت مر جاتے ہیں، تو مغربی، مشرقی کا وارث ہو گا اس لیے کہ اس کے شہر کا زوال بعد میں ہوا ہے۔ انتہی۔

شیخ علی بن عبدالکافی السبکی اپنی کتاب العلم المنشور فی اثبات الشہور میں تصریح کرتے ہیں کہ ایک شہر میں چاند دیکھ کر، تمام دنیا کے بلاد میں اس کے مطابق عمل کو لازم قرار دینا بہت کمزور بات ہے۔ اس لیے کہ حضرت عمرؓ اور دوسرے خلفائے راشدین سے یہ منقول نہیں کہ وہ چاند دیکھ کر دوسرے علاقوں میں چاند کی اطلاع بھیجتے تھے، اگر یہ لازم ہوتا تو وہ ضرور ایسا کرتے کیونکہ وہ دینی امور کا زیادہ اہتمام رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں ہم دیکھتے ہیں کہ بعض بلاد میں چاند ایسے وقت میں نظر آتا ہے کہ دوسرے بلاد میں دیکھنا ممکن ہی نہیں ہوتا جیسا کہ ہمیں یہ قطعی علم ہے کہ سورج بعض جگہ پہلے غروب ہو جاتا ہے یہی حال طلوع، زوال، فجر اور غیبوبتِ شفق کا ہے جب سورج حرکت میں آتا ہے تو کسی جگہ کے لوگوں کے لیے صبح بنتی ہے، کہیں زوال ہوتا ہے اور کہیں غروب، تو ہر قوم کے لیے نماز میں ان کا اپنا غروب، طلوع اور زوال معتبر ہے اسی پر چاند کو قیاس کر لیا جائے۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے ہر قوم کو ان کے اپنے حالات کے مطابق مکلف بنایا ہے۔

حضرت عکرمہؒ، قاسمؒ، سالمؒ، اسحاقؒ بن راہویہ اور عبداللہ ابن المبارکؒ سے منقول ہے کہ ہر شہر والوں کے لیے ان کی اپنی روایت کا اعتبار ہوگا۔ شیخ علی بن عبدالکافی سبکی نے مزید کہا کہ امام بخاری نے یہ باب باندھا ہے "باب لکل بلد رؤیتھم" لیکن میں نے (رسالہ کے مؤلف شیخ عبداللہ بن حمید نے) صحیح بخاری کے مختلف طبع کے نسخے اور مخطوطے دیکھے مگر مجھے یہ باب نہیں مل سکا۔ قرطبی نے بھی بخاری کے اس باب کا ذکر کیا ہے جیسا کہ مالکیوں کے اقوال کے ذیل میں قرطبی کی تفسیر کے حوالہ سے ہم نقل کر چکے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ شیخ سبکیؒ اور قرطبیؒ کے صحیح بخاری کے نسخوں میں یہ باب موجود ہو، یا پھر شیخ سبکی نے قرطبی کی تقلید کی ہو۔

ہاں! تو ایک جگہ چاند دیکھ کر تمام بلاد میں رویت کا حکم لگانا اس بات پر مبنی ہے کہ زمین مسطح ہے جیسا کہ رافعی نے شرح الوجیز میں کہا (ص ۱، ۲جز ساد س) اور یہ نظریہ ہئیت کے ماہرین کے متفقہ فیصلے کی رو سے غلط ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ زمین کروی ہے اور جس چیز کی بنیاد غلط ہو وہ خود بھی غلط ہے۔

شوافع میں ہمارے پیش کردہ موقف کے قائلین میں امام الحرمین، غزالی اور امام بغویؒ بھی ہیں اور رافعی نے بھی اپنی شرح صغیر اور المحرر میں اسے ہی صحیح قرار دیا ہے۔ نیز رافعی نے "حاشیہ

اقناع" میں بھی لکھا ہے کہ چاند کی رویت اُس کے نہ دیکھنے والوں کے حق میں بھی ثابت ہو جائے گی جب کہ مطلع ایک ہو یعنی سورج اور ستاروں کا طلوع و غروب دونوں شہروں میں ایک وقت میں ہو، لیکن اگر ایک شہر میں طلوع و غروب پہلے ہوتا ہے دوسرے میں بعد کو (یعنی دونوں کے طلوع و غروب میں معتد بہ فرق میں) تو چاند نہ دیکھنے والوں پر رویت کا حکم لاگو نہ ہو گا، اور اس کا دار مدار طولِ بلد اور عرضِ بلد پر ہے۔ مسافت قریب ہو یا بعید۔

ہاں بلادِ شرقی میں اگر رویت ہوئی ہے تو بلادِ غربیہ میں ضرور ہونی چاہیے اس کا برعکس نہیں مثلاً مکہ مکرمہ اور مصر کو لیجیے اگر مکہ میں چاند نظر آگیا تو مصر میں لازماً نظر آئے گا مگر مصر میں نظر آنے سے لازم نہیں کہ مکہ میں بھی نظر آجائے۔"

امام نوویؒ کریب والی (مذکورہ بالا) حدیث پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اگر ایک شہر میں چاند دیکھ لیں تو اس کا حکم دور کے شہر والوں کے لیے ثابت نہیں ہو گا۔ ہمارے بعض اصحاب (یعنی بعض علماء شافعیہ) کہتے ہیں کہ ایک جگہ کی رویت کا حکم تمام دنیا والوں کو حاوی ہو گا۔ وہ کہتے ہیں کہ ابن عباسؓ نے کریب کی خبر پر عمل اس لیے نہیں کیا تھا کہ ایک آدمی کی شہادت ثبوت کے لیے کافی نہیں ہوتی لیکن ظاہر حدیث سے یہ واضح ہے کہ ابن عباسؓ نے کریب کی بات کو اس لیے رد نہیں کیا کہ وہ ایک آدمی کی شہادت ہے بلکہ اس بنا پر رد کیا کہ دور والوں کے لیے رؤیت کا حکم ثابت نہیں ہوتا۔

شوافع کے اقوال اس بارے میں بکثرت ملتے ہیں ان کا استقصاء کر کے ہم طوالت نہیں کرنا چاہتے۔ بہرحال اختلافِ مطالع کی صورت میں اقوالِ ائمۂ حنفیہ، مالکیہ اور شافعیہ سے ثابت ہو گیا کہ ایک علاقہ کی رویت سے دوسرے علاقہ والوں کے لیے رؤیت کا حکم لازم نہیں ہو گا۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ بھی مطالع کے مختلف ہونے پر اہل معرفت کا اتفاق نقل کر چکے ہیں۔ ان حالات میں یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ ایک بلد میں رویت ہونے سے دنیا کے تمام مسلمانوں پر روزہ اور افطار لازم ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصریحات بھی اسی امر پر دال ہیں کہ ایک شہر کی رؤیت وہیں کے باشندوں کے لیے ہے اور صحابہ کرامؓ و تابعینؒ کا عمل بھی اسی پر رہا ہے۔ ان میں سے کسی سے بھی یہ منقول نہیں کہ انھوں نے چاند دیکھ کر دوسرے علاقوں کو لکھا ہو کہ ہونے

چاند دیکھ لیا ہے لہذا تم ایک دن کی قضا کرو ـــــ اگر کبھی ایسا ہوا ہوتا تو اس مسئلہ کی عمومیت اور اہمیت کا تقاضا تھا کہ ضرور یہ نقل ہو کر ہم تک پہنچتا۔ لہذا معلوم ہوا کہ اوقات سے متعلق دوسرے مسائل کی طرح اس میں بھی ہر علاقہ کے لوگ اپنی ہی رویت کا اعتبار کرتے تھے۔

(باقی)

نئی مطبوعات

مذہب اور جدید ذہن از ڈاکٹر مشیر الحق
صفحات ۱۳۰ (۲۲ × ۱۸ / ۸ × ۱) کتابت طباعت اور کاغذ متوسط
مجلد قیمت ۵۰/۷

مسلمان اور سیکولر ہندوستان از ڈاکٹر مشیر الحق
صفحات ۱۸۰ (۲۲ × ۱۸ / ۸ × ۱) مجلد قیمت ۷/
دونوں کے ناشر:- مکتبہ جامعہ لمٹیڈ۔ نئی دہلی

پہلی کتاب مصنف کے ۹ مضامین کا مجموعہ ہے۔ مذہب[۱] اور جدید ذہن۔ فتاوی[۲] اور عصری مسائل۔ شاہ عبدالعزیز کے فتاوائے دارالحرب[۳] کا سماجی پس منظر۔ مسلم[۴] پرسنل لا اور ہندوستانی عدالتیں۔ پاکستان[۵] اور قانون شریعت۔ ملایا[۶] میں قانون شریعت۔ "پیش لفظ" کو بھی شامل کر لیا جائے جو واقعہ میں ایک مضمون ہی ہے، تو یہ تعداد سات ہو جاتی ہے۔

یہ مضامین گو متفرق طور پر اور مختلف اوقات میں لکھے گئے اور ہر ایک کا اپنا الگ موضوع ہے۔ مگر مذہب اسلام کے بارے میں جدید ذہن کا تعارف اور مذہبی مسائل میں اس کے طرز فکر کی ترجمانی، یہ ان سب میں قدر مشترک ہے۔ اور یہی اس مجموعہ کی اشاعت سے مصنف کا مقصد ہے۔

مصنف کی اصل تعلیم ندوی ہے، اگرچہ ناکمل۔ پھر عرصہ تک اپنے استاذ مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ندوی کے ساتھ ادارۂ تعلیمات اسلام لکھنؤ میں ایک آسان اردو نصاب کے ذریعہ عربی کی مختصر تعلیم، خاص طور پر جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو، دینے کے تجربے میں شریک رہے۔ اس کے بعد جامعہ ملیہ سے

انھوں نے بی۔اے کیا اور پھر کناڈا کی میکگل یونیورسٹی سے سندِ فضیلت لیکر انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ اسٹڈیز (شملہ) سے وابستہ ہو گئے۔ آجکل مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے سنٹر آف ویسٹ ایشین اسٹڈیز میں ہیں۔

کچھ دوستانہ سے اُنس و تعلق کی بنا پر، تبصرہ نگار کو خوشی ہے کہ مشیر صاحب نے ایک بامقصد زندگی اپنائی ہے اور اللہ تعالیٰ نے انھیں اس میں سہولت کے مواقع بھی عطا کر دیے ہیں۔ اُن کا یہ مجموعہ مضامین اسی مقصدی زندگی کا مظہر ہے کہ وہ دین و ملت کے لیے سوچتے اور جس بات کو مفید جانتے ہیں اسے دوسروں تک پہنچانے کی فکر کرتے ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ تبصرہ کی دیانت یہ رائے ظاہر کرنے پر مجبور کرتی ہے کہ جس "جدید ذہن" کی ترجمانی انھوں نے اس کتاب میں کی ہے اُس کا کیس، اس ترجمانی کی روشنی میں کچھ مضبوط نہیں ہے۔ اُن کا "جدید ذہن" اصطلاحی "علماء" اور "غیر علماء" کا فرق مٹا کر اُن تمام "اہل علم" کے لیے اجتہاد اور کتاب و سنت کی تشریح کا حق مانگتا ہے جو دینی علوم پر نظر رکھتے ہیں۔ خواہ وہ مدارس کی تعلیم کے ذریعہ ہو، خواہ ذاتی مطالعہ کی بنیاد پر اور خواہ کسی یونیورسٹی میں اسلامیات کے اعلیٰ نصاب کی تکمیل کر کے۔ دوسری بات وہ یہ کہتا ہے کہ ماضی میں جو تشریح کتاب و سنت کی ہو چکی (جس میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح کتاب بھی شامل ہے) وہ حرف آخر نہیں ہے۔ ان تشریحات کا تعلق زمانے سے تھا اور زمانے کی تبدیلی کے ساتھ ان میں لازماً تبدیلی آئے گی۔

مختصراً یہ دو مطالبے یا فکری نقطے ہوئے (۱) مذہبی علوم کی تحصیل کے کسی خاص طریقے کی قید کے بغیر ہر "صاحب علم" کے لیے مذہبی احکام کی تشریح اور اجتہاد کا حق ——— (۲) اس حق کی یہ وسعت کہ ماضی میں کی گئی کوئی تشریح یا اجتہادی فیصلہ (حتیٰ کہ پیغمبر علیہ السلام، کی تشریحات اور فیصلے بھی) اس سے باہر نہ سمجھے جائیں۔

۱ کی دلیل یہ ہے کہ لفظ علماء کا جو خاص مفہوم آج رائج ہے وہ بعد کے زمانے کی پیداوار ہے؛ ورنہ صدر اول میں اس کے خاص قیود کا کوئی وجود نہیں تھا، علیٰ ہذا کوئی عقلی اور منطقی دلیل ان قیود کو حق بجانب نہیں ٹھیراتی۔ یہ ایک طرح سے عیسائی چرچ کا تصور ہے جو اسلام میں قائم کر دیا گیا ہے جبکہ اسلام اس تصور سے بالکل بری ہے۔

۲ کے سلسلے میں کہا گیا ہے کہ آنحضرت پر ختم نبوت اور قرآن پر انقطاع وحی کے اسلامی عقیدہ و اعلان

کا راز ہی یہ ہے کہ اُس وقت (چھٹی صدی عیسوی میں) نوعِ انسانی اپنے قدموں پر کھڑے ہونے اور کسی مخصوص فرد کی رہنمائی کے بغیر اپنا راستہ مرضیٔ الٰہی کی روشنی میں خود تلاش کر لینے کے قابل ہو چکی تھی۔ اس لیے بعد کے لوگوں کی تشریحات اور فقہی اجتہادات تو درکنار خود نبوی تشریح (سنت) کو بھی خاص زمانِ نبوت کے پس منظر میں دیکھا جائے گا اور ایک نئے زمانے میں اس کا مفہوم اُس زمانے کے مسلمان از سرِ نو متعین کرنے یا بالفاظ دگر، قرآنی ہدایات و احکام کی تشریح اپنے حالات کے تقاضوں کے پیشِ نظر خود ہی کرنے میں حق بجانب ہوں گے! — کہا گیا ہے کہ ماضی کی تشریحات کو حرفِ آخر قرار دینے کی ذہنیت عین "ما وجدنا علیہ اٰبائنا" کی وہ ذہنیت ہے جو ہر نئے نبی کے مقابلے میں آکر کھڑی ہو جاتی تھی۔ حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس سے سابقہ پیش آیا تو قرآن کے مطابق "انھیں یہ جواب نہیں دیا گیا کہ اُن کے آباء اجداد غلط راستہ پر تھے" بلکہ غلطی، بعد والوں کی داخل کردہ اس روایت میں بتائی گئی کہ ہمارا طریق ناقابل ترمیم ہے۔ بعض صورتوں میں کبھی اسی حقیقت کو ظاہر کیا گیا ہے کہ حضور کی بعثت اُس "ضابطۂ ربانی میں مناسب وقت ترمیم" پہنچانے کے لیے تھی جو آپ سے پہلے کے انبیاء اپنے زمانے میں لائے تھے۔ اور حضور کے بعد اسلامی تاریخ میں جو مجدد شخصیتیں تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد پیدا ہوتی رہیں ان کا کارنامہ بھی اپنے زمانے کے "مروجہ اسلام" کے خلاف آواز اٹھانا اور "چودہ سو برس پہلے کی طرف دیکھنے" کی ذہنیت پر ضرب لگانا ہی تھا۔

یہ ہے اپنے مطالبات کے سلسلے میں اس کتاب کے "جدید ذہن" کے استدلال کا خلاصہ، جو "پیش لفظ" سے اور اس کے بعد کے پہلے مضمون "تذبذب ... جدید ذہن" سے لیا گیا ہے، اور اسی کی بنیاد پر ہم نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ مرتب کے دعوے میں جان نہیں ہے۔

کیوں؟ —— اس لیے کہ

۱- یہ صحیح ہے کہ صدرِ اول میں "علماء" کے مفہوم میں یہ قیود داخل نہیں تھیں جو اب داخل ہو گئی ہیں لیکن اس سے قطع نظر کہ یہ خاص قیود برحق اور بجا ہیں یا نہیں، یہ تو ایک پڑھے لکھے آدمی کو ماننا پڑے گا کہ صدرِ اول میں بھی خود آنحضرت سے یا آپ کے کسی عنہ ان سے مستند ٹھیرائے ہوئے اصحاب سے استفادہ کا کوئی نہ کوئی معیار قرآن و سنت کی تشریح اور فقہی اجتہاد کے لیے بہرحال شرط تھا —— یعنی نفس استفادہ کے ساتھ اُس کا ایک کم سے کم معیار بھی —— قانون کی زبان میں نہ سہی روایت کی زبان میں (شرط) تھا! اس استفادے کے مستند تسلسل اور اس کے معیار کی برقراری ہی کا فقط ذریعہ یہ مدرسی نظام ہے جو دورِ آخر میں

اس دور کے تقاضوں یا حالات سے پیدا ہوا۔ اس لیے کوئی بھی پرانا یا نیا تعلیمی نظام جو اس استفادے کے سندی تسلسل اور اس کے معیار کے تحفظ کا مطالبہ پورا کر سکتا ہے۔ اس کے ڈھالے ہوئے سکّے عوام میں (اپنی اجنبیت کی وجہ سے) مقبول ہوں یا نہ ہوں، مدرسی نظام کا کوئی سنجیدہ نمائندہ ان سکّوں کو ناقابل قبول نہیں ٹھیرا سکتا ہے۔ پس یہ "علماء" کے "مفہوم" میں صدر اول کے برخلاف مابعد کی کوئی تبدیلی نہوئی بلکہ ممکن حد تک "عین اسی" مفہوم "کے "علماء" کو وجود میں لانے کا ایک انتظامی اضافہ ذرائع میں ہوا۔ اور ذاتی مطالعے یا یونیورسٹی تعلیم کے ذریعہ وجود میں آنے والے "اہل علم" اس لیے "علماء" والے حقوق کے سزاوار نہیں مانے جاتے کہ صدر اول کے شرائط وہاں موجود نہیں ہیں۔ نہ اس لیے کہ وہ خاص مدرسی نظام سے باہر پیدا ہوئے ہیں۔

مسئلے کی یہی تنقیح مدرسوں کے جرچ بن جانے کا اعتراض بھی بے محل کر دیتی ہے اسکے علاوہ یوں بھی یہ اعتراض بے محل ہے کہ جرچ، آسمان کے نیچے حاکم مطلق ہوتا ہے جبکہ مدارس میں کہیں دینی رہنمائی پر اجارہ داری کا تصور بھی اگر پایا جاتا ہو تو اس کی بہر حال ایک بھی مثال نہیں مل سکتی کہ اس رہنمائی میں "لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ" (اختیار مطلق) کا دعویٰ بھی کیا جاتا ہو اور دلیل مانگنے کے حق سے کسی ایک فرد ملت کو بھی محروم سمجھا جاتا ہو۔

(۲) ختم نبوت اور انقطاع وحی کا یہ مبیّنہ نکتہ کہ اب نوع انسانی قرآنی ہدایت کی روشنی میں اپنا جادۂ حیات بغیر کسی شخصی رہنمائی کے، خود استوار کرنے کی حقدار ٹھیرا دی گئی ہے ۔ ———

جس کی بنیاد پر "جدید ذہن" کا یہ مطالبہ پیش ہوا ہے کہ، نہ صرف "علماء" کا حق اجتہاد اور حق تشریح مذہب عام "اہل علم" کو بھی ملنا چاہیے بلکہ یہ حق اتنا وسیع اور مطلق بھی ہونا چاہیے کہ بشمول تشریح پیغمبر، ماضی کی کسی بھی تشریح اور کسی بھی اجتہاد کی پابندی اس پر عائد نہ ہو ـــــ اس نکتہ کی براہ راست تنقید تو اتنی طوالت چاہے گی جو ایک تبصرہ کی وسعت سے باہر ہے۔ اس لیے اس بحث میں جاتے ہوئے کہ کتنی بات اس نکتے میں واقعہ اور کتنی مغالطہ ہے اور کیا صحیح تعبیر اس کی ہونی چاہیے، ہم صرف ان "شواہد" کی تنقید پر قناعت کریں گے جو مبیّنہ نکتہ سے اخذ کردہ نتیجے کے حق میں ہمارے مصنف نے پیش کیے ہیں۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا، کہا گیا ہے کہ قرآن اور سنّت دونوں اس پر شاہد ہیں کہ پیغمبر اسلام اور آپ کے منکرین کے درمیان کشمکش کی حقیقی بنیاد یہی تھی کہ ماضی کے "نازل شدہ" ضابطۂ ربانی "میں" حسب وقت ترمیم "ہو سکتی ہے یا نہیں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی ترمیم کے داعی تھے۔ اور قرآن نے

منکرین کی "ما وجدنا علیہ آباءنا" کی رٹ کو اس ترمیم کی مخالفت کے مفہوم میں مذموم قرار دیا ہے، نہ یہ کہ سرے سے اُن کے آبائی مذہب ہی کو ملامت کرنا مقصود ہو! —— دوسری شہادت مجددین اسلام کے تجدیدی کام کی ہے کہ یہ اپنے زمانے کے "مروجہ اسلام" اور "چودہ سو سال پیچھے کی طرف دیکھنے" کی ذہنیت ہی کے خلاف آواز اُٹھانا ہی تھا۔

کل یہی دو شہادتیں ہیں جو جدید ذہن کے "ہمہ گیر حق ترمیم" کا کیس مضبوط کرنے کے لیے پیش کی گئی ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ دونوں افسوسناک غلط فہمی یا لاعلمی پر مبنی ہیں۔ قرآن پاک میں "ما وجدنا علیہ آباءنا" کی منکرانہ منطق پچاسوں مقامات پر بحث میں آئی ہے۔ مگر کسی ایک مقام سے بھی اس مفہوم کا سوال نہیں پیدا ہوتا جو یہاں قرآن کی طرف ایک مسلم حقیقت کے انداز میں منسوب کر دیا گیا ہے۔ اگر ایسا کوئی مقام "جدید ذہن" کی نظر میں ہے تو اس کی نشاندہی کر کے بات کہی جانی چاہیے تھی۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ جس مفہوم کی نفی یہاں کی گئی ہے وہی ہر جگہ کا مفہوم ہے۔ اسی لیے ایسے الفاظ بھی ان موقعوں پر ملتے ہیں کہ "أولو كان آباؤهم لا يعقلون شيئا ولا يهتدون" (آباء کی سند پکڑی جاتی ہے، چاہے یہاں کے آباء نہ کچھ سمجھتے ہوں نہ ہدایت یاب ہوں!)۔ اسی طرح حدیث میں "لو كان موسى حيا"..... (اگر آج موسیٰ (یا عیسیٰ) زندہ ہوتے تو میری ہی پیروی کرتے) کے الفاظ کا مدعا یہ ٹھیرانا کہ حضورؐ "ماضی کے آبائی فضائلوں" میں "مناسب وقت ترمیم" کا اصول لوگوں کے ذہن نشین کرانا چاہتے تھے، اپنا مدعا حدیث کے منہ میں ڈالنے کا مصداق ہے۔ ورنہ حضورؐ کا مدعا صرف اپنے اتباع پر زور دینا تھا، یہی پوری حدیث (جو طویل ہے) کی اپنی شہادت ہے۔ اور یہی پورے ذخیرۂ حدیث کا مقتضیٰ —— جدید ذہن نے یہاں بھی مجرد دعوے سے آگے جانے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

مجددین کے کام سے استشہاد، اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز غلطی اس لیے ہے کہ "جدید ذہن" قرآن و حدیث کے فہم میں اگر ٹھوکر کھا جائے تو چنداں حیرت کی بات نہیں۔ لیکن تاریخ کا معاملہ تو دوسرا ہے۔ اس کے حقائق سمجھنے میں تو ایسی کوئی دشواری کی بات نہیں۔ اور وہ مجددین جن کے نام لیے گئے (شاہ ولی اللہ، مجدد الف ثانی، نظام الدین اولیاؒ، شاہ اسماعیل شہید)[۱] یہ تو خود ہمارے ملک کے ہیں۔ ان کے کام کو کون سی تاریخی تحریر یہ کہہ کر مسخ کرنے کی جرأت کر سکتی ہے کہ یہ چودہ سو سال پہلے والے اسلام اور اس پر اصرار

---

[۱] یہ نام دراصل اکابرینِ اسلام کے ایک دوسرے زمرہ میں آنے کا ہے ہم نے صرف بطور نقل اسے برقرار رکھا ہے۔

اس ذہنیت کے خلاف صف آرا ہوئے تھے؟ ہم ایک جانی اور مانی کھلی اور عیاں حقیقت کو ناقابلِ کشف بنانے کے مرتکب ہوں گے اگر یہ بتانے لگیں کہ اس کے برعکس ان حضرات کا کام کیا تھا! کون ہے جو نہیں جانتا کہ یہ چودہ سو سال پہلے کے اسلام کو زندہ کرنے اور درمیانی ترمیموں اور اضافوں سے اس کا دامن صاف کرنے کے لیے کھڑے ہوئے تھے اور اسی پر جیے اور مرے۔

قرآن اور حدیث سے مذکورہ استشہاد کے سلسلے میں اتنی بات اور کہہ دینا بھی غالباً برمحل ہی ہوگا کہ اس استشہاد میں قرآن و حدیث کی تشریح کا جو نمونہ سامنے آیا ہے وہ اُن "علماء" کا کیس بہت مضبوط کر دینے والا ہے جو کہتے ہیں کہ یہ میدان "جدید اہل علم" کا نہیں ہے اُنھیں اس میں مداخلت کے حق پر اصرار نہیں کرنا چاہیے۔

کتاب کے صرف ایک ہی مضمون (اور پیش لفظ) پر یہ تبصرے کے عام مزاج سے کچھ نکلا ہوا اظہار خیال اس لیے ضروری محسوس ہوا کہ مصنف کا بنیادی مقصد تو اس پوری کتاب پر ہمدردانہ نظر کی روشنی میں —— اور کچھ ذاتی واقفیت کی روشنی میں —— اس سے زیادہ نہیں معلوم ہوتا کہ فقہ میں جمود اور ماضی کی انتہا پسندانہ اسیری کے خلاف تحریک کی جائے (اور تفصیل و تشریح کے اختلاف سے قطع نظر، کم از کم تبصرہ نگار کے خیال میں یہ مقصد صحیح بھی ہے اور اس کی ضرورت بھی۔) اور غالباً اس جمود کے اسباب کے سلسلے میں مستشرقین کے پھیلائے ہوئے غلط نقطۂ نظر سے متاثر ہو کر وہ اس (جمود) سے نجات پانے کے ذرائع کی تجویز میں (جو اُن کے پہلے مضمون کا حاصل ہے) اُن حدود تک چلے گئے ہیں جن کے بعد اسلامی فقہ ہی اپنے اصل سرچشمہ سے محروم نہیں ہو جاتا بلکہ ملت کی اسلامیت بھی بے اساس اور نام نہاد ہو کر رہ جاتی ہے، —— تبصرہ نگار کے احساس میں یہ غیر شعوری طور پر ہوا ہے، اس لیے نظرِ ثانی کی امید پر اس نے ضروری سمجھا کہ ان تجویزوں کی علمی کمزوری اختصار کے ساتھ جتنی واضح ہو سکتی ہو کر دی جائے۔

کتاب کا دوسرا اور تیسرا مضمون خاص اسی مقصد (فقہ میں جمود کے خلاف تحریک) کے لیے وقف ہے جسے ہم نے مصنف کا اصل مقصد قرار دیا ہے۔ ان میں بھی اگرچہ اسباب جمود کے سلسلے میں نقطۂ نظر کی غلطی کے اثرات قدرتی طور پر ملتے اور ان کا وزن ہلکا کرتے ہیں، لیکن اصل مقصد پر کچھ قابلِ غور باتیں بھی ان میں

ملیں گی اور انھیں ان کا حق دیا جانا چاہیے ـــــ ان میں سے "شاہ عبدالعزیز کے فتاوائے دارالحرب" والا مضمون مصنف کی اپنی موضوع کے لیے محنت اور اس سے دلچسپی کا خاص مظہر ہے۔ اور اسی میں اُن کی اپنے اصل فکر و مقصد اور ذہن پر بیرونی اثرات کی وہ کش مکش بھی بہت نمایاں طور پر ملتی ہے جو جابجا تضاد فکر کی شکل پیدا کر کے مصنف کے ذہن و فکر کے بارے میں قاری کو حیرانی کے حوالے کر جاتی ہے۔

"پاکستان اور قانون شریعت" نام کا مضمون ہمیں ڈر ہے کہیں قاری کو ہمارے اس حسن ظن پر بدگمان نہ کردے کہ مصنف کا اصل مقصد فقہی جمہور کے خلاف ایک تحریک کرنا ہے۔ اس میں معلوماتی حصّے کے علاوہ فکری اظہار کا جو حصہ ہے وہ اسی جدید ذہن کا آئینہ دار بن گیا ہے جو کتاب کے پہلے مضمون میں سامنے آتا ہے۔

کتاب کے دو مضمون بہرحال ایسے ہیں جن کے لیے اس کے مطالعہ کی سفارش بے خطر کی جاسکتی ہے۔ ایک "مسلم پرسنل لا اور ہندوستانی عدالتیں" دوسرا "ملایا میں قانون شریعت" یہ دونوں معلوماتی، اور بڑی ضروری اور مفید معلومات پر مشتمل ہیں ان کا مطالعہ فقہی دلچسپی رکھنے والے ہمارے طبقۂ علماء کو ضرور کرنا چاہیے۔

آخر میں یہ ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ "فقہی اصول استحسان" اور "مصالح مرسلہ" کے مفہوم میں مصنف سخت غلط فہمی کا شکار ہیں۔ جدید تصنیفی طرز کے مطابق انھوں نے ہر ہر بات کے لیے باقاعدہ حوالے دینے کا التزام کیا ہے۔ مگر اس سلسلے میں کہیں ایک اصول فقہ کی کتاب یا قول فقہا کا حوالہ نہ ملنے سے یہ گمان قوی ہوتا ہے کہ انھوں نے کسی مستند مطالعہ کا موقع نہیں پایا ہے۔

مسلمان اور سیکولر ہندوستان۔ جب کہ مصنف کی پہلی کتاب: خاص طور پر، مسلمانوں کے "قدامت پسند" اہل علم سے کچھ کہنا چاہتی ہے، اس دوسری کتاب کا زیادہ تر ہدف اُن کا تجدد پسند طبقہ ہے، جس کے ایک زمرے میں مصنف خود بھی شامل ہیں۔

تجدد پسند طبقہ چاہتا ہے کہ مسلمان سیکولر ریاست کے تصور کو بھی کھلے دل سے اپنائیں اور سیکولرزم جو ریاست کی طرح افراد کے بھی (ذہنی اور عملی) رویہ سے تعلق رکھنے والی چیز ہے، اسے بھی ایک اصول فکر و عمل کی حیثیت سے قبول کریں۔ ان دونوں باتوں میں فی الوقت مسلمانان ہند کی واقعی پوزیشن کیا ہے؟

اگر مسلمانوں میں کچھ مختلف اہل الرائے طبقے مختلف پوزیشنیں رکھتے ہیں، تو اُن کی تفصیل کیا ہے ؛ عام مسلمانوں کی پوزیشن کیا ہے اور اگر وہ اس معاملے میں کسی خاص طبقے کے ساتھ جھکے ہوئے ہیں تو اس کے اسباب کیا ہیں ؟ سیکولرزم کا تعلق زندگی کے کس دائرے سے ہے ؟ اور سیکولرزم کے حامی طبقے کو کن باتوں پر غور کرنے اور کیا طرزِ عمل اختیار کرنے کی ضرورت ہے، اگر وہ مسلمانوں میں سیکولرزم کی مقبولیت چاہتا ہے ؟ یہ عنوانات ہیں جس پر پیشِ نظر کتاب میں گفتگو کی گئی ہے۔ گفتگو بہت سیر حاصل اور بڑی حد تک معروضی (مصنف کی اندرونی لگاوٹ اور مخالفت کے اثرات سے پاک) ہے۔ مکمل معروضیت کے وہ بھی دعویدار نہیں ؛ کیونکہ بقول ان کے یہ چیز ایک انسان سے نہیں صرف کسی کمپیوٹر ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔

مسلمانوں کو اپنے ذہنی اور عملی رویہ کے اعتبار سے خود بھی سیکولر ہو جانا چاہیے یا نہیں ؟ اس میں جو بھی رائے صحیح ہو، لیکن ایک سیکولر ہندوستان کے مضمرات کو سمجھنا مسلمانوں کے ذی فہم طبقے کی ایک قطعی ضرورت ہے۔ آج سے پانچ سال پہلے (اگست ۷۰ء کے الفرقان میں) اس تبصرہ نگار نے خود اس ضرورت کی طرف خاص طور سے ملت کے دینی رہنماؤں کو متوجہ کرنے کی ایک کوشش کی تھی۔ مشیر صاحب نے یہی کام بہت بسط و تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب میں انجام دیا ہے۔[له]

کتاب چھ ابواب، تین ضمیموں اور ایک کتابیات (انڈکس) پر مشتمل ہے۔ پہلا باب "مذہب، سیکولرزم اور سیکولر ریاست" اس مسئلہ سے بحث کرتے ہوئے جس پر توجہ کو ہم نے ہندوستانی مسلمانوں کے ذی فہم طبقے کی ایک قطعی ضرورت کہا، ... ... نفسِ سیکولرزم اور ہندوستان کے آئینی سیکولرزم کی تنقیح کرتا ہے اور ان دونوں سے ہم آہنگی یا ناہم آہنگی کے پہلو سے مسلمانوں میں پائی جانے والی مختلف پوزیشنوں کی وضاحت کرتے ہوئے عام مسلمانوں اور اُن کے رہبر عالموں کی مخصوص پوزیشن کا ایک وسیع جائزہ، اس پوزیشن کے فکری اور تاریخی اسباب کے ساتھ پیش کرتا ہے، جن پر

له الفرقان کے اسی مضمون (اداریہ) کے پیشِ نظر مشیر صاحب نے کچھ خصوصی دلچسپی کے ساتھ تبصرہ کی بجا توقع کرتے ہوئے اپنی یہ کتاب الفرقان کو بھیجی تھی۔ مگر تبصرہ نگار اپنی صحت کی کچھ زیادہ خرابی سے اُن کی توقع پوری کرنے کے لائق اُس وقت نہیں تھا، اس لیے کتاب کو واپس کر دینا مناسب سمجھا گیا۔ اب کوئی دو سال بعد اپنی نئی کتاب کے ساتھ اسے مشیر صاحب نے پھر بھجوا کر تبصرہ نگار کو اس کا فرض یاد دلایا ہے۔

اہم ترین سبب اُن کا تصورِ مذہب ہے۔

چونکہ مصنف کا مقصد قدیم علما اور اُن سے ہم آہنگ عام ذی فہم مسلمانوں کو دعوتِ فکر دینے کے ساتھ اپنے تجدد پسند طبقے کو بھی خاص طور پر اس معاملے کی واقعی صورتِ حال سے آگاہ کرنا اور اُن کی جدوجہد کو نتیجہ خیز رخوں پر لگانے کی کوشش کرنا ہے، اس لیے دوسرے اور تیسرے باب میں انھوں نے اُن علما کے اہم وسائلِ اقتدار کا ایک بھرپور جائزہ پیش کیا ہے جن کے ہاتھ میں اس وقت عام مسلمانوں کی باگ ڈور ہے۔ ان اہم وسائل میں ۱۔ دینی مدرسے ہیں۔ ۲۔ فتوے کا قلم۔ اس جائزے کے مین مقصد کے مطابق مصنف نے اُن پہلوؤں کو اچھی طرح اُبھارا ہے جہاں سے ان قلعوں میں سرنگ لگائی جا سکتی ہے۔ بلکہ جو اسی مقصد کے لیے انھیں مفید معلوم ہوئے ہیں اُن کی بھی نشاندہی کرتے ہوئے اُن کا استعمال بھی اپنے امکان بھر اپنے طبقے کے ناواقفوں کو سکھانے کی کوشش کی ہے —— ہم اس کوشش کو لاشعوریت پر تو محمول کر سکتے ہیں۔ مگر جس سیاق میں (ملاحظہ ہو باب اول کا آخری صفحہ آخری پیرا) یہ دونوں باب تصنیف کیے گئے ہیں اُس سیاق میں استحسان وغیرہ کی بحث کے لیے اس کوشش کے علاوہ کوئی دوسری تعبیر سمجھ میں نہیں آتی۔

بہرحال یہ دونوں باب اگرچہ خاص طور سے جدید طبقے کی معلومات کے لیے ہیں مگر اہلِ مدرسہ اور اہلِ افتا کو بھی ان میں پیش کی گئی اپنی تصویر ضرور دیکھنی چاہیے۔ واقعی حقیقت کا اندازہ کرنے کے لیے اپنا مطالعہ دوسروں کی نظر سے کرنا بھی ضروری ہوتا ہے اور دنیا میں ایک اچھی زندگی کی شرط ہے کہ فرد ہو یا جماعت اپنے سے باہر کی طرح خود اپنے بارے میں بھی حقیقت پسند اور حقیقت جو نگاہ رکھے۔ اس مطالعہ سے جہاں ایسے خیالات علم میں آ سکتے ہیں جنھیں دور کرنے کی ضرورت ہو وہاں ایسے پہلو بھی روشن ہوں گے جن کی اصلاح کے بغیر ان اداروں کی زندگی دیر تک ممکن نہیں۔

ہندوستان کے جیسے معتدل سیکولرزم کے ساتھ بھی مذہب (خاص کر اسلام) کو اپنے لیے خطرہ محسوس کرنے بلکہ اپنے بچاؤ کی جنگ لڑنے پر جس دائرے میں بہرحال مجبور ہونا پڑ رہا ہے، وہ شریعت کا قانونی دائرہ ہے۔ اس کشمکش کی تفصیل کیا ہے؟ اس میں کتنے فریق ہیں اور کس کا موقف کیا ہے؟ ان موقفوں کا غیر جانبدارانہ تجزیہ، کس موقف کا کیا وزن یا اس کی کیا قابلِ لحاظ کمزوری دکھاتا ہے؟ اور مستقبل کے آثار و امکانات کیا ہیں؟ یہ کتاب کے چوتھے باب کی بحث ہے۔

اس باب میں اور اس کے بعد والے، یعنی پانچویں باب میں مصنف کا اندازِ بحث اس بات کی بھرپور شہادت فراہم کرتا ہے کہ وہ (بیش لفظ میں) اپنے امکان بھر معروضیت کا اطمینان دلانے میں بالکل صادق تھے۔ وہ خود اگرچہ سیکولرزم کے حامی ہیں اور صاف صاف یہ رائے رکھتے ہیں کہ شریعت کے قانونی دائرے کو مذہب میں نہیں شمار ہونا چاہیے، چنانچہ مسلم پرسنل لا میں، جدید سوسائٹی کے تقاضوں کے مطابق، ہر "ضروری" تبدیلی کو بے جھجک قبول کیا جانا چاہیے، لیکن چوتھے باب — "قانون اور شریعت میں" اپنے ہم آوازوں کے اُن تمام دلائل کی کمزوریاں دکھاتے ہوئے جنھیں بشرطِ فہم و انصاف کوئی آدمی قابلِ اعتنا نہیں ٹھہرا سکتا، اپنے مخالف فریق کے اُن تمام دلائل کی معقولیت پر وہ زور دیتے ہیں جنھیں معقولیت کی عام بنیادوں پر کسی طرح رد نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح پانچویں باب "بھارتی سیکولرزم" میں انھوں نے بہت بے لاگ طریقے سے یہ دکھایا ہے کہ سیکولر طرزِ فکر و عمل سے مسلمانوں کی وحشت کا سبب اگر علماء کی قیادت کو کہا جائے تو اس سے کچھ زیادہ ہی اُن داعیانِ سیکولرزم کا طرزِ عمل بھی اس کا ذمہ دار ہے جو اس دعوت اور جدوجہد کے سلسلے میں مسلمانوں کے خاص مذہبی تصورات کی پروا نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ خود ملک کی حکومت اور اس کے پالیسی سازوں کا ملک کے سیکولرزم تک سے مسلمانوں کے بدگمان کرنے میں جو حصہ ہے اُس کو بھی مصنف نے بے لاگ طور پر عیاں کیا ہے۔ بہرحال یہ دونوں باب مصنف کے معروضی طرزِ فکر کا بہت بیّن ثبوت اور کتاب کے مطالعہ کی سفارش کے لیے بجائے خود کافی ہیں۔ اور یہیں یہ بات بھی کہہ دینی چاہیے کہ اپنے موضوع پر سلجھے ہوئے بیان ذکت کی ندرت اور اس کے لیے سنجیدہ فکر و محنت کتاب میں شروع سے آخر تک یکساں نظر آنے والی چیز ہے اور یہ بڑی چیز ہے۔

مصنف اگر تغیر اور تجدد پسند طبقے کے دلائل کو رد کر گئے ہیں اور روایت و قدامت پسند موقف کے دلائل کو انھوں نے جاندار مانا ہے تو پھر خود ان کا تجدد حامی ہونا کس بنیاد پر ہے؟ اور شرعی قانون میں عصری تقاضوں کے مطابق تبدیلیوں کے لیے اُن کے پاس کیا استدلال ہے؟ یہ ایک سوال ہے جو اوپر کی سطریں پڑھ کر قارئین کے ذہن میں اٹھنا چاہیے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مصنف کے نزدیک روایت پرستوں کی غلطی اُن کے اس بنیادی موقف میں ہے کہ مذہب پوری زندگی پر حاوی ہے اور زندگی کے دنیاوی معاملات میں بھی مذہبی دلائل ہی سے فیصلہ ہوگا۔ اُن کی نظر میں خود اسلام کی تعلیم اور تاریخ کے اندر اس

موقف کی غلطی کے دلائل موجود ہیں۔ ضرورت انہی دلائل سے کام لیکر اصل موقف کو غلط دکھانے کی ہے جب کہ تجدد پسند طبقہ عام طور پر دوسرے راستے اختیار کرتا ہے ۔۔۔ مصنف کے اس نقطۂ نظر کی کچھ زیادہ وضاحت اُن کی پہلی کتاب کے تبصرہ میں آچکی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ موقف اصولی طور پر نہایت صحیح ہے جب تک علماء اور ان کے متبعین کے اس خیال کو مذہب کی زبان سے ہی باطل نہ کرا دیا جائے کہ مذہب پوری زندگی پر حاوی ہے، اس وقت تک ظاہر ہے کہ وہ مسلمانوں کو سیکولرزم سے باز رکھنے اور سیکولر حکومت سے یہ مطالبہ کرنے میں بالکل حق بجانب ہیں کہ اُن کے شرعی قوانین میں مداخلت نہ کی جائے۔ علاوہ اُن بعض دوسری خوبیوں کے جن کا کچھ اوپر تذکرہ کیا گیا، پوری کتاب اسی اصولی انداز فکر و کوشش پر مبنی ہونے کی بنا پر ہمارے نزدیک نہایت قابل قدر ہے۔

لیکن یہ ابھی حیرت کی بات ہے کہ مصنف کا ذہن اس قدر سلیم اور معروضی ہوتے ہوئے یہ بات انھیں مضبوط کیسے نظر آگئی ہے کہ اسلام خود قرآن و سنت اور اپنی معتبر تاریخ کی رو سے پوری انسانی زندگی پر حاوی نہیں ہے۔ بقدر موقع کچھ اشارے اس کی کمزوری، بلکہ بالکل بے اساسی کی طرف ہم نے اس سے پہلے والی کتاب کے تبصرے میں کیے ہیں، شاید وہ کچھ توجہ اصل حقیقت کی طرف دلا سکیں۔ ایک مسئلہ اس ذیل میں فقہی اصولِ "استحسان" کا رد گیا تھا جس کا ذکر انھوں نے اس کتاب میں بھی بار بار کیا ہے۔ اس کے بارے میں بھی مختصر سی بات یہ ہے کہ اس فقہی اصول کے بارے میں بھی اُن کا تصور سراسر غلط فہمی پر مبنی ہے وہ اسے آجکل کی زبان کے مفادِ عامہ کی رعایت کا مرادف قرار دیتے ہوئے اس بات کی گویا دلیل ٹھیراتے ہیں کہ دنیاوی معاملات و مسائل کو شریعت نے انسانوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے۔ حالانکہ اولاً تو سرے سے یہ مفہوم ہی فقہاء کے یہاں اپنی اس اصطلاح کا نہیں تھا۔ کاش مصنف نے کوئی حوالہ اس سلسلے میں دیا ہوتا تو کچھ سراغ اُن کے اس خیال کی بنیاد کا ملتا۔ دوسرے یہ بھی غور کرنے کی بات ہے کہ جو فقہاء اس اصول کے قائل ہیں اُن کے یہاں شرعی دلائل کی درجہ بندی میں اس کا کیا درجہ اور کیا دائرہ استعمال ہے، صرف اسی پہلو پر غور کر لیا جائے تو اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسے دنیاوی معاملات سے متعلق تمام شرعی قوانین کو ساقط کر دینے کی بنیاد کیسے بنایا جا سکتا ہے؟

اس وضاحت کی شاید ہی ضرورت ہو کہ تبصرہ صرف مصنف کے خیالات پر اظہار رائے کا محل ہے متعلقہ مسئلہ پر تبصرہ نگار کے اپنے جامع خیالات کے اظہار کا اس میں موقع نہیں۔ ع۔س

خون صاف کرنے کی
قدرتی دوا
خوب صورت بنایئے
SAFI
صافی
ہمدرد
SAFI

Regd. No. LW/NP-62

Monthly 'ALFURQAN'

31, Naya Gaon West
Lucknow U. P.

VOL. 43 NO. 9 ~~JULY~~ 1975 SEP 1975 Phone : 23547

الفرقان لکھنؤ

مدیر

محمد منظور نعمانی

سالانہ چندہ

ہندوستان سے: -/۱۲

پاکستان سے: -/۲۰

بنگلادیش سے: -/۱۳

قیمت فی کاپی: ۱/۲۰

اس خصوصی شمارہ کی قیمت: ۲/۴۰

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

ممالک غیر سے سالانہ چندہ

بحری ڈاک سے ۱ پونڈ ۵ شلنگ

ہوائی ڈاک سے

امریکہ و کناڈا سے ۳ پونڈ

یورپ و افریقہ سے ۲½

ممالک عربیہ (مشرق وسطیٰ) سے ۲ پونڈ

جلد ۴۳ | بابت اکتوبر ۱۹۷۵ء مطابق رمضان المبارک ۱۳۹۵ھ | شمارہ ۱۰

اگر اس دائرہ میں ◯ سُرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجائے ورنہ اگلا پرچہ وی پی ارسال ہوگا۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے جو پتہ کی چٹ پر لکھا رہتا ہے۔

تاریخ اشاعت: الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے، اگر ۲۰ تاریخ تک کسی صاحب کو پرچہ نہ ملے تو فوراً مطلع کریں۔ اس کی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانی چاہیے۔ اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان اور کتب خانہ الفرقان کے پتہ میں تبدیلی: الفرقان کا دفتر اور کتب خانہ لکھنؤ ہی میں کچہری روڈ سے دوسری جگہ منتقل ہو گئے ہیں —— اب پتہ یہ ہے:

۳۱۔ نیا گاؤں مغربی (نظیر آباد) لکھنؤ، یو۔پی۔

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، اڈیٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان ۳۱ نیا گاؤں مغربی۔ لکھنؤ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

محمد منظور نعمانی

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

حجازِ مقدس کے اُس سفر سے جس کا ذکر ناظرین کرام اسی شمارہ میں پڑھیں گے ۹ رشوال کو واپسی ہوئی تھی پانچویں ہی دن ۱۴ رشوال کی صبح ۸ بجے کے قریب ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ یہ میرے وطن سنبھل سے ایک ٹرنک کال تھا، اس کے ذریعہ اطلاع دی گئی تھی کہ آج رات میں میرے بڑے بھائی مولٰنا محمد حسن صاحب بدر (فاضل دیوبند) انتقال فرما گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَ لِاَخِیْ وَ اَدْخِلْنَا فِیْ رَحْمَتِکَ وَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ

بھائی صاحب مرحوم مجھ سے قریبًا دس سال بڑے تھے۔ میں نے تھوڑی سی فارسی پڑھنے کے بعد جب میزان الصرف شروع کی ہے تو وہ غالبًا ہدایہ، ملاحسن وغیرہ متوسطات پڑھ رہے تھے، اسی زمانہ میں انھوں نے الہ آباد یونیورسٹی اور لاہور یونیورسٹی کے بعض عربی فارسی امتحانات بھی دیے اور اس کے بعد مقامی ہائی اسکول میں فارسی کے استاذ کی حیثیت سے ملازمت کرلی جس کی وجہ سے درس نظامی کی تعلیم اُس وقت نامکمل رہ گئی —— پھر خلافت اور ترک موالات کی تحریک کے زمانہ میں کسی واقعہ کی بنیاد پر خود ہی استعفا دیدیا —— اس کے ۴-۵ سال بعد (غالبًا ۲۵ء میں) وہ وقت آیا کہ راقم سطور اپنی تعلیم کا آخری دور پورا کرنے کے لیے دارالعلوم دیوبند جانے لگا تو انھوں نے بھی ساتھ جانے کا فیصلہ کرلیا۔ لیکن انھیں عربی تعلیم کا سلسلہ چھوڑے قریبًا ۸-۱۰ سال ہوچکے تھے جس کی وجہ سے بہت کچھ بھول چکے تھے اور دارالعلوم دیوبند جاکر جو کتابیں وہ پڑھنا چاہتے تھے ان کا پڑھنا مشکل تھا۔ انھوں نے اپنے نہایت شفیق اور ماہر استاذ مولٰنا عبدالمجید صاحب سنبھلیؒ سے مشورہ لیا۔ مولٰنا نے فرمایا کہ

تم ایک مہینہ میں مجھ سے صرف، نحو اور منطق کا صرف ایک ایک متن پڑھ لو انشاء اللہ اُسی سے یہ خامی دور ہو جائے گی۔ بلاشبہ بڑا ہی ماہرانہ مشورہ تھا، انھوں نے یہی طے کر لیا ——— میں نے تو شوال ہی میں جا کر دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لے لیا، بھائی صاحب قریباً دو مہینے کے بعد آئے اور مشکوٰۃ شریف جلالین شریف اور ہدایہ اخیرین کے اسباق میں سماعت کی اجازت لے لی ——— تعلیمی سال کے ختم پر اُن کو ان کتابوں کے امتحان میں باقاعدہ شریک ہونے کی بھی اجازت مل گئی اور انھوں نے امتحان دیدیا اور کامیاب ہو کر اگلے سال دارالعلوم کے ایک طالب علم کی حیثیت سے دورۂ حدیث میں شریک ہو گئے۔ اس طرح ۸-۱۰ سال کے انقطاع کے بعد انھوں نے میرے ساتھ ہی درس نظامی کی تکمیل کر لی۔

فراغت کے بعد انھوں نے پھر اپنی پرانی لائن اختیار کر لی، پہلے کئی سال آگرہ کے ایک کالج میں اور بعد میں طویل مدت تک اپنے ضلع مراد آباد ہی کے کالجوں میں فارسی کے استاد رہے، جب تک قانونی طور پر ان کے ریٹائر ہونے کا وقت آیا۔ اس کے بعد پھر گھر ہی پر رہے ——— بڑے منتظم اور اپنے اوقات اور اصولوں کے بڑے پابند تھے۔ نماز باجماعت اور مقررہ وقت پر تلاوت وغیرہ کے ہمیشہ پابند رہے ——— حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہٗ کے وصال سے دو تین سال پہلے جبکہ حضرت کا قیام بسلسلہ علاج سہارنپور میں تھا وہیں حاضر ہو کر حضرت سے بیعت بھی ہو گئے تھے۔

اب ان کی عمر اسّی سے متجاوز ہو چکی تھی۔ اِدھر کئی مہینہ سے ضعف بڑھتا جا رہا تھا۔ حجاز مقدس کے حالیہ سفر سے واپسی کے بعد مجھے ان کے بارہ میں کوئی اطلاع نہیں ملی تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ چند ہفتوں سے نقاہت اور ضعف میں بہت اضافہ ہو گیا تھا۔ اور انھیں وقت کے قرب کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اس وجہ سے روزانہ اس کا بڑا اہتمام فرماتے تھے کہ لیٹتے اور سوتے وقت ان کا رخ صحیح قبلہ کی طرف ہو ——— جس رات میں انتقال ہوا، عشا کی نماز اطمینان سے حسب معمول ادا کی اور اُسی اہتمام سے قبلہ رو لیٹ گئے اور وقت آجانے پر روح نے داعی اجل کو لبیک کہا اور جسم سے مفارقت اختیار کر لی ——— اللہ تعالیٰ اپنی شان کریمی کے مطابق مغفرت و رحمت کا خاص معاملہ فرمائے۔ ناظرین کرام سے درخواست ہے کہ دعائے مغفرت اور حسب توفیق ایصال ثواب فرما کر اس عاجز پر بھی احسان فرمائیں۔

——— ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین ۵

مولانا سید محمد میاں صاحب پر خدا کی رحمت :-

آج ۱۷ر شوال (۲۳ر اکتوبر) علی الصبح حسب معمول ہاکر نے مقامی روزنامہ "قومی آواز- لکھنؤ" پہنچایا تو پہلے ہی صفحہ پر یہ خبر دیکھی کہ مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندی کل ساڑھے پانچ بجے دہلی میں رحلت فرماگئے ——— مولانا کی شخصیت اپنے معاصرین میں بہت ممتاز تھی، انتقال کی خبر پڑھ کے پوری آدھی صدی کی طویل مدت کے نوع بہ نوع واقعات مسلسل یاد آتے رہے، اگر ان سب کو قلمبند کیا جائے تو اچھی خاصی کتاب تیار ہو جائے۔

اب سے ٹھیک ۵۲ سال پہلے (شروع شوال ۱۳۴۳ھ میں) جب میں ایک طالب علم کی حیثیت سے دارالعلوم میں داخلہ کے لیے دیوبند پہونچا تو مولانا موصوف کو ایک دبلے پتلے سفید رنگ نوجوان کی صورت میں دیکھا وہ وہی مہینہ پہلے شعبان ۱۳۴۳ھ میں دورۂ حدیث سے فارغ ہوئے تھے، اور ان کی اور ان کے ایک رفیق درس مولوی محمد ادریس میرٹھیؒ کی علمی استعداد اور (غالباً امتحان میں امتیازی کامیابی کا بھی) بڑا چرچا تھا ——— شاید مولانا کی بعض فنون کی کچھ کتابیں باقی رہ گئی تھیں۔ اس لیے اس سال بھی وہ چند اسباق میں شریک تھے۔ حضرت مولانا سراج احمد صاحب رشیدیؒ کے ہاں شام کے آخری گھنٹہ میں ہم لوگوں کا دیوان حماسہ تھا۔ مولانا محمد میاں صاحب اس میں بھی شریک تھے ——— اس کے علاوہ کسی سبق میں اپنی اور ان کی شرکت یاد نہیں ——— پھر غالباً دوران سال ہی میں کسی مدرسہ میں ان کا تقرر ہو گیا اور وہ چلے گئے ——— کچھ مدت کے بعد جبکہ میں بھی فارغ ہو چکا تھا ان کا تقرر مدرسہ شاہی مسجد مرادآباد میں ہو گیا، جو اس وقت (خاصکر درس حدیث کے لحاظ سے) دارالعلوم دیوبند کے بعد ہندوستان کے چند بڑے اور ممتاز مدرسوں میں شمار ہوتا تھا۔ یہاں مولانا کو پڑھانے کے لیے شروع ہی میں بڑی کتابیں مل گئیں۔ دورۂ حدیث کی کتابوں میں درسی لحاظ سے "جامع ترمذی" کی خاص اہمیت ہے، اس کی تدریس بھی ان کے سپرد ہوئی ——— مجھے یاد ہے کہ غالباً کسی سفر سے واپسی میں، ایک دفعہ میں رات کے وقت شاہی مسجد میں اچانک ان کے حجرہ پہونچا وہ سبق کی تیاری کے لیے مطالعہ اس طرح کر رہے تھے کہ ترمذی شریف ان کے سامنے کھلی ہوئی تھی اور حجرہ کے آدھے سے زیادہ حصہ میں حدیث کی آٹھ دس کتابیں نصف دائرہ کی شکل میں ان کے سامنے ترتیب سے کھلی رکھی تھیں ——— حدیث کی تدریس کے لیے یہ طرزِ تحقیق حضرت الاستاذ الامام مولانا محمد انور شاہ

کشمیری قدس سرہ سے حدیث پڑھنے کا نتیجہ تھا۔ اگر مولانا تدریس ہی کی لائن میں رہتے تو یقیناً وہ ہندوستان کے ممتاز اساتذۂ حدیث میں ہوتے ـــــ لیکن چند سالوں کے بعد (۱۹۳۰ء سے) آزادی کی تحریک اور انگریزی اقتدارِ حکومت کے خلاف غیر مسلح جنگ کا وہ سلسلہ شروع ہوگیا جو آزادی کے فیصلہ تک جاری رہا۔ یہ جنگ جمیعۃ العلماء کانگریس کے دوش بدوش لڑ رہی تھی اور یہ واقعہ ہے کہ پورے ہندوستان میں مرادآباد اور اس کا مدرسہ شاہی جمیعۃ العلماء کا سب سے بڑا طاقتی مرکز تھا۔ اسی کا نتیجہ یہ بھی ہوا کہ مولانا محمد میاں صاحب نے کچھ مدت کے بعد اپنے کو اسی جہاد کے لیے وقف کر دیا۔ اس راستہ میں قید و بند اور اس کے علاوہ بھی ہر طرح کی تکلیفیں اٹھائیں اور مصیبتیں جھیلیں پھر ایک وقت آیا کہ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور مولانا حفظ الرحمٰن نے یہ ضرورت محسوس کی کہ مولانا محمد میاں صاحب مستقل طور پر دہلی منتقل ہو جائیں۔ اور جمیعۃ العلماء کے مرکزی دفتر کا کام سنبھالیں۔ چنانچہ وہ دہلی منتقل ہو گئے ـــ مجھے ذاتی طور پر معلوم ہے کہ ۱۹۴۲ء کی انقلابی تحریک "ہندوستان چھوڑو" میں انھوں نے ایسے خطرناک کام کیے کہ اگر پکڑ لیے جاتے تو پھانسی کا حکم ہو سکتا تھا۔ مگر انھوں نے جو کچھ کیا تھا "جہاد فی سبیل اللہ" سمجھ کر کیا تھا۔ اور اس کے آخری انجام کے لیے تیار ہو کر کیا تھا ـــــ ان سب باتوں کا یہ نتیجہ تھا کہ آزادی کے بعد جو صورتِ حال سامنے آئی اس نے مولانا کو بے حد شکستہ دل کر دیا۔

مولانا ہمارے طبقہ کے خواص اہلِ قلم میں سے بھی تھے گذشتہ چالیس پچاس سال میں انھوں نے اتنا لکھا کہ بہت کم مصنفین اور اصحابِ قلم نے لکھا ہوگا۔ اُن کے تحریری ورثہ اور کثیر التعداد تصانیف کے بارہ میں لکھنا اُن کے سوانح نگار کا کام ہے ـــــ آخری دور کی اُن کی اہم تصنیف وہ ہے جو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مقدسہ پر لکھی ہے۔ اگرچہ اس موضوع پر مختلف زبانوں میں ہزاروں کتابیں لکھی جا چکی ہیں، لیکن جس نے موصوف کی اس کتاب کا مطالعہ کیا ہے وہ اعتراف کرے گا کہ یہ اس موضوع پر نہایت قیمتی اضافہ ہے اور امت کو اس کی ضرورت تھی، کَمْ تَرَکَ الْاَوَّلُ لِلْآخِرِ ـــــ

اللہ تعالیٰ نے مولانا پر یہ بڑا انعام و احسان فرمایا کہ عمر کے آخری دور میں مدرسہ امینیہ دہلی کے شیخ الحدیث کی حیثیت سے حدیث نبوی کا درس ہی ان کا خاص مشغلہ ہوگیا تھا۔

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے بیعت و ارادت کا تعلق تھا پوری زندگی اپنے اکابر و اسلاف کے طریقہ پر رہے۔ جو کچھ کیا (جہاں تک اپنا اندازہ ہے) اللہ کے لیے اور آخرت کے ثواب کی امید پر کیا، یہ صفت ایمان کا جوہر ہے لیکن عنقا ہوتی جا رہی ہے۔

——— رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ الابرار الصالحین۔

گزشتہ شمارہ (بابت ماہ ستمبر) میں اعلان کیا گیا تھا کہ اس کے بعد انشاء اللہ اکتوبر اور نومبر کا مشترک شمارہ آخر اکتوبر یا شروع نومبر میں شائع ہوگا، لیکن حضرت مدیر الفرقان کو اچانک حرمین شریفین کا وہ سفر پیش آگیا جس کا کچھ حال ناظرین کرام اس زیر نظر شمارہ میں پڑھیں گے، اس وجہ سے دو مہینے کا مشترک شمارہ تیار نہیں ہو سکا، اب صرف اکتوبر کا شمارہ مرتب کر کے پریس کے حوالہ کیا جا رہا ہے۔

اگر بالفرض اس کی طباعت اور تیاری میں دیر لگی تو ہم کوشش کریں گے کہ نومبر کا شمارہ بھی اسی کے ساتھ شائع ہو جائے تاکہ اشاعت کا نظام صحیح اور وقت کا پابند ہو جائے اللہ تعالیٰ ہماری مدد فرمائے۔

ناظم دفتر الفرقان لکھنؤ

۲۵ر اکتوبر ۱۹۷۵ء

مولانا حافظ محمد نعیم ندوی صدیقی (اعظم گڑھ)

ہندوستان میں علم حدیث کی ترویج میں خاندان ولی اللّٰہی کا حصہ

یہ مضمون اب سے کئی سال پہلے اشاعت کے لئے دفتر الفرقان میں موصول ہوا تھا، لیکن کاغذات میں کہیں ان کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ اب جبکہ اس شمارہ کی کتابت شروع ہو چکی تھی۔ کتابوں کی ایک الماری میں نظر پڑ گیا۔ فاضل مضمون نگار سے معذرت اور شکریہ کے ساتھ اس اشاعت میں شریک کیا جا رہا ہے — ادارہ

سرزمین ہند تقریباً آغاز اسلام ہی سے آفتاب نبوت کی کرنوں سے منور رہی اور ہر عصر و عہد میں علماء، صوفیہ اور بزرگان دین کی ایک کثیر تعداد کی آماجگاہ بنی رہی، تاریخ سے بہت ہی واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے عہد فاروقی ہی میں سندھ کی زمین پر قدم رکھ لیا تھا اور تیسری صدی ہجری تک انھوں نے وہاں جہانبانی و سیاست دانی کے جوہر دکھائے تھے۔ اس بت کدۂ آذری میں مسلمانوں کے جس پہلے قافلے نے صدائے حق بلند کی تھی اس میں ایک محدث اور تابعی کے وجود کا بھی پتہ ملتا ہے، جن کا نام ربیع تھا[1] اور جن کے متعلق شیخ سبحن علی نے لکھا ہے کہ وہ اسلام کی پہلی صاحب تصنیف شخصیت ہیں۔[2]

عرب و ہند کے درمیان جو تعلقات تیسری صدی میں قائم ہوئے تھے، وہ بتدریج پروان چڑھ کر ایک تنومند درخت کی شکل اختیار کر گئے اس کے نتیجہ میں سرزمین سندھ جو کہ واردین کی پہلی منزل تھی

---

[1] معارف ج ۲۲ ع ۵ ص ۲۵۱ [2] تذکرہ علمائے ہند ص ۲

علماء و فضلاء کی سرگرمیوں کا جولانگاہ بنی ہوئی تھی چنانچہ بشاری مقدسی جب چوتھی صدی ہجری میں ہندوستان آیا تو اس نے محدثین کی ایک بڑی جماعت اس ملک میں دیکھی[۱] - نیز اس نے قاضی ابو محمد منصوری سے ملاقات بھی کی اور اس نے لکھا ہے کہ انھوں نے اچھی اچھی کتابیں تصنیف کی ہیں[۲] لیکن سندھ میں علوم اسلامیہ کی اس ترقی کے باوجود اس کے اثرات دور رس نتائج کے حامل نہ ہو سکے اور اسلامی علوم کے قافلے ملک کے دوسرے حصوں میں نہ پہنچ سکے۔

یہ صحیح ہے کہ غزنوی فتوحات سے پہلے ہی سندھی فضلاء کی جد و جہد سے علوم اسلامیہ نشو و نما پا چکے تھے لیکن سلطان محمود غزنوی کے حملۂ ہندوستان کے بعد ایک باقاعدہ اور منظم شکل میں علمی و تمدنی ترقیات کا آغاز ہوا، اور پھر غوریوں، بلبنیوں، تغلقوں اور لودیوں کے عہد سلطنت میں تو اسلامی علوم کے ہر گوشہ کو وہ ترقی ہوئی اور ماہرین فن کی ایک جمعیت کثیرہ نے ملک کے کونے کونے کو اپنی جد و جہد سے ایسا رشک جہاں بنا دیا تھا کہ اس کی نظیر دیگر ممالک میں بھی خال خال ہی ملتی ہے۔ چنانچہ بقول ضیاء الدین برنی اس وقت صرف دہلی میں ایسے علماء اور ماہرین فن موجود تھے جن کی مثال بخارا، سمرقند اور بغداد میں بھی نہیں مل سکتی[۳]۔

مذکورہ بالا ادوار میں علوم و فنون کی ترقی کے اعتبار سے سب سے زیادہ تابناک دور خلجیوں کا ہے اس میں اکابر علماء اور یگانۂ روزگار فضلاء نے ملک کے طول و عرض کو اپنی شعلہ نفسیوں سے سرگرم اور نوا سنجیوں سے پر شور کر رکھا تھا۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اپنی کتاب میں اس دور کے فضلاء کی ایک طویل فہرست دی ہے[۴]

غرض یہ کہ اسلامی ہند نے اپنے ابتدائی دور ہی سے محدثین عظام کی ایک بڑی تعداد پیدا کی اور علوم اسلامیہ بالخصوص حدیث و تفسیر کی متعدد کتابیں تصنیف کی گئیں، اس تحقیق جدید کے سامنے آجانے کے بعد اب اس سابقہ خیال کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی ہے کہ شیخ عبد الحق محدث دہلوی اور شاہ ولی اللہ رحمہا اللہ سے پہلے ہندوستان میں علم حدیث کا وجود نہ تھا

---

۱ احسن التقاسیم ص ۴۸۱ ۲ ایضاً ۳ تاریخ فیروز شاہی ص ۳۵۲ ۴ ملاحظہ تفصیل کیلئے حیات شیخ عبد الحق ص ۲۵

اور در اصل شیخ عبدالحق محدث دہلوی ہی

"اول کسے کہ تخم حدیث در ہند کشت او بود"

تاہم اس حقیقت سے مجال انکار نہیں کہ گیارہویں صدی میں جب علم حدیث عام بے اعتنائی کا شکار ہو کر موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا تھا تو شیخ محدثؒ ہی کی جدوجہد سے اس کو نشأۂ ثانیہ نصیب ہوئی اور اگر فی الواقع انھوں نے اس طرف توجہ نہ کی ہوتی تو ہندوستان کی سرزمین "قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" کے دلنواز نغموں سے محروم ہو جاتی۔

شیخ عبدالحق محدثؒ

اس لئے اس حقیقت کو تسلیم کرنا ضروری ہے کہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ ہی کی ذات وہ ذات ہے جس نے ہندوستان میں رہ کر حدیث کے سربمہر خزانہ کو وقف عام کیا اور اپنی دل پسند محققانہ تصنیفات کے ذریعہ سے علماء ظاہر و باطن دونوں کی محفلوں سے داد و تحسین وصول کی[1] ہندوستان میں علم حدیث کے سلسلہ کی بیشتر روایات شیخ محدثؒ ہی نے قائم کیں۔ ان روایات پر شاہ ولی اللہ اور انکے خانوادہ نے نہ صرف پوری طرح عمل کیا، بلکہ پایۂ تکمیل کو پہنچایا[2]

پروفیسر خلیق احمد نظامی رقم طراز ہیں۔

"اسلامی ہند کی فضائے علم و ادب جن روشن و تابناک ستاروں سے مزین ہے۔ ان میں شیخ عبدالحق کو ایک امتیازی شان حاصل ہے، انھوں نے نصف صدی سے زیادہ درس و تدریس اور ارشاد و تلقین کا ہنگامہ گرم رکھا ان کا قلم عمر بھر قرآن و حدیث کے اسرار و حکم کے کشف و تحقیق میں گہر افشانی کرتا رہا[3]"

دارا شکوہ نے انھیں "امام محدثان وقت" کے الفاظ سے خراج تحسین پیش کیا ہے[4] شیخ سبحن علی نے لکھا ہے کہ۔

"علم حدیث بہ مجرد سر ہندوستان ازو۔ شیوع یافتہ[5]"

---

[1] معارف ج ۲۲ ع ۴ ص ۲۶۷ [2] حیات شیخ عبدالحق ص ۲۸۵
[3] ایضاً ص ۲۸۳ [4] ایضاً بحوالہ سفینۃ الاولیاء (قلمی) [5] تذکرہ علمائے ہند۔

مولانا آزاد لکھتے ہیں۔

"شیخ عبدالحق جس دور علم و تعلّم کے بانی ہوئے اس کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ علم حدیث کے متعلق فارسی زبان میں جو ملک کی عام زبان تھی تصنیف و تالیف کی بنیاد ڈالی گئی[1]"

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کو جس چیز نے تاریخ میں بقائے دوام عطا کیا وہ ان کا یہی عظیم کارنامہ ہے جو انھوں نے علم حدیث کی ترویج واشاعت کی راہ میں انجام دیا۔ انھوں نے کتب احادیث کو اپنے زمانے کے نصاب کا لازمی جزو بنا کر اپنے مدرسہ میں اس کے درس کی ابتدا کی جس کو ان کی اولاد نے بھی مدتوں جاری رکھا، آپ نے مشکوٰۃ المصابیح کی فارسی میں بھی شرح لکھی، کل تصانیف کی تعداد سو تک پہنچتی ہے[2]۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور ان کے خانوادۂ عالیہ کے ذکر سے پہلے شیخ عبدالحق کا اجمالی تذکرہ اس لئے ضروری ہے کہ اس کے بغیر شاہ صاحب کا تذکرہ ناقص رہتا ہے کیونکہ علم حدیث کی جو بلند و بالا عمارت ...... شاہ ولی اللہ صاحب نے تعمیر کی اس کی بنیاد شیخ محدث ہی نے رکھی تھی۔

خانوادہ ولی اللہی

گیارھویں اور بارھویں صدی ہجری میں علمائے ہند کی زیادہ توجہ فلسفہ اور علم کلام کی جانب مبذول ہونے لگی تھی اور انھوں نے قرآن وحدیث کو نصاب میں ایک ثانوی حیثیت دے رکھی تھی۔ ملا بدایونی نے بھی لکھا ہے کہ فقہ و تفسیر اور ان کے پڑھنے والے نفرت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور اس کے برخلاف نجوم و حکمت اور افسانہ و تاریخ وغیرہ علوم عام طور پر رائج تھے، اور ان کی تحصیل ہر شخص لازم خیال کرتا تھا[3]۔

سلطنت مغلیہ کی بنیادیں متزلزل ہو رہی تھیں تو اسلامی ہند سیاسی حیثیت کے ساتھ مذہبی و تمدنی حیثیت سے بھی تباہ و برباد ہو رہا تھا، علامہ سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ اس وقت

---

[1] تذکرہ آزاد　[2] ابجد العلوم ص ۹۰۱

[3] منتخب التواریخ ج ۲ ص ۲۸۷ ــ ۳۰۶

مسلمانوں میں رسوم و بدعات کا بہت زور تھا، مدرسوں کا گوشہ گوشہ منطق و حکمت کے ہنگاموں سے پرشور تھا، عوام تو عوام خواص تک قرآن پاک کے معانی و مطالب اور احادیث کے احکام وارشادات سے بے خبر تھے[1]

شاہ صاحبؒ کا وجود اس نازک عہد میں اہل ہند کے لئے یقیناً ایک موہبت عظمیٰ اور عطیہ کبریٰ سے کم نہ تھا، آپ کے دیگر کمالات میں سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ انھوں نے انتھک محنت وجانکاہی سے دین حنیف کے ہر شعبہ میں مصلحانہ خدمات انجام دے کر اسے ازسرنو تازگی بخشی اور اپنے بعد ایسی اولاد تیار کر کے چھوڑ گئے جس نے ولی اللہی مشن کو عروج و کمال تک پہنچا کر چھوڑا، آج ہندوستان میں درس حدیث کے جتنے بھی سلسلے قائم ہیں سب بالواسطہ اسی خانوادۂ عالیہ کے خوشہ چیں ہیں، شاہ صاحبؒ نے تقریباً ۲۵ سال مسند علم وارشاد کو مزین فرمایا اور پھر آپ کی رحلت کے بعد چاروں صاحبزادوں نے اس محفل علم و عمل کو زینت دے کر باقی رکھا۔

نواب صدیق حسن خاں اس خاندان عالی کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

"اس خاندان کا ہر ایک فرد اپنے اسلاف اور اعمام کی طرح عالم دین، صاحب مرتبت، حکیم و فقیہ تھا اور ہونا بھی چاہئے تھا، کیونکہ یہ حضرات علم و عمل میں یکتائے زمانہ ہونے کے ساتھ نسب عالی فاروقی کے بھی حامل تھے۔ اس بیت العلم کے تمام افراد جملہ علوم عقلیہ و نقلیہ میں کامل ہونے کے ساتھ مشائخ وقت بھی تھے، حتیٰ کہ ہندوستان بھر میں کوئی ایک گھرانہ بھی اس کا مثیل اور ہم پلہ نہ ہو سکا[2]"

اسی طرح موصوف اتحاف میں خامہ ریز ہیں۔

"اولاد و احفاد او (ای شاہ ولی اللہ، "ن") کہ ہر یکے از ایشاں بے نظیر وقت و فرید دھر و وحید عصر در علم و عمل و عقل و فہم و قوت تقریر و فصاحت تحریر و تقویٰ و دیانت و امانت و مراتب ولایت بود، و ہم چنیں اولاد اولاد[3]"

ترجمہ:۔ (شاہ ولی اللہ صاحب کی اولاد امجاد میں سے ہر ایک علم، عمل، عقل، فہم، زور بیان فصاحت تحریر، پرہیزگاری، دیانتداری، امانت، اور مراتب ولایت میں یکتائے زمن اور بے نظیر وقت تھا

---

[1] معارف ج ۲۲ ع ۴ ص ۱۴۳ [2] ابجد العلوم ص ۹۱۲ [3] اتحاف النبلاء المتقین باحیاء مآثر الفقہاء المحدثین ص ۴۳۰

اور اسی طرح ان کے پوتے بھی۔)

اور فی الحقیقت اسلامی ہند کی اتنی طویل تاریخ میں کوئی ایک نظیر اور مثیل بھی ایسی پیش نہیں کی جاسکتی کہ کسی خانوادہ نے مسند تدریس کو تقریباً دو صدیوں تک بچھائے رکھا ہو اور حدیث نبوی کا چشمہ جاری کر کے نہ صرف سرزمین ہند کو سیراب کیا ہو بلکہ اطراف عالم کے تشنگان علم بھی اس سے مستفید ہوئے ہوں، یہ فضل و تقدم نصیب ہے صرف ولی اللہی خانوادہ عالیہ کا جس کا ہر ممبر نیر تاباں اور خورشید درخشاں تھا۔

امام شاہ ولی اللہ دھلوی

اس عالی خاندان کے چشم و چراغ اور ہمہ منیر شاہ صاحبؒ تھے اور در اصل آپ ہی کے علمی تبحر اور فضل و کمال کی وجہ سے یہ معزز و بزرگ خاندان ساری دنیا میں روشناس ہوا اور ان کے امتیازی نشان کا جھنڈا نہ صرف ہندوستان میں بلکہ پورے عالم میں زور شور سے لہرایا۔

آپ نے ۴ شوال ۱۱۱۴ھ اس عالم آب و گل میں اپنی زندگی کا پہلا سانس لیا[1] آپ کے نیز آپ کے خاندان کے تفصیلی حالات تذکرہ و تراجم کی کتابوں میں منتشر عام طور پر ملتے ہیں اسلئے یہاں ہم دیگر غیر ضروری امور سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف علم حدیث کی راہ میں ان کی گراں قدر خدمات کا اجمالی جائزہ لینے ہی پر اکتفا کریں گے۔

ایک مشہور سوانح نگار کے درج ذیل الفاظ گو مبالغہ پر مبنی ہیں، تاہم حقیقت سے یکسر خالی بھی نہیں۔

"انصاف یہ ہے کہ علم حدیث میں جس اولیت کا تمغہ اس زمانہ کے مورخوں نے شیخ عبد الحق محدث دہلوی کے لئے تجویز کیا ہے اس کے مستحق جناب مولانا شاہ ولی اللہ صاحب ہیں چونکہ علم حدیث کی عمارت کے بانی اگرچہ جناب شیخ عبد الحق محدث دہلوی تھے لیکن جنھوں نے اس عمارت کا نقشہ تیار کرلیا اور پھر اشاعت و رواج کے مرغوں سے اس کے در و دیوار کو سجایا وہ شاہ ولی اللہ ہیں"[2]۔

اس حیثیت سے یقیناً شاہ صاحب کو فضیلت حاصل ہے کہ ان کا کام بہ نسبت شاہ عبد الحق

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۵۱ [2] حیات ولی ص ۳۸۴

کے زیادہ کامل اور مکمل شکل میں نمودار ہوا۔ لیکن گیارہویں صدی میں علم حدیث کو تقریباً منتی ہوئی حیثیت کو سنبھالا دینا اور پھر اسے حیات نو سے ہمکنار کرنا وہ کارنامہ ہے جو شاہ عبدالحق کو مرتبہ اولیت پر فائز کرتا ہے، شاہ صاحبؒ نے صرف شیخ محدثؒ کی کوششوں کی تکمیل کی تالیف و تحریر کے ذریعہ کتب احادیث کو عام کیا، حدیث کی اولین اور صحیح ترین کتاب مؤطا امام مالک کی عربی اور فارسی میں دو مجتہدانہ شرحیں لکھیں[۱]۔ عربی شرح کا نام مسوی اور فارسی کا مصفی ہے[۲]۔ صحیح بخاری کے تراجم کی شرح کی، جو رسالہ فی شرح تراجم ابواب البخاری کے نام سے مشہور ہے۔ علاوہ ازیں الفضل المبین فی المسلسل من حدیث النبی الامین ایک رسالہ تصنیف کیا اور حدیث کے اسرار و معارف میں شہرہ آفاق کتاب حجۃ اللہ البالغہ لکھی۔

آپ کے والد ماجد شیخ عبدالرحیم دہلوی نے دہلی میں ایک مدرسہ حدیث نبوی کی تعلیم کے لئے قائم کیا تھا، جو مدرسہ رحیمیہ کے نام سے مشہور تھا، وہ تا عمر اس میں درس دیتے رہے۔ ان کی وفات کے بعد شاہ ولی اللہ صاحب نے حجاز مقدس سے واپسی پر مدرسہ کی مسند تدریس کو زینت دی، اور کامل بارہ سال تک استغراق و محویت کے ساتھ اس خدمت کو انجام دیتے رہے، آپ کا شہرہ سن کر دور دراز ملکوں کے طلبہ دشوار گذار راستوں کو طے کر کے آتے اور اس درس گاہ میں داخل ہونے کو باعث صد افتخار و ناز سمجھتے تھے۔

مرحوم تذکرہ نویس شیخ رحیم بخشؒ، شاہ ولی اللہ صاحب کے ذکر میں تحریر فرماتے ہیں۔

"جب ہندوستان کے اقبال و یاوری کا ستارہ چمکا تو قدرت نے جولانگاہ حدیث کے شہسوار کو پیدا کیا، یعنی شاہ ولی اللہ صاحب اس سرزمین میں ظاہر ہوئے، جن کے علم و فضل کی صدائیں ہندوستانی حدود سے نکل کر عرب و عجم میں پہنچیں اور جن کی ربانی مقبولیت تمام بلاد اسلامیہ میں پھیل گئی چونکہ آپ علم و عمل دونوں میں خاص طور سے مشہور تھے اور آپکا علمی کمال اعلیٰ درجہ کی وقعت کے ساتھ لوگوں کے کانوں میں گونج رہا تھا، لہٰذا اطراف عالم کے لوگ بے اختیارانہ جوش کے ساتھ آپکی طرف کھنچے چلے آتے تھے اور آپ کی درس و تدریس کا بازار ہر وقت گرم رہتا تھا آپ نے بڑی ستعدی

---

۱ معارف ج ۲۲ ع ۵ ص ۳۴۳ ۲ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۵۱

اور سرگرمی کے ساتھ علم نبوی کی اشاعت میں کوشش کی اور اپنی انتھک کوششوں سے علم نبوی کو اس قدر رواج دیا کہ اب شیخ محدث دہلوی کی ڈالی ہوئی بنیادیں آسمان سے باتیں کرنے لگ گئیں [1]۔

یوں تو شاہ صاحب کو تمام ہی علوم اسلامیہ میں مہارت تامہ اور ید طولیٰ حاصل تھا لیکن علم حدیث و تفسیر میں وہ خصوصی درک اور ملکہ کے حامل تھے آپ کی جدوجہد سے ہندوستان کی فضائیں قال اللہ وقال الرسول کے نغموں سے معمور ہو گئی تھیں اور یہی علوم جو پستی و تاریکی میں گم تھے ان کا ایسا چرچا ہوا کہ علماء کے ہر حلقہ اور طلبہ کے ہر استدلال میں حدیث کے مقدس الفاظ کی گونج سنائی دینے لگی اور حقیقت تو یہ ہے کہ سرزمین ہند پر یہ شاہ صاحب کا ایسا گرانبار احسان ہے جس سے سبکدوش ہونا محال ہے۔

نواب صدیق حسن خاں فرماتے ہیں کہ "اگر شاہ ولی اللہ صاحب کا وجود مسعود گزشتہ زمانے میں ہوتا تو ان کا شمار ائمہ کرام اور مجتہدین عظام کے زمرہ میں کیا جاتا [2]"

شاہ صاحبؒ کی شہرہ آفاق تصنیف حجۃ اللہ البالغۃ کے متعلق نواب صاحب موصوف لکھتے ہیں کہ "وہ اگرچہ علم حدیث میں نہیں ہے لیکن احادیث کی شرح اور اس کے اسرار و حکم اس کتاب میں بکثرت موجود ہیں، اور یہ کتاب اس پایہ کی ہے کہ عرب و عجم کے علماء نے اس کے مثل اب تک کوئی کتاب تصنیف نہیں کی [3]"

حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ فرماتے تھے کہ "اگر سرزمین ہند میں صرف شاہ ولی اللہ دہلوی ہی پیدا ہوتے تو ہندوستان کے لئے یہ فخر کافی تھا [4]"

علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ

"اللہ تعالیٰ نے شاہ صاحب کی حسن نیت کا ثمرہ یہ دیا کہ ان کو ایسی لائق اولادیں دیں جنہوں نے اپنے والد بزرگوار کے ناتمام کاموں کی پوری تکمیل کی، اور ہندوستان کے گوشہ گوشہ کو پیغام نبوی کے آوازہ سے معمور کر دیا [5]"

۱۱۷۶ھ میں شمع حدیث نبوی کا یہ پروانہ اپنی حیات مستعار کے آخری سانس تک آقائے مدنی سے

---

[1] حیات ولی ص ۱۵۰ [2] اتحاف النبلاء ص ۴۳۰ [3] ایضاً ص ۴۳ [4] الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر [5] معارف ج ۲۲ ع ۵ ص ۲۲۴

سرگوشی کرتا ہوا ابدی نیند سو گیا، فرحمہ اللہ وجزاہ عن المسلمین کافۃ،

شاہ صاحب نے چار اولاد امجاد یادگار چھوڑیں، شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر، شاہ عبدالغنی رحمہم اللہ، ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ ماہ کامل تھا۔

شاہ عبدالعزیز دہلوی

۱۱۵۹ھ میں ولادت باسعادت ہوئی، تاریخی نام غلام حلیم تھا[1]۔ شاہ عبدالعزیز صاحب کی تعلیم و تربیت کے تمام مدارج ان کے والد ماجد کی زیر نگرانی انجام پائے اور پندرہ سال کی صغر سنی ہی میں وہ علوم اسلامیہ حدیث و فقہ وغیرہ سے فارغ ہو گئے، ۱۷ سال کی عمر میں والد کا سایہ عاطفت سر سے اٹھ گیا، چونکہ آپ ہی تمام بھائیوں میں مسن ہونے کے ساتھ علم میں بھی ممتاز و فائق تھے اس لئے ولی اللہی مسند تحدیث و خلافت آپ ہی کو تفویض ہوئی، ہندوستان میں جس قدر بھی محدثین ہوئے یا ہیں سب کا سلسلہ شاہ عبدالعزیز صاحب ہی کے واسطے سے شاہ ولی اللہ پر منتہی ہوتا ہے[2]۔

شاہ عبدالعزیز صاحب نے اپنے پدر بزرگوار کے شروع کئے ہوئے کاموں کو آگے بڑھایا، درس و تدریس کا ہنگامہ برپا کیا اور علم حدیث و سنت کو فروغ دیا، احیائے شریعت اور تجدید دین کی راہ میں بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔

آپ کی درس گاہ سے فارغ ہو کر جو تلامذہ علم و ادب میں مشہور عام ہوئے ان کی تعداد شمار سے باہر ہے اس دور میں جتنے محدثین اساتذۂ حدیث تیار ہوئے وہ سب درحقیقت آپ ہی کے فیض یافتہ تھے، انھوں نے اطراف ملک میں منتشر ہو کر "اخبرنا" اور "حدثنا" کا غلغلہ بلند کیا۔

شاہ عبدالعزیز صاحب کی اہم تصانیف میں ان کی تفسیر "فتح العزیز" ہے جو فارسی زبان میں ہے فن حدیث سے متعلق ان کی کتاب "بستان المحدثین" حدیث میں ان کی وسعت نظر کی دلیل ہے اور اصول حدیث میں "عجالہ نافعہ" مختصر ہونے کے باوجود بے نظیر تالیف ہے۔ اہل تشیع کے رد میں ان کی کتاب "تحفۂ اثنا عشریہ" اپنے موضوع میں حرف آخر کہی جا سکتی ہے[3]، اس کے علاوہ مختلف موضوعات

---

[1] ابجد العلوم ص ۹۱۵ [2] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۲۲ [3] حیات ولی ص ۵۸۶

پر ان کی بہت سی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تالیفات ہیں، ابھی حال میں مولانا نسیم احمد صاحب فریدی امروہوی نے "الفرقان" میں شاہ صاحب کا تذکرہ لکھا ہے اس میں ان کی تالیفات کے استقصا کی کوشش کی ہے، مولانا کا یہ مضمون مختصر ہونے کے باوجود تحقیقی اور جامع ہے۔

شاہ صاحب نے شوال ۱۲۳۹ھ میں وفات پائی، مولانا نسیم احمد صاحب فریدی نے مرض وفات اور وفات کا بیان بھی تفصیل سے کیا ہے۔

شیخ محسن علی نے آپ کی تاریخ وفات کے متعلق کسی کا یہ شعر نقل کیا ہے ؎

یہ بود یا آنکہ انداز دو صد سیاد اجل　　عقل تو دید لطف و کرم فضل ظہور علاء عمل

جس سے ۱۲۳۹ھ کی تاریخ نکلتی ہے۔ تذکرۂ علمائے ہند صـ۱۲۲ ——— حکیم مومن خاں نے بھی "تاڑ سر لطف و علم" تاریخ نکالی ہے، تاریخ وفات نکالی ہے۔ تراجم علمائے اہل حدیث صـ۲۳

شاہ رفیع الدین دہلوی

یہ عمر میں شاہ عبد العزیز صاحب سے چھوٹے تھے علم حدیث و تفسیر کی سند اپنے پدر بزرگوار سے حاصل کی، علوم دینیہ و عقلیہ میں مجتہدانہ کمال رکھتے تھے اگر شاہ ولی اللہ صاحب کے فیض کو سب سے زیادہ شاہ عبد العزیز صاحب نے عام کیا، لیکن جب وہ مکفوف البصر اور ضعیف المزاج ہو گئے تو اس وقت جس ذات نے ولی اللہی چشمہ فیض کو سنبھالا وہ شاہ رفیع الدین صاحب ہی تھے۔ ان کے درس کی شہرت سن سن کر دور دراز مقامات سے نہ صرف طلبہ بلکہ نامور فضلاء بھی آ آ کر اکٹھا ہو گئے تھے اور یہاں اپنے فضل و کمال کے شاہ رفیع الدین صاحب کی شان تبحر علمی کو دیکھ کر متحیر و ششدر رہ جاتے[۲]

شاہ رفیع الدین صاحب کا سب سے عظیم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ایسے وقت میں قرآن پاک کا ملکی زبان اردو میں تحت اللفظ ترجمہ کیا کہ اگر اس وقت یہ خدمت انجام نہ پاتی تو پھر کسی کی ہمت نہ پڑتی، ترجمہ کی خوبی یہ ہے کہ آج بھی اس سے بہتر اور صحیح تر ترجمہ مشکل ہے آج بھی قرآنیات کا طالب علم اس ترجمہ سے مستغنی نہیں ہے، بقول مولانا سید سلیمان ندوی شاہ رفیع الدین کے اس شہرۂ آفاق ترجمہ نے لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کو دین و ایمان کی راہ بتائی۔[۳] آپ کی تصنیفات میں تکمیل الصناعہ، رسالہ دمغ الباطل اور اسرار المحبۃ یادگار ہیں۔[۴] ۱۲۴۹ھ میں علم و عمل

لے الفرقان بابت ... مختصر لے حیات ولی صـ۶۲۱ سے معارف ج ۲۲ ص ۵ ص ۳۴۴ سے ابجد العلوم صـ۹۱۵

کی یہ شمع فروزاں گل ہو گئی۔

شاہ عبدالقادر دھلوی

آپ نے دینیات وغیرہ علوم دینیہ کی تحصیل و تکمیل اپنے والد ماجد ہی سے کی تھی اور باطنی فیض دیگر اکابر دین و اہل کمال سے بھی حاصل کیا، فقہ، تفسیر اور حدیث میں ید طولی حاصل تھا حدیث کا درس بھی جاری کیا لیکن آپ پر استغنار کا غلبہ تھا، اہل دنیا اور ان کے جھگڑوں سے ہمیشہ کنارہ کش رہے اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنی عمر کا بیشتر حصہ مسجد اکبر آبادی میں بسر کیا، تحدیث و تدریس کی خدمات بھی انجام دیتے رہتے تھے، بقیہ وقت ذکر و فکر الٰہی میں گزارتے، یہی وجہ ہے کہ آپ کو تصنیفات کی طرف توجہ کرنے کی فرصت کم ملی، لیکن جس چیز نے آپ کو شہرت عام اور بقائے دوام عطا کیا وہ آپ کا ترجمہ قرآن ہے جو سلیس و بامحاورہ اردو میں ہے، جس کے متعلق بعض لکھنے والوں نے لکھا ہے کہ۔

"اگر اردو زبان میں قرآن مجید نازل ہوتا تو ان ہی محاورات کے لباس سے آراستہ ہوتا جن کی رعایت جناب شاہ عبدالقادر صاحب نے اس ترجمہ میں پیش نظر رکھی ہے۔"[1]

آپ بھی دیگر برادران عظام کی طرح علم و عمل کا مکمل نمونہ تھے، اساتذہ فن مثل علامہ فضل حق خیر آبادی اور شاہ محمد اسحاق آپ ہی کے فیض یافتہ ہیں، سنہ ۱۲۳۲ھ میں عالم بقا کو سدھارے۔

شاہ عبدالغنی دھلوی

شاہ ولی اللہ صاحب کے سب سے چھوٹے فرزند تھے لیکن مشیت الٰہی کے بموجب ان فرزندان ولی اللٰہی میں وفات کی ترتیب الٹی چلی، حتیٰ کہ شاہ عبدالعزیز صاحب کی زندگی ہی میں ان کے تینوں چھوٹے بھائی سفر آخرت اختیار کر چکے تھے، چنانچہ سب سے پہلے شاہ عبدالغنی صاحب ہی فوت ہوئے تھے۔

آپ نے علوم کی تکمیل کچھ تو اپنے والد سے کی اور کچھ برادر اکبر شاہ عبدالعزیز صاحب سے، علم و فضل اور باطنی فیض میں عام شہرت کے مالک تھے، تاحیات مشغلہ درس رہا، ظاہری وضع قطع میں شاہ ولی اللہ صاحب سے اس حد تک مشابہت رکھتے تھے کہ ان کو دیکھ کر ہر شخص مرحوم شاہ صاحب کی یاد تازہ کرتا تھا اولاد میں شاہ محمد اسماعیل کو یادگار چھوڑا جنھوں نے خود بھی اپنے علم و عمل کا سکہ جمایا۔

---

[1] حیات ولی ص ۶۴۱　[2] ابجد العلوم ص ۹۱۵

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ

آپ کی ذات وہ دامان عالی ولی اللہی کا تتمہ و تکملہ تھی، شاہ ولی اللہ صاحب نے جو چشمۂ فیض جاری کیا تھا اس میں ان کے پوتے نے اپنے خون کی بھی آمیزش کر کے اسے مزید اثر انگیز اور پر رعب بنا دیا تھا۔

شاہ شہیدؒ نے علوم کی تحصیل اپنے والد اور چچا شاہ عبدالعزیز سے کی، علم حدیث میں انھیں خصوصی درک حاصل تھا اور اس میں انھوں نے اتنا کمال پیدا کر لیا تھا، کہ بڑے بڑے مشاق اور تجربہ کار آپ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرنے کو باعث صد افتخار و ناز تصور کرتے، آپ کے کارنامے مسند تدریس سے زیادہ میدان تجدید و احیائے شریعت میں انجام پذیر ہوئے، انھوں نے بدعت، شرک و کفر اور ضلال و عصیان کی تاریکیوں کو اپنی اولوالعزمی اور ولی اللہی شان عزیمت سے کاٹنے اور چھانٹنے کا بیڑہ اٹھایا اور بالآخر اسے اپنے خون سے لالہ گوں کر کے چھوڑا۔

مولانا آزاد لکھتے ہیں۔

شاہ صاحب (شاہ ولی اللہ، ن) نے اپنے جامع و کامل ہونے کے ساتھ جو کچھ کیا وہ تجدید و تدوین علوم و معارف اور تعلیم و تربیت اصحاب استعداد تک محدود رہا اس سے آگے نہ بڑھ سکا"

"فعلاً عمل و نفاذ اور ظہور و شیوع کا پورا کام تو کسی دوسرے ہی مرد میدان کا منتظر تھا اور معلوم ہے کہ توفیق الٰہی نے یہ معاملہ صرف حضرت علامہ مجدد شہید کے لئے مخصوص کر دیا تھا، خود حضرت شاہ صاحبؒ کا بھی اس میں حصہ نہ تھا۔ خود شاہ صاحبؒ بھی اگر اس وقت ہوتے تو انھیں (شاہ اسمٰعیل شہید، ن) کے جھنڈے تلے نظر آتے [1]"

شاہ شہید کی دعوت عمل اور احیائے سنن کی جد و جہد سے ملک کی ساری فضا اسلامیت سے معمور ہو گئی تھی آپ کی مشہور تصنیف "تقویۃ الایمان" نے ہزاروں تاریک دلوں میں رشد و ہدایت کی قندیلیں فروزاں کیں۔ لاکھوں گم کردہ راہ مسافروں کو منزل مقصود کا پتہ دیا اور بے شمار پرستار حق، سنت کے متبع ہو گئے، شاہ صاحب کی یہ تصنیف اتنی معرکۃ الآرا ہے کہ مقلدین اور اہل حدیث باوصف باہمی آویزش کے اس کتاب کے گرویدہ و فریفتہ ہیں،

(باقی بر صفحہ ۲۵)

[1] تذکرہ آزاد: ص ۲۲۵

مرتب - مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی (اعظم گڑھ)

مجلس حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڑھی مدظلہ

الہ آباد، ۷؍ مئی ۱۹۷۵ء مطابق ۲۴؍ ربیع الثانی ۱۳۹۵ھ

دوسری حاضری کے بعد ۱۰؍ مارچ ۱۹۷۵ء کو اعظم گڑھ واپس آیا تو ارادہ تھا کہ جلدی پھر مولانا کی خدمت میں حاضری دوں گا، اور اپنی آمد کا خط بھی لکھ دیا مگر کچھ ایسے موانع در پیش آئے کہ نہ جا سکا، وقت پر نہ پہنچنے کی وجہ سے مولانا کو تشویش ہوئی، پہلے انھوں نے خیریت دریافت کرنے کے لیے خط لکھوایا پھر ایک آنے والے سے دستی رقعہ بھیجا کہ اپنی خیریت سے مطلع کرو! آنے والے صاحب نے بتایا کہ ایک ہفتہ سے وہ تم کو بار بار یاد کرتے ہیں اور خیریت معلوم کرنا چاہتے ہیں، مجھے بے غیرتی محسوس ہوئی کہ اس خلوص کا میں صرف کاغذی جواب دے دوں، اسی وقت یعنی ۷؍ مئی سنہ ۱۹۷۵ء کو ایک بجے دن میں الہ آباد روانہ ہو گیا، بس لیٹ ہو گئی اس وجہ سے عشا کے قریب وہاں پہنچا حضرت فتحپوری کے آستانہ پر سامان رکھا اور عشا کی نماز سے فارغ ہو کر مولانا عمار کی معیت میں مولانا کی قیام گاہ پہنچا، مولانا نے حسب عادت سلام و دعا کے بعد انتہائی محبت سے معانقہ کیا اور ایسا محسوس ہوا کہ ان کو میری آمد کا انتظار تھا، میں اس ارادہ سے گیا تھا کہ مولانا کی خدمت میں چند گھنٹے رہ کر دوسرے دن واپس آجاؤں گا، مگر صبح شام کرتے کرتے دو دن گزر گئے، رخصت ہونے سے پہلے دوسرے لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ محبت عجب چیز ہے، جب کسی سے محبت ہو جاتی ہے تو اس کی ملاقات سے دلی مسرت ہوتی ہے مگر اس کی جدائی سے غم ہوتا ہے پھر اپنا ایک شعر پڑھا

تِرا آنا مرے احساس میں جانِ مسرت ہے مگر جانا ستم ہے، غم ہے، حسرت ہے، قیامت ہے

اس کہنے اور شعر پڑھنے میں ایسا درد تھا کہ جی چاہتا تھا کہ بس اسی در پر پڑا رہا جائے، اس کے بعد مولانا تجمل حسین صاحبؒ کا واقعہ سنایا کہ وہ جب حضرت مولانا فضل رحمٰن صاحب گنج مرادآبادی کی خدمت سے برسوں کے بعد خلافت سے سرفراز ہو کر واپس ہونے لگے تو وہ زار و قطار رو رہے تھے حضرت گنج مرادآبادی نے انھیں تسکین دی اور رخصت کیا مگر حضرت پر بھی اس کا بے حد اثر تھا مگر انھوں نے ظاہر نہیں ہونے دیا ـــــ مولانا اپنے متوسلین اور اہل تعلق پر کتنی شفقت فرماتے ہیں اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھیں کبھی اس "وادی محبت اور شفقت میں رہنے کا اتفاق ہوا ہے" ـــــ حضرت کے ایک متوسل ریاض احمد اعظم گڑھ موضع کوٹلہ کے رہنے والے ہیں، مولانا ایک بار کوٹلہ تشریف لائے اور جب واپس ہونے لگے تو ریاض احمد صاحب پر مولانا کی جدائی کا اتنا اثر ہوا کہ وہ زار و قطار رو رہے تھے اور گھر سے ننگے پیر دور تک مولانا کو رخصت کرنے چلے گئے، اور پھر ایسا درد بھرا خط لکھا کہ مولانا پر جو خود سراپا درد و محبت ہیں ایک عجیب اثر پیدا ہو گیا اور اسی عالم میں ان کے لیے یہ اشعار لکھ ڈالے۔

لخت دل لخت جگر نور نظر ‌ ‌ ‌ ہے جدائی کا تری دل پر اثر

وقت رخصت جو ترے آنسو گرے ‌ ‌ ‌ وہ نہیں آنسو، وہ ہیں لعل و گہر

ہائے وہ ترا تڑپنا دیکھ کر ‌ ‌ ‌ دل پہ جو گذری کسے اس کی خبر

شعر یہ چسپاں ہے ترے حال پر ‌ ‌ ‌ لکھ رہا ہوں جس کو میں با چشم تر

[نے عزیزے نے قریبے نے شفیق ‌ ‌ ‌ نے کوئی غمخواراں کا نے رفیق]

{ ہوتے ہیں ہمراہ عاشق کے مگر ‌ ‌ ‌ آہ سرد و رنگ زرد و چشم تر }عہ

تو تڑپتا ہے کسی کی یاد میں ‌ ‌ ‌ حال تیرا ہے یہی المختصر

مرحبا صد مرحبا تو ہے مراد ‌ ‌ ‌ یہ کسی کی ہے دعاؤں کا اثر

یوں تو ہیں لاکھوں زمانے میں ریاض

تو مگر ہے واقعی چیزے دگر

عہ یہ دونوں شعر حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے ہیں۔

دو دن کی مجلس میں بہت سی مفید اور قیمتی باتیں سننا نصیب ہوئیں جی چاہتا تھا سب باتیں قلم بند کرلوں مگر ایسا نہ ہو سکا جو چند باتیں محفوظ ہو سکیں وہ درج ذیل ہیں:۔

فرمایا کہ مولانا فضل رحمٰن صاحب گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ قرآن پڑھنے میں جو لذت ملتی ہے اگر وہ تم لوگوں کو مل جائے تو تم کپڑا پھاڑ کر جنگل میں نکل جاؤ۔

فرمایا کہ شاہ عبدالغنی صاحب مجددیؒ دلی کی کسی مسجد میں نماز پڑھایا کرتے تھے، جمعہ کے دن ایک دیہاتی کہیں دور سے آیا اور ان کے پیچھے نماز پڑھی، نماز پڑھنے میں اس پر ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ بعد نماز کہنے لگا کہ "مولوی تم نے ہم کو ذبح کر دیا" آخری جملہ کو مولانا نے دو بار ایک خاص انداز کے ساتھ دہرایا۔

حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے درد و سوز اور فنائیت کا تفصیل سے ذکر کیا اور پھر ان کے کئی شعر سنائے دو تین شعر یاد رہ گئے ہیں۔

میں تو تام و نشاں بھلا بیٹھا — کسی نے شہرہ اڑا دیا میرا

ہے برا اچھا جو سمجھے آپ کو — اور بالاسب پر کھنیچے آپ کو

مردم دیدہ سے سیکھ امداد تو — سب کو دیکھے اور نہ دیکھے آپ کو

فرمایا کہ اللہ والے کبھی دل خوش کرنے والی باتیں بھی کرتے ہیں اور ہنستے بولتے بھی ہیں مگر ان کے ہنسنے کی مثال توے کے ہنسنے کی سی ہے، یعنی توے پر جو آگ کی لکیر پڑ جاتی ہے وہ اچھی لگتی ہے مگر اس پر کوئی ہاتھ نہیں رکھتا اگر ہاتھ رکھے گا تو رونے لگے گا، یہی حال بالکل اہل دل کا ہوتا ہے وہ بھی ہنستے بولتے ہیں لیکن ان کا دل درد و سوز سے بھرا ہوتا ہے جو چھوئے گا اس کی آنچ اس کو ضرور پہنچے گی، مگر لوگ ان کے دل کو چھوتے کہاں ہیں؟ جسم کو چھوتے ہیں اس لیے دل کی گرمی سے محروم رہتے ہیں

فرمایا کہ تصوف کا خلاصہ قرآن سے تعلق ہے پھر قرآن کی متعدد آیتیں، جن میں آل عمران کے آخری رکوع کی چند آیتیں بھی تھیں بڑے سوز سے پڑھیں اسی ضمن میں فرمایا کہ دعا کا اہتمام کرنا چاہیے، دعا مغز عبادت ہے، اس کہنے میں یقین و عزم اور محبت کی عجیب کیفیت تھی۔

فرمایا کہ شریعت کا دامن کبھی نہیں چھوڑنا چاہئے چاہے آدمی پر جو بھی کیفیت طاری ہو۔
اس ضمن میں فرمایا کہ سجدہ میں ایسا لطف آتا ہے کہ پڑے رہنے کا جی چاہتا ہے مگر حکم شریعت ہے
اس لیے فوراً اللہ اکبر کہکر سر اُٹھانا پڑتا ہے پھر خواجہ صاحب کا یہ شعر پڑھا

میں ہوں اور حشر تک اس در کی جبیں سائی ہے
سر زاہد نہیں یہ سر، سر سودائی ہے

فرمایا کہ اگر صرف عشق پر تکیہ کیا جائے تو وہ نہ جانے کس کھڈ میں گرا دے مگر شریعت کی رہنمائی توازن باقی رکھتی ہے، پھر مولانا نے اپنا کوئی شعر سنایا پھر اللہ کے ذکر و کبریائی کی کچھ بات کی اور اکبر الہ آبادی کے یہ اشعار بڑے وجد سے پڑھے۔

ہے وہ یہ نام خاک کو پاک کرے نکھار کر
ہے یہ وہ نام خار کو پھول کرے سنوار کر

ہے یہ وہ نام ارض کو کر دے سماں ابھار کر
اکبر اسی کا ذکر صدق سے بے شمار کر

فرمایا کہ دنیا کے سفر کے لیے لوگ سامان لیکر جاتے ہیں اور آخرت کے سفر میں سامان ساتھ نہیں جاتا بلکہ وہ سامان پہلے سے بھیج دیا جاتا ہے پھر بہت سی آیتیں پڑھیں مثلاً۔ وما تقدموا لأنفسکم من خیر تجدوہ عند اللہ" (تم اپنے لیے جو (اعمال) پہلے سے بھیج دوگے اللہ کے یہاں اسے پاؤ گے)" یوم ینظر المرء ما قدمت یداہ" (اس دن آدمی دیکھے گا کہ اس نے پہلے سے کیا بھیج رکھا ہے۔" علمت نفس ما قدمت و اخرت" ہر نفس اپنے اگلے پچھلے اعمال کو جان لے گا۔
ان آیتوں کو ایسے پرسوز انداز میں پڑھا کہ مجلس پر ایک رقّت کا سماں طاری ہو گیا۔
فرمایا کہ حضرت حاجی صاحبؒ کے یہاں ایک عالم آئے اور کہا کہ تمام باتیں کتابوں میں موجود ہیں پھر بزرگوں کے یہاں جانے کی کیا ضرورت ہے حاجی صاحب نے تسبیح کے دو تین دانے گنے اور توجہ دی وہ غش کھا کر گر گئے، جب کچھ دیر بعد افاقہ ہوا تو فرمایا سب کچھ کتابوں میں ہے گر یہ کہاں ہے؟
فرمایا کہ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب کے پڑوس میں ایک بڑھیا رہتی تھی اس نے ایک ایک

کوڑی کر کے دو پیسے جمع کیے (اس زمانہ میں کوڑیاں چلا کرتی تھیں) اور شاہ صاحب کی خدمت میں ہدیہ پیش کیا؟ شاہ صاحب نے یہ کہکر واپس کر دیا کہ مجھے حاجت نہیں ہے، بڑھیا واپس چلی گئی مگر اسے ہدیہ قبول کرنے سے بڑی تکلیف ہوئی، اسے اس سے اتنی اذیت ہوئی کہ کئی رات اس کی نیند حرام ہوگئی، اور شاہ صاحب پر فتوحات کا دروازہ بند ہوگیا اور نماز وغیرہ میں بے کیفی ہونے لگی، غور کرنے لگے کہ کونسی غلطی یا ایسا گناہ ہوگیا کہ یہ بات ہوگئی؟ تیسرے دن تہجد کے وقت اُٹھے تو ان کو خیال ہوا کہ شاید بڑھیا کا ہدیہ قبول نہ کرنے کی یہ سزا ہو، چنانچہ رات ہی میں اس کے پاس گئے، اور دروازہ کھٹکھٹایا، بڑھیا نے پوچھا کون! بولے عبدالقادر، پھر کہا اماں وہ پیسے مجھے دے دو! بڑھیا نے وہ پیسے دے دیے اور پھر اس نے اپنی بے چینی کا ذکر کیا، اس کے بعد بڑھیا کی بے چینی اور شاہ صاحب کی بے کیفی دور ہوئی، اور فتوحات کا دروازہ کھل گیا، خلوص کا ہدیہ تھا اس لیے اس کا نہ قبول کرنا بھی اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہوا،

فرمایا حضرت اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ انبیاء علیہم السلام سے ہدایت ملنے کے بہت سے طریقے ہیں مگر ان میں یہ پانچ چیزیں خاص ہیں ـــــ نزولِ رحمت، عقدِ ہمت، فیضِ صحبت، خرقِ عادت، اور موعظت، مولانا نے اس کی تفصیل اور وضاحت یہ کی :-

جس طرح زمین خشک ہو جاتی ہے تو بارش ہوتی ہے اور خشک زمین لہلہا اُٹھتی ہے اور جس زمین میں جتنی صلاحیت ہوتی ہے اس کو اتنا ہی فائدہ ہوتا ہے، اسی طرح انبیاء علیہم السلام کی بعثت ہے کہ اُن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی رحمت انسانوں کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ اب آدمی کے اندر جتنی صلاحیت ہوتی ہے اس کو اتنا فائدہ ہوتا ہے۔ اور عقد ہمت یہ ہے کہ انبیاء بندوں کی ہدایت کے لیے بے چین رہتے ہیں چنانچہ قرآن کے اندر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے بارے میں متعدد آیتیں نازل ہوئی ہیں۔ "لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ" (شاید اس غم میں کہ وہ ایمان نہیں لاتے اپنے کو ہلاک کر دیں گے) وَمَا اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰى (ہم نے آپ پر قرآن اس لیے نہیں نازل کیا کہ آپ شدید تکلیف میں مبتلا ہو جائیں) ان آیتوں میں آپ کے عزم و ارادہ فکر اور شدید جد و جہد کی طرف اشارہ ہے اسی کا نام ہے "عقد ہمت" (ہمت باندھنا)۔

فیض صحبت ایک کھلی ہوئی چیز ہے اس سے بے شمار لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے کم استعداد والے لوگوں کو معجزات کے ذریعہ فائدہ پہنچتا ہے "خرق عادت" کا مطلب یہی ہے اسی طرح وعظ و نصیحت سے بھی ہدایت کی سعادت حاصل ہوتی ہے اور یہ انبیا علیہم السلام کا خاص وظیفہ ہے۔ "اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ" (اللہ کے راستہ کی طرف حکمت سے اور اچھے انداز میں دعوت دیجیے)

فرمایا کہ حضرت بایزید بسطامیؒ فرماتے تھے کہ مجھے سب سے سخت گھاٹی توبہ کی نظر آئی حقوق اللہ سے توبہ اور پھر حقوق العباد سے توبہ تو بہت مشکل ہے، نہ جانے کتنے لوگوں کے حقوق آدمی کے ذمہ باقی رہ جاتے ہیں یہ قول نقل کرنے کے بعد اس کی تفصیل کرتے ہوئے مولانا نے قرآن کی یہ آیت تلاوت فرمائی۔

"ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِیْنَ عَمِلُوا السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْٓا اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ" (نحل رکوع ۱۵)

پھر آپ کا رب ان لوگوں کے لیے جنھوں نے غلطی سے گناہ کر لیا پھر انھوں نے توبہ کی اور اپنی اصلاح کر لی تو اس کے بعد آپ کا رب غفور رحیم ہے۔

فرمایا کہ اللہ تعالیٰ غفور الرحیم ضرور ہیں مگر اس کی رحمت پر تکیہ کر کے بے عملی اختیار نہیں کرنی چاہیے دیکھیے اس کی غفاریت اور رحمت کو متوجہ کرنے کے لیے قید لگی ہوئی ہے، پہلے توبہ پھر اعمال کی درستگی، چنانچہ پہلے "ثم تابوا من بعد ذالک واصلحوا" فرمایا —— اور اس کے بعد پھر فرمایا کہ بیشک تمہارا رب غفور الرحیم ہے۔ یعنی اس کی غفاریت اور رحمت توبہ واصلاح کے ساتھ مشروط ہے۔

فرمایا کہ ایک علم نبوت ہے اور دوسرے نور نبوت ہے، علم نبوت کتابوں کے اندر موجود ہے اور نور نبوت کو مشائخ سے حاصل کیا جاتا ہے، جو ان کے سینے میں ہوتا ہے اگر نور نبوت حاصل نہ ہو تو علم نبوت کا فیض بسا اوقات اس کی ذات کو بھی نہیں پہنچتا دوسروں کو کیا پہنچے گا، دیکھیے حضرت سید احمد شہید اور حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہما علم کے اعتبار سے بہت زیادہ نہیں تھے مگر تھوڑے ظاہری علم کے ساتھ اللہ نے ان کو نور نبوت عطا کیا تھا اس لیے مولانا اسمٰعیل شہیدؒ اور

مولانا عبد الحئی بڈھانوی جیسے علمائے روزگار سید شہید رحمۃ اللہ علیہ سے اس نور کو حاصل کرنے کے لیے آئے تھے، اسی طرح حاجی صاحب کے یہاں مولانا رشید احمد گنگوہیؒ مولانا محمد قاسمؒ اور مولانا یعقوب صاحبؒ اور دوسرے جید علماء حاضری دینے کو اپنی خوش بختی اور سعادت سمجھتے تھے۔

فرمایا کہ ایک بزرگ تھے وہ جب گھر سے باہر جاتے تھے تو اپنے لوگوں سے کہہ دیتے تھے کہ جب کوئی پوچھے کہ شیخ کہاں ہیں؟ تو کہہ دینا کہ ابھی آتے ہیں اور پھر ان کے سامنے کھانا پیش کر دینا، اگر پوچھیں کہ شیخ کہاں ہیں، تو کہنا کہ شیخ یہی ہیں، آنے والا کہتا کہ مذاق کرتے ہو، کہنے والا جواب میں کہتا کہ اس کھانے سے وہی فائدہ ہوگا جو شیخ سے ہوتا، اس کے بعد شیخ نے کہا کہ جب میں گھر سے جاتا ہوں تو اپنی نسبت کھانے میں منتقل کر دیتا ہوں[1] تاکہ یہاں آکر کوئی نامراد نہ جائے۔

(باقی)

---

[1] غالباً ان بزرگ کا طریقہ یہ ہوگا کہ جب کہیں باہر تشریف لے جاتے ہوں گے تو اللہ سے دعا کرتے ہوں گے کہ اے اللہ تیرے طالب بندوں کو جو فائدہ میرے ذریعہ سے ہوتا تھا اب وہی دینی و روحانی نفع ان کو میرے گھر کے کھانے کے ذریعہ ہو۔

(بقیہ صفحہ ۱۸)

اس کے علاوہ عبقات، صراط مستقیم، ایضاح الحق، رسالہ اصول فقہ، منصب امامت اور تنویر العینین وغیرہ تصنیفات یادگار ہیں۔

خاتمہ کلام

دودمان عالی ولی اللہی کی گرانقدر خدمات کا مذکورہ بالا اجمالی جائزہ لینے کے بعد اس حقیقت میں قطعی دورایوں کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ آج ہندوستان میں جہاں کہیں بھی قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی آواز سنائی دیتی ہے، وہ اسی خانوادۂ فضل و کمال کی خیر و برکت کی صدائے بازگشت ہے، اور اشاعت توحید و تبلیغ سنت کے جتنے بھی سلاسل نظر آتے ہیں،

"یہ سب پودا انھیں کی لگائی ہوئی ہے"۔

علامہ شیخ عبد اللہ بن حمید
الرئیس العام للاشراف الدینی علی المسجد الحرام (مکہ مکرمہ)

ترجمہ: خلیل الرحمٰن سجاد ندوی
متعلم جامعہ اسلامیہ (مدینہ منورہ)

رؤیت ہلال میں اختلاف مطالع کا اعتبار دلائل شرعیہ اور عقل کی روشنی میں

(دوسری اور آخری قسط)

فقہائے حنابلہ کے اقوال :-

(زیر بحث مسئلہ سے متعلق فقہائے حنفیہ، مالکیہ اور شافعیہ کی تصریحات ناظرین ملاحظہ فرما چکے) اب علمائے حنابلہ کے بھی چند اقوال ملاحظہ ہوں۔

"الانصاف" میں ہے کہ "ایک شہر والے چاند دیکھ لیں تو ساری دنیا کے مسلمانوں پر روزہ لازم ہو جائے گا۔ مطلع خواہ ایک ہو یا مختلف"۔۔۔۔ یہ اصل مذہب ہے لیکن یہ مسلک "مفردات" میں سے ہے (یعنی ائمہ مجتہدین میں سے یہ صرف امام احمد کا مسلک ہے، دوسرے تمام ائمہ اس کے خلاف ہیں)

شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا مختار یہ ہے کہ "جس شہر میں رمضان کا چاند نظر آئے، جس طرح وہاں کے باشندوں پر روزہ لازم ہو گا، اُسی طرح اُن لوگوں پر بھی لازم ہو گا جو اس مطلع کے قریب میں رہتے ہیں" نیز وہ فرماتے ہیں کہ "مطالع کے مختلف ہونے پر اصحاب معرفت کا اتفاق ہے۔ پس اگر دو شہروں کا مطلع ایک ہو تو ایک کی رویت سے دوسرے شہر والوں پر روزہ لازم ہو گا۔ دوسری صورت میں لازم نہ ہو گا"۔

اور کتاب "الرعایۃ الکبریٰ" میں ہے کہ "جس نے چاند نہیں دیکھا اس پر بھی وہ حکم لازم ہوجائیگا جو دیکھنے والے پر لازم ہے" ——— آگے فرماتے ہیں "مگر یہ اسی صورت میں ہے جب دونوں کا مطلع قریب یا ایک ہی ہو اور دونوں کے درمیان فاصلہ مسافتِ قصر سے کم ہو، اگر فاصلہ مسافت قصر سے زیادہ ہو تو یہ حکم نہیں ہے (ملخصاً)"

تو خود صاحب "الانصاف" نے صراحت کر دی ہے کہ یہ مذہب (کہ کسی ایک جگہ کی روایت کا اعتبار پورے عالم اسلامی اور تمام روئے زمین کے لیے ہو خواہ مطلع ایک ہو یا مختلف) "مفردات" میں سے ہے یعنی جمہور کے مسلک کے خلاف ہے۔ ناظم "المفردات" نے اپنے اس شعر میں اسی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

اذا رای الهلال اهل بلد صام جميع الناس فی الجود

(شعر کا مطلب یہ ہے کہ کسی ایک شہر میں رویت ہو جانے سے تمام روئے زمین کے مسلمانوں پر روزہ اور افطار لازم ہو جانا صرف امام احمدؒ ہی کا مذہب ہے) ——— لیکن درحقیقت بات ایسی نہیں ہے، کیونکہ امام احمد کے علاوہ مالکیہ و حنفیہ کی ایک جماعت اور بعض شوافع کا بھی یہی مسلک ہے، مگر حق وہی ہے جو ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ ہر علاقہ کے لیے اسی علاقہ والوں کی رویت کا اعتبار ہوتا ہے۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ "جو لوگ فلکیات کے بارہ میں معرفت و بصیرت رکھتے ہیں ان کا مطالع کے مختلف ہونے پر اتفاق ہے۔ اگر مطلع ایک ہو تو روزہ رکھنا لازم ہوگا ورنہ نہیں شافعیہ کا صحیح ترین قول یہی ہے، اور امام احمد کے مذہب میں بھی یہ ایک قول ہے۔"

نیز شیخ الاسلام نے فرمایا کہ "مشرق و مغرب کے اختلاف سے چاند کی رویت مختلف ہو جاتی ہے مشرق میں اگر چاند نظر آجائے تو مغرب میں ضرور دکھائی دے گا، لیکن مغرب میں چاند کے نظر آجانے سے مشرق میں دیکھا جانا ضروری نہیں، کیونکہ مغرب میں سورج کا غروب بہ نسبت مشرق کے دیر سے ہوتا ہے۔ اس اثنا میں چاند، سورج اور اس کی شعاعوں سے کچھ اور دور ہو کر اور زیادہ روشن ہو چکا ہوگا۔ تو مغرب میں رویت اور بھی واضح ہوگی۔ اور مغرب میں چاند کے نظر آنے سے مشرق میں نظر آنا ضروری نہیں، کیونکہ مغرب میں رویت اس وجہ سے ہو جاتی ہے کہ وہاں آفتاب دیر سے

غروب ہوتا ہے اور چاند سورج سے زیادہ دور ہو کر زیادہ روشن ہو جاتا ہے اور جس وقت سورج مشرق میں غروب ہوا تھا تو چاند اُس کے قریب تھا (اس لیے وہاں رویت نہیں ہو سکتی تھی) پھر یہ بات بھی ہے کہ جس وقت چاند مغرب میں دیکھا جاتا ہے اُس وقت مشرق کے مطلع سے وہ غروب ہو چکا ہوتا ہے، اس لیے وہاں رویت کا امکان ہی نہیں ہوتا ـــــ چاند اور سورج کے بارہ میں یہ بات جو کہی گئی ہے ایک محسوس حقیقت ہے۔ دیکھیے مغربی علاقہ میں نمازِ مغرب کا وقت آئے تو مشرقی علاقہ میں اُس سے پہلے ضرور آچکا ہوگا اور اس کے برعکس نہیں۔ ایسے ہی طلوعِ آفتاب کا معاملہ ہے اگر مغرب میں طلوع ہو جائے تو مشرق میں ضرور ہو چکا ہوگا اس کے برعکس نہیں ہو سکتا۔ آفتاب اور (چاند کے علاوہ) سارے تاروں کا طلوع مشرق میں پہلے ہوتا ہے اور مغرب میں بعد کو، لیکن چاند کا طلوع اور اُس کی رویت مغرب میں پہلے ہوتی ہے کیونکہ وہ مغرب میں طلوع ہوتا ہے اور چاند کے سوا آسمان کا کوئی ستارہ نہیں ہے جس کا طلوع مغرب سے ہوتا ہو ـــــ اور اس بنا پر کہ اس کے روشن و نمایاں ہونے کا سبب سورج سے دوری ہوتی ہے، سورج کا غروب جتنا متاخر ہوگا اتنا ہی چاند سورج سے دور ہوتا چلا جائے گا۔ اور اُس کے روشن اور نمایاں ہونے کی وجہ سے دیکھنے والوں کی نگاہیں اس کو دیکھ سکیں گی۔

نیز شیخ الاسلام نے فرمایا کہ اختلافِ مطالع کے معتبر ہونے کی نہایت روشن دلیل یہ بھی ہے کہ ہمیں یقین کے ساتھ معلوم ہے کہ عہدِ صحابہ و تابعین میں بعض اسلامی علاقوں میں چاند بعض دوسرے علاقوں کی بہ نسبت پہلے دیکھ لیا جاتا تھا، کیونکہ یہ ایک دائمی قدرتی نظام ہے کہ مغربی علاقوں میں چاند پہلے نظر آجائے اور مشرقی علاقوں میں بعد کو۔ اس میں زمانہ کے آگے پیچھے ہونے سے کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی اور یقیناً مہینہ کے اندر ہی ایک علاقہ والوں کو دوسرے علاقہ کی رویت کی اطلاع پہونچ جاتی ہوگی پس اگر بعد میں چاند دیکھنے والوں پر پہلے دیکھنے والوں کے حساب سے روزہ کی قضا واجب ہوتی تو تمام اسلامی علاقوں میں رویتِ ہلال کے بارہ میں معلومات حاصل کرنے کے لیے اسلاف پوری جدوجہد کرتے اور ممکنہ وسائل استعمال کرتے، جیسا کہ ایک شہر میں اہتمام کیا جاتا ہے۔ اور پھر اکثر رمضانوں میں پہلے روزہ کی قضا کسی نہ کسی جگہ ضرور واجب ہوا کرتی، اور اگر ایسا ہوتا تو نقل در نقل کے ذریعہ یہ باتیں ہم تک ضرور پہونچتیں۔ مگر ایسی کوئی چیز ہم تک نہیں پہونچی تو معلوم ہوا

کہ عہد صحابہ و تابعین میں ایسا نہیں ہوا ——— حضرت ابن عباس کی حدیث سے بھی (جو شروع میں ذکر کی جا چکی ہے) یہی معلوم ہوتا ہے۔"

یہ ہیں تمام مذاہب کے اکابر اہل علم کے اقوال۔ اِن سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ کسی ایک علاقہ اور شہر والوں کے چاند دیکھ لینے سے دور دراز کے دوسرے علاقوں اور شہروں میں اس کے مطابق عمل کرنا لازم نہیں ہوتا جبکہ مطلع مختلف ہو۔ چنانچہ صحابۂ کرام اس معاملہ میں دوسرے علاقوں سے خط کتابت نہیں کرتے تھے۔ اور نہ ہی دوسرے علاقوں کی رُویت کے بارہ میں تحقیق و تجسس کرتے تھے۔

یہ اکابر علماء جن کے اقوال ہم نے نقل کیے ان کا اعتماد اس بارہ میں حضرت ابن عباس کی حدیث اور دوسری حدیث صوموا لرؤیته وافطروا لرؤیته پر ہے۔ ان حدیثوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہر علاقہ والوں کے لیے اسی علاقہ کی رویت معتبر ہے ——— ہم نے علماء کے جو اقوال نقل کیے ہیں ہم انہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ طالبین حق کے لیے یہ کافی شافی ہیں۔ واللہ الموفق الہادی الی سواء السبیل

رُویت ہلال کا مسئلہ، جدید علم ہیئت اور جغرافیہ کی روشنی میں

ماہرین فن کا کہنا ہے کہ سورج کے غروب کے وقت چاند اگر کسی علاقہ میں آٹھ درجہ اونچا ہے یعنی اتنا اونچا ہے کہ سورج کے غروب ہونے کے بعد (۳۲) منٹ تک افق پر رہے گا تو ایسا چاند اُس علاقہ کے مشرق میں (۵۰۰) میل تک ضرور موجود ہے۔ اور اگر کوئی رکاوٹ بادل، گہرا غبار، یا اسی قسم کی کوئی اور کثیف چیز درمیان میں حائل نہ ہو تو یہ چاند مشرق میں اتنی مسافت تک ضرور اُفق پر دیکھا جا سکے گا۔ بعض اصحاب فن کا کہنا ہے کہ چاند ہر ستر میل پر ایک درجہ بڑھتا اور کم ہوتا ہے۔ مثلاً جس شہر پر چاند آٹھ درجہ پر تھا تو اس سے ستر میل مشرق میں جو شہر ہوگا اُس میں وہ سات درجہ پر ہوگا اور جو شہر ستر میل مغرب میں ہوگا وہاں چاند نو درجہ پر ہوگا ——— تو جب ایک شہر میں چاند نظر آ جائے تو جو علاقے اُس شہر سے مغرب میں ہیں اُن سب میں چاند ضرور ہوگا، یہ علم ہیئت کے مسلّمات بلکہ بدیہیات میں سے ہے، اور اگر کسی مغربی شہر میں چاند دیکھ لیا جائے تو اُس شہر سے مشرق کی سمت میں پانچسو ساٹھ (۵۶۰) میل تک چاند کا اعتبار کیا جائے گا لیکن اُس کے مغرب میں مطلقاً اعتبار نہ ہوگا۔ واللہ اعلم۔

اور شیخ محمد ابن عبد الوہاب ابن عبد الرزاق اپنی کتاب "خلاصۃ العذب المزلال"

میں لکھتے ہیں "یہ بدیہی بات ہے کہ سورج اور چاند کا اجتماع آن واحد میں ہوتا ہے علاقوں اور شہروں کے اختلاف سے اُس میں فرق نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ یہ اجتماع فلک پر ہے اور اُن امور نسبیہ میں سے نہیں ہے جو طول بلد کے اختلاف کی وجہ سے مختلف ہو جاتے ہیں۔ مثلاً فرض کیجیے کہ سورج اور چاند کا اجتماع مراکش کی نسبت سے ٹھیک دن کے ۱۲ بجے ہوا تو یہی لمحہ دنیا کے دوسرے شہروں میں اُن کے اجتماع کا وقت ہوگا بحالانکہ اُس وقت الجزائر میں ۱۲ بجکر ۴۴ منٹ کا وقت ہوگا۔ ٹیونس میں ۱ بجکر ۱۳ منٹ، قاہرہ میں ۲ بجکر ۴ منٹ، مکہ اور مدینہ میں ۳ بجکر ۱۲ منٹ، بمبئی (ہندوستان) میں ۵ بجکر ۳۲ منٹ، ٹوکیو (جاپان) میں رات کے ۹ بجکر ۱۵ منٹ، ہاوائی میں ۲ بجکر ۱۲ منٹ رات، نیویارک میں ۷ بجکر ۳۵ منٹ صبح کا وقت ہوگا ــــــ تو وقت اجتماع ایک ہے لیکن ہم اہل مراکش کی نسبت سے وہ زوال کا وقت ہے، مکہ اور مدینہ میں عصر کا وقت اور بمبئی میں قریب مغرب کا وقت ہے، ٹوکیو میں آدھی رات کے قریب اور ہاوائی میں فجر کا وقت ہے، نیویارک میں اشراق کا وقت ــــــ بعینہٖ یہی بات خسوف قمر کے بارہ میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ اس لیے کہ چاند کے ابتدائی ظہور اور درمیانی حالت اور مکمل ہونے کے اوقات طول بلد کے مختلف ہونے کی وجہ سے مختلف ہوتے ہیں۔ انتہیٰ

اس تفصیل سے ہلال کے مطالع کا مختلف ہونا واضح اور روشن ہو جاتا ہے۔ مثلاً چاند جب مغرب میں نظر آجائے تو دور مشرق میں اُس کی رویت دوسری رات میں ممکن ہوگی، کیونکہ مغرب میں چاند سورج کی شعاعوں سے الگ اور دور ہو گیا۔ اس لیے نظر آگیا۔ مگر جس وقت وہ مشرق میں تھا تو شعاعوں کے پردہ میں تھا۔ اس لیے اُس وقت اس کا دیکھنا وہاں ممکن نہیں تھا، کیونکہ مغرب و مشرق کے ان شہروں کے درمیان طویل مسافت ہے اور طول البلد و عرض البلد بھی مختلف ہے۔

علامہ احمد بن محمد السلاوی التطوانی فرماتے ہیں کہ "سورج اور چاند کا فلک و بروج کے ایک نقطہ میں اجتماع واحد شے ہے، علاقوں اور شہروں کے متعدد ہونے سے اُس میں تعدد نہیں ہوتا اور نہ ہی یہ طلوع و غروب اور زوال کی طرح امور نسبیہ میں سے ہے۔ کہ طول بلد کے اختلاف سے اس میں اختلاف ہو جائے، تو اس بنا پر اگر ہم فرض کریں کہ ان کا اجتماع "برج حمل" کے پہلے درجہ میں ہوا تھا جبکہ رات اور دن بالکل مساوی یعنی بارہ بارہ گھنٹے کے ہوتے ہیں، اور یہ اجتماع چاند اور سورج کا ٹھیک اس وقت ہوا جب مراکش کے شہر فاس میں آدھی رات تھی اور پھر یہ بھی

فرض کر لیا جائے کہ اجتماع کے وقت کی کم سے کم مدت جس کے بعد چاند کی رویت ممکن ہو جاتی ہے اٹھارہ گھنٹے ہے تو جس وقت فاس میں رویت کا وقت آئے گا یعنی سورج کے غروب کا وقت تو اہل فاس کی نسبت سے اٹھارہ گھنٹے گذر چکے ہوں گے، اس لیے انہیں چاند نظر آجائے گا مگر جب مکہ میں اسی دن آفتاب غروب ہوا تھا تو چونکہ سورج اور چاند کے اجتماع کے وقت سے اُس وقت تک اٹھارہ گھنٹے نہیں گزرے اس لیے اہل مکہ کے لیے اُس دن چاند کی رویت ممکن ہی نہیں ہے، اُن کو چاند اگلے ہی دن نظر آئے گا کیونکہ وہاں اجتماع کے وقت سے ابھی پندرہ ہی گھنٹے پورے ہوئے ہیں، کیونکہ مکہ میں سورج فاس سے تین گھنٹہ پہلے غروب ہو چکا ہے۔ مکہ اور فاس کے وقت غروب میں تین گھنٹہ کا فرق ہے، کیونکہ دونوں کے طول بلد میں پینتیس درجہ تفاوت ہے اس لیے غروب میں تین گھنٹہ کا فرق لازمی ہے۔

شیخ طنطاوی جوہری اپنے رسالہ میں لکھتے ہیں کہ کوئی علاقہ یا شہر مغرب کی سمت میں جس قدر زیادہ دور ہوگا اسی قدر وہاں ہلال زیادہ روشن اور نمایاں ہوگا اور طول بلد کے جس خط پر اُس کا ابتدائی ظہور ہوگا تو اس سے دور مشرق کے علاقوں میں اُس رات کو چاند نہیں دیکھا جا سکے گا۔ وہاں رویت اگلی ہی رات کو ہو گی —— یہ بات کریب کی حدیث سے بھی معلوم ہوتی ہے۔ انھوں نے ملک شام (دمشق) میں چاند شب جمعہ کو دیکھ لیا تھا اور مدینہ والوں نے اگلے دن شب شنبہ میں دیکھا۔ آپ دمشق کو دیکھیں وہ خط طول مشرقی جر نیتش (۳۵) پر واقع ہے، اور مدینہ خط طول مشرقی (۴۰) پر۔ اس کے آگے شیخ نے حلوان کی رسدگاہ کے مدیر عام کا یہ قول نقل کیا ہے۔ کہ جب مکہ مکرمہ میں چاند دیکھنا ممکن ہو تو دمشق (شام) میں اور مصر میں دیکھنا ضرور ممکن ہوتا ہے۔ بشرطیکہ وہاں مطلع صاف ہو۔ لیکن اُن علاقوں میں دیکھنا یقینی نہیں ہوگا جو مکہ کے خط طول پر واقع ہیں۔ جبکہ ان کے خط عرض البلد میں زیادہ فرق اور اختلاف ہو۔

شیخ طنطاوی جوہری مزید لکھتے ہیں کہ ہر وہ علاقہ جس میں سچ مچ چاند کی رویت ہو جائے تو اس کے سمت مغرب میں واقع تمام علاقوں میں یقیناً چاند دیکھا جائے گا اور وہ چاند زیادہ واضح اور زیادہ روشن ہوگا، خواہ بادل وغیرہ کسی مانع کی وجہ سے وہاں دیکھا نہ جاسکے۔ اور اس کے برعکس کسی مغربی علاقہ میں چاند کی رویت سے مشرقی علاقوں میں رویت لازمی نہیں واضح رہے کہ مغربی علاقہ سے مراد وہ علاقہ ہے جس کا طول بلد کم ہو، اور مشرقی علاقہ وہ ہے جس کا طول بلد زیادہ ہو ——

مثلاً کویت میں اگر چاند دیکھ لیا جائے جس کا طول بلد (۴۸) ہے تو ضروری نہیں کہ مسقط میں بھی دیکھ لیا جائے کیونکہ اس کا طول بلد (۵۸) اور یہ کویت سے کافی مشرق میں ہے۔ اسی طرح "شارقہ" جس کا طول ۵۵ درجہ ہے اور "قطیف" جس کا طول ۵۰ درجہ ہے، ضروری نہیں کہ اگر کویت میں رویت ہو تو ان میں (شارقہ اور قطیف میں) بھی رویت ہو جائے۔ ہاں بغداد، نجف اور کربلا جن کا طول بلد (۴۴)، (۴۴) درجہ ہے اور اسی طرح "سماوہ" جس کا طول (۴۵) درجہ ہے، ان سب میں چاند کویت کے ساتھ ہی نظر آجائے گا (کیونکہ ان سب کا طول بلد متقارب ہے) مشرق و مغرب کے سارے علاقوں کو اسی پر قیاس کر لیا جائے۔

باقی رہی یہ بات کہ اگر دو شہر طول بلد اور عرض بلد میں برابر ہوں جس طرح "بروسہ" ایشیائے کوچک میں اور "سکدار" اور "ازنان" یہ سب (۲۹) درجہ طول بلد پر ہیں، اور ان کا عرض بلد بھی (۴۰) کے قریب قریب ہے، تو ان کے بارہ میں ہم فیصلہ کریں گے کہ ان سب شہروں اور علاقوں میں چاند ایک ہی وقت طلوع کرے گا۔ اور اگر دو شہر طول بلد میں مساوی ہیں لیکن عرض بلد میں فرق ہے جیسا کہ عجم میں شہر "تبریز" ہے جس کا طول البلد (۴۶ ½) ہے اور بصرہ جس کا طول بلد (۴۷) درجہ ہے، مگر پہلے کا عرض البلد (۳۸) ہے اور دوسرے کا (۳۰) تو اس میں غور و فکر کرنا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ دونوں جگہ ساتھ ہی رویت ہو جائے گی کیونکہ دونوں کا طول بلد ایک ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ ایک جگہ رویت ہو اور دوسری جگہ نہ ہو کیونکہ عرض البلد میں (۸) درجہ کا فرق ہے اگرچہ عرض البلد کے اختلاف کا اثر بہت کم ہوتا ہے مگر کچھ نہ کچھ ہوتا ضرور ہے۔

موجودہ اسلامی ممالک اور "توحید اہلہ" کی تجویز

ہمارے اس دور میں اسلامی علاقوں، ملکوں اور اسلامی حکومتوں کے حالات اور رجحانات سے جو لوگ صحیح واقفیت رکھتے ہیں اور یہ صورت حال اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ مسلمان متفرق حکومتوں اور قومیتوں میں بٹ چکے ہیں اور خاص کر ارباب ریاست و حکومت اکثر و بیشتر دین و شریعت کے احکام سے بے پروا اور دور ہیں، اور قلب صحیح دینی جذبہ سے بھی خالی ہیں، ان کے خیالات و عزائم اور پالیسیوں پر اغراض کی حکمرانی ہے، ان میں سے کوئی کسی ایک طاقت ور حکومت کی طرف جھکا ہوا ہے اور کوئی اس کے مقابل کی دوسری طاقتور حکومت سے وابستہ ہے۔

تو ایسی حالت اور صورت میں تمام ممالک اسلامیہ میں "توحید اہلہ" کی تجویز کے نفاذ کا کوئی امکان نہیں ہے علاوہ یہ کہ اگر رویت کسی دوست اور ہم مسلک ملک میں ہوئی ہے اور وہاں سے اعلان کیا گیا ہے تو اہل حکومت اس کو مان لیں گے اور نافذ کریں گے لیکن اگر رویت کسی ایسے ملک میں ہوئی ہے جس سے تعلقات اچھے نہیں ہیں، سیاسی اور حکومتی اختلافات ہیں تو اس ملک کی رویت کے حکم کو اپنے ملک میں نافذ نہیں کیا جائے گا۔ اور ہر حکومت کے مفتی صاحبان کے لیے اپنی حکومت کے منشا کے مطابق فتویٰ دینا آسان ہوگا، کیونکہ کتب فقہ میں دونوں ہی قول مل جاتے ہیں۔ ان حالات میں اسلام اور اس کے احکام ان اہل حکومت کی خواہشات کے تابع اور کھلونا بن جائیں گے۔

میں صاف لفظوں میں کہنا چاہتا ہوں کہ عالم اسلام اس وقت ایسی متفرق ریاستوں اور مختلف قومیتوں میں تقسیم ہے جن کے رجحانات اور جن کی پالیسیاں مختلف ہیں، کسی کا میلان مغربی بلاک (اینگلو امریکن بلاک) کی طرف ہے اور کسی کا رخ مشرقی بلاک (روسی بلاک) کی طرف ہے، دوستی اور باہمی تعلقات بھی اسی اصول اور معیار سے بندھے ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ مسلم ممالک کے حکمرانوں میں بہت سے وہ بھی ہیں جو شریعت کو اپنے سیاسی مصالح اور حکومتی اغراض کے تحت لانے پر تلے ہوئے ہیں۔ اُن سے اس کے سوا کسی رویہ کی توقع نہیں کہ اگر کسی دوست اور ہم مسلک ملک میں چاند دیکھا گیا ہے تو وہ وہاں کی رویت کو اپنے ملک کے لیے بھی تسلیم کرتے ہوئے روزہ اور افطار وغیرہ کا فیصلہ کریں گے۔ اور اگر کسی ایسے ملک میں رویت ہوئی ہے اور رویت کا اعلان کیا گیا ہے جس کے ساتھ تعلقات اچھے نہیں ہیں تو وہ اس رویت کو نہ روزہ کے بارے میں تسلیم کریں گے نہ افطار کے بارے میں ــــ تو اگر بالفرض اس نظریہ کو حق بھی مان لیا جائے کہ کسی ایک جگہ چاند نظر آ جانے سے مشرق و مغرب سب جگہ کے لیے رویت ثابت ہو جاتی ہے، تب بھی آج کے عالم اسلامی میں عملاً اس کا نفاذ کسی طرح ممکن نہیں ہے ــــ رابطہ عالم اسلامی اور اس جیسی دوسری مسلم تنظیمیں خواہ کتنی ہی قرار دادیں کیوں نہ پاس کریں۔ واللہ المستعان

الحمد للہ کتاب و سنت اور مذاہب اربعہ کے اکابر علماء و فقہا کی تحقیقات و تصریحات کی روشنی میں یہ مسئلہ پوری طرح واضح ہو گیا کہ ایک ملک اور علاقہ کی رویت اسی ملک اور علاقہ کے لیے معتبر ہے۔

وصلی اللہ علی محمد وعلیٰ آلہ واصحبہ وسلم تسلیماً کثیراً الیٰ یوم الدین۔

محمد منظور نعمانی

ایک غیر مترقبہ نعمت

رمضان مبارک میں حرمین پاک کی حاضری

بالکل غیر متوقع طور پر گزشتہ رمضان مبارک میں "رابطۂ عالم اسلامی (مکہ مکرمہ)" کی بلائی ہوئی ایک کانفرنس کے طفیل حرمین شریفین کی حاضری اور چند روزہ قیام نصیب ہوا، اس سفر میں کچھ عجیب واقعات بھی پیش آئے، دل چاہا کہ قلم کی زبان سے ناظرین الفرقان کو بھی سنا دیے جائیں، ان میں لذت بھی ہے اور سبق بھی

زہے سعادت آں بندۂ کہ کرد نزول　　گہے بہ بیت خدا و گہے بہ بیت رسول

رمضان مبارک سے چند ہی روز پہلے اطلاع ملی کہ "رابطۂ عالم اسلامی (مکہ مکرمہ)" کی جانب سے رمضان مبارک کے تیسرے ہفتہ میں ایک موتمر (کانفرنس) بلائی جا رہی ہے جس میں اس کے مستقل ارکان کے علاوہ اور بھی بہت سے حضرات کو مدعو کیا جا رہا ہے۔ اس اطلاع کے چند روز بعد اس کا دعوت نامہ بھی راقم سطور کے نام آیا اور تار سے اطلاع ملی کہ "آپ کا ٹکٹ "ایر انڈیا" کے ذریعہ بھیجدیا گیا ہے آپ اس سے رابطہ قائم کیجیے اور تاریخ آمد سے مطلع کیجیے" —— میں نے "ایر انڈیا" کے دہلی کے دفتر کو لکھا کہ "رابطہ عالم اسلامی" کی طرف سے یہ اطلاع ملی ہے لیکن آپ کی طرف سے ٹکٹ کے بارہ میں کوئی اطلاع ابھی تک نہیں ملی، آپ مجھے مطلع کریں تاکہ میں سفر کے پروگرام کے بارہ میں فیصلہ کر سکوں —— مجھے اس کا کوئی جواب ایر انڈیا کے دفتر کی طرف سے نہیں ملا —— لکھنؤ میں بھی ایر انڈیا کا ایک برائے نام

سا دفتر ہے، احتیاطاً وہاں بھی دریافت کیا گیا، وہاں سے جواب ملا کہ "ہمارے پاس کوئی ٹکٹ نہیں آیا، اگر آیا ہوگا تو ہمارے دہلی کے دفتر آیا ہوگا ـــــ میں نے احتیاطاً بمبئی کے ایک دوست (حاجی محمد یعقوب صاحب) کو بھی لکھا تھا کہ وہ بمبئی کے ایرانڈیا کے دفتر سے بھی دریافت کریں، ممکن ہے ٹکٹ وہاں آیا ہو ـــــ انھوں نے مجھے لکھا کہ یہاں تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ ایرانڈیا کے یہاں کے دفتر میں آپ کا ٹکٹ نہیں آیا ہے ـــــ اسی کے ساتھ انھوں نے لکھا کہ یہی معاملہ مولانا محمد عمران خاں صاحب ندوی کے ساتھ بھی پیش آیا ہے ان کو بھی رابطہ کی طرف سے موتمر میں شرکت کی دعوت کے ساتھ اطلاع دی گئی تھی کہ آپ کا ٹکٹ ایرانڈیا کے ذریعہ بھیجدیا گیا ہے لیکن نہ دہلی کے ایرانڈیا کے دفتر سے اُن کے ٹکٹ کے بارہ میں کچھ معلوم ہو سکا نہ بمبئی کے دفتر سے۔ بہت تحقیق و جستجو کے بعد یہ معلوم ہوا کہ اُن کا ٹکٹ بھوپال کے دفتر میں آیا ہوا ہے اور اس دفتر نے مولانا کو کوئی اطلاع ٹکٹ کے بارے میں نہیں دی ہے اب وہ ٹکٹ وہاں سے بمبئی منگوایا گیا ہے۔ ممکن ہے اسی طرح آپ کا ٹکٹ لکھنؤ کے ایرانڈیا کے دفتر میں آیا ہوا ہو آپ وہاں ضرور دریافت کرائیں!

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے لکھنؤ کے دفتر میں اپنا آدمی بھیجکر کئی دن پہلے دریافت کرا چکا تھا، اور وہاں سے جواب ملا تھا کہ ٹکٹ ہمارے ہاں نہیں آیا ـــــ لیکن حاجی محمد یعقوب صاحب کے اس خط کے بعد دوبارہ آدمی بھیجا تو اس کو بتایا گیا کہ " ہاں ۳-۴ دن پہلے ٹکٹ ہمارے یہاں آیا تھا لیکن ہم نے وہ اپنے دہلی کے دفتر کو بھیجدیا کیونکہ اس کو وہیں آنا چاہیے تھا" ـــــ مگر اس کے بعد جب دہلی کے دفتر ٹیلی فون کرکے دریافت کیا گیا تو پھر یہی جواب ملا کہ ہمارے ہاں کوئی ٹکٹ نہیں آیا ـــــ ایرانڈیا کے دفتر کے بارہ میں عجیب و غریب قسم کا یہ پہلا تجربہ ہوا ـــــ مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کا معاملہ بھی یہی ہوا ان کو بھی رابطہ کی طرف سے دعوت نامہ کے ساتھ اطلاع دی گئی تھی کہ آپ کا ٹکٹ ایرانڈیا کے ذریعہ بھیجدیا گیا ہے، لیکن ایرانڈیا کے دفتر سے جب بھی مفتی صاحب کی طرف سے دریافت کرایا گیا تو یہی جواب ملا کہ آپ کے ٹکٹ کے بارہ میں ہمارے ہاں کوئی اطلاع نہیں۔

مجھے چونکہ ایرانڈیا کے لکھنؤ کے دفتر سے یہ اطلاع مل گئی تھی کہ چند روز پہلے میرا ٹکٹ

وہاں آیا تھا جس کو انھوں نے اپنے دہلی کے دفتر بھیجدیا ہے۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ خود دہلی جاؤں اگر وہاں ایرانڈیا کے دفتر سے ٹکٹ مل جائے تو وہیں سے مکہ معظمہ کے لیے روانہ ہو جاؤں ورنہ واپس آجاؤں ——— یہ فیصلہ ۸ رمضان (۱۵ ستمبر) دوشنبہ کے دن عصر کے وقت کیا، جس ٹرین سے دہلی جانے کا ارادہ کیا وہ صرف ڈھائی تین گھنٹے کے بعد جانے والی تھی، رزرویشن کے لیے آدمی ریلوے اسٹیشن بھیجا، یہ ایمرجنسی کی کرامت تھی کہ ٹرین کے وقت سے صرف دو گھنٹے پہلے رزرویشن ہو گیا۔ اور میں رات کو ۸ بجے دہلی جانے والی ٹرین سے روانہ ہو گیا۔

۱۶ ستمبر کی صبح نئی دہلی کے اسٹیشن پر اتر کے سیدھا تبلیغی مرکز نظام الدین آیا، وہاں کے معمول کے مطابق حضرت مولانا محمد عمر صاحب پالن پوری کا بیان ہو رہا تھا، اُس کے اچھے خاصے حصہ میں شرکت نصیب ہوئی اور بعض بڑی قیمتی نصیحتیں اور دینی حقیقتیں سننے کو ملیں۔ اللہ تعالیٰ اُن سے فائدہ اُٹھانے کی توفیق دے، یہ اس سفر کی پہلی برکت تھی۔

کچھ دیر کے بعد اپنے عنایت فرما محمد یونس سلیم صاحب ایم۔پی سے ٹیلی فون پہ بات کی انھوں نے فرمایا کہ آپ میرے پاس آجائیے میں خود ایرانڈیا کے دفتر چلوں گا اور انشاء اللہ سفر کے سارے مرحلے طے ہو جائیں گے۔ چنانچہ میں اُن کے ہاں پہنچ گیا، وہ مجھے ساتھ لیکر پہلے ایرانڈیا کے دفتر پہنچے ——— ٹکٹ کا مسئلہ وہاں کے جن صاحب سے متعلق تھا وہ محمد یونس سلیم صاحب کے شناسا تھے اُن کو بتلایا گیا کہ "رابطہ عالم اسلامی (مکہ مکرمہ)" نے تار سے یہ اطلاع دی ہے کہ میرا ٹکٹ ایرانڈیا کے ذریعہ بھیجا گیا ہے اور آپ کے لکھنؤ کے دفتر نے بتلایا ہے کہ ٹکٹ یہاں آیا تھا لیکن انہوں نے وہ دہلی کے دفتر بھیجدیا ہے۔ اس لیے ٹکٹ آپ کے ہاں ہونا چاہیے ——— انھوں نے اسی وقت تلاش کرایا اور تحقیق و تلاش کے بعد بھی یہی کہا کہ ہمارے دفتر میں آپ کا ٹکٹ نہیں آیا ——— محمد یونس سلیم صاحب نے اُن سے کہا کہ آپ ابھی لکھنؤ کے اپنے دفتر کو ٹیلی فون کر کے دریافت کیجیے، چنانچہ انھوں نے لکھنؤ کے دفتر ٹیلی فون کر کے دریافت کیا تو وہاں سے بتلایا گیا کہ ٹکٹ فلاں تاریخ کو ہمارے ہاں آیا تھا اور ہم نے فلاں تاریخ کو آپ کے ہاں روانہ کر دیا ——— آخر کار لکھنؤ کے دفتر کی اس اطلاع پر دہلی کے دفتر نے میرے لیے

جدہ کا واپسی ٹکٹ جاری کرنے کی ذمہ داری قبول کرلی۔۔۔۔۔ اب سفر کے لیے دو چیزیں اور ضروری تھیں ایک سعودی سفارت خانہ سے ویزا حاصل کرنا۔ اور دوسرے ریزروبنک سے پی فارم پاس کرانا۔۔۔۔ ٹکٹ کے کام سے فارغ ہو کر ہم لوگ سعودی سفارت خانے پہنچے، وہاں کام کا وقت صرف ایک بجے تک ہے اس کے بعد بند ہو جاتا ہے، ہم لوگ کافی دیر کے بعد پہنچے، معلوم ہوا کہ وقت ختم اور کام بند ہو چکا ہے اور ویزا کا تعلق جن صاحب سے ہے وہ اپنے مکان جا چکے ہیں۔۔۔ یونس سلیم صاحب نے اُن صاحب کو سفارت خانے ہی سے ٹیلی فون کیا اور کہا کہ ہم لوگ بعد از وقت پہنچے لیکن ویزا آج ہی لینا ضروری ہے، انھوں نے کہا کہ بہت اچھا میں تھوڑی دیر کے بعد سفارت خانہ آؤں گا اور ویزا آج ہی مل جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اللہ تعالیٰ اُن کو اس عنایت کی بہتر جزا عطا فرمائے۔

اس کے بعد یونس سلیم صاحب پی فارم کا آخری مرحلہ طے کرنے کے لیے مجھے ساتھ لیکر متعلقہ دفتر پہنچے لیکن میرا پاسپورٹ حفیظ سلمہ کے پاس تھا جو اس سفر میں دہلی تک میرے ساتھ گئے تھے اور وہ ایک غلط فہمی کی وجہ سے وقت پر اُس کو ہمارے پاس نہیں پہنچا سکے اور پی فارم کے لیے اُس کا ہونا ضروری تھا اس لیے پی فارم کا مرحلہ اُس دن طے ہونے سے رہ گیا، اب دن بھی قریب الختم تھا اور روزہ کے افطار کا وقت بھی قریب، یونس سلیم صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ آپ روزہ میرے ساتھ ہی افطار کریں اور کھانا بھی ساتھ ہی کھائیں اور رات کو قیام بھی یہیں رہے، میں نے عرض کیا کہ قیام تو مرکز نظام الدین میں رہے گا اور عشا اور تراویح بھی انشاءاللہ وہیں پڑھوں گا، اس لیے میری سہولت اس میں ہے کہ میں ابھی چلا جاؤں اور افطار بھی وہیں کروں۔۔۔۔۔۔

مجھے ایک اسکوٹر مل گیا اور میں اُس سے نظام الدین کے لیے روانہ ہو گیا۔۔۔۔۔ مرکز پہنچ کے اتر گیا اور غفلت سے بیگ اسکوٹر ہی میں چھوڑ دیا۔۔۔ اس بیگ میں دوسرے ضروری کاغذات کے علاوہ میرا صحت سارٹیفکٹ بھی تھا جس کے بغیر سفر نہیں ہو سکتا تھا اور سفر ہی کی ضروریات کے لیے کچھ رقم بھی تھی۔ میں اسکوٹر سے اتر کے مسجد میں داخل ہی ہوا تھا کہ مجھے بیگ یاد آگیا، فوراً ہی پلٹ کے دیکھا تو اسکوٹر واپس جا چکا تھا اور میں نے اُس کا نمبر بھی نوٹ نہیں کیا تھا۔۔۔ اپنی غلطی اور غفلت پر ایسا شدید صدمہ ہوا اور اتنی سخت پریشانی لاحق ہوئی کہ زندگی میں کم ہی ایسا

ہوا ہو گا۔ بڑا افسوس اور قلق اس کا تھا کہ یونس سلیم صاحب نے دن بھر دوڑ دھوپ کر کے سفر کے سارے مرحلے طے کرائے اور میری اس غلطی اور غفلت سے اُن کی ساری محنت بھی ضائع ہو گئی بظاہر اب سفر کا کوئی امکان نہیں رہا ـــــ مرکز کے برابر ہی میں پولیس اسٹیشن ہے، وہاں کے ذمہ داروں سے بھی بات کی انھوں نے کہا جب اسکوٹر کا نمبر بھی معلوم نہیں ہے اور آپ بتاتے ہیں کہ بیگ میں کچھ رقم بھی ہے تو پھر تو بظاہر اُس کے ملنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اگر رقم نہ ہوتی تو کچھ امید ہو سکتی تھی۔ ـــــ اس حادثہ کا علم حضرت مولانا انعام الحسن صاحب مولانا محمد عمر صاحب اور مرکز کے دوسرے اکابر کو بھی ہو گیا ـــــ میری پریشانی سے ان حضرات کے قلب بھی بےچین ہوئے، سب ہی حضرات نے اہتمام سے دعا فرمائی صرف اس دعا ہی کا کرشمہ کہا جا سکتا ہے کہ آدھ گھنٹہ بھی نہ گزرا ہو گا کہ پولیس اسٹیشن کا ایک آدمی آیا اور اُس نے کہا کہ وہ اسکوٹر والا آپ کا بیگ لے کر آیا ہے اور آپ کو تلاش کر رہا ہے جتنا شدید صدمہ تھا اتنی ہی غیر معمولی خوشی ہوئی، میں نے اُس سے اپنا وہ بیگ لیا اپنے کریم پروردگار کا شکر ادا کیا اور انعام کے طور پر تیس روپئے اس اسکوٹر والے کو دیے۔ بعض احباب نے کہا کہ آپ نے زیادہ دے دیا اس کو خوش کرنے کے لیے دس پندرہ روپئے کافی تھے ـــــ میں نے کہا کہ میں نے دانستہ زیادہ اس لیے دیا کہ اگر آئندہ کبھی ایسا ہی کوئی واقعہ پیش آئے اور کسی بندہ کا سامان اسی طرح چھوٹ جائے تو یہ اچھے انعام کی امید پر اسی طرح اس کو پہنچانے کی کوشش کرے ـــــ اس سفر کے واقعات میں یہ واقعہ بھی یادگار رہے گا۔

اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ پی فارم کا مرحلہ آج طے ہونے سے رہ گیا تھا ـــــ اگلے دن وہ بھی حاصل کر لیا گیا۔ اب سفر کے لیے صرف سیٹ رزرو ہونے کا کام باقی تھا، اور وقت پر مکہ معظمہ پہنچنے کے لیے سفر آج ہی ہونا ضروری تھا اور دہلی سے بمبئی جانے کے لیے اب کوئی ایسا ہوائی جہاز نہیں تھا جس سے بمبئی پہنچکر وہ سعودی طیارہ پکڑا جا سکے جو آج ہی رات کو بمبئی سے براہ راست جدہ جانے والا تھا (اور سعودی سفارت خانہ نے سعودی ایرلائنز کے بمبئی کے دفتر کو ٹیلیفون کر کے اُس میں میرے لیے بھی سیٹ محفوظ کرا دی تھی) ایرانڈیا کے وہ افسر جن سے

میرے مسئلہ کا تعلق تھا انھوں نے بڑی ہمدردی سے ہوائی جہازوں کے پروگرام دیکھے اور کہا کہ سب سے زیادہ محفوظ اور قابل اطمینان صورت یہ ہے کہ آپ آج رات کو کویت جانے والے ایرانڈیا کے ہوائی جہاز سے کویت چلے جائیں اور کل دن میں کویت رہیں اور وہاں سے شام کو جدہ جانے والے سعودی ہوائی جہاز سے جدہ پہنچ جائیں۔ ہم نے کہا جب آپ کے نزدیک یہی صورت زیادہ قابل اطمینان ہے تو اسی طرح رزرویشن کر دیجئے۔ انھوں نے کہا لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ کے پاس کویت کا پاسپورٹ ہو، میرے پاسپورٹ میں کویت کا اندراج نہیں تھا، یونس سلیم کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے وہ مجھے ساتھ لے کر اسی وقت پاسپورٹ آفس آئے اور کھڑے کھڑے پاسپورٹ میں کویت کا اندراج کرایا، وہاں سے ایرانڈیا کے دفتر آکر براہ کویت جدہ کے لیے رزرویشن کرایا۔

جس ہوائی جہاز سے مجھے کویت جانا تھا اس کے پہنچنے کا وقت آدھی رات کے بعد تھا، مجھے بتایا گیا کہ ایرانڈیا کی طرف سے وہاں میرے قیام کا انتظام ایک ہوٹل میں ہوگا —— یہ شام کا وقت تھا اور انتظار میں تھوڑا سا وقت باقی تھا، میں نے اسی وقت حفیظ میاں کو مولانا محمد عمر صاحب پالن پوری کی خدمت میں مرکز نظام الدین بھیجا، مولانا موصوف کی ڈائری میں تبلیغی کام سے تعلق رکھنے والے مختلف ملکوں اور شہروں کے مخلص دوستوں اور رفیقوں کے پتے محفوظ رہتے ہیں، میں نے حفیظ میاں سے کہا کہ مولانا سے دریافت کر کے کویت کے ایک دو دوستوں کے پتے اور ٹیلی فون نمبر نوٹ کر لاؤ، وہ گئے اور نوٹ کر لائے۔

رات کو ۹ بجے کے قریب میں دہلی سے ایرانڈیا کے ہوائی جہاز سے روانہ ہوا، میں سمجھ رہا تھا کہ یہ سیدھا کویت جائے گا۔ لیکن معلوم ہوا کہ یہ پہلے بمبئی جائے گا۔ قریباً دو گھنٹے میں وہ بمبئی کے ہوائی اڈہ پر اترا، اُس وقت معلوم ہوا کہ یہاں سے کویت دوسرے طیارہ سے جانا ہوگا قریباً ایک گھنٹہ کے بعد ہم لوگوں کو لیکر ایرانڈیا ہی کا دوسرا طیارہ روانہ ہوا، اُس نے آدھی رات کے بعد کویت پہنچایا، اسی وقت مجھے ہوٹل پہنچا دیا گیا۔ میں نے سحر کا آخری وقت دریافت کیا جو مجھے بتلا دیا گیا، میں نے کہا کہ سحر کا کھانا مجھے آدھ گھنٹہ پہلے بھیج دیا جائے۔ ایسا ہی ہوا، کھانا عربوں والا تھا، سحر کے بعد فجر کی نماز سے فارغ ہو کر میں اطمینان سے سو گیا، صبح ۸ بجے

کے بعد اٹھا، کویت میں تبلیغی کام سے خاص تعلق رکھنے والوں میں ایک دوست عبدالباسط صاحب ہیں
اُن کا ٹیلی فون نمبر مولانا محمد عمر صاحب نے نوٹ کرا دیا تھا، ۹ بجے کے قریب میں نے اُن کو ٹیلی فون
کیا اور اپنے بارہ میں اطلاع دی، وہ چند دوستوں کے ساتھ فوراً ہی ہوٹل تشریف لے آئے اور
مجھے ساتھ لے گئے، پہلی دفعہ کویت کا تبلیغی مرکز دیکھا، وہیں دوستوں کے ساتھ وقت گزارا اور
آرام کیا۔ حسن اتفاق سے جمعرات کا دن تھا اور وہاں کے ہفتہ وار تبلیغی اجتماع کا وقت بعد عصر
تھا، اُس میں بھی کچھ شرکت ہوئی، وہیں سے ہوائی اڈہ کے لیے روانہ ہوئے، جس طیارہ سے
مجھے وہاں سے جدہ جانا تھا اُس کی روانگی کا وقت مغرب سے قریباً آدھ گھنٹہ بعد تھا، میرے
لیے افطار اور کھانے کا سامان بھائی عبدالباسط صاحب اور دوسرے احباب ساتھ لائے تھے لیکن
ہوائی اڈہ پر ایک بڑا خوش کن منظر دیکھا — ۵۰-۶۰ یا اس سے بھی زیادہ میزیں لگی ہوئی تھیں،
اُن پر تمام روزہ دار مسافروں کے لیے اور ہوائی اڈہ کے عملہ کے لیے افطار اور کھانے کا بہت اعلیٰ
قسم کا سامان قرینہ سے چنا ہوا تھا، ہر میز کے گرد چار کرسیاں تھیں، گویا کم از کم دو ڈھائی سو لوگوں
کے افطار اور کھانے کا سامان تھا، افطار کے وقت تک قریباً ساری کرسیاں بھر گئیں، معلوم ہوا
کہ وہاں کی حکومت کی طرف سے پورے رمضان مبارک میں روزانہ یہ انتظام اسی طرح ہوتا ہے۔
بڑا ہی جی خوش ہوا اور دل سے دعا نکلی —— وقت ہو جانے پر سب نے افطار کیا اور اسی کے
ساتھ گویا کھانا کھا لیا گیا، ہوائی اڈہ ہی پر مغرب کی نماز بڑی جماعت کے ساتھ پڑھی، اور فوراً
ہی طیارہ پر سوار ہو گئے جو ریاض ہو کر جدہ کی طرف پرواز کے لیے تیار کھڑا تھا۔ طیارہ کویت سے
اڑ کر ریاض ہی کے ہوائی اڈہ پر اترا، پاسپورٹ اور صحت سرٹیفکیٹ وغیرہ کی ساری دیکھ بھال وہیں
ہوئی، یہاں ایک غیر متوقع سعادت یہ نصیب ہوئی کہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی
(کراچی) کی زیارت ہوائی اڈہ پر ہوئی۔ حضرت ممدوح بھی رابطہ کی اسی موتمر میں شرکت کے
لیے مکہ معظمہ تشریف لے جا رہے تھے، وہ کراچی سے آنے والے کسی ہوائی جہاز سے ریاض کے ہوائی
اڈہ پر پہلے اتر چکے تھے ... مختلف ذرائع سے یہ اطلاعیں مل رہی تھیں کہ حضرت مفتی صاحب
سخت مریض ہیں ... مستقل صاحب فراش ہیں، اس لیے اس کا تصور بھی نہیں تھا کہ وہ قابل
سفر ہو سکیں گے اور کسی موقع پر ان سے ملاقات ہو سکے گی، لیکن الحمد للہ مفتی صاحب کو اچھے

حال میں دیکھا۔ عشا کی نماز ریاض میں ہوائی اڈہ پر اُن ہی کی اقتدا میں پڑھی، اُن کے صاحبزادے مولانا تقی عثمانی مدیر "البلاغ کراچی" اور اُن سے بڑے بھائی محمد رفیع عثمانی بھی حضرت مفتی صاحب کے ساتھ تھے ان دونوں کو پہلی ہی مرتبہ دیکھا۔ یہ بھی اس سفر کی برکات اور مغتنمات میں سے ہے ـــــ اللّٰھم لک الحمد ولک الشکر ـــــ ریاض کے ہوائی اڈہ ہی پر راقم سطور نے عمرہ کا احرام باندھا ـــــ ریاض سے روانہ ہو کر ہمارا طیارہ جدہ کے مطار پہ اترا ـــــ میں نے اپنی آمد کی اطلاع کویت سے بذریعہ تار رابطہ کو دیدی تھی جیسے ہی میں اترا رابطہ کے کارکنوں نے مکہ معظمہ جانے کے لیے مجھے ایک کار دیدی اور بتلایا کہ یہ کار مستقل طور سے میرے ہی سپرد رہے گی اس کا سواق (ڈرائیور) جس کا نام عبداللہ تھا۔ بہت ہی شریف اور بھلا آدمی تھا۔ حجاز مقدس میں بھی ڈرائیوروں کی برادری میں ایسے شریف اور بھلے آدمی شاذونادر ہی ہوتے ہیں (یہ بھی اس عاجز پر اللہ تعالیٰ کا خاص کرم تھا ورنہ اکثر حضرات کو ڈرائیوروں کا سخت شاکی پایا) یہ جمعرات اور جمعہ کی درمیانی شب تھی۔ رابطہ کے کارکنوں نے یہ بھی بتلایا تھا کہ قیام کا انتظام فندق الفتح میں کیا گیا ہے اور مجھے وہیں پہنچنا ہے ـــــ میں جدہ سے روانہ ہو کر رات کو ۱۲ بجے کے قریب مکہ معظمہ فندق الفتح پہنچا، یہ حرم شریف کے باب ابراہیم کے سامنے واقع ہے فاصلہ دو ڈھائی سو قدم ہوگا ـــــ میں نے مناسب سمجھا کہ اس وقت آرام نہ کروں بلکہ پہلے عمرہ سے فراغت حاصل کرلوں، چنانچہ وضو کر کے حرم شریف آیا، عمرہ کا طواف کیا، پھر رکعتین طواف پڑھ کر ملتزم پہ حاضر ہوا اور اللہ تعالیٰ نے جو دعا نصیب فرمائی وہ کی ـــــ اس کے بعد حجر اسود کا استلام کر کے سعی کے لیے صفا پر آیا اور سعی شروع کی، سعی سے فارغ ہو کر مروہ کے پاس ہی ایک حجام نے حلق کی دوکان پر آیا اور صرف قصر کرایا ـــــ عمرہ سے فارغ ہو کے ہوٹل الفتح آیا، مہمانوں کے سحر کھانے کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا، تھوڑا سا آرام کر کے سحر کھائی، اور پھر مسجد حرام آگیا اور فجر کی نماز پڑھ کے ہوٹل کے کمرہ میں آکے آرام کیا ـــــ اس کمرہ میں تین حضرات پہلے سے مقیم تھے، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی، مولانا مختار احمد صاحب ندوی (بمبئی) مولانا عبدالوحید صاحب (بنارس) انہی حضرات کے ساتھ ہم تھا میں ہو گیا۔ پہلی رات یہاں گزارنے کے بعد میں نے مناسب سمجھا کہ رات کو بجائے ہوٹل کے عزیز مکرم مولانا عبداللہ عباس ندوی کے ہاں قیام کروں، چنانچہ مکہ معظمہ کے قیام کی اکثر راتوں میں

وہیں قیام رہا اور اس کی وجہ سے بڑی راحت رہی، ہوٹل میں مہمانوں کی تعداد حساب سے بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ میں نے سنا کہ موتمر کے لیے دعوت قریباً دو سو حضرات کو دی گئی تھی لیکن آمد چار سو سے زیادہ ہوگئی۔ واللہ اعلم

میرے سب سے چھوٹے لڑکے خلیل الرحمان سجاد سلمہ جو جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں زیر تعلیم ہیں یہ زمانہ اُن کی تعطیل کا تھا، وہ میرے پہنچنے سے پہلے سے مکہ معظمہ میں مقیم تھے، لیکن جمعہ کا پورا دن گزر گیا اور مجھے اُن کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ مغرب سے پہلے میں نے طواف کیا، طواف سے فارغ ہو کر مطاف ہی میں کھڑا تھا ایک دوست سے ملاقات ہوئی، انھوں نے کہا سجاد میاں تو یہیں ہیں کیا وہ آپ کو مل گئے؟ میں نے کہا ابھی تک نہیں ملے اور شاید انھیں اس کا علم بھی نہیں ہو سکا کہ میں آگیا ہوں۔ جس وقت میں اُن دوست سے مطاف میں کھڑا ہوا یہ بات کر رہا تھا سجاد سلمہ میرے پاس ہی کھڑے تھے انھوں نے مجھ سے مصافحہ بھی کیا تھا لیکن میں بات کرنے والے اُن دوست کی طرف متوجہ تھا اس لیے میں نے ان کو اچھی طرح دیکھا بھی نہیں اور اس وجہ سے پہچانا نہیں اُن دوست ہی نے کہا کہ آپ کے سجاد تو یہ آپ کے پاس کھڑے ہیں ـــــ یہ بھی اس سفر کا ایک اعجوبہ تھا۔

"موتمر رسالۃ المسجد" کا اجلاس اعلان کے مطابق اگلے دن پندرہ رمضان (۲۰ ستمبر) شنبہ سے شروع ہوا اور ۱۸ رمضان تک جاری رہا، قریباً تمام اُن ملکوں کے نمایندے موتمر میں شریک تھے جن میں مسلمانوں کی قابل لحاظ آبادی ہے، معلوم ہوا تھا کہ مندوبین کی تعداد چار سو سے اوپر ہو گئی ہے۔ ان سب کے مصارف سفر اور مصارف قیام کی کفالت رابطہ نے کی۔ ہمارے ملک ہندوستان کے جس کا شمار اسلامی ممالک میں نہیں غالباً ۹ مندوب تھے۔ مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی، مولانا محمد طیب صاحب (مہتمم دارالعلوم دیوبند) اور ان کے صاحبزادے مولانا محمد سالم صاحب، مولانا محمد عمران خاں صاحب ندوی ازہری بھوپال، مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی (امیر شریعت بہار و اڑیسہ) مولانا مختار احمد صاحب ندوی (بمبئی) مولانا عبدالوحید صاحب (ناظم مرکزی دارالعلوم بنارس) ڈاکٹر عبدالحفیظ صاحب سلفی (دربھنگہ۔بہار) اور یہ عاجز راقم سطور رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ) جو رابطۂ عالم اسلامی کے مستقل بنیادی رکن ہیں، آخر اکتوبر میں ہونے والے ندوۃ العلماء کے عالمی اجلاس کے سلسلے کی مصروفیتوں کی وجہ سے موتمر میں شرکت نہیں کر سکے اور خاص کر ہم لوگوں کے نقطۂ نگاہ سے یہ بہت بڑی کمی رہی۔

مؤتمر کے چار دن کے اجلاسوں میں جو کچھ ہوا اور جو قراردادیں پاس ہوئیں اس کا ایک مستقل مقالہ میں ذکر کیا جاسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مؤتمر کی ساری کارروائی اور اس کی تجاویز اور منصوبوں کو امت مسلمہ کے لیے اور پورے عالم اسلامی کے لیے بلکہ پوری انسانی دنیا کے لیے خیر وسعادت کا وسیلہ بنائے۔
جیسا کہ ذکر کیا گیا مؤتمر کے اجلاسوں کا سلسلہ ۱۰ رمضان کو ختم ہوگیا اس کے بعد مندوبین سے کہدیا گیا کہ جو موٹریں ان کو استعمال کے لیے دی گئی ہیں وہ اگر چاہیں تو انہی موٹروں سے ۲-۳ دن کے لیے وہ مدینہ طیبہ چلے جائیں، رابطہ ہی کی طرف سے وہاں کے ہوٹلوں میں اُن کے قیام کا انتظام ہوگا۔ بہت سے مندوبین نے ایسا ہی کیا، راقم سطور بھی ۱۹ کی صبح کو فجر کی نماز پڑھنے کے بعد روانہ ہوگیا۔ سجاد سلمہ میرے ساتھ تھے، ہمارے سواق عبداللہ نے صرف ۷ گھنٹے میں مدینہ طیبہ پہنچادیا، قیام فندق التیسیر میں طے ہوا، سامان وغیرہ رکھ کے مسجد شریف میں حاضری ہوئی پہلے دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور حسب توفیق دعا کی، اس کے بعد روضۂ اقدس پر حاضر ہوکر سلام عرض کیا۔ اور جو کچھ عرض کرنا مناسب سمجھا عرض کیا ـــــ ظہر کی نماز ادا کرکے قیام گاہ پہ واپسی ہوئی ـــــ مکہ معظمہ میں بھی موسم بہت گرم اور سخت تھا لیکن مدینہ طیبہ آکر اندازہ ہوا کہ ان دنوں یہاں کا موسم وہاں سے زیادہ گرم اور زیادہ سخت ہے ـــــ ظہر اور عصر میں ہوٹل سے مسجد شریف تک آتے ہوئے حلق اور زبان میں اتنی خشکی ہوجاتی تھی کہ بولا نہیں جاسکتا تھا اور نماز میں الفاظ صحیح ادا ہونے مشکل ہوتے تھے ـــــ بمبئی کے ایک نہایت مخلص دوست صوفی عبدالرحمان صاحب جن کے دو صاحبزادے جدہ ہی میں مقیم ہیں اپنے اہل خانہ کے ساتھ رمضان مبارک سے پہلے ہی حج کے ارادہ سے حجاز مقدس پہنچ گئے ہیں، جب تک ہم لوگ مکہ معظمہ رہے وہ وہیں تھے اور جب ہم ۱۹ رمضان کو مدینہ طیبہ حاضر ہوئے تو ان کو وہاں موجود پایا، جدہ کے نور ولی خاندان کے بھائی محمد نور بھی ان دنوں مدینہ طیبہ ہی میں تھے، افطار کے وقت ان دونوں کرم فرما مخلصوں کا دستر خوان مسجد شریف میں ایک متعین جگہ پر روزانہ لگتا تھا۔ حضرت مولانا محمد طیب صاحب، مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب، مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی، مولانا محمد عمران خاں صاحب اور یہ عاجز ہم سب روزانہ انہی حضرات کے دستر خوان پر افطار کرتے تھے، ہم میں سے جس کا قیام جب تک مدینہ طیبہ میں رہا یہی معمول رہا۔

مکہ معظمہ سے روانہ ہوتے وقت میرا خیال تھا کہ بس ۲-۳ دن مدینہ طیبہ رہ کے واپس آجاؤں گا اور پھر عید تک مکہ مکرمہ ہی میں رہوں گا، لیکن وہاں پہنچکر جلدی واپسی کے لیے طبیعت آمادہ نہیں ہوئی، حجاز مقدس میں تبلیغی جماعت کے امیر یا تبلیغی کام کے ذمہ دار مولانا سعید احمد خاں صاحب ہیں، مدینہ طیبہ ہی میں اُن کا قیام رہتا ہے۔ حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ حیات ہی سے مجھے ان سے خاص عقیدت ہے۔ ۲۰ رمضان کی شام کو میں نے ان سے مشورہ کیا اور عرض کیا کہ میں خود فیصلہ نہیں کر سک رہا ہوں، آپ طے فرما دیجیے کہ میرے لیے کیا بہتر ہے؟ انھوں نے فرمایا میری رائے ہے کہ آپ یہیں قیام کریں اور آخری عشرہ کا یہیں اعتکاف کریں ——— میں نے یہی طے کر لیا، رابطہ کی موٹر واپس کر دی اور ہوٹل سے مسجد شریف آگیا ——— حقیقت یہ ہے کہ اعتکاف بس اتنا ہی نصیب ہوا کہ اپنے جسم کو دس دن کے لیے مسجد شریف میں مقید کر دیا ——— فقہی لحاظ سے تو بظاہر یہ اعتکاف تھا لیکن اعتکاف کی جو حقیقت ہے اس کا شاید ذرہ بھی نصیب نہ ہو سکا۔

بزمیں چو سجدہ کردم ز زمیں ندا بر آمد　　　کہ مرا خراب کردی تو بسجدۂ ریائی

بطواف کعبہ رفتم بحرم رہم نہ دادند　　　کہ برون در چہ کردی کہ درون خانہ آئی

بہر حال دس دن اور دس راتیں مسجد شریف ہی میں گزاریں (کھانے اور اس طرح کی دوسری ساری ضروریات کا اہتمام مولانا سعید احمد خاں صاحب فرماتے رہے) باب مجیدی کے داہنی جانب کے ایک حصہ میں معتکفین کی اچھی خاصی تعداد تھی، سرسری اندازہ یہ ہے کہ سو کے لگ بھگ ہوں گے لیکن ان میں زیادہ تر بلکہ قریباً تمام تر پاکستان یا ہندوستان ہی کے تھے، ان میں حضرت مولانا محمد یوسف بنوری اور اُن کے چند رفقا بھی تھے۔ اس نام ہی کے اعتکاف کی وجہ سے مدت مدید کے بعد مولانا موصوف کے ساتھ ایسی یکجائی اور مختلف موضوعات پر گفتگو کا موقعہ ملا اور تفصیل سے معلوم ہو سکا کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا کو پاکستان میں کتنی عظیم علمی اور دینی خدمتوں کی توفیق بخشی ہے اور وہ اپنے اساتذہ اور اسلاف کی جانشینی کا کیسا حق ادا کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کی اور اُن کے قلب کی حفاظت فرمائے اور اس کی غیبی تائید و نصرت اُن کے شامل حال رہے۔

حضرت شیخ الحدیث مدظلہٗ کے ایک خادم عبدالقدیر صاحب مدینہ طیبہ میں مقیم ہیں، یہ اصلاً

غالباً حیدرآباد کے ہیں اُن کا مستقل معمول تھا کہ وہ پلاسٹک کی ایک بوتل آب زمزم سے بھری ہوئی ریفریجریٹر کے ذریعہ ٹھنڈی کی ہوئی اور مدینہ شریف کی چند کھجوریں جن میں سے گٹھلی نکال کر اس کی جگہ نہایت نفیس مکھن بھرا ہوا ہوتا افطار کے وقت روزانہ پہونچا دیتے، یہ اُن کا بڑا ہی لذیذ اور گراں قدر تحفہ ہوتا! اور ان کا یہ معاملہ صرف میرے ہی ساتھ نہ تھا اور بھی متعدد حضرات کو وہ یہ دونوں تحفے اسی طرح پہونچاتے تھے۔ اُن کو اس کا اتنا اہتمام تھا کہ آب زمزم کا ذخیرہ ایک دن جب اُن کے پاس ختم ہوگیا تو مکہ معظمہ سے اُس کے لانے کے لیے انھوں نے ایک دن مستقل سفر کیا۔ رات میں مکہ معظمہ کے لیے روانہ ہوئے اور اگلے دن لیکر واپس آگئے —— اللہ تعالیٰ ان کی اس عنایت کا دنیا اور آخرت میں اُن کو بہتر سے بہتر صلہ عطا فرمائے۔

رمضان المبارک کی ۲۸ ویں شب تھی ہمارے ہاں کے حساب سے رات کے قریباً ۲ بجے ہوں گے یہ عاجز روضۂ اقدس پر سلام عرض کر کے اپنے قیام کی جگہ واپس آرہا تھا راستے میں دیکھا کہ ایک قاری صاحب نوافل میں قرآن مجید پڑھ رہے ہیں، کچھ حضرات ان کے پیچھے مقتدی بن کر سن رہے ہیں، ان کی قرأت بڑی دلکش تھی، چند منٹ کھڑے ہو کر سنا، پھر میں بھی نیت کر کے اُن کے مقتدیوں کی صف میں شامل ہوگیا۔ انھوں نے دو رکعتوں میں اٹھائیسواں اور انتیسواں پارہ پڑھا۔ اتنی دلکش قرأت کا سننا کبھی یاد نہیں۔ فارغ ہونے کے بعد میں نے تعارف حاصل کیا تو معلوم ہوا کہ وہ میرے جاننے والے اور بہت تعلق رکھنے والے ہیں، ان کا نام حافظ قاری مقبول احمد صاحب ہے۔ پاکستانی ہیں اب عرصہ سے امریکا میں مقیم ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ امریکا میں اُن سے دین کی بڑی خدمت لے رہا ہے۔ بہت سے امریکن اُن کے ذریعہ اسلام کے حلقہ بگوش ہو چکے ہیں —— اگلی رات یعنی ۲۹ ویں شب پھر اسی جگہ انھوں نے آخری پارہ دو رکعت میں سنایا اور گویا ان کا قرآن مجید ختم ہوگیا۔ ان سے عرض کیا گیا کہ اگر آج ۲۹ کو رویت نہ ہو تو آئندہ شب بھی یہ سلسلہ جاری رہے۔ اللہ نے ایسا ہی کیا ۲۹ کو رویت نہیں ہوئی تو تیسویں کی رات میں بھی انھوں نے ہر رکعت میں قریباً دو پارے سنائے، ان کی قرأت کی لذت و حلاوت ہمیشہ یاد رہے گی —— اگر اللہ تعالیٰ مسجد نبوی ہی کی ان کی قرأت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنوا دیتا ہوگا تو یقیناً آپ کو بے حد خوشی ہوتی ہوگی۔

جیسا کہ عرض کیا گیا اس سال حجاز مقدس میں پورے ۳۰ روزے ہوئے۔ یہ بات بڑی افسوسناک ہے کہ بعض حلقے سعودی حکومت کے خلاف بہت ہی بے اصل قسم کی بدگمانیاں رکھتے ہیں اور بہت ہی ناخدا ترساطریقہ پر اُن کو پھیلاتے اور اُن کا پروپیگنڈہ کرتے ہیں۔ انہی میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بعض لوگوں نے خود مجھ سے کہا کہ یہ لوگ (یعنی حکومت سعودیہ کے ذمہ داران کے علماء) کبھی ۳۰ روزے پورے نہیں ہونے دیتے۔ ہمیشہ یہاں ۲۹ ہی کی عید ہوتی ہے۔ ایک صاحب نے اس دفعہ بھی کہا کہ میں ۲۰ سال سے یہاں ہوں کبھی ۳۰ روزے نہیں ہوئے۔ یہ لوگ ہمیشہ ۲۹ رمضان کو رویت کا اعلان کر دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ ہمارے صوفی سید عبدالرب صاحبؒ کے بڑے صاحبزادے خالد سلمہٗ جدہ میں ہیں، انھوں نے بتلایا کہ مجھے یہاں آئے ہوئے ۵-۶ سال ہوئے ہیں، میرے اس قیام کے زمانہ میں بھی ایک دفعہ ۳۰ کا رمضان ہوا ہے۔ اسی طرح کی باتوں میں سے ایک یہ بھی ہے جس کو بعض لوگوں سے تو راقم نے خود بھی سنا کہ یہ لوگ (سعودی حکومت والے) کبھی حج اکبر نہیں ہونے دیتے یعنی ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ وقوف عرفہ جمعہ کو ہو۔ جب کبھی رویت کے حساب سے ایسا ہونے والا ہوتا ہے تو یہ لوگ تاریخ میں گڑبڑ کر کے وقوف عرفہ جمعرات کو یا سنیچر کو کرا دیتے ہیں۔ یہ بھی سراسر جھوٹ اور بہتان ہے۔ خود راقم سطور کو دو دفعہ اسی حکومت کے زمانہ میں ایسا موقع نصیب ہوا ہے کہ وقوف عرفہ جمعہ کو ہوا۔ بہرحال حجاز مقدس میں اس سال رمضان المبارک ۳۰ دن کا ہوا۔ اور عید دوشنبہ (۶ اکتوبر) کو ہوئی۔

ناظرین کو معلوم ہے کہ مولوی عتیق الرحمٰن سلمہ کی صحت ۸-۱۰ سال سے مسلسل خراب چل رہی تھی جس کی وجہ سے الفرقان کے لیے بھی وہ شاذونادر ہی کچھ لکھ پاتے تھے اور گزشتہ دو شماروں سے ناظرین کو یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ انگلستان کے بعض مخلصین کی دعوت پر وہ اسی امید پر وہاں چلے گئے تھے کہ اللہ تعالیٰ شاید اس سفر ہی کو اُن کے لیے صحت کا وسیلہ بنا دے۔ الحمدللہ ایسا ہی ہوا جیسا کہ گزشتہ شمارہ میں شائع ہونے والے اُن کے مکتوب سے ناظرین کرام کو معلوم ہو چکا ہے۔ پہلے ہی سے اُن کا یہ پروگرام طے تھا کہ انشاء اللہ اواخر رمضان مبارک میں وہ حجاز مقدس پہنچ جائیں گے اور پھر اللہ تعالیٰ کی توفیق اگر شامل حال رہی تو حج تک وہیں قیام

کریں گے ۔۔۔ چنانچہ ۲۲ر رمضان مبارک (۲۷ر ستمبر) کو وہ مکہ مکرمہ پہنچ گئے پانچ دن وہیں مولانا عبداللہ عباس صاحب کے پاس قیام رہا، ۲۷ر رمضان مبارک کو وہ میرے پاس مدینہ طیبہ آ گئے، مولانا سعید احمد خاں صاحب نے ان کو بھی اپنا مستقل مہمان بنا لیا۔

مولوی وقار عظیم اعظمی ندوی سلمہم اللہ تعالیٰ جامعہ اسلامیہ (مدینہ منورہ) میں زیر تعلیم اور خلیل الرحمن سجاد سلمہ کے خاص رفیق ہیں، انھوں نے پورے اس سفر میں میری خدمت اور راحت رسانی کی فکر سجاد میاں سے کم نہیں کچھ زیادہ ہی کی، ان کی نیکی اور حقیقی دینداری نے بھی بہت متاثر کیا، ہمارے بڑے مدرسوں اور دارالعلوموں پر جو لاکھوں سالانہ صرف ہوتے ہیں اگر اس کے نتیجے میں دو چار فی صدی بھی ایسے صاحب صلاح اور باصلاحیت پیدا ہوتے رہیں تو یہ سودا گراں نہیں ہے۔ میں جب تک مکہ معظمہ رہا مولوی وقار عظیم سلمہ میرے ساتھ رہے؛ پھر جب میں مدینہ طیبہ آنے لگا تو اس لیے مکہ معظمہ ٹھہر گئے کہ امروز فردا میں مولوی عتیق الرحمٰن کے آنے کی امید تھی۔ انھوں نے یہ کام اپنے ذمہ لیا کہ ان کے پہنچ جانے پر میں مکہ مکرمہ میں اُن کے ساتھ رہوں گا اور ان کو ساتھ لیکر مدینہ طیبہ آؤں گا؛ چنانچہ وہ بھی مولوی عتیق الرحمٰن کے ساتھ ہی ۲۷ر رمضان کو مدینہ طیبہ آئے اور برابر ساتھ ہی رہے۔

حجاز مقدس میں ۵ر اکتوبر (اتوار کے دن) تیسواں روزہ تھا اُس دن روزہ افطار کر کے ہم لوگ وہاں کے تبلیغی مرکز مسجد نور میں آ گئے۔ رات وہیں گزاری، مولانا سعید احمد خاں صاحب اور وہاں کے مقیم دوسرے مخلصین نے تہجد کے وقت ہی ناشتہ بھی کرا دیا اور چائے بھی پلا دی اور اس اندیشہ سے کہ خدانخواستہ مسجد شریف میں جگہ نہ مل سکے صبح صادق سے بہت پہلے آ گئے اس کے باوجود بہت مشکل سے اندر کے حصہ میں جگہ مل سکی۔ صبح صادق ہو جانے پر حسب معمول فجر کی نماز ہوئی اور اس کے قریباً ڈیڑھ گھنٹہ ہی کے بعد یعنی سورج نکلنے کے قریباً ۱۵-۲۰ ہی منٹ کے بعد گویا اشراق ہوتے ہی عید کی نماز ہوئی، مسجد نبوی کے امام شیخ عبدالعزیز بن صالح کا خطبہ بہت ہی موثر تھا۔ اُن کا عید کا خطبہ سننے کا تو یہ پہلا اتفاق تھا، جب بھی مسجد نبوی میں جمعہ کی نماز اُن کے پیچھے پڑھی اور خطبہ سنا ہمیشہ یہی تجربہ ہوا۔ اب سے ۲۶-۲۷ سال پہلے (۱۹۴۹ء میں) جب اللہ تعالیٰ نے پہلی دفعہ حاضری نصیب فرمائی تھی تو مدینہ طیبہ کے زمانہ قیام میں ایک دن استسقا کی نماز مسجد نبوی ہی میں

انہی شیخ عبدالعزیز کی اقتداء میں پڑھنے کا اتفاق ہوا تھا، اُس دن کا اِن کا خطبہ اس قدر غیر معمولی اور موثر تھا کہ اُس سے پہلے اور اس کے بعد کبھی ایسا خطبہ سننا یاد نہیں اور دعا ایسی تھی کہ جی چاہتا تھا کہ اس کا ایک ایک لفظ یاد رہے، پھر اس صلوٰۃ استسقا کا (جو پوری مملکت میں ہوئی تھی) یہ اثر بھی دیکھا کہ ہم لوگ نماز استسقا سے فارغ ہو کر اُسی دن مکہ معظمہ روانہ ہو گئے تھے، رات راستہ میں گزار کے جب اگلے دن مکہ معظمہ حاضر ہوئے تو بارش کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا اور کئی دن تک یہ سلسلہ جاری رہا، جس کی وجہ سے غالباً ایک ہفتہ یا اس سے بھی زیادہ مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ کے درمیان آمد و رفت بالکل بند رہی[1] ——— خیر یہ تو ایک پرانی بات تھی جو مسجد نبوی کے امام صاحب کے خطبہ کے ذکر کے ساتھ یاد آ گئی، اللہ تعالیٰ نے ممدوح کو بہت رقیق القلب بھی بنایا ہے خطبہ میں اور خاص کر دعا میں خود بھی خوب روتے ہیں اور دوسروں کو بھی رلاتے ہیں۔

(باقی)

[1] اُس زمانہ میں مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ کے درمیان پختہ سڑک نہیں بنی تھی، اس سبب سے حاجیوں کی بسیں اور موٹریں رات کو کسی منزل پر ٹھہر کے اگلے دن پہنچتی تھیں، اب خدا کے فضل سے سڑک اتنی اعلیٰ قسم کی ہے قریبًا پانسو کیلو میٹر کی مسافت ۸۔۹ گھنٹے میں طے ہو جاتی ہے۔

الفرقان

ماهنامہ لکھنؤ

جلد (۴۳)	بابت ماہ نومبر ۱۹۷۵ء مطابق شوال و ذیقعدہ ۱۳۹۵ھ	شمارہ (۱۱)

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

محمد منظور نعمانی

"ندوۃ العلماء" کا عالمی اجلاس جو ۳۱ اکتوبر سے ۳ نومبر تک لکھنؤ میں منعقد ہونے والا تھا، جس کا ذکر الفرقان کی ایک قریبی اشاعت کے انہی صفحات میں کیا گیا تھا، الحمد للہ وہ انہی تاریخوں میں منعقد ہوا، اور اللہ تعالیٰ نے اس کے داعیوں کی توقعات بلکہ اُن کے عزائم اور خیالات سے بھی بہت زیادہ اُس کو کامیاب فرمایا۔

عالم اسلامی کی سب سے بڑی اور قدیم درسگاہ اور دانش گاہ جامعہ ازہر (مصر) کے سربراہ علامہ شیخ عبدالحلیم محمود نے صدارت فرمائی، ان کے ساتھ آنے والے مصری وفد میں مصر کی دوسری چند اہم شخصیتوں کے علاوہ مصر کے وزیر اوقاف بھی تھے، —— اس مصری وفد کے علاوہ مملکت سعودیہ، عربیہ کویت، قطر، شارقہ، ابوظبی، الجزائر، شام، عراق، ایران اور بعض دوسرے ممالک کے وفود نے بھی شرکت فرمائی، جن میں ان ملکوں کی نہایت اہم اور ممتاز علمی اور دینی شخصیتیں تھیں۔ ہندوستان کے بھی قریب قریب تمام ہی علمی و دینی حلقوں اور تعلیمی اداروں کے اکابر اور ذمہ دار حضرات شریک ہوئے۔

بلاشبہ ہندوستان میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا اجتماع اور اجلاس تھا اور اپنے مقصد کے لحاظ سے نہایت کامیاب فللہ الحمد والمنۃ

اس چار روزہ اجلاس کی کارروائی کی تفصیل تو غالباً ندوہ کی طرف سے شائع کی جائے گی۔ اس وقت تو صرف اپنے چند تاثرات ناظرین کے لیے ان سطروں میں پیش کرنے کا ارادہ کیا ہے۔

سب سے زیادہ متاثر کرنے والی چیز اتنے بڑے جلسہ کا غیر معمولی سکون اور خاص کیفیت تھی جس کو "سکینہ" کے لفظ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور یہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت و نصرت کا کرشمہ تھا —— اسی

بہت سی چیزیں تھیں، جو بدنظمی اور بدمزگی کا باعث بن سکتی تھیں لیکن الحمدللہ چار دن کے اجلاس میں کسی وقت بھی ادنیٰ قسم کی بدنظمی اور بدمزگی کا ظہور نہیں ہوا۔

اجلاس کے منتظمین نے (اس خیال سے کہ جن دوسرے ممالک کے وفود اور اہم شخصیتیں آرہی ہیں وہاں کا عام رواج یہی ہے کہ بڑے سے بڑے جلسوں میں بھی کرسیوں کا انتظام سامعین کے واسطے بھی ہوتا ہے اور اس بات کو معیوب سمجھا جاتا ہے کہ معززین اور خواص کرسیوں پر ہوں اور عام حاضرین وسامعین فرش زمین پر) قریب قریب پوری جلسہ گاہ میں جو نہایت وسیع تھی، کرسیوں کا انتظام کیا تھا، اور لکھنؤ جیسے بڑے شہر میں جو ملک کی سب سے بڑی ریاست اتر پردیش کا دارالحکومت ہے جس حد تک اور جس طرح بھی کرسیاں دستیاب ہوسکتی تھیں، فراہم کرلی تھیں، تاہم ان کی تعداد (جہاں تک معلوم ہے) ۷-۸ ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ اور اندازہ یہ تھا کہ حاضری ۲۰-۲۵ ہزار سے کم نہ ہوگی، اس لیے بڑا خطرہ تھا کہ جو ہزاروں سامعین کرسیوں پر جگہ نہ پاسکیں گے اور ان کو مسلسل کھڑا رہنا پڑے گا، اُن کی طرف سے خدانخواستہ کوئی ناخوشگوار مظاہرہ اور احتجاج نہ ہو ــــــ لیکن سب ہی نے حیرت سے یہ منظر دیکھا کہ حاضرین کی بہت بڑی تعداد مسلسل کئی کئی گھنٹے کھڑے ہوکر اجلاس کی کارروائی دیکھتی اور سنتی رہی اور کسی قسم کی ناراضگی اور احتجاج کا ادنیٰ مظاہرہ کسی طرف سے نہیں ہوا۔

اور اس سے بھی زیادہ عجیب اور حیرت انگیز بات اس اجلاس میں یہ دیکھنے میں آئی کہ عام سامعین میں مشکل سے ایک دو فی صدی ہوں گے جو کچھ عربی سمجھتے ہوں گے باقی سب غیر عربی داں تھے، اور کئی کئی گھنٹے مسلسل عربی مقالے پڑھے جاتے اور عربی میں تقریریں ہوتیں لیکن تمام سامعین وحاضرین بڑے اطمینان سے اس طرح اپنی جگہ بیٹھے یا کھڑے سنتے رہتے گویا کہ وہ سب ایک ایک لفظ سمجھ رہے ہیں اور اس وقت بھی اجلاس کے کسی گوشہ میں کوئی اضطراب اور خلفشار قطعاً محسوس نہ ہوتا۔

اس سلسلہ میں اس کا ذکر کردینا بھی مناسب اور ناظرین کے لیے انشاء اللہ نفع مند ہوگا کہ ایسے بڑے اور غیر معمولی اجلاس کے لیے تدبیر واسباب کے نقطۂ نظر سے جو انتظامات کرنا ضروری تھے امکانی حد تک وہ تو کیے ہی گئے تھے لیکن اس ایمان ویقین کی بنیاد پر کہ سب کچھ اللہ کے اور صرف اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے اور وہی ظہور میں آئے گا جو اس کی مشیت کا فیصلہ ہوگا، اسی کی توفیق سے دعاؤں کا بھی خاص اہتمام کیا گیا تھا ــــــ جن حضرات کو اللہ کا مقرب ومقبول اور صاحب دعا بندہ سمجھا گیا اُن سے خاص طور پر

دعا کی درخواست کی گئی اور معلوم ہے کہ اُن حضرات نے اجلاس کے باعثِ خیر و فلاح ہونے کے لیے اور ہر قسم کے شرور و فتن سے حفاظت کے لیے دعا کا بڑا اہتمام فرمایا اور مسلسل متوجہ رہے جیسا کہ ناظرین کرام کو معلوم ہو چکا ہے رمضان مبارک میں راقم سطور کا قیام مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں رہا، وہاں بھی دیکھا کہ دار العلوم ندوۃ العلماء اور رفیق محترم مولانا علی میاں سے تعلق رکھنے والے حضرات اجلاس کے لیے اہتمام سے دعائیں کرتے اور دوسروں سے بھی دعا کی استدعا کرتے تھے ــــ اور جب اجلاس کا وقت قریب آیا تو ایک دن پہلے سے خاص دار العلوم کی مسجد میں ایک پوری جماعت معتکف ہو گئی، اجلاس کے اختتام تک ان کی خدمت اور ان کا وظیفہ بس یہی رہا کہ وہ اللہ سے خیر و فلاح کی اور شرور و فتن سے حفاظت کی دعا کرتے رہے۔ اس کے ذکر کر دینے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں کہ یہ اہتمام شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا اور حضرت مولانا انعام الحسن صاحب کے ایماء سے کیا گیا تھا ــــ ہم جیسوں کو اس میں کوئی شک نہیں کہ پورے اجلاس میں سکینۃ کی جو غیر معمولی کیفیت مشاہدہ میں آئی اور اپنے مقصد کے لحاظ سے اجلاس جس درجہ کامیاب ہوا اُس میں سب سے زیادہ دخل ان بندگانِ خدا کی دعاؤں کا تھا۔ دعا کی تاثیر و قوت کے بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا اور جو آپ کے طرز عمل سے معلوم ہوا کاش ہمیں اُس پر یقین نصیب ہو۔

اس اجلاس سے ایک ضمنی مگر نہایت عظیم ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ مختلف ممالک سے جو وفود اور نمائندے آئے انھوں نے بچشم خود دیکھ لیا کہ اُن کے بھائی ہندوستانی مسلمان، اسلام کے ساتھ وابستگی و وفاداری اور دین و علم دین کی خدمت کے لحاظ سے کس حال میں ہیں۔ ہم نے خاصکر بعض عرب ملکوں میں محسوس کیا کہ وہاں کے عوام ہی نہیں خواص میں بھی یہ غلط فہمی بہت عام ہے کہ ملک کی تقسیم اور پاکستان کے قیام کے بعد ہندوستان میں وہی مسلمان رہ گئے ہیں جو ضعیف الایمان تھے، جنھیں اپنے گھر، اپنی جائدادیں اپنے کارخانے اور دکانیں، دین و ایمان سے زیادہ عزیز تھیں، یا وہ جنھیں قرآن پاک میں "مُسْتَضْعَفِيْن" کہا گیا ہے یعنی جو بیچارے تنگدستی و ناداری یا اسی طرح کی دوسری مجبوریوں کی وجہ سے ہندوستان سے نہیں جا سکے۔

اس قسم کی غلط فہمیوں کے ازالہ کی بہترین صورت یہی تھی کہ ان ممالک کے حضرات خود آکر ہندوستانی مسلمانوں کو اور ان کی علمی اور دینی کوششوں کو دیکھیں، الحمد للہ اس اجلاس نے کسی درجہ

میں اس کا اچھا موقع فراہم کر دیا، اور اجلاس کے خاص داعی رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (ناظم ندوۃ العلماء) کے استقبالیہ خطبہ نے مسلمانانِ ہند کی زندگی کے اس پہلو کی بھی پوری وضاحت کر دی ——— یہ خطبہ عربی زبان میں تھا اجلاس میں اس کا اردو ترجمہ بھی پیش کیا گیا تھا، ہم نے اپنے پر، اس خطبہ کا اور اپنے ناظرین کا یہ حق سمجھا کہ اس پورے خطبہ کو الفرقان کے ذریعہ ان تک پہنچا دیا جائے یہ ہندوستان کے لیے اور پورے عالم اسلام کے لیے اس اجلاس کا خاص تحفہ ہے، ناظرین کرام "نگاہِ اولیں" کی ان سطروں کے بعد ہی یہ خطبہ پڑھیں گے۔

اسی طرح باہر سے آنے والے ہمارے ان محترم بھائیوں اور مہمانوں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ ہم ہندوستانی مسلمانوں نے جو ہمیشہ ہی سے اقلیت میں ہیں (اور بظاہر اسباب اقلیت ہی رہیں گے) اپنے کو پیغام محمدی کا حامل اور امین سمجھ کر اُس کی وفاداری کے عہد کے ساتھ اس ملک ہی میں رہنے کا فیصلہ کیا ہے اور اپنے مسائل کے حل کے لیے ہمارا اصل اعتماد اپنے اللہ پر اور اُس کے بعد اُسی کی بخشی ہوئی صلاحیتوں اور اپنی جدوجہد پر ہے۔ ——— مولانا علی میاں کے خطبہ استقبالیہ نے مسلمانانِ ہند کی زندگی کے اس پہلو اور خدا اعتمادی اور خود اعتمادی کے اس اصول اور فیصلہ کو بھی پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے اور اس حیثیت سے یہ خطبہ مسلمانانِ ہند کی طرف سے ایک اعلانیہ بھی ہے۔

اجلاس کے سلسلہ میں ایک یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اُس کے داعیوں اور منتظمین کو حکومت کا بھی پورا تعاون حاصل رہا، جن ملکوں سے جن حضرات نے بھی اجلاس کی شرکت کے لیے آنا چاہا، وزارتِ خارجہ کی ہدایت کے مطابق ان ملکوں کے ہندوستانی سفارت خانوں نے اُن سب کو ویزا دیا، اور اس سلسلہ میں غالباً کسی کو بھی کوئی زحمت پیش نہیں آئی ——— اسی طرح اتر پردیش کی حکومت اور لکھنؤ کارپوریشن کا تعاون بھی مثالی رہا ——— حکومت کے اس تعاون کو ہم ہی لوگوں نے نہیں، باہر سے آنے والے محترم مہمانوں نے بھی عام طور سے بہت محسوس کیا۔ اور نجی گفتگوؤں میں بھی اور ایک تجویز کے ذریعہ بھی اپنے تاثر اور ممنونیت کا اظہار کیا ——— واقعہ یہ ہے کہ اگر یہ تعاون حاصل نہ ہوتا تو منتظمین کو ایسی سخت مشکلات پیش آسکتی تھیں جن پر بظاہر اسباب قابو نہ پایا جاسکتا ——— لیکن ہمارا ایمان و یقین ہے

کہ یہ سب بھی اللہ تعالیٰ ہی کی مشیت اور اُس کے حکم سے ہوا۔ ارباب حکومت کے قلوب بھی اُسی کے ہاتھ میں ہیں۔ ایک حدیث قدسی میں ہے "انا مالک الملک، مِلک الملوک قلوب الملوک بیدی الخ"

جو کچھ کہ ہوا، ہوا کرم سے تیرے
جو کچھ کہ ہوگا، ترے کرم سے ہوگا

یہ شمارہ:۔ اس شمارہ کے صفحہ ۵ پر ناظرین کرام نے دفتری نوٹ پڑھا ہوگا، اُس میں عرض کیا گیا تھا کہ اگر اکتوبر کے شمارہ کی طباعت و تیاری میں دیر لگی تو نومبر کا شمارہ بھی اسی کے ساتھ شامل کر دیا جائے گا ـــــ ایسا ہی ہوا، اور اب ان دونوں مہینوں کا یہ مشترک شمارہ ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اس میں ۸ صفحے حساب سے کم ہیں لیکن ستمبر کے شمارہ میں ۸ صفحے زیادہ تھے، اس لیے حساب برابر ہے۔

اگلا شمارہ:۔ بہت سے ناظرین کو غالباً یاد ہوگا اب سے ۷۔۸ مہینے پہلے فروری اور مارچ کے مشترکہ شمارہ میں "ایک مردِ مومن کی وفات" کے زیر عنوان حضرت صوفی سید عبدالرب صاحبؒ کے سانحہ وفات کی اطلاع کے ساتھ صرف ۵۔۶ صفحے پر اُن کا کچھ مختصر تذکرہ بھی کیا گیا تھا۔ اسی وقت سے ارادہ تھا کہ صوفی صاحبؒ سے تعلق رکھنے والے دوسرے حضرات سے مزید معلومات حاصل کر کے اس سے زیادہ مفصل تذکرہ شائع کیا جائے گا ـــــ انشاء اللہ اگلے شمارہ میں جو ماہ دسمبر کا شمارہ اور الفرقان کی تینتالیسویں جلد کا آخری شمارہ ہوگا حضرت صوفی صاحبؒ کا وہ تذکرہ شائع ہوگا۔ اور وہ پورا شمارہ اسی کے لیے مخصوص ہوگا، ہماری کوشش ہے کہ وہ مقررہ وقت پر یعنی دسمبر کے پہلے ہفتہ میں حوالہ ڈاک ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ ہماری مدد فرمائے۔

ناظم دفتر الفرقان ۹ نومبر ۱۹۷۵ء

ناظم ندوۃ العلماء مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ

کا

خطبۂ استقبالیہ

جو ندوۃ العلماء کے عالمی اجلاس منعقدہ ۳۱؍ اکتوبر، ۱-۲-۳؍ نومبر کے افتتاحی جلسہ میں پڑھا گیا ـــــ اصل خطبہ عربی میں تھا۔ پہلے دن جمعہ کی صبح کی نشست میں وہی پڑھا گیا، اس کا اردو ترجمہ جو مولانا ممدوح کے برادر زادہ مولانا محمد الحسنی نے کیا تھا شام کی نشست میں پڑھا گیا تھا ـــــ وہی ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ وَآلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَمَنْ وَالَاہٗ

جنابِ صدر، معزز نمائندگان، مہمانانِ کرام، شرکاءِ اجلاس!

سب سے پہلے میں اپنی طرف سے نیز اپنے رفقاءِ کار، جماعتِ علماء، ملتِ اسلامی ہند کی طرف سے آپ کی خدمت میں اسلام اور علم کا دوہرا اسلام پیش کرتا ہوں یہ سلام ہے نئے اور چھوٹے ساتھیوں کا، اپنے بڑے اور تجربہ کار ساتھیوں کو، ہمراہیوں اور رفیقوں کا ہمراہیوں اور رفیقوں کو، اس لیے کہ ہم سب اسلام کے رواں دواں قافلہ میں شامل اور علومِ اسلامیہ کے طویل کارواں کے ہم سفر ہیں۔ استادی وشاگردی، بزرگی وخوردی اور اصل ونقل کے اعتبار سے ہمارے درمیان یقیناً فرق وتفاوت ہے، لیکن اسلام کے سایۂ عاطفت اور علم کے مقدس رشتہ نے ہم کو ایک لڑی کے موتیوں کی طرح پرو دیا ہے۔ ہم سب اسلام ہی کے ساختہ پرداختہ قرآن کے خوانِ کرم کے ریزہ چیں، اور درسگاہِ محمدی کے مختلف درجوں اور استعدادوں کے طالب علم اور مکتب نشین ہیں۔

حضرات! میں آپ کا ہندوستان کی اس سرزمین میں خیر مقدم کرتا ہوں جہاں مذہب، تہذیب اور ثقافت کی پوری تاریخ میں ایک انوکھا اور منفرد تجربہ کیا گیا، اور یہ تجربہ غیر معمولی اور بے مثال

طریقہ پر کامیاب رہا۔ اس سرزمین میں جب اسلام کے قدم آئے تو اس کے جلو میں علم و تہذیب بھی تھی۔ اور وہ مسلک زندگی بھی، جو زبان، کلچر، قوم و نسل اور قومی عادات و خصائل کا پابند نہیں، دیکھنے والوں کو بہت جلد نظر آگیا کہ اسلام کے خمیر میں ایک ایسی باطنی قوت پوشیدہ ہے جو خوابیدہ صلاحیتوں کو جگاتی، ذہانت کے خشک سوتوں کو روانی بخشتی اور انسانی صلاحیتوں اور طاقتوں کو انسانی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کرنا سکھاتی ہے ——————— اس کے ساتھ اس حقیقت کا بھی انکشاف ہوا کہ انسان کی فطرتِ سلیم خود بڑھ کر دینِ فطرت کا استقبال کرتی ہے اور اس کے ساتھ اس طرح ہمنوا اور ہم آہنگ ہو جاتی ہے جیسے وہ اس کے انتظار میں دن گن رہی تھی۔ اس سے ہمیں جہاں اس دین کی اس مخفی صلاحیت و طاقت کا اندازہ ہوا، وہاں اس زمین کی نرمی اور زرخیزی کا بھی جس نے اس نہالِ تازہ کو اس آسانی کے ساتھ قبول کیا اور پھلنے پھولنے کا موقع دیا، اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ علومِ اسلامیہ کا درخت ہر طرح کی زمین اور ہر قسم کی آب و ہوا میں برگ و بار لاتا اور نئے نئے شگوفے کھلاتا ہے نیز یہ کہ دوسرے شاداب درخت سے قلم لگانے سے اس کی قوتِ نمو اور شادابی بڑھ جاتی ہے۔

ان حقیقتوں کے ساتھ ایک اور نئی حقیقت کا انکشاف ہوا، جو اقوام و ملل کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے، وہ یہ کہ تنہائی اور مسافرت کے احساس، اپنے اصل سرچشمہ سے دوری، تازہ رسد اور نئی کمک سے مایوسی نے اس نو وارد کا حوصلہ پست، اور اس کو اپنے مستقبل سے مایوس اور ہراساں کرنے کے بجائے اس کے دل کو ایک نئی طاقت اور نئے جوش اور نئے اعتماد سے معمور و مخمور کر دیا۔ اس نے اس صورتِ حال سے شکستگی اور مایوسی کا سبق لینے کے بجائے ہمت و جرأت، خدا کی نصرتِ غیبی، اور اپنے ناتواں بازوؤں پر اعتماد کرنے کا سبق لیا، اس کو اپنے پیغام و دعوت کی صلاحیت دا ذاتیت، اور اس ملک میں اس کی ضرورت پر یقین تھا، یہ احساس کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اسلام کی ایک دُور دراز سرحد کا محافظ اور پاسباں بنایا ہے اور اس کے دفاع کی ذمہ داری تنہا اسی کے سر پر ڈالی ہے۔ ایک مختصر سے مختصر اقلیت کو ایسی قوت عطا کرتی ہے جس سے انقلاب انگیز اور محیر العقول کارنامے وجود میں آتے ہیں۔ وہ ہر آزمائش میں پوری اترتی ہے۔ وہ اقوامِ عالم کے سابقہ تجربات کی تردید کرتی ہے اور مادہ پرستانہ منطق اور ریاضی کے جامد اصولوں اور اعداد و شمار کے بے روح

دبے رحم فلسفے کو غلط ثابت کر دیتی ہے۔

اسلام کا یہ مختصر اور آوارہ قافلہ، اس ملک میں پردیسی کی طرح وارد ہوتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کو اپنا عزیز وطن اور محبوب مسکن بنا لیتا ہے اس ملک کے اصلی باشندے اس کی محبت کا دم بھرنے لگتے ہیں۔ اور ان نو وارد انسانوں کی شکل میں ان کو محبت کرنے والے بھائی، شفیق استاد، خیر خواہ حاکم، آزمودہ کار منتظم، ماہر فن کاریگر، اور بلند پایہ عالم و دانشور مل جاتے ہیں۔ یہ اسلامی نو آبادی، اپنی ذہنی صلاحیت، علمی تجربہ، قوت ایجاد و اختراع، قوت عمل اور انتظامی صلاحیت کا ایک ایک قطرہ اس سرزمین میں نچوڑ دیتی ہے۔ یہاں ترکوں کی سپہ گری و ترک تازی، مغلوں کی اولوالعزمی، افغانیوں کی غیرت قومی، ایرانیوں کا ذوق جمال و رعنائی خیال، عربوں کی حقیقت پسندی اور ذوق سلیم، ملک کے باشندوں کی نرم خوئی اور صلح جوئی اور شعر و نغمہ و فلسفہ و تصوف سے فطری مناسبت سے آکر گھل مل گیا۔ ان سب مختلف (اور بعض اوقات متضاد) صفات پر اسلام کے عقیدۂ توحید کا پرتو اور اس کی عادلانہ تعلیمات کا عکس اس طرح پڑا کہ اس نے ان کو ایک نیا رنگ و آہنگ عطا کیا اور ان کو ایک دوسرے سے شیر و شکر کر کے ایک نئی زندگی بخشی، اس کے نتیجہ میں ایک نئی تہذیب وجود میں آئی جس کو ہم بجا طور پر "اسلامی ہندوستانی تہذیب" کہہ سکتے ہیں۔

اس نئے عہد کے آغاز کے ساتھ ہندوستان میں ایک نیا تہذیبی، فکری و علمی دبستان وجود میں آیا، جو اپنی ایک مستقل شخصیت اور نمایاں کردار رکھتا تھا، اس نے بڑی تعداد میں ایسے ماہرین فن، موجدین علوم اور ارباب فضل و کمال پیدا کیے جو خود مختلف مکاتب خیال کے بانی تھے۔ جنہوں نے علم کی نئی دنیاؤں سے اس ملک کو روشناس کیا اور نہ صرف علوم دینیہ، تفسیر و حدیث اور فقہ و عقائد میں ان کی پیشوائی و سربراہی تسلیم کی گئی بلکہ عربی لغت و زبان و ادب میں بھی علماء عرب نے ان کا لوہا مان لیا۔ اور ان کی بعض تصنیفات نے ان علوم میں بنیادی، ماخذ اور سند کی حیثیت اختیار کر لی۔ ان میں کچھ کتابیں لیے اسلامی کتب خانہ میں اب تک بے نظیر اور منفرد ہیں۔

اس مدرسۂ فکر نے تصنیف و تالیف کی اس تحریک کو جو آٹھویں صدی ہجری (پندرھویں صدی عیسوی) کے بعد ذہنی اضمحلال، اور علمی زوال کا شکار ہو چکی تھی، نیا خون اور نئی زندگی عطا کی، تاتاریو

کے فتنۂ عالم آشوب میں اس نے بعض اسلامی علوم کے لیے پناہ گاہ کا کام دیا، اور عہد آخر میں اس کو حدیث نبوی کی خدمت و اشاعت کا سب سے بڑا مرکز بننے کا شرف حاصل رہا جہاں سے اس فن شریف کی شعاعیں دوسرے ملکوں میں پھیلیں اور "درآمد" کے بجائے "برآمد" کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس سرزمین میں یکتائے زمانہ اور سرآمد روزگار علماء و ائمہ فن پیدا ہوئے اور اس موضوع پر بہتر سے بہتر کتابیں یہاں تیار کی گئیں۔

یہاں کے متعدد علمائے حق اور ارباب دعوت و عزیمت نے مختلف زمانوں میں اصلاح و تجدید اور اسلام کی نشأۃ ثانیہ کا وہ کارِ عظیم انجام دیا جس کی صدائے بازگشت ہر جگہ سنی گئی اور اس کے مبارک اثرات دنیائے اسلام کے دور دراز حصوں تک پہونچے، اور لاکھوں انسانوں نے ان کے فیض و اثر سے اپنے قلب و روح کی پیاس بجھائی اور دلوں کو روشن کیا۔

تقدیر الٰہی کا فیصلہ تھا کہ اس ملک کو جدید تاریخ کا سب سے بڑا تہذیبی، ثقافتی اور فکری معرکہ پیش آئے اور افکار و اقدار کی سب سے بڑی کش مکش سے اس کو گذرنا پڑے، یہ مغربی تہذیب و فلسفہ اور اسلامی تہذیب و فلسفہ کا معرکہ اور اسلامی طرزِ فکر اور مغربی طرزِ فکر کی کش مکش تھی اور در اصل ایک سخت، خونریز، بے رحم اور طویل جنگ تھی۔

ملتِ اسلامی ہند نے جو ۱۸۵۷ء کی جد و جہد میں ناکامی سے زخم خوردہ اور برطانوی فتح سے دہشت زدہ ہو رہی تھی اپنے کو اچانک ایک ایسی جواں سال، تازہ دم، ابھرتی ہوئی بلکہ زندگی اور جوش و جوانی سے ابلتی ہوئی مغربی تہذیب کے سامنے اس طرح پایا کہ درمیان میں کوئی پردہ حجاب نہ تھا، یہ انگریزی اقتدار، ان مسلمانوں کی طرف سے جنھوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی قیادت کی تھی خار کھائے ہوئے تھا وہ مسلمانوں کو اپنا اصل و دائمی حریف اور اسلام کو اپنے کیمپ کا متوازی و مقابل کیمپ سمجھتا تھا، دونوں کو اس کا دعویٰ تھا کہ وہ زندگی کی رہنمائی اور معاشرۂ انسانی کی تعمیر و تشکیل کی اہلیت رکھتے ہیں اس لیے اس معرکہ کی شعلہ سامانیوں اور "تاوانِ جنگ" میں مسلمانوں کا حصہ ملک کے ہر فرقہ سے زیادہ تھا۔ ان کو صورتِ حال کی سنگینی، اور دور رس خطرات کا پورا اندازہ تھا۔

لیکن تاریخ گواہ ہے کہ ہندوستانی مسلمان اس زبردست سازش اور مغربی تہذیب کی طوفانی

یلغار کے سامنے بہت سی ان مسلم قوموں سے کہیں زیادہ ثابت قدم، سخت جان، ناقابل تسخیر اور اپنی اسلامی شخصیت اور معنوی دولت کی حفاظت میں زیادہ کامیاب ثابت ہوئے جن کا انیسویں صدی کے اواخر یا بیسویں صدی کے اوائل میں مغربی اقتدار یا مغربی افکار سے واسطہ پڑا۔

مغربی تہذیب و تعلیم کی اس یلغار کے علاوہ ہندوستانی مسلمانوں کو ایک دوسری یلغار کا مقابلہ کرنا پڑا یہ عیسائی مشنریوں کی یلغار تھی جو انگریزی اقتدار کے اس ملک میں قدم جماتے ہی زور شور سے شروع ہوئی، اور قریب تھا کہ پورے ملک کو وہ اپنی لپیٹ میں لے لے، یہ عیسائی مشنری، جدید ترین اور موثر ترین اسلحہ سے لیس تھی، ان کو حکومت کی حمایت و سرپرستی بھی حاصل تھی، جو اس زرخیز ملک کو حضرت مسیح کا عطیہ اور انعام سمجھ رہی تھی، اور اس اقتدار کو عیسائیت کے فروغ و اشاعت کے لیے ایک زریں موقع تصور کرتی تھی جس کو کسی حالت میں بھی ہاتھ سے جانے نہ دینا چاہیے تھا۔

ان مشنری سرگرمیوں اور پورے ملک کو عیسائی بنا لینے کے عزم و منصوبہ کے ساتھ تشکیک کی ایک طاقت ور تحریک بھی جاری تھی جس کا مقصد اسلام سے تعلق رکھنے والی ہر چیز کو مسلمان نوجوانوں کی نظر میں مشتبہ و مشکوک بنا دینا تھا، خواہ اس کا تعلق شریعت و قانون سے ہو یا مذہب و تمدن اور ثقافت و تاریخ سے، ہندوستان کے علماء نے ان دونوں تحریکوں اور طاقتوں کا پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کیا، انھوں نے معذرت و دفاع کی سیاست کو ترک کر کے، اقدام و حملہ کی سیاست اور بھرپور علمی تنقید کا راستہ اختیار کیا۔ اس کے نتیجہ میں تبلیغ عیسائیت کی یہ تیز و تند لہریں اور تشکیک کی پوری مہم پسپائی اختیار کرنے پر مجبور ہو گئی اور مسلمانوں کے اندر اسلام پر نیا اعتماد، اپنی تہذیب و ثقافت پر فخر، اور اپنی شخصیت و تاریخ کا احترام پیدا ہوا۔

اس زمانہ میں ذہین مسلم نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد نے مغربی تہذیب اور مغربی اقتدار کے مرکز "ولایت" کا رخ کیا، انھوں نے وہاں کی اعلیٰ یونیورسٹیوں اور شہرۂ آفاق کالجوں میں تعلیم حاصل کی، جدید علوم میں کمال پیدا کیا، انگریزی ادبیات میں بصیرت، اور انگریزی تحریر و تقریر میں اہل زبان کی طرح قدرت حاصل کی، جن کی قابلیت، زباں دانی، اور نکتہ شناسی کا انگریز ادبا اور اہل نظر نے بھی اعتراف کیا، لیکن مغربی علم و ادب کے سمندر میں غوطہ لگانے والوں میں خاصی تعداد میں مغربی فلسفے کے باغی اور حریف پیدا ہوئے جن کی مثال کسی دوسرے اسلامی ملک کے نوجوانوں میں

نہیں ملتی، وہ مغربی طرزِ فکر کے زبردست ناقد و نکتہ چیں بنکر واپس آئے۔ یہی حال ان لوگوں کا بھی تھا جنھوں نے ہندوستان میں رہکر مغربی علم و فلسفہ سے اس حد تک واقفیت پیدا کی جتنی خود مغرب میں ممکن تھی، انھوں نے پورے اعتماد و اطمینان کے ساتھ مغربی افکار پر تنقید و عمل جراحی کا فرض انجام دیا، اور اس کے افسوں کو باطل اور اس کے طلسم کو توڑ کے رکھ دیا، کسی نے سنجیدہ عالمانہ اور فلسفیانہ انداز میں اس کا محاسبہ کیا اور کسی نے طنز و مزاح کے لطیف پیرائے میں اس کا خاکہ اڑایا، مغربی تہذیب و فلسفہ کے رُعب کے کم کرنے اور اس کی ہوا خیزی میں دونوں کا حصہ ہے، ان اہلِ فکر و اہلِ قلم نے اسلام کو ایک مکمل دین اور ابدی پیغام کی حیثیت سے پیش کرنے، جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے احساسِ کمتری کو دور کرنے اور اسلام اور اسلامی تہذیب کی صلاحیت و ابدیت پر اس کا اعتماد بحال کرنے میں بیش قیمت خدمت انجام دی، انھوں نے مغربی تہذیب کی دعوت کے مقابلہ میں ایک مضبوط اسلامی مورچہ قائم کر لیا، جس کا اصول و شعار مغرب کی امامت و سیادت اور ہر کمزوری اور نقص سے اس کے بالاتر ہونے کا انکار، اسلام پر ایک عالمگیر و زندۂ جاوید پیغام اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری نبی، رہبر انسانیت اور پیشوائے کُل ہونے کا اقرار و اعلان تھا۔ وہ اس یافت و دریافت میں ایسے سرشار اور اس ایمان و یقین میں ایسے مست ہوئے کہ ان کے ہر بُن مو سے یہ صدا آنے لگی ؎

"وہ دانائے سُبل، ختم الرسل، مولائے کُل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا"

اس کے بعد ہندوستان کی ملّتِ اسلامی کو ایک نیا تجربہ پیش آیا اور وہ ایک اہم دَور میں داخل ہوئی یہ ایک آزاد ملک کی آزاد زندگی کا تجربہ تھا جس کے آزادی کے اولین علمبردار، اور اس کے لیے بیش از بیش قربانیاں پیش کرنے والے بھی مسلمان تھے، یہ دور غیر ملکی اقتدار سے ملکی و قومی اقتدار کی طرف منتقلی کا دور ہے جس میں نیا دستور مرتب ہوا، اور نئے قوانین وضع کئے گئے، معاشرہ کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش شروع کی گئی، نیا نظامِ تعلیم نافذ کیا گیا اس موقع پر کئی بار خالص فرقہ وارانہ رجحانات نے سر اٹھایا۔ اور اس کی آبادی کی ایک کثیر تعداد پر جذباتی اور اعصابی دَورے بھی پڑے، مسلمانوں کی حیثیت ان حالات میں ایک ایسی عددی اقلیت اور پس ماندہ طبقہ کی تھی جس کو انگریزی اقتدار نے ہمیشہ کمزور مغلوب اور کارزارِ حیات سے دُور رکھنے

کی کوشش کی تھی، ماضی کا ترکہ اس کے گلے کا ہار بن چکا تھا۔ بہت سے شکوک و شبہات اس کے ساتھ وابستہ ہو گئے تھے، ملک سے باہر پیش آنے والے واقعات بھی اس کی زندگی اور قسمت پر اثر انداز اور ملک کے دوسرے فرقوں کے جذبات میں تلاطم برپا کرتے رہتے تھے اور یہ اقلیت بہت سے ناکردنی بلکہ بیرونی غلطیوں کی جابدہ سمجھی جاتی تھی، یہ وہ حالات و واقعات ہیں، جنہوں نے اس کو بہت نازک پوزیشن میں کھڑا کر دیا ہے، لیکن اس کے باوجود اس ملک کے مسلمان پوری خودداری و خود شناسی، اپنے دینی شعائر اور دینی و ملی تہذیب و شخصیت کے ساتھ اپنے اس ملک میں رہنے کا عزم مصمم کر چکے ہیں۔ یہ ہندوستانی مسلمانوں کی ذہانت کا بھی امتحان ہے اور وفا کا بھی، ان کے مضبوط اور غیر متزلزل عقیدہ کی بھی آزمائش ہے اور سچی حب الوطنی کی بھی ان کی طاقتور اور دلآویز شخصیت اور اعلیٰ کردار کی بھی، اور مثبت و تعمیری طرز فکر اور جذبۂ عمل کی بھی۔

یہ ایک ایسی کڑی اور دوہری آزمائش ہے جس کی نظیر قدیم اسلامی تاریخ میں بہت کم ملتی ہے۔ اس لیے ہمیں اس سے کوئی بڑی مدد اور روشنی حاصل نہیں ہو سکتی۔ فقہ و فتاویٰ کی کتابوں میں بھی شاذ و نادر اس عجیب و غریب صورت حال کا ذکر ملے گا۔ کیا اس کی کوئی مثال ہے کہ چھ کروڑ یا اس سے زائد کی اسلامی اقلیت کسی غیر مسلم اکثریت کے درمیان ہو، اور ایسے ملک میں جہاں پارلیمانی نظام قائم ہے دستور کی حکمرانی ہے جس نے سکولرزم و نامذہبیت کو اپنا شعار بنایا ہے؟ اس لیے اب اس کے سامنے آبرومندانہ، باعزت ایجابی و مثبت زندگی گذارنے کا (جو اسلامی تعلیمات کے مطابق اور حقائق و واقعات کے ساتھ ہم آہنگ ہو) ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے اسلام کی حکیمانہ، لازوال اور عالمگیر اصولوں سے روشنی و رہنمائی حاصل کرنا اعلیٰ درجہ کی فراست و بصیرت، طاقتور و ممتاز ملی شخصیت عزم صادق و ایمان راسخ، عزت کی مختصر و جفاکش زندگی کی طویل اور خوشحال زندگی پر ترجیح اور ملک کی اخلاقی قیادت کا وہ منصب عالی حاصل کرنے کی خواہش و کوشش جو عرصۂ دراز سے خالی ہے اور کسی مرد خدا و دانائے راز کا منتظر ہے اس ملک کے اسٹیج پر ایک ایسے مخلص، خدا ترس اور اخلاقی و انسانی قائد کی حیثیت سے سامنے آنا جو ہر قسم کی نفس پرستی سے بلند، ذاتی و جماعتی اغراض سے بالاتر، محب وطن اور انسان دوست و خدا پرست ہو اور وہ ملک کو انسانیت کی پستی، اخلاقی انتشار، خدا فراموشی، اور دولت و منفعت پرستی کے اس عمیق غار میں گرنے سے (امکانی حد تک) بچانے کا عزم کر چکا ہو جس کے کنارے

یہ ملک کھڑا ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جو اس ملت کو عام سطح سے اٹھا کر قیادت و رہنمائی کے منصبِ بلند تک پہونچا سکتا ہے اور حریف کے بجائے حبیب، مبغوض و محسود کے بجائے مخدوم و محبوب بنا سکتا ہے۔

دوسرا پہلو جس میں یہ ملت ہمیشہ سرخ رُو، و باعظمت رہی ہے اور جس کے ذکر سے میرا مقصد محض مدح سرائی اور قصیدہ خوانی نہیں، ایک تاریخی حقیقت کا اظہار ہے؛ وہ اس کا طاقتور دینی جذبہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی سے اس کی والہانہ شیفتگی اور مرکزِ اسلام سے اس کی وہ عقیدت اور قلبی تعلق ہے جس نے مختلف تہذیبی، تمدنی اور معاشرتی فتنوں سے اس کی بارہا حفاظت کی، اور اس کو ہندوستان میں آنے والی دوسری قوموں اور نسلوں کی طرح یہاں کے فلسفوں میں یکسر تحلیل ہونے سے روکا، ہندوستانی مسلمانوں نے اسلام اور مسلمانوں کے تمام مسائل سے (خاص طور پر بیسویں صدی کی ابتدا سے) ہمیشہ سے گہری دلچسپی لی، خلافتِ عثمانیہ کی حفاظت و بقا کے لیے اس ملک میں جتنے جوش کا مظاہرہ کیا گیا (جس میں ہندو مسلمان دوش بدوش تھے) وہ اس کا ایک ثبوت ہے، تحریکِ خلافت جس کا برصغیر میں سیاسی و قومی شعور پیدا کرنے میں بڑا ہاتھ ہے ایک ملک گیر عمومی تحریک تھی، اس کی وسعت و مقبولیت کا اندازہ صرف انھیں لوگوں کو ہو سکتا ہے جنھوں نے وہ دور دیکھا ہے، اسی طرح فلسطین و مسجد اقصیٰ کی بازیابی کے لیے بھی مسلمانانِ ہند نے اپنے خیالات و جذبات کے اظہار میں کبھی کوتاہی نہیں کی، اسلامی مسائل کے بارے میں خواہ ان کا تعلق دنیا کے دور دراز گوشوں سے ہو یہاں کی ملتِ اسلامی ہمیشہ سے بہت ذکی الحس واقع ہوئی ہے اور اس کا عمل اس بارے میں "داد و ستد" اور لین دین کے اصول پر نہیں ہے، یہ اس کے دینی جذبات اور مخصوص تربیت کا نتیجہ ہے۔

اس کا یہ جذبۂ اسلامی اور دین سے گہری وابستگی ان دینی مدارس و مکاتب کی شکل میں بھی نمایاں ہے، جن کا سارے ملک میں ایک جال بچھا ہوا ہے اور جس سے کوئی شہر و قریہ مشکل سے بچا ہوگا، مسلمانوں نے علم و دین کے یہ قلعے انگریزی حکومت کے استحکام اور تعلیمی نظام کے نئے رخ کو سامنے رکھ کر قائم کئے تھے جن کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز ہو کر ہزاروں تک پہونچتی ہے، ان میں ایک بڑی تعداد ان مدارس کی ہے جن کو علوم اسلامیہ کی طرف خصوصی توجہ کی بنا پر ہم عام طور پر "عربی مدارس" کے نام سے یاد کرتے ہیں، ان مدارس میں عام طور پر صحاحِ ستہ کی اول سے آخر تک مکمل تعلیم کا انتظام ہے اور خصوصیت کے ساتھ صحیح بخاری و صحیح مسلم جامع ترمذی، اور سنن ابی داؤد کی طرف زیادہ توجہ رہتی ہے

اور ان کو حرفاً حرفاً پڑھایا جاتا ہے، اس بارے میں شاید ہندوستان کے مدارس عربیہ عالم اسلام میں منفرد ہیں، یہ مدارس قریب قریب سب غیر سرکاری ہیں، ملت اسلامی ان کی کفیل ہے اس ملک میں مخلص علماء، ایثار پیشہ مدرسین، اور رضاکار، داعی و مبلغ شروع سے بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں، جو بڑی قناعت، سادگی اور ایک حد تک قربانی کے ساتھ دین و علم دین کی خدمت میں معروف رہتے ہیں۔ یہ زیادہ تر انھیں مدرسوں کا فیض ہے اور ہندوستان میں سارے سیاسی انقلابات کے باوجود اب بھی دین سے جو گہرا لگاؤ پایا جاتا ہے۔ اور علم کی شمع روشن ہے وہ اسی طریقۂ کار کی برکت اور ثمرہ ہے۔

جب ہندوستان کے عربی مدارس کا ذکر آگیا ہے تو ہندوستانی علماء و فضلاء مدارس کی اس خصوصیت کا ذکر کرنا نامناسب نہ ہوگا کہ وہ نہ صرف ہندوستان کی تحریک آزادی کی جدوجہد کرنے والوں کی صف اول میں تھے بلکہ اکثر اوقات انھوں نے اس تحریک و جدوجہد کی قیادت کی اور زیادہ غور سے دیکھا جائے اور انصاف سے کام لیا جائے تو اول اول یہ خیال انھیں نے دیا اور اس جذبہ میں جو حرارت، طاقت اور عمومیت پیدا ہوئی وہ انھیں کی رہین منت تھی، ان میں سے متعدد اصحاب نے انگریزی حکومت کے خلاف علم جہاد بلند کرنے والوں کی عملی قیادت کی، انگریزی فوجوں سے دو بدو جنگ کی اور متعدد حضرات جزائر انڈمان و نکوبار اور جزیرۂ مالٹا میں قید و نظر بند کیے گئے اور کئی کو حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی۔ ہزاروں حضرات ایسے تھے جنھوں نے اپنی زندگی کا خاصا حصہ ہندوستان کی جیلوں میں گذارا، حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کی تحریک آزادی کی تاریخ علماء اور دینی شخصیتوں کی تاریخ کے ساتھ اس طرح گھل مل گئی ہے کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا ممکن نہیں رہا۔

ان کی دوسری نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے برصغیر ہند کی زبان و ادب کی خدمت و ترقی میں قائدانہ حصہ لیا اور ۱۸۵۷ء کے بعد اس تحریک کی سربراہی اور رہنمائی کی، اردو کا قصر ادب جن مضبوط اور بلند ستونوں پر قائم ہے ان میں سے بیشتر طبقۂ علماء سے تعلق رکھتے ہیں، انھیں نے اردو کو نیا رنگ و آہنگ نئے اسلوب اور وہ سنجیدگی اور پختگی عطا کی جو اس وقت تک اردو کا سرمایہ فخر ہے، ان میں سے ایک ایک مستقل دبستان ادب کا بانی ہے جس کی اس وقت تک پیروی کی جارہی ہے۔ اردو شعراء کے مستند تذکرے اور اردو زبان کے ظہور و ارتقاء کی تاریخ میں انھیں کی تصنیفات

و تحقیقات اس وقت تک اس موضوع میں ابتدائی ماخذ اور سند کا درجہ رکھتی ہیں اور ابھی تک ان سے کام لیا جاتا ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان میں علوم مذہبی اور ملک کی زبان و ادب کے درمیان وہ خلیج کبھی نہیں رہی اور دونوں کے نمائندوں کے درمیان وہ بیگانگی اور اجنبیت بھی کبھی پیدا نہیں ہوئی جو بعض دوسرے اسلامی ملکوں میں پائی جاتی ہے، اور جس کا نقصان دونوں طبقوں کو کم و بیش برداشت کرنا پڑا۔

اگر اجازت دی جائے تو میں بڑے ادب کے ساتھ ایک بات اور عرض کروں گا، وہ یہ کہ ہندوستانی مسلمان خدا کے فضل سے بڑی حد تک اسلام کے معاملہ میں خود کفیل ہیں وہ اسلام کے اولین و حقیقی سرچشمول کتاب و سنت اور اسلام کے اولین علمبرداروں کی سیرت و کردار، ان کی قربانی، و ایثار، اور ان کی اولوالعزمی و حوصلہ مندی کی جلائی ہوئی شمع سے روشنی حاصل کرتے ہیں، انھوں نے اپنا عقیدہ و ایمان اپنا حال و مآل، اسلام کے چمکتے ہوئے سورج کے ساتھ وابستہ کیا ہے مسلم اقوام یا عرب ممالک کے ابھرتے ڈوبتے ستاروں یا ٹمٹماتے چراغوں سے نہیں، وہ آنکھ بند کر کے ان میں سے کسی کی انگلی پکڑ کر چلنے والے نہیں ہیں نہ انھوں نے ان میں سے کسی کی اسلام کے ساتھ وفاشعاری کو اپنی وفاشعاری کی شرط قرار دی ہے، انھوں نے اللہ کے بھروسہ پر یہ فیصلہ کیا ہے کہ ان کو اسلام اور اسلامی تعلیمات کو اپنے سینہ سے لگائے رکھنا ہے، خواہ دنیا کی کوئی قوم (عرب ہو یا عجم) اس سے بے تعلقی یا روگردانی اختیار کرے، اگر عرب یا دوسرے ممالک کے مسلمان اپنی پرانی تہذیبوں اور قدیم فلسفوں کے سحر میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور ان کا دم بھرنے لگتے ہیں تو ہم انشاء اللہ وحدت اسلامی، اور شریعت اسلامی کا دم بھرتے رہیں گے، ہم اسلامی اصولوں اور اسلام کے مسلک زندگی کے معاملہ میں کسی قسم کا سودا کرنے کے لیے تیار نہیں ہم اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ ہمیں اس ملک میں اور اس ملک کے باہر اپنی اس اصول پسندی اور وفاشعاری کی قیمت ادا کرنی پڑے گی، ہمیں بہت سے ان منافع و مواقع سے آنکھیں بند کرنی پڑیں گی جو ہوا کے رخ پر چلنے والی ملتوں اور فرقوں کو حاصل ہوتے ہیں، لیکن ہمارا یقین ہے کہ ہمارا خدا اگر ہم سے راضی ہے اور ہم خلوص و فہم کے ساتھ اپنے اصولوں پر قائم ہیں تو ہمارے لیے کوئی تنگی اور ہماری قسمت میں محرومی نہیں لکھی ہے۔ اس لیے کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ یہ ساری کائنات ارادۂ الٰہی کے تابع ہے اور اس کے حکم کے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔ اس لیے ہمارا مسلک اور ہمارا عقیدہ ہے کہ ۔

گلہ نہیں جو گریزاں ہیں چند پیمانے
نگاہِ یار سلامت! ہزار میخانے

حضرات! ان سب وجوہ کی بنا پر شاید اس سر زمین کو بہت سے دوسرے اسلامی ملکوں سے اس کا زیادہ حق ہے کہ اس کو ایسے مایۂ ناز اور منتخب روزگار علماء، ارباب فکر و نظر، ماہرین تعلیم اور اساتذہ و معلمین کی میزبانی کا شرف حاصل ہو، اور وہ خود یہاں تشریف لاکر اپنی آنکھوں سے ان کوششوں کے نتائج کو دیکھ سکیں، جو ایک بے سروسامان اور بے نوا ملت نے اپنے دین کی خدمت اور علوم اسلامیہ کی ترقی و اشاعت کے سلسلہ میں کی ہیں۔ اور یہ دیکھیں کہ ابھی اس کو کتنی طویل مسافت طے کرنی ہے، اور وہ اس سفر میں اس کی کیا رہنمائی کر سکتے ہیں؟

دوسری حیثیت سے میں آپ کا خیر مقدم لکھنؤ کے اس تاریخی شہر میں کر رہا ہوں جو اپنی مردم خیزی، علم پروری، علماء نوازی میں دہلی کا ہمسر، اور اس کا ہم ردیف رہا ہے۔ یہ دہلی کے بعد ہندوستانی تہذیب و تمدن، ادب و شائستگی اور اردو زبان و شاعری کا گہوارہ تھا، اور یہی ہندوستان کی قدیم تعلیمی تحریک کا مرکز تھا، یہاں وہ سر آمدِ روزگار علماء پیدا ہوئے جن کے علم کے چشمے ایک طرف مشرق کے آخری حد و دتک، دوسری طرف جنوب کے کناروں تک بہے، اور ایک عالم نے ان سے اپنی علمی پیاس بجھائی، قدیم نصاب درس (درس نظامی) یہیں ترتیب و تکمیل کے آخری مراحل کو پہونچا، جس کا سکہ ایک زمانہ میں برصغیر ہند سے لیکر افغانستان و ترکستان تک چلتا رہا ہے، اس شہر کو آخری دور میں قرآن مجید کی خدمت، اس کے حفظ و تجوید، اور اشاعت و تبلیغ کا وہ شرف بھی حاصل ہوا جس میں کم نامی گرامی اسلامی شہر اس سے سبقت لے جانے کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔

ذَالِكَ فَضْلُ اللهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ وَاللهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْم۔

حضرات! تیسری حیثیت سے اس اہم تعلیمی مرکز میں آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں جہاں اسلامی فکر و شعور، بحث و نظر اور علمی بصیرت اور دور بینی کی تاریخ کا ایک دلآویز و درخشاں باب تحریر کیا گیا۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں اس تلخ و ترش حقیقت کا احساس پہلی بار مجسّم اور ٹھوس شکل میں سامنے آیا کہ چودھویں صدی ہجری کے آغاز اور انیسویں صدی کے اواخر میں عالم اسلام تفرقہ و انتشار، پریشان خیالی، اور فکری اضمحلال کی کس آخری منزل میں تھا، نئے تغیرات اور نئے حوادث

کا سامنا کرنے اور نئے مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت علمائے دین میں (جو ملت کے حقیقی قائد تھے، اور اس طریقہ تعلیم سے جو ان کو پیدا کرنے کا واحد ذریعہ تھا کس تیزی سے مفقود ہوتی جا رہی تھی، مسلم معاشرہ دو متوازی طبقوں کے درمیان منقسم ہو گیا تھا، ایک طرف علمائے دین تھے، جو عربی مدارس سے قدیم طرز پر پڑھ کر نکلے تھے، دوسری طرف مغربی تعلیم یافتہ حضرات جو کالجوں اور یونیورسٹیوں کے پروردہ تھے۔ ان دونوں کے درمیان اجنبیت اور بیگانگی کی خلیج تھی اور یہ خلیج دن بدن بڑھتی جا رہی تھی، اندیشہ تھا کہ وہ اس حد تک پہونچ جائے کہ کسی ملانے والے پل کے بغیر ان کی ملاقات اور کسی ترجمان کے بغیر افہام و تفہیم ممکن نہ ہو۔

معاملہ انھیں دو طبقوں ہی میں منحصر نہ تھا، ملت کے مختلف مذہبی فرقے اور فقہی مسلک ایک دوسرے کو تحقیر یا خوف و نفرت کی نگاہ سے دیکھنے کے عادی ہو گئے تھے، مناظروں اور مجادلوں کا بازار گرم تھا اور وہ کبھی کبھی سخت جارحانہ شکل اختیار کر لیتے تھے معاملہ صرف اثبات و تردید تک محدود نہ تھا، بلکہ تفسیق و تکفیر تک کی گرم بازاری تھی، جہاں تک نصابِ درس کا تعلق ہے اس میں کسی کمی یا زیادتی کی گنجائش نہیں سمجھی جاتی تھی علمی حلقوں پر بالعموم ذہنی عزلت اور گوشہ نشینی کی فضا طاری تھی، اور جدید دنیا کے علوم و افکار، اور علمی تحقیقات کے لیے کوئی روزن کھلا نہیں رہ گیا تھا، تیز رو اور تغیر پذیر زندگی سے صرف اسی وقت واسطہ پڑتا تھا جب علما سیاست کے راستہ پر گامزن ہوتے، مسلم معاشرہ کی پاسبانی و نگرانی مغربی علوم کے حملوں اور اس کے تشکیکی اثرات سے مسلمان نوجوانوں کی حفاظت سے علما کنارہ کش ہوتے جا رہے تھے اور تعلیم یافتہ طبقہ مغرب کے غاشیہ برداروں اور فکری و تہذیبی شکست کے نقیبوں کے رحم و کرم پر تھا۔

اس نازک بحرانی دور میں (۱۳۱۱ھ - ۱۸۹۴ء) کچھ منتخب اہلِ نظر و اہلِ درد جن کو فراست ایمانی اور درد اسلامی کا حصۂ وافر ملا تھا سر جوڑ کر ایک جگہ بیٹھے اور انھوں نے اس کا ایک حل تجویز کیا، یہ پہلا موقع تھا کہ جب اہلِ نظر، اہل دل کے ساتھ، علما دین، جدید تعلیم یافتہ حضرات کے ساتھ، مذہب حنفی کے علمبردار، علمائے اہل حدیث کے ساتھ، زاہد و گوشہ نشین، امراء و رؤساء اور ماہرین تعلیم کے ساتھ شانہ بشانہ اور صف بصف نظر آئے، ان لوگوں نے اس مقصد کے لیے ایک انجمن قائم کی اور اس کا نام "ندوۃ العلماء" تجویز کیا اس لیے کہ یہ انجمن در اصل

جماعت علماء ہی کے غور و فکر اور انھیں کی دعوت پر قائم ہوئی تھی اور وہی اس کے رُوحِ رواں تھے؛
اس انجمن نے جن بنیادوں پر اپنے سفر کا آغاز کیا وہ تھیں، مسلمانوں کا باہمی اتحادِ اسلامی
نشأت ثانیہ کے لیے مختلف اجتماعی، اصلاحی و تعلیمی کوششوں میں ہم آہنگی، اعلیٰ سیرت و کردار
کی تشکیل، رسوم قبیحہ کا استیصال، مسلمانوں کے مختلف امور و مسائل کے حل کے لیے مختلف مسلک
و مشرب کے صحیح العقیدہ (اہل سنت والجماعت) علماء کے ایک مشترکہ پلیٹ فارم کی تشکیل، اسلامی
اصولوں اور شریعت اسلامی کے مقاصد کو سامنے رکھ کر علوم دینیہ کے نصاب میں ایسی تبدیلیاں جو
عصر حاضر کے تقاضوں کی تکمیل کر سکیں، علماء کی دینی سطح کو بلند اور ان کے فکر و معلومات کے افق کو
وسیع کرنا اور ایسے علماء تیار کرنا جو قدیم و جدید دونوں طبقوں کے اعتماد کے اہل اور احترام کے مستحق
اور مسلمانوں کے دینی، فکری، علمی قیادت کے اس منصب پر فائز ہو سکیں جو عرصہ سے خالی چلا آ رہا ہے۔

انھوں نے قرآن مجید کے متن و تفسیر کے طریقۂ تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دی، علوم آلیہ
اور علوم عالیہ، اور وسائل و مقاصد میں تفریق کی، متقدمین میں جو اصحاب دین و علم کا مذاق صحیح
اور ملکۂ راسخہ رکھتے تھے ان کی تصنیفات کو اصولاً متاخرین کی تصنیفات پر مقدم رکھا گیا، "محض کتاب
خوانی" کے بجائے "علم آموزی" کی طرف توجہ کی گئی، نصاب میں عربی زبان کو اس کے شایان شان
اور معزز جگہ دی گئی، اس لیے کہ وہ عرصۂ دراز سے غفلت کا شکار تھی اور عہد آخر میں وہ اپنے
زوال کے آخری نقطہ پر پہونچ چکی تھی، اور نصاب درس اور علمی و تعلیمی سرگرمیوں میں اس کی حیثیت
ایک حاشیئے سے زیادہ نہ تھی۔ یہاں ایک ایسی زندہ اور ترقی یافتہ زبان کی حیثیت سے اس کی
تعلیم کا انتظام کیا گیا جو زندگی اور قوت سے بھرپور ہے زمانہ کی تمام ضرورتیں پوری کر سکتی ہے، اور
اس سے دعوت اور اپنے افکار و خیالات کی اشاعت کا بڑا کام لیا جا سکتا ہے اس کا مقصد یہ تھا کہ
یہاں کے طلبہ اور فضلاء اس کے ذریعہ قرآن مجید کے جمال حسی و معنوی اور اس کے اعجاز و بلاغت
سے ذوق حاصل کر سکیں، حدیث نبوی کی فصاحت و شیرینی سے لطف اندوز ہوں اور وہ اہل عرب کو
ان ہی کی زبان اور ان ہی کے اسلوب میں خطاب کر سکیں اور اس کے ذریعہ عصر حاضر کے فتنوں اور گمراہ
کن تحریکوں اور دعوتوں کا کامیابی سے مقابلہ کر سکیں، یہ اس زمانہ میں جب ہوا اصلاحات اور رسل
و رسائل کا یہ سلسلہ موجود نہ تھا، اور بیرونی سفروں کا سلسلہ اس طرح شروع نہ ہوا تھا ایک نوکھی

اور اپنے زمانے سے آگے کی بات تھی، اب جبکہ ممالک عربیہ واسلامیہ آزاد ہو چکے ہیں اور بین الاقوامی سطح پر اجتماعات، وفود کی آمد و رفت اور مذاکرہ و تبادلۂ خیال ایک عام بات بن چکی ہے۔ ہمارے لیے اس فیصلہ کی اہمیت اور "ندوۃ العلماء" کے بانیوں کی عربی زبان سے خصوصی اور غیر معمولی دلچسپی کا راز سمجھنا کچھ مشکل نہیں ؟

انھوں نے اس کے ساتھ بعض مفید اور جدید علوم کو بھی جن سے ایک عالم دین کو ناواقف نہ رہنا چاہیے، اپنے نصاب میں شامل کیا اور مروّجہ سرکاری زبان کی تعلیم کا بھی انتظام کیا، ان مقاصد اور آرزوؤں کی تکمیل کے لیے ۱۳۱۶ھ مطابق ۱۸۹۸ء میں ان حضرات نے تجربہ ونمونہ کے طور پر لکھنؤ میں ایک دارالعلوم قائم کیا اور اس کا نام "دارالعلوم ندوۃ العلماء" تجویز کیا جو اپنی شہرت ومقبولیت اور زبان زد ہونے کی وجہ سے ندوہ ہی کے نام سے موسوم ومعروف ہے ورنہ یہ دراصل اس انجمن کا نام ہے جو اس مدرسہ کی نگراں وسرپرست ہے، اس انجمن کی تاریخ اور اس کی مرحلہ وار داستان اور دارالعلوم کی کہانی جس کے وسیع وخوشنما سبزہ زار میں ہم اور آپ جمع ہیں اور اس کی عہد بہ عہد ترقیاں آپ ان رسائل اور کتابچوں میں پڑھیں گے (جو آپ کی خدمت میں پیش کیے گئے ہیں) اور آیندہ مقالہ میں سنیں گے۔

اس مرکز علم ودین! اس انجمن کے قائم کردہ دارالعلوم کی کشادہ فضاؤں میں جو ایک مرکز تعلیم سے زیادہ ایک وسیع اور جامع مدرسۂ فکر اور فکری و اصلاحی تحریک ہے۔ ہم سب آپ کا انتہائی گرمجوشی سے استقبال کرتے ہیں اور اس تاریخ ساز اجتماع اور مبارک و منتخب محفل میں جس کے واقعات اور داستانیں شاید آنے والے زمانہ میں شکر واعتراف کے لہجہ میں سنائی جائیں اور ایک مقدس امانت اور قیمتی اثاثہ کی طرح ہماری نئی نسل کی طرف منتقل کی جائیں، اور جس اجتماع میں اللہ کے فضل سے عالم اسلام نے اتنی فیاضی سے اپنے جگر کے ٹکڑے اور آنکھ کے تارے ایک جگہ جمع کر دیے ہیں کہ اس کی مثال ہمیں اس ملک کے ماضی قریب کی تاریخ میں نہیں ملتی، ہم دوبارہ اپنے معزز مہمانوں کی خدمت میں اسلام اور علم کا مشترک سلام پیش کرتے ہیں۔

یہ ملت اور یہ سرزمین پہلے بھی احسان فراموش نہ تھی اس نے پہلے بھی اپنے عزیز

ومعزز مہمانوں کی آمد پر شکر و فخر کیا ہے، ازآج جبکہ اتنی کثیر التعداد اور یگانہ شخصیتوں نے اس کو اپنے قدوم سے رونق و عزت بخشی ہے، اس کا سر فخر سے اونچا اور اس کی زبان شکر و مسرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اس طرح زمزمہ سنج ہوتی ہے ؎

من آں خاکم کہ ابر نو بہاری ز لطفش کرد بر من قطرہ باری
اگر بر روید از تن صد زبانم ہو سوسن شکر نعمت کے توانم؟!

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی چند اہم تصنیفات

تاریخ دعوت وعزیمت

عالم اسلامی کی اصلاحی و تجدیدی کوششوں کا تاریخی جائزہ، نامور مصلحین اور ممتاز اصحاب دعوت وعزیمت کا مفصل تعارف، ان کے علمی و عملی کارناموں کی روداد اور ان کے اثرات و نتائج کا تذکرہ تین حصوں میں مکمل قیمت -/۳۴

جب ایمان کی بہار آئی

مجاہد کبیر حضرت سید احمد شہید اور آپ کے عالی ہمت رفقاء کے ایمان افروز واقعات جن کی کوششوں سے ہندوستان میں ایمان کی بہار آئی اور اسلام کی ابتدائی صدیوں کی یاد تازہ ہو گئی۔ قیمت -/۱۲

پرانے چراغ

مصنف مدظلہ کے ان مضامین کا مجموعہ جو اہم شخصیتوں پر ان کی وفات کے بعد لکھے گئے۔ نقوش و تاثرات، تجربات اور حالات و واقعات کا دلکش و دلچسپ اور سبق آموز مرقع۔ قیمت -/۱۶

مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں

مولانا مدظلہ کے مقالات کا مجموعہ جن میں مغربی تہذیب کے نقائص پر نکتہ چینی اور مشرق کے پرستاران مغرب کی غلامانہ ذہنیت اور اندھی تقلید پر صاف صاف تنقید کی گئی ہے اور انسانیت کی صحیح رہنمائی و خدمت کے لیے ایک معتدل راہ کی نشاندہی کی گئی ہے۔ قیمت صرف -/۵

ارکان اربعہ

اس کتاب میں ارکان اسلام کے احکام کے ساتھ ساتھ ان کے عقلی مصالح، ان کی اہمیت، اور دوسری امتوں کے عبادتی طور طریقوں سے موازنہ اور مقابلہ کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ فقہ و کلام اور اصول دین کی ایک جامع کتاب۔ قیمت -/۱۲ انگریزی -/۲۲

معرکۂ ایمان و مادیت

سورۂ کہف کا نیا مطالعہ اور اصحاب کہف کا عجیب و سبق آموز قصہ
قیمت صرف -/۵ انگریزی -/۱۰

پاجا سراغ زندگی

مولانا مدظلہ کی مفید اہم تقاریر کا مجموعہ جن میں درد و سوز اور ایمان و یقین کی کیفیات کے ساتھ ساتھ مصنف کے طویل علم و مطالعہ اور تجربہ و مشاہدہ کا نچوڑ کتاب کی سطر سطر سے نمایاں ہے۔ قیمت صرف -/۴

منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین

مولانا مدظلہ کی ایک تازہ ترین تصنیف جس میں نوع انسانی اور تمدن انسانی پر نبوت کے احسانات، انبیاء کرام کی امتیازی خصوصیات، نبوت کے پیدا کردہ ذہن و مزاج اور طریقۂ فکر نیز ختم نبوت کی ضرورت اور اہمیت اور اس کے دور رس عظیم انقلاب انگیز اثرات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

قیمت صرف -/۱۲

مرتب مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی (اعظم گڑھ)

مجلس حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڑھی مدظلہ

الہ آباد، ۷ رمئی ۱۹۷۵ء مطابق ۲۴ ربیع الثانی ۱۳۹۵ھ

(گذشتہ سے پیوستہ)

[اس سلسلہ کی پہلی قسط ناظرین کرام پچھلے مہینے اکتوبر کے شمارہ میں ملاحظہ فرما چکے ہیں افسوس ہے کہ صفحات میں گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے پوری "مجلس" اس میں نہیں آسکی تھی، جو حصہ باقی رہ گیا تھا وہ آج کی صحبت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

یکسوئی اور شیخ کی اطاعت کے سلسلہ میں فرمایا کہ مولانا خالد کردی، شام سے جب شاہ غلام علی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں کسب فیض کے لیے دلی آئے تو گو وہ بڑے آدمی تھے مگر شاہ صاحب نے انھیں خلوت میں رہنے کا حکم دیا، وہ شیخ کے حکم کی بنا پر خلوت نشیں ہوگئے اور درس و تدریس و ملاقات کا سلسلہ بالکل بند کر دیا صرف نماز کے وقت نکلتے تھے، جب حضرت شاہ عبد العزیز صاحبؒ کو اُن کی آمد کا علم ہوا تو ان کے علم و فضل کی بنا پر ان سے ملنے آئے، اور اطلاع دی مولانا خالد نے ملاقات سے معذرت کر دی اور کہلا دیا کہ جب اس کام کی تکمیل سے فارغ ہو جاؤں گا جس کے لیے حاضر ہوا ہوں تو خود ہی حاضر خدمت ہوں گا۔ مولانا نے فرمایا کہ کوئی ظاہر پرست اگر اس پر اعتراض کرے کہ شاہ صاحب اتنے بڑے آدمی تھے اور اُن سے وہ ملے نہیں، تو اصل بات یہ ہے کہ صوفیا کے یہاں ایک چیز ہے توحیدِ مطلب جب تک سلوک کی تکمیل نہ ہو جائے اس وقت تک ایک شیخ سے تعلق رکھنا ضروری ہے اگر ایسا نہیں ہوگا تو وہ ڈانواں ڈول رہے گا، اور یہ چیز تکمیل میں مضر ہوگی۔ تکمیل کے بعد وہ جس سے چاہے ملے اور جس کی خدمت میں چاہے جائے۔ شاہ عبد العزیز صاحب بھی بڑے آدمی تھے مولانا خالد ان کو پہلے سے جانتے تھے اس لیے انھوں نے

سوچا کہ اگر اس وقت ملوں گا تو ممکن ہے کہ شاہ صاحب کی طرف میلان ہو جائے تو پھر جس شیخ سے استفادہ کے لیے اتنی دور سے آئے ہیں ان سے فائدہ نہ ہو گا اس لیے انھوں نے معذرت کر دی۔

فرمایا کہ اصل چیز اخلاص ہے، اسی اخلاص کی وجہ سے عارف کی دو رکعت نماز غیر عارف کی سو رکعت کے برابر ہوتی ہے۔ صحابہ کے اخلاص ہی کی وجہ سے آپ نے فرمایا کہ صحابی کا ایک مُد صدقہ کرنے کا ثواب بعد کے لوگوں کے پہاڑ کے برابر صدقہ کرنے کے برابر ہے۔

فرمایا کہ عالم اور جاہل کے گناہ کرنے میں فرق ہے عالم کو جلدی تنبہ ہو جاتا ہے اور جاہل غافل رہتا ہے۔

فرمایا کہ اب بہت سے علما اہل حق ہوتے ہوئے بدعات کے سلسلہ میں تساہل اور نرمی برتتے ہیں۔ بھائی مجھے یہ اچھا نہیں لگتا، بدعات ہی میں غلو سے شرک پیدا ہوتا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کو یہ بات پہنچی کہ ان کے شیخ حضرت باقی باللہؒ کے وصال کے بعد ان کے کچھ متوسلین نے محفل میلاد کے نام سے ایک مجلس قائم کی ہے، حضرت مجدد کو جب علم ہوا تو آپ نے ان لوگوں سے فرمایا کہ اگر آپ لوگ اس بدعت کو ترک نہیں کریں گے تو میں آپ لوگوں سے اپنا تعلق منقطع کر لوں گا، ان لوگوں نے کہا کہ حضرت بعض بزرگوں نے خواب میں دیکھا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے راضی ہیں، فرمایا کہ اگر رویا اور خواب پر دین کا دارومدار ہوتا تو دین برباد ہو جاتا، آپ لوگ اس سے باز آئیں۔ غالباً اس کے بعد اس سلسلے میں یہ بدعت ختم ہو گئی۔

پھر اپنا ایک واقعہ سنایا کہ میری سالی کی شادی تھی اس تقریب میں کوئی غیر شرعی بات نہیں تھی مگر نکاح کے بعد ایک آتش بازی چھوڑ دی گئی، میں اسی وقت اٹھا اور دوسرے گاؤں آکر بغیر کھائے پیے سو رہا، اور پھر صبح کو اپنے گاؤں واپس چلا آیا، خلاف شریعت بات اور بدعت سے اتنی شدید نفرت کم لوگوں میں دیکھنے میں آئی، اکثر مولانا فرماتے ہیں حدیث میں "کل بدعۃ ضلالۃ" کا لفظ آیا ہے کُل کے لفظ پہ مولانا زور دے کر اسے جب بیان کرتے ہیں تو دل میں واقعی ہر بدعت سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔

مولانا محمد علی جوہر کا ذکر کر کے فرمایا کہ وہ رسمی مولوی نہیں تھے مگر ان کے دل میں عشق و محبت کی عجیب چنگاری تھی، ایک بار وہ جیل میں تھے تو ان پر عجیب کیفیت طاری ہوئی اور اسی کیفیت

میں تہجد کے وقت یہ اشعار کہے ہیں:-

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں — اب ہونے لگیں مجھ سے خلوت کی ملاقاتیں

ہر رات کو اٹھتے تھے وہ بام پر آتے تھے — تب عشق و محبت کی ہو جاتی تھیں دو باتیں

معراج کی سی حاصل سجدوں میں تھی کیفیت — ایک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں

بزرگوں کی بے نفسی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ شیخ عبد القدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو ایک صاحب نے اپنے یہاں تقریب میں بلایا حضرت نے وعدہ کر لیا، وعدے کے مطابق تقریب کے وقت گئے اور چپکے سے مجمع میں ایک کنارے بیٹھ گئے اور کھانا کھا کر واپس چلے آئے، داعی نے دیکھا ہی نہیں، داعی کئی دن بعد خدمت میں آیا اور اپنی افسردگی کا اظہار کیا کہ حضرت وعدہ کے باوجود تشریف نہیں لائے، فرمایا کہ میں تو گیا تھا اور کھانا کھا کر واپس چلا آیا، داعی نے کہا کہ حضرت میں نے تو دیکھا ہی نہیں بہت افسوس ہوا، اس کے بعد ذرا جوش اور تعلق کے لہجہ میں فرمایا کہ تم نے میری خوشبو سے کیوں نہ جان لیا کہ میں آیا ہوں۔

فرمایا کہ لوگ آزاد رہنا چاہتے ہیں حالانکہ خدا کا شکر کرنا چاہیے کہ ہم کو آزاد نہیں رکھا گیا بلکہ شریعت کا پابند کیا گیا پھر اپنا یہ شعر سنایا ؎

اگر آزاد ہم ہوتے خدا جانے کہاں ہوتے — مبارک عاشقوں کے واسطے دستور ہو جانا

فرمایا کہ مولانا عبد السلام صاحب مرحوم خلف الرشید مولانا عبد الشکور صاحب رحؒ کی عیادت کے لیے میں ان کی آخری بیماری میں گیا تو دیکھتے ہی کہا کہ آپ آ گئے آپ کا انتظار تھا اس کے بعد کہا کہ مولانا اگر اس مرض میں موت آ جائے تو میں موت کو لبیک کہنے کے لیے تیار ہوں، میرے والد مولانا عبد الشکور صاحبؒ کثرت سے حضرت یوسفؑ کی یہ دعا پڑھا کرتے تھے اور میں بھی پڑھتا ہوں فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ۔

پھر حضرت خواجگی کے وہ دو شعر پڑھے جو ان کی مزار پر کندہ ہیں۔

بس مرگ من اے عزیزانِ من — نویسد بر گور من ایں سخن

کہ چوں خواجگی در تہ خاک شد — نکو شد کہ خس کم جہاں پاک شد

حضرت خواجگی عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے وقت کے بزرگ ہیں اور ان کا مزار کڑہ الہ آباد میں ہے۔

فرمایا کہ مرشد اور مسترشد دونوں میں جب محبت کا تعلق ہو تو کچھ فائدہ ہوتا ہے ورنہ مرشد کی یک طرفہ محبت اور دردمندی سے کچھ نہیں ہوتا اور نہ اس کا کوئی ثمرہ نکلتا ہے، بزرگوں سے فائدے کے لیے ان سے محبت وخلوص ضروری ہے سہ

الفت کا جب مزا ہے کہ ہوں وہ بھی دردمند
دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی

اس سے پہلے جو مضمون مولانا پر راقم نے لکھا تھا اس میں ان کی چند خصوصیات کا ذکر کیا تھا مگر اس میں ان کی دو ایک خاص خصوصیتوں کا ذکر رہ گیا تھا آج کی صحبت اور مجلس میں وہ بھی ناظرین کے پیش خدمت ہے۔

فارسی شاعری ہو یا اُردو شاعری اس میں جان درد وسوز کی وجہ سے ہے جس شاعر کو درد وسوز کا جتنا حصہ ملا تھا اسی کے کلام میں اتنی زیادہ جان تھی، کچھ لوگوں کو یہ درد وسوز حالات کی ناسازگاری سے ملتا ہے اور کچھ لوگوں کے خمیر میں یہ درد وسوز ہوتا ہے مگر قدرت کا یہ عطیہ جن لوگوں کو ملتا ہے ان کے کلام میں ایک خاص کشش اور کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ حضرت مولانا محمد احمد صاحب مدظلہٗ فطری طور پر سراپا درد وسوز ہیں، اور پھر درد وسوز کے ساتھ ان کو شعر وشاعری کا اعلیٰ مذاق قدرت نے عطا کیا ہے۔ اس لیے وہ قرآن وحدیث کی بات کریں یا ذکر اذکار کی گفتگو کریں درد وسوز اور اس کی شعر وشاعری سے ان کی مجلس کبھی خالی نہیں ملے گی ان کو ہزاروں فارسی اور اُردو کے اشعار یاد ہیں اور خود بھی شاعر ہیں اس لیے وہ بات بات پر شعر پڑھکر تقشف کی خشک باتوں کو بھی پرکشش اور دلچسپ بنا دیتے ہیں اور ان کی مجلس میں بیٹھنے والا کبھی اکتاتا نہیں، مولانا کے متعدد اشعار اوپر نقل کیے گئے ہیں چند اشعار اور نقل کیے جاتے ہیں، ان کے اشعار میں رعایت شعری کے ساتھ کہیں عام شعرا کی بے اعتدالی نظر نہیں آئے گی، یہ خصوصیت خواجہ میر دردؔ اور خواجہ عزیز الحسن مجذوبؔ کے علاوہ اردو شعرا میں کم ہی نظر آئے گی پھر درد وسوز کے ساتھ شعر میں ایک خاص باطنی کیفیت کی جلوہ گری محسوس ہوگی یا دوسرے الفاظ میں سلوک کی کسی نہ کسی منزل کی ترجمانی ہوگی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

جہاں جاتے ہیں ہم تیرا افسانہ چھیڑ دیتے ہیں — کوئی محفل ہو تیرا رنگ محفل دیکھ لیتے ہیں

داستانِ عشق کی ہم کس کو سنائیں آخر — جس کو دیکھو وہی دیوانہ نظر آتا ہے

تڑپنے سے ہم کو فقط کام ہے — یہی بس محبت کا انعام ہے

تیرا عشق شاید ابھی خام ہے — جو آغاز میں فکرِ انجام ہے

گیا ہیں بھول گلستاں کے سارے افسانے — دیا پیام کچھ ایسا سکوتِ صحرا نے

معیت[1] گر نہ ہو تیری تو گھبراؤں گلستاں میں — رہے تو ساتھ تو صحرا میں گلشن کا مزا پاؤں

جو آ سکتا نہیں وہم و گماں میں — اسے کیا پا سکیں لفظ و معانی

قیس بے چارہ رموزِ عشق سے تھا بے خبر — ورنہ ان کی راہ میں ناقہ نہیں محمل نہیں

لطفِ جنت کا تڑپنے میں جسے ملتا نہ ہو — وہ کسی کا ہو تو ہو لیکن ترا بسمل نہیں

حسن[2] کا انتظام ہوتا ہے — عشق کا یوں ہی نام ہوتا ہے

جس پہ ان کا کرم نہیں ہوتا — حاملِ دردِ غم نہیں ہوتا

محسوس لگا ہونے کہ دل عرش بریں ہے — اللہ رے یہ ان کی ملاقات کا عالم

کہنے کی نہیں بات یہ کہتا ہوں مگر خیر — پھرتا ہے نگاہوں میں محالات کا عالم

بس پوچھیے ان سے جو محبت پہ فدا ہیں — حرکات کا سکنات کا لمحات کا عالم

قربان وہ کر دیتا ہے جنت کی بہاریں — پاتا ہے جو قسمت سے مناجات کا عالم

میں فرش کو بھی عرش سمجھنے لگا احمدؔ — طاری ہوا جب ان کے خیالات کا عالم

کہیں بھی ہم ہوں مگر فیض ہے یہ ساقی کا — ہمارے پاس پہنچتے ہیں اڑ کے پیمانے

مولانا کے ایک خصوصی متوسل کامل احسن صاحب جب ان اشعار کو اپنے پُرسوز لہجہ میں سناتے ہیں، تو ایک وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

---

[1] معیت سے مراد اللہ تعالیٰ کی معیت ہے۔ صوفیا کے یہاں اس کی تشریح سننے کے قابل ہوتی ہے۔

[2] یہاں حسن و عشق سے مراد صاحبِ حسن یعنی ذاتِ خداوندی اور عشق سے مراد صاحبِ عشق یعنی سالک۔

محمد منظور نعمانی

ایک غیر مترقبہ نعمت
رمضان مبارک میں حرمین شریفین کی حاضری

الفرقان کے ناظرین کو بھی اپنے لطف و لذت میں شریک کرنے کے لیے اس مبارک سفر کا حال کچھ تفصیل سے کہنا شروع کیا تھا لیکن بلا ارادہ یہ سلسلہ بہت طویل ہو گیا، پچھلے مہینے اکتوبر کے شمارہ میں ناظرین اس کی پہلی قسط پڑھ چکے ہیں جس میں عید کی نماز مسجد نبوی میں ادا کرنے تک کا حال بیان ہو چکا ہے۔ اس کے آگے آج کی صحبت میں ملاحظہ فرمایا جائے۔

اس طوالت کے لیے راقم سطور کی یہ معذرت ناظرین کے لیے انشاء اللہ قابل قبول ہو گی کہ

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

عید کی نماز سے فارغ ہو گئے اور روضۂ اقدس پہ سلام عرض کر کے، بعض متعارف دوستوں سے رخصتی ملاقات کی کیونکہ آج ہی مکہ معظمہ کے لیے روانگی کا پروگرام تھا، مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی کا قیام بھی مدینہ طیبہ ہی میں رہا تھا بلکہ ان کا ارادہ عید کے بعد بھی چند روز قیام کا تھا، اُن سے رخصتی ملاقات کے لیے اُن کی قیام گاہ پر حاضر ہوا۔ ---- ابھی تک جنت البقیع جانا بالکل نہ ہو سکا تھا، آج عید ہی کے دن جنت البقیع حاضری ہوئی، اور وہاں آرام فرمانے والوں کو مسنون طریقہ پر سلام عرض کرنے اور اُن کے اور اپنے واسطے دعا کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ---- کتنا پیارا اور جامع ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلیم فرمایا ہوا یہ سلام

السلام علیکم اهل الدیار من المومنین ان گھروں کے بسنے والے مومنو اور مسلمو تم پر سلام ہو

والمسلمین ویرحم اللہ المستقدمین منا　　اور اللہ کی رحمت ہو ہم میں سے پہلے جانے والوں
والمستاخرین وانا انشاء اللہ بکم للاحقون　　پر اور بعد میں جانے والوں پر اور انشاء اللہ ہم تم سے ملیں گے۔

ہم لوگوں کو اب مسجد نور جانا تھا، جنۃ البقیع سے مسجد نور زیادہ فاصلہ پر نہیں ہے لیکن چونکہ دھوپ میں تمازت آچکی تھی اور میری طبیعت دو تین دن سے ناساز بھی تھی اس لیے جنۃ البقیع سے باہر آکر ٹیکسی لی اور مسجد نور آگئے، تھوڑا سا آرام کیا، اور وقت آجانے پر ظہر کی نماز مسجد نبوی آکر ادا کی، یہ مسجد شریف کی آخری نماز تھی کیونکہ عصر سے پہلے ہی مکہ معظمہ کے لیے روانگی کا پروگرام تھا۔ ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر مواجہ شریف میں آخری اور وداعی سلام عرض کیا، اور مسجد نور آگئے۔ مولانا سعید احمد خاں صاحب نے کھانا کھلایا جس میں عید والا اہتمام بھی تھا، کویت کے بھائی عبد الباسط صاحب بھی اسی وقت ملے اور کئی قسم کے پھل دسترخوان پر لے آئے۔ کھانے سے فارغ ہو کر تھوڑا سا آرام بھی کیا۔

نیو کاسل (جنوبی افریقہ) کے رہنے والے میرے ایک نہایت محب اور محسن حافظ عبد الحق صاحب کا قیام بھی رمضان مبارک کے آخری عشرہ میں مدینہ منورہ ہی میں تھا اور ان کو بھی عید ہی کے دن مکہ معظمہ کے لیے روانہ ہونا تھا، اُن سے طے ہو گیا کہ انشاء اللہ ساتھ ہی چلیں گے۔ میرے ساتھ مولوی عتیق الرحمٰن اور خلیل الرحمٰن سجاد بھی تھے — انھوں نے ایک صاحب کو ٹیکسی لیکر ہم لوگوں کو لینے کے لیے مسجد نور ہی بھیج دیا اور ہم لوگ مولانا سعید احمد خاں اور میاں جی محراب اور دوسرے مخلصوں سے رخصت ہو کر اس ٹیکسی سے موقف پر (یعنی ٹیکسیوں کے اڈہ پر) آئے اور یہاں سے ایک دوسری ٹیکسی سے مکہ معظمہ کے لیے روانہ ہوئے، اُس سے طے کر لیا تھا کہ وہ بیر علی (ذوالحلیفہ) پر ٹیکسی روکے گا، ہم لوگوں کو وہیں سے عمرہ کا احرام باندھنا تھا، چنانچہ بیر علی آکر ٹیکسی ٹھیری ہم نے وہیں احرام باندھا، دو رکعتیں پڑھ کے عمرہ کی نیت کی اور لبیک کہا، اب عصر کا وقت بھی آچکا تھا وہیں جماعت سے نماز ادا کر کے روانہ ہوئے، مغرب کی نماز غالباً مستورہ کی منزل پہ آکر ادا کی اور عشاء کے بعد مکہ مکرمہ پہنچے　　حافظ عبد الحق صاحب تو افریقی ہوٹل پہ اتر گئے جو حرم شریف کے قریب ہی ہے اور ہم لوگ مولانا عبد اللہ عباس صاحب کے مکان پہ جا کر اترے ہم سب کی طبیعت بہت خستہ تھی، تھکی ماندی تھی اور مجھے نزلہ کے اثر سے کچھ حرارت بھی تھی مناسب سمجھا کہ اس وقت نماز عشا پڑھ کے سو جائیں اور صبح فجر کے بعد عمرہ کا طواف اور سعی وغیرہ

کریں ـــــ ایسا ہی کیا ـــــ مولانا عبداللہ عباس صاحب کو ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ہونے والے عالمی اجلاس کے کاموں کے سلسلہ میں جلد سے جلد لکھنؤ پہنچنا تھا اس لیے وہ اسی رات میں ۲ بجے جدہ کے لیے روانہ ہونے والے تھے، اور وہاں سے انھیں طہران پہنچ کے آج ہی ایرانڈیا کے ہوائی جہاز سے بمبئی پہنچنا تھا ـــــ میں نے اُن کو کئی دن پہلے مدینہ طیبہ سے یہ پیام بھیجدیا تھا کہ وہ جدہ سے (۸ اکتوبر) بدھ کی صبح بمبئی جانے والے سعودی طیارہ میں میرے لیے سیٹ ریزرو کرا دیں، انھوں نے رزرویشن کرا دیا تھا ـــــ وہ اپنے پروگرام کے مطابق صبح صادق سے پہلے چار بجے جدہ کے لیے روانہ ہوگئے، میں نے اُن سے کہدیا کہ وہ بمبئی پہنچکر بھائی حاجی محمد یعقوب صاحب یا وہاں کے کسی بھی دوست کو اس کی اطلاع دیدیں کہ میں انشاء اللہ کل ہی بدھ کی شام کو سعودی طیارہ سے بمبئی کے ہوائی اڈہ پہ اتروں گا، مقصد یہ تھا کہ کوئی دوست وہاں آجائیں گے تو مجھے سہولت ہوگی۔ انھوں نے بمبئی پہنچ کر میرا یہ پیام پہنچا دیا۔

ہم لوگوں نے صبح فجر کی نماز اُس مسجد ہی میں ادا کی جو مولانا عبداللہ عباس صاحب کے مکان کے بالکل برابر میں ہے (اور یہ بھی اُن نعمتوں میں سے ایک ہے جو اللہ تعالیٰ نے موصوف کو وہاں عطا فرما رکھی ہیں) مولانا کے ایک عزیز اکرام صاحب اور دوسرے طارق عسکری صاحب جو اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے حجاز مقدس میں مقیم ہیں اور بظاہر اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت سے سرفراز ہیں۔ وہ دونوں بھی عید کی چھٹی میں آئے ہوئے تھے اور مولانا ہی کے ہاں مقیم تھے، اللہ تعالیٰ نے ان دونوں ہی کو خدمت کا بڑا جذبہ اور سلیقہ دیا ہے۔ انھوں نے فجر سے پہلے ہی چائے پلا دی تھی، مولانا کے صاحبزادگان اُن کو جدہ تک رخصت کرنے کے لیے ساتھ چلے گئے تھے۔ فجر کی نماز میں بھائی سعدی سے ملاقات ہوئی، ان کا مکان مولانا عبداللہ عباس صاحب کے بالکل برابر میں ہے یہ مولانا شیخ محمد سلیم صاحب (مہتمم مدرسہ صولتیہ) کے چھوٹے بھائی مرحوم حکیم محمد نعیم صاحب کے صاحبزادہ ہیں، حکومت کے ایک اچھے عہدہ پر فائز ہیں، مولانا عبداللہ عباس صاحب سے حقیقی بھائی کا سا تعلق ہے۔ حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کی خاص نظر عنایت ہے اس کی وجہ سے ہم لوگوں کے ساتھ بھی خصوصی تعلق ہے۔ میرا ٹکٹ رزرویشن کرانے کے بعد مولانا عبداللہ عباس صاحب نے احتیاطاً انہی کے سپرد کر دیا تھا۔ فجر کی نماز کے بعد وہ انھوں نے عنایت فرمایا۔

ہم لوگوں کا پروگرام یہ تھا کہ فجر کی نماز کے بعد مدرسہ صولتیہ (حارۃ الباب) آئیں اور اپنا سامان قاری محمد سلیمان صاحب کے یہاں رکھوادیں اس کے بعد عمرہ سے فارغ ہوں۔ چنانچہ ایک ٹیکسی سے حارۃ الباب آئے، قاری محمد سلیمان صاحب گویا منتظر تھے، حالانکہ میں نے اُن کو کوئی اطلاع نہیں دی تھی، سامان ٹیکسی سے اتروا کے اُن کے زیر زمین خلوت خانہ میں رکھوایا جو ہم جیسوں کے لیے بہترین مہمان خانہ ہے) اگرچہ بہت مختصر ہے۔ ۱۰-۱۲ گز مربع سے زیادہ نہ ہوگا لیکن ہم جیسوں کے لیے ہوٹلوں کے کمروں سے زیادہ آرام دہ ہے) اور سامان رکھوا کے اسی وقت حرم شریف آگئے، عمرہ کا طواف کیا سعی کی آج حلق کرانے کا ارادہ تھا لیکن طبیعت کی خرابی کی وجہ سے اس وقت بھی قصر ہی کرایا۔ —— فارغ ہوکر مدرسہ صولتیہ آئے، بھائی مولوی محمد شمیم صاحب سے ملاقات ہوئی اُن کو بتلایا کہ آج ہی انشاء اللہ روانگی ہے جو خطوط دینے ہوں تیار کر دیجیے انشاء اللہ ظہر کے بعد لے لوں گا —— اس کے بعد قاری صاحب کے ہاں آکر کچھ آرام کیا، ظہر کا وقت آجانے پر ظہر کی نماز ادا کی اس کے بعد مدرسہ صولتیہ آکر مولانا شیخ محمد سلیم صاحب سے اور بھائی مولوی محمد شمیم صاحب سے رخصتی ملاقات کی اور ان سے خطوط لیے۔ آج کھانا قاری صاحب ہی کے ہاں کھانا تھا۔ اس پورے سفر میں ابھی تک قاری صاحب کے ہاں کھانے کی نوبت ہی نہیں آئی تھی، اگرچہ موتمر کے دنوں میں افطار قریباً روزانہ ہی مسجد حرام میں قاری صاحب کے ساتھ ہی ہوتا تھا۔ انہی ایام میں ایک دن اُن کے ہاں کھانا طے بھی ہوگیا تھا لیکن اتفاق سے اُسی دن ہمارے محترم مولانا شیخ محمد سلیم صاحب نے قریباً سب ہی ہندوستانی مندوبین کو افطار اور کھانے کے لیے مدعو کر دیا تھا اس لیے مجھے اُس دن قاری صاحب سے معذرت کرنی پڑی تھی —— ظہر کی نماز کے بعد جب کھانے کے وقت قاری صاحب کے مکان پر آئے تو یہ دیکھ کر دل بے حد خوش ہوا کہ حافظ قاری مقبول احمد صاحب بھی (جن کے مسجد نبوی میں نوافل میں قرآن پاک سنانے کا ابھی کچھ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے) دستر خوان پر تشریف فرما ہیں اور احرام کی حالت میں ہیں، میرے دریافت کرنے پر انہوں نے بتلایا کہ میں ابھی مدینہ طیبہ سے آیا ہوں، قاری صاحب کو ایک پیام پہنچانا تھا اس کے لیے آیا تو قاری صاحب نے کھانے کے لیے فرمایا اور یہ بھی بتلادیا کہ انشاء اللہ آپ بھی کھانے پر ہوں گے۔ بہرحال اُن سے یہ ملاقات بھی ایک غیر مترقبہ نعمت تھی۔

کھانے سے فارغ ہو کر بہت تھوڑی دیر قیلولہ کر کے مولوی عتیق الرحمٰن اور سجاد میاں نے میرا سامان درست اور مرتب کیا، پہلے خیال تھا کہ عصر کی نماز پڑھ کے فوراً ہی جدہ روانہ ہو جائیں تاکہ ایسے وقت پہنچ سکیں کہ کل ہونے والے سفر کے لیے کوئی دفتری کارروائی اگر آج ضروری ہو تو وہ ہو سکے۔ بھائی فضل عظیم صاحب مراد آبادی (جو اللہ کے عظیم فضل سے اب سے بہت پہلے مکی بن چکے ہیں) ملاقات کے لیے آئے ہوئے تھے، عصر کا وقت قریب آچکا تھا، مجھے عصر کی نماز سے پہلے ہی طوافِ وداع بھی کرنا تھا، حرم شریف جانے کے لیے میں وضو کر کے تیار ہی ہوا تھا کہ حرم شریف میں اذان ہونے لگی، مجھے فکر ہوئی کہ اب میں نماز سے پہلے طواف وداع نہ کر سکوں گا، بھائی فضل عظیم نے کہا چلیں ان شاء اللہ طواف کا وقت مل جائے گا۔ سڑک پہ آکر ٹیکسی کا انتظار کیا خلاف توقع کئی منٹ کے انتظار کے بعد ٹیکسی ملی، میں جلدی میں پیسے ساتھ لینا بھی بھول گیا تھا، ٹیکسی کا کرایہ بھائی فضل ہی نے ادا کیا، اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے۔ باب عمرہ پر ٹیکسی سے اتر کے تیزی سے حرم شریف میں داخل ہوئے پہلے طواف وداع کیا، اُس دن طواف کے سات چکر صرف ۵ منٹ میں پورے ہو گئے۔ اُس کے بعد جماعت کھڑی ہونے سے پہلے رکعتیں طواف بھی پڑھ لیں۔ اللہ تعالیٰ کا بڑا شکر ادا کیا ـــــ اس کے بعد عصر کی جماعت ہوئی۔

نماز سے فارغ ہو کے میں نے اور بھائی فضل عظیم صاحب نے مولانا غلام رسول صاحب کو حرم شریف کے دالانوں کے اُس حصہ میں تلاش کیا جہاں وہ اکثر نماز پڑھتے ہیں، میں جدہ جانے کے بارہ میں اُن سے کچھ مشورہ کرنا چاہتا تھا وہ نہیں ملے ـــــ مایوس ہو کر ہم لوگ اپنی قیام گاہ پر واپس آگئے۔ یہاں دیکھا کہ مولانا غلام رسول صاحب موجود ہیں اور ہمارے منتظر ہیں ـــــ میں نے مولانا سے کہا کہ صورت یہ ہے کہ کل صبح بمبئی جانے والے سعودی میں میرے لیے سیٹ رزرو ہو چکی ہے ایسی صورت میں کیا ہم کو ابھی جدہ چلا جانا چاہیے اور رزرویشن کے بارہ میں مزید اطمینان حاصل کر لینا چاہیے، یا اس کی ضرورت نہیں، ہم بعد عشا یا کل صبح بعد فجر بھی جا سکتے ہیں؟ (مجھے یہ بتایا گیا تھا اور اپنا پہلا تجربہ بھی یہی تھا کہ پرواز کا وقت صبح ۸ بجے ہے) میں نے ان سے کہا کہ ایک صورت یہ ہے کہ آپ جدہ بھائی محمد نور صاحب کو فون کر کے اس بارہ میں دریافت کر لیں! ـــــ وہ اُٹھے اور کہیں سے انھوں نے فون کر کے بھائی محمد نور صاحب سے بات کی، انھوں نے کہا کہ اگر رزرویشن

ٹوکنہ (پکا) ہو چکا ہے تو پھر اس وقت آنا ضروری نہیں ہے۔ صبح تک کسی وقت بھی پہنچ جائیں۔ بھائی محمد نور صاحب نے سعودی ایرلائنز کے دفتر سے رابطہ قائم کر کے میری سیٹ کے رزرویشن کے بارہ میں بات کی تو معلوم ہوا کہ وہ ٹوکنہ (پکا) نہیں کرایا گیا ہے اس لیے میرا نام ہی کل کے مسافروں کی فہرست میں نہیں ہے، انھوں نے کوشش کر کے اس کو ٹوکنہ کرایا اور اطمینان حاصل کیا۔——
بھائی محمد نور سے بات ہو جانے کے بعد ہم لوگوں نے فیصلہ کیا کہ اب عشا کی نماز پڑھ کے ہی جائیں گے فون سے جدہ اس کی اطلاع بھی دلوا دی، چنانچہ عشا کے بعد ایک ٹیکسی سے اس موقف (اڈہ) پر پہنچے جہاں جدہ کے لیے ٹیکسیاں ملتی ہیں، حرمین شریفین میں ہر طبقہ کے لوگ کئی دن تک عید مناتے ہیں، اس وجہ سے اس دن ٹیکسی بہت مشکل سے مل سکی اور کرایہ بھی بہت زیادہ ادا کرنا پڑا، بہرحال رات کو یہاں کے حساب سے کوئی گیارہ بجے جدہ کی اپنی مستقل قیام گاہ بیت نور ولی پہنچے (جس کا نام ہم لوگوں نے "بیت الاولیا" رکھا ہے) بھائی محمد نور غالباً ہم لوگوں کے انتظار میں اس وقت تک جگ رہے تھے حالانکہ اُن کی طبیعت ناساز تھی، بھائی محمد ولی عبداللہ بھی آگئے، ان حضرات نے کھانے کے لیے کہا ہم لوگوں نے معذرت کر دی اور کہدیا کہ صرف چائے پئیں گے۔ چائے آگئی۔ ہم تینوں کے لیے بستر لگ گئے۔ ہم لوگوں نے اصرار کیا کہ اب آپ حضرات جا کر آرام کریں۔ چائے سے فارغ ہو کے ہم لوگ بھی سو گئے۔ سحر میں وقت پر آنکھ کھل گئی، ابھی فجر کی اذان بھی نہ ہوئی تھی کہ بھائی محمد ولی صاحب چائے اور ناشتہ لیکر آگئے، میں نے کہا کہ اتنی سویرے! انھوں نے کہا کہ آپ کو ابھی مطار جانا ہوگا۔ میں نے اس لیے جلدی کی، میں نے کہا طیارہ کی پرواز کا وقت تو ۹ بجے معلوم ہوا ہے۔ انشاء اللہ ۸ بجے سے پہلے وہاں پہنچ جائیں گے۔ انھوں نے کہا کہ مولانا محمد عمران خاں صاحب تو بہت سویرے فجر کی اذان سے پہلے ہی چلے گئے تھے، میں نے مزاحاً کہا کہ مولانا کا مسلک تو یہ ہے کہ وہ ریل پکڑنے کے لیے بھی وقت سے دو گھنٹہ پہلے اسٹیشن پہنچ جاتے ہیں ہوائی جہاز کے لیے انھوں نے اور زیادہ جلدی کی ہوگی۔—— بہرحال ہم لوگوں نے ناشتہ کیا، چائے پی اور فارغ ہو کر فجر کی نماز برابر والی مسجد میں جماعت سے ادا کی اس کے بعد بھی بیٹھ کر وقت گزارتے رہے اور اپنے سوچے ہوئے پروگرام کے مطابق ساڑھے چھ بجے کے قریب ہوائی اڈہ کے لیے روانہ ہو گئے بھائی محمد ولی صاحب اور بھائی محمد نور صاحب کے صاحبزادے عزیز یوسف سلمہم اللہ اپنی ہی گاڑی

سے پہنچانے کے لیے ساتھ تھے، —— وہاں پہنچکر معلوم ہوا کہ بمبئی جانے والے سعودی طیارہ کی پرواز کا وقت ساڑھے چھ بجے ہے اور وہ ابھی روانہ ہوا ہے — انا للہ وانا الیہ راجعون ٥
یہ اپنی کتنی بڑی غلطی اور کیسی سخت غفلت بلکہ حماقت تھی کہ طیارہ کے وقت کے بارہ میں تحقیق کرنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی۔ کسی سے ۸ بجے سن لیا اور اسی کو کافی سمجھا اور جب بھائی محمد ولی صاحب نے مولانا محمد عمران خاں صاحب کے فجر کی اذان سے پہلے جانے کا ذکر کیا تو اس سے بھی تنبہ نہیں ہوا۔ —— بہرحال اپنی غفلت اور غلطی کی قدرت کی طرف سے یہ سزا برحق تھی —— ناچار واپس آئے۔
اب ۳ دن تک بمبئی کے لیے کوئی جہاز نہیں تھا جو تھے دن شنبہ اور یکشنبہ کی درمیانی رات میں ظہران سے بمبئی جانے والے سعودی سے سفر ہو سکتا تھا، اسی سے جانا طے کیا، اس کے لیے ار اکتوبر شنبہ کی شام کو جدہ سے ظہران جانا تھا جب اس میں رزرویشن کے لیے کہا گیا تو معلوم ہوا کہ شنبہ کو بلکہ اس سے ایک دن پہلے جمعہ کو بھی جدہ سے ظہران جانے والے کسی ہوائی جہاز میں کوئی سیٹ خالی نہیں ہے، —— مجبوراً جمعرات کی صبح ظہران جانے والے طیارہ میں رزرویشن کرالیا گیا اور سوچ لیا گیا کہ تین دن ظہران کے قریب کے شہر الخُبر میں گزاریں گے، وہاں تبلیغی مرکز ہے اور دوست احباب ہیں —— جدہ کے داؤد بھائی ساعاتی کے پاس الخبر کے بھائی عبدالرؤف عبدالباسط کا ٹیلی فون نمبر تھا انھوں نے اس کی پوری کوشش کی کہ ٹرنکال کے ذریعہ میرے پہنچنے کی ان دوستوں کو اطلاع دیدیں تاکہ وہ ظہران آکر مجھے لے لیں۔ لیکن کامیابی نہیں ہو سکی۔

اگلے دن ۹ راکتوبر (جمعرات) کی صبح بھائی محمد ولی اور عزیز یوسف بن محمد نور سلمہم اللہ تعالیٰ ہی نے مطار پہنچایا، مولوی عتیق الرحمٰن اور سجاد میاں اتنک ساتھ ہی رہے۔ مطار ہی پر ان سب نے مجھے خدا حافظ کہا اور میں ان سے رخصت ہو کر ظہران کے لیے روانہ ہو گیا، —— اس کی بڑی فکر تھی کہ ظہران اتر کر بغیر کسی رہنمائی کے تبلیغی مرکز (مسجد نور) یا وہاں کسی دوست کے پاس پہنچنے کے لیے غالباً بڑی پریشانی اٹھانی پڑے گی —— لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت نے دستگیری فرمائی؛ میں ہوائی جہاز میں جاکر بیٹھا ہی تھا کہ میرے برابر والی سیٹ پر ایک صاحب آکر بیٹھے سلام اور جواب سلام کے بعد چند منٹ تو خاموشی رہی اس کے بعد انھوں نے میرا نام دریافت کیا،

انہوں نے بتلایا تو معلوم ہوا کہ وہ مجھ کو جانتے ہیں اور حجاز مقدس ہی میں ایک دو دفعہ رفیق محترم مولانا علی میاں سے اور مجھ سے مل چکے ہیں، مجھے بھی کچھ یاد آ گیا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ یوں تو پاکستانی ہیں لیکن الخبر ہی میں رہتے ہیں۔ —— انھوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ ظہران اتر کے آپ کو کہاں جانا ہے؟ میں نے ان کو بتلایا کہ انشاء اللہ مسجد نور جاؤں گا، وہاں کے بعض دوستوں کا میں نے نام بھی بتلایا۔ —— اور یہ بھی بتلایا کہ مجھے انشاء اللہ پرسوں بمبئی کے لیے روانہ ہونا ہے آج دو دن پہلے اس مجبوری سے یہاں آنا پڑا کہ جمعہ اور شنبہ کو جدہ سے ظہران کے لیے سیٹ ملنا یقینی نہیں تھا۔ —— انھوں نے اصرار کیا کہ میں اُن کے پاس ہی قیام کروں، —— میں نے وہاں کے بعض دوستوں سے تعلقات کا حوالہ دیکر اس سے معذرت کی اور کہا کہ میرے لیے آپ اتنی زحمت کریں کہ ظہران سے مسجد نور کے لیے ٹیکسی کر دیں اور ڈرائیور کو مسجد نور کا محل وقوع بتلا دیں اور سمجھا دیں۔ انھوں نے کہا کہ پھر میں اپنی ہی گاڑی سے آپ کو لے چلوں گا اور مسجد نور پہنچا دوں گا، چنانچہ الحمد للہ انہوں نے ہی مجھے مسجد نور پہنچایا اور میرا سامان گاڑی سے اتار کے خود مسجد نور کے مہمان خانہ میں پہنچایا۔ —— میں نے اُن سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو میرے لیے رحمت کا فرشتہ بنا دیا، حضرت خضر کے بارہ میں تو امت کے علماء میں اختلاف ہے لیکن رحمت کے فرشتوں کے بارہ میں کوئی اختلاف رائے نہیں ہے —— اللہ تعالیٰ ان کو بہتر سے بہتر جزا عطا فرمائے —— میں نے اُن کے ہاں قیام کے بارہ میں معذرت کرتے ہوئے وعدہ کیا تھا کہ انشاء اللہ آپ کے ہاں آؤں گا۔ —— لیکن افسوس ہے کہ میری کوشش کے باوجود ایسا نہ ہو سکا، ایک دن ٹیلی فون سے رابطہ قائم کرنا چاہا تو رابطہ ہی نہ ہو سکا، دوسرے دن ایک مخلص دوست محمد اسلام صاحب کے ساتھ اُن کے مکان پر گیا تو وہ موجود نہیں تھے اور غالباً مکان میں کوئی بھی نہیں تھا۔ —— بہرحال اُن سے پھر ملاقات نہ ہو سکنے کا قلق رہے گا۔

الخبر میں جمعرات، جمعہ، شنبہ تین دن قیام رہا، جمعرات تو وہاں کے ہفتہ واری اجتماع کا دن ہی تھا، مغرب بعد حسب معمول اجتماع ہوا، عربی والوں کا حلقہ الگ اور اردو والوں کا حلقہ الگ، اس اجتماع کی وجہ سے سب دوستوں سے ملاقات ہو گئی، اردو والے حلقہ میں میں نے بھی بات کی، اور یہ طے ہو گیا کہ کل جمعہ کو بعد مغرب فلاں مسجد میں اور پرسوں شنبہ کو فلاں مسجد میں اجتماع ہوگا —— الغرض میرے قیام کے تینوں دن اجتماعات ہوئے اور میرا قیام الحمد للہ کچھ وصول ہو گیا۔ ——

بھائی رسول احمد صاحب جو وہاں کے پرانے اور بڑے مخلص تبلیغی کارکن ہیں، انھیں اس حال میں دیکھ کر بڑا دل دکھا کہ اُن کا ایک ہاتھ بیکار سا ہو چکا ہے، چلنا پھرنا بھی مشکل ہو گیا ہے، معلوم ہوا کہ پچھلے ہی حج کے سفر میں ایکسی ڈنٹ ہو گیا تھا اس کے نتیجہ میں یہ حالت ہو گئی ہے، لیکن الحمدللہ دینی جذبہ میں اور بقدر امکان عمل میں کوئی کمی نہیں ہے، اللہ تعالیٰ استقامت عطا فرمائے اور ہم جیسوں کو ایسے صادق العہد بندوں سے سبق لینے کی توفیق دے۔

شنبہ کے دن اجتماع ظہران کے کیمپ کی مسجد میں تھا، یہاں لکھنؤ کے ایک عزیز دوست شبیر احمد انصاری نظر پڑے، میں بھول گیا تھا کہ وہ ظہران میں ہیں، انھوں نے بتلایا کہ مجھے آج ہی آپ کی آمد کی اطلاع ہوئی ہے ——— پھر معلوم ہوا کہ اس وقت اجتماع سے فارغ ہونے کے بعد انہی کے ہاں کھانا کھانا ہے اور بعض اور احباب بھی مدعو ہیں ——— مجھے چونکہ رات بھر ہوائی جہاز میں بیٹھ کر سفر کرنا تھا اس لیے طے کر چکا تھا کہ کھانا بالکل ہی نہیں کھاؤں گا، لیکن اُن کے ہاں پہنچ کر دیکھا کہ انھوں نے حد سے زیادہ اہتمام کیا ہے تو اُن کی دل شکنی کے خیال سے کھانے میں کچھ شریک ہو گیا۔

کھانے سے فارغ ہو کر اور احباب سے رخصت ہو کر ہم لوگ ظہران کے ہوائی اڈہ پر آگئے بھائی عبدالباسط صاحب (جو الخبر کی جماعت کے امیر بھی ہیں اور دینی تقاضوں کے بارہ میں وسیع النظر ہیں) ساتھ تھے سفر سے متعلق ضروری قانونی کارروائیاں اُن کی وجہ سے بسہولت انجام پا گئیں بلکہ سب کچھ انھوں نے ہی کیا کرایا۔

ظہران کے ہوائی اڈہ پر مولانا عبدالماجد صاحب ندوی بھی مل گئے، ان کے صاحبزادہ عبدالواحد سلمہ بھی ساتھ تھے، موصوف دارالعلوم ندوۃ العلماء میں عرصہ تک استاذ رہے ہیں، اب سے قریباً دو سال پہلے سعودی حکومت کے شعبہ اذاعہ سے وابستہ ہو گئے ہیں، جدہ ہی میں قیام رہتا ہے، اُن کو بھی ظہران سے اسی طیارہ سے بمبئی آنا تھا جس سے مجھے سفر کرنا تھا، ظہران سے طیارہ کی پرواز کا وقت رات کے ساڑھے بارہ بجے تھا، لیکن وہ ۳ گھنٹہ لیٹ ہو گیا اور رات کو ساڑھے تین بجے روانہ ہوا۔ اور اتوار کو صبح ۹ بجے کے بجائے ساڑھے دس بجے بمبئی کے ہوائی اڈہ پر اترا ——— مسافروں کے اترنے کے لیے جیسے ہی ہوائی جہاز کا زینہ لگا اور میں اترا ایک صاحب بہت تیزی سے بڑھ کر اس زینہ کے پاس آگئے، میں ان کو نہیں پہچانتا تھا، لیکن انھوں نے ایسا معاملہ کیا جیسے کہ میرے بہت خاص

دوستوں میں ہیں، جلدی سے میرے ہاتھ سے سامان لیا اور مجھے بتایا کہ بھائی اسماعیل منصوری وغیرہ آئے ہوئے ہیں آپ کے انتظار میں ہیں اپنا نام انھوں نے ماہر عبقانی (یا عقبانی) بتلایا۔ میں نے اُن کے رویہ سے یہ تو سمجھ لیا کہ ان کا ہوائی اڈہ سے کوئی خاص تعلق ہے۔ باہر کا کوئی بھی آدمی جہاز پر اس طرح نہیں آسکتا، اور یہ بھی جان لیا کہ بھائی اسماعیل منصوری وغیرہ سے بھی ان کا خاص تعلق ہے۔ اور مجھ سے بھی تعلق ومحبت رکھتے ہیں۔ اس پر بڑی شرمندگی ہوئی کہ میں ان کو نہیں پہچانتا ہوں، انھوں نے ہوائی اڈے کے سارے قانونی مرحلے جن میں گھنٹے لگ جاتے ہیں منٹوں میں طے کرائے۔ اگرچہ میرے ساتھ کوئی ایسی چیز نہ تھی جس پر کسٹم لگتا لیکن فکر اور تشویش ضرور تھی کیونکہ اس میں اچھا خاصا وقت لگ جاتا ہے۔ لیکن اس مخلص بندۂ خدا کی وجہ سے یہ مرحلہ بھی بس دو چار منٹ میں طے ہوگیا۔ مولانا عبدالماجد صاحب کو بھی اُن کی وجہ سے الحمد للہ سہولت حاصل ہوگئی۔ ان کے لیے دل سے بڑی دعا نکلی اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی بھی توفیق ہوئی کہ درحقیقت اس طرح کی ساری مددیں اُسی کی طرف سے ہوتی ہیں۔ اور بندے بس اس کے آلۂ کار ہوتے ہیں۔

ہوائی اڈہ سے باہر آکر دیکھا، بھائی اسماعیل منصوری اور بھائی اسماعیل امین موجود ہیں۔ معلوم ہوا کہ صبح ہی سے آئے ہوئے ہیں۔ دل بہت متاثر ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے بمبئی کے دوستوں کو بڑی قابل رشک توفیق دی ہے۔

ہوائی اڈہ سے اپنی قیام گاہ کھو کھا بازار کی مسجد آگئے۔ میں نے ان دوستوں سے کہا کہ اگر ہو سکے تو کل صبح ہی کے لیے دہلی کے واسطے ریزرویشن کرادیا جائے۔ محمد بھائی میرا ٹکٹ لے گئے اور الحمد للہ اگلی صبح ہی کے لیے ریزرویشن ہوگیا۔

عصر کی نماز کے بعد بھائی اسماعیل ہاشم، بھائی منصوری اور بعض دوسرے دوستوں نے کہا کہ اس وقت صابو صدیق مسافر خانہ میں حج کو جانے والوں کا بڑا مجمع ہے، مغرب کے بعد وہاں تقریر کا پروگرام رکھ دیا جائے۔ —— میں نے کہا یہ تو اتنی بڑی سعادت اور ایسی نیکی ہے کہ اگر اس کے لیے میں بمبئی کا مستقل سفر کرکے آؤں تو بھی یہ نفع کا سودا ہے —— بہرحال یہ طے ہوگیا اور مغرب سے عشا تک حجاج کے مجمع سے خطاب کرنے کی سعادت حاصل ہوئی، اللہ تعالیٰ نے حج سے متعلق کام کی باتیں کہنے کی توفیق دی، وہی سننے والوں کو اُن سے نفع پہنچائے اور میرا یہ عمل قبول فرمائے اور

اسی کو میرے اس سفر کا خاتم الاعمال قرار دیا جائے۔

بمبئی میں اس دفعہ صرف آدھا دن اور ایک رات قیام رہا، یہاں کے مخلصین اللہ کی بڑی نعمت ہیں

۱۳ اکتوبر دوشنبہ کی صبح فجر کی نماز اول وقت پڑھ کے ہوائی اڈہ کے لیے روانہ ہوئے۔ خالد بھائی نے اپنی گاڑی سے پہونچایا۔ بھائی منصوری اور مولوی محمد شفیع صاحب بھی ساتھ تھے۔ اللہ تعالیٰ ان حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ ۷ بجے طیارہ روانہ ہوا اور پونے نو بجے دہلی پالم ہوائی اڈہ پر اتر گیا۔ میں وہاں سے چل کر پہلے انڈین ایرلائنز کے دفتر آیا، میرا ارادہ آج دہلی سے سہارنپور جانے کا تھا۔ اس لیے پرسوں (۱۵ اکتوبر کی صبح کے لیے) میں نے لکھنؤ کا رزرویشن کرایا اس کے بعد نظام الدین مرکز آیا ـــــ اتفاق سے اُس وقت یہاں مولانا عبداللہ عباس صاحب بھی موجود تھے اُن سے ضروری باتیں ہوئیں اور ندوۃ العلماء کے عالمی اجلاس کی تیاریوں کا حال معلوم ہوا وہ اُسی سلسلے کے بعض کاموں کے لیے دہلی آئے ہوئے تھے۔

جیسا کہ ناظرین کرام کو معلوم ہو چکا ہے حرمین شریفین کے اس سفر میں میرے عنایت فرما محمد یونس سلیم صاحب کا بڑا حصہ تھا بلکہ ظاہری اسباب میں تو اُن ہی کی جد و جہد سے یہ سفر ہو سکا اس لیے واپسی پر ان سے ملنا ضروری تھا۔ ۱۱ بجے کے قریب میں نظام الدین سے ان کے یہاں پہونچا۔ الحمد للہ موجود تھے ملاقات ہو گئی۔ انہی کے یہاں سے میں نے لکھنؤ اپنے گھر پر ٹیلیفون کیا۔ اور اپنے دہلی پہونچ جانے کی اطلاع دی اور ساتھ ہی بتلایا کہ اب میرا پروگرام یہ ہے کہ میں انشاء اللہ آج سہارنپور حضرت شیخ الحدیث کی زیارت و ملاقات کے لیے جاؤں گا۔ کل وہاں سے دہلی ہی واپس آجاؤں گا اور پرسوں صبح دہلی سے انشاء اللہ لکھنؤ پہونچوں گا۔ میری بڑی لڑکی کوثر جو ٹیلیفون پر بات کر رہی تھی اس نے کہا کہ چھوٹی بہن حمیرا کی طبیعت کئی دن سے زیادہ خراب ہے اختلاجی دورے ہوتے ہیں اور بیہوش ہو جاتی ہے۔ اس لیے اچھا یہ ہے کہ آپ اس وقت سہارنپور کا سفر ملتوی فرمائیں اور آج ہی یا کل یہاں پہونچ جائیں۔ میں نے کہا کہ اگر تم لوگوں کی رائے قطعیت کے ساتھ یہی ہو تو میں سوچوں، اور اگر تم گنجائش سمجھو تو پھر میں یہی بہتر سمجھتا ہوں کہ اپنے سوچے ہوئے پروگرام کے مطابق سہارنپور ہو آؤں۔ حضرت شیخ سے اس کے لیے دعا کی درخواست بھی کروں گا۔ کوثر نے کہا کہ پھر آپ ایسا ہی کیجیے۔ چنانچہ میں سہارنپور جانے کے لیے دہلی کے ریلوے اسٹیشن آگیا۔ یہاں ایک گجراتی طالب علم تھے جن کو نظام الدین جانا تھا۔ میں نے اُن کے

ذریعہ حضرت مولانا انعام الحسن صاحب کی خدمت میں عریضہ لکھا، کہ ابھی مجھے ٹیلیفون سے اپنی لڑکی کی شدید اور تشویشناک علالت کی اطلاع ملی ہے اس کے لیے دعا کی درخواست ہے ——— رات کو عشا کے بعد سہارنپور پہونچا، اسی وقت حضرت شیخ مدظلہ کی خدمت میں حاضری ہوئی۔ دوسری باتوں کے علاوہ حضرت سے مریضہ بچی کے لیے دعا کی درخواست بھی کی۔ صبح کو پھر دیر تک حضرت کی خدمت میں حاضری نصیب رہی۔ اس کے بعد میں نے اجازت لی۔ اور دہلی واپس آگیا۔ ظہر کی نماز نظام الدین آکر پڑھی، معلوم ہوا کہ حضرت مولانا انعام الحسن صاحب نے خود بھی دعا کا اہتمام فرمایا اور دوسرے حضرات سے بھی ارشاد فرمایا۔ ——— ۱۵ اکتوبر بدھ کی صبح فجر سے پہلے ہی ٹیکسی سے ہوائی اڈہ آیا اور ۷ بجے لکھنؤ کے ہوائی اڈہ پر اتر گیا۔ یہاں حفیظ میاں، حسان میاں مولوی زکریا سلمہ وغیرہ گھر کے متعدد افراد موجود تھے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ حمیرا کا حال پہلے کی بہ نسبت کچھ بہتر ہے۔ گھر پہونچ کر اُس کو بہت ہی کمزور حالت میں دیکھا، لیکن آہستہ آہستہ حالت بہتر ہوتی گئی۔ اور اب جبکہ مجھ کو یہاں پہونچے ایک ہفتہ ہو چکا ہے الحمد للہ اس کو قریب قریب پوری صحت ہو چکی ہے۔ صرف ضعف باقی ہے۔

یہ سفر پورے ایک مہینہ کا ہوا، ۱۰ ستمبر کی شام کو لکھنؤ سے روانگی ہوئی تھی اور ۹ اکتوبر کی صبح واپسی ہوگئی ——— اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو نعمتیں اور عنایتیں ہوئیں ان کی کوئی حد و انتہا نہیں اور اپنی طرف سے جو تقصیریں اور کوتاہیاں ہوئیں اُن کی بھی کوئی گنتی اور حساب نہیں۔

شکر نعمتہائے تو چندانکہ نعمت ہائے تو
عذر تقصیرات ما چندانکہ تقصیرات ما

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کی چند اہم اور گرانقدر تالیفات

اسلام کیا ہے؟

نہایت آسان زبان اور سنجیدہ دل نشین اور پراثر انداز میں اسلامی تعلیمات کا جامع اور مکمل خلاصہ — دین کی ضروری واقفیت حاصل کرنے ہی کے لیے نہیں بلکہ کامل مسلمان اور اللہ کا ولی بننے کے لیے بھی اس کا مطالعہ اور اس پر عمل ان شاء اللہ کافی ہے۔
مولانا موصوف کی سب سے زیادہ مقبول کتاب۔ قیمت مجلد صرف ۴/۵۰

دین و شریعت

اس کتاب میں توحید، آخرت، رسالت، نماز، روزہ، زکوٰۃ و حج، اخلاق و معاملات، دعوت و جہاد، سیاست و حکومت اور احسان و تصوف کے مباحث پر ایسی محققانہ روشنی ڈالی گئی ہے کہ دل و دماغ اور عقل و وجدان ایمان و اطمینان سے معمور ہو جاتے ہیں۔ قیمت ۵/-

قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟

قرآنی ہدایات اور اس کی اہم تعلیمات کا ایک جامع مرقع۔ جس میں سیکڑوں عنوانات کے تحت متعلقہ قرآنی آیات کو نہایت موثر اور واضح پیرائے تشریحات کے ساتھ جمع کیا گیا ہے۔ قیمت مجلد ۷/- انگریزی ۱۵/-

نماز کی حقیقت

اسلام میں ایمان کے بعد نماز ہی کا درجہ ہے۔ مگر کیا ہم نماز کو ایسی ہی اہمیت کے ساتھ ادا بھی کرتے ہیں؟ کیوں اس لیے کہ ہم عام طور پر اس کی پوری حقیقت کو نہیں سمجھتے۔ یہ مفید کتاب ہے۔ قیمت ۲/-

برکات رمضان

ماہ رمضان اور اس کے خاص اعمال و وظائف تراویح و اعتکاف وغیرہ کے فضائل و برکات اور ان کی روحانی تاثیرات کا نہایت موثر اور شوق انگیز بیان۔ قیمت مجلد صرف ۱/۵۰

معارف الحدیث

(احادیث نبوی کا ایک نیا اور جامع انتخاب اردو ترجمہ اور تشریح کے ساتھ)
مولانا نے احادیث کے مستند مجموعوں سے گہرے غور و فکر کے بعد وہ حدیثیں منتخب کیں جن کا انسان کی فکری و اعتقادی اور عملی زندگی سے خاص تعلق ہے اور جن میں امت کے لیے ہدایت کا خاص سامان ہے۔
اس سلسلے کی ۶ جلدیں الحمد للہ مکمل ہو چکی ہیں۔
جلد اول ۹/۵۰ جلد دوم ۱۱/۵۰ جلد سوم ۱۳/۵۰ جلد چہارم ۱۰/- جلد پنجم ۱۲/۵۰ جلد ششم ۱۳/۵۰ (مجلد کے لیے ہر جلد کی قیمت ۲/- زائد لگائی جاتی)
انگریزی ایڈیشن۔ معارف الحدیث کی پہلی جلد اور نصف دوم کا انگریزی ترجمہ ایک جلد میں شائع ہو گیا ہے۔ قیمت ۳۲/-

تصوف کیا ہے؟

یہ کتاب اپنے اختصار کے باوجود انصاف و تحقیق اور مباحث کے سلجھاؤ کے لحاظ سے اپنے موضوع میں بہت ممتاز سمجھی گئی ہے قیمت صرف ۵/-

منتخب تقریریں

مولانا موصوف کی ایمان افروز اصلاحی و تبلیغی تقاریر کا مجموعہ جو اپنی اثر انگیزی افادیت اور جامعیت کے ہزاروں پہلوؤں کو سمیٹے ہوئے ہے۔ قیمت مجلد صرف ۶/-

قادیانی کیوں مسلمان نہیں؟
اور مسئلہ حیات مسیح و نزول مسیح

مولانا موصوف کے چار مضامین کا مجموعہ ہے۔ رد قادیانیت پر مدلل کتاب ہے اس میں قرآن و حدیث اور عقل کی روشنی میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بالکل عام فہم پیرائے میں لکھا گیا ہے۔ جو عوام و خواص کے لیے یکساں تسلی بخش ہے۔ قیمت مجلد صرف ۳/-

ناشر: کتب خانہ الفرقان - ۳۱ نیا گاؤں (نظیر آباد) لکھنؤ

حدیث و فقہ کی کچھ مستند کتابیں

صحیح بخاری مکمل

مترجم - مرزا حیرت دہلوی

امام بخاری کی جمع کردہ ۷۲۷۵ احادیث نبوی کا وہ گراں بہا ترجمہ جو گذشتہ پچاس سال سے اہل علم میں مقبول ہے۔
تین جلدوں میں مکمل، قیمت مجلد کامل سٹ =/۶۰

ایضاح البخاری

از افادات فخر الاسلام حضرت مولانا فخر الدین احمد صاحب۔ بخاری شریف کی مستند اور کامیاب شرح۔ تراجم ابواب پر محققانہ کلام زندہ اسلوب کے ساتھ اردو زبان میں۔ ۱۲ قسطیں طبع ہو چکی ہیں۔
قیمت مکمل =/۳۹

صحیح مسلم مترجم مکمل

امام مسلم کی جمع کردہ بارہ ہزار احادیث نبوی کا قابل قدر بیش قیمت مجموعہ۔ مکمل عربی متن مع مقابل اردو ترجمہ از مولانا وحید الزماں صاحب
۶ جلدوں میں مکمل قیمت کامل سٹ مجلد =/۱۰۰

فتاویٰ دار العلوم دیوبند

از افادات حضرت مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی قدس سرہٗ۔ یہ فتاویٰ کا بے نظیر مجموعہ اور مسائل فقہیہ کا بے مثال ذخیرہ ہے۔ ۸ حصے شائع ہو چکے ہیں۔ قیمت مکمل سٹ =/۹۸

فتاویٰ رحیمیہ

حضرت مولانا مفتی سید عبد الرحیم صاحب لاجپوری کے فتاویٰ جو اس غیر دینی ماحول میں بھی تین زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں مستفتی کے لیے ہی نہیں بلکہ مفتی حضرات کے لیے بھی لائق استفادہ ہے۔ قیمت حصہ اول مجلد -/۱۲
دوم مجلد -/۲۰ ۔ سوم مجلد -/۲۰

فتاویٰ عالمگیری اردو

حضرت اورنگ زیب عالمگیرؒ کا عظیم الشان اسلامی شاہکار۔ فقہ حنفی کے لیے مستند دستاویز۔ اسلامی دستور کا مکمل انسائیکلوپیڈیا۔ جدید حواشی اور نوٹس سے مزین۔ ۲۰ قسطیں شائع ہو چکی ہیں۔
قیمت مکمل سٹ =/۸۸

ترجمان السنہ

تالیف حضرت مولانا بدر عالم مہاجر مدنیؒ۔ اردو زبان میں ضروری تشریحات و مباحث کے ساتھ ارشادات نبوی کا جامع اور مستند ذخیرہ
۴ جلدوں میں مکمل سٹ ۷۲/۵۰

محدثین عظام اور ان کے علمی کارنامے

مولفہ مولانا تقی الدین ندوی مظاہری۔ ائمہ اربعہ اور ارباب صحاح ستہ اور امام طحاوی کا تحقیقی تذکرہ اور تاریخ تدوین حدیث
قیمت مجلد صرف -/۱۰

فتاویٰ عبد الحیؒ

مولانا عبد الحیؒ لکھنوی کا مجموعہ فتاویٰ جو فقہی اور اعتقادی مسائل کا ایک نادر ذخیرہ ہے۔ تین حصے یکجا۔ مجلد -/۲۰

بہشتی زیور — حضرت تھانوی کی یہ کتاب مسلمان مرد عورت کے لیے دین و دنیا کی ضرورتوں میں ممتاز درجہ کی کتاب ہے۔ اردو کی قیمتی کتابوں میں بے نظیر ہے۔ ہر گھر میں رہنا ضروری ہے۔
اختری بہشتی زیور عکسی مجلد -/۲۴۔ بدنی بہشتی زیور عکسی مجلد یکجا -/۲۰ - ربانی بہشتی زیور عکسی مجلد یکجا -/۲۲
اشرفیہ بہشتی زیور غیر مجلد (۲ جلدوں میں مکمل) -/۴۰

بہشتی ثمر — بہشتی زیور کا خلاصہ۔ جدید اضافہ کے ساتھ ۲۰×۳۰/۱۶ سائز پر دو حصوں میں مکمل۔ قیمت مکمل عکسی -/۶

ملنے کا پتہ: کتب خانہ الفرقان - ۳۱ نیا گاؤں مغربی (نظیر آباد) لکھنؤ

اہم نہیں کہ
ٹانک کے اجزا کیا ہیں
بات یہ ہے کہ آپ کے جسم کو اس سے کیا ملتا ہے ؟
ہمدرد
سنکارا
cinkara
آپ کے جسم کو
بہت کچھ دیتا ہے

Monthly "AL FURQAN" 31, Naya Gaon West, Lucknow (U.P.)
VOL. ... NO. 10 OCTOBER, 1975 Phone : 2...

مدیر

محمد منظور نعمانی

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

سالانہ چندہ
ہندستان سے: ۱۲/-
پاکستان سے: ۲۰/-
بنگلا دیش سے: ۱۳/-
قیمت فی کاپی: ۱/۲۰

ممالک غیر سے سالانہ چندہ
بحری ڈاک سے ۱ پونڈ ۵ شلنگ
ہوائی ڈاک سے
امریکہ و کناڈا سے ۳ پونڈ
یورپ و افریقہ سے ۲ پونڈ
ممالک عربیہ و مشرق وسطیٰ سے ۲ پونڈ

جلد ۴۳ | بابت دسمبر ۱۹۷۵ء مطابق ذی الحجہ ۱۳۹۵ھ | شمارہ ۱۲

تذکرہ

حضرت صوفی سید عبدالرب علیہ الرحمہ

مرتبہ: ——— مولوی محمد ابراہیم الہ آبادی ایم اے و حفیظ الرحمٰن نعمانی

نگاہِ اولیں یا پیش لفظ: ——— از محمد منظور نعمانی مدیر مسئول

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، اڈیٹر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان ۳۱ نیا گاؤں مغربی لکھنؤ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اولیں — یا — پیش لفظ

————— از محمد منظور نعمانی

غالباً ہجری سنہ ۱۳۵۲ھ تھا اور عیسوی سنہ ۱۹۳۳ء حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی لکھنوی نے لکھنؤ میں ادارہ "دارالمبلغین" قائم فرمایا، جس میں عربی مدارس کے فارغین اور فضلا کو دوسرے مذاہب اور فرقوں سے متعلق تحقیقی مطالعہ کرایا جاتا تھا اور تقریر اور بحث مباحثہ کی تربیت دی جاتی تھی۔ اس دور میں راقم سطور کو بھی اس موضوع سے خاص دلچسپی تھی اس لیے مولانا نے مجھے بھی طلب فرمایا اور ادارہ کے ایک رفیق کی حیثیت سے چند مہینے میرا قیام بھی دارالمبلغین میں رہا۔ روزانہ صبح اول وقت خود مولانا دارالمبلغین ہی میں قرآن مجید کا درس دیتے تھے، یہ درس عوامی ہوتا تھا اور شہر کے کچھ حضرات بھی اس میں شرکت کرتے تھے، ان میں ایک صاحب تھے جن کو ان کے جاننے والے "ماسٹر عبدالرب" کہا کرتے تھے، یہ لکھنؤ ہی کے کسی انگریزی اسکول میں ماسٹر تھے لیکن شکل و صورت اور وضع قطع سر سے پاؤں تک مولویانہ بلکہ کہنا چاہیے کہ بزرگانہ تھی۔ سر پر اکثر سفید ٹوپی اور سردی کے دنوں میں عمامہ، نیچے کرتے پہ خوب لانبی جھکتی ہوئی اچکن، مگر جسم مضبوط پہلوانوں کا سا۔

یہی تھے وہ جو بعد میں ہمارے حلقہ میں "صوفی صاحب" اور "حضرت صوفی صاحب" کے نام سے معروف ہوئے۔ جہاں تک یاد ہے ان سے تعارف اور تعلق کی ابتدا قیام لکھنؤ کے انہی دنوں میں ہوئی — چونکہ صوفی صاحب کا مزاج باطل سے لڑنے کا تھا (جیسا کہ ناظرین کو ان کے اس تذکرہ سے بھی معلوم ہوگا) اور شاید انھوں نے کسی درجہ میں اپنا ہم مشرب و ہم مذاق پایا تھا، اس لیے وہ مجھ سے اس سے بہت زیادہ محبت فرمانے لگے جس کا میں مستحق ہو سکتا تھا۔

پھر چند ہی مہینوں کے بعد سنہ ۱۳۵۳ھ کے آغاز میں) "الفرقان" بریلی سے جاری ہوا، وہ شروع ہی سے صوفی صاحب کے مطالعہ میں رہا، اس کی وجہ سے ایک مستقل رابطہ قائم ہو گیا اور ان کی محبت و

عنایت میں اضافہ ہوتا رہا۔

پھر غالباً ۱۹۴۵ء میں وہ اور اُن کے ایک ہم مشرب رفیق و دوست ماسٹر محمد ابراہیم الہ آبادی (جو صوفی صاحب ہی کی طرح حکیم الامت حضرت تھانوی رح کی بیعت سے مشرف تھے اور اصلاح کا تعلق بھی حضرت مولانا محمد عیسیٰ الٰہ آبادی رح سے رہا تھا) ایم۔ اے کا امتحان دینے کے لیے بریلی تشریف لائے اور میرے اصرار پر ہفتہ عشرہ میرے ہی پاس قیام فرمایا، دن رات کی اس چند روزہ معیت و مصاحبت میں ہم دونوں نے ایک دوسرے کو زیادہ جاننا پہچاننا اور مجھے اُن سے وہ عقیدت ہوئی جو خاص اللہ والوں سے ہوتی ہے اور انھیں میرے بارہ میں غیر معمولی قسم کی خوش فہمی اور حسن ظن! ——— ماسٹر محمد ابراہیم صاحب کو انہی دنوں میں پہلی دفعہ دیکھا تھا، اُن سے بھی بڑا اُنس ہو گیا۔ میں نے ان کو بڑا فہیم اور بے نفس پایا، صوفی صاحب اُن کو "شاہ ابراہیم" کہتے تھے میں بھی یہی کہتا تھا اور سمجھتا تھا کہ وہ اسی نام سے معروف ہیں، یہ تو بہت دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ صوفی صاحب ہی نے اُن کے نام کے ساتھ "شاہ" لگایا تھا، ورنہ ان کے حلقۂ تعارف میں اُن کو ماسٹر ابراہیم ہی کہا جاتا تھا ——— ان دونوں حضرات کے بریلی میں قیام کے انہی دنوں میں یہ بھی طے ہو گیا کہ آنے والی گرمیوں کی تعطیل میں ہم تینوں نظام الدین (دہلی) کی تبلیغی جماعت کے ساتھ سفر کریں گے۔ بعد میں خط کتابت سے تاریخ کے تعین کے ساتھ پروگرام طے ہو گیا اور وقت آنے پر ہم لوگوں نے ایک جماعت کے ساتھ یوپی کے کئی مشرقی اضلاع گورکھپور، اعظم گڑھ وغیرہ کا دورہ کیا، اس دینی تبلیغی سفر کی رفاقت نے ہماری عقیدت و محبت اور ہمارے قلبی تعلق میں اور اضافہ کیا اور الحمدللہ یہ اضافہ کسی نہ کسی رفتار کے ساتھ برابر جاری رہا۔ اور ان شاء اللہ آخرت میں بھی ہم تینوں کے لیے نفع مند ہو گا۔

صوفی صاحب کی جسمانی صحت اللہ تعالیٰ کے فضل سے بہت اچھی تھی، بڑھاپے میں بھی وہ صحت و قوت کے لحاظ سے پورے جوان تھے ـ مگر اللہ کی مشیت، ادھر کئی سال سے اُن کو ذیابیطس کی شکایت ہو گئی، اس نے جسم کو بالکل گھلا دیا، پھر ایک وقت آیا کہ اُسی کے اثر سے بینائی بھی جاتی رہی اور دوسرے تکلیف دہ عوارض بھی پیدا ہو گئے، لیکن دیکھنے والوں نے یہی دیکھا کہ وہ تسلیم و رضا کا پیکر بنے رہے اور غالباً معمولات میں بھی کوئی فرق نہیں آیا۔

راقم سطور کو اپنی اس تقصیر اور کوتاہی کا بڑا قلق ہے اور رہے گا کہ اناؤ، اگرچہ لکھنؤ سے دور نہیں ہے، ۴۰ میل سے بھی کم ہی مسافت ہے، اس کے باوجود حضرت صوفی صاحب کی زندگی کے آخری مہینوں میں اُن کی زیارت و عیادت کے لیے جانا نصیب نہیں ہوا، اگرچہ ان مہینوں کا کوئی ہفتہ غالباً ایسا نہ گزرا ہوگا جس میں اناؤ جانے کا ارادہ نہ کیا ہو، لیکن مشاغل و مصروفیات کی وجہ سے ہمیشہ اگلے ہفتے کے لیے ملتوی ہوتا رہا، یہاں تک کہ صوفی صاحب کے لیے وہ وقت آگیا جو ہر ایک کے لیے مقدر ہے۔ میں اس کی کوئی توجیہ اس کے سوا نہیں کر سکا کہ میری تقصیر کی وجہ سے یہ محرومی اور حسرت میرے لیے مقدر کردی گئی تھی۔

زندگی میں کبھی ایک دو دفعہ حضرت صوفی صاحب نے فرمایا تھا کہ اگر تمہاری زندگی میں میرا وقت آجائے اور تمہارے لیے ممکن ہو تو تم مجھے غسل دینا اور نماز جنازہ پڑھانا (بعد میں معلوم ہوا کہ انھوں نے اپنے "وصیت نامہ" میں یہ تحریر بھی فرمادیا تھا) اور اللہ تعالیٰ کی توفیق سے میرا معمول بھی ہے کہ اموات کو غسل دینے کو اپنی سعادت سمجھتا ہوں، خاص کر اللہ والوں کو غسل دینے کی مجھے حرص ہے۔ لیکن اس بارہ میں بھی میری محرومی مقدر تھی، اگرچہ حضرت صوفی صاحب نے اہتمام سے وصیت فرمائی تھی کہ جب ان کا انتقال ہو تو مجھے لکھنؤ ٹیلی فون سے اطلاع دی جائے تاکہ میں غسل دینے کے لیے بروقت پہنچ سکوں مگر اُن کے صاحبزادے عزیزی صدیق عم سلمہٗ کے اس وقت موجود نہ ہونے کی وجہ سے مجھے بروقت اطلاع نہیں دی جاسکی، اور میں غسل کی سعادت سے محروم رہا لیکن نماز جنازہ اور تدفین میں شرکت نصیب ہوگئی۔ ماشاء اللہ کان و مالم یشاء لم یکن۔

الفرقان کے فروری و مارچ کے مشترک شمارہ میں راقم سطور نے "ایک مرد مومن کی وفات" کے زیر عنوان ناظرین کو صوفی صاحب کے سانحۂ وفات کی اطلاع دیتے ہوئے ۵-۴ صفحے پر اپنے بعض تاثرات کا بھی اظہار کیا تھا۔ اسی وقت ارادہ کرلیا گیا کہ صوفی صاحب کی زندگی سے متعلق مزید معلومات حاصل کر کے انشاء اللہ اُن کا کسی قدر مفصل تذکرہ ایک مستقل شمارہ میں شائع کیا جائے گا ـــــ اس کے لیے میں نے اُن کے اور اپنے دیرینہ رفیق و دوست شاہ ابراہیم صاحب الہ آبادی کو لکھا (جن کا ابھی ذکر کیا جاچکا ہے) اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے انھوں نے حضرت صوفی صاحب کے خطوط اور اُن کی بعض تحریروں سے اور اُن کے گھر والوں سے معلومات حاصل کر کے قریباً پچاس ساٹھ صفحات کی ایک یادداشت (باقی صفحہ ۵۶ پر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ایک مرد مومن

حضرت صوفی سید عبد الرب علیہ الرحمہ

حضرت صوفی صاحبؒ کا پورا نام سید محمد عبد الربّ تھا، وہ سید سالار مسعود غازیؒ کے ہمراہ آئے ہوئے سالک سادات کی نسل سے تعلق رکھتے تھے، آپ کا وطن ضلع بارہ بنکی کا ایک موضع اگاسر تھا، لیکن ابتدائی عمر کے علاوہ کچھ سرکاری ملازمت کی بنا پر (جو ۱۹۳۱ء سے شروع ہو کر ۱۹۶۲ء میں ختم ہوئی) اور کچھ اپنے خاص مزاج اور اہل خاندان کی ناقدری کی وجہ سے تقریباً تمام عمر وطن سے دور ہی دور رہے۔

صوفی صاحبؒ بالکل ابتدائی عمر ہی میں جب آٹھویں درجہ میں زیر تعلیم تھے حکیم الامت حضرت مولانا تھانویؒ سے اپنے پورے خاندان کے ساتھ بیعت ہو گئے تھے اور بقول خود کلاس میں بیٹھ کر حضرت تھانوی کے مواعظ کا مطالعہ فرمایا کرتے تھے۔

صوفی صاحب کی تمام تر تعلیم انگریزی اسکولوں میں ہوئی۔ انھوں نے لکھنؤ یونی ورسٹی سے دبیر کامل فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا، اس کے بعد ٹیچر ٹریننگ کر کے محکمہ تعلیم میں بحیثیت ٹیچر ملازمت شروع کی۔ دوران ملازمت ہی آپ نے کانپور سے بی۔اے اور برلی سے ایم۔اے کا امتحان پاس کیا۔

حضرت صوفی جیؒ قد آور اور جسمانی طور پر بھی طاقتور تھے۔ ابتدا سے انتہا تک وضع قطع میں اپنے اکابر و مشائخ کے پیرو رہے۔ سر پر سفید معمولی کپڑے کا عمامہ یا ململ کی ٹوپی، لانبا کرتا، شرعی پاجامہ، خوب گھنی اور بڑی داڑھی۔ لیکن بے حد خوش مزاج، بڑے زندہ دل، بہت ہی باغ و بہار، مگر بس اس حد تک کہ شریعت و طریقت کی حد پار نہ ہو، اس حد کو پار کرنے والے کو خواہ وہ کسی درجہ اور رتبہ کا ہوتا ایک لمحہ کے لیے بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھے اور یہیں سے ان کے جلال کی حد شروع ہو جاتی تھی۔

اشداء علی الکفار رحماء بینھم کی جیتی جاگتی اور چلتی پھرتی ایسی مکمل تصویر اس دور

میں شاید ہی کوئی دوسری ہو۔ حضرت صوفی صاحب کی اسی خصوصیت نے ان کے بار بار تبادلے کرائے اور ۳۱ برس کی ملازمت میں ایسے ایسے سخت امتحانات سے گذارا کہ بڑے سے بڑا صاحب استقامت وعزیمت ان امتحانات کے تصور سے کانپ جائے۔ لیکن حضرت صوفیؒ کا یہ حال تھا کہ ؎

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خوں چکاں ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

حضرت صوفی صاحبؒ کی زندگی کے بہت سے پہلو ہیں۔ وہ پیشہ کے لحاظ سے ایک ماسٹر تھے، لیکن ان کی پوری زندگی ایک عابد وزاہد اور مجاہد و مصلح کی زندگی تھی۔ وہ بے حد زود گو اور پُرگو شاعر تھے لیکن کبھی ایک شعر بھی لذت کام و دہن کے لیے یا بے مقصد نہیں کہا، وہ پراثر واعظ تھے لیکن کسی رسمی جلسہ میں وعظ و تقریر کے لیے نہیں گئے۔ وہ گھر کے اندر بھی دین کے داعی اور مبلغ تھے اور گھر کے باہر بھی، مسجد میں بھی اور بازار میں بھی، اسکول کے لڑکوں کے لیے بھی وہ ناصح مشفق تھے اور اپنے احباب کے لیے بھی اور یہاں ان کی زندگی کا سب سے نمایاں پہلو اور وصف ان کی یہی خصوصیت تھی۔

حضرت صوفی صاحب کی زندگی اور ان کے حالات پر ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے لیکن اس مختصر مضمون میں خصوصیت کے ساتھ ان کی زندگی کے بس دو رخ سامنے لانے کا ارادہ ہے۔

ایک اللہ پر ایمان کامل۔ اور دوسرے بامقصد شاعری۔ صوفی صاحبؒ کی آزمائش سب سے پہلے ان کے خاندان سے شروع ہوئی ان کے والد اگرچہ بہت دین دار اور خود صوفی صاحبؒ کی ایک روایت کے مطابق حکیم الامت حضرت مولانا تھانویؒ کے سب سے پہلے مرید تھے۔ صوفی صاحب کے بھائی اور بھاوجیں بھی سب کی سب اسی سلسلہ سے وابستہ تھے۔ لیکن گھریلو معاملات میں کچھ افراد خاندان صوفی صاحب کے لیے شدید ابتلاء اور آزمائش بن گئے تھے۔ خود صوفی صاحبؒ نے اپنے ایک ذاتی خط میں ایک ہمدرد کو ان معاملات کی جو تفصیل لکھی وہ اس کا پورا اندازہ کرنے کے لیے کافی ہے۔

"معاملہ یہ ہے کہ ایک عزیز نے مصارف مقدمہ کا مطالبہ کیا۔ ایک دوسرے عزیز نے قرضہ کا مطالبہ کیا۔ دو بھاوجوں نے زیورات کا مطالبہ کیا۔ بھائیوں نے معاوضہ مکان کا مطالبہ کیا۔ اب کوئی بتائے کہ ان مطالبات کے جواب میں

سو اس کے میں نے کیا کہا کہ تصفیۂ شرعی کر لو جو نکلے ملے لو اور دیدو، جب تیار نہوئے۔ یہ بھی کہا کہ تمہارا نکلے لے لو میرا نکلے معاف۔ تب بھی راضی نہوئے۔ یہی جڑ اس نزاع خانگی کی ہے اس میں بتائیے میرا قصور کیا ہے۔...... اور جو کچھ کہا گیا وہ سنئے ...... نے چوری۔ ڈاکہ۔ تذلیل سب طرح ستا کر شرعی فیصلہ کیا اور بھاگ گئے۔ ایک صاحب...... نے شرعی فیصلہ کا نام سنکر مسجد میں بالاعلان شریعت اور ایمان کو جوتے میں جھونکا اور بے ایمانی کر کے وصول کرنے کا دعویٰ کیا اور مجھ کو گاؤں سے بھگا دینے کا اعلان کیا۔ معاوضہ مکان کا یہ حشر ہوا کہ اعلان کر کے میرا دو منزلہ مکان گرا دیا گیا اب بے وطن بھی ہوں اور خانماں برباد بھی۔ آخر بابا (والد) نے پھر مجھ کو چار پانچ خط لکھ کر بلایا کہ مولانا عبدالشکور صاحبؒ کو حکم مانتے ہیں آجاؤ اور سب بھائی مگر تصفیہ شرعی کر لو میں غیر جانبدار رہوں گا۔ لیکن جو ہوا وہ آپ کو بھی معلوم ہے کہ بھائی لوگ دارالمبلغین لکھنؤ سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ خیال تھا کہ بابا بوجہ دینداری اس فرار پر ان کو خوب لتاڑیں گے لیکن جب مولانا صاحب نے خط دربارہ شکایت فرار و تاکید واپسی لکھا تو جواب بالکل ہی خلاف توقع اور امید آیا جس سے دل بیٹھ گیا حسب ارشاد حضرت مصلح (حضرت مولانا سید محمد عیسیٰؒ) خاموش اور صابر ہو کر بیٹھ رہا، حتیٰ کہ میرا سامان ذاتی۔ تخت۔ چارپائی۔ کتابیں اثاث البیت اگا سر میں برباد کیا جا رہا ہے لیکن کون ہے اللہ کے سوا جو راستہ نکالے۔ اس پر بھی اس خدا سے جس کے قبضہ میں میری جان ہے ہر نماز کے بعد یہی دعا کرتا ہوں — اے اللہ والدین کو خوش کر دیجئے اور خانگی حالات کی اصلاح کر دیجئے۔"

جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے — حضرت صوفی صاحبؒ بچپن میں ہی حضرت حکیم الامتؒ سے بیعت ہو گئے تھے اس کے بعد متعدد بار تھانہ بھون جا کر بھی اپنے مرشد کی خدمت میں حاضری دی۔ ایک مرتبہ حضرت حکیم الامتؒ نے صوفی صاحبؒ کو ایک خط حضرت مولانا محمد عیسیٰؒ کے نام دیا اور فرمایا "یہ لفافہ ان کو دیدینا انھیں کو اپنا حال لکھنا، انھیں سے اصلاحی تعلق پیدا کر لو مجھ سے زیادہ مبصر اور شفیق ہیں"
اس حکم کے بعد صوفی صاحب نے اصلاح و تربیت کا تعلق حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب سے قائم

فرمالیا۔ مولاناؒ کی وفات (۱۹۴۴ء) کے بعد آپ نے حضرت مولانا شاہ وصی اللہؒ سے یہ تعلق قائم کیا اور شاہ صاحبؒ کے بعد ایک خط کے ذریعہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مدظلہٗ سے اپنی آخری عمر اور آخری حالات میں بیعت کی درخواست کی۔

صوفی صاحبؒ نے اپنی دینی نسبت کو حلقہ بندی اور گروہ بندی میں کبھی محدود نہیں ہونے دیا وہ دہلی نظام الدین تبلیغی جماعت کے مرکز بھی تشریف لے جاتے اور حضرت شیخ الحدیث مدظلہٗ کی خدمت میں بھی حاضر ہوتے۔ غرض کہ جہاں کبھی انھیں دین کی کوئی شمع نظر آتی وہ پورے اخلاص کے ساتھ وہاں جاتے اور اس سے روشنی حاصل کرنے کی کوشش کرتے وہ دین اور دینی اصلاح کے معاملہ میں بس اس کے قائل تھے۔ ؏

جس سے ملے، جہاں سے ملے، جس قدر ملے

حضرت صوفی صاحب ایک طرف تو اپنی دینی ترقی اور اصلاح کے لیے ہر وقت متلاشی اور مضطرب رہتے تھے اور دوسری طرف اپنے کو جس قابل سمجھتے تھے اس کے بقدر دوسروں کی اصلاح میں بھی سرگرداں رہتے تھے اور اکثر اس معاملہ میں اتنا آگے بڑھ جاتے تھے کہ ان کی ملازمت خطرہ میں نظر آنے لگتی تھی۔ لیکن اپنے اللہ پر اس قدر اعتماد اور بھروسہ رکھتے تھے کہ ہر آزمائش کو اسی کی بھیجی ہوئی سمجھتے اور اسی سے دعا کرتے کہ اس آزمائش سے نجات دے۔ اور دیکھا گیا کہ اس کی قدرت کاملہ سے نجات مل جاتی۔

سنہ ۴۰ء میں انکا تبادلہ گڑھوال کے پہاڑی گاؤں سری نگر ہو گیا جہاں کا حال یہ تھا۔ وہاں ایک گھر بھی مسلمان کا نہ تھا مسجد کا تو ذکر ہی کیا، رستہ بے حد دشوار گذار، پینے کا پانی تک ایک میل سے لانا پڑتا، گاؤں والوں کا جو حال صوفی صاحب خود بیان فرماتے یہ تھا کہ چلتی گائے کی دم کے نیچے لوگ بھی دیتے اور جب وہ پیشاب کرنے لگتی تو بڑی عقیدت سے ہاتھوں میں لیکر وہیں پی لیتے۔

اس آزمائش سے نجات پانے کے لیے صوفی صاحبؒ نے خود دعائیں کیں، اپنے مصلح حضرت مولانا محمد عیسیٰؒ کو بھی لکھا اور اپنے اصل مرشد حکیم الامت حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کو بھی۔ اور اسی کے ساتھ ظاہری اور اسبابی تدبیریں اور کوششیں بھی کیں۔ اللہ تعالیٰ نے دعائیں سنیں

اور وہاں سے بہرائچ آ گئے۔

صوفی صاحبؒ کے تبادلوں کی ایک طویل فہرست ہے وہ لکھنؤ، بلند شہر، ہمیر پور، باندہ، اٹیہ کروی، فتح پور، پرتاب گڈھ، گونڈہ، بلرام پور، بہرائچ، ہمالیہ کی وادی میں واقع کرن پریاگ، سیتا پور، اناؤ وغیرہ خدا جانے کہاں کہاں رہے لیکن وہ جہاں سے بھی گئے صرف اعلاء کلمۃ الحق اور مداہنت نہ کرنے کے "جرم" کی پاداش میں گئے اور جہاں بھی گئے، اُن کی اس خصوصیت کی شہرت نے اُن سے پہلے وہاں پہنچ کر ان کا استقبال کیا۔

حضرت صوفی صاحب جہاں بھی تشریف لے جاتے وہاں تبلیغی و اصلاحی کام شروع کر دیتے وہ پہلے بہت ہی نرم گفتاری کے ساتھ اپنے اردگرد کی اصلاح کا کام شروع کرتے، عقائد کی درستی اور شعائر اسلام کی پابندی کی کوشش کرتے۔ جس مسجد میں نماز پڑھتے اُس کے امام صاحب اگر صوفی صاحب کے نزدیک اصلاح کے محتاج ہوتے تو ان کی اصلاح کی فکر کرتے۔ اس لیے کہ اس دور میں خواص کو چھوڑ کر شاید ہی کوئی ایسا ہو جو ان کی کسوٹی پر پورا اترتا ہو۔

حضرت صوفی صاحب سب کو اپنے جیسا بنانا چاہتے، کچھ لوگوں کے حلق سے ان کی بات کسی طرح نہ اترتی تو مخالفت شروع ہو جاتی جس کے جواب میں صوفی صاحبؒ کے اندر بھی سختی پیدا ہو جاتی پھر مقابلہ اور بحث و مناظرہ کی نوبت آنے لگتی۔ فضا ناخوشگوار ہو جاتی اور کبھی کبھی بات اتنی بڑھ جاتی کہ وہی تبادلہ کا باعث بن جاتی۔

صوفی صاحبؒ کو کہیں بریلویوں سے سابقہ پڑتا کہیں تعزیہ داروں سے کہیں شیعوں سے اور کہیں قادیانیوں سے۔ وہ ایک جگہ اصلاحی کام شروع کرتے آہستہ آہستہ آگے بڑھاتے ابھی ان کا حلقہ پوری طرح بننے بھی نہ پاتا کہ وہاں سے کہیں اور بھیج دیے جاتے اور پھر وہاں نئے سرے سے کام شروع کر دیتے۔

بعض مقامات پر حضرت صوفی صاحب کو بڑی سخت آزمائش سے بھی گذرنا پڑا لیکن وہ اپنی غیر معمولی ایمانی طاقت کی بدولت ہر آزمائش سے کامیاب اور کامران گذرے۔

اناؤ ہی میں صوفی صاحب کے خلاف وہاں کے بعض با اثر شیعہ صاحبان نے ایک محاذ بنا لیا اور ہر ممکن کوشش اُن کے تبادلہ کی کرلی، جب کوئی صورت نہ بن پڑی تو محکمۂ تعلیم کو نقضِ امن کے خطرہ سے آگاہ کیا، صوفی صاحبؒ نے ابن سعد کے جواب میں ۲۷ صفحات میں بھرپور جواب لکھ کر ہیڈ ماسٹر کو

دیدیا جس نے اپنی خفیہ رپورٹ کے ساتھ اسے آگے بڑھادیا۔

ہیڈ ماسٹر کی رپورٹ یہ اندازہ کرنے کے لیے کافی ہے کہ صوفی صاحب اپنے فرائض منصبی میں کتنے ممتاز اور مستعد تھے ہیڈ ماسٹر نے لکھا کہ ـــــــ

"مجھے کسی ایسی بات کا علم نہیں ہوا جو اس بات کو ثابت کرتی ہو کہ نقض امن کا اندیشہ ہے۔ میرے نزدیک نقض امن کا ذکر صرف حکام میں سنسنی پیدا کرنے کے لیے کیا گیا ہے اور نار وا دباؤ ڈالنے کے لیے۔

اسکول میں اے۔آر۔صوفی کے متعلق کوئی بھی شکایت نہیں ہے بلکہ وہ اسکول کے نظم و بہتری کے معیار کو بلند کرتے رہے ہیں اور میرے لیے بہترین معاون ثابت ہوتے ہیں جیسا کہ میں نے ان کی سالانہ خفیہ رپورٹ میں بھی لکھا ہے۔

اسکول کے تمام مدرسین ملازمین وطلبہ کے ساتھ وہ امن اور چین سے رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں ان کا تبادلہ اسکول کے لیے نقصان عظیم ہوگا۔

آپ کا مخلص

جے۔پی۔اگروال، ہیڈ ماسٹر

اثنا ء میں حضرت صوفی صاحب کا قیام محلہ شیخو واڑہ میں تھا وہاں کی مسجد کے وہ امام بھی بنا دیے گئے تھے لیکن شر پسندوں نے ان کے خلاف محاذ بنا لیا جس سے بددل ہو کر آپ نے امامت ترک کر دی۔ اس واقعہ کو مفصل طور پر خود صوفی صاحب نے ایک خط میں لکھا ہے جس سے اس کا پورا اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ بے مقصد کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ جس کام سے دینی فائدہ ہوا اسے ضرور کرتے اور جس سے فائدہ نہ ہو اسے ہرگز نہ کرتے۔

صوفی صاحب کے حمایتوں نے چاہا کہ وہ امامت برابر جاری رکھیں۔ لیکن صوفی صاحب نے اس حمایت سے خوش ہونے کے بجائے خود حمایتیوں کو ہی نصیحتیں کیں انھوں نے تحریر فرمایا

"میں امامت نہ کروں گا اس لیے کہ میں نے امامت سوچ سمجھ کر چھوڑی ہے۔ پھر میری امامت سے نفع صرف اس صورت میں ہوتا کہ میرے ساتھی تین کام کرتے۔

(۱) خود تقویٰ اور دین اختیار کر لیتے جس سے ان کا دنیاوی اور دینی بیڑا پار ہوتا۔

(۲) مخالفوں کے ساتھ وہی رویہ رکھتے جو میں رکھتا ہوں اور چاہتا ہوں اُس سے وہ دین کے اعتبار سے حق پرست رہتے اور مخالفوں کو لاجواب ہونا پڑتا اور وہ دل ہی دل میں اثر لیتے خواہ دیر لگتی۔ (۳) میرے مشورہ پر عمل کرتے خواہ آپس میں بحث کر لیتے تب اطاعت کرتے۔

مخالفوں کے رویہ سے ہو سکتا ہے کہ آپ لوگ مطمئن ہوں لیکن میں بالکل مطمئن نہیں اور مخالفوں کو برابر شرارت میں منہمک پاتا ہوں اور موافقوں کو دیکھتا ہوں کہ ان کا شوق بھی پورا ہو گیا اور وہ دین کو دنیا ہی کے رنگ میں سنتے ہیں جو سراسر دنیا و آخرت کا خسارہ ہے...... ان حالات میں الیکشن محض دنیا اور فتنہ ہے اور دین کو اس سے کوئی سروکار نہیں ہے، جو کام آپ کے کرنے کا ہے وہ عقلمندوں اور ایمانداروں کی طرح کیجیے تو میرا اور آپ کا اور دین کا اور دنیا کا اور مخالفوں کا اور موافقوں کا سب کا نفع ہو سکتا ہے اگر ایک مسجد شیخواڑہ میں میں نے امامت کر بھی لی تو سوا نقصان دینی و دنیاوی کے کوئی نفع نہیں۔ ہمارے آپ کے پیش نظر آبادی کی ہر مسجد اور ہر محلہ اور ہر گھر ہونا چاہیے اور سب سے پہلے اپنی ذات۔ اپنا گھر اور اپنے بچے ہونے چاہئیں.......میں مکاری اور مصلحت سے نہیں پوری ایمانداری سے کہتا ہوں کہ اپنے خون کے پیاسے دشمن کو......اپنی اولاد سمجھتا ہوں لیکن نالائق اولاد ہیں ان سب کا دعاگو اور خیرخواہ ہوں۔ مجھے اللہ کو راضی کرنا ہے نہ کہ الیکشن والی حیفلش خرید کر جہنم تیار کرنا۔ اب وہ اجزا سنیے جو آپ کو اختیار کرنا ہے۔

۱۔ مجھ سے دین سمجھتے جاتے، اور جتنا سمجھ میں آتا جاتا اتنا اپنی زندگی میں داخل کرتے جاتے اور جو نہ سمجھ میں آتا اس کے لیے جہنم کے ڈر سے اور جنت کی طلب میں یعنی اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور ناراضگی کو سامنے رکھ کر بے چین رہتے اور مجھ سے سمجھتے اور یہی اپنی اولاد کا رنگ بناتے اور اسی طرح اپنے گھر میں انقلاب لاتے، ورنہ بُرا نہ مانیے۔ کل آپ تو ہوں گے جہنم میں اور اولاد ہو گی مندر میں۔ غیر مسلم بن کر اور یہ سب کا رخانہ دھرا رہ جائے گا۔

۲۔ مخالفین کے ساتھ وہ رویہ رکھتے جو میں چاہتا ہوں جس سے اُن کے قلوب فتح

ہوتے اور اگر از راہِ خباثت وہ راہِ راست پر نہ آتے جب بھی ہم کو رنج نہ ہوتا ......
لیکن برخلاف اس کے آپ سب لوگ مخالفین کی شرارتوں سے متاثر ہونے کے لیے مجھے بے یار و مددگار بے اثر کر چھوڑ دیتے ہیں، زیادہ سے زیادہ تبادلہ ہی تو ہوگا: ورنہ تقوی اختیار کرتے ہیں اور نہ دین اور نفس سے یہ بہانہ بنا لیتے ہیں کہ اصلاح دھیرے ہی دھیرے ہو گی اور سمجھتے ہیں کہ اصلاح ہو تو رہی ہے حالانکہ خاک نہیں ہو رہی ہے اور جو نظر آتی ہے کہ ہو رہی ہے اس سے زیادہ مخالفوں کی چپقلش اور شرارت ہو رہی ہے، جو غلبہ پا کر معمولی سے نفع کو مغلوب کر دیتی ہے اور مجھے نقصان پہنچاتی ہے۔ بس اتنا ہی اشارہ عقلمندوں کے لیے کافی ہے اگر دینی و دنیاوی اصلاح اور نفع مقصود ہے تو نفس سے کام نہ لیجیے تو پھر سب آپ کو حاصل ہوگا ورنہ انجام ہلاکت۔ آپ حق پر خود چلیے اولاد کو چلا لیے۔ دوسروں سے راز کی والی نہیں دین والی باتیں کیجیے اور ان لغویوں کو چھوڑ دیجیے"

اس کے برعکس صوفی صاحب کا دوسرا رخ یہ بھی تھا کہ چیلنج قبول کرنے اور مخالفین کے مقابلہ میں ڈٹ جاتے۔ صوفی صاحب کی مجلس میں اکثر ایک قادیانی آکر بیٹھ جاتا تھا اور کچھ اس قسم کے خیالات ظاہر کرتا جن سے سننے والوں میں شک و شبہ پیدا ہو جائے۔ صوفی صاحب اس کو پورے اخلاص کے ساتھ سمجھایا کرتے آخر ہوتے ہوتے بات مناظرہ تک آ گئی۔ صوفی صاحب سمجھ گئے کہ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ میرے پاس آنے جانے والوں میں شک پیدا کر دے۔ صوفی صاحب نے ایک دن بھری مجلس میں اسے پکڑ لیا اور کہا مناظرہ کر لو وہ مناظرہ پر آمادہ تھا لیکن کسی کو حکم بنانے پر تیار نہیں تھا۔ آخر صوفی صاحب نے تجویز پیش کی کہ آؤ باہم مناظرہ کریں اور یہ جاننے کے لیے کہ حق پر کون ہے ہم دونوں اپنا ایک ایک ہاتھ آپس میں مضبوطی سے باندھ لیں اور ایک کڑھائی میں تیل کھولا کر اس میں ڈال دیں جو حق پر ہوگا اس کا ہاتھ محفوظ رہے گا جو باطل پر ہوگا اس کا ہاتھ جل جائے گا۔

اس تجویز پر حاضرین نے بہت واہ واہ کی لیکن قادیانی بھاگ کھڑا ہوا اور اس کے بعد پھر کبھی نہ آیا۔

ان کی ایمانی قوت کا ایسا ہی ایک مظاہرہ شہر فتح پور میں ہوا۔

صوفی صاحب فتح پور جب پہنچے تو وہاں بھی ہمیشہ کی طرح انھوں نے دوپہر کی چھٹی میں ظہر کی نماز

پڑھنے کا معمول باقی رکھا اور مسلمان طلبا کو تلقین کی کہ وہ بھی ان کے ساتھ جماعت سے نماز پڑھا کریں۔
کچھ ہی دنوں میں وہاں باقاعدہ ظہر کی نماز باجماعت ہونے لگی۔ ہیڈ ماسٹر کچھ متعصب تھا وہ اس بات کو پسند نہ کرتا۔ اس نے چند غیر مسلم لڑکوں کو مخالفت پر آمادہ کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ طلبہ میں کچھ ہندو مسلم مناقشہ ہو گیا۔ بعض لڑکوں نے ہیڈ ماسٹر کو بھی پیٹ دیا۔ معاملہ سنگین ہو گیا۔ چونکہ صوفی صاحب پکے مسلمان مشہور تھے اور باجماعت نماز انھوں نے ہی شروع کرائی تھی اس لیے انھیں کو سارے فساد کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا اُس وقت محکمۂ تعلیم کا ڈائرکٹر انگریز تھا وہ خود تحقیق و تفتیش کے لیے فتحپور پہونچا اور مختلف لوگوں سے بیانات لیے۔ صوفی صاحب اور ہیڈ ماسٹر کو اپنی اپنی صفائی پر وضاحتی بیان دینے کے لیے کہا گیا۔ عوام بھی موجود تھے صوفی صاحب نے تقریر کی اور اپنی صفائی معقول طور سے پیش کی۔ جب ہیڈ ماسٹر تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو بجائے دلائل کے اپنی پوزیشن صاف کرنے کے لیے انھوں نے اسٹیج پر رونا، چیخنا، اچھلنا کودنا، فریاد کرنا شروع کر دیا گویا وہ بہت بڑے مظلوم ہیں۔ صوفی صاحب کا گویا پکا مسلمان ہونا رب سے بڑا جرم تھا۔ ڈائرکٹر نے صوفی صاحب کو سارے فساد کا ذمہ دار قرار دیا۔ صوفی صاحب نے یہ ساری کارروائی خاموشی اور صبر سے سنی اور اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہ کر دعا فرماتے رہے۔ آخر میں ڈائرکٹر نے غصہ بھرے انداز میں صوفی صاحب سے کہا "تم کو کچھ کہنا ہے تو کہو۔" صوفی صاحب نے کہا "جی ہاں میں کچھ کہوں گا۔"
صوفی صاحب نے ڈائرکٹر اور اس کے سامنے بیٹھے ہوئے ہیڈ ماسٹر کے روبرو کہا۔ "ان ہیڈ ماسٹر صاحب کے ایک لڑکا ہے جو اسی اسکول میں پڑھتا ہے اس کو یہاں بلا لیا جائے۔" ڈائرکٹر نے پوچھا کہ لڑکے کو کیوں بلا لیا جائے؟ صوفی صاحب نے کہا کہ (ان ہیڈ ماسٹر کا) اکلوتا بیٹا ہے اور مجھے معلوم ہے کہ وہ اس کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ وہ یہاں آجائے تو میں اسی جگہ دو رکعت نماز پڑھوں گا اور دعا کروں گا اور یہ ہیڈ ماسٹر بھی اپنے لڑکے کے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائیں اور میرے ساتھ دعا کریں کہ ہم دونوں میں جو شرارتی اور فسادی اور جھوٹا ہو تو زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں دھنسا دیا جائے یا چھت پھٹ کر اسی پر گر جائے اور وہ ہلاک ہو جائے۔ اور ان ہیڈ ماسٹر صاحب نے اگر جھوٹ بولا یا شرارت کی ہے تو ان کا لڑکا بھی زمین میں دھنسا دیا جائے۔
ڈائرکٹر نے صوفی صاحب کی یہ بات سنی اور کہا کہ صوفی صاحب آپ نے کیا کہا؟ صوفی صاحب نے پھر وہی بات دل کے خاص تاثر کے ساتھ اور پرجلال انداز میں دہرائی۔ ڈائرکٹر اور ہیڈ ماسٹر پر

دہشت طاری ہوگئی اور جب ڈائرکٹر نے ہیڈ ماسٹر سے پوچھا "کیا آپ اس کے لیے تیار ہیں" تو وہ اتنا دہشت زدہ اور مرعوب تھا کہ اس نے اس پر عمل کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کا انکار کرنا تھا کہ لال پنسل سے ڈائرکٹر نے مقدمۂ فساد کے فائل کی تحریروں کو کاٹ دیا اور صوفی صاحب سے کہا۔ اچھا پادری صاحب آپ جا سکتے ہیں۔ بس ساری تحقیق و تفتیش اسی پر ختم ہوگئی۔ یہ البتہ ہوا کہ فتحپور کے سارے ٹیچروں کا اور ہیڈ ماسٹر کا وہاں سے تبادلہ کر دیا گیا......

صوفی صاحب سے جب ان کے ایک دوست نے پوچھا کہ آپ نے اتنی بڑی بات کیسے کہدی" صوفی صاحب نے فرمایا کہ "اس وقت مجھے پختہ یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ ایسا ہی کر دے گا"۔

حضرت صوفی صاحب کے یہاں دین کے معاملہ میں لچک یا رواداری کا کوئی خانہ ہی نہ تھا وہ صاف طور پر کہتے تھے کہ میرے بس کی بات نہیں ہے کہ میں بندوں کو خوش کرنے کے لیے خدا کو ناخوش کروں۔

ایک دفعہ تبادلہ ہو کر گونڈہ پہنچے تو وہاں یہ دیکھ کر ان کی غیرت ایمانی جوش میں آگئی کہ اکثر سنی مسلمان شیعوں کے زیر اثر ہیں اور ان کی انجمن "اتحاد المومنین" کے زیر انتظام "یادگار حسینی" وغیرہ بنانے اور امام باڑوں کو سنوارنے اور آباد کرنے میں منہمک ہیں۔ صوفی صاحب نے فوراً تقریری اور تحریری جہاد شروع کر دیا اور ایک انجمن "مجلس خیر" کی بنیاد ڈالی کہ دھیرے دھیرے سنی مسلمانوں کو صحیح راستے پر لے آئے۔

گونڈہ کے قیام کے زمانہ میں صوفی صاحب ایک دن جگر مرادآبادی مرحوم کے مکان پر اُن سے ملنے گئے تو دیکھا کہ کمرہ میں حاجی وارث علی شاہؒ کا فوٹو لگا ہوا ہے، صوفی صاحب نے فوراً جگر صاحب کو ٹوکا کہ فوٹو لگانا حرام ہے۔ جگر صاحب نے فرمایا کہ یہ تو ایک صوفی بزرگ کا فوٹو ہے ـــــ صوفی صاحب نے جگر صاحب کو بتایا کہ بزرگوں کے فوٹوؤں سے ہی تو عوام تباہ ہوتے ہیں اور وہ شرک تک میں مبتلا ہو جاتے ہیں، یہ بات جگر صاحب کی سمجھ میں آگئی اور انھوں نے وہ فوٹو اتار کے اُسی وقت پھاڑ دیا۔

جگر صاحب صوفی صاحب کی صحبتوں سے برابر مستفید ہوتے رہے اور یہ واقعہ ہے کہ جگر صاحب کے اس دینی انقلاب میں کہ وہ ایک آزاد منش رند خراب سے صرف پابند شرع نمازی ہی نہیں بلکہ تہجد گزار بن گئے حضرت صوفی صاحب سے ان کے تعلق کا بڑا دخل تھا ـــــ انھوں نے جو خطوط صوفی صاحب کو لکھے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے دل میں صوفی صاحب کی بڑی عظمت اور عقیدت تھی ـــــ جاننے والے جانتے ہیں کہ جگر صاحب کس درجہ کے "رند" تھے اور آخری زمانہ اللہ والوں کی طرح گزارا۔ حضرت مولانا

ابوالحسن علی میاں مدظلہٗ نے تو ان پر مستقل مضمون لکھا ہے جو ان کی تصنیف "پرانے چراغ" میں شائع ہوا ہے۔

گونڈہ کے ٹامسن انٹر کالج میں اُردو کے ایک لکچرار خواجہ مسعود علی ذوقی تھے جو بہت اچھے شاعر اور جگر صاحب کے گہرے دوستوں میں سے تھے ایک دن انھوں نے حضرت صوفی صاحبؒ کو ایک تصویر دکھلائی جو استاد ذوق دہلوی مرحوم کی تھی۔ ذوقی صاحب نے دریافت کیا کہ صوفی صاحب پہچانیے یہ کون ہے؟ صوفی صاحب نے تھوڑی دیر غور کیا اور پھر معذوری ظاہر فرما دی۔

ذوقی صاحب نے خوش ہو کر فرمایا کہ یہ میری تصویر ہے جو کلکتہ کی ایک کمپنی کی نمائش پر میرا میک اَپ کر کے لی گئی تھی۔ صوفی صاحب نے فرمایا کہ ایک شب کے لیے یہ تصویر مجھے دیجیے۔ ذوقی صاحب نے بخوشی تصویر دیدی۔ صوفی صاحبؒ نے رات کو چند شعر کہے اور ایک کاغذ پر لکھ کر اور اس کو تصویر کا غلاف بنا کر صبح کو واپس کر دیا۔ ان چند اشعار کو ملاحظہ فرمائیے اور دیکھیے کہ تبلیغ کا کوئی موقع اگر اُن کے ہاتھ آجاتا تو وہ اس سے کس طرح بھرپور فائدہ اٹھانا چاہتے تھے — حضرت صوفی صاحبؒ نے اس کا عنوان "خطاب محبت" رکھا تھا۔ فرماتے ہیں:-

تمہارے دل کی دنیا بھی کبھی بیدار ہوتی ہے
تمہاری چشم بینا بھی کبھی ہشیار ہوتی ہے

بدل دے روپ جو یکسر بھلا ایسے تغیر پر
تمہاری طبع دانا بھی کبھی تیار ہوتی ہے

ذوق کے قالب میں ذوقی تو ہے ذرا دیکھیے
موم کر دیتا ہے یہ اکسیر پتھر دیکھیے

نقل کا یہ حال ہے اے کاش اب ہو جائے اصل
وضع بھی کیا چیز ہے اللہ اکبر دیکھیے

ماہیت کی حقیقت کاش سمجھا دے کوئی
ذوق پیدا ہو تو پھر ذوقی کے جوہر دیکھیے

آنکھ ہے محو تماشہ روبرو تصویر دوست
ہے زبانِ شوق صوفی نغمہ پرور دیکھیے

خواجہ مسعود علی ذوقی صاحب نے اسے اپنی ذات پر حملہ سمجھا اور بجائے خوش ہونے کے کج بحثی پر اتر آئے انھوں نے ایک ماہ کے بعد ان اشعار کا جواب صوفی صاحبؒ کی خدمت میں بھجوایا اور ایک مختصر نظم کے ساتھ نثر میں لکھا کہ

"بذلہ گوئی اور برجستگی میں آپ کا مقابلہ کرنا گویا آفتاب کو چراغ دکھانا ہے۔

مجھے اعتراف ہے کہ نہ میں آپ کی طرح فی البدیہہ شعر ڈھال سکتا ہوں نہ میرے کلام

میں غالب کی شیوہ بیانی اور بیدل کی دقیقہ رسی کا رنگ جھلکتا ہے۔ یہ طرز آپ کا حصہ ہے اور آپ ہی پر ختم ہے۔ لہٰذا اس نظر کو اپنی نظم کا جواب تصور نہ کیجیے گا اسی سے اس کا عنوان "جواب ناصواب" رکھا ہے صرف لطف اٹھانے کی چیز ہے۔

تین شعر اور حاضر ہیں ان کا عنوان غائب ہے جو چاہیے خود رکھ لیجیے۔"

ذوقی صاحب کے "جواب ناصواب" کے بجائے اختصار کے پیش نظر یہاں ان کے بلاعنوان تین شعر نقل کیے جا رہے ہیں — ذوقی صاحب نے فرمایا۔

تو سطح بیں ہے ناداں؛ دھوکہ میں آگیا ہے	ظاہر کو تو نے میرے باطن سمجھ لیا ہے
تو دیں سمجھ رہا ہے دیں کی علامتوں کو	ساحل پہ ڈھونڈتا ہے [illegible] کی حقیقتوں کو
فریاد کی تو کوئی تخصیص ہے نہیں ہے	نالے کو سچ کہا ہے پابند لے نہیں ہے

ذوقی صاحب نے یہ اشعار ماسٹر عبدالرب صوفی ایم۔ اے۔ کو مخاطب کر کے کہے ہوتے تو شاید صوفی صاحب درگزر فرما دیتے لیکن ان کا مخاطب انھوں نے داعی اور مبلغ عبدالرب صوفی کو بنایا تھا اس لیے صوفی صاحب کی مناظرانہ رگیں بیدار ہو گئیں اور انھوں نے [illegible] ان کی رفتار سے شعر کہنے کے بجائے شعر برسانا شروع کر دیے صوفی صاحب نے (۱۴۰۰) شعر اس کے جواب میں کہے جو مختلف عنوانات کے تحت ان کے ذخیرے منظوم میں موجود ہیں۔ ہر نظم کا انداز جدا عنوان جدا مگر روح ایک ہے اور وہ ہے دعوت و تبلیغ۔ صوفی صاحب [illegible] کہتے تھے [illegible] وقت میں کہتے تھے اس میں یہ بات آسان نہیں تھی کہ بھرتی کے شعر نہ آجائیں لیکن ان کے ذخیرۂ اشعار میں آمد کی ایسی بارش محسوس ہوتی ہے کہ اسی کو سمیٹنا دوسرے کو مشکل ہوتا ہے۔ اسی لیے آورد یا محنت سے شعر بنانے کی ان کو شاید ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔

نیز وہ جس بلند مقام سے شعر کہتے تھے اور جس انداز سے کہتے تھے اس کا [illegible] مخاطب کے قلب پر پڑنا لازمی تھا۔

صوفی صاحب نے ذوقی صاحب کے لیے جو کچھ کہا اس کی چند جھلکیاں ہم یہاں پیش کر رہے ہیں۔ فرماتے ہیں:

السلام اے [illegible] بارگاہ رتبہ مستعار	السلام اے ذوق شادابی [illegible] پائیدار

اے سراپا عشق اے بدر جوانی کے چکور . اے سراپا حسن اے صحرائے انسانی کے نور

صوفی صاحب نے اس کے بعد اٹھارہ اشعار میں اپنے جواب کی تمہید نظم فرمائی اور جواب کی طوالت کی پیشگی جو معذرت یا توجیہ فرمائی اس میں بھی مخاطب کی بہتری ہی کو پیش نظر رکھا۔ ؎

مختصر لکھوں تو ڈر ہے آپ ٹھوکر کھائیں گے

اور بخود رائی نہ کی تو پھر مرا سر کھائیں گے

اس معذرت کے بعد آٹھ مختلف عنوانات کے تحت پند و نصائح کا دفتر ہے جس کا ہر ہر شعر حکمت، دعوت، شفقت اور محبت کا آئینہ دار ہے کہیں ہلکے سے طنز یا تحقیر کی جھلک بھی نظر نہیں آسکتی، جو شاعری کا عمومی خاصہ رہا ہے۔ حضرت صوفی صاحب نے یہ منظوم خط ختم کیا ہے تو اسے بھی آخر شب کی دعا بنانا نہیں بھولے ہیں۔ دیکھیے کیسے کرب اور کیسی تڑپ کے ساتھ فرماتے ہیں۔

اے دلوں کے پھیرنے والے خدائے بے نیاز — جانتا ہے چوریاں آنکھوں کی تو سینوں کا راز

شاعری میں "بلّغوا عنّی" کی یہ تعمیل ہے — میری محنت کا صلہ مقصود کی تحصیل ہے

درد دل میں آنکھ میں آنسو زباں پر ہے دعا — آج پچھلی رات میں اتنی ہے میری التجا

رحم یارب رحم یارب ذوقی بے چارہ پر — رحم یارب کو چۂ مغرب کے اس آوارہ پر

حضرت صوفی کے اس بھرپور جواب سے ذوقی صاحب نے بجائے اصلاح قبول کرنے کے اپنی سخت توہین محسوس کی اور جگر صاحب (مرحوم) سے جا کر شکایت کی۔ جگر صاحب نے جب حضرت صوفی صاحب سے تذکرہ کیا تو صوفی صاحب نے پورا واقعہ اور تمام شعر سنا دیئے جن کو سنکر جگر صاحب نے جو کچھ فرمایا وہ ذرا حضرت صوفی صاحب کی زبان سے ہی سن لیجیے۔

"جگر صاحب نے نظموں کی جتنی تعریف فرمائی اس سے اس لیے ضرور خوش ہوا کہ زمانہ کا مسلّم و مستند و صاحب کمال استادِ سخن ایک ملّا کی تبلیغ منظوم کا مداح ہے لیکن جگر صاحب کے جملے اس لیے نقل نہیں کرتا کہ اپنی بے بضاعتی پیش نظر کرکے یقین ہو جاتا ہے کہ جگر صاحب نے بطور ہمت افزائی تحسین کر دی ہوگی۔

اتفاق سے چند منٹ کے بعد ذوقی صاحب بھی آگئے اور میں نے ان کے اعتراضات کو ہنسی خوشی اس لیے تاکہ ان کا غصہ نکل جائے۔ اس کے بعد میں نے انکسار و محبت

کے ساتھ اعتراضات کو دفع کیا اور منظوم جواب کی درخواست کی جس مقصد کو ظاہر کر کے میں نے جواب کی درخواست کی اسکو جگر صاحب نے بھی پسند کیا وہ یہ کہ آپ اگر پوری قوت کے ساتھ جواب دیں گے تو تہذیب جدید کی ذہنیت کی کامل نمائندگی ہو جائے گی۔ پھر میں ان کا جواب دوں گا جو ممکن ہے ان لوگوں کے لیے جن پر زمانے کی ہوا کا اثر ہے، نیز جن کی طرف سے میں وکالت کا حق ادا کروں گا اُن کی خوشی کو میں ذخیرۂ آخرت سمجھتا ہوں۔ لیکن ذوقی صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا۔"

حضرت صوفیؒ نے دین پر ہونے والے حملہ کو کبھی بھی برداشت نہیں کیا۔ انھوں نے نیاز فتحپوری اور شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی کی متعدد نظموں اور رباعیوں کو اپنی صنف سخن میں چیلنج کیا اور جب جب بھی ان حضرات نے خدا، دین، اور دینداروں پر پھبتے پھبتکے صوفی صاحبؒ سے منہ توڑ جواب پایا۔

حضرت صوفی صاحبؒ ساری عمر جو بھی لڑائی لڑتے رہے اور کبھی انھوں نے پہلوتہی نہیں کی اور نہ یہ خیال کیا کہ ساری دنیا سے میں اکیلا ہی کیوں لڑوں؟ وہ تقریر سے تحریر سے نثر سے نظم سے حد یہ کہ ہاتھ پاؤں سے بھی اسلام کی طرف سے لڑنے والے مجاہد تھے اور آخر عمر تک اسی حال میں رہے وہ دیکھتے تھے کہ بڑے بڑے محاذوں پر سرد بازاری ہو چکی ہے لیکن ان کا محاذ کبھی ٹھنڈا نہیں ہوا۔

صوفی صاحبؒ صحابہ کرامؓ سے انتہائی محبت اور عقیدت رکھتے تھے اور ان کو شیعوں سے اسی بنا پر بہت بغض تھا کہ وہ صحابہ کرامؓ کے متعلق مخصوص نظریات رکھتے ہیں۔

ایک مرتبہ سیتاپور میں ایک نشست میں بعض دوستوں سے حضرت ابوہریرہؓ کے فضائل و مناقب بیان کر رہے تھے۔ اتنے میں ان کے ایک ملنے والے شیعہ ماسٹر آ گئے۔ چند منٹ گفتگو سننے کے بعد ان سے نہ رہا گیا کہنے لگے کہ ــــ "آج تو بڑے بڑے وضاعین حدیث کی تعریف ہو رہی ہے۔" صوفی صاحب دو چار منٹ تک سن ہو کر رہ گئے پھر اندر سے ایک چھرا نکال کر لائے اور اعلان کر دیا کہ آج میں اس کو صحابہ کرام کی شان میں گستاخی کی پوری سزا دوں گا۔ سب کی انتہائی مداخلت، معافی اور تلافی کے بعد ان کی جان بخشی کی ـــ اور اس کے بعد جب تک سیتاپور میں رہے ان صاحب سے کلام اور سلام نہیں کیا۔

وہ لکھنؤ میں ایک زمانہ تک اپنے ایک قدردان دوست کے مکان پر قیام فرمایا کرتے تھے جو

دنیاوی اعتبار سے صاحبِ حیثیت اور وجاہت تھے اور مزاج بھی دینی تھا۔ اور دونوں میں بہت ہی قریبی تعلق تھا لیکن کچھ عرصے کے بعد یہ معمول ختم کر دیا اور اس کا سبب اپنے ایک دوست اور ہم مشرب ساتھی کو یہ لکھا کہ

"وہ ...... تو میرا اثر قبول کرتے کراتے نہیں اس لئے مجھکو ان کی رعایت سے ان کی باتیں گوارہ کرنا پڑتی ہیں مثلاً وہ میز کرسی پر ناشتہ اور کھانا دیتے ہیں اور میری موجودگی میں داڑھی منڈاتے ہیں اگرچہ بہت آؤ بھگت سے پیش آتے ہیں۔ تو دل پر غیرتِ دینی کا غلبہ ہوا اور دل نے کہا کہ اس طرح مہمان بننا محض دنیا ہے اور ہزار بار حرام ہے اس لیے بے رخی اور کج خلقی تو نہیں کی لیکن ان کا مہمان بننا چھوڑ دیا۔"

لکھنؤ جیسے شہر میں کوٹھی کا قیام، آگے پیچھے خدمت، گاڑی آنے جانے کے لیے موٹر، بہترین کھانے اور تحائف لیکن سب کچھ اُس وقت تک قبول جب تک یہ امید ہے کہ ایک دن صاحبِ خانہ مہمان کے رنگ میں رنگ جائیں گے۔ جس دن مایوسی ہوئی ہر چیز پر ٹھوکر ماری اور سلام کر کے رخصت ہو گئے۔ صوفی صاحب کی اس خصوصیت اور صفت کو شاید ہی کوئی ان کا جاننے والا ہو جس نے محسوس نہ کیا ہو۔

وہ بریلی میں جب ایم اے کا امتحان دینے گئے تو حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کے مہمان ہوئے اور دورانِ امتحان ان کے وعظ کی مجلسیں اور مختصر نشستوں میں ان کے پند و نصائح بھی جاری رہے ان کے وعظ کی مجلسوں میں مستورات کا بھی باپردہ انتظام رہتا تھا اور وہ اپنی تقریر کا بڑا حصہ عورتوں کے لیے مخصوص فرماتے تھے۔ خصوصیت کے ساتھ پردہ کی اہمیت اور عورتوں کو گھر سے نہ نکلنے اور گھر میں رہ کر اولاد کی تربیت کی جانب متوجہ کرنا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند دن کے قیام کے بعد ہی جب وہ واپس تشریف لے گئے تو کسی کے مرشد کسی کے مربی اور کسی کے منہ بولے بھائی بن چکے تھے ـــــ پبلک سروس کمیشن یو پی کے اس وقت کے چیرمین محمد احمد صاحب اور ان کے بھائی پروفیسر خلیق احمد صاحب اور ان کے ایک قریبی عزیز پروفیسر حسیب صاحب وغیرہ ان سے متعلق ہی نہیں بلکہ ان کے اسیر بن چکے تھے ـــــ لیکن اس خاندان کی نوجوان نسل کو صوفی صاحب کی وضع قطع اور رنگ ایک آنکھ نہ بھائی۔ صوفی صاحب جب دوبارہ صرف ان حضرات کے بلانے پر بریلی تشریف لے گئے تو ایک دن خاندان کے نوجوانوں کی ایک پارٹی نے یلغار کر کے محمد احمد صاحب کے مکان پر صوفی صاحب کو باقاعدہ گھیر لیا تھا۔ نئی اور پرانی قدروں کے درمیان مباحثہ کی ابتدا ہوا ہی

چاہتی تھی کہ محمد احمد صاحب نے مداخلت کرتے ہوئے اپنے بزرگ ہونے کا ہتھیار استعمال کرنا چاہا۔ صوفی صاحب نے بڑی خوبصورتی سے ان کو ٹالا اور فرمایا کہ ساری عمر اسی نسل اور اسی عمر کے بچوں میں گذاری ہے آپ اندر جائیں اور مجھے ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں۔ یہ نوجوان سب کے سب اس نسل سے تعلق رکھتے تھے جس کو اس زمانہ میں پوری منصوبہ بندی کے ساتھ علماء اور دیندار حضرات سے بری طرح برگشتہ کر دیا گیا تھا اور ان کے ذہن میں یہ بات بٹھلا دی گئی تھی کہ اسلام کے اصل دشمن اور مسلمانوں کی ترقی میں حقیقی رکاوٹ یہ مولوی اور ملا ہیں — یہ بھی اتفاق ہے کہ یوپی کے وہ چند شہر جن میں اس زہر نے سب سے زیادہ اثر کیا تھا ان میں بریلی سرفہرست تھا۔ الغرض محفل جمع ہوئی، دس بارہ لڑکوں نے سب سے پہلے یہی سوال کیا کہ آپ حضرات مسلمان عورتوں کو پردہ میں قید کر کے ان پر ترقی کے دروازے کیوں بند کرنا چاہتے ہیں؟ صوفی صاحبؒ نے بہت نرم لہجے اور شیریں گفتاری کے ساتھ مسلمان عورت کے فرائض اور اس کی ذمہ داریوں پر روشنی ڈالی۔ اور بتلایا کہ مسلمان عورت کی اصل ترقی یہی ہے کہ وہ اپنے پیٹ سے اور اپنے دودھ سے اسلام کے لیے مجاہد تیار کرے وہ مجاہد بنانے کا کارخانہ ہے خود مجاہد نہیں ہے۔ —— اگر کوئی کارخانہ جس میں بندوقیں اور توپیں تیار کی جاتی ہوں یہ سمجھ کر میدان جنگ میں بھیج دیا جائے کہ اس میں ہزاروں اسلحہ بنانے کی صلاحیت ہے اس لیے یہ دشمن کے خلاف زیادہ موثر ہتھیار ثابت ہوگا۔ تو آپ اس بھیجنے والے کو کیا کہیں گے —— یہی حال مسلمان عورت کا ہے وہ بجائے اچھے مجاہد، اچھے عالم، اچھے ڈاکٹر اور اچھے انجینیر بنانے کے خود میدان کارزار میں آ کھڑی ہو تو پھر کیا مٹی سے مجاہد بناؤ گے —— ؟ پھر صوفی صاحب سے کہا گیا کہ ——

گر پردے میں نکلنے والی عورتوں اور لڑکیوں کو مرد زیادہ غور سے دیکھتے ہیں اور ان میں یہ تجسس پیدا ہوتا ہے کہ معلوم نہیں اس نقاب کے اندر کیسی صورت ہو —— ؟

صوفی صاحب نے فرمایا —— کہ بھئی یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ چلو اچھا برقع اتار دو اب سوال یہ ہے کہ نگاہیں ڈھونڈھیں گی کہ ان کپڑوں کے اندر جسم کیسا ہے؟ تو کون کون سے کپڑے اتروا دو گے —— ؟ آگے فرمایا کہ بیٹا بات یہ نہیں ہے۔ جسے تم پردہ کہتے ہو وہ حقیقت میں پردہ ہی نہیں ہے مجھے دیکھو ساری عمر سفر کیے شہر شہر تبادلوں کی وجہ سے بارہا، اُس وقت بھی سفر کیے جب میری اہلیہ جوان تھیں اور اس وقت بھی جب یہ بچیاں بڑی ہو گئیں لیکن کبھی یاد نہیں کہ کسی آنے جانے والے نے میرے اہل خانہ

کو نظر بد سے یا تجسس کی نگاہ سے دیکھا ہو۔ کیونکہ میری بیوی اور لڑکیاں جو برقعے استعمال کرتی ہیں وہ سفید مارکین کے ہوتے ہیں اور سر سے پاؤں تک ایک ہی غلافت ہوتا ہے پھر ساتھ میں مجھ جیسا شکل وصورت اور وضع قطع کا گھر والا۔ آپ حضرات اپنی بہنوں کو لیکر نکلتے ہیں جھکڑا اور پُرکشش برقعے، خود آپ اپنے کو گھنٹوں جاذب نظر بنانے میں صرف کرتے ہیں اور دوسروں کی شکایت کرتے ہیں یا مذہب کو برا کہنے لگتے ہیں۔ آپ اسلامی صورت، اسلامی لباس کے ساتھ نکلئے اور اسلامی پردہ گھر والوں کو کرائیے پھر اس کے ثمرات دیکھیے۔

نشست تو تقریباً دو گھنٹہ جاری رہی اور صوفی صاحب ہر اعتراض کا ایسا ہی مدلل جواب دیتے رہے یہاں تک کہ سب نے صوفی صاحبؒ سے معافی مانگی اور پھر ان کی ہر مجلس میں پابندی سے شریک ہوتے رہے۔

صوفی صاحبؒ اپنے وسیع مطالعے اور مختلف زبانوں میں پوری دسترس کے باوجود اپنے کو علماء کا محتاج سمجھتے رہے ہمیشہ اپنے مصلحین کو اپنا حال لکھتے اور ہر الجھن میں فتویٰ پوچھتے اور اس پر پوری دلجمعی کے ساتھ عمل فرماتے۔ اور اگر کسی کو کوئی رائے دیدی اور بعد میں اپنی غلطی علم میں آئی تو برملا اپنی رائے واپس لیتے۔

حضرت صوفی صاحب ۱۹۵۲ء میں پرتاپگڈھ میں تھے۔ وہاں مردوں اور عورتوں میں باہم سلام کے مسئلہ پر کسی صاحب نے ان کی رائے سے اختلاف کیا صوفی صاحب نے حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ سے مسئلہ دریافت فرمایا۔ وہاں سے جواب آیا کہ

"ان صاحب کا ٹوکنا بھی برمحل تھا اور آپ کا خیال بھی صحیح ہے۔ علماء نے عورتوں کو سلام کرنے اور ان کے سلام کا جواب دینے کی مطلقاً اجازت نہیں دی۔ بلکہ قید کے ساتھ اجازت ہے کہ بوڑھی ہوں یا فتنہ کا اندیشہ نہو، چونکہ زمانہ فتنہ کا ہے اس لیے اس کو عام نہ کیا جائے اور بہتر یہی ہے کہ خواص بھی اس کو زیادہ وسعت نہ دیں تاکہ عوام کے لیے سد باب ہو جائے۔"

اس خط کے بعد صوفی صاحب نے ان صاحب کو لکھ بھیجا کہ

"عورتوں کو سلام کے بارے میں آپ کا ٹوکنا صحیح تھا اور میں اپنی غلطی کا اقرار

کرتا ہوں"

پرتاب گڑھ ہی میں ایک مرتبہ ایک نشست میں اپنے ایک خورد سے دوران گفتگو حکیم الامت حضرت تھانوی اور جماعت دیوبند ہی کے ایک دوسرے مشہور صاحب ارشاد شیخ طریقت کے اصلاحی طریقوں کا فرق واضح کرتے ہوئے فرمایا "حضرت حکیم الامت خطوط کے ذریعہ اصلاح فرماتے تھے اور اس پر بہت زور دیتے تھے لیکن حضرت...... (فلاں) اپنی بعض مجلسوں میں فرماتے ہیں کہ کہیں خطوط سے بھی اصلاح ہوتی ہے، پھر فرمایا کہ جو شخص خطوط کا لفظ صحیح نہ ادا کر سکے اس کو اعتراض نہیں کرنا چاہئے"

یہ گفتگو صبح ناشتہ پر ہوئی دوپہر کو کھانے پر فرمایا "صبح میں نے...... (فلاں بزرگ اور شیخ) کی شان میں گستاخی کر دی تھی وہ ولی اللہ ہیں، میں ان کی جوتی کی خاک بھی نہیں ہوں، وہ بڑے ہیں اور ان کو حق ہے کہ وہ دوسرے بڑوں سے اختلاف کریں لیکن میں چھوٹا ہوں میں نے کیوں کہا۔ اللہ تعالیٰ معاف فرمائیں، تم بھی معاف کر دینا" اور بواسطہ ان بزرگ کو فوراً پورا واقعہ لکھ کر معافی چاہی اور دعا کی درخواست کی۔

بلرام پور سے حضرت شاہ وصی اللہؒ کو لکھا کہ "ہم اناؤ سے بلرام پور بدلی کر کے پہنچ گئے ہیں کوارٹر سرکاری مل گیا ہے۔ کوارٹر سے مسجد دور ہے۔ اس کا امام جاہل بدعتی بلکہ شرعی اور ظالم ہے۔ صبر وتحمل کے ساتھ اس مسجد سے محروم ہو گیا۔ اب کوارٹر ہی میں نماز ادا کرتا ہوں۔ ایک اور مسجد کا پتہ چلا ہے جو کوارٹر سے اور زیادہ دور ہے لیکن اس کے لوگ اچھے ہیں۔ میں نے اب اسی مسجد میں جانا شروع کیا ہے اس مسجد کے امام ان پڑھ اور غلط خواں ہیں لیکن شرعی فسادی نہیں ہیں جب کہیں معنی میں فساد ہوا تو نماز دہرا لی"

صوفی صاحب نے دریافت فرمایا کہ

منافق اور بدعتی کے پیچھے نماز پڑھنے کے مقابلہ میں گھر میں نماز پڑھنا کیسا ہے۔؟

جواب آیا کہ "کسی فاسق یا مبتدع کو امام بنانا مکروہ ہے باقی اگر وہ خود سے بن جائے اور اس کے معزول کرنے کی قدرت نہ ہو یا فتنہ کا اندیشہ ہو تو نماز پڑھنے والوں پر کوئی گناہ نہیں ہے"

صوفی صاحب نے لکھا کہ "اب ذہن میں کوئی خلش نہیں ہے کیوں کہ میں یہی سمجھتا ہوں کہ ہم سب کا کام فتوی پر سعادت مندی اور سلیم الطبعی سے عمل کرنا ہے نہ کہ نفس کے پیچھے چلنا، ہم سب کی آبرو اتباع ہی میں ہے نہ کہ الگ اپنی آبرو اپنے طور پر قائم کرتے پھرنا اور جاہ طلبی کے پیچھے پڑنا اور

ناک نہ کٹنے کی رسم کو پوجتا۔ حضرات والا کی جوتیوں کے طفیل میں نہایت صاف دلی اور کشادہ دلی سے ہر مسئلہ شرعی پر عمل کے لیے میرا جسم بیری جان تبع و مطیع و منقاد ہے۔

حضرت صوفی جی نے اپنی زندگی میں "انا" اور "فنا" کے درمیان اس قدر توازن قائم رکھا کہ تمام عمر اس میں سرمو فرق نہ آنے دیا۔ وہ جن کے سامنے اپنے کو اس کا اہل سمجھتے کہ ان کی اصلاح کریں اور اپنا مقام ان پر ظاہر کریں اس میں کبھی جھجک اور انکساری سے کام نہیں لیا۔ کبھی کبھی بے تکلف فرماتے کہ —— "میری ہر دعا قبول ہوتی ہے" وہ صاف صاف فرمایا کرتے کہ دعا کی قبولیت کے لیے جتنی اور جو جو شرائط ہیں اللہ کی توفیق سے میں وہ سب پوری کرتا ہوں۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ۔ حق گوئی میں ملامت کرنے والوں کی ملامت کی پرواہ مت کیجیے جس چیز کو آپ حق سمجھتے ہیں اس کا حق یہ ہے کہ اس کا برملا اعلان کیا جائے ورنہ حق کا حق مارا جائے گا۔

صوفی صاحب نے ہمیشہ اپنے ملنے والوں کو ایسی تصنیفات کے مطالعہ سے روکا جن سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی محبت اور تعلق میں کمی آئے اسی لیے وہ مودودی صاحب کی کتابوں کے مطالعہ سے لوگوں کو روکتے اور فرماتے کہ ان کے مطالعہ سے صحابہ کرامؓ کے "عطائی مرتبہ" اور "وہبی مقام" پر سخت اثر پڑتا ہے۔ فرماتے تھے کہ میں "البغض فی اللہ" کے تحت مودودی صاحب کی جماعت پر سخت نکیر کرتا ہوں اور میں انشاء اللہ عند اللہ ماجور ہوں گا۔

بلاشبہ صوفی صاحب کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص معاملہ تھا وہ مستجاب الدعوات بندوں میں سے تھے۔

ایسے بہت سے مواقع آئے کہ بعض اللہ کے بندے کردنی یا ناکردنی میں پھنس گئے اور نجات کی راہ بظاہر بند نظر آئی انھوں نے صوفی صاحب سے دعا کی درخواست کی تو صوفی صاحب نے کبھی بخل سے کام نہیں لیا لیکن سب سے پہلے صاحب معاملہ سے دین کی بنیادی باتوں پر عمل کرنے کا وعدہ لیا اور پھر بڑے ہی اہتمام سے دعا فرمائی اور وہ قبول ہوئی۔ انھیں اللہ سے اپنے معاملہ پر اتنا اعتماد تھا کہ اکثر فراتے تھے کہ میں اللہ کی قسم کھا لوں گا تو اللہ میری قسم پوری فرمائے گا۔ اس کا بھی دیکھنے والوں نے مشاہدہ کیا۔ لیکن مینا کا حال کیا تھا اس کا اندازہ گذشتہ صفحات میں گذرے ہوئے متعدد واقعات کے ساتھ ساتھ اس ایک خط سے مزید ہو جاتا ہے جو انھوں نے اپنے مرشدین و مصلحین۔ حکیم الامت حضرت مولانا

تھانوی، حضرت مولانا محمد عیسیٰؒ اور حضرت مولانا شاہ وصی اللہؒ کے انتقال کے بعد اپنی آخری عمر میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا سہارنپوری مدظلہ کی خدمت میں بھیجا۔

ناظرین یہ پورا خط اور اس کا جواب ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔

۳۰ر شوال ۱۴۰۰ھ

از طرف غلام کفش بردار ناچیز عبدالرب صوفی عفی عنہ۔ بخدمت شریف مخدومی و مطاعی حضرت اقدس جناب شیخ الحدیث صاحب دامت برکاتہم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مجھ کو یقین ہے کہ حضرت والا اس ناچیز کو نام سے پہچان لیں گے تاہم احتیاطاً مختصر تعارف عرض کرتا ہوں۔ میں ۱۹۴۳ء میں تبلیغی جماعت کا امیر بنکر بمعیت مولانا محمد منظور اور علی میاں مدظلہما حاضر خدمت ہوا تھا اور حضرت والا نے مجھ بے استعداد نااہل پر اتنی شفقتیں فرمائی تھیں کہ میں نے اپنی دہقانیت کے سبب آپ کا لقب "والدۂ شفیقہ" تجویز کیا تھا اور یہ لقب حضرت والا کی خدمت میں عرض بھی کر دیا تھا اور حضرت والا کے معارف کو دیکھ کر اور آمد کا شان و گمان نہ پاکر ایک دن بعد عصر حضرت کی خدمت میں یہ سوال بغایت دہقانیت پیش کیا تھا کہ مجھے بھی کیمیا کا نسخہ بتا دیجیے۔ حضرت نے آسمان کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیا تب آنسو گرنے لگے اور مجھ سے فرمایا کہ صوفی صاحب اللہ تعالیٰ نے کیمیا ہی عطا فرما رکھی ہے۔ مجھے حضرت والا کا وہ نقشہ اسی طرح پیش نظر ہے۔ مزید تعارف ایسا عرض کرتا ہوں کہ جو شاید جناب کے علم میں نہ ہوگا وہ یہ کہ میرے والد ماجد علیہ الرحمۃ حضرت تھانویؒ رحمۃ اللہ علیہ کے سب سے پہلے مرید ہیں ان کی بیعت بمقام گڑھی پر موجودگی حضرت مولانا صادق الیقین صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہوئی تھی۔ مولانا صادق الیقین صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے محبوب خلیفہ تھے اور میرے والد صاحب کے یار غار تھے۔ (مولانا) علی میاں کی فرمائش پر میں نے مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی سے اپنے والد صاحب کی بیعت کا تذکرہ لکھا تھا جو (مولانا) علی میاں کی کتاب "تذکرہ شاہ فضل الرحمٰنؒ گنج مرادآبادی" کے زیر عنوان موجود ہے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ گڑھی سے تین میل کے فاصلہ پر میرے گاؤں (اگاسر) تشریف لے گئے تھے۔ والد صاحب

کی یہ بیعت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر دوسری بیعت تھی پہلی بیعت شاہ فضل الرحمٰن صاحب سے تھی۔ میرے موضع پہنچکر حضرت تھانویؒ نے میرے تمام بھائیوں اور بھاوجوں اور میری والدہ کو بیعت کیا تھا۔ میں اس وقت ذی شعور نہ تھا میں جب انگریزی کے آٹھویں درجہ میں پڑھتا تھا تو مجھ کو بھی خطی بیعت سے سرفراز فرمایا تھا۔ میں اس وقت کلاس میں بیٹھکر بھی حضرت کے مواعظ پڑھا کرتا تھا۔ میں چند بار خانقاہ شریف تھانہ بھون میں حاضر ہوا ہوں ایک آدھ بار راستہ میں مظاہر العلوم بھی حاضر ہوا ہوں اور اس وقت جناب کی بھی زیارت کی ہے اور اسی وقت سے آپ کو صورت وسیرت سے مقرب فرشتہ سمجھتا رہا ہوں۔ آپ کا سبز عبا میں ہونا اسی طرح پیش نظر ہے اور میں شروع ہی سے حضرت والا کا عقیدت مند بھی ہوں میرے متعلق عام طور پر جتنی خوش گمانیاں ہیں میں اُسی قدر سیاہ کار اور تباہ حال ہوں۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے میرے عریضہ پر خانقاہ شریف کے اندر یہ تحریر فرمایا تھا کہ تم کو ۱/۲ نسبت حاصل ہو گئی میں نے عرض کیا کہ باقی ۱/۲ کیسے حاصل ہو؟ تو فرمایا تھا کہ خود حاصل ہو جائے گی کام میں لگے رہو اور یہ لفافہ دیتا ہوں انھیں کو اپنا حال لکھو اور ان سے اصلاحی تعلق پیدا کرو۔ مجھ سے زیادہ متبحر اور شفیق ہیں۔ یہ الفاظ مجھ کو بالکل صحیح صحیح یاد ہیں اس لفافہ پر حضرت مولانا سید محمد عیسیٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ (الہ آباد) کا پتہ درج تھا میں نے ان سے تعلق پیدا کر لیا اور موصوف کی وفات تک ان سے خوشگوار تعلق باقی رہا۔ ۱۹۳۷ء میں جب میں حج سے واپس ہوا تو حضرت مصلح علیہ الرحمۃ نے میرے عریضہ پر تحریر فرمایا کہ "میں تم کو تکمیل سلوک کی بشارت دیتا ہوں۔ اور اجازت کے لیے حکمت پیدا ہونے کا منتظر ہوں۔" لیکن میں حضرت والا سے باصد ندامت عرض کرتا ہوں کہ حکمت تو میرے اندر خاک نہ پیدا ہوئی البتہ جو کچھ ان حضرات کی توجہ سے حالت صحیح ہوئی تھی وہ اپنی غفلت کے ہاتھوں بالکل تباہ کر چکا ہوں میں نے حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحبؒ کے بعد مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ سے بھی بیعت کا تعلق پیدا کیا لیکن اب دنیاوی علائق اور جسمانی معذوریوں اور دوسری مجبوریوں کے سبب موصوف کی خدمت میں بہت کم حاضر ہو سکا

بلکہ مدتوں گیا ہی نہیں اب جب کہ بالکل پابہ گور ہوں اور نہایت ضعیف ہو چکا ہوں بالکل خالی ہاتھ اور بالکل تباہ حال ہو کر منزل قبر کا پابہ رکاب مسافر ہوں اور اب نہ میں حضرت والا سے نسخۂ کیمیا کا طالب ہوں اور نہ کسی اور حرص میں مبتلا ہوں بس صرف یہ درخواست پیش خدمت کر رہا ہوں کہ میری نااہلی اور بدحالی کے باوجود مجھے بھی اپنے کفش برداروں میں شامل کر لیں اور اس عریضہ پر درخواست کی منظوری کا مژدہ ثبت فرمادیں یعنی مجھے بھی اپنا مرید بنا لیں۔ مجھے خوب معلوم ہے کہ میں حضرت والا کے مریدوں میں شامل ہونے کے قابل نہیں ہوں لیکن آپ کی شفقت دیرینہ پر بھروسہ کر کے اس درخواست کی جرأت کر رہا ہوں یہ عریضہ میں عزیزی مولوی سید مصطفےٰ رفاعی کو املا کرا رہا ہوں جو ازراہ کرم صرف اپنی زیارت کرانے چند گھنٹے کے لیے تشریف لائے ہیں اور جس زمانہ میں عزیز موصوف حضرت والا کی بارگاہ عالی میں حاضر تھے میں نے تقریباً اسی مضمون کا ایک عریضہ جوابی لفافہ کے ساتھ سپرد ڈاک کیا تھا اب تک جواب نہ آنے سے کبھی خیال گذرتا ہے کہ ڈاک کی خرابی سے وہ عریضہ راستہ میں ضائع ہو گیا اور کبھی یہ خیال آتا ہے کہ حضرت نے اس نااہل کو اپنی مریدی میں لینے کے قابل نہیں سمجھا۔ ادھر مجھ پر ضعف و اضمحلال کا بھی غلبہ ہے اور آنکھیں بھی جواب دے چکی ہیں، مسجد تک کوئی معاون لے جاتا ہے راستہ میں سنبھل کر چلتا ہوں، لڑکھڑا جانے کا اندیشہ رہتا ہے نیز کوئی اچھا رفیق بھی میسر نہیں ہے ورنہ کسی طرح اپنے کو باب عالی تک پہنچاتا۔ اب تو یہ درخواست ہے کہ مجھے داخل سلسلہ فرمالیں اور کچھ ایسے مختصر کلمات بتادیں کہ ان کو رٹتا رہوں۔ اور سکرات کی منزل سے حسن خاتمہ کے ساتھ قبر تک اسی حال میں پہنچوں کہ قبر کو باغیچۂ رحمت پاؤں جس کا اہل نہیں ہوں لیکن آپ کا مرید بن کر انشاء اللہ اس نعمت سے مشرف ہو جاؤں گا۔ اب اتنی طاقت نہیں ہے کہ معمولات پوچھوں اور ان پر مداومت و مزاولت کرتا رہوں ورنہ بغیر اصالۃً حاضر ہوئے تحریری بیعت کی درخواست نہ کرتا اور کیا لکھوں بس سراپا اشتیاق و انتظار ہوں کہ یہ عریضہ بیعت کر لینے کی اور مرید بنا لینے کی اور داخل سلسلہ کر لینے کی خوشخبری لائے ؎ ۔ بر کریماں کارہا دشوار نیست ـــــ اللہ تعالیٰ حضرت والا کے وجود باجود کو

تادیر قائم دائم سایہ فگن اور سلامت باکرامت رکھیں۔ میرا حال بے کم وکاست یہ ہے کہ پیشاب دائی سا تو رہتی ہے پندرہ بیس منٹ کے بعد پیشاب کرتا ہوں۔ شکر آنے کے مرض میں پندرہ سال سے مبتلا ہوں۔ تدریجی ضعف نے بالکل نکما کر دیا۔ کوئی غذا سازگار نہیں ہوتی۔ ایسے حالات میں نہ سفر کے قابل نہ حضر کے بس اپنی ہی بیوی بچوں پوتوں پوتیوں میں پڑے رہنے اور خدمت لیتے رہنے کے سوا چارہ نہیں ہے۔ والسلام مع الادب والاحترام طالب دعا محتاج نگاہ کرم ناچیز عبدالرب صوفی عفی عنہ

۳۰ر شوال ۹۰ھ یا یکم ذی قعدہ۔

جواب از حضرت شیخ الحدیث مدظلہٗ

میں گو رہا رہین ستمہائے روزگار　　لیکن تمہاری یاد سے غافل نہیں رہا

مکرم محترم ذوالمجد والکرم جناب الحاج صوفی عبدالرب صاحب زاد معالیکم۔

بعد سلام مسنون جناب کے گرامی نامہ جس پر تاریخ ۳۰ر شوال یا یکم ذی القعدہ ۹۰ھ لکھی ہے ملا۔ میں تو کئی سال سے نزول آب کی وجہ سے لکھنے پڑھنے سے معذور ہوں تحقیق سے کوئی صحیح بات نہیں معلوم ہو سکی۔ ایک شخص نے بیان کیا کہ تیری سفر حجاز کی روانگی کے بعد آیا تھا اور چونکہ تیری ذات سے متعلق نہ تھا اس لیے جواب نہیں لکھا اور ایک شخص نے بیان کیا اس وقت یہ لکھ کر واپس کر دیا تھا کہ تو سفر حجاز میں گیا ہوا ہے۔ اب کسی کی معرفت دستی آیا ہے بہرحال آپ کا گرامی نامہ ۲۰ر ربیع الثانی ۹۱ھ کو ملا[1] بہت ہی قلق ہوا کہ اگر آپ کا جواب نہیں گیا تو پریشان ہوئے ہوں گے۔ آپ نے بہت اچھا کیا کہ مختصر تعارف کرا دیا کیونکہ عبدالرب نام کے خطوط متعدد آرہے ہیں اور صوفیوں کی کمی نہیں۔ آجکل تو واقعی ان رستے چلتے فقیروں نے بہت بازار گرم کر رکھا ہے جناب کا اتنا ہی تعارف کافی ہے کہ میں تبلیغی جماعت میں مولانا علی میاں اور مولانا منظور نعمانی

---

[1] حضرت صوفی صاحبؒ کا مکتوب حضرت شیخ الحدیث مدظلہٗ کو ۶ مہینے کے بعد اس وجہ سے ملا کہ حضرت شیخ اس زمانہ میں حجاز مقدس میں قیام فرما تھے۔　(الفرقان)

کے ہمراہ آیا تھا۔ وہ سفر تو مجھے خوب یاد ہے آپ کے اس سفر کے اختتام پر تین سوالوں میں سے ایک تو بھول گیا دو خوب یاد ہیں ایک تو وہی جو آپ نے دست غیب کے متعلق کہا تھا مجھے اس کا جواب جو یاد ہے اور خوب یاد ہے وہ اس کے علاوہ ہے جو آپ نے لکھا:

میں نے یہ جواب دیا تھا کہ کوئی چیز پیسے دے کر منگا لی جائے اور یہ نہ کہے کہ یہ چیز چار آنے کی بلکہ یہ کہا جائے کہ دو سیر تو دو نہ ٹھیک سیر دہی کا اور جب کھا لے اور لا دینے والا پیسے کا مطالبہ کرے تو اس کو فوراً ادا کرے اور اگر پاس نہ ہوں تو قرض لیکر ادا کرے۔ غالباً آپ کو بھی یاد آگیا ہو گا۔ دوسرا سوال آپ نے یہ کیا تھا کہ یہ تبلیغ والے یہ کہتے ہیں کہ نہ بیوی کی پروا کرو نہ ماں کی سب کو اللہ کے حوالے کر دو اور نکلو۔ اور مولوی یہ کہتے ہیں۔ حقوق! حقوق!! حقوق!!!۔ تجھے میں نے بہت معتدل پایا تو بتلا ہم کیا کریں؟ ۔۔ میں نے کہا تھا کہ اگر بیوی کو آپ کی ضرورت ہو حفاظت یا اخراجات یا اور کسی ضرورت میں تو تبلیغ والوں کی بالکل نہ مانیو، اور اگر محض خاطر میں دلداری اور دلبستگی میں اہلیہ کا اصرار ہو تو مولویوں کی ہرگز نہ مانیو اور ضرور جائیو، البتہ راستہ سے بیوی کو اور والدہ کو خیریت کے خطوط جلد جلد لکھیں نیز بیوی کو لکھیں کہ تو بہت یاد آرہی ہے، میرے اس سفر کے ثواب میں تو بھی شریک ہے۔ آپ جب لکھنؤ گئے آپ نے اہلیہ سے میرا مضمون دہرایا۔ اہلیہ نے مزے سے کہا "کہاں سے پڑھ کر آئے"؟ آپ نے مجھے یہ قصہ بہت مفصل لکھا تھا اور یہ بھی لکھا تھا کہ مجھے تیرے الفاظ ایسے اچھے لگے کہ تیرے الفاظ میں نے بعینہٖ اہلیہ کو سنا دیے جس پر اس نے کہا: "کہاں سے پڑھ کر آئے؟" اس لیے کہ مجھے تیرے الفاظ بہت اچھے لگے تھے اور ہمارے یہاں اہلیہ کو "تو" نہیں کہتے "آپ" کہتے ہیں۔ اس پر اہلیہ نے کہا کہ "کہاں سے پڑھ کر آئے" اب تو آپ کو یہ پورا قصہ یاد آگیا ہو گا۔ مجھے تو آپ کے یہ دو قصے ایسے یاد ہیں کہ اکثر طلبہ کو بالخصوص تبلیغ اور مولویوں کے اختلاف کو میں خاص طور سے سنایا کرتا ہوں۔ یہ تو آپ کی تمہید کا جواب تھا۔ اس کے بعد آپ کے اصل گرامی نامہ کے متعلق ہے۔

آپ نے مرید ہونے کے متعلق لکھا ہے۔ میں اس مضمون کو سن کر لرز گیا۔ اکابر کے تعلق کے بعد اور ان کے عالی الفاظ کے بعد آپ کے لیے تو یہ لکھنا کفران نعمت ہے اور میرے لیے

گستاخی اور بے ادبی۔ اس کا واہمہ بھی دل میں نہ لائیں لیکن مشورے اور کلمۃ الخیر سے کوئی دریغ نہیں۔ آپ کے موجودہ حالات کے مناسب اب یہ ہے کہ درود شریف چپکے چپکے جس سے دماغ پر بوجھ نہ ہو بہ سہولت جتنا پڑھا جا سکتا ہو ضرور پڑھیں اور ان اکابر میں سے جس کسی نے آپ کے لیے مراقبہ تجویز کر رکھا ہو تو اس کا اہتمام کریں کہ لیٹے لیٹے آنکھ بند کر کے مراقبہ میں کثرت سے مشغول رہیں اور اگر کوئی مراقبہ اب تک تجویز نہ ہوا ہو تو آپ کے حال کے مناسب "مراقبہ دعائیہ" ہے جس کی صورت یہ ہے کہ آنکھیں اور زبان بند کر کے دل میں امت کی صلاح و فلاح کے لیے دعا کریں اس کے بعد اپنے حسن خاتمہ کی دعا کریں اس کے بعد اپنی کوئی دنیوی ضرورت ہو تو اس کی ——— مجھے یاد نہیں کہ اس مضمون کا کوئی خط آپ کا پہلے آیا ہو لیکن چونکہ ۷-۸ برس سے نزول آب میں مبتلا ہوں اس لیے میری ڈاک بھی گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ کوئی ایسا کاتب میسر نہیں آیا جس کے حوالے مستقل کر دوں۔ آپ کی بیماری اور ضعف کا حال سن کر بہت ہی قلق ہوا۔ آپ یہاں ایسی حالت میں بالکل آنے کا ارادہ نہ کریں۔ یہ ناکارہ آپ کے لیے ویسا ہی دعاگو ہے جیسا ۴۳ء میں تھا جبکہ آپ تشریف لائے تھے بلکہ آپ کی عظمت و محبت اس سے زیادہ پاتا ہوں۔ انشاء اللہ آپ کی ذات سے اور اپنے اکابر کے اقدام عالیہ کی برکت سے امید ہے کہ وہ آپ کی مغفرت فرما کر درجات عالیہ نصیب فرمائے گا۔ اس کی زیادہ فکر نہ کریں مانگتے ضرور رہیں میں نے پڑھنے کے لیے لکھ دیا جتنا بھی سہولت ہو سکے۔ درود شریف بھی [illegible] اور خالی اوقات میں مراقبہ بیشتر اسم ذات بھی بہت مختصر ہے۔ درود شریف سے جتنا وقت بچے اس کو اسم ذات میں خرچ کریں۔ آپ نے جو حال اپنا لکھا یہ ناکارہ امراض بدنیہ میں آپ سے بہت آگے ہے آپ کے ساتھ تو پیشاب دانی رہتی ہے اس سیہ کار کے ساتھ پیشاب دانی کے علاوہ پاخانہ کی چوکی بھی ہوائی جہاز اور موٹر میں ساتھ رہتی ہے اس لیے کہ ٹانگ کی چوٹ کے بعد سے اکڑوں نہیں بیٹھ سکتے اور امراض کی کثرت کی وجہ سے پاخانہ بے قابو ہے نہیں آتا تو ۳-۳ دن نہیں آتا اور اگر آتا ہے تو انتظار کی گنجائش نہیں ہوتی ضعف میں یہ ناکارہ بھی شریک حال ہے اور بھوک نہ لگنے کے مرض میں کئی ماہ سے مبتلا ہے۔ اتفاق

سے سید مصطفیٰ رفاعی جنہوں نے آپ کا یہ خط لکھا اور جو کئی ماہ بعد ملا وہ بھی سہارنپور میں ہیں کہ ندوہ کے رسائل کے سلسلہ میں عربی مدارس کا دورہ کرتے ہوئے سہارنپور پہونچے ہیں ان سے اس ناکارہ کے تفصیلی حالات معلوم ہو جائیں گے۔ آپ کے اس لفافہ میں ایک پرچہ مولوی نصیر کے نام بھی ملا جس میں آپ نے "اکمال الشیم" اور "آپ بیتی" بذریعہ وی پی منگانے کو لکھا ہے۔ معلوم نہیں کہ "آپ بیتی" کا ذکر آپ تک کیسے پہنچا اس کے نمبر ۲، ۳ بھی طبع ہو گئے ہیں یہ تینوں رسائل ہیں اور "اکمال الشیم" جو جناب مولوی نصیر کے پرچہ میں منگائی تھی سید مصطفیٰ رفاعی کے حوالہ کر دی ہے کہ وہاں سے آپ کے یہاں آمد و رفت معلوم ہوا ہے کہ زائد ہے اور یہ خود بھی جاتے رہتے ہیں۔

اہلیہ محترمہ اور صاحبزادے اور پوتے پوتیوں سے بھی میرا سلام کہہ دیں۔ یہ ناکارہ ان سب کے لیے دعا کرتا ہے۔　　　فقط والسلام

حضرت شیخ مدظلہٗ بقلم شاہد غفرلہٗ

ان خطوط سے یہ اندازہ واضح طور پر ہو جاتا ہے کہ صوفی صاحب کو اپنے متعلق زندگی کے کسی دور میں بھی اطمینان نصیب نہیں ہوا تھا وہ ما شاء اللہ سب کچھ تھے لیکن اپنے کو کچھ نہیں سمجھتے تھے، انھوں نے جس انداز سے حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم کو خط لکھا وہ ان کی قلبی کیفیت سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے بہت کافی ہے اور اکابر کی نگاہ میں ان کا مقام کیا تھا یہ حضرت شیخ کے جواب سے ناظرین کو اندازہ ہو جائے گا۔

اس سے پہلے بھی صوفی صاحب اپنے اکابر سے ہر ہر قدم پر رجوع کرتے رہے ہیں اور تقریباً سب حضرات کا یہی معمول رہا ہے کہ وہ ان کو پاک طینت، صاف باطن اور حق کا بے لوث اور بے لاگ داعی سمجھ کر ان کے شایان شان جواب دیتے رہے ہیں۔

صوفی صاحب کئی برس باندہ اور اس کے ایک قصبہ کرد ی میں بھی بسلسلۂ ملازمت قیام فرما چکے ہیں وہاں کے قیام کے زمانہ میں بھی باندہ میں ایک بڑا دینی حلقہ قائم ہوا۔

حضرت صوفی صاحب کا دینی حلقوں میں بڑا احترام کیا جاتا تھا وہ اپنے حلقہ تھانہ بھون کے اکابر ہی میں نہیں ہر جگہ بلند سے بلند مقام پر بٹھلائے جاتے تھے۔ وہ حضرت مولانا علی میاں مدظلہٗ کے پاس ہوں یا حضرت

مولانا نعمانی کے پاس، دارالمبلغین تشریف لے جاتیں یا مرکز اصلاح و تبلیغ، ہر جگہ ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا اور ان سے استفادے کے لیے ان کے پاس ایک بھیڑ جمع ہو جاتی۔ اور ہر مشکل میں ان سے دعا کی درخواست کی جاتی۔

حضرت صوفی صاحب کی آخری ملازمت گردی ضلع باندہ میں تھی وہاں سے ریٹائر ہوئے، اور اناؤ میں ایک مکان خرید کر اسی کو اپنی آخری قیام گاہ بنایا۔

حضرت صوفی صاحبؒ کی گھریلو زندگی بھی مثالی تھی وہ ایک مہربان اور فرض شناس شوہر بھی تھے اور اپنے بچوں کے بے حد مشفق باپ بھی۔ ان کا گھر چھوٹی سی جنت بنا ہوا تھا۔

ہندوستان کے جس دور میں ان کے صاحبزادے خالد عمر سن شعور کو پہنچے وہ دینی اعتبار سے ملک کا سب سے تاریک دور تھا کالجوں اور اسکولوں میں پڑھنے والے لڑکے مسلم لیگ کے اثر سے بزرگان دین اور علماء سے ایسے برگشتہ ہو چکے تھے کہ برسر عام گالیاں بکنا اور دین دار صورتوں کو بے آبرو کرنا ان کا سب سے دلچسپ مشغلہ بن گیا تھا۔

اس ماحول میں خالد عمر صاحب نے کالج میں تعلیم پائی اور انجینیرنگ کا کورس کرنے کے لیے وہ علی گڑھ گئے اور وہاں سے فارغ ہوئے لیکن یہ صوفی صاحب کی تربیت کا اثر تھا کہ انھوں نے کبھی کوٹ پتلون تو کیا شیروانی بھی نہیں پہنی حد یہ کہ سردیوں میں وہ ٹھنڈ سہتے پر گرم کرتا زیب تن کرتے تھے علی گڑھ یونیورسٹی میں ان کو ان کی علمی امتیازی صلاحیتوں پر تقریباً سارے ہی وظیفے ملتے تھے اس کے ساتھ ساتھ نظم و ضبط کی سب سے زیادہ پابندی اور نماز کی سب سے زیادہ پابندی کے بھی وظائف انھوں نے ہمیشہ حاصل کیے۔

سیتاپور میں حضرت صوفی صاحبؒ ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ

میرے گھر میں شر کے داخل ہونے کا کوئی راستہ نہیں، باہر میں لیٹا رہتا ہوں اور اندر میری اہلیہ موجود ہیں۔

ایک مرتبہ اپنے مصلح حضرت مولانا محمد عیسیٰؒ کو لکھا کہ "مسجد بالکل متصل ہے نیچے بھی پابند جماعت ہیں اور لڑکیاں تہجد بھی پڑھتی ہیں۔ الحمد للہ گھر کی فضا خانقاہانہ ہے۔ اور دل خوش رہتا ہے۔

حضرت صوفی صاحب کو تبادلہ کے بعد ہر نئے شہر میں مکان کا مسئلہ سامنے ہوتا تھا۔ اکثر یہ ہوا کہ لوگوں نے مکان کی خبر دی مگر یہ بھی کہہ دیا کہ اس میں جنات یا بدروحوں کا اثر ہے صوفی صاحب نے ہر ایسے مکان کو اپنے لیے قبول کیا اور اس میں اپنے اہل خانہ کے ساتھ فروکش رہے۔ اور صبح سے رات تک ذکر اللہ اور نمازوں کی برکت سے گھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آباد ہو گیا۔ ایسے مواقع پر کبھی کبھی صوفی صاحب کو اہل خانہ سے عدم تعاون نہیں ملا بلکہ سب بطیب خاطر ایسے مکانات میں آئے اور خوش خوش رہے۔

حضرت صوفی صاحب کو عملیات میں بھی کافی دخل تھا اور لوگوں نے دیکھا کہ سیکڑوں بندگان خدا نے ان کے ہاتھ سے شفا پائی اور اپنے مکانات سے "اثر" زائل کرا کر اطمینان کی زندگی گذاری۔

انھوں نے اپنی اولاد کی تربیت میں کتنی جانسوزی کی اور کتنا خون جگر جلایا اس کا اندازہ صرف اس سے ہو سکتا ہے کہ جب خالد عمر صاحب اپنی تعلیم کی تکمیل کے لیے علی گڑھ جانے لگے تو صوفی صاحب نے اپنے دل کی ترجمانی چند اشعار میں کی اور اولاد کو یاد کرایا کہ ان کا حال کیا ہے۔ فرماتے ہیں :-

تم علی گڑھ جا رہے ہو اے مرے لخت جگر	مجھکو مارے ڈالتا ہے رنج و فرقت کا اثر
میں نے دو دن کے لیے تا چار رو کا ہے تمھیں	روشنی آنکھوں کی بڑھ جاتی ہے تم کو دیکھ کر
عقل کہتی ہے کہ جانے دو تمھیں لیکن یہ دل	مجھ سے کہتا ہے ابھی جانے نہ دے رخصت نہ کر
دل کا کہنا کر کے قوت سی مجھے حاصل ہوئی	عقل کے کہنے پہ چلتا میں تو روتا رات بھر
اب تمھارے ہجر میں رونا اگر آیا مجھے	دل کو سمجھاؤں گا یہ کہکر اب تو صبر کر

میرے بیٹے میرے پیارے میری آنکھوں کے نور
لخت دل پیوند جاں، لخت جگر، خالد عمر

صوفی صاحب کی نظموں کا ایک بڑا حصہ وہ ہے جو انھوں نے اپنے بیٹوں بیٹیوں اور پوتے کو مخاطب کر کے لکھیں، کچھ نظموں میں خود مخاطب ہیں اور کچھ حسب مرتبہ اہل خانہ کی طرف سے منظوم اصلاحی خطوط کے طور پر لکھی ہیں۔

حضرت صوفی صاحب کو اپنی صاحبزادیوں سے جو لگاؤ تھا وہ دیکھنے کے لیے یہ چند شعر کافی ہیں جو انھوں نے اپنی صاحبزادی کو ان کی سسرال کے لیے رخصت کر دینے کے بعد کہے۔

اے میری حفصہ میری بیٹی میری لخت جگر	باعث تشویش سامانِ تردد درد سر

تو پہنچنے بھی نہ پائی تھی کہ رخصت کر دیا — تاکہ ہو جائے نہ بڑھتی تیرے شوہر کی نظر
دو مہینے رہ سکی وہ بھی علالت میں گئے — تیری صورت یاد آتی ہے تو پھٹتا ہے جگر
ٹھونس آیا ریل کے ڈبہ میں اے بیٹی تجھے — نیند تیرے باپ کو آئی نہ لیکن رات بھر
اُف وہ بیماری کا مارا جسم وہ جاڑوں کی رات — اور تو کرتی رہی سسرال کی جانب سفر

از الہ آباد آ اے دخترک!
جاں فشانم جانِ مادرک!
از دو چشمش چشمہ ہائے خوں رواں
در فراقِ دختر خود نیم جاں

ان اشعار کو پڑھنے کے بعد ایک مشفق باپ کی جو تصویر سامنے آتی ہے اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں، صوفی صاحبؒ نے زندگی پر کتنی مضبوط گرفت رکھی، ہر ہر جزوی بات کا کتنا لحاظ رکھا، کس طرح اپنے گھر کی چمن بندی کی پھر کیسی راحتیں اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا فرمائیں، یہ سب ان کی خدا پرستی اور دعاؤں ہی کا ثمرہ کہا جائے گا۔ وہ بلاشبہ مہد سے لحد تک اپنے بچوں پر متوجہ رہے۔ انھوں نے خالد عمر صاحب کی پیدائش اور ان کے بچپن کی کلکاریوں کو بھی نظم کیا اور والہانہ انداز میں خوب خوب اشعار کہے اور جب میاں خالد عمر صاحب کا پہلا بچہ پیدا ہوا تو دادا کی حیثیت سے کیسے کیسے پھول ان کی نوک قلم سے برسے وہ دیکھنے اور پڑھنے ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہر ہر بچے کی جانب سے الگ منظوم خطوط اور مبارک باد بھیجی لیکن ہر ایک کا مضمون جدا ہوتے ہوئے بھی روح ایک ہی ہے۔

اپنے چھوٹے صاحبزادے صدیق عمر صاحب کی طرف سے جو طویل نظم لکھی اس کے آخری چند شعر یہ ہیں:-

صدیق ہے بندہ تیرا اے قادر مطلق خدا — کرتا ہے تجھ سے یہ دعا یہ چاند یہ رشک قمر
ہے ایک ہلال آرزو ہے ایک نہال آبرو — چڑھتا رہے بڑھتا رہے اوج ترقیات پر
عمر طویلہ طیبہ علم و عمل صدق و صفا — یارب اسے فرما عطا در صدقۂ خیر البشر

صوفی صاحبؒ نے اپنے گھر کے معمولات کا جو نقشہ اپنی بڑی بیٹی حفصہ صاحبہ کی زبان میں نظم فرمایا ہے اس کے پڑھنے سے ان کے گھر کے اندر کا پورا ماحول صاف صاف نظر آتا ہے — اور اس کے بعد۔

اندرونِ خانہ کسی تعارف کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔

نام ہے حفصہ میرا ہم پانچ ہیں بھائی بہن ــ پر دعا ہے، یہ پھلا پھولا رہے یارب چمن
سب سے چھوٹا بوہریرہؓ ہے ابھی دو سال کا ــ بال ہیں سر پر سنہری ریشمی گورا بدن
ماں نے مارے پیار کے یہ بال کترائے نہیں ــ کہتی ہیں دیکھو تو ہے ہر بال سورج کی کرن
شوخ ہے لیکن بڑی سنجیدگی سے بیٹھ کر ــ بات کرتا ہے ادھوری کھول کر پورا دہن

ان اشعار کے بعد کچھ اشعار میں خالد عمر صاحب کا تعارف ہے اور اس کے بعد گھر کا نقشہ۔

آجکل جاڑوں کی راتوں میں وہ رہتی ہے بہار ــ ہم سبھوں پر رشک کرتے ہیں کھلے پھولے چمن
چیختے ہنستے گھڑکتے ہی گذر جاتا ہے دن ــ رات آتی ہے مگر جوں ہی بدل کر پیرہن
بعدِ مغرب بیٹھ جاتے ہیں کتابیں لے کے ہم ــ اور ابا جان بن جاتے ہیں صدرِ انجمن
والدہ کو دیکھ کر لیٹے ہوئے زیرِ لحاف ــ کہہ یا کرتے ہیں ابا جان ہنس کر یہ سخن
اوا ے نند یا سلا جا دونوں دیدے پھوڑ جا ــ سن کے کہتی ہیں ماں اے ہے بڑے اچھے سخن
کیوں ہماری پھوٹیں آنکھیں لو بڑے آئے بزرگ ــ آپ کو آخر ہمارے لیٹنے سے کیا جلن
بعدِ مغرب سے عشا کے وقت تک ہم سب کے سب ــ بیٹھتے ہیں آجکل یوں ہی جما کر انجمن
یہ کہا کرتے ہیں ابا جان سونا ہے منع ــ پڑھ نہ لیں جب تک عشا میں ہم نماز ذوالمنن
بعدِ اذاں پھر بات کرنا بھی خلافِ شرع ہے ــ چاہیئے سو جائیں فوراً ہیں یہ نیکوں کے چلن
رات کے پچھلے میں پھر والد اٹھاتے ہیں ہمیں ــ واہ وا ہوتے ہیں پھر انوار کیا جلوہ فگن
پہلے میں اٹھتی ہوں پانی گرم کرنے کے لیے ــ بعد ازاں پھر دھیرے دھیرے دوسرے بھائی بہن
والدہ اٹھتی تو ہیں لیکن بڑے ساان سے ــ کیونکہ ہو جاتے ہیں فوراً بوہریرہ نغمہ زن
ان کو جب خاموش کراتی ہیں تب اٹھتی ہیں ماں ــ کیونکہ لگ جاتی ہے ان کو بھی تہجد کی لگن
جب اٹھی ہو تم تو پڑھ لو چار چھ رکعت نماز ــ ان سے ابا جان فرماتے ہیں جبکہ یہ سخن
کچھ نمازیں پڑھ کے وہ ہو جاتے ہیں مشغولِ ذکر ــ اور ہم شیرینیٔ قرآن سے شیریں دہن
ہم بھی اٹھتے ہیں نمازِ فجر کو یہ دیکھ کر ــ صبحِ صادق کا فرشتہ ہو گیا جلوہ فگن

ملہ بھائی صدیق عمر کی کنیت

صبح کو مسجد کو جب جانے لگے ابا میاں — ایک جذبہ سے کیا خالد عمر سے یہ سخن
تو اگر فرزند ہے میرا تو اے جان پدر — اور کچھ بن یا نہ بن اسلام کا فرزند بن
یہ پسندیدہ عرفیت ہے[1]، نام ہے خالد عمر — لاج ان ناموں کی رکھنی ہے تجھے اے جان من
تجھکو اگر اسلام پر مرنا ہے تو زندہ رہے — جامۂ ہستی سے ورنہ ہے تجھے بہتر کفن
دھوم رہتی ہے خدا کے فضل سے اشراق تک — صبح سر تا حشر تک یارب رہے سایہ فگن

حضرت صوفی صاحب نے تمام عمر معاملات کو بے حد صاف رکھا وہ ہر ایک کا حساب آنہ پائی کے ساتھ کرتے تھے۔ آخری عمر میں ذیابیطس نے ان کو گھلانا شروع کر دیا تھا بینائی بھی دھیرے دھیرے ختم ہو گئی تھی لیکن اپنے مشن اور فرائض سے حتی المقدور کبھی پہلو تہی نہیں کی۔

ایک زمانہ میں صوفی صاحب نے خواہش کی تھی کہ جب ان کا انتقال ہو تو ان کو کرسی (ضلع بارہ بنکی) کے قبرستان نجاتیہ میں دفن کیا جائے، اور مولانا واثق الیقین صاحب نے اپنے اور صوفی صاحب کے لیے تدفین کی جگہ بھی تجویز فرمادی تھی اور اس کے بارے میں اجازت نامہ لکھ کر بھی صوفی صاحب کے حوالہ کر دیا تھا۔ لیکن، وقت موعود آنے سے کچھ پہلے یہ سوچ کر کہ یہ سنت کے خلاف ہوگا اور میت کی منتقلی میں لوگوں کو زحمت بھی ہوگی، اناؤ ہی کے ایک قبرستان میں دفن کیے جانے کی وصیت فرمادی تھی جیسا کہ آگے درج ہونے والے وصیت نامہ میں بھی مذکور ہے۔

ناظرین خود دیکھیں گے کہ صوفی صاحب نے اس وصیت نامہ میں اپنی زندگی کے معاملات اور معمولات کو پوری طرح سمو دیا ہے، سنت و شریعت کی پابندی، معاملات کی صفائی، فرائض کی ادائگی انکسار اور اولاد کا خیال سب کچھ اس دل نشیں وصیت میں موجود ہے۔

حضرت صوفی صاحب نے اپنے آخری ایام میں اپنے احباب اور رفقا، کو جتنے بھی خطوط لکھے ان میں اشتیاق ملاقات کا ذکر فرمایا اور یہ بھی تحریر فرمادیا کہ اب نہ آئے تو انشاءاللہ جنت میں ملاقات ہوگی۔

حضرت صوفی صاحب رح نے ۲۴ و ۲۵ محرم ۱۳۹۵ھ جمعرات و جمعہ کی درمیانی شب میں انتقال فرمایا اور ۲۵ محرم مطابق ۷ فروری ۱۹۷۵ء بروز جمعہ ان کی وصیت کے مطابق نتن صاحب کے قبرستان میں تدفین ہوئی، غسل اور تکفین کے فرائض اناؤ کے مقامی حضرات نے ادا کیے، جو صوفی صاحب کی نظر میں

---

[1] بھائی خالد عمر کی کنیت اور عرفیت

صالح اور متقی حضرات تھے اور جن کے بارہ میں صوفی صاحب نے وصیت فرمادی تھی۔ نماز جنازہ حضرت مولانا محمد منظور نعمانی نے پڑھائی۔

— آسماں اُن کی لحد پر شبنم افشانی کرے

اب ہم حضرت صوفی صاحب کے اس مختصر تذکرہ کو اُن کے وصیت نامہ پر ختم کرتے ہیں۔ بلاشبہ اس وصیت میں کبھی ہر صاحب ایمان کے لیے رہنمائی کا پورا سامان ہے ان فی ذالک لذکریٰ لاولی الالباب ہ

حضرت صوفی صاحب کی وصیت

۱۔ جس وقت میرا انتقال ہو جائے فوراً ا یکسچینج جاکر بذریعہ ٹرنک کال حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کو اطلاع کریں اور ان سے بات کر کے ان کی تشریف آوری کا انتظار کریں تاکہ جب وہ مع دو تین حضرات کے تشریف لائیں تو وہی حضرات مجھے غسل میت دیں۔ وہی کفن پہنائیں وہی قبر میں اتاریں۔ اگر مولانا نعمانی صاحب نہ ملیں تو مولانا عتیق الرحمٰن صاحب سلمہٗ سے بات کریں اگر وہ بھی نہ ملیں تو وہ ٹرنک کال کر کے حافظ محمد اقبال صاحب کو بلائیں جس سے بات کریں اس سے یہ بات صاف کرلیں کہ وہ حضرات کس وقت پہونچیں گے۔ کون کون حضرات آدیں گے آنے والے حضرات کو دو طرفہ کرایہ دیا جائے۔ چار سے زیادہ حضرات کو آنے سے روک دیا جائے۔ حضرت مولانا نعمانی یا ان کے بجائے جو آوے وہی میرے جنازے کی نماز پڑھائے[1]۔

۲۔ میرے حج کے احرام کی جو چادر محفوظ ہے کفن کے تین مسنون کپڑوں میں سے کفنی اُسی کی دی جائے۔

۳۔ قبر کی جگہ عزیزم عبدالرحمٰن سلمہٗ اور بھائی رونق علی صاحب مدظلہٗ کے انتظام سے طے

[1] اللہ کی مشیت کہ جس وقت رات میں حضرت صوفی صاحب کا انتقال ہوا ان کے چھوٹے صاحبزادے صدیق عمر صاحب گھر پر موجود نہیں تھے، وہ صوفی صاحب کی دوا لینے کے لیے لکھنؤ آئے ہوئے تھے صبح کو وہ اناؤ واپس ہوئے اس لیے حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کو صوفی صاحب کے انتقال کی اطلاع بہت دیر کے بعد ہو سکی۔ اور وہ نماز جمعہ کے وقت وہاں پہنچ سکے۔ غسل اور تکفین میں مولانا نعمانی اور لکھنؤ کے دوسرے حضرات شریک نہ ہو سکے جس کا حضرت مولانا نعمانی کو بہت قلق اور افسوس رہا اور شاید ہمیشہ رہے گا۔ لیکن اللہ کی مشیت یہی تھی۔ اناؤ کے اُن دوستوں نے غسل دیا جن کا حضرت صوفی صاحب سے دینی تعلق تھا اور جن کو حضرت صوفی صاحب نے آخری دنوں میں اس کی زبانی وصیت بھی فرمائی تھی۔

کی جائے۔ (انھوں نے ایک قبرستان کی نشاندہی کر دی تھی اور قبرستان کے مالک نے اجازت بھی دیدی تھی)۔

۴۔ میرے مرنے کے سلسلے میں کوئی کام خلاف سنت ہرگز ہرگز نہ کیا جائے۔

۵۔ میرے مرنے کے بعد جس کو مجھ سے محبت ہو وہ "قل ہو اللہ" شریف پڑھ پڑھ کر بخشے یا جتنی تلاوت کر سکے یا جو صدقہ کر سکے۔ اور میرے لیے استغفار کرے اور میرے لیے دعائے مغفرت کرے۔

۶۔ میرا ترکہ بالکل موافق شریعت جلد از جلد تقسیم کر دیا جائے۔ جو کتابیں خالد عمر کی خریدی ہوئی ہیں وہ میرے پاس عاریۃً ہیں میری ملک نہیں ہیں خواہ کورس کی ہوں، خواہ دینی ان کو خالد عمر کو واپس کر دی جائیں۔

۷۔ اگا سر کی جو جائداد ہے اس کو بھی موافق شریعت تقسیم کر دیا جائے۔

۸۔ کسی چیز کی تقسیم کے وقت تراضی ورثا سے چیزوں کا ادلنا بدلنا چیزوں کے بالعوض روپیہ لینا دینا ہو سکتا ہے یہ بات ورثا کے پسند کی ہے۔

۹۔ میرے عزیز از جان لخت جگر خالد عمر سلمہٗ کو فوراً پریشان نہ کیا جائے نہ ان کو کوئی تار دیا جائے بلکہ بعد دفن کر چکنے کے اطمینان سے خط لکھ دیا جائے۔

۱۰۔ اولاد سے بہت کچھ امیدیں ہیں وہ اپنے مال کا خود ہی خیال رکھیں گی اس کے لیے کچھ نہیں لکھتا۔ فقط عبدالرب عفی عنہٗ۔

حضرت صوفی صاحبؒ ایک باکمال اصلاحی شاعر

حضرت صوفی عبدالرب صاحب صوفیؒ کو جن لوگوں نے دیکھا ہے وہ صرف ان کی صورت دیکھ کر ہر بات تسلیم کر سکتے ہیں لیکن یہ باور کرنا ان کے لیے انتہائی مشکل ہے کہ وہ شاعر بھی تھے۔ اور شاعر بھی ایسے کہ صرف موزوں طبع یا تک بند نہیں بلکہ انتہائی بلند پایہ اور باکمال شاعر۔

غالباً حضرت صوفیؒ کا کچھ کلام کبھی کبھی الفرقان ہی میں شائع ہوا ہے۔ وہ بھی خصوصاً حج کی کیفیات اور واردات سے متعلق۔ دراصل وہ اپنی اس خصوصیت کو اس قابل ہرگز نہیں سمجھتے تھے کہ اسے قابل فخر یا قابل ذکر کوئی چیز سمجھیں۔

حضرت صوفی صاحب کا کلام سینکڑوں صفحات میں محفوظ ہے جس میں شاعری کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی گئی ہے۔ انھوں نے حمد باری اور نعت و سلام پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ غزلیں اور رباعیاں بھی کہی ہیں گیدی اور سہرے بھی کہے ہیں۔ منظوم اصلاحی خطوط بھی لکھے ہیں۔ تاریخی واقعات کو بھی نظم کیا ہے، مناظرے بھی کیے ہیں اور راہ بیت اللہ کے مسافروں کے لیے بھی زادِ راہ کا ایک بڑا ذخیرہ بھی نظم کر دیا ہے۔ لیکن اس میں سے کچھ بھی انھوں نے ناموری جھوٹی واہ واہ یا شہرت کے لیے نہیں کہا بلکہ ان کے سامنے ہر شعر کہتے وقت ایک پاکیزہ مقصد ہوتا تھا اور وہ تھا مخاطب کی اصلاح و تربیت۔

حضرت صوفی صاحب کے کلام کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اگر صرف شاعری پر اکتفا کر بیٹھتے تو اس دور کے خدا جانے کتنے بڑے بڑے شاعروں اور اساتذہ کا چراغ گل ہو جاتا۔ ان کے کلام میں بے ساختگی اور بے پناہ آمد ہر ہر شعر سے جھلکتی ہے۔ کلام کے بیشتر حصہ کو پڑھنے سے محسوس ہوتا ہے جیسے ان پر اشعار کی بارش ہو رہی ہے اور وہ صرف قلم اور کاغذ پر انھیں پروتے چلے جا رہے ہیں۔

صوفی صاحب کی ہر نظم طویل ہی نہیں، انتہائی طویل ہے لیکن عیوب شاعری سے بالکل پاک۔ نہ بھرتی ہے نہ تکرار اور نہ الفاظ کا ثقل۔ ان کے یہاں سبک روی بھی ہے اور تیز گامی بھی، جمال بھی ہے اور جلال بھی، نغمگی بھی ہے اور گھن گرج بھی۔ ان کا مخاطب کوئی بھی رہا ہو خواہ مرد مومن ہو یا عام مسلمان، مرد ہو یا عورت، خواص ہوں یا عوام، مسند شادی پر بیٹھے دولھا دلھن ہوں یا پالنے میں جھولتا ہوا شیر خوار وہ اسے ایک ہی پیغام دیتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ

تجھ کو گر بننا ہے کچھ اسلام کا فرزند بن

صوفی صاحب نے اپنے احباب کے لیے فرمائشی شعر بھی کہے شادی کا سہرا بھی کہا اور موت کا نوحہ بھی بزنگی اور بھی نظم کی اور بیداری کا صور بھی پھونکا لیکن شاعری کے متعلق اپنے بارے میں جو انھوں نے فیصلہ فرمالیا تھا اس سے ایک انچ نہیں ہٹے ——— شاعری کے متعلق حضرت صوفی کا نظریہ یہ تھا کہ ؎

کام کے اشعار کہہ، صوفی کہ ہے درکار کام
داغ کی غزلیں اگر تو نے بھی دہرائیں تو کیا

حضرت صوفی رح کا کلام دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا اپنا ایک مخصوص رنگ تھا جو ان کے مزاج اور ان کی زندگی کی طرح بالکل منفرد تھا لیکن وہ علامہ اقبال رح کے بہت ہی مداح تھے اس لیے ان کی شاعری میں اگر کسی کا رنگ جھلکتا ہے تو وہ صرف علامہ کا، ورنہ ان کے شعر کی شستگی اور شگفتگی معرفت اور والہانہ پن بے ساختگی اور بے پناہی کی مثال ملنا مشکل ہے۔

صوفی صاحب رح کی زندگی سرکاری ملازمت کے ساتھ جیسی دعوت و تبلیغ اور رزم آرائیوں و بزم آرائیوں میں گذری اس میں اتنی فرصت اور گنجائش کہاں تھی کہ وہ چند نظموں اور غزلوں سے زیادہ طبع آزمائی کر سکتے۔ لیکن انھوں نے دفتر کے دفتر کہہ ڈالے ہیں جسے دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاید صوفی صاحب رح نے ساری عمر شاعری کے علاوہ اور کچھ نہیں کیا۔

ان کے کلام کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ اللہ نے ان کے ساتھ بڑا ہی خاص معاملہ فرمایا۔ ان کو عظمت اور شہرت کے ساتھ گھر کا سکون بھی دیا اور فارغ البالی بھی اور سب سے زیادہ یہ کہ ان کے وقت میں بڑی ہی برکت عطا فرمائی۔

حضرت صوفی صاحب رح کے متعلق مختصر لکھنے سے زیادہ مشکل کام ان کے کلام کا انتخاب ہے۔ اس لیے کہ کنکر پتھر کے ذخیرہ سے موتی رولنا تو بے شک آسان ہے لیکن موتیوں کے انبار میں سے موتیوں کا انتخاب کرتے وقت جوہری کو بھی پسینہ آجاتا ہے صوفی صاحب رح کے کلام کا جو انتخاب نذر ناظرین ہے اسے انتخاب نہ سمجھا جائے بلکہ ان کے کلام کا نمونہ یا تعارف تصور کیا جائے اسی لیے ان کے مجموعہ میں سے ایک حمد، ایک نعت چند نظمیں اور غزلیں دیدی گئی ہیں تاکہ ان کی رنگا رنگ طبیعت کی ترجمانی کا کچھ حق ادا ہو سکے ——— حضرت صوفی صاحب رح کا کلام بلا شبہ اس قابل ہے کہ اس کی اشاعت میں اب تاخیر نہ کی جائے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں اسے بے شک غیر موزوں سمجھا لیکن ان کے بعد اس کی اشاعت سے نہ صرف اصلاحی لٹریچر میں ایک قابل قدر اضافہ ہوگا بلکہ شعری ادب میں اس کی حیثیت ایک سنگ میل کی ہوگی۔

زباں کھولے اگر شاعر سخن اعجاز ہو جائے
بیانِ پر اثر پیغمبری اعجاز ہو جائے (صوفی رح)

حمد

اے خدا تیری مہک پھیلی ہے گلزاروں میں — اے خدا نور چمکتا ہے ترا تاروں میں

نام رٹتا ہے ترا باغ میں پتہ پتہ — سنگریزے ترا دم بھرتے ہیں کہساروں میں

خشک صحرا میں ترے نام کی خاموشی ہے — اور رونق ہے ترے کام کی بازاروں میں

نہیں تسبیح میں مصروف فقط غنچہ و گل — اے خدا تذکرہ ہوتا ہے ترا خاروں میں

لہلہاتے ہوئے پودوں میں تری شادابی — اور خشکی ہے تیری سوکھے ہوئے خاروں میں

دودھ پیتے ہوئے بچے بھی نہیں ہیں خاموش — تری معصوم ثنا خوانی ہے گہواروں میں

لال چہرے میں مجاہد کے جھلک ہے تیری — اور چمک تیری ہے چلتی ہوئی تلواروں میں

لیکے آتے تھے ملائک تری نصرت کی نوید — غزوۂ بدر کے دن تیغ کی جھنکاروں میں

دھاک بیٹھی ہے غلامان نبی کی تیرے — آج بھی سارے زمانے کے جہانداروں میں

تھی ترے نام کی شوکت ترے اسلام کی شان — اے خدا خالد و فاروق کی للکاروں میں

تیرے موسیٰ کی جلالت کا مرقع دیکھا — قصر فرعون کی ٹوٹی ہوئی دیواروں میں

اے خدا صوفیؔ مسکیں سے کبھی راضی ہو جا

وہ بھی ایک عمر سے ہے تیرے طلبگاروں میں

جلوۂ نور

میں نور کے تڑکے میں جب وقت اُٹھا سو کر — اللہ کی رحمت کے دروازے کھلے پائے

آئی یہ ندا پیہم جو مانگنے والا ہو — ہاتھ اپنے عقیدت سے آگے میرے پھیلائے

جس جس کو گناہوں سے بخشش کی تمنا ہو — وہ اپنے گناہوں کی کثرت سے نہ گھبرائے

وہ مائل توبہ ہو میں مائل بخشش ہوں — میں رحم سے بخشوں گا وہ شرم سے پچھتائے
جو رزق کا طالب ہو میں رزق اسے دوں گا — جو طالب جنت ہو جنت کی طلب لائے
وہ کشت طلب بوئے میں بارش رحمت ہوں — میں دیکھ نہیں سکتا کھیتی کوئی مرجھائے
یہ سن کے ہوئے جاری آنکھوں سے مری آنسو — قسمت ہے نصیبہ ہیں رونا جسے آجائے
وہ کافر نعمت ہے جو نیند میں غافل ہو — جب نور کے تڑکے میں اللہ یہ فرمائے
یہ نور کا عالم ہے در کھول دے رحمت کے — جھونکے جو ادھر آئے جنت کی ہوا لائے
اک غنچہ لب بستہ کھل جائے مرے دل کا — پھوٹے وہ مہک اس سے جو روح کو مہکائے
بھر دے جو رگ و پے میں سرمستی و ہشیاری — ہو کام وہی مجھ سے جو تجھ کو پسند آئے
میثاق محبت کی تجدید کا طالب ہوں — پھر سوز وہ دے مجھ کو جو روح کو تڑپائے
آقائے گدا پرور سائل ہوں ترے در پر — میں اور تو کیا مانگوں بس تو مجھے مل جائے
اے ابر کرم میری سوکھی ہوئی کھیتی ہے — گلزار تمنا پر رحمت کی گھٹا چھائے

صوفی ہے ترا بندہ غفلت سے ہے شرمندہ
حاضر ہے ترے در پر سر شرم سے نہوڑائے

لا الٰہ الا اللہ

خدا کے عاشقو! شمع نبیؐ کے پروانو! — خدا کے مست حبیب خدا کے دیوانو
خدا کے دین کے شیدائیو! مسلمانو — پھر اپنا مرتبہ اپنی شان پہچانو

تمہارے ہاتھ میں ہے دامن رسول اللہ
عطا ہوا ہے تمہیں لا الٰہ الا اللہ

غضب ہے اپنی امامت کا راز بھول گئے — زمیں پہ اپنی خلافت کا راز بھول گئے
ارے خدا کی عبادت کا راز بھول گئے — رسول پاک کی الفت کا راز بھول گئے

جنہیں کہ راہ دکھاتے وہ ہو گئے گمراہ
کہ خود ہی بھول گئے لا الٰہ الا اللہ

زمانہ کہتا ہے تم سے کہ اب نہ دیر کرو　　بس اب خدا کے لیے خواہشوں کو زیر کرو
دہل رہے ہیں جو دل ان کو پھر دلیر کرو　　خدا کے شیر ہو پھر اپنے دل کو شیر کرو
بہت قریب ہے منزل بہت انوکھی راہ
ہے رہبری کے لیے لا الٰہ الا اللہ

خدا کے چاہنے والو خدا کا کام کرو　　پھر اپنے اٹھ کے سنبھلنے کا انتظام کرو
جو غفلتیں ہیں پھر ان غفلتوں کو رام کرو　　تم اپنے نفس کو پھر دور سے سلام کرو
یہ پھر سے عہد کرو کہ اب نہیں کریں گے گناہ
پھر ایک دل سے پڑھو لا الٰہ الا اللہ

تمہیں بتاؤ کرے کون مسجدیں آباد　　نبی کے حکم سے تم جب ہو گئے آزاد
تمہیں بتاؤ کہ پھر اور کون ہو برباد　　خدا کے دین پہ جب کر رہے ہو خود بیداد
خدا کے دین سے غافل ہوئے خدا کی پناہ
اگرچہ پڑھ بھی چکے لا الٰہ الا اللہ

اذان کون کہے تم تو گھر میں سوتے ہو　　نماز کون پڑھے تم تو کھیت بوتے ہو
درود کون پڑھے تم تو وقت کھوتے ہو　　میرے عزیزو! بھلا کیوں خراب ہوتے ہو
بدن تمہارا ہو ناپاک اے عزیزو آہ
تمہارے ہاتھ میں ہے لا الٰہ الا اللہ

گھروں میں اپنے شریعت کی دھوم دھام کرو　　خدا کے دین پہ چلنے کا اہتمام کرو
ڈرو خدا سے گناہوں کی روک تھام کرو　　خدا کا ذکر شب و روز صبح و شام کرو
یہ ہل یہ بیل یہ کھیتی ہے سب نجات کی راہ
اگر زباں پہ رہے لا الٰہ الا اللہ

عشاء بغیر پڑھے سو رہو نہ تم پڑ کے　　نماز فجر کی عادت کرو اٹھو تڑکے
تمہارے ساتھ نمازوں میں ساتھ ہوں لڑکے　　کہ پیڑ ہو نہیں سکتا بلند بے جڑ کے
دکھاؤ پہلے سے بچوں کو دینِ پاک کی راہ

ابھی سے دل میں جمے لا الٰہ الا اللہ

تمھیں دیا ہے خدا کے رسول نے قرآں ، تمھیں دیا ہے خدا نے زمانہ کا فرماں
بہت بڑی ہے خدا کے یہاں تمھاری شان ، مگر غضب ہے کہ تم خود ہو بے سروساماں

تم اپنی نسل کو قرآں سے کرو آگاہ
کہ وہ سمجھ تو سکیں لا الٰہ الا اللہ

تمھیں صحیح طریقہ بتائے جاتے ہیں ، تمھیں فلاح کی راہ دکھائے جاتے ہیں
تمھیں نجات کا کلمہ پڑھائے جاتے ہیں ، تمھیں رسول کا پیرو بنائے جاتے ہیں

ہم آکے جائزہ پھر لیں گے! فی امان اللہ
پھر ایک بار پڑھو لا الٰہ الا اللہ

رسول عربیؐ

ہر بن مو ہے ثنا خوان رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم
گو ثنا سے ہے شان رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم

دل و جان دونوں ہیں قربان رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم
ہائے یہ بھی نہیں شایان رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم

جس کی قیمت ہے دو عالم وہ سکوں ہے کیا چیز
صدقہ موئے پریشان رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم

کوئی یونان سے، ایران سے، روما سے سُنے
شوکت و شان دلیران رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم

خام دیوار، چٹائی کی چھتیں فرش زمیں
بادشاہو، یہ ہے ایوان رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم

سیکھ لی سارے زمانے نے اخوت ان سے
سارے عالم پہ ہے احسان رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم

ساری دنیا کے ضعیفوں کے محافظ ہم ہیں
ہم مسلمان ہیں غلامانِ رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم

ہفت اقلیم کو ٹھکرائیں وہ استغنا ہے
اے زہے شانِ گدایانِ رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم

بنے شاہانِ جہاں اونٹ چرانے والے
تھے جو طیبہ میں غلامانِ رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم

اے خدا حشر کے دن عرش الٰہی کے تلے
سر پہ ہو سایۂ دامانِ رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم

ہدیۂ تبریک حج

اے عازمِ حج منزلِ بطحا کے مسافر
الفت کے دھنی گنبدِ خضرا کے مسافر

اے میرے برادر! مرے محبوب مرے دوست
تو مغز ہے میں قشر ہوں تو جان ہے میں پوست

میں عامی بے علم ہوں تو حبر..... گرامی
ہستی مری ناچیز تری ذات ہے سامی

میں کفش ترے چھونے کے قابل بھی نہیں ہوں
تو صدر ہے میں درخورِ محفل بھی نہیں ہوں

تو عازمِ کعبہ ہے خوشا تیرا مقدر
حج کر کے مبارک ہو تجھے بزمِ پیمبر صلی اللہ علیہ وسلم

میں! کوئی پیام! اور تجھے دوں! اے مرے مخدوم
معلوم مجھے کیا ہے تجھے کیا نہیں معلوم

محبوب ہے کتنی تری بیتابیٔ دل بھی
اس گل کی مہک سے متاثر ہو یہ گل بھی

تسلیمِ محبت سے تجھے بھی کوئی جرعہ
اس دولتِ سرمد سے مجھے بھی کوئی حصہ

بے صبر وہی ہے کہ جو عارف ہے ولی ہے
ہر ایک سے سائل ہے کدھر ان کی گلی ہے

اس پرسشِ معلوم میں ہے لذتِ تکرار
ہے قندِ مکرر سے سوا تذکرۂ یار

اے دوست مبارک ہو تجھے دردِ نہانی
ہے حج کا بیاں سوزِ محبت کی کہانی

افسوس کہ ہستی ہے مری دانۂ اسپند
کس طرح سے ان شعلوں کو شیشے میں کروں بند

قرطاس پہ کس طرح بکھیروں یہ شرارے
اس فرش پہ رکھتے ہیں کہیں عرش کے تارے

ایک بات اگر تجھ سے کہوں گا میں زبانی — کاغذ کو جلا دے نہ مری شعلہ بیانی

اجمال کی تنگی میں سماتے نہیں اسرار — تفصیل سے عاجز ہے مری وسعت اشعار

کیا ظرف ہے شاید کہ چھلک جائے پیالہ — ڈرتا ہوں کہ یہ نظم نہ بنجائے رسالہ

میں ہدیۂ تبریک یہ کرتا ہوں قناعت — سو بار مبارک ہو تجھے حج و زیارت

کعبہ کے تصور میں جو پر تول رہا ہے — اے طائر قدسی مرا دل بول رہا ہے

قابل بھی بناتے ہیں وہ کرتے ہیں دہش بھی — دیتے ہیں وہی دل دبی دیتے ہیں خلش بھی

کھینچا ہے جو تجھ کو کشش خاص نبی نے — مشغول کو تجھ سے جو بلایا ہے مدینے

لیتا ہے ترا سر تیری گردن تری جاں مول — اے طائر شوق اڑ کے پہنچنا ہے تو پر کھول

بخشیں گی تجھے امر جہانگیر کی طاقت — اب پھر ہے زمانہ کو مجدد کی ضرورت

یہ عہد بلاخیز ہے اکبر کا زمانہ — دہرائے گا پھر سے مجدد کا فسانہ

پھر عام ہوئی قومیت و وحدت دینی — توحید کے اعیان کی الحاد گری سے

سموتا ہے ہر سمت سے فریاد مجدد — فیضی و ابوالفضل ہے اولاد مجدد

جس راہ پہ تو گامزن اے مرد جری ہے — امت کے لیے خیر تری ہم سفری ہے

ہر چند ترے جد کی گلشن میں نئی ہے — اس فصل میں ہو جائے گی پوری جو کمی ہے

ہے موسم حج فصل بہار چمن عشق — اس فصل میں سرسبز ہیں کوہ و دمن عشق

اس راہ پہ چل کر وہ ملے گی تجھے منزل — کھل جائے گا سینے پہ ترے راز و رتل

وہ راہ دکھا کر تجھے فرمائیں گے اب چل — دو پاؤں ترے ہوں گے 'توکل' و 'تبتل'

پامال سی ہے گرد جہاں لومۃ و لائم — کر دینگے پکڑ کر تجھے اس راہ پہ قائم

اس بزم میں توحید کا وہ جام ملے گا — آلام کے بڑھ جانے سے آرام ملے گا

ہرگز تیری توحید نہ ہوگی متاثر — ہوگا متزلزل نہ ترا عزم فاَنذر

توہیئت طاغوت سے مرعوب نہ ہوگا — کچھ جز غم جاناں تجھے مرغوب نہ ہوگا

احباب نہ اغیار تجھے توڑ سکیں گے — رہبان نہ احبار تجھے موڑ سکیں گے

آواز کو کر دینگے تیری صور سرافیل — بخشیں گے تجھے پائے نبی بازوئے جبریل

اس بزم کی جانب جو چلا ہے دل صافی
بن جائے جو چلتے تو یہی جہد ہے کافی

بجھ عاجی بے علم سے چلتے نہ بنا تھا
لیکن دل صوفی پہ یہی راز کھلا تھا

جب تک نہ ہو توفیق خدا شامل و رہبر
اس راہ میں سب عالم و عالی ہیں برابر

اللہ سے ڈر طالب توفیق خدا ہو
اخلاص سے الحاح لیے مشغول دعا ہو

اس راہ میں اے دوست 'دعا' راہ نما ہے
یا 'فکر' کلید در توفیق خدا ہے

بے فکر کہ توفیق الٰہی نہیں ملتی
چلتا ہے مگر منزل شاہی نہیں ملتی

قفل دل غافل کے لیے ذکر ہے مفتاح
توفیق سعادت کے لیے فکر ہے مفتاح

بے فکر نہیں ہوتا ہے حج کرکے بھی حاجی
جاتی نہیں بے فکر کی آوارہ مزاجی

بے فکر کا حصہ نہیں۔ اعمال سفر میں
بے فکر تو کھو جاتا ہے احوال سفر میں

اس وادی پر خار میں جب گھر سے نکلنا
مقصود ہو منزل تو قدم روک کے چلنا

چل پڑنے سے پہلے کئی پڑتے ہیں مراحل
یہ سخت بھنور ہیں جو نظر آتے ہیں ساحل

جب گھر سے نکلتے نہ بنے کچھ نہیں ملتا
موسم تو گذر جاتا ہے غنچہ نہیں کھلتا

بندوں سے ضروری ہے معافی و تلافی
اللہ کی درگاہ میں توبہ نہیں کافی

لازم نہیں مقصود سے حب زن و فرزند
مومن کے سوا کون محبت کا ہے پابند

مومن میں محبت ہے تو کافر میں ہوس ہے
وہ شہپر جبریل ہے یہ بال مگس ہے

جس سے بھی محبت ہو وہ ان کے ہی لیے ہو
کافر کی طرح سہو محبت میں نہ جا کھو

اک اور مصیبت ہے محبت کے مقابل
مشکل ہے نجات اس سے نہ ہو ذوق جو قابل

دل میں ہو اگر بغض تو ہے دل کی ہلاکت
دنیا کے لیے کینہ ہے سینہ کی غلاظت

جب حج کا ارادہ ہو تو سینے کو کرلے صاف
آئینہ کے مانند کرے قلب کو شفاف

دل میں نہ کدورت ہو نہ کوئی غسل و غش ہو
لے دے کے فقط عشق الٰہی کی خلش ہو

جو واقعہ پیش آئے وہ عرفاں میں بدل جائے
جو چوٹ بھی ابھرے غم جاناں میں بدل جائے

دراصل حوادث ہیں حقیقت کے حجابات
تکوین بھی قرآن ہے حوادث بھی ہیں آیات

ہو فکر تو دشوار نہیں حادثہ خوانی
احوال حجابات اعراض ہیں معانی

اس راہ کا توشہ ہے بس اللہ کا تقویٰ ہشیار و خبردار کہ قزاق ہے دعویٰ
جو محتسبِ نفس ہو دھوکا نہیں کھاتا چکر میں شیاطین کے ہرگز نہیں آتا

میدانِ قیامت کی طرف جب ہو روانہ اخلاص سے پڑھ شکر الٰہی کا دوگانہ
حج کیا ہے بڑے عزم سے اپنے کو بدلنا قبروں سے نکلنا ہے، کفن اوڑھ کے چلنا

یہ حال نہ پیدا ہو تو ہے دل کی قساوت اور اس کی تمنا بھی نہ ہو یہ ہے شقاوت
اللہ کی درگاہ میں دونوں کی دوا ہے طالب کو مبارک ہو وہ ہمت ہے دعا ہے

وہ ہمت مومن تجھے اے دوست عطا ہو ہو قلب و جوارح سے عمل، لب پہ دعا ہو
جن جن کے مقدر میں تری ہم سفری ہو ایک چشمۂ فیض ان کو تری راہبری ہو

ہر لحظہ میسر ہو تجھے کشفِ حجابات ہر گام پہ حاصل ہوں تقرب کے مقامات
اس در پہ رسائی ہو تو جی کھول کے رونا بخشش میں ہو کچھ دیر تو مایوس نہ ہونا

کھیتی تری اے فضل الٰہی کے طلبگار گلزار ہو گلزار ہو گلزار ہو گلزار
بھیجیں گے تجھے کارکنانِ مشیت کچھ کر کے عطا جانبِ دربارِ نبوت

دربارِ جہاں بخش سے وہ تاج ملے گا جو تیرے سرِ فقر و عزیمت پہ کھلے گا
بخشیں گے مدینہ میں تجھے خلعتِ مومن سو بار مبارک تجھے اے قسمتِ مومن

یہ ہدیۂ تبریک ہے پیغام نہیں ہے
آغاز ہے آغاز ہے انجام نہیں ہے

خون کے آنسو

کیا لوگ تھے کہ دین پہ گردن کٹا گئے گھر بار اپنا راہ خدا میں لٹا گئے
اللہ کے رسول پہ ہستی مٹا گئے باطل کا زور جیسے بن آیا گھٹا گئے
یوں جان دی کہ زندہ جاوید ہو گئے
اسلام کو جگا کے مزاروں پہ سو گئے

ایک شیر تھا بپھر کے ادھر بھی جو آگیا گرجا کچھ اس طرح کہ باطل پہ چھا گیا

وہ شیر ہاتھیوں کے قدم ڈگمگا گیا　　تنہا ہزاروں فیل نشینوں کو کھا گیا

اترا جو وہ خدا کا ببر اس کچھار میں
باطل کے ہوش اڑ گئے پہلی ڈکار میں

پھر آج اس خدا کے ببر کی ترائی تھی　　باطل کے ساتھ حق کی نبرد آزمائی تھی
اس معرکہ میں ایک سر کی لڑائی تھی　　مردان حق کے سامنے ساری خدائی تھی

سیلاب تھا لہو کا صف کارزار میں
فوجیں عدو کی بہہ گئیں خنجر کی دھار میں

ان غازیوں نے دم لیا جھنڈے کو گاڑ کے　　باطل کا دیو رکھ دیا حق نے پچھاڑ کے
تکبیروں سے اڑا دیے پرخچے پہاڑ کے　　پھینکا شجر گھمنڈ کا جڑ سے اکھاڑ کے

زخموں سے غازیوں کے بدن چور ہو گئے
ظلمت کدے بھی نور سے معمور ہو گئے

اللہ کے جو شیر ڈکارے کچھار سے　　آواز بازگشت اٹھی کوہسار سے
جنگل تمام گونج اٹھا اس ڈکار سے　　تھرا گئے صنمکدے حق کی پکار سے

تیغوں کے سائے میں بھی کڑک کر اذان دی
اونچا خدا کا نام کیا اور جان دی

آوازۂ اذاں سے دلوں کو ہلا گئے　　بندوں کو یہ شہید خدا سے ملا گئے
خود جان دے کے مردوں کو پھر سے جلا گئے　　پھر اس زمینِ شور سے ایسے کھلا گئے

ہے چپہ چپہ گنج شہیداں سے لالہ زار
سینچا لہو سے یوں کہ خزاں ہو گئی بہار

جو مسجدیں ہیں کوچہ و بازار کی بہار　　یہ سب ہیں غازیان دلاور کی یادگار
کہتی ہیں اپنے حال پہ اب ہو کے اشکبار　　برباد ہے جو شہر تھا مشہور روزگار

روتی ہیں مسجدیں کہ نمازی نہیں رہے
تیغوں کی قدر کیا ہو کہ غازی نہیں رہے

یہ سجدیں نہیں تھیں خزانے تھے نور کے ۔ بانگ اذان نہیں تھی ترانے تھے حور کے
سجدے نہیں تھے جھونکے تھے کیف و سرور کے ۔ جتنے تھے پینے والے تھے جام طہور کے
اس مے نے بزم مست کو ہشیار کر دیا
مے کیا لہو کے چھینٹوں نے بیدار کر دیا

جو قوم جاگ اٹھی تھی اس طرح سو گئی ۔ کروٹ بدل کے نیند میں غرقاب ہو گئی
منجدھار میں جہاز خود اپنا ڈبو گئی ۔ پونجی جو جان کھو کے ملی تھی وہ کھو گئی
سرمایہ جس پہ دار و مدار آبرو کا تھا
وہ سب عوض العین شہدا کے لہو کا تھا

تھی جستجوئے خیر یہ فیروز شاہ کو ۔ رہبر بنایا عالم دیں مہر ماہ کو
طے کر رہے تھے پنجوں کے بل آپ راہ کو ۔ دوڑا رہے تھے فرط ادب سے نگاہ کو
فیروز نے یہ دیکھ کے پوچھا جو ماجرا
عمامہ اپنا آپ نے ان کو پہنا دیا

دیکھا رنگی ہوئی ہے لہو سے تمام راہ ۔ لاشے تڑپ رہے ہیں جدھر کیجیے نگاہ
مقتل کا چپہ چپہ ہے اس بات کا گواہ ۔ مجبور ہو کے چلے کہیں پنجوں پہ بر ماہ
جو دیدہ ور تھے ان کی حقیقت یہ تھی نظر
ہیں چشم و گوش اب بھی مگر سب ہیں کور و کر

مٹی میں آج بھی سمویا ہوا لہو ۔ مقتل کا ذرہ ذرہ ابھی تک ہے سرخرو
لاشے تڑپ رہے ہیں اسی طرح چارسو ۔ فوارہ آج بھی ہے لہو کا رگ گلو
ہاں چاہیے کہ دیدۂ عبرت نگاہ ہو
دستار میر داد ہو فیروز شاہ ہو

آنکھیں تو آج بھی ہیں مگر وہ نظر نہیں ۔ لاشوں سے ورنہ خالی کوئی رہگزر نہیں
پیروں سے روندے ہیں کوئی حس مگر نہیں ۔ جتنے ہیں بے خبر کسی کو خبر نہیں
اچھا ہے دیکھنے سے جو قاصر نگاہ ہے

جو قبر آشکار ہے اک سجدہ گاہ ہے

دی تھی جنھوں نے دہر میں للکار کر ندا — سجدہ روا نہیں ہے کسی کو بجز خدا
اب قوم نے انھیں کو خدا خود بنا لیا — قبروں کو پوجتے ہیں مسلمان برملا

بندے جو خود شہید ہوئے لا الٰہ پر
اب تک رہے ہیں شکل خدا شاہ راہ پر

سر پٹکتے ہیں جا کے فلاں قبر پر — دن رات یوں چڑھاتے ہیں ایمان قبر پر
کرتے ہیں پورے سجدوں کے ارمان قبر پر — پڑھتے ہیں بس نماز مسلمان قبر پر

سب مقتدی ہیں اور مجاور امام ہے
کچھ اعتراض ہے نہ کوئی روک تھام ہے

مرقد کو سج سجا کے بنایا ہے اک صنم — جس پر پڑے تپاک سے کرتے ہیں سر کو خم
چڑھتے ہیں اس صنم پہ چڑھاوے بھی دمبدم — کھویا پجاریوں نے مسلماں کا بھرم

بندے خدا کے دین سے آزاد ہو گئے
اسلام کے صنمکدے ایجاد ہو گئے

اسلام کی تباہی کا افسانہ ہے دراز — شرع محمدی سے مسلماں ہیں بے نیاز
ہے ارتکاب شرک پہ اسلامیوں کو ناز — بدعات کے بھنور میں ہے توحید کا جہاز

غازی میاں کی گاڑھی کمائی لٹا چکے
اسلام کے نشاں جہاں سے مٹا چکے

شاعر

وہ شاعر ہے جو توبہ کر کے پھر میخوار ہو جائے — نہیں جو چشم میگوں دیکھ کر سرشار ہو جائے
وہ شاعر ہے جو محو باغ میں گل بن کے بلبل پر — کبھی بے ہوش ہو جائے کبھی ہشیار ہو جائے
وہ شاعر ہے جو ہو نظارہ خواہ حسن آوارہ — جہاں ہوں چار آنکھیں عاشق رخسار ہو جائے
وہ شاعر ہے جو گھورے نگہ پر تن من فدا کر دے — یہ رس دار آنکھیں دیکھ کر بسمل ہو جائے

وہ شاعر ہے جسے ہر جامہ زیبی خواہش اندامی
بلائے حسن بن کر جان کا آزار ہو جائے

وہ شاعر ہے جو دیکھے کچھ سراپا بے لب جامے
تو آہِ سرد بھر کر طالبِ دیدار ہو جائے

کبھی صورت پرستی ہو کبھی ہو شغلِ مے خواری
تو ایسی شاعری کیا ہے سراپا ہے سیہ کاری

وہ شاعر ہے جسے دیر و حرم سے بے نیازی ہو
جو کافر ہو نہ مومن ہو نہ ستمگر ہو نہ غازی ہو

وہ شاعر ہے جسے اللہ سے دیرینہ کینہ ہو
حسینانِ جہاں کے ساتھ لیکن عشق بازی ہو

وہ شاعر ہے جو دیر و کعبہ دونوں کو برا سمجھے
مگر بت کے خمِ محرابِ ابرو کا نمازی ہو

وہ شاعر ہے جو شیخ و برہمن سے بغض رکھتا ہو
بتوں کے ناز اٹھانے کو مگر یکتا نیازی ہو

وہ شاعر ہے جو گرما دے مجالسِ عیش و عشرت کو
جہاں ہو ذکرِ خوش وقتی تو شغلِ لہو بازی ہو

وہ شاعر ہے کہ ہو آزاد جس کا ظاہر و باطن
مہذب ہو مگر تہذیب میں شہوت نوازی ہو

کبھی فرعون بن جانا کبھی ہامان بن جانا
تو گویا شاعری ہے سر بسر شیطان بن جانا

وہ شاعر ہے گزارے رات جو اختر شماری میں
بسر ہو جائے جس کا روزِ تیرہ بے قراری میں

وہ شاعر ہے کہ جس کی شام ہو کالی گھٹا غم کی
سحر جس کی شبِ تاریک کی ہو آہ و زاری میں

وہ شاعر ہے کہ چھالے ہوں ہزاروں جس کے سینے پر
جگر کے آبلوں کا خوں نکلے اشک باری میں

وہ شاعر ہے کہ جو صد چاک کر دے پیرہن اپنا
جنوں کے جوش سے بیچارہ ہر فصلِ بہاری میں

وہ شاعر ہے جو دل میں داغ تن پر زخم رکھتا ہو
جگر کے آبلوں کے جام چھلکیں بادہ خواری میں

لہو ہو پیپ ہو دیوانہ پن ہو تلخ کامی ہو
تو گویا ہے وہی شاعر جو مجنوں ہو جذامی ہو

وہ شاعر ہے جو کلیوں کو گلستاں میں دلہن سمجھے
شگفتہ پھول کو جو عاشق کا پیرہن سمجھے

وہ شاعر ہے جسے دیوار و در سے تنگ وحشت ہو
مکاں کو خانۂ زنداں بیاباں کو وطن سمجھے

وہ شاعر ہے جو آنکھیں بند کر محوِ تصور میں
کبھی نظارہ بازی کو شریفوں کا چلن سمجھے

وہ شاعر ہے جسے ہر شمع معشوقِ شبستاں ہو
جو پروانے کو دیکھے نعشِ بے گور و کفن سمجھے

وہ شاعر ہے جو ہو پابند دامِ گیسوئے جاناں
قدِ موزوں و زلفِ یار کو دار و رسن سمجھے

وہ شاعر ہے کہ جس کو سارے عالم سے رقابت ہو
رقیبوں کے لہو کو لذتِ کام و دہن سمجھے

وہ شاعر ہے جو سرتاپا عجوبہ ہو نرالا ہو
وہی شاعر ہے گویا جو انوکھی شان والا ہو

مجھے منظور ہے یہ بھی ثنائے آخری تیری
فلاحِ دین و دنیا ہے سراسر شاعری تیری

مگر یہ تو بتا قوم و وطن کے واسطے کب تک
بنائے گی ہزاروں اثر دہے جادوگری تیری

خدارا اپنی آنکھیں کھول دورِ انقلاب آیا
کہ اب درکار ہے قوم و وطن کو رہبری تیری

کسی معجز بیانی سے حقیقت منکشف کر دے
مسلم ہے جہانِ شعر میں پیغمبری تیری

بہت دن تو نے معشوقِ مجازی کی غلامی کی
ادھر آ جنگ میں درکار ہے اب سروری تیری

اگر تو جاگ اٹھے سارا جہاں بیدار ہو جائے
جو تو غفلت پہ روئے پھر وطن گلزار ہو جائے

نصیحت گو کوئی شاعر سے بہتر ہو نہیں سکتا
یہ کرتا ہے نبوت گو پیمبر ہو نہیں سکتا

ہدایت کو اگر شاعر اٹھے اعجاز ہو جائے
جہاں میں گو نبی تا روزِ محشر ہو نہیں سکتا

شجاعت میں یہ ہے ہمتا فصاحت میں یہ لاثانی
کوئی زیرِ فلک اب اگرچہ حیدر ہو نہیں سکتا

ترنم بلد یاں ہیں شاعروں کی لحنِ داؤدی
کوئی داؤد سا گو نغمہ پرور ہو نہیں سکتا

رجز خوانی سے شاعر روح اب بھی پھونک سکتا ہے
رجز خواں گو عرب والوں سے بہتر ہو نہیں سکتا

دلوں کو توڑ کر شاعر دوبارہ جوڑ سکتا ہے
دوبارہ گرچہ اب ماہِ منور ہو نہیں سکتا

زباں کھولے اگر شاعر سخن اعجاز ہو جائے
بیانِ پُراثر پیغمبری آواز ہو جائے

تو پھر بزمِ سخن میں یہ سخن آرائیاں کب تک
غزل گوئی کہاں تک قافیہ پیمائیاں کب تک

وہی گیسو وہی سنبل وہی غنچہ وہی بلبل
وہی مضمون وہی نازک خیال آرائیاں کب تک

وہی چاہت وہی فرقت وہی نالے وہی چھالے
رہِ جاناں پہ آخر نامیہ فرسائیاں کب تک

کمر کو بال سے باریک کہنے میں دھرا کیا ہے
ادب کے نام پر بیہودہ رنج افزائیاں کب تک

سراپا جھوٹ بکنے سے نہ جانے فائدہ کیا ہے
گھروں میں بیٹھے بیٹھے بادہ پیمائیاں کب تک

غزل پڑھنے کھنچے جاتے ہیں بزمِ شعر کی جانب
جہاں پر رزم ہو درکار بزم آرائیاں کب تک

خدارا کھول دو آنکھیں کہیں بیدار ہو جاؤ
اٹھو اے شاعرو! بہرِ عمل تیار ہو جاؤ

یہ "سرشکِ خونچکاں" تک

مبارک ہو مبارک ہو گلوں کو گلستاں اپنا
مبارک ہو مبارک گلستاں کو باغباں اپنا
مبارک ہو شرابِ سرخ پھولوں کے پیالوں کو
مبارک ہو ہمیں اے میکشو پیرِ مغاں اپنا

مبارک ہو ستاروں کو مبارک کہکشاں اپنا
مبارک ہو مبارک کہکشاں کو آسماں اپنا
مبارک چاند سورج کے لبالب جامِ گردوں کو
مبارک ہو ہمیں جامِ شرابِ ارغواں اپنا

مبارک ہو بیاباں کو مبارک کارواں اپنا
مبارک کارواں کو یوسفِ بے خانماں اپنا
مبارک ہو زلیخا کی نظر کو ماہِ کنعانی
مبارک ہو ہمیں رشکِ حسینانِ جہاں اپنا

مبارک موج کو سو بار دریائے رواں اپنا
مبارک سرعتِ دریا کو بحرِ بیکراں اپنا
مبارک بحرِ بے پایاں کو بخششِ ابرِ نیساں کی
مبارک ہو ہمیں سرمایۂ دردِ نہاں اپنا

مبارک وسعتِ صحرائے غم کو جادہ پیمائی
مبارک جادہ پیمائے الم کی آبلہ پائی
مبارک آبلہ پائے ستم کو خارِ صحرائی
مبارک خارِ صحرائے حرم کو جسم و جاں اپنا

مبارک عشق کی رسوائیوں کو متینِ بے پردا
مبارک قیس کی دیوانگی کو وسعتِ صحرا
مبارک دشت کی تنہائیوں کو محملِ لیلا
مبارک اے جنوں ہم کو امیرِ کارواں اپنا

مبارک ہو گلوں کو بلبلوں کی نازبرداری
مبارک بلبلوں کو گریۂ شبنم کی غمخواری
مبارک گریۂ شبنم کو گلشن میں گہرباری
مبارک ہو ہمیں ذوقِ سرشک خونچکاں اپنا

رباعیات

تمنائے جنت میں ہم جی رہے ہیں
بہ امیدِ راحت لہو پی رہے ہیں
بنفسی کی سزا ہیں جو ڈالے گئے تھے
انھیں رشتۂ اشک سے سی رہے ہیں

مجھے یاد ہیں وہ بھی رنگیں زمانے
کہ جب سب صدائیں تھیں دلکش ترانے
نہ جانے مرے دل کو کیا ہو گیا ہے
کہ اب زمزمے بھی ہیں غم کے فسانے

وطن کی طرف جا رہی ہے جو لاری
نہ جانے کہ ہے دل کو کیوں بے قراری
طبیعت کو اپنی سنبھالے ہوئے ہوں
مگر پھر بھی آنکھوں سے آنسو ہیں جاری

عمر غفلت میں کٹ گئی ساری
کچھ نہ کی آخرت کی تیاری
اب جو پیری میں ہوش آیا ہے
غم واندوہ وفکر ہے طاری

(بقیہ صفحہ ۴) مرتب کر کے بھیجا ہی۔ مجھے چونکہ "رابطۂ عالم اسلامی (مکہ مکرمہ)" کے اجلاس میں شرکت کے لیے حجاز مقدس کا سفر درپیش تھا اور اس یادداشت سے تذکرہ مرتب کرنے کی وقت میں گنجائش نہیں تھی اس لیے میں نے یہ کام حفیظ الرحمٰن سلمہٗ کے سپرد کر دیا، وہ ایک زمانہ میں صوفی صاحب کی خدمت میں رہے تھے اور کچھ اہم اور قابل ذکر واقعات خود اُن کے علم میں بھی تھے۔ اور صوفی صاحب پر لکھنے کے لیے اُن کے خاص مزاج ومذاق اور طرز زندگی سے جو واقفیت ضروری تھی وہ بھی کسی حد تک ان کو حاصل تھی ـــــ انھوں نے ہی موجودہ شکل میں یہ تذکرہ مرتب کیا اور مجھے سنایا ـــ الفرقان کی یہ پوری اشاعت اسی تذکرہ کی نذر کی جا رہی ہے

دعا ہے کہ حضرت صوفی صاحب کی زندگی کی طرح اُن کی زندگی کا یہ تذکرہ بھی اللہ کے بندوں کے لیے سامان ہدایت بنے ـــــ لکھنے والوں اور شائع کرنے والوں کو بھی اس سے روشنی اور سبق حاصل کرنے کی توفیق ہو اور اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور حضرت صوفی صاحب کو اپنی خاص رحمتوں سے نوازے

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝

Monthly "ALFURQAN" 31, Naya Gaon West Lucknow (U.P.)

VOL. 43 NO. 12 DECEMBER 1975 Phone : 25547

Cover Printed at— Shining Press, Naya Gaon, Lucknow-1

Regd. No. LW/NP-62

Monthly 'ALFURQAN' 31, Naya Gaon West Lucknow (U.P.)

VOL. 43 NO. 12 DECEMBER, 1975 Phone : 25547

Cover Printed at—Shining Press, Naya Gaon, Lucknow-1